سیرت ائمہ اہلبیتؑ

جلد دوم

ہاشم معروف حسنی
(لبنان)

جامعہ تعلیمات اسلامی
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی ۲ پاکستان

سیرت ائمہ اہلبیتؑ

جلد دوم

ہاشم معروف حسنی
(لبنان)

جامعہ تعلیمات اسلامی
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی ۲ پاکستان

ترجمہ ـــــــ سیّد علی رضا

اصلاح ونظر ـــــــ شاکر علی سرور

کتابت ـــــــ اشرف راحت

طبع اول ـــــــ ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۶ء

مطبع ـــــــ پرائما پرنٹرز کراچی

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

سیرت ائمۂ اہلبیتؑ کی پہلی جلد میں صحابیۂ اولیٰ، جدّۂ ائمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور ان کی لختِ جگر جناب صدیقہ فاطمہ زہراؑ کی عظیم خدمات کا اعتراف کرنے اور ان دونوں کے اس حق کو ادا کرنے کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے ہر فرد پر ہے، ان مُخَدَّرَات کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز دو عظیم المرتبت اماموں یعنی امام علی بن ابی طالبؑ اور ان کے فرزند نواسۂ رسولؐ امام حسنؑ کی سیرت اور ان کی زندگیوں میں پیش آنے والے واقعات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اب اس دوسری جلد میں تیسرے امام سید الشہداء حسینؑ بن علیؑ سے لیکر بارھویں امام حجت منتظرؑ تک کی سوانح حیات پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان واقعات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے جو ان حضرات کو اموی اور عباسی فرمانرواؤں کے عہد میں پیش آتے رہے، کیونکہ اصلاح پسندوں اور انسانی بہبود کے لیے کام کرنے والوں پر ظلم و تشدّد، ان دونوں ادوار کی تاریخ کا نمایاں ترین پہلو رہا ہے۔

امام حسینؑ شہیدِ کربلا

حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْ حُسَیْنٍ، اَللّٰھُمَّ اَحِبَّ مَنْ یُّحِبُّ حُسَیْناً.
(حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اے اللہ دوست رکھ اُس کو جو حسینؑ کو دوست رکھے)

حضرت ابوعبداللہ حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار، باغ مصطفیٰؐ کے پھول اور ان خمسۂ نجباء میں کے ایک فرد ہیں جن سے اللہ نے ہر برائی کو دُور رکھا اور ان کو پوری طرح پاکیزہ قرار دیا ہے۔ نیز اکثر مفسرین، محدثین اور مورخین کے بیان کے مطابق نبی اکرمؐ نے ان کی معیت میں نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ فرمایا تھا۔ آپ اپنے نانا رسول اکرمؐ، اپنے والد امام علیؑ اور اپنے بھائی امام حسنؑ کی صراحت کے مطابق امام برحق تھے۔

آپ ۵ شعبان ۴ھ کو مدینے میں پیدا ہوئے۔ اسماء بنت عمیس سے روایت ہے کہ آپ اپنے بھائی حسنؑ کی ولادت سے ایک سال بعد فاطمہ زہراؑ کی آغوش میں آئے۔ پس نبی اکرمؐ تشریف لائے اور فرمایا: اے اسماء! میرے بیٹے کو لاؤ۔ تب اسماء نے ان کو ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر آنحضرتؐ کے سپرد کر دیا۔ آپ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی۔ اسکے بعد آنحضرتؐ نے ان کو اپنی گود میں

لے لیا اور رونے لگے۔

اسماء کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہو جائیں، آپ رو کیوں رہے ہیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: میں اس واقعہ پر رو رہا ہوں جو اس بچے کو میرے بعد پیش آنے والا ہے۔ اس کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی کہ جس کو میری شفاعت نصیب نہ ہو گی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: اے ابوالحسنؑ! کیا آپ نے اس کا نام رکھا؟ انھوں نے جواب دیا میں اس معاملے میں آپ پر سبقت نہیں کر سکتا۔ البتہ میری خواہش ہے کہ ان کا نام "حرب" رکھا جائے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: تم اس کا نام حسینؑ رکھ دو۔ پھر ساتویں روز آنحضرتؐ نے آپ کا عقیقہ فرمایا۔ اس کے لیے ایک مینڈھا ذبح فرمایا اور آپکے بالوں کے برابر چاندی صدقہ میں دی جیسا کہ اس سے پہلے آنحضرتؐ نے آپ کے بھائی حسنؑ کے لیے کیا تھا۔

بیشتر روایات میں آیا ہے کہ آپ نے اپنی مادر گرامی کا دودھ پیا نہ کسی دوسری عورت کا، بلکہ رسول اکرمؐ اپنا انگوٹھا آپ کے منہ میں دیدیتے تھے۔ پھر آپ اس کو اتنا چوس لیتے تھے کہ وہ آپ کو دو یا تین روز کے لیے کافی ہو جاتا۔

مناقب ابن شہر آشوب میں روایت ہے کہ حسینؑ کی ولادت کے بعد فاطمہ زہراؑ علیل ہو گئیں۔ تب رسول اکرمؐ نے چاہا کہ کوئی دوسری عورت آپ کو دودھ پلا دے لیکن کوئی بھی دودھ پلانے والی نہ تھی۔ پس آنحضرتؐ اپنا انگوٹھا آپ کے دہن مبارک میں دیدیا کرتے اور آپ اسی کو چوستے رہتے تھے۔ چنانچہ چالیس دن تک یہی آپ کی غذا رہی اور آپ کا گوشت رسول اکرمؐ کے گوشت سے پرورش پاتا رہا۔

امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ: میرے جدبزرگوار حسینؑ نے نہ فاطمہ زہراؑ کا دودھ پیا اور نہ کسی اور عورت کا۔ بلکہ رسول اکرمؐ اپنا انگوٹھا آپ کے دہن مبارک میں دیدیتے تھے۔ پھر آپ اس کو اتنا چوس لیتے کہ وہ آپ کو دو یا تین روز کے لیے کافی ہو جاتا تھا۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ رسول اکرمؐ کبھی آپ کو اپنا انگوٹھا اور کبھی اپنی

زبان مبارک چُساتے تھے، کیونکہ نہ آپ نے اپنی مادر گرامی کا دودھ پیا اور نہ کسی غیر عورت کا۔ پس آپ کے بچپن کے متعلق وہ روایات صحیح نہیں ہیں جو اس صورت واقعہ کے خلاف ہوں۔

روایات بتلاتی ہیں کہ امام حسینؑ کا بدن اور امام حسنؑ کا چہرہ سب سے زیادہ رسول اکرمؐ سے مشابہ تھا۔ آپ کے قویٰ مضبوط اور قد میانہ تھا۔ لوگوں نے آپ سے زیادہ حسین کوئی اور نہ دیکھا تھا۔ رسول اکرمؐ آپ سے بہت محبت رکھتے اور بے حد شفقت فرماتے تھے۔ آپ کے رونے سے آنحضرتؐ رنجیدہ ہو جاتے تھے، اس لیے بی بی فاطمہ زہراؑ کو آپ کا خیال رکھنے کی ہدایت فرماتے رہتے تھے۔ کبھی آنحضرتؐ آپ کو اپنے ہاتھوں پر لے لیتے، کبھی کندھے پر بٹھا کر باہر لے جاتے تھے۔ جب آپ بیٹھتے تو حسینؑ کو اپنی گود میں لیے رہتے تھے۔ اگر آپ آنحضرتؐ کے پاس سے ادھر ادھر جانے لگتے تو حضورؐ کی نظریں ان پر سے ہٹتی نہ تھیں۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ لوگوں سے خطاب کر رہے تھے۔ اس وقت آپ نے دیکھا کہ حسینؑ اپنی قمیص میں الجھ کر گر پڑے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فوراً منبر پر سے اتر کر آپ کو سنبھالا اور پھر اپنا خطبہ وہیں سے شروع کر دیا جہاں اس کو چھوڑا تھا۔ اس وقت آنحضرتؐ یہ بھی فرماتے جا رہے تھے کہ اولاد ذریعہ آزمائش ہے۔

پروفیسر احمد عاشور اپنی کتاب "سید شباب اہل الجنۃ" میں رقمطراز ہیں کہ: اگر آپ اہل سنت کی کتابوں میں صرف صحاح ہی کی ورق گردانی کریں تو آپ کو امام حسینؑ کی فضیلت میں دسیوں ایسی حدیثیں مل جائیں گی جو آپ کی منزلت اور آپ سے رسول اکرمؐ کی محبت کو ثابت کرتی ہیں بلکہ آپ کو ان کتابوں میں دسیوں ایسے اشارے اور قرینے بھی ملیں گے جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو ان بیشتر مصیبتوں، دشواریوں اور آزمائشوں سے آگاہ کر دیا تھا، جو امام حسینؑ کو اپنی زندگی میں پیش آنے والی تھیں۔ پس یہ امر بھی یقینی تھا کہ آنحضرتؐ کربلا کے مقام پر ہونیوالی خونریزی اور دوسرے مصائب سے آگاہ کر دیتے۔ چنانچہ آپ نے بعض موقعوں پر اپنے اصحاب کو اس

کے متعلق بتلا بھی دیا تھا۔ جیسا کہ زہیر بن قین کے طرز عمل سے واضح ہوتا ہے کہ جب امام حسین ع کربلا کی جانب سفر فرما رہے تھے تو آپ نے زہیر بن قین سے ملاقات فرمائی۔ زہیر عثمانی مسلک پر تھے اور حج کر کے واپس جا رہے تھے۔ جب امام حسین ع اپنی سواری کو ان کی سواری کے قریب لائے تو زہیر بن قین نے بیان کیا کہ: ایک مرتبہ ہم لوگ سلمان فارسی رض کے ساتھ ایک غزوہ میں شریک تھے۔ اس میں اللہ نے ہم کو فتح عطا کی اور بہت سا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ اس وقت سلمان نے ہم لوگوں سے کہا، اگر تم کو سیدِ شباب اہل الجنۃ (یعنی امام حسین ع) کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے کا موقع مل جائے تو اس جنگ میں شرکت پر تم اس سے زیادہ خوش ہو گے جتنا آج یہ مال غنیمت حاصل ہونے سے خوش ہوئے ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ سلمان فارسی رض کو مستقبل میں ہونیوالے واقعات کا علم ہو ہی نہیں سکتا تھا تاوقتیکہ نبی اکرم ص نے ان کو بتایا نہ ہو۔

راوی یہ بھی کہتے ہیں کہ جب امام علی ع کربلا سے گزرے تو آپ نے وہاں دیر تک توقف فرمایا۔ وہاں آپ نے گریہ فرماتے ہوئے ان واقعات کا ذکر کیا جو اس مقام پر آپ کی اولاد کو پیش آنیوالے تھے جبکہ آنحضرت ص کو یہ علم وحی کے ذریعے سے حاصل ہوا تھا۔ جیسے بی بی ام سلمہ نے اور ان کے حوالے سے دوسرے راویوں نے کربلا میں ہونیوالے واقعات بیان کیے ہیں کہ: جب جبرئیل ع نے رسول اکرم ص کو کربلا میں ان کے بیٹے حسین ع پر گزرنے والے واقعات کی اطلاع دی تو آنحضرت ص نے کربلا کی ایک مٹھی بھر خاک ان معظمہ کو دی اور ان کو بتلایا کہ: حسین ع کے قتل ہونے کے وقت یہ مٹی جوش مارتا ہوا خون بن جائے گی۔ پھر ایک مدت کے بعد جب امام حسین ع سفر عراق پر چلے تو آپ بی بی ام سلمہ رض سے رخصت ہونے آئے تب انھوں نے امام ع کو بھی یہ حدیث سنائی۔ امام ع نے اس خبر کی تصدیق کی اور پھر آپ نے بھی ان کو کربلا کی مٹی دی۔ چنانچہ جب سے امام حسین ع عراق کی جانب روانہ ہوتے تھے، وہ معظمہ اس مٹی کا بہت دھیان رکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ محرم کی دسویں تاریخ کو جب انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس مٹی پر نظر کی تو کیا دیکھتی ہیں کہ وہ خونِ تازہ کی مانند جوش مار رہی ہے۔ اسی طرح کی بہت سی روایات کے مطابق وہ بی بی ام سلمہ ہی ہیں کہ جن کو حجاز

میں سب سے پہلے امامؑ کے قتل کا علم ہوا۔ حالانکہ ان روایات میں سے بیشتر وہ ہیں جن پر خاص طور پر تحقیق نہیں کی گئی۔

بہر حال حسینؑ سات سال یا (تاریخ ولادت میں اختلاف کے لحاظ سے) اس سے کچھ کم عرصے تک اپنے نانا رسول اللہؐ کے زیر سایہ رہے۔ آنحضرتؐ نے آپ کا نام حسینؑ رکھا جیسا کہ اس سے قبل آپ کے بھائی کا نام حسنؑ رکھا تھا۔ آپ انہی کی تربیت میں رہے، یہاں تک کہ آنحضرتؐ اپنے رب سے جا ملے۔ پس کم سنی کے باوجود آپ کے ذہن شریف پر ہر وہ شے نقش ہوتی رہی جو آنحضرتؐ کے قول و فعل سے ظہور میں آتی تھی۔ گویا آپ اپنے جد بزرگوار سے پہلے کسی اور سے واقف نہیں ہوئے، نہ آپ کو آنحضرتؐ کی شفقت سے پہلے کسی انسان کی شفقت ملی۔ وہ آپ کو اپنی زبان مبارک چبا چبا کر اتنی غذا بہم پہنچا دیتے تھے جو راویوں کے بقول آپ کو دو یا تین روز کے لیے کافی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ آپ کا بدن مضبوط ہو گیا اور آپ کے عظیم ذہن میں رسالت کے علوم اور مقاصد کے لیے اتنی وسعت پیدا ہو گئی کہ وہ روحانیت اس میں پوری طرح رچ بس گئی۔ آپ کے جد بزرگوار نے بارہا آپ کے متعلق فرمایا: حُسَيْنٌ مِّنِّي وَاَنَا مِنْ حُسَيْنٍ یعنی حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔

براء بن عازب سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے نبی اکرمؐ کو دیکھا کہ حسینؑ کو اپنے کندھے پر لیے ہوئے یہ فرما رہے ہیں: بارِ الٰہا! میں اس کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اس کو محبوب رکھ اور اس کو بھی جو اس کو محبوب رکھے۔' اپنے جدِّ بزرگوار کے بعد آپ اپنے والد عالی قدر کی تربیت میں آ گئے۔ اس وقت آپ اپنی عمر کے ساتویں سال میں تھے۔ آپ اپنے والدین کے اس رنج میں شریک رہے جو ان کو رسول اکرمؐ کے انتقال اور پھر آپ کے والد گرامی کو خلافت سے محروم رکھے جانے پر لاحق ہوا تھا۔ نیز آپ نے دیکھا کہ ان چند مہینوں کے دوران جبکہ آپ کی والدہ گرامی آپ کے جد بزرگوار کے بعد زندہ رہیں، ان کو اپنے والد کے فراق میں قرار نہ آتا تھا۔ وہ رات دن آنحضرتؐ کے لیے روتی رہتی تھیں لیکن اس تاریک فضا میں بھی انہوں نے قوم سے ان چیزوں کا مطالبہ کرنے میں جھجک محسوس نہ کی جو ان لوگوں نے ان سے اور ان کے شوہر سے چھین لی تھیں۔ وہ ان کے سامنے اپنے حق میں مضبوط اور محکم دلیلیں پیش

کیا کرتی تھیں۔ مگر وہ لوگ ان پر ظلم ڈھانے اور ان کے حقوق غصب کرنے پر جمے ہی رہے۔ بلکہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ راویوں کے بقول ان لوگوں نے بی بی کے گھر پر ہلہ بول دیا اور اس گھر کو اس کے مکینوں سمیت جلا دینے پر تیار ہو گئے۔

ابو عبداللہ حسینؑ اپنے اس لڑکپن میں یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ چنانچہ آپ رنج سے پیچ و تاب کھاتے اور ان واقعات کی تلخی کو محسوس فرماتے تھے۔ آپ اپنے پدر عالی قدر اور برادر عزیز کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ آپ کی مادر گرامی کا انتقال ہو گیا۔ اب تو آپ کا غم دو چند ہو گیا اور آپ کے ذہن پر اس کا شدید اثر ہوا لیکن صبر اور استقامت میں اپنے والد بزرگوار کی پیروی فرماتے رہے۔ آپ نے اپنے والد اور بھائی کی طرح اپنی زندگی کا یہ مرحلہ اللہ کی مشیئت اور اس کے فیصلے پر بڑے اطمینان اور حوصلے کے ساتھ طے کیا۔ آپ تیس سال سے زیادہ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہے۔ جبکہ آپ خلوص قلب سے اپنے جدامجد کی رسالت کے معتقد تھے۔ باطل اور اہل باطل سے نفرت فرماتے اور ظالموں کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ آپ دین کے معاملہ میں نہ کسی سے مصالحت فرماتے نہ کسی کی بے جا طرفداری کرتے تھے۔ دنیا کی فتنہ انگیزیاں اور دلفریبیاں آپ کو بھٹکا نہ سکتی تھی۔ اگر کوئی کسی پر زیادتی کرتا تو آپ کو جوش آجاتا تھا۔ کمزوروں کی فریاد اور پریشان حالوں کی پکار پر آپ انکے حق میں آواز بلند کرتے، جس سے ظالموں اور جابروں کی خوابگاہوں میں ہلچل پڑ جاتی تھی۔

آپ کا قول یہ تھا: آگاہ ہو جاؤ کہ میں موت کو خوش بختی سمجھتا ہوں اور اس کے مقابل ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو ایک گناہ تصور کرتا ہوں۔

تمام مؤرخ اور راوی اس امر پر متفق ہیں کہ آپ ذاتی فضیلت، اخلاقی برتری اور حسن عمل میں مثالی حیثیت کے حامل تھے۔ آپ اس وسیع علم سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے جو آپ کو اپنے جدامجد اور پدر عالی قدر سے ورثے میں ملا تھا۔ آپ اقوال سے پہلے اعمال میں پیش پیش رہتے تھے۔ اپنے مال کو ناداروں اور حاجتمندوں پر صرف کرنے میں سخی اور متواضع تھے۔ آپ حق کی نصرت فرماتے اور برائیوں سے برسرپیکار رہتے تھے۔ آپ صبر، بردباری، عفت، مروّت اور خداترسی سے آراستہ تھے۔ آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار اور

سب سے زیادہ دنیا اور اس کی لذتوں سے روگرداں تھے۔

آپ دنیا اور اس میں انسان کی حیثیت کے بارے میں کلام فرماتے تو کہتے: "اے بندگان خدا! اللہ سے ڈرو اور دنیا (کے فریب) سے خبردار رہو۔ کیونکہ اگر وہ کسی کے لیے سدا باقی رہتی یا کوئی اس میں ہمیشہ رہتا تو اس کا سب سے زیادہ حق انبیاء کو تھا اور وہی اس سے بہرہ یابی کے سب سے زیادہ سزاوار تھے لیکن اللہ نے دنیا کو آزمائش کے لیے خلق کیا ہے اور اس کے باشندوں کو ایک مقررہ مدت کے لیے پیدا کیا ہے۔ پس اس کی نئی سے نئی چیزیں بوسیدہ ہو جانے والی ہیں۔ اس کی نعمتیں ختم ہو جانے والی ہیں اور اس کی خوشیاں زائل ہو جانے والی ہیں۔ تم لوگوں کو چاہیے کہ آخرت کے لیے سامان سفر مہیا کر لو اور بہترین سامان اللہ کا خوف ہے۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو کہ تم اسی سے فلاح پاؤ گے۔"

مختصر یہ کہ امام حسینؑ کا کلام شرافت، قربانی اور فداکاری کے جذبات و احساسات سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ آپ اصلاح چاہنے والوں، تاریخ کی عظیم ہستیوں اور ظلم و سرکشی کے خلاف برسرپیکار رہنے والوں میں بلندترین مقام کے حامل ہیں۔ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ آپ کی باشرف اور پاکیزہ زندگی، ہر اصلاح چاہنے والے، ظلم اور ظالموں سے مقابلہ کرنیوالے نیز ہر اس صاحبِ فضیلت شخص کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ اور عمدہ مثال بنی رہے جو ظالموں کے چنگل میں ذلت کے ساتھ زندہ رہنے کے مقابلے میں اپنی گردن تلوار کی دھار پہ رکھ دینے کو ترجیح دیتا ہو۔ چنانچہ آپ کی زندگی بھی اسی طرح تمام ہوئی کہ تلواریں آپ کے جسم کو پارہ پارہ کر رہی تھیں اور آپ کی زبان مبارک پہ یہی کلمات جاری تھے: "میں اپنے آپکو ذلیل فرد کی طرح تمہارے حوالے نہیں کروں گا اور نہ میں تمہارے ساتھ ایک غلام کی مانند زندہ رہوں گا۔"

اسی لیے آپ دلیری و فداکاری کا ایسا باشرف اور پاکیزہ نمونۂ عمل بنے رہے اور بنے رہیں گے جس کے اثرات و خصوصیات سے انسانیت کی طویل تاریخ میں آنے والی تمام نسلیں تقویت حاصل کرتی رہیں گی۔

اب امام حسینؑ کی سیرت بیان کرنے کا موقع آگیا ہے۔ پس ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے تمام مراحل کو تیزی سے طے کر لیں۔ پھر اللہ سے امید کریں کہ ہم کو بھی ان کی سیرت طیبہ سے حق جوئی، حق کوشی، سخاوت اور قربانی کا وہی جذبہ حاصل ہو جو سید الشہداءؑ کے دل میں تھا۔

امام حسینؑ چار خلفاء کے عہد میں

ہم امام حسینؑ کی ولادت اور آپ کے جدامجد رسول اکرمؐ کے ساتھ آپ کی زندگی پر ہلکی سی روشنی ڈال چکے ہیں لیکن تاریخ ہم کو پہلے خلیفہ کے زمانہ میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ شائد اس وجہ سے کہ آپ اس وقت کم سن تھے اور حضرت ابوبکر صرف دو سال کے قریب خلیفہ رہے جبکہ ان کی وفات کے وقت امام حسینؑ اپنی عمر کے نویں سال میں تھے۔ البتہ حضرت عمر بن خطاب کی خلافت کے دوران میں ہر تلاش کرنے والے کو امام حسینؑ کی سیرت کے متعلق کہیں کہیں تھوڑا سا مواد مل جائے گا۔

چنانچہ حضرت عمر بن خطاب کی خلافت کے ابتدائی زمانے کے متعلق امام حسینؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: میں حضرت عمر کے پاس گیا تو وہ منبر پہ بیٹھے خطبہ دے رہے تھے اور مسلمان ان کے چاروں طرف جمع تھے۔ میں لوگوں میں سے گزرتے ہوئے ان کے قریب پہنچا اور ان سے کہا: میرے باپ کے منبر پہ سے اتر جاؤ اور اپنے باپ کے منبر پر بیٹھو۔ اس پر وہ مسکراتے ہوئے بولے: میرے باپ کا کوئی منبر نہیں ہے اور قسم بخدا یہ منبر آپ کے والد بزرگوار ہی کا ہے۔ پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ کو اپنے برابر میں بٹھا لیا۔ جب وہ منبر پہ سے اترے تو مجھ کو اپنے ساتھ اپنے گھر میں لے گئے جہاں انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ: آپ کو یہ بات کس نے سکھائی تھی۔ میں نے کہا: بخدا یہ بات مجھ کو کسی نے نہیں سکھائی۔ تب وہ کہنے لگے: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ کاش کہ میں اپنے حواس میں نہ رہوں! پھر ایک روز میں ان کے ہاں گیا۔ وہ معاویہ کے ساتھ تنہائی میں باتیں کر رہے تھے اور ان کا بیٹا عبداللہ دروازے پر کھڑا تھا۔ چنانچہ جب وہ وہاں سے چلا گیا تو میں بھی اس کے ساتھ ہی واپس ہو گیا۔ اس کے بعد

میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے: جب آپ مجھ سے مل کر گئے تھے دوبارہ میں نے آپ کو دیکھا ہی نہیں۔ تب میں نے ان کو بتلایا کہ میں آپ کے پاس آیا تو تھا لیکن آپ معاویہ کے ساتھ تنہائی میں محو گفتگو تھے۔ البتہ آپ کے فرزند عبداللہ دروازے پر کھڑے تھے میں بھی ان کے ساتھ ہی واپس چلا گیا تھا۔ اس پر وہ کہنے لگے: آپ میرے بیٹے سے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ یہ جو (نشان حکمرانی)، آپ ہمارے سروں پر دیکھتے ہیں یہ اللہ کا اور پھر آپ کے گھرانے ہی کا دیا ہوا ہے۔

تذکرۃ الخواص وغیرہ میں ابن عباس سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب حسنؑ اور حسینؑ سے محبت کرتے اور ان کو اپنے بیٹوں پر مقدم قرار دیتے تھے۔ ایک روز انھوں نے مال تقسیم کیا تو حسنؑ و حسینؑ کو دس دس ہزار درہم دیے اور اپنے بیٹے عبداللہ کو ایک ہزار دیے۔ تب ان کے بیٹے نے ان سے شکایت کی اور کہا: آپ اسلام میں میری سبقت اور رسول اکرمؐ کی طرف میری ہجرت سے واقف ہوتے ہوئے بھی ان دونوں صاحبزادوں کو مجھ پر افضل قرار دیتے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا: اے عبداللہ وائے ہو تجھ پر، ذرا ان دونوں کے سے نانا، ان دونوں کے سے باپ، ان دونوں کی سی ماں، ان دونوں کے سے ماموں، ان دونوں کے سے چچا اور ان دونوں کی سی پھوپھی تو لے کر آؤ، کیونکہ ان کے نانا رسول اکرمؐ، ان کے باپ علیؑ بن ابی طالب، ان کی ماں فاطمہ زہراؑ، ان کی نانی خدیجہؓ بنت خویلد، ان کے ماموں ابراہیم بن رسول کریمؐ، ان کے چچا جعفر طیار اور ان کی پھوپھی ام ہانی بنت ابی طالب ہیں۔

تاریخ ابن عساکر میں روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے حسنؑ اور حسینؑ کے لیے وہی روزینہ مقرر کیا جو ان کے والد بزرگوار کے لیے مقرر کیا تھا۔ نیز عطایا کے معاملہ میں بھی ان دونوں کو اہل بدر میں شامل کر دیا۔ ایک مرتبہ یمن کے گورنر نے کچھ حلے بھیجے جو انھوں نے تقسیم کر دیے لیکن ان میں سے حسنؑ و حسینؑ کو کچھ نہیں دیا۔ لوگ وہ لباس پہن کر خوش ہونے لگے۔ اتنے میں حسنؑ و حسینؑ اپنی مادر گرامی کے مکان سے نکلے جو مسجد سے ملا ہوا تھا۔ ان کو دیکھا تو حضرت عمر بن خطاب رنجیدہ ہو کر اپنے چاروں طرف کے لوگوں سے کہنے لگے:

میں نے انصاف نہیں کیا، کیونکہ تم کو یمن کے حلے پہننے کو دیے اور ان دونوں صاحبزادوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے یمن میں اپنے گورنر کو لکھ بھیجا کہ وہ حسن و حسینؑ کے لیے جلدی سے دو حلے بھیج دے، چنانچہ گورنر نے دو حلے بھیجے۔ تب انہوں نے وہ ان دونوں شہزادوں کو پہنا کر کہا: اب میرا دل خوش ہو گیا۔

دوسری روایت میں ہے کہ ان کے پاس اولاً جو حلے آئے تھے، ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان دونوں بھائیوں کے لیے مناسب ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے یمن کے گورنر کو لکھ بھیجا کہ وہ دو ایسے حلے بھیجے جو ان دونوں کے لیے موزوں ہوں۔

تاریخ کی کتابوں میں اس بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ آپ نے روم اور فارس کے ساتھ مسلمانوں کی جنگوں میں شرکت فرمائی ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں آپ ابتداء شباب کی منزل سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ البتہ حضرت عثمان کے زمانے میں آپ پورے شباب کو پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ آپ اور آپ کے بھائی حسنؑ عملی زندگی میں عام لوگوں کے ساتھ شریک ہونے لگے تھے جیسا کہ افریقہ اور فارس کے بعض معرکوں میں بھی شریک ہوئے تھے۔

ابن خلدون یہ روایت کرتے ہیں[1] کہ جب حضرت عثمان بن عفان نے عمرو بن العاص کو مصر کی گورنری سے علیحدہ کر دیا تو وہاں اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سرح کو مقرر کیا اور اس کو اہل افریقہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی عقبہ بن نافع بن عبدالقیس اور عبداللہ بن نافع بن حرث کو لشکر پر امیر مقرر کیا۔ یہ لوگ افریقہ کی طرف بڑھے لیکن وہاں کے لوگوں نے خراج دینے کے وعدہ پر ان سے صلح کر لی۔ البتہ وہاں کی کثیر افرادی قوت کی وجہ سے مسلمان پیش قدمی نہیں کر سکے۔ اس کے بعد ابن سرح نے افریقہ میں پیش قدمی کرنے کے لیے حضرت عثمان سے اجازت طلب کی۔ اس نے یہ بھی درخواست کی کہ لشکر میں اضافہ کیا جائے۔ حضرت عثمان بن عفان نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا تو انھوں نے لشکر کشی کے حق

---

[1] تاریخ ابن خلدون، جلد دوم، کتاب العبر صفحہ ۱۲۸ - ۱۲۹

میں رائے دی۔ چنانچہ خلیفہ نے مزید فوج وہاں بھیج دی۔ جس میں صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن عاص، عبداللہ ابن جعفر اور حسنؑ و حسینؑ بھی شامل تھے[1]

طبری اور ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ امام حسینؑ نے طبرستان کے نواح میں اہل فارس کے ساتھ مسلمانوں کی جنگوں میں شرکت فرمائی[2] جیسا کہ دونوں کتابوں میں ہے کہ: ۳۰ھ میں سعید بن عاص نے طبرستان پر فوج کشی کی۔ حالانکہ وہاں کے بادشاہ، اجھبید نے عمر بن خطاب کے زمانے میں، مسلمانوں کو ہر سال کچھ مال دینے کی شرط پر سوید بن مقرن سے صلح کر لی تھی۔ تاہم جب سعید بن عاص حضرت عثمان کی طرف سے کوفہ کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے اجھبید پر فوج کشی کر دی۔ اس وقت صحابہ کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہو گئی۔ جس میں حسنؑ و حسینؑ، عبداللہ بن عباس اور مہاجرین و انصار کی اولاد میں سے کچھ افراد تھے۔ یہ غازی جرجان اور نہاوند وغیرہ تک بڑھتے چلے گئے۔ تب یہ سارے علاقے ان کے آگے سرنگوں ہوتے چلے گئے۔ البتہ مؤرخوں کی ایک جماعت نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی ان جنگوں میں حسنؑ و حسینؑ کی شرکت کا ذکر نہیں کیا جو اس وقت کامیابیوں سے ہمکنار ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ افریقہ، طبرستان اور اس کے نواح کے معرکوں میں بھی ان دونوں بھائیوں کی شرکت کو اسی طرح نظر انداز کر دیا ہے، جس طرح بعض دوسرے تاریخی حقائق پر غبار ڈالا ہے لیکن صرف شرکت کے نظر انداز کرنے ہی پر معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے تو ان جنگوں میں حسنینؑ کی شرکت کا معاملہ ہی شک میں پڑ جاتا ہے حالانکہ اہلبیتؑ کی تاریخ، دین اسلام کی خاطر قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔

بعض مؤرخین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے بھائی امام حسنؑ حضرت عثمان کو مظاہرین سے بچانے میں شریک رہے۔ امام علیؑ نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ انکے

---

[1] احمد بن خالد ناصری سلاوی۔ استقصاء الاخبار المغرب الاقصیٰ۔ جلد ا صفحہ ۳۹ [2] تاریخ طبری جلد ۵ صفحہ ۵۷۔۵۸۔ تاریخ ابن خلدون جلد ۲ کتاب العبر صفحہ ۱۳۴۔۱۳۵،

دروازے پر کھڑے رہیں اور شورشیوں کو ان پر حملہ کرنے سے روکے رکھیں۔ بعض مؤرخ اس پر یہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ: مظاہرین حضرت عثمانؓ تک اس دروازے سے جاتے ہوئے ڈرے جس پر امام حسنؑ اور امام حسینؑ کھڑے تھے، اسی لیے وہ لوگ دیوار پھاند کر حضرت عثمان تک جا پہنچے اور ان کا خاتمہ کر دیا۔ میں اس معاملے میں حسنؑ و حسینؑ کے طرز عمل کے بارے میں اس کتاب کی پہلی جلد میں حضرت عثمان اور ان کی حکومت کے خلاف خروج کے سلسلے میں اس قسم کی روایات پر تبصرہ پیش کر چکا ہوں، اس لیے اب اس کا اعادہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ امام حسینؑ اپنے والد بزرگوار کی خلافت کے زمانے میں تمام سیاسی، فوجی اور انتظامی معاملات میں شریک رہے۔ البتہ خود امام علیؑ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ آپ اور آپ کے بھائی حسنؑ قتال میں حصہ نہ لیں۔ چنانچہ آپ جنگ میں اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو آگے رکھتے تھے۔

اسی بنا پر محمد بن حنفیہ سے کہا گیا کہ آپ کے والد بزرگوار کیوں آپ ہی کو خطرے میں ڈالتے ہیں جبکہ حسنؑ اور حسینؑ کو خطرے میں نہیں ڈالتے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ وہ دونوں ان کی آنکھیں ہیں اور میں ان کا دست راست ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے داہنے ہاتھ سے اپنی آنکھوں کی حفاظت فرماتے ہیں۔ ایک اور موقع پر امیرالمومنینؑ سے کہا گیا کہ آپ محمد بن حنفیہ کو قتال کرنے کی اجازت کیوں دیدیتے ہیں حالانکہ آپ حسنؑ اور حسینؑ کو روکتے رہتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ وہ دونوں میری آنکھیں ہیں اور محمد میرا ہاتھ ہے۔ پس میں ہاتھ سے اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتا ہوں۔

صفین میں قرآن کے نیزوں پر بلند کیے جانے اور ہنگامۂ تحکیم کے بعد امیرالمومنینؑ جب کوفہ واپس پہنچے تو آپ نے کسی کو یہ کہتے سنا: "ان کو چاہیے تھا کہ جو لوگ انکی اطاعت میں تھے ان کی معیت میں جنگ جاری رکھتے، یہاں تک کہ فتح یاب ہو جاتے یا قتل ہو جاتے۔" اس پر آپ نے فرمایا: یہ خیال میرے ذہن سے باہر نہیں تھا۔ میں تو خود ہی دنیا میں اپنے کو قیدی سمجھتے ہوئے موت کو اپنے لیے خوشگوار پاتا تھا۔ میں نے تو یہ ارادہ بھی کیا کہ دشمن کے خلاف اقدام کروں لیکن جب میں نے حسنؑ و حسینؑ کو دیکھا کہ یہ مجھ سے بھی آگے ہیں، پھر میری نظر جو عبداللہ بن جعفر اور محمد بن حنفیہ پر پڑی کہ وہ بھی میرے ساتھ بڑھ رہے ہیں

تب میں سمجھ گیا کہ اگر حسینؑ قتل ہو گئے تو اس امت سے رسول اکرمؐ کی نسل نابود ہو جائے گی۔ پھر ان دونوں کے متعلق میں نے ایسا خیال کیا کہ اگر یہ مر گئے اور مجھ کو دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا تو میں ان سے ضرور مقابلہ کروں گا خواہ میرے ساتھ فوج بھی نہ ہو۔

اسد الغابہ میں شقیق بن سلمہ سے روایت ہے[1] کہ خوارج یا بیعت شکنوں کے ساتھ کسی جنگ میں حسینؑ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ تھے۔ آپ میدان میں آئے اور آواز دی کہ ہے کوئی مقابلہ کرنے والا! آپ کی آواز پر آل ذی لعوہ کا ایک شخص جس کا نام زبرقان بن اسلم تھا، مقابلے کے لیے آیا، جو نہایت قوی اور بہادر تھا۔ اس نے امام حسینؑ سے کہا: تم کون ہو؟ آپ نے فرمایا میں حسینؑ بن علیؑ ہوں۔ اس پر زبرقان بولا: اے بیٹے واپس چلے جاؤ۔ قسم بخدا! ایک روز میں نے رسول اکرمؐ کو دیکھا جبکہ وہ ایک سرخ اونٹنی پر قبا سے آ رہے تھے۔ اس وقت میں نے تم کو ان کے آگے بیٹھے دیکھا تھا۔ پس میں تمہارے خون میں ہاتھ رنگ کر رسول کریمؐ سے ملاقات کرنا نہیں چاہتا۔ پھر وہ خود ہی آپ کے سامنے سے چلا گیا۔[2]

امیر المومنینؑ کی امام حسینؑ کے لیے وصیت

راوی بیان کرتے ہیں کہ جب ابن ملجم نے امیر المومنینؑ کو تلوار سے گھائل کر دیا پھر آپ کو اپنے مکان میں لے جایا گیا تو آپ کو غش پر غش آ رہے تھے۔ چنانچہ اس رات کہ جس میں آپ نے شہادت پائی، آپ کے سب بیٹے آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ اس وقت آپ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی امامت کا اعلان فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے دوسرے بیٹوں کو ان دونوں کی فرمانبرداری کا حکم دیا۔ تب آپ نے ان دونوں سے فرمایا: میں تم دونوں کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ تم دنیا کی خواہش نہ کرنا خواہ وہ تمہارے پیچھے پڑی رہے۔ دنیا کی جو چیز تم سے لے لی جائے اس پر افسوس نہ کرنا۔ مظلوم کے مددگار اور ظالم کے مخالف رہنا۔ پھر آپ

---

[1] اسد الغابہ جلد ۲۔ صفحہ ۱۹۳-۱۹۴

[2] اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس شخص کا آپ کے سامنے سے چلا جانا اپنی جان کے خوف سے رہا ہوگا نہ کہ امام حسینؑ کے خیال سے کہ وہ اپنی بہادری اور قوت میں مشہور تھے۔

نے اپنے دوسرے بیٹوں اور بنی ہاشم کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا: اے بنی عبدالمطلب! ایسا نہ ہو کہ تم یہ کہہ کر مسلمانوں کا خون بہانے لگو کہ امیرالمومنینؑ قتل کر دیے گئے ہیں۔ میرے قصاص میں میرے قاتل کے علاوہ کسی اور کو مت مارنا۔ میری موت جو کہ مقرر ہے، اگر اسی ضربت سے واقع ہو جائے تو تم لوگ بھی اس کو ایک ضربت کے بدلہ میں صرف ایک ہی ضربت لگانا۔ اس آدمی کے اعضاء قطع نہ کرنا کیونکہ میں نے رسول اکرمؐ کو یہ کہتے سنا ہے: خبردار! کسی کے اعضاء قطع مت کرنا، خواہ وہ کاٹنے والا کتا ہی کیوں نہ ہو۔

ابو منصور ثعالبی کی الاعجاز والایجاز میں ہے کہ آپ نے امام حسینؑ کو یوں وصیت فرمائی: "اے بیٹے وہ برائی برائی نہیں جس کے بعد جنت حاصل ہو جائے اور وہ اچھائی اچھائی نہیں جس کے بعد نار جہنم ملے۔ جنت کے علاوہ ہر نعمت وقتی ہے اور جہنم کے علاوہ ہر مصیبت عافیت ہے۔ میرے بیٹے! جان رکھو کہ جو کوئی اپنے عیب دیکھتا رہتا ہے وہ دوسروں سے بے نیاز رہتا ہے۔ جو کوئی اللہ کے دیے ہوئے پر مطمئن رہتا ہے، وہ کسی چیز کے نہ ملنے پر رنجیدہ نہیں ہوتا۔ جو بغاوت میں تلوار اٹھاتا ہے وہ اسی سے قتل ہو جاتا ہے۔ جو کوئی اپنے بھائی کے لیے گڑھا کھودتا ہے، خود اسی میں گر پڑتا ہے۔ جو کوئی دوسرے کا پردہ چاک کرتا ہے، وہ اپنے ہی گھر کی پوشیدگی لوگوں پر ظاہر کر دیتا ہے۔ جو اپنی خطاؤں کو بھول جاتا ہے وہ دوسروں کی خطاؤں کو بڑا سمجھتا ہے۔ جو مشکلوں سے دب جاتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ جو سمندر میں پھاند پڑتا ہے، وہ ڈوب جاتا ہے۔ جو اپنی رائے کو بہتر سمجھتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ جو عقل سے کام نہ لے وہ ذلت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ جو دوسروں پر بڑائی جتاتا ہے وہ خود ہی خوار ہوتا ہے۔ جو دوسروں کو گالی دیگا وہ خود بھی گالی کھائیگا۔ جو برائی کے مقامات پر جائیگا وہ بدنام ہو جائے گا۔ جو کمینوں سے ملے جلے گا وہ حقیر ہو جائے گا۔ جو علماء کی صحبت اختیار کرے گا وہ عزت پائے گا۔"

"اے بیٹے! انسان کی خود پسندی عقل کی کمزوری کی پہچان ہے۔ تم اپنے آپ کو اس چیز سے بچائے رکھو جو تم دوسرے میں ناپسند کرتے ہو۔ تمہارے بھائیوں کے تمہارے اوپر وہی حقوق ہیں جو تمہارے ان کے اوپر ہیں۔"

اس کے علاوہ امیرالمومنینؑ کی دی ہوئی اور نصیحتیں اور ہدایات ہیں جو حدیث

اور تاریخ کی دوسری کتابوں میں ملتی ہیں۔

امام حسینؑ اپنے بھائی امام حسنؑ کے ساتھ

امیرالمومنینؑ نے اپنے بیٹے حسنؑ کو امامت کا منصب تفویض فرمایا اور تبرکات نبوت ان کے سپرد کر دیے۔ نیز امام حسینؑ اور اپنے دوسرے بیٹوں کو ان کی اطاعت کرنے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ امام حسینؑ ان تمام معاملات میں جو ان کے بھائی حسنؑ کو درپیش ہوئے، ان کے ساتھ رہے۔ دونوں بھائیوں میں ان تمام تدبیروں کے بارے میں مکمل اتفاق رائے رہا جو امام حسنؑ نے اہل عراق کی کنارہ کشی، معاویہ کی چالوں اور جاسوسی کی کارروائیوں کے مقابلہ میں اختیار فرمائیں کیونکہ لشکرِ عراق کی اکثریت، معاویہ بن ابی سفیان اور ان کی ہمنوا جماعت کے زیرِ تصرف تھی۔ یہ بات امام ابوعبداللہ حسینؑ سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ امام حسنؑ معاویہ سے جنگ کرتے تو نتیجہ معاویہ کے حق میں ہوتا۔ ہاں وہ جنگ اس طرح ختم ہوتی کہ امام حسنؑ، امام حسینؑ دیگر بنی ہاشم اور ان کے پرخلوص ساتھی قتل ہو جاتے یا قیدی بنا لیے جاتے۔ جیسا کہ امام حسنؑ کی مختصر سی مدت خلافت کے ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے، جن کا ذکر ہم امام حسنؑ کی سیرت میں کر کے یہ واضح کر چکے ہیں کہ امام حسنؑ کے موقف پر کسی طرح کا شک کرنے یا آپ پہ کوئی الزام لگانے کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں، ابن کثیر نے البدایہ و النہایہ میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں، اس بارے میں جو روایات بیان کی ہیں کہ امام حسنؑ نے معاویہ کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، امام حسینؑ اس کو پسند نہ فرماتے تھے جیسا کہ اُسد الغابہ میں ہے کہ امام حسینؑ نے امام حسنؑ سے فرمایا: میں آپ کو اللہ کی قسم دلاتا ہوں کہ آپ معاویہ کی بات کی تصدیق اور اپنے والد بزرگوار کی بات کی تکذیب نہ فرمایئے۔ اس پہ امام حسنؑ نے ان سے فرمایا کہ تم چپ رہو۔ میں اس معاملے کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں یا ابن اثیر نے البدایہ والنہایہ میں بیان کیا ہے کہ امام حسنؑ نے فرمایا: میرا ارادہ ہے کہ میں تم کو ایک مکان میں نظر بند کر دوں تا اینکہ میں یہ کام اپنے طور پر انجام دے کر فارغ ہو جاؤں۔ اس کے بعد تم کو وہاں سے باہر نکالوں۔ نیز ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ امام حسنؑ نے ان سے فرمایا: قسم بخدا جب بھی میں کسی کام کا ارادہ کرتا ہوں

تم اس کی مخالفت کرنے لگتے ہو۔ اسی طرح وہ تمام واقعات اور پیچیدگیاں کہ جو امام حسنؑ کے موقف پر اثر انداز ہوئیں اور جن کو ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں، ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان روایات کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔ علاوہ بریں امام حسینؑ ان سب معاملات اور ان کے اسباب پر اس زمانے کے ان نمایاں افراد سے کہیں زیادہ وسعت فکر و نظر کے حامل تھے جو امام حسنؑ کے اس عاقلانہ موقف کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار باقی نہیں رہا تھا۔ پھر امام حسینؑ کی شان تو یقیناً اس سے بلند تھی کہ ان سے اپنے بھائی کے افعال کی وہ مصلحت مخفی رہتی جسے دوسرے افراد بخوبی سمجھ رہے تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے ان دونوں اماموں کے مابین اختلاف کا افسانہ تیار کیا، میرے خیال میں وہ یہ چاہتے تھے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک پر کوئی نہ کوئی الزام ضرور تھوپ دیں، خواہ وہ غلط ہی ہو کیونکہ وہ لوگ ان دونوں بھائیوں کی مشکلات اور حادثات میں گھری ہوئی، مگر بے عیب زندگی میں کوئی فکری خامی یا کوئی عملی غلطی نکالنے سے قاصر رہے تھے تاہم اپنے بھائی کے موقف سے امام حسینؑ کے اختلاف کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور غلطی پر تھا یعنی جب ایک کی رائے اور طریقۂ عمل دوسرے کی رائے اور طریقۂ عمل سے مختلف ہو تو پھر یہ بات قرین عقل نہیں ہے کہ وہ دونوں ہی صحیح ہوں۔

جن لوگوں نے ان دونوں اماموں کے مابین اختلاف کا افسانہ گھڑا اور اپنے بھائی کے متعلق اس موقف کو امام حسینؑ سے منسوب کیا۔ شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ صرف آپ ہی کو غلطی پر قرار دیں۔ وہ اس دلیل سے کہ جو کچھ امام حسنؑ نے کیا وہ مسلمانوں کی بھلائی کے لیے تھا اور اس سے رسول اکرمؐ کے اس قول کی تصدیق ہوتی تھی، جسے ابوبکر نے روایت کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: بے شک یہ (حسنؑ) سردار ہے اور خدا اس کے ذریعے سے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کروا دے گا۔ پس ان لوگوں کے خیال کے مطابق اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نہ تو حسینؑ اپنے بھائی کے عہد میں صحیح موقف پر تھے اور نہ وہ اپنی انقلابی تحریک میں صحیح موقف پر تھے۔ گویا کہ ان لوگوں کے خیال کے مطابق، آپ مسلمانوں کی مصلحت کو سمجھ پانے سے قاصر رہے تھے۔

بہرحال میری رائے یہ ہے اور دسیوں ثبوت اس کی تائید کرتے ہیں کہ یہ دونوں امام

تمام معاملات اور ان کے نتائج کے متعلق اپنی فکر و نظر میں پوری طرح متحد تھے۔ البتہ لوگوں نے امام حسینؑ سے بھی اسی طرح کی باتیں منسوب کیں جس طرح امام حسنؑ سے منسوب کی تھیں۔ جیسے یہ کہ وہ اپنے والد بزرگوار کی خلافت سے قبل اور اس کے دوران میں بہت سے سیاسی معاملات میں ان سے اختلاف رکھتے تھے، بلکہ بعض لوگ تو اس پر یہ اضافہ بھی کرنے لگے کہ وہ عثمانی مسلک پر تھے۔ مزید برآں لوگوں نے ان کو اپنے والد بزرگوار سے اس طرح پیش آتے ہوئے دکھایا ہے جس طرح کسی کے لیے بھی اپنے باپ سے پیش آنا مناسب نہیں ہو سکتا۔ لوگوں نے اس بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، ہم قبل ازیں اس کو امام حسنؑ کے حالات میں بیان کر چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ یہ باتیں امویوں کی گھڑی ہوئی ہیں کیونکہ امام حسنؑ اپنے پدر بزرگوار کے سیاسی طرزِ عمل سے پوری طرح متفق تھے اور وہ تمام مراحل کہ جن سے وہ گزرتے رہے، ان میں آپ نے کسی بھی مرحلہ میں اپنے والد بزرگوار کی مخالفت نہیں کی۔

غزوۂ قسطنطنیہ بعض مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں نے معاویہ بن ابی سفیان کے عہد خلافت میں یزید بن معاویہ کی قیادت میں ۴۹ھ ہجری اور ۵۰ھ میں دو مرتبہ فوج کشی کی۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ دوسرے حملے میں ابوایوب انصاری اور حسینؑ بن علیؑ بھی شریک تھے۔ "تاریخ ابن کثیر" میں لکھا ہے کہ حسینؑ اپنے بھائی کی وفات کے بعد معاویہ کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایسا اتفاق ہوا کہ ۵۱ھ میں جب آپ ان کے پاس تشریف لے گئے تو یزید بن معاویہ کی قیادت میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے لشکر میں شامل ہو گئے۔ اپنی تاریخ کی چوتھی جلد میں علی بن حسین بن عساکر نے بھی اس بیان کی تائید کی ہے۔

تاہم تحقیق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابن عساکر اور ابن کثیر کے علاوہ کسی اور مؤرخ نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ ابن جریر طبری نے تو اپنی تاریخ میں صرف ایک یعنی ۴۹ھ کی فوج کشی کا حال لکھا ہے جس میں ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر اور ابوایوب انصاری کی شرکت بتائی ہے لیکن ان کے ساتھ امام حسینؑ کا نام نہیں۔ پھر جس کسی نے بھی اس زمانے میں مسلمانوں کی فوج کشیوں کا تذکرہ کیا ہے، اس نے اس میں امام حسینؑ کی شرکت کا ذکر نہیں کیا۔

اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ ابوایوب انصاری نے اسی فوجی مہم کے دوران انتقال کیا اور ان کی وصیت کے مطابق ان کو وہیں دفن کر دیا گیا تھا۔ جب سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو انھوں نے ہر کام سے پہلے ان کی قبر پر نہایت عمدہ عمارت بنوائی۔ پھر سلاطین عثمانیہ کا یہ معمول رہا کہ جو بھی حکومت سنبھالتا وہ ازراہ برکت اپنی شمشیر بندی اور تاجپوشی کی رسم ابوایوب انصاری کے مزار پر ادا کرتا تھا۔

بعض عرب اور غیر عرب مورخین کا کہنا ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں نے رومیوں کے ساتھ لڑنے کے لیے ایک ہوائی جہاز بھی بنایا تھا لیکن، جب ایک ہوا باز اس کو لیکر فضا میں گیا تو وہ جہاز گر پڑا اور پاش پاش ہو گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ پہلے بزنطیہ کے گورنر نے قسطنطنیہ سے ہوائی جہاز لیا اور عرب لشکر کے خلاف استعمال کیا جس نے وہاں کا محاصرہ کیا تھا۔ جب عرب اس کی ساخت سے واقف ہو گئے تو انھوں نے بھی ویسا ہی جہاز بنایا اور اس پر پرواز کی لیکن جب اس نے کچھ مسافت طے کی اور قریب تھا کہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے عین اس وقت وہ بحیرۂ باسفورس میں گر کر تباہ ہو گیا۔

بہرحال تاریخی مصادر نے جنگ قسطنطنیہ میں امام حسینؑ کی شرکت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ بات قابل قبول بھی ہے لیکن اس لیے نہیں کہ اس کی سالاری یزید کر رہا تھا اور اس کا منصوبہ تیار کرنے والے معاویہ تھے۔ جیسا کہ کچھ شیعہ اور غیر شیعہ افراد کا خیال ہے جو اہلبیتؑ کرامؑ کی صحیح حیثیت کو سمجھتے ہی نہیں ہیں، کیونکہ سالار خواہ صالح ہو یا فاسد اہلبیتؑ اسلام کی راہ میں لڑنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ جیسا کہ ان کی تاریخ سے واضح ہے جو اسلام کی راہ میں قربانیوں سے بھری پڑی ہے۔ بہرحال جنگ قسطنطنیہ میں امام حسینؑ کی عدم شرکت اس لیے قابل تسلیم ہے کہ آپ معاویہ سے زیادہ روابط نہیں رکھتے تھے۔ نیز معاویہ کے عہد میں آپ کا شام تشریف لے جانا ثابت ہی نہیں ہے۔ اگر ایک ایسی فوج جس کی قیادت یزید کر رہا تھا، امام حسینؑ نے اس میں ایک لشکری کی حیثیت سے شرکت کی ہوتی تو اموی افراد اپنے تمام وسائل سے کام لیکر اس کو اتنی شہرت دیتے۔ یہ معاملہ کسی مورخ سے پوشیدہ نہ رہ پاتا۔

امام حسینؑ اور معاویہ کے اہلکار

بعض مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ امام حسینؑ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک قطعۂ زمین کے بارے میں تنازعہ پیدا ہوگیا۔ وہ اس وقت اپنے چچا معاویہ بن ابی سفیان کی طرف سے مدینہ کا گورنر تھا۔ ولید نے امام حسینؑ کے خلاف چال چلی اور اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس پر امام حسینؑ نے اس سے کہا: قسم بخدا! یا تو تم میرے حق کے بارے میں انصاف سے کام لو ورنہ میں تلوار لے کر مسجد رسولؐ میں کھڑا ہو جاؤں گا اور حلف الفضول کا سہارا طلب کروں گا۔ تب عبداللہ بن زبیر بھی جو وہاں موجود تھے، بولے کہ میں بھی خدا سے عہد کرتا ہوں کہ اگر انہوں نے حلف الفضول کا سہارا طلب کیا تو میں بھی اپنی تلوار لیکر ان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوں گا تا اینکہ ان کے حق کے بارے میں انصاف کیا جائے یا ہم دونوں ایک ساتھ مر جائیں۔ جب ان دونوں کی گفتگو مسور بن مخرمہ زہری تک پہنچی تو انھوں نے بھی یہی کہا۔ پھر یہ بات عبدالرحمان بن عثمان تیمی تک پہنچی تو انھوں نے بھی ویسا ہی عہد کیا۔ جب ولید بن عتبہ کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے امام حسینؑ کے ساتھ انصاف کیا اور آپ کی زمین آپ کو واپس کر دی۔

شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید میں ہے کہ معاویہ اور امام حسینؑ کے مابین حجاز میں واقع ایک زمین کی بابت تنازعہ ہو گیا۔ اس پر امام حسینؑ نے معاویہ سے کہا کہ یہ زمین تم مجھ سے خرید لو یا مجھ کو واپس دیدو یا اس کے لیے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر میں سے کسی ایک کو ثالث بناؤ، ورنہ چوتھی صورت تو "صیلم" ہی رہ جاتی ہے۔ معاویہ نے پوچھا کہ صیلم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں حلف الفضول کا سہارا لوں گا۔ اس کے بعد آپ غصے میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ عبداللہ بن زبیر کے پاس سے گزرے تو ان کو معاویہ کے ساتھ اپنی یہ گفتگو سنائی۔ اس پر ابن زبیر بولے: قسم بخدا! اگر آپ نے حلف الفضول کا سہارا لیا تو پھر میں لیٹا ہوں گا تو اٹھ جاؤں گا، بیٹھا ہونگا تو کھڑا ہو جاؤں گا، کھڑا ہوں گا تو چل پڑوں گا، چل رہا ہوں گا تو دوڑ پڑونگا تا اینکہ میری روح آپ کی روح سے متصل ہو جائے۔ جب معاویہ کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو

انہوں نے کہا : ہم کو "صیلم" کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تب انہوں نے امام حسینؑ کو کہلا بھیجا کہ آپ اپنی رقم لے جائیے کیونکہ ہم نے وہ زمین آپ سے خرید لی ہے۔

یہ حلف الفضول جاہلی دور کا وہ عہدنامہ تھا جو قریش کے چند قبیلوں نے ظلم و جور کو مٹانے کے لیے مرتب کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہو کر باہم عہد کیا تھا کہ جب کبھی وہ لوگ مکہ میں کسی پر ظلم ہوتا ہوا پائیں گے تو اس سے ظلم کو دور کریں گے اور ہمیشہ حقدار کی طرفداری کریں گے۔

نبی اکرمؐ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا : میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں معاہدہ کے وقت حاضر رہا ہوں۔ اگر مجھ کو ایسے ہی کسی معاہدہ کی طرف بلایا جائے تو میں اس بلاوے کو ضرور قبول کروں گا۔ آنحضرتؐ نے یہ اس لیے فرمایا کہ اس معاہدے کے مقاصد اسلام سے قریب تر ہیں کیونکہ اسلام بھی حق کی طرف داری اور مظلوموں اور پسماندہ افراد کی حمایت کی دعوت دیتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس معاہدے کو یہ نام دینے کا سبب یہ تھا کہ مکہ کے جن چند ممتاز افراد نے ظلم کو مٹانے کا عہد کیا تھا، ان کے نام فضیل، فضال اور مفضل تھے۔ اس بنا پر یہ عہدنامہ حلف الفضول کے نام سے معروف ہو گیا۔

امام حسینؑ کی سخاوت و عبادت

امام حسینؑ کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ آپ مہمان کی عزت فرماتے، سائل کو دریا دلی سے نوازتے، رشتہ ونانے کا خیال فرماتے، نادار کو عطا فرماتے، مانگنے والے کی ضرورت پوری فرماتے، بے لباس کو لباس دیتے، بھوکے کو کھانا کھلاتے، مقروض کی امداد فرماتے، یتیم پر شفقت فرماتے اور حاجتمندوں کی اعانت فرماتے تھے۔ جیسے ہی ان کے پاس کوئی رقم آتی وہ اس کو خرچ کر ڈالتے تھے۔[1]

راویوں نے ایک بڑھیا کا واقعہ بیان کیا ہے جو امام حسینؑ، آپ کے بھائی امام حسنؑ اور عبداللہ بن جعفر کے ساتھ پیش آیا تھا، جبکہ یہ تینوں بھائی مکہ کے راستے میں تھے تب اس بڑھیا نے ایک بکری ذبح کی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد آپ نے اس کو مدینے میں دیکھا کہ

---

[1] محمد بن طلحہ شافعی۔ کتاب مناقب باب ۷

وہ ناداری اور تنگی سے خستہ حال تھی۔ امام حسنؑ نے اس کو ایک ہزار بکریاں اور ایک ہزار دینار عطا فرمائے۔ اسی طرح امام حسینؑ اور عبداللہ بن جعفر نے بھی اس کو اتنا ہی دیا۔ چنانچہ وہ تین ہزار بکریاں اور تین ہزار دینار لیکر اپنے شوہر کے ہمراہ وطن واپس ہوئی۔

کتاب عقد اللآلی میں ہے کہ امام حسینؑ اپنے بھائی امام حسنؑ کی وفات کے بعد ایکبار مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ دوسری جانب عبداللہ بن زبیر اور عتبہ بن ابی سفیان بھی بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک اعرابی ناقہ پر آیا اور اس کو مسجد کے دروازے پر باندھ کر اندر آ گیا۔ اس نے عتبہ کو سلام کیا اور اس نے سلام کا جواب دیا۔ تب اعرابی نے اس سے کہا۔ میں نے اپنے ابن عم کو قتل کر دیا ہے اور اب اس کے وارث مجھ سے دیت (خون بہا) طلب کر رہے ہیں۔ کیا اس کے لیے تم مجھ کو کچھ دے سکتے ہو؟ اس پر عتبہ نے اپنے غلام کی طرف دیکھا اور کہا کہ اس کو سو درہم دیدو لیکن اعرابی نے ان کے لینے سے انکار کر دیا اور عبداللہ بن زبیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر ان سے بھی وہی کہا جو عتبہ سے کہا۔ اس نے اس کو دو سو درہم دیے جانے کا حکم دیا لیکن اس نے ان کے لینے سے بھی انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ اتنی رقم سے میرا کچھ نہیں بنے گا۔ اب وہ امام حسینؑ کی طرف گیا اور سلام کے بعد اپنی ضرورت بیان کی۔ آپ نے اس سے فرمایا: ہم لوگ کسی کو اس کے درجۂ معرفت کے لحاظ سے دیا کرتے ہیں۔ اس نے کہا: آپ جو بھی مناسب سمجھتے ہوں وہ مجھ سے پوچھ لیجیے۔ تب امام حسینؑ نے اس سے دریافت فرمایا: اے اعرابی! ہلاکت سے کس طرح بچاؤ ہو سکتا ہے؟ اس نے جواب دیا اللہ پر توکل کرنے سے۔ پھر آپ نے فرمایا: کونسا عمل سب سے بہتر ہے؟ اس نے کہا: اللہ پر اعتماد۔ تب امامؑ نے اس سے پوچھا: ایک بندے کی زندگی میں کون سی شے بہترین ہے؟ اس نے جواب دیا وہ علم جس کیساتھ بردباری بھی ہو۔ آپ نے کہا: اگر کسی میں یہ نہ ہو؟ اس نے کہا: پھر وہ مال جسکے ساتھ سخاوت اور کشادگی ہو۔ آپ نے فرمایا: اگر کسی میں یہ بھی نہ ہو۔ اس پر وہ بولا کہ پھر ایسے شخص کیلئے زندگی اور بقا کے بجائے مرنا اور دفنا ہو جانا بہتر ہے۔ امامؑ اسی طرح اس سے سوال فرماتے رہے اور وہ شخص جواب دیتا رہا تا اینکہ امامؑ نے اسکے علم و معرفت پر اظہار تعجب کرتے ہوئے اپنے کارندے کو حکم دیا کہ اس کو بیس ہزار دینار دیدو۔ نیز اس اعرابی سے فرمایا کہ اس میں سے دس ہزار خون بہا کی ادائیگی کے لیے اور دس ہزار

تمہارے اہل و عیال کے خرچ کے لیے ہیں۔ اس پر اعرابی یہ اشعار پڑھنے لگا:

"نہ تو مجھے کوئی اعلیٰ مقام حاصل ہوا ہے، نہ ہی چاہنے والے سے ملاقات ہوئی ہے۔ پھر بھی میں خوش ہوں، لیکن مجھ کو کسی اچھی خوشبو نے فرحت بخشی ہے، بلکہ میں آل رسولؐ کی بدولت خوشی سے ہمکنار ہوا ہوں۔ اب مجھ کو شعر و سخن میں بھی لطف آرہا ہے۔ یہی حضرات صاحبانِ عزّت ہیں، اور یہی صاحبانِ نجابت۔ ہاں! آسمان کے ستارے انہی سے چمک حاصل کرتے ہیں۔ یا حسینؑ! آپ عزت کی بلندیوں میں تمام انسانوں سے آگے نکل گئے ہیں۔ پھر آپ ایسے سخی ہیں کہ کوئی آپ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ آپ کے والد بزرگوار، امام علیؑ فضائل میں سب سے اعلیٰ تھے، کیونکہ آگے بڑھنے والے ان سے آگے بڑھنے میں ناکام ہوگئے تھے۔ ان کے ذریعے سے اللہ نے ہدایت کا دروازہ کھولا۔ یا حسین! اپنے والد کے بعد اب آپ ہی وہ امام ہیں جن کے ذریعے سے فساد کا دروازہ بند ہوا۔"

تاریخ ابن عساکر میں ہے کہ ایک سائل مدینے کی گلیوں میں پھرتا رہا، یہاں تک کہ امام حسینؑ کے در پر پہنچ گیا۔ اس نے آپ کا دروازہ کھٹکھٹا کر یہ اشعار پڑھے:

یا حسینؑ! جس کسی نے آپ سے امید لگائی اور آپ کے دروازہ کی زنجیر ہلائی وہ مایوس نہیں ہوا۔ آپ صاحبِ سخاوت ہیں، بلکہ سخاوت کا مرکز، جبکہ آپ کے والد بزرگوار ہی، فاسقوں کو قتل کرنیوالے تھے۔

اس وقت امام حسینؑ نماز ادا فرما رہے تھے۔ چنانچہ آپ نماز کو مختصر کرکے اس اعرابی سائل کے پاس تشریف لائے اور اس کے چہرے پر تکلیف اور فاقہ کے آثار ملاحظہ فرما کر واپس ہوگئے۔ آپ نے اپنے کارندے کو آواز دی۔ جب وہ دوڑتا ہوا آیا تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا: تمہارے پاس ہمارے خرچ میں سے کیا کچھ بچا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا: میرے پاس صرف دو سو درہم ہیں، جن کی بابت آپ نے فرمایا تھا کہ میں ان کو آپ کے عیال پر خرچ کروں۔ آپ نے حکم دیا، وہی لے آؤ کیونکہ اب وہ آگیا ہے جو ان سے زیادہ حقدار ہے۔ پس آپ نے وہ رقم لے کر اس اعرابی کو دیدی

اور یہ اشعار پڑھے :

یہ لے لو لیکن میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔ تاہم یقین کرو کہ میں تم
پر مہربان ہوں۔ اگر ہماری حالت کچھ بھی بہتر ہوتی تو ہم تمہارے اوپر
زر و مال کی بارش کر دیتے۔ مگر زمانہ بڑا پر آشوب ہے اور ہم تم کو بہت
کم دے سکے ہیں۔

اعرابی نے وہ دو سو دینار لیے اور یہ اشعار پڑھے :

یہ لوگ صاف دل ہیں اور ان کے دامن پاک ہیں۔ جب ان کا ذکر کیا
جائے تو ان پر درود بھیجا جاتا ہے۔ یا حسینؑ! آپ سب کے سب عالی مرتبہ
ہیں۔ آپ وہ ہیں جن کے پاس قرآن اور اس کی سورتوں کا علم ہے۔ جس
کسی کو علیؑ سے نسبت نہ ہو، اس کو لوگوں میں کوئی عزت حاصل نہیں ہو سکتی۔

ایک مرتبہ انصار میں سے ایک شخص اپنی حاجت پیش کرنے کے لیے آپ کے
پاس آیا۔ آپ نے اس سے فرمایا: اے انصاری بھائی! تم اپنے چہرے کو سوال کرنے کی
ذلت سے آلودہ نہ کرو بلکہ اپنی ضرورت ایک کاغذ پر لکھ دو۔ انشاء اللہ میں تم کو اتنا
دوں گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔ چنانچہ اس نے لکھا: فلاں شخص کے پانچ سو دینار
میرے ذمے ہیں اور وہ مجھ سے تقاضا کر رہا ہے۔ آپ اس سے فرما دیجیے کہ وہ میری
حالت بہتر ہونے تک انتظار کرے۔ جب امام حسینؑ نے یہ رقعہ پڑھا تو آپ اندر تشریف
لے گئے۔ پھر ایک ہزار دینار کی تھیلی لیکر برآمد ہوئے اور اس سے فرمایا: یہ ایک ہزار
دینار ہیں۔ ان میں سے پانچ سو دینار تمہارا قرض ادا کرنے کے لیے ہیں، بقایا پانچسو
سے تم اپنی خانگی ضروریات پوری کر لینا۔ اب سنو کہ تم اپنی حاجت ان تین آدمیوں یعنی
دیندار یا صاحب مروت یا عالی نسب کے علاوہ، کسی اور سے کبھی بیان نہ کرنا، کیونکہ دیندار
اپنے دین کی حفاظت کے لیے تمہاری مدد کرے گا۔ صاحب مروت کو اپنی مروت کے
باعث انکار کرنے میں غیرت محسوس ہو گی اور جو عالی نسب ہے وہ یہ سمجھے گا کہ تم کسی
حاجت کے لیے اپنی حرمت کو نہ گنواؤ گے۔ پس وہ تمہاری حرمت کو بچانے کے لیے
تمہاری حاجت پوری کرے گا۔

راویوں کا بیان ہے کہ جب اسامہ بن زید بیمار تھے تو ایک مرتبہ امام حسینؑ ان سے ملنے گئے۔ تب اسامہ کہہ رہے تھے: ہائے رے پریشانی۔ اس پر امام حسینؑ نے ان سے کہا: اے بھائی! آپ کو کیا پریشانی لاحق ہے؟ وہ بولے: میرا قرض کہ جو ساٹھ ہزار درہم ہے۔ امام حسینؑ نے ان سے فرمایا: بس وہ قرض میرے اوپر ہے۔ اسامہ کہنے لگے: میں ڈرتا ہوں، کہیں میں اس کے ادا ہونے سے پہلے ہی نہ مر جاؤں۔ اس پر آپ نے وہ قرض اسی وقت ادا فرما دیا۔

ابن صباغ مالکی کی کتاب فصول المہمہ میں انس بن مالک سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا: میں امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ کی ایک کنیز گلدستہ لیے ہوئے آئی۔ اس نے وہ گلدستہ آپ کو پیش کیا۔ پس آپ نے اس سے فرمایا: جاؤ! تم اللہ کے نام پر آزاد ہو۔ اس پر میں نے ان سے کہا: ایک کنیز پھولوں کا یہ گلدستہ لے کر آتی ہے اور آپ کو پیش کرتی ہے تو اسی پر آپ اسکو آزاد فرما رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اللہ نے ہم کو یہی سکھایا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا ۔ (سورۂ نساء۔ آیت ۸۶)

یعنی جب کوئی تم کو سلام کرے تو تم اس سے بہتر طریقے سے سلام کرو، یا وہی لفظ کہہ دو۔

وَاَحْسَنَ مِنْهَا عِتْقُهَا ۔ اور اس کو آزاد کر دینا اس کے تحفے سے ضرور بہتر ہے۔

امام حسینؑ کے کسی غلام نے ایک ایسا جرم کیا، جس پر قصاص کے ساتھ سزا بھی لازم تھی۔ پس آپ نے اس کو سزا دینے کا حکم دیا۔ اس پر اس نے کہا: اے میرے آقا! اللہ فرماتا ہے: وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ .... امام علیہ السلام نے فرمایا: اسکو چھوڑ دو۔ میں نے اپنا غصہ فرو کر لیا۔ پھر اس نے کہا: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۔ اس پر امام نے فرمایا: میں نے تم کو معاف کیا۔ اب اس نے کہا: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۳۴)۔ پس امام نے فرمایا: جاؤ! تم اللہ کے نام پر آزاد ہو۔ پھر آپ نے اس کو اتنا دیا جو اس کو زندگی بھر کے لیے کافی ہو۔ تاریخ ابن عساکر میں ہے کہ

آپ کے پاس بصرہ وغیرہ سے مال آتا تھا تو آپ اپنے مقام سے اس وقت تک نہ ہٹتے جب تک وہ پورے کا پورا محتاجوں پر تقسیم نہ فرما دیتے۔

ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں لکھا ہے کہ معاویہ اپنے کسی سفر حجاز میں مدینہ بھی گئے۔ تب انھوں نے امام حسنؑ، امام حسینؑ، عبداللہ بن جعفرؓ، ابن زبیرؓ، عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ بن صفوان کو کپڑوں، خوشبوؤں اور بڑی بڑی رقموں کے تحفے بھیجے۔ انھوں نے اپنے قاصدوں کو حکم دیا: تم میں سے ہر ایک جو کچھ وہاں دیکھے اور سنے اس کو یاد رکھے۔ جب وہ قاصد روانہ ہو گئے تو معاویہ نے اپنے مصاحبین سے کہا: اگر تم چاہو تو میں تمھیں بتا دوں کہ وہ لوگ کیا کیا کریں گے۔ لوگوں نے کہا: ہاں! ہمیں ضرور بتائیے کہ آپ کا کیا خیال ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ حسنؑ خوشبوؤں میں سے کچھ اپنی بیویوں کو دیدیں گے، باقی اپنی صحبت میں موجود لوگوں میں تقسیم کر دیں گے اور کسی غیر موجود کا انتظار نہ کریں گے۔ حسینؑ ان لوگوں کے یتیم بچوں سے ابتداء کریں گے جو ان کے والد کے ساتھ صفین کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ اگر ان سے کچھ بچ رہا تو اس سے لوگوں کو دودھ پلائیں گے اور ان کے لیے اونٹ ذبح کریں گے۔ عبداللہ بن جعفر کہیں گے کہ اے بدیح! پہلے تو اس سے میرا قرض ادا کرو، پھر باقیماندہ سے میرے دشمنوں کو نمٹ لو۔ عبداللہ بن عمرؓ، عدی بن کعب کے محتاجوں سے ابتداء کرینگے۔ باقی اپنے اہل و عیال کی ضروریات کے لیے رکھ چھوڑیں گے۔ عبداللہ بن زبیر کے پاس جب میرا آدمی پہنچے گا تو وہ تسبیح پڑھتے ہوں گے اور اس کی طرف توجہ نہ کرینگے۔ جب وہ دوبارہ ان کے پاس جائے گا تو اپنے غلاموں سے کہیں گے: جو کچھ معاویہ نے بھیجا ہے وہ ان کے قاصد سے لے لو۔ اللہ ان کی نظر التفات کو قائم رکھے اور ان کو جزائے خیر دے۔ تاہم وہ ان چیزوں کی طرف توجہ نہ دیں گے۔ حالانکہ وہ ان کی نظر میں ہر چیز سے بڑھ کر ہوں گی۔ اس کے بعد وہ ان چیزوں کو اپنے اہل و عیال میں جا کر دیکھیں گے اور کہیں گے: تم ان کو سنبھال لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہ ابن ہند کو لوٹا دوں۔ عبداللہ بن صفوان کہیں گے: زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی سہی۔ معاویہ قریش کے جن افراد کو اس طرح چیزیں بھیجتے ہیں وہ ان کو واپس نہیں کرتے۔ اگر وہ واپس

کریں بھی تو ہم ضرور قبول کریں گے۔ چنانچہ معاویہ کے بھیجے ہوئے آدمیوں نے واپس آکر وہی کچھ بیان کیا، جو معاویہ نے کہا تھا۔ یہ سن کر معاویہ بولے: میں ہند کا بیٹا ہوں اس لیے قریش کو خوب جانتا ہوں۔

راویوں نے آپ کے جود و کرم کی ایسی اور بھی مثالیں بیان کی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر روایات مرسل ہیں، جن کے راویوں کا سلسلہ قائم نہیں رہتا اور وہ جانچنے پر صحیح ثابت نہیں ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض ان لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں جو اس قسم کی داستانوں سے لوگوں کے جذبات کو متاثر کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ یہ آخری روایت مرسل ہونے کے علاوہ ایسی ہے جس کا متن ہی یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ یہ بنی امیہ کے حامیوں نے اس لیے گھڑی ہے کہ وہ اس سے معاویہ کی زیرکی اور فراست کی ہمہ گیری ثابت کریں اور امام حسنؑ کو اس طرح پیش کریں کہ وہ عورتوں کے علاوہ کسی اور چیز سے سروکار ہی نہ رکھتے تھے۔

تمام مستند تاریخیں اس امر پر زور دیتی ہیں کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ اپنا کل کا کل مال اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے تھے کیونکہ وہ محتاجوں اور ناداروں کو خود اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے۔ وہ معاویہ کے عطیات اس لیے قبول فرما لیتے تھے کہ وہ سب انہی کا حق تھا۔ جس کے وہ خود معاویہ اور ایسے ہی دوسرے لوگوں سے زیادہ حقدار تھے جنھوں نے خلافت پر قبضہ کرکے امت پر تسلط حاصل کر لیا تھا اور اس کی آمدنی کو ابن عاص اور ابن شعبہ جیسے حامی، پیرو اور قریبی لوگوں کو خریدنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

حضرات حسنینؑ، معاویہ کے عطیات اس لیے قبول فرما لیتے تھے تاکہ وہ ان کو اس مال کے صحیح حقداروں تک پہنچا دیں جو نادار اور محتاج تھے۔ پس ان دونوں بھائیوں کی ساری زندگی اللہ کے لیے اور اللہ کی راہ میں کام آنے کے لیے تھی۔ چنانچہ راویوں اور مؤرخوں میں یہ امر عام طور پر مشہور تھا کہ امام حسینؑ ہر سال اپنی دولت کا نصف حصہ ناداروں، محتاجوں اور یتیموں پر خرچ کرتے اور نصف اپنے عیال پر صرف کرتے تھے۔

بعض روایات میں ہے کہ کبھی کبھی آپ اپنا سارا مال غریبوں پر خرچ کر ڈالتے تھے۔ یہی حال امام حسینؑ کا تھا کہ آپ کبھی دولت جمع نہ فرماتے اور نہ مال کا حساب رکھتے تھے۔ اس امر کے متعلق متواتر روایات آئی ہیں کہ آپ نے پچیس حج پا پیادہ چل کر فرمائے جبکہ سواریاں آپ کے آگے آگے چلتی رہتی تھیں۔ جب کبھی آپ یا آپ کے بھائی حسنؑ کسی سوار کے پاس سے گزرتے، تو وہ بھی اپنی سواری سے اتر کر آپ دونوں کے ساتھ پیدل چلنے لگتا تھا۔ ان کا یہ عمل بہت سے لوگوں پر شاق گزرتا تھا۔ چنانچہ حاجیوں کے ایک وفد نے سعد بن ابی وقاص کے پاس آکر کہا: پیدل چلنا ہم پر بہت شاق ہو رہا ہے لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ رسول اکرمؐ کے بیٹے تو پیدل ہوں اور ہم سواری پر ہوں۔ تب سعد نے آپ دونوں بھائیوں سے عرض کیا کہ لوگوں کے لیے پا پیادہ چلنا دوبھر ہو رہا ہے، کیونکہ جب آپ دونوں پیدل چل رہے ہوں تو کوئی بھی مسلمان سوار ہو نا گوارا نہیں کر سکتا۔ پس آپ عوام کی رعایت کے خیال سے سواری استعمال فرمائیے۔ حسنینؑ نے جواب دیا کہ ہم دونوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ یہ راستا پیدل ہی طے کریں گے، البتہ ہم راستا تبدیل کیے لیتے ہیں۔ چنانچہ آپ دونوں ایک دوسرے راستا سے تشریف لے گئے، جو ایسا غیر معروف تھا کہ کوئی ادھر سے آتا ہی نہ تھا۔

ابن عساکر نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو دیکھا کہ انھوں نے کعبہ میں جماعت کے ساتھ نماز عصر ادا فرمائی۔ پھر حجر اسود پر جاکر اس کو بوسہ دیا۔ سات مرتبہ طواف فرمایا اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ اتنے میں لوگوں نے ان دونوں کو اس طرح گھیر لیا کہ آپ آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔ البتہ ان کے ساتھ ایک اور صاحبِ حیثیت شخص بھی تھا۔ امام حسنؑ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ امام حسینؑ کے پاس سے لوگوں کو ہٹاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ان میں سے نکل آئے۔ جہاں کہیں بھی لوگ آپ کو دیکھ پاتے، آپ کے چاروں طرف حلقہ بنا لیتے۔ کوئی آپ سے دین کے کسی معاملہ میں حکم دریافت کرتا، کوئی فقہ کا نکتہ معلوم کرتا، کوئی آپ سے روایات سنتا اور کوئی اپنی حاجت پیش کرتا تھا۔ معاویہ نے آپ کے متعلق کسی سے کہا تھا: میں جب مسجدِ رسولؐ میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک حلقہ ہے، جس میں لوگ اس طرح دم بخود

بیٹھے ہیں جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ وہ ابو عبداللہ حسینؑ کا حلقہ درس تھا کہ جو اپنی آدھی پنڈلیوں تک قبا ڈالے ہوئے تھے اِس قدر مصروفیت کے باوجود وہ ایک دن رات میں ہزار رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔ جیسا کہ ابن عبدربہ کی کتاب العقد الفرید میں ہے: امام علیؑ بن حسینؑ سے پوچھا گیا کہ کیوں آپ کے والد بزرگوار کے بہت کم اولاد تھی؟ آپ نے جواب دیا کہ ان کے بچے کیسے پیدا ہوتے جبکہ دن رات میں ایک ہزار رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔ پھر عورتوں کے پاس جانے کا موقع ہی کہاں ہوتا تھا۔ آپ رات کی تاریکی میں اللہ سے یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! تو نے مجھ کو نعمتیں دیں لیکن میں تیرا شکر ادا نہ کر سکا۔ تو نے میری آزمائش کی تو میں صابر نہ رہ سکا لیکن میرے ترک شکر پر نہ تو نے اپنی نعمت کو مجھ سے چھینا اور نہ میرے ترک صبر پر تو نے مجھ پر سختی کو جاری رکھا۔ اے اللہ! کریم سے صرف کرم ہی ظاہر ہوتا ہے۔

ایام حج میں عرفات کے مقام پر امام حسینؑ کے اعمال اور مناجاتیں شیعہ محدثین میں بہت مشہور ہیں۔ ان موقعوں پر آپ پہاڑ کی بائیں جانب کھڑے ہو جاتے اور لوگ آپ کے چاروں طرف اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ یہ مناجاتیں ایسی ہیں کہ جو کوئی بھی ان کو پڑھے اور ان کے معانی و مقاصد پر غور کرے، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں گے۔

اے میرے اللہ اگر میں سارے زمانوں اور تمام صدیوں میں، بشرطیکہ میری عمر بھی اتنی ہو جائے، برابر کوشش میں لگا رہوں کہ تیری نعمتوں میں سے ایک کا شکر ادا کروں تو میں تیرے احسان کے بغیر ایسا نہیں کر سکوں گا لیکن یہ امر بجائے خود ایک اور شکر کے واجب ہونے کا باعث بن جائے گا۔ اے اللہ! مجھ کو ایسا ڈرنے والا بنا دے، گویا میں تجھ کو دیکھ رہا ہوں۔ میرے نفس میں سکون کا احساس، میرے دل میں یقین، میرے عمل میں خلوص، میری نظر میں نور اور میرے دین میں فہم پیدا کر دے۔

اے اللہ! اگر تو میری ایک حاجت پوری کر دے گا تو وہ حاجت جس کو تو پورا نہ کرے گا مجھ کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔ ایسے ہی اگر تو میری ایک حاجت پوری نہ کرے گا تو وہ حاجت جس کو تو پورا کرے گا مجھ کو فائدہ نہ پہنچائے گی۔ اے سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے میں تجھ سے نارِ جہنم سے نجات کا سوال کرتا ہوں۔

میرے اللہ! جس چیز سے میں ڈرتا ہوں، اس میں میری مدد کر، جس سے میں بچنا چاہتا ہوں اس سے مجھے بچالے۔ میرے نفس اور دین میں مجھ کو محفوظ رکھ، میرے سفر میں میری حفاظت فرما اور میرے عیال اور مال کو میرے بعد تک باقی رہنے دے۔ جو رزق تو نے مجھ کو دیا ہے اس میں برکت عطا کر۔ مجھے خود کو کمتر سمجھنے والا بنا دے لیکن لوگوں کی نظروں میں مجھ کو معزز قرار دے۔ مجھ کو جن و انس کے شر سے سلامت رکھ۔ میرے گناہوں کی وجہ سے مجھے رسوا نہ کر اور میری خطاؤں کے باعث مجھ کو ذلیل نہ کر، میرے عمل کو نظرانداز نہ کر، اپنی نعمتوں کو مجھ سے دور نہ کر۔ مجھے کسی غیراللہ پر بھروسہ نہ کرنے دے۔ اے اللہ تو مجھے کس پر بھروسہ کروائے گا؟ کیا ایسے رشتے دار پر جو رشتے کا خیال نہیں رکھتا یا ایسے غیر پر جو مجھ پر حملہ کرتا ہے یا ان پر جو مجھ سے بھی کمزور ہیں جبکہ میرا پالنے والا اور میرے معاملات کا مالک تو ہے۔ میں تجھ سے اپنی بے کسی کی، گھر کی دوری کی اور اس شخص کی شکایت کرتا ہوں جس کو تو نے میرے معاملات کا نگہدار بنایا ہے۔

اے وہ کہ جس کو میں نے مرض میں پکارا تو اس نے مجھ کو شفا دی، برہنگی میں پکارا تو اس نے مجھے لباس پہنایا۔ بھوک میں پکارا تو اس نے مجھ کو سیر کر دیا۔ پیاس میں پکارا تو اس نے پانی بہم پہنچایا۔ ذلت میں پکارا تو اس نے عزت بخشی۔ جہالت کی حالت میں پکارا تو اس نے علم عطا کیا۔ تنہا ہونے کی حالت میں پکارا تو اس نے مجھ کو کثرت عطا کی۔ میں سفر پر تھا تو مجھ کو واپس پہنچایا۔ میں نادار تھا تو مجھ کو دولت مند بنا دیا اور میں طالب نصرت تھا تو مجھ کو نصرت بہم پہنچائی۔

یہ بھی آپ کی مناجات میں سے ہے:

میرے اللہ! میں اپنی دولت مندی کے باوجود نادار ہوں، تو ناداری کی حالت میں کیونکر نادار نہ ہونگا۔ میں اپنے علم کے باوجود جاہل ہوں، تو جہل کی حالت میں کیسے جاہل نہ ہوں گا۔ میرے اللہ میں ملامت کے لائق ہوں لیکن تو تکریم کے لائق ہے۔ میرے اللہ جب مجھ کو میرے قابل ملامت اعمال نے گونگا بنا دیا تو تیرے عفو نے مجھ کو بولنے کا یارا دیدیا۔ جب میرے گناہوں نے مجھ کو مایوس کر دیا تو تیرے کرم نے مجھ کو بولنے کے قابل بنا دیا۔

راوی مزید کہتا ہے کہ لوگ آپ کے چاروں طرف جمع ہو کر آپ کی مناجات سنتے اور آپ کی دعا پر آمین کہتے رہتے۔ راوی کا کہنا ہے کہ آپ کے رونے کے ساتھ وہ لوگ بھی اپنے لیے یہ دعا کر کے روتے تھے: میرے اللہ! تیرے لیے ایسی چیز سے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جو خود اپنے وجود میں تیری محتاج ہو۔ کیا تیرے علاوہ کسی اور کا کوئی ایسا ظہور ہو سکتا ہے جو تیرے لیے نہ ہو؟ تاکہ جب تو سامنے نہ ہو تو وہ تیرا مظہر بن سکے یا ایسی دلیل کی ضرورت پڑ جائے جو تجھ تک پہنچا سکے، لیکن تو دور ہی کب ہوتا ہے کہ نشانیاں تجھ تک پہنچائیں۔ اندھی ہے وہ آنکھ جو یہ نہ دیکھ سکے کہ تو برابر اس کو دیکھ رہا ہے۔ گھاٹے کا سودا ہے اس بندے کا جو اپنی محبت میں سے کوئی حصہ تیرے لیے قرار نہ دے سکے۔ اسی طرح کے بہت سے جملے ہیں جن سے انسان کو دنیا اور آخرت دونوں کے لیے اچھے سبق حاصل ہوتے ہیں۔

امام حسینؑ نے اپنے کچھ صحابیوں کو ہدایت کرتے ہوئے فرمایا: ایسا کام مت کرو جو تمہاری طاقت سے باہر ہو۔ جو بات سمجھتے نہیں ہو اس کو بیان نہ کرو۔ جس پر قدرت نہ ہو اس کا وعدہ نہ کرو۔ جس قدر ضرورت ہو اس سے زیادہ خرچ نہ کرو۔ تم نے جتنا حسن سلوک کیا ہو اس سے زیادہ کسی سے توقع نہ کرو۔ تم نے اللہ کی جتنی اطاعت کی ہو اس کے ماسوا پر خوش نہ ہو۔ جتنے کے تم اہل ہو اس سے زیادہ مت لو۔

آپ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ: ایک عالم کی خصوصیت یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے علم اور کلام کو نظر کی حقیقی گہرائی سے جانچتا پرکھتا رہے۔ یہ قول اپنے اختصار کے باوجود عالم اور جاہل کے مابین حد فاصل قائم کرتا ہے کیونکہ جاہل ہمیشہ اپنی رائے کو صحیح اور دوسرے کی رائے کو غلط کہتا ہے۔ نیز وہ معاملات اور ان کے حقائق کو صرف اپنے محدود فکر اور اپنے محدود فہم ہی کے دائرے میں دیکھتا ہے۔ جبکہ ایک عالم ہمیشہ اپنے آپ کو پرکھتا رہتا ہے اور دوسرے کی رائے کو تلاش کرتا ہے تاکہ شاید اس میں اسکو وہ چیز مل جائے جس تک اس کی اپنی فکر و عقل نہ پہنچ سکی تھی۔ امام جعفر صادقؑ نے بھی اپنے اس قول میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے:

اپنی رائے پر اڑا رہنے والا ایک پھسلواں مقام پہ کھڑا ہوتا ہے۔ امیرالمومنین امام علیؑ

نے بھی اپنے اس قول میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ :

جو کوئی اپنی ہی رائے کو اچھا سمجھتا ہے وہ گمراہ ہے۔ جو اپنی عقل کو کافی سمجھتا ہے، وہ پھسل جاتا ہے۔ امام حسینؑ کے کچھ اور اقوال یہ ہیں: مومن برا فعل نہیں کرتا اور نہ معذرت وغیرہ کا موقع آنے دیتا ہے۔ جبکہ منافق ہر روز ایک برا فعل کرتا ہے اور اس کے لیے عذر ڈھونڈتا رہتا ہے۔ لیکن گناہ کا عذر اس سے بھی برا ہے۔ آپ نے اپنے بعض اصحاب سے فرمایا: جو تم سے محبت کرتا ہے، وہ تم کو بُری باتوں سے روکے گا، جو تم سے دشمنی رکھتا ہے وہ تم کو بری باتوں کی ترغیب دے گا۔

کسی شخص نے آپ سے کہا: اے فرزند رسولؐ! میں گناہ کرتا ہوں اور اپنے آپ کو گناہ سے روک نہیں سکتا۔ آپ مجھ کو ایسی نصیحت فرمائیے کہ جو میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔ آپ نے اس سے فرمایا: تم ان پانچ باتوں کو بجالایا کرو۔ پھر جو بھی گناہ کرنا چاہو، کرتے رہنا۔ وہ آدمی بولا: اے ابو عبداللہ! وہ چیزیں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: اللہ کا رزق نہ کھاؤ۔ پھر جو گناہ چاہو کرو۔ وہ شخص بولا: پھر میں کہاں سے کھاؤں۔ جبکہ جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے اور اسی کا دیا ہوا ہے۔ امامؑ نے اس سے کہا: اللہ کی زمین سے باہر چلے جاؤ۔ پھر جو گناہ چاہو کرو۔ وہ شخص بولا: یہ تو پہلے سے بھی کٹھن کام ہے۔ پھر میں رہوں گا کہاں، کیونکہ موجودات میں تو ہر چیز اللہ ہی کی ہے۔ پھر امامؑ نے اس سے فرمایا: ایسی جگہ تلاش کرلو، جہاں اللہ تم کو نہ دیکھتا ہو۔ پھر جو گناہ چاہو کرو۔ اس شخص نے کہا: لیکن اللہ پر تو کوئی بھی راز چھپا ہوا نہیں ہے۔ پھر امام نے فرمایا: جب ملک الموت تمہاری روح قبض کرنے آئے تو اس کو اپنے پاس سے ہٹادو، پھر جو گناہ چاہو کرو۔ پانچویں یہ کہ جب مالک ارادہ کرے کہ تجھ کو جہنم میں ڈالے تو اس میں نہ جاؤ۔ پھر جو گناہ چاہو کرو۔ تب وہ آدمی کہنے لگا: اے فرزند رسولؐ! میرے لیے یہی کافی ہے۔ آج کے بعد اللہ مجھ کو ایسی حالت میں نہ دیکھے گا، جو اس کو ناپسند ہو۔

آپ کے کچھ مناظرے بھی ہیں جو خارجیوں کے ایک ممتاز فرد سے ہوئے۔ پھر وہ ہیں جو معاویہ اور ان کے حاشیہ برداروں سے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں حکمت وموعظت

پر مشتمل آپ کے وہ مختصر اقوال بھی ہیں جو آپ اکثر اپنے پاس آنے والوں سے ارشاد فرماتے رہتے تھے۔ جن کو محدثوں اور مؤرخوں نے اپنی اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ البتہ طول بیان اور قاری کی اکتاہٹ کے خوف سے ہمارے لیے ان کا پیش کرنا مناسب نہیں ہے۔

مؤرخوں نے ارنیب بنت اسحاق کے معاملے میں آپ کے بلند موقف کا ذکر بھی کیا ہے جو عراق کے گورنر عبداللہ بن سلام کی بیوی تھی۔ جب یزید اس کی محبت میں بے قرار ہو گیا تو معاویہ نے اس کے لیے ایک چال چلی۔ اس نے ابن سلام سے وعدہ کیا کہ اگر تم ارنیب کو طلاق دے دوگے تو میں اپنی لڑکی کی تزویج تجھ سے کردونگا۔ اس پر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے ڈالی۔ پھر اس نے معاویہ سے ان کی لڑکی کا رشتہ طلب کیا لیکن اس لڑکی نے معاویہ اور عمرو بن عاص کے منصوبے کے مطابق ابن سلام کے ساتھ تزویج کرنے سے انکار کردیا۔ تاہم معاویہ اپنی اس چال میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ چنانچہ ارنیب کا عدّہ ختم ہونے پر جب انھوں نے اس کو اپنے بیٹے یزید کے لیے پیغام بھیجا تو اس کو للچانے کے لیے بطور مہر ایک خطیر رقم بھی روانہ کی۔ پیغام لیجانے والے شخص ابودرداء یا ابوہریرہ تھے۔ تب اتفاق ایسا ہوا کہ ان کی ملاقات امام حسینؑ سے ہوگئی اور انہوں نے آپ کو اپنے آنے کا مقصد بتادیا۔ اس پر امام حسینؑ نے ان سے کہا کہ اس عورت سے میرا ذکر بھی کردینا۔ چنانچہ جب وہ ارنیب کے پاس پہنچے تو انہوں نے اس کو یزید کا پیغام دیا اور یہ بھی بتایا کہ اس کو اپنے باپ کے بعد حکومت ملنے کی توقع ہے۔ پھر انھوں نے امام حسینؑ کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ اسلام میں اور رسول اکرمؐ کی قرابت میں ان کا کیا مرتبہ ہے۔ بعض روایات کے مطابق انہوں نے اس سے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ ابن زبیر کا ذکر بھی کیا۔ راوی کے بیان کے مطابق اس عورت نے کہا کہ ان میں سے جس سے چاہیں خود آپ ہی میری تزویج کردیجیے۔ اگر آپ نہ بھی آتے تو میں اس معاملے میں آپ کی رائے لینے کے لیے آپ کو بلوا لیتی۔ راوی کا بیان ہے کہ وہ بزرگ جن کو معاویہ نے اپنا وکیل بنا کر بھیجا تھا، انہوں نے کہا کہ میں کسی کو اس چہرے پر ترجیح نہیں دے سکتا جس کو رسول اکرمؐ بوسہ دیا کرتے تھے۔ پس انھوں نے اس کی تزویج امام حسینؑ سے کردی اور اس کو وہ مال بھی دیدیا جو معاویہ کی طرف

سے لائے تھے۔ پھر واپس جا کر معاویہ کو پورا قصہ سنا دیا۔ اس پر معاویہ نے کہا: اے ابو ہریرہ! تم نے ہمارا مال دوسروں پر صرف کر ڈالا۔ انہوں نے جواب میں کہا: یہ دولت تم کو اپنے باپ سے تو نہیں ملی تھی۔ جب ابن سلام معاویہ کی بیٹی کی طرف سے مایوس ہو گیا اور معاویہ نے اس کو اس کے عہدہ سے بھی ہٹا دیا تو وہ بڑا کبیدہ خاطر ہو کر مدینہ واپس آ گیا۔ ادھر اس نے اپنی مطلقہ بیوی کو کچھ مال دیا ہوا تھا، اس لیے اب وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس سے ملنے کی خاطر امام حسینؑ سے اجازت چاہی اور آپ نے اجازت دے دی۔ جب اس نے ارنیب کے پاس جا کر اس سے اپنی دی ہوئی چیزیں مانگیں، تو دونوں رو پڑے۔ پھر عبداللہ بن سلام پر ایسی خاموشی طاری ہوئی جو یہ بتا رہی تھی کہ وہ اس کے فراق میں غمگین ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ایسا طریقہ ہو تو وہ اس سے رجوع کا خواہشمند ہے۔ چنانچہ امام حسینؑ نے ارنیب کو مس کیے بغیر ہی اسے طلاق دیدی اور اسے اس کے پہلے شوہر کے حوالے کر دیا۔ اس طرح معاویہ کی چال ناکام ہو گئی اور یزید کے دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

ابن قتیبہ اور نویری[1] نے روایت کی ہے کہ اس زمانے میں امام حسینؑ کوفے ہی میں سکونت رکھتے تھے۔ جبکہ عبداللہ بن سلام معاویہ کی طرف سے عراق کا گورنر تھا۔ آپ نے یہ عورت اس کو اس وقت واپس کی، جب معاویہ نے اس کو عراق کی گورنری سے ہٹا دیا تھا اور وہ کوفہ واپس آ گیا تھا۔

شہاب الدین احمد بن قلیوبی[2] نے روایت کی ہے کہ یزید بن معاویہ نے دیوار پر سے ایک خوبصورت عورت کو دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ عدی بن حاتم کی بیوی تھی اور اس کی کنیت ام خالد تھی۔ یزید اس کی وجہ سے بیماریٔ دل کے ہاتھوں بستر سے لگ گیا لیکن کوئی بھی شخص اس کی بیماری کو نہ سمجھ سکا۔ تب ابن عاص نے معاویہ کو مشورہ دیا کہ یزید کی ماں اس سے تنہائی میں دریافت کرے کہ اس کو کیا عارضہ ہے۔ جب وہ اس سے ملی تو یزید نے اس کو اپنے دل کا حال بتایا۔ تب ابن عاص نے عدی کو یہ کہہ کر

---

[1] ابن قتیبہ۔ الامامت والسیاست، نویری۔ نہایت الادب جلد ۶ [2] قلیوبی۔ کتاب نوادر

پھسلایا کہ اگر وہ اپنی بیوی اُمّ خالد کو طلاق دیدے تو اس کی تزویج معاویہ کی بیٹی سے ہو جائے گی۔ جب اس نے طلاق دیدی اور اس کی عدّت بھی ختم ہو گئی تو معاویہ نے ابوہریرہ کو بھیجا تاکہ یزید کے لیے اس کو پیغام دیں۔ مدینہ میں جب وہ امام حسینؑ، ابن زبیر اور ابن عمر سے ملے تو ہر ایک نے ان سے کہا کہ اس عورت کو میرا بھی پیغام دیں۔ چنانچہ ابوہریرہ نے اس کو یزید کے علاوہ ان سب کے پیغام بھی دیلے اور معاملہ امام حسینؑ پر آن ٹھیرا۔ وہ اس طرح کہ امّ خالد نے یہ فیصلہ خود ابوہریرہ پر چھوڑ دیا، کہ وہی اس کے لیے بہتر بن فرد کا انتخاب کر دیں اور انھوں نے امام حسینؑ کو منتخب کیا۔ اُدھر جیسا کہ پہلی روایت میں آ چکا ہے، معاویہ کی بیٹی نے عدی کے ساتھ تزویج کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے وہ بہت ہی غمگین اور کبیدہ خاطر ہو گیا۔ جب امام حسینؑ نے عدی بن حاتم کو رنجیدہ دیکھا تو آپ نے اس کی بیوی کو اس کے ہاں واپس بھیج دیا، اسی روز یہ کہا گیا کہ :

"اے اُمّ خالد خوشی منا کہ کبھی کبھی بیٹھے بٹھائے بھی کام بن جاتا ہے۔"

یہ روایات باہمی اختلاف اور ٹکراؤ کے باوجود، ایک طرف ابن ہند (معاویہ) کی مکر، فریب اور چالبازی کی فطرت سے اور دوسری طرف سے امام حسینؑ کی عالی ظرفی، وفا کیشی اور ظلم و جور سے ٹکراتے رہنے کی فطرت سے بعید نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یزید کو یہ واقعہ دوبار پیش آیا ہو، کیونکہ وہ شہوت پرستی میں حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ حالانکہ دونوں واقعات کا یا ان میں سے کسی ایک کا واقع ہونا ظن سے آگے نہیں بڑھتا۔ تاہم یہ گمان رہتا ہے کہ یہ دونوں قصے داستان گویوں یا محبت کرنیوالوں کے بنائے ہوتے ہیں اور یہ بات بعید بھی نہیں ہے۔

یزید بن معاویہ کے ولی عہد ہونے کے متعلق امام حسینؑ کا موقف

یزید کے ولی عہد مقرر ہونے اور اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والے واقعات پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اسلام اور مسلمانوں کے زاویۂ نظر سے یزید کی حیثیت کو سمجھ لیں۔ نیز اموی گھرانا کی عام صورت حال کے لحاظ سے اسلام کی حیثیت کو بھی سمجھ لیں۔

اس امر میں کوئی محقق اور کوئی مؤرخ شک نہیں کرتا کہ اموی افراد اسلام کے ظہور سے لیکر اپنی حکومت کے آخری ایام تک اسلام کے بدترین دشمن اور شدید ترین مخالف رہے۔ وہ اسلام میں صرف اس وقت داخل ہوئے جب پیغمبر اکرمؐ سے جنگ آزمائی میں اپنی امکانی قوتیں صرف کرکے ناکام ہوگئے۔ تاہم جب اس میں بادل ناخواستہ داخل ہوئے تو ایک نئے ڈھنگ سے اسلام کے پردے میں جاہلیت کی رسوم کو واپس لاتے۔ اس کی خصوصیات کو مسخ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔

جب معاویہ دن میں بیسیوں مرتبہ، تمام گلدستہ ہائے اذان سے محمد رسول اللہؐ کا نام نامی فضاء عالم میں گونجتا ہوا سنتے تو رنج اور کوفت سے ان کی رگیں کا نپنے لگتیں جیسا کہ خود انہوں نے مغیرہ بن شعبہ سے کہا تھا۔ جس کا ذکر ہم پچھلی فصلوں میں امام حسنؑ بن علیؑ کی سیرت میں کر آئے ہیں۔ یہی حال اس گھرانے کے دوسرے فرمانرواؤں کا بھی تھا۔ جو حکومت تو اسلام کے نام سے کرتے تھے لیکن ان کا عمل اس کو مٹانے اس کو خلافِ حقیقت بتانے اور اس کے احکام، قوانین اور طریقوں کو مسخ کرنے کے لیے ہوتا تھا۔ پھر یزید بن معاویہ کہ جس کے خلاف امام حسینؑ نے ایک دائمی موقف اختیار کیا۔ جیسا کہ محدثین اور مؤرخین بیان کرتے ہیں۔ وہ امویوں میں سے نفس پرستی میں بہت ہی بڑھا ہوا تھا اور ناجائز افعال اور بدکاریوں میں غرق رہتا تھا۔

جب ولید نے رات کے وقت امام حسینؑ سے یزید کی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا تو امام حسینؑ نے فرمایا: یزید بن معاویہ ایک بدکار آدمی ہے۔ وہ شراب کا عادی، بے گناہوں کا قاتل اور علانیہ گناہ کرنے والا ہے۔ پس میرے جیسا شخص اس کی بیعت نہیں کرے گا۔

ابن سعد نے یزید کے بارے میں عبد اللہ بن حنظلہ کا ایک قول بیان کیا ہے۔ عبد اللہ بن حنظلہ وہ ہیں کہ جب یزید نے اپنا لشکر مدینہ بھیجا تو اہل مدینہ نے ان کی بیعت کرلی۔ اس وقت یزید کے لشکر والوں سے خطاب کرتے ہوئے عبد اللہ نے کہا: اے لوگو! اللہ وحدہٗ لاشریک سے ڈرو۔ بخدا ہم یزید بن معاویہ کے خلاف اسی وقت اٹھے ہیں، جب ہم کو یہ خوف ہوگیا کہ ہم پر آسمان سے پتھر برس پڑینگے

کیونکہ یہ شخص ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے منہ کالا کرتا رہتا ہے، شراب پیتا ہے اور نماز، روزے کو چھوڑے ہوئے ہے۔ بخدا اگر میرے ساتھ لوگوں میں سے ایک شخص بھی نہ ہو تب بھی میں اس بدکار سے سخت جنگ کروں گا۔[1]

مؤرخ مسعودی لکھتے ہیں کہ یزید موسیقی کا دلدادہ، کتوں اور بندروں کا شوقین اور شراب کی محفلوں کا رسیا تھا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ قتل حسینؑ کے بعد ایک روز وہ شراب لیے بیٹھا تھا جبکہ اس کی داہنی جانب ابن زیاد بھی موجود تھا۔ تب اس نے اپنے ساقی کی طرف بڑھ کر یہ شعر پڑھے:

اے میرے ساقی! مجھے ایسی شراب دے جو میری بے چینی کو دور کرے اور میرے دل کو تازگی بخش دے۔ پھر ابن زیاد کو بھی ایسی ہی شراب پلاؤ، کیونکہ وہ میرا رازداں، امانتدار اور میری جنگ اور غنیمت کا انتظام کرنے والا ہے۔

اس کے بعد اس نے گانے والوں کو حکم دیا اور وہ اس کے سامنے گاتے رہے۔ راوی مزید کہتا ہے کہ یزید کے درباریوں اور اس کے دوسرے ساتھیوں پر بھی وہی بدکاریاں اور جرم و گناہ حاوی ہو گئے جن کا وہ خود مرتکب ہوتا تھا۔ چنانچہ مکہ اور مدینہ میں بھی موسیقی اور شراب خوری ہونے لگی اور وہاں ہر قسم کا لہو ولعب پھیل گیا تھا۔

اس کا ایک بندر تھا جس کو وہ ابوقیس کہتا تھا۔ وہ اس کی شراب کی محفلوں میں بھی موجود رہتا۔ جہاں اس کے بیٹھنے کے لیے ایک گدّا رکھا ہوتا تھا۔ پھر وہ تھا بھی بہت شریر اور بدخو۔ اس کو ایک جنگلی گدھے پر بٹھایا جاتا جو زین اور لگام سے سجا ہوتا تھا۔ جب گھڑ دوڑ کا دن آتا تو ابوقیس بھی سواروں کے مقابلہ میں شامل ہوتا تھا۔ کسی دن وہ جیت جاتا اور اس کا گدھا گھوڑے سے پہلے باڑے میں داخل ہو جاتا۔ ابوقیس کو سرخ رنگ کا ریشمی لباس پہنایا جاتا جس پر مختلف رنگوں کے پھول بنے ہوتے

---

[1] طبقات ابن سعد

تھے۔ اس کے بارے میں کسی شامی شاعر نے یہ اشعار کہے تھے :

اے ابو قیس اس کی لگام کو اچھی طرح سنبھالے رہنا، کیونکہ اگر تو گرا تو کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ کیا کسی نے اس بندر کو دیکھا ہے جو گدھے پر بیٹھ کر امیر یزید کے گھوڑوں کو ہرا دیتا ہے۔[1]

محمد بن علی بن طبا طبا (ابن طقطقی) رقمطراز ہیں کہ : یزید بن معاویہ شکاری کتوں کو سونے کے کڑے اور زربفت کے کپڑے پہنایا کرتا تھا۔ ہر کتے کی دیکھ بھال کے لیے ایک ایک غلام مقرر رہا کرتا تھا۔[2]

ابن کثیر کہتے ہیں کہ یزید بھاری جسم اور گھنے بالوں والا چیچک رو شخص تھا۔ معاویہ نے اس کی ماں کو اس وقت طلاق دیدی تھی جبکہ وہ اس کے بطن میں تھا۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا، تاہم اس کے شعر زیادہ تر فحاشی و ابتذال سے متعلق ہوتے تھے۔ جیسے اس کے یہ اشعار ہیں :

میرے وہ ساتھی جو مل بیٹھ کر شراب پیتے اور محبت بھرے نغمے گاتے ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ تم جی بھر کے لطف اٹھا لو، کیونکہ یہ زندگی خواہ کتنی ہی طویل ہو ضرور ختم ہو جانے والی ہے۔[3]

جیسا کہ ابن طقطقی نے کہا ہے کہ یزید کے اسی قسم کے اور بھی بہت سے اشعار ہیں جن میں سے کچھ اشعار انہوں نے بھی نقل کیے ہیں۔

ابن قتیبہ کی کتاب ''الامامت والسیاست'' میں ہے کہ عتبہ بن مسعود نے عبداللہ بن عباس سے کہا : کیا آپ یزید کی بیعت کریں گے۔ حالانکہ وہ شراب پیتا، لونڈیوں کے ساتھ کھیلتا اور بدکاریوں میں مست رہتا ہے۔ وہ بولے کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ اس سے زیادہ شراب پینے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ بدترین شرابی ہے۔ اس پر مؤرخوں کا اتفاق ہے کہ اس کی حکومت تین سال اور چھ ماہ تک رہی۔ پہلے سال میں

---

[1] مسعودی۔ مروج الذہب جلد ۲ [2] ابن طقطقی۔ کتاب الفخری صفحہ ۴۹
[3] ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ

اس نے حسینؑ بن علیؑ کو قتل کیا۔ دوسرے سال میں مدینہ کو تاراج کیا۔ وہاں مردوں کو قتل کیا اور عورتوں کو تین دن تک اپنے فوجیوں کے آگے ڈالے رکھا۔ پھر تیسرے سال میں اس نے کعبے پر فوج کشی کی اور منجنیق سے سنگباری کر کے اس کو منہدم کر دیا۔

ابن طقطقی اپنی کتاب "الفخری" میں لکھتے ہیں کہ یزید بن معاویہ کھیل، شراب، شکار اور عورتوں سے شدید رغبت رکھتا تھا۔ اس کو شعر گوئی سے اتنا شغف تھا کہ کہا جاتا ہے اس کی حکومت شعر سے شروع ہوئی اور شعر ہی پر ختم ہوئی۔ جس کسی نے بھی اس کی تاریخ زندگی پیش کی ہے، اس نے یہی بیان کیا ہے کہ وہ دین سے بالکل بے پروائی برتتا اور ہر قسم کی ناجائز حرکات کرتا رہتا تھا۔ جیسا کہ تمام مورخین اور محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ دین سے بے پروا اور ہر قسم کے ناجائز افعال میں سرشار رہتا تھا۔

بعض مستشرقین اور عرب مصنفین، یزید کی تربیت کے ماحول کو اس کی زندگی کی اس نمایاں کیفیت کا سبب قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس کے باپ معاویہ نے اس کی ماں میسون بنت بجدل کلبیہ کو طلاق دیدی جبکہ وہ اس کے بطن میں تھا۔ چنانچہ وہ اپنے میکے والوں کے ہاں بیابان میں چلی گئی اور یزید وہیں پیدا ہوا۔ پھر لڑکپن کی عمر کو پہنچنے تک وہ اسی کے پاس رہا۔ مؤرخین نے میسون کی طلاق کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ معاویہ جب اس کے پاس گئے تو وہ یہ اشعار پڑھ رہی تھی:

> مجھ کو اپنا اون کا موٹا لباس اس ریشمیں لباس سے زیادہ محبوب ہے وہی میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ وہ جھونپڑا جس میں کھلی ہوائیں آتی رہتی ہیں، مجھ کو اس بلند و بالا محل سے زیادہ محبوب ہے۔ مجھ کو اونٹوں کے یہ کھردرے کجاوے، ان شاہی خچروں کی خوبصورت کاٹھیوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ مجھ کو مہمانوں پر بھونکتے ہوئے یہ آوارہ کتے، وہاں کی پیاری پیاری بلیوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ ہاں! مجھ کو اپنے نادار اور اجڈ رشتہ داران سخت مزاج گدھوں سے زیادہ محبوب ہیں۔

یہ سن کر معاویہ نے اس سے کہا: اے بجدل کی بیٹی! تو نے ہم کو سخت مزاج گدھا کہہ کر دم لیا ہے۔ جا اب تو اپنے رشتہ داروں ہی میں چلی جا۔ چنانچہ وہ بنی کلب کے

بیابانی علاقہ میں چلی گئی۔ ان دنوں اس پر عیسائیت کا بھی گہرا اثر تھا۔ اسی زمانہ میں اس کے ہاں یزید پیدا ہوا اور پھر لڑکپن تک اسی کے پاس رہا۔ مؤرخوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یزید کی تعلیم و تربیت نسطوری عیسائیوں کے ہاتھوں ہوئی۔ اسکے علاوہ بعض مصنفین کی رائے میں اس کی نشو و نما ایسے ماحول میں ہوئی جس میں بیابانی زندگی کا اکھڑپن اور طبیعت کی سختی شامل تھی۔ بعض مصنفین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس نے کعب بن جعیل سے کہا کہ وہ انصار کی برائی کرے لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ البتہ اخطل تغلبی کی طرف رجوع کرنے کی رائے دیدی۔ چونکہ وہ عیسائی تھا اس لیے اس نے اس بات کو قبول کرلیا۔ پس اسی عیسائی تربیت کا اثر تھا کہ یزید زیادہ تر عیسائیوں ہی کو اپنے قریب رکھتا تھا۔ وہ اپنے خاص معاملات میں بھی انہی کو شریک رکھتا تھا۔ جیساکہ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس کو ان لوگوں پر اس حد تک بھروسا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کی تربیت بھی ایک عیسائی ہی کے سپرد کی تھی۔ اس طرح اخطل وغیرہ کی دی ہوئی عیسائی تربیت کا یہی اثر ہو سکتا تھا کہ اس کا ان لوگوں کے ساتھ بڑا اعتماد تعلق اور مضبوط لگاؤ پیدا ہو جائے۔ علائلی نے اس پر یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ جب یہ امر یقینی ہے یا یقین کے قریب ہے کہ یزید کی تربیت خالص عیسائی طریقہ پر ہوئی تو پھر یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ وہ احکام شرع کی پابندی سے گریز کرے اور مسلمانوں کے طریقوں کا مذاق اڑاتا رہے کیونکہ اس کے دل میں ان احکام کے ماننے کی کوئی اہمیت اور ان پر عمل کرنے کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ بلکہ اگر وہ بڑا ہوکر ایسا نہ نکلتا تو اس بات پر واقعی تعجب ہونا چاہیے تھا۔[۱]

بعض مصنفین اس حقیقت کی روشنی میں یزید کی طرف سے اسلام اور شعائر اسلام کی اہانت کیے جانے کا سبب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ سبب اس کے لیے تب وجہ صفائی بن سکتا تھا جبکہ اس کا یہ برتاؤ بیابانی زندگی اور عیسائی تربیت ہی کا خاص نتیجہ ہوتا۔ اس کے سن بلوغ سے لے کر اپنے باپ کا ولی عہد اور پھر خود فرمانروا

---

[۱] علائلی اشعۃ من حیات الحسینؑ

ہونے تک اس سے ظہور میں آتا رہا۔ حالانکہ عرب خواہ وہ حضری ہوں یا بدوی ہوں ان میں ایسی خصوصیات تھیں جن کو اسلام نے بھی پسند کیا تھا۔ جیسے وفاء، حق ہمسایہ، سخاوت دلیری اور تحفظ ناموس وغیرہ کہ جن کا ذکر تاریخ کرتی ہے لیکن یزید میں، ان میں سے کوئی بات نہ پائی جاتی تھی۔ پھر تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ عربوں نے کبھی بہنوں اور پھوپھیوں سے نکاح کو جائز قرار دیا ہو، جیسا کہ یہ تاریخ اس کے بارے میں بتاتی ہے۔ علاوہ بریں جو لوگ بیابانی ماحول میں عیسائیت پر پیدا ہوئے اور اسلام کی فتح سے پہلے اپنی انھی نمایاں خصوصیات کے ساتھ زندہ رہے۔ جب وہ اسلام میں داخل ہوگئے تو وہ ان تمام رسوم پر غالب آگئے، جو اُن کو اپنے باپ دادا سے ملی تھیں۔ اس پر طرہ یہ کہ خود معاویہ کی ولادت شرک پر ہوئی اور اسی میں ان کی نشوونما ہوئی تھی۔ وہ قریش کے ساتھ اسلام دشمنی کے تمام مواقع میں شریک تھے۔ نیز لڑکپن میں اور بڑے ہوکر بھی وہ اپنے ان والدین کے ساتھ رہتے تھے جو اسلام سے، ہاشمیوں سے اور علویوں سے دشمنی کے معاملے میں تمام مخلوق خدا میں سب سے زیادہ سخت تھے۔ چنانچہ خود معاویہ ان کے باپ اور ان کی ماں رسول اکرمؐ کی وفات سے صرف دو سال پہلے اسلام میں داخل ہوئے لیکن باطن میں شرک چھپائے رہے۔ البتہ ان کے اندر ایسی ہوشیاری موجود تھی کہ بڑی آسانی سے مسلمانوں کا سا رنگ اپنائے رہتے تھے۔ حتٰی اینکہ اپنی شام کی گورنری نیز مملکت اسلامی کا حکمران بن جانے کے زمانے میں بھی بڑی کامیابی سے اپنی اس دشمنی کو چھپائے رہے جو وہ اسلام کے لیے رکھتے تھے۔ وہ عام مسلمانوں پر اسلام سے اپنی رغبت ظاہر کرتے رہے۔ حالانکہ وہ ایسے لوگوں میں پلے بڑھے تھے جو اسلام کے بدترین دشمن اور سخت ترین بدخواہ تھے۔ پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ بیشتر اموی حکام جو علانیہ طور پر حرام افعال کے مرتکب ہوا کرتے تھے، اسلام کے ظاہری مراسم کی تحقیر کرتے تھے اور یزید کی طرح تمام اسلامی تعلیمات کے خلاف چلتے تھے۔ وہ کیوں ایسا کرتے تھے؟ حالانکہ نہ وہ بدوی طرزِ زندگی میں پلے بڑھے تھے اور نہ عیسائی ماحول کے زیرِ تربیت رہے تھے۔

مختصر یہ کہ بعض مؤلفین کے اس خیال کی تائید نہ تاریخ سے ہوتی ہے نہ اس کی

کوئی عقلی بنیاد ہے کہ یزید کی اس روش کا سبب وہ تربیت ہے جو اس کو بدوی زندگی اور مسیحی ماحول میں ملی تھی۔ میری رائے میں اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ ان احمقوں میں سے تھا جو امورِ سیاست کو بالکل نہیں سمجھتے اور اپنی شہوانی خواہشات اور بغض کی رو میں بہہ جایا کرتے ہیں۔ اس کے لیے اس سے بڑی اور کیا دلیل ہوگی کہ اس نے امام حسینؑ کو ان کے افرادِ خاندان اور اصحاب سمیت قتل کر ڈالا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر کے شہر بہ شہر عوام کے سامنے پھرایا۔ حالانکہ وہ رسول اکرمؐ کی ذریت تھے اور لاکھوں مسلمان ان کا احترام کرتے اور ان کے ذریعہ سے آنحضرتؐ کی اور اسلام کی حقانیت اور خوبیوں کی یاد تازہ کر لیا کرتے تھے۔ نیز اس کے بعد اس نے اہل مدینہ سے جنگ کی اور وہاں کی عورتوں کو اپنے لشکر والوں پر مباح قرار دیدیا کیونکہ ان لوگوں نے امام حسینؑ کے قتل کو ایک عظیم واقعہ قرار دیتے ہوئے اس پر ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مکہ کا محاصرہ کیا اور کعبہ کو منہدم کر دیا۔ ایسے ہی اس کے اور بھی بہت سے برے اعمال اور زیادتیاں ہیں جن کا سبب حماقت، جہالت اور خود رائی کے علاوہ کچھ نہیں۔

بہر حال جب حجاز اور اس کے اطراف کے مسلمانوں نے دیکھا کہ امام حسنؑ کی وفات کے بعد معاویہ نے اپنے حرامکار اور اسلام کی تحقیر کرنے والے بیٹے یزید کے لیے حالات کو سازگار بنانا شروع کر دیا ہے تو انھوں نے امام حسینؑ سے اس معاملے میں مداخلت کرنیکی خواہش ظاہر کی لیکن آپ ان سب کو صبر کرنے اور حکمت اور تدبّر سے حالات کا سامنا کرنیکی ہدایت فرماتے رہے۔ یزید کے ولی عہد مقرر کیے جانے پر مسلمانوں کے خیالات اور ان کی پریشانی کو عبداللہ بن ہمام سلولی نے ان اشعار میں ظاہر کیا ہے:

ہم ہر ایرے غیرے کو امیرالمومنین مانتے اور اس کی بیعت کرتے رہے۔ جبکہ ایک کے بعد ایک خودسر حکمران آجاتا تھا۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے تین آئے اور گئے۔ پھر تو خوف اور غضب سے ہمارا یہ حال تھا کہ اگر ہم بنی امیہ کا خون بھی پی لیتے تو ہماری سیری نہ ہوتی۔ ارے تمہاری حالت تو یہ ہے کہ رعایا برباد ہو رہی ہے اور تم خرگوش کے شکار میں لگے رہتے ہو۔

استاد ابو علم کی کتاب "سیرت اہلبیتؑ" میں ہے کہ مروان بن حکم نے جو مدینہ میں معاویہ کا گورنر تھا ان کو لکھا: عمرو بن عثمان نے خبر دی ہے کہ عراق اور حجاز کے کچھ ممتاز افراد ہم سے کٹ کر حسینؑ بن علیؑ کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور ان کا یہ اقدام خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ جب میں نے اس کے بارے میں چھان بین کی تو مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ عنقریب سر اٹھانے والے ہیں، پس آپ مجھ کو اپنی رائے سے مطلع کیجیے۔ اس پر معاویہ نے اس کو لکھا: مجھے تمہارا خط مل گیا اور اس میں جو کچھ تم نے (امام) حسین (علیہ السلام) کے متعلق لکھا ہے اس سے میں آگاہ ہو گیا۔ پس تم ان سے مت ٹکراؤ اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ جب تک وہ ہماری حکومت کے معاملہ میں کوئی جھگڑا نہیں اٹھاتے، ہم نہیں چاہتے کہ ان سے ٹکرائیں۔ پس جب تک ان کی طرف سے کوئی واضح بات ظاہر نہ ہو تم بھی ان سے کنارہ کش رہو۔

نیز انھوں نے امام حسینؑ کو لکھا: مجھ کو آپ کے معاملات کے بارے میں خبریں پہنچی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایسی باتوں سے دور رہیں۔ خدا کی قسم جو شخص اللہ سے عہد و پیمان کرے وہ اس کو وفا کرنے کا پابند ہے۔ پھر آپ جیسا شخص تو عہد کو وفا کرنے کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ کیونکہ اللہ نے آپ کو خاص بڑائی، بزرگی اور منزلت عطا کی ہے۔ پس آپ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو یاد کیجیے اور اس کو وفا فرمائیے۔ کیونکہ اگر آپ مجھ کو ناپسند کریں گے تو میں بھی آپ کو ناپسند کروں گا۔ آپ میرے خلاف چال چلیں گے تو میں بھی آپ کے خلاف چال چلوں گا۔ آپ غور کیجیے کہ کہیں اس امت کا شیرازہ بکھر نہ جائے اور آپ کی وجہ سے اللہ اس کو فتنے میں نہ ڈال دے۔ آپ نے یقیناً لوگوں کو سمجھ لیا ہے اور ان کو آزما لیا ہے۔ لہٰذا اپنی جان، اپنے دین اور اپنے نانا کی امت کا خیال کیجیے تاکہ وہ بیوقوف افراد جو یقین سے محروم ہیں، آپ کو راہ صواب سے ہٹا نہ دیں۔

اس کے جواب میں امام حسینؑ نے ان کو لکھا: مزید یہ کہ تمہارا خط مجھ کو ملا، جس میں تم نے یہ کہا ہے کہ تم کو میرے امور کے متعلق خبریں پہنچی ہیں اور تم مجھ کو ان سے اس لیے دور رکھنا چاہتے ہو کہ ہم تم آپس میں کسی اور ہی عہد کے پابند ہیں۔ ہاں تو جان رکھو کہ نیکیوں کی طرف ہدایت اور رہبری صرف اللہ ہی کر سکتا ہے۔ تم نے ذکر کیا ہے کہ میرے

متعلق کچھ باتیں تم تک پہنچائی گئی ہیں۔ پس یہ کام تمہارے ان ملنے والوں نے کیا ہے جو کہ چغل خور ہیں اور ہمارے بیچ میں پھوٹ ڈالنے کے درپے ہیں۔ ان گمراہ کرنے والوں نے یقیناً جھوٹ بولا ہے کیونکہ میرا ارادہ تم سے جنگ کرنے یا تمہاری مخالفت کرنے کا نہیں ہے، لیکن ایسا نہ کرنے میں مجھے اللہ کا خوف مانع نہیں ہے۔ نہ اس کے لیے مجھے تم سے اور تمہارے ان ملحد اور گم گشتہ راہ دوستوں سے معذرت خواہی کی ضرورت ہے جو سب کے سب ظالموں کا گروہ اور شیطان کے ساتھی ہیں۔ کیا تم حجر بن عدی کندی اور ان کے ساتھیوں کے قاتل نہیں ہو؟ جو نماز کے پابند، عبادت گزار، ظلم سے نفرت کرنے والے بدعتوں پر ٹوکنے والے اور بدی سے روکنے والے تھے۔ وہ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہ تھے۔ پھر بھی تم نے بڑی بڑی قسمیں کھانے اور مکرر پیمان دینے کے بعد ان کو ظلم اور زیادتی سے قتل کر ڈالا۔ تم نے اپنے اور ان کے مابین باندھے گئے کسی پیمان کا خیال نہ کیا۔ اس طرح تم اللہ کے مقابلے پر جرأت اور اس سے کیے ہوئے عہد کی تحقیر کے مرتکب ہوئے۔

کیا تم عمرو بن حمق کے قاتل نہیں ہو؟ جو رسول اکرمؐ کے صحابی اور اللہ کے ایک نیک بندے تھے۔ کثرت عبادت نے ان کو گھلا دیا تھا جس سے ان کا جسم دبلا ہو گیا تھا اور ان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ تم نے ان کو بھی امان دینے اور ایسے ایسے عہد و پیمان کے بعد قتل کر ڈالا کہ اگر وہ جنگلی بکریوں کے ساتھ بھی کیے جاتے تو وہ بھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے نیچے اُتر آتیں۔

زیاد بن سمیہ کہ جو عبید بن ثقیف کے یہاں پیدا ہوا تھا کیا تم نے اس کو اپنے باپ کا بیٹا قرار نہیں دیا؟ حالانکہ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے کہ لڑکا اسی کا ہے جس کے یہاں پیدا ہو اور زناکار کو صرف پتھر پڑیں گے لیکن تم نے جان بوجھ کر رسول اکرمؐ کی نافرمانی میں اپنی خواہش کی پیروی کی۔ پھر تم نے اسی شخص کو اہل اسلام پر مسلط کر دیا۔ اب وہ ان کو قتل کرتا ہے، انکے ہاتھ پیر کاٹتا ہے، ان کی آنکھیں نکلواتا ہے اور ان کو کھجور کے درختوں پر پھانسی دیتا ہے۔ گویا کہ نہ تم اس امت میں شامل ہو اور نہ مسلمانوں کا تم سے کوئی تعلق ہے۔

کیا تم وہ نہیں ہو کہ جب حضرمیوں کے بارے میں ابن سمیہ نے تم کو لکھا کہ وہ علیؑ کے طریقے پر ہیں تو تم نے اسے لکھ بھیجا: ہر اس شخص کو قتل کر ڈالو جو علیؑ کے طریقے پر ہو۔ چنانچہ اس نے ان سب کو قتل کر ڈالا اور تمہارے حکم سے ان کے اعضاء کاٹ ڈالے۔ ہاں تو علیؑ کا طریقہ کیا ہے؟ ارے وہ ان کے ابن عم محمد رسول اللہؐ ہی کا دین تو ہے کہ جس کی خاطر وہ تم سے اور تمہارے باپ سے لڑا کرتے تھے کہ تم دونوں اپنی گمراہی سے باز آجاؤ۔ یاد رکھو آج تم اسی دین کی بدولت ہی اس مقام پر بیٹھے ہو جہاں تم اس وقت ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہاری اور تمہارے باپ دادا کی بزرگی ان جاڑے اور گرمی کے تجارتی قافلوں تک ہی محدود رہتی۔ دوسری باتوں کے علاوہ تم نے مجھے یہ بھی کہا ہے کہ اپنی جان اپنے دین اور امت محمدؐ کا خیال کیجیے اور یہ فکر کیجیے کہ کہیں مسلمانوں کا شیرازہ نہ بکھر جائے اور مبادا آپ ان کو فتنہ میں ڈال دیں۔ حالانکہ میری دانست میں اس امت کے لیے اس سے بڑا کوئی فتنہ نہیں ہے کہ تمہاری حکومت اس پر قائم رہے۔ اپنی جان، اپنے دین اور امتِ محمدؐ کو نظر میں رکھتے ہوئے میرے لیے اس سے بڑی کوئی فضیلت نہیں ہے کہ میں تم سے جنگ کروں۔ اگر میں ایسا کروں تو میرا یہ عمل اللہ کی خوشنودی کے لیے ہوگا لیکن اگر میں اس سے باز رہوں تو پھر میں اپنے دین کی خاطر اللہ سے بخشش طلب کروں گا اور اپنے معاملے میں راست روی کے لیے اس کی توفیق چاہوں گا۔

تم نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر آپ مجھ کو ناپسند کریں گے تو میں بھی آپ کو ناپسند کروں گا۔ اگر آپ میرے خلاف چال چلیں گے تو میں بھی آپ کے خلاف چال چلوں گا۔ پس میں کہتا ہوں تم میرے خلاف جو چال چلنا چاہتے ہو چل لو۔ مجھے اللہ سے امید ہے کہ تمہاری کوئی چال مجھ کو گزند نہ پہنچائے گی۔ تمہاری وہ چال کسی اور کے مقابلے میں خود تمہارے لیے نقصان دہ ہوگی۔ وہ اس لیے کہ تم اپنی جہالت میں سرشار ہو۔ تم نے اپنے عہد و پیمان توڑنے کی جرأت کی ہے۔ قسم بخدا! تم نے ہم سے کی ہوئی شرطوں میں سے ایک شرط بھی پوری نہیں کی۔ بلکہ تم نے ان لوگوں کو قتل کر کے یقیناً عہد شکنی کی ہے جن کو تم نے صلح، قسم اور عہد کے بعد بھی قتل کر ڈالا۔ تم نے ان لوگوں پر صرف اس لیے ظلم ڈھایا ہے کہ وہ ہماری فضیلتیں بیان کرتے تھے اور ہمارے حق کی فوقیت کو تسلیم کرتے

تھے۔ تم نے ان کو خوف سے قتل کر ڈالا کہ شاید تم اس سے پہلے مر جاتے کہ وہ اپنا کام کرتے یا وہ مرجاتے قبل اس کے کہ تمہاری گرفت میں آتے۔ اے معاویہ! اب سن لو کہ انکا قصاص ضرور لیا جائے گا اور یقین کر لو کہ تمہیں ان کے خون کا حساب ضرور دینا ہوگا۔ یہ بھی جان رکھو! کہ اللہ کے پاس ایک کتاب ہے جو کسی چھوٹے بڑے گناہ کو قلمبند کیے بغیر ہرگز نہیں چھوڑتی۔ تم محض شک اور تہمت کی بنا پر لوگوں کا مواخذہ کرتے ہو اور ان کو ان کے گھروں سے نکال کر جلاوطن کر دیتے ہو۔ اللہ اس ظلم کو اور اپنے بیٹے کے لیے لوگوں سے تمہارے بیعت لینے کو قطعاً معاف کرنے والا نہیں ہے۔ جبکہ وہ ایک نوخیز لڑکا ہے جو شراب پیتا ہے، اور کتوں سے کھیلتا ہے۔ میری نظر میں تم نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا ہے اور اپنی رعایا کو دھوکہ دیا ہے کیونکہ تم نے ایک جاہل اور بیوقوف کی بات تو سنی لیکن خدا ترس اور پرہیزگار لوگوں کی بات کو حقیر سمجھا۔

معاویہ نے آپ کا خط پڑھا تو کہنے لگے: جو کچھ ان کے دل میں چھپا ہوا تھا وہ سب انہوں نے ظاہر کر دیا ہے۔ اس پر ان کے بیٹے یزید نے کہا: آپ ان کو اس خط کا ایسا جواب دیجیے جس سے ان کو اپنے چھوٹے پن کا احساس ہو جائے۔ اس میں آپ ان کے باپ کی مصیبتوں کا ذکر کیجیے۔ اتنے میں عبداللہ بن عمرو بن عاص بھی آ پہنچا۔ معاویہ نے اس سے کہا: تم جانتے ہو کہ حسینؑ نے ہمیں کیا لکھا ہے۔ وہ بولا کیا لکھا ہے؟ تب انھوں نے وہ خط پڑھ کر اس کو سنایا۔ اس پر اس نے کہا: آپ ان کو ایسا جواب کیوں نہیں دیتے جس سے وہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے چھوٹا سمجھنے لگیں۔ معاویہ بولے: یزید نے بھی مجھ کو یہی مشورہ دیا ہے، لیکن تم دونوں غلطی پر ہو۔ کیا تم نے غور کیا کہ اگر میں علیؑ پر عیب لگانا چاہوں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ علیؑ پر جھوٹا اور انجان سا عیب لگانا تو اچھا نہیں ہے۔ یہ بات میرے لیے بھی مناسب نہیں کہ میں کسی شخص کا ایسا عیب بیان کروں کہ عام لوگ اس کو جانتے ہی نہ ہوں۔ تاکہ وہ اس میں یہ عیب نہ پاکر میری بات کو جھوٹ نہ قرار دیں۔ اب تم ہی کہو کہ میں حسینؑ پر کیا عیب لگاؤں۔ قسم بخدا! ان پر عیب لگانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم میں بھی یہ چاہتا تھا کہ اب ان کو ایک اور خط لکھ کر ڈراؤں دھمکاؤں لیکن پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ بھی نہ کروں تو اچھا ہے۔

راویوں کا بیان ہے کہ امام حسینؑ اور معاویہ کے درمیان ایک سے زیادہ مرتبہ گفتگو ہوئی تھی۔ اس میں معاویہ یہ کوشش کرتے تھے کہ یزید کی بیعت کے معاملہ میں امام حسینؑ سے اپنی بات کو آخری حد تک پہنچادیں لیکن سردست وہ یہ چاہتے تھے کہ حتی الامکان شدت سے کام نہ لیں جبکہ وہ سب سے زیادہ امام حسینؑ سے خائف تھے کیونکہ وہ اسلام میں ہر پہلو سے عظیم مرتبہ کے حامل تھے۔ پھر آپ پر بھی معاویہ کے طور طریقے چھپے ہوئے نہ تھے۔ چنانچہ آپ ان کے الفاظ کی نرمی، بات چیت کی طراوت اور فریب کاری سے دھوکہ نہ کھاتے تھے۔ اس کے باوصف آپ ان کو اس طریقہ سے جواب دیتے رہے کہ دونوں کے درمیان تبادلۂ خیالات جاری رہا۔ اسی دوران میں ایک بار آپ نے لکھا: یزید نے اپنے بارے میں رائے دینے کا موقع خود ہی فراہم کردیا ہے۔ تم اس کے لیے مشتغل کرکے لڑائے جانے والے کتے۔ اپنے ہم جنسوں کی طرف اڑنے والے کبوتر، طبلے، طنبورے اور ناچنے گانے والی لڑکیاں مہیا کردو۔ پھر تم دیکھو گے کہ وہ انہی چیزوں میں کھو جائے گا۔ لہٰذا جس چیز کی کوشش میں تم لگے ہوئے ہو اس کو چھوڑ دو، کیونکہ مخلوقِ خدا کے معاملے میں تم اپنے جس قدر گناہ لیے ہوئے اللہ سے ملاقات کرنے والے ہو، وہی تمہارے لیے کافی ہیں۔ تاہم میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم باطل کے لیے زیادتیاں کرنے اور بغض کی بنا پر ظلم کرنے سے باز نہ آؤ گے۔ یہاں تک کہ تمہاری عمر کا پیمانہ لبریز نہ ہو جائے۔ حالانکہ تمہارے اور تمہاری موت کے درمیان صرف آنکھ جھپکنے کا وقفہ ہے۔ اس کے بعد تم ہو گے اور تمہارے اعمال ہوں گے جو یوم حساب کے لیے محفوظ ہیں اور اس وقت تمہارے لیے بچاؤ کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

ابن جریر طبری نے ۶۰ھ کے حالات میں لکھا ہے کہ معاویہ نے اپنے مرض الموت کے دوران میں اپنے بیٹے یزید کو بلا کر اس سے کہا: اے بیٹے! میں نے تمہارے لیے پورا ساز و سامان مہیا کر دیا ہے۔ معاملوں کو تمہارے لیے ہموار کر دیا ہے، دشمنوں کو تمہارے آگے سرنگوں کر دیا ہے اور عربوں کی گردنیں تمہارے آگے جھکا دی ہیں۔ اب مجھے قریش کے چار افراد کے سوا کسی سے خوف نہیں ہے کہ کوئی شخص تم سے اس حکومت کے بارے میں تنازعہ کرے گا جو میں نے تمہارے لیے تیار کی ہے، وہ چار افراد حسینؑ ابن علیؑ

عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر ہیں۔ عبداللہ بن عمر کو تو عبادت نے ناکارہ کر دیا ہے۔ جب ان کے علاوہ بیعت نہ کرنے والا کوئی اور باقی نہ رہے گا تو وہ بھی تمہاری بیعت کر لیں گے۔ البتہ اہل عراق حسینؑ بن علیؑ کو تم سے لڑائے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ اگر انھوں نے تم پر فوج کشی کی اور تم ان پر فتحمند ہو گئے تو اُن سے درگزر کر دینا کیونکہ ہمارا ان سے قریبی رشتہ ہے اور ان کا مرتبہ بھی عظیم ہے۔ رہے ابوبکر کے بیٹے تو اگر ان کے ساتھی کچھ کریں گے تو وہ بھی کریں گے، ورنہ ان میں زن پرستی اور لہو ولعب کے سوا اور کسی چیز کی ہمت نہیں ہے۔ البتہ جو شخص تم پر شیر کی مانند تاک لگائے گا اور لومڑی کی طرح تم کو دھوکہ دے گا وہ ابن زبیر ہے کیونکہ جیسے ہی اس کو موقع ملے گا وہ تمہارے اوپر جھپٹ پڑے گا۔ پس اگر اس نے تمہارے ساتھ ایسا کیا اور تم کو اس پر فتح حاصل ہو جائے تو تم اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنا۔

ایک دوسری روایت ہے کہ انھوں نے کہا: حسینؑ بن علیؑ ایک قوی فرد ہیں اور امید ہے کہ ان کے لیے تمہیں انہی لوگوں کی مدد کافی ہو جائے گی جنہوں نے ان کے باپ کو قتل کیا اور ان کے بھائی سے کنارہ کشی اختیار کی۔ تاہم ان سے ہمارا قریب کا رشتہ ہے۔ ہم پر ان کا عظیم حق ہے اور ان کی رسول اکرمؐ سے قرابتداری ہے۔ میرا خیال ہے کہ اہل عراق ان کو تم سے بھڑائے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ اگر تم ان پر فتحیاب ہو جاؤ تو ان سے درگزر کرنا۔

اگر یہ صحیح ہے کہ انھوں نے امام حسینؑ کے بارے میں یزید کو ایسی وصیت کی تھی، تو پھر اس کی وجہ ان کا یہ علم تھا کہ امام حسینؑ کے قتل سے یزید اور پورے اموی گھرانے پر مکمل تباہی اور بربادی ٹوٹ پڑے گی۔ پھر بھی مجھ کو اس معاملے میں اس لیے شک ہے کہ اگر امام حسینؑ کا وجود خود معاویہ کی حکومت اور اقتدار میں حارج ہوتا تو وہ ان کو کبھی نہ بخشتے اور نہ ہی درگزر کرتے۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو ایسے سلوک کی وصیت کیوں کرنے لگے، جو انھوں نے اپنے مخالفین کے ساتھ نہ کیا تھا۔ چنانچہ اس سے قبل وہ امام حسنؑ، حجر بن عدی اور خدا کے دسیوں پاکباز بندوں کو قتل کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کو بھی قتل کیا، کیونکہ یہ دونوں انکے

بعد یزید کے خلیفہ بنائے جانے پر معترض ہوئے تھے۔ پھر اموی گھرانہ کب عفو و درگزر سے واقف ہوا یا ان کے یہاں علوی گھرانے سے قریبی رشتہ کب شمار میں لایا گیا۔ ہاں یہ بات زیادہ قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ معاویہ کی زبانی ایسی وصیت اس لیے تیار کی گئی ہے کہ جو کچھ انکے ولی عہد نے امام حسین ع اور ان کے اہلبیت ع کے ساتھ کیا، اس کی ذمہ داری ان پر سے کم ہو جائے۔

البتہ جو روایت ابن اثیر نے اسد الغابہ کی دوسری جلد میں بیان کی ہے، وہ اموی سیاست کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے کہ جس کی بنیاد سخت روی، پُر فریب قتل اور اقتدار کی خاطر ہر قسم کے تشدد کے استعمال پر قائم تھی۔ جیسا کہ ابن اثیر نے کہا ہے کہ جب یزید کے باپ نے اس کے ولی عہد ہونے کی بیعت لی تو امام حسین ع نے بیعت کرنے سے انکار کیا اور ان کے ساتھ ہی ابن عمر، ابن زبیر اور عبد الرحمٰن بن ابی بکر نے بھی یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا، حالانکہ بیشتر لوگوں نے اس کی بیعت کر لی تھی۔ اس پر معاویہ ایک ہزار شامی سوار لے کر حجاز کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو ان سے حسین ع کی ملاقات ہوئی۔ جب اس کی نظر آپ پر پڑی تو بولا: میری طرف سے قربانی کے ایسے جانور کو خوش آمدید نہیں کہا جا سکتا جس کا خون بہہ رہا ہے اور اللہ اس کو بہانے والا ہے۔ اس پر امام ع نے ان سے کہا: اے معاویہ ذرا سنبھل کر بات کرو۔ میں ایسے الفاظ کا مستحق نہیں ہوں۔ تب معاویہ نے کہا: کیوں نہیں! بلکہ تم اس سے بھی بُرے الفاظ کے مستحق ہو۔ پھر جب ابن زبیر نے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے ان سے کہا: میری طرف سے ایسے فریب کار کو خوش آمدید نہیں ہے جو سر کو چھپائے ہوئے اپنی دُم کو پٹختا رہتا ہے۔ قسم بخدا! عنقریب اس کو دم کی طرف سے پکڑ لیا جائے گا اور اس کی کمر توڑ دی جائے گی۔ پھر کہا: اس کو میرے پاس سے پرے لے جاؤ۔ یہ کہتے ہوئے انھوں نے ابن زبیر کی سواری کے منہ پر چابک رسید کیا۔ اس کے بعد جب عبد الرحمٰن بن ابی بکر ان سے ملے تو ان سے انھوں نے کہا: ایسا بوڑھا کہ جس کی عقل جاتی رہی ہے، اس کو میری طرف سے خوش آمدید نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سواری کے منہ پر بھی چابک مار دیا۔ نیز انھوں نے ابن عمر کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ کیا۔

اس طرح معاویہ مدینہ میں داخل ہوئے مگر ان چاروں افراد میں سے کسی کے گھر پر اترنے کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ تاہم دوسرے لوگوں کو بھی ان میں کوئی پسندیدہ بات نظر نہیں آئی۔ پھر وہ مکہ گئے اور وہاں کے لوگوں کے سامنے ایک تقریر کی جس میں اپنے بیٹے یزید کا ذکر کیا اور اس کی خوب تعریف و توصیف کی۔ بعد میں وہ بی بی عائشہ سے ملنے گئے۔ وہ یہ خبر سن چکی تھیں کہ معاویہ نے امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کو یہ دھمکی دی ہے کہ اگر وہ یزید کی بیعت نہ کریں گے تو ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے بی بی عائشہ سے ان لوگوں کی شکایت کی۔ اس پر وہ بولیں: مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تم نے ان لوگوں کو قتل کی دھمکی دی ہے۔ معاویہ نے کہا: میں نے یزید کے لیے بیعت لی ہے اور ان چار افراد کے علاوہ سبھوں نے اس کی بیعت کرلی ہے تو اب جبکہ بیعت مکمل ہو گئی ہے کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ اس کو توڑ دیا جائے۔ اس پر وہ بولیں: پھر بھی تم ان کے معاملے میں نرمی سے کام لو اس لیے کہ وہ بھی اسی طرف آجائیں گے جدھر تم انکو لانا چاہتے ہو۔

پھر وہ ان سے مذاق کے طور پر کہنے لگیں: تم نے یہ کیسے یقین کر لیا کہ جو کچھ تم نے میرے بھائی محمد کے ساتھ کیا تھا اس کی وجہ سے میں نے تمہارے پیچھے ایسے آدمی لگا دئے ہیں جو تم کو دھوکے سے مار ڈالیں۔ اس پر وہ بولے کہ نہیں! نہیں! میں تو آپ کے گھر میں خود کو ہر طرح سے محفوظ سمجھتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ان کے گھر سے یہ ارادہ لے کر چلے کہ بیعت سے انکار کرنے والوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں گے بشرطیکہ وہ ان کے مطالبہ کو مان لیں۔ اب انھوں نے امام حسینؑ اور دوسرے معترضین کو بلوایا اور ان کو بتایا کہ میں نے یزید کو کیوں منتخب کیا ہے۔ پھر ان سے خواہش کی کہ وہ اس کی تائید کریں اور اس کا ساتھ دیں۔ گویا انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ بھی وہی طرز عمل اختیار کیا جو انھوں نے امام حسنؑ کے ساتھ اس وقت اختیار کیا تھا جب ان کو صلح کی تجویز پیش کی تھی۔ منجملہ اور باتوں کے انھوں نے یہ بھی کہا: حکومت دراصل تمہاری ہی ہوگی، کیونکہ تدبیر مملکت تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔ یزید کی خلافت تو بس برائے نام ہوگی۔

ظاہر ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے دوسرے ساتھی اس طرح مطمئن نہ ہو سکتے تھے نہ وہ اس قسم کی پیشکش کے دھوکے میں آسکتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ان بزرگوں ڈالا

کہ یا تو آپ ابوبکر کی طرح عمل کریں جنہوں نے ایسے شخص کو خلافت کے لیے منتخب کیا جو ان کے اہل میں سے نہیں تھا۔ یا آپ عمر بن خطاب کی طرح عمل کریں جنہوں نے چھ آدمیوں کو نامزد کر دیا اور خلافت انہی میں مرکوز کر دی تھی۔ اس پر وہ غصہ سے بیٹھ گئے اور بولے: اب تک تو میں اس طرح بات کر رہا تھا کہ تم میں سے جس کسی کو کوئی بات ناپسند تھی، وہ مجھ کو ٹوک دیتا تھا، نہ میں اس کو بُرا کہتا تھا نہ اس کی بات کا بُرا مانتا تھا۔ ہاں سن لو کہ اب میں مسجد نبویؐ جا رہا ہوں، جہاں میں اپنے فیصلے کا اعلان کروں گا۔ اگر تم میں سے کسی نے میری بات کاٹی یا جو کچھ میں کہوں گا اس کی مخالفت کی تو قبل اس کے کہ اس کے الفاظ ہونٹوں پر آئیں، میری تلوار اس کی گردن پر جا پڑے گی۔

پھر امام حسینؑ اور دوسرے تینوں افراد کو مسجد میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ تب معاویہ منبر پر آئے۔ اللہ کی حمد و ثناء کی اور کہا: میں نے اپنے بعد کے لیے مسلمانوں کی حکومت کے معاملے پر بڑا غور کیا ہے لیکن اس کے لیے میں نے اپنے بیٹے یزید سے زیادہ مناسب کسی کو نہیں پایا۔ انہوں نے مزید کہا: میں نے حسینؑ بن علیؑ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ ابن زبیر اور عبدالرحمٰن ابن ابی بکر سے کہہ دیا ہے کہ یزید کوئی بھی معاملہ ان کے بغیر طے نہ کرے گا اور وہ ان کی رائے کے بغیر کوئی اقدام نہ کرے گا۔ وہ سب اس بات کو مان گئے ہیں اور یہ امر انھوں نے مجھ پر چھوڑ دیا ہے کہ اب میں جیسے چاہوں اس کو پورا کروں۔

انہوں نے جن افراد کے نام لیے ان میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ نہ کسی نے ان کو ٹوکا، کیونکہ بیشتر مورخین نے صراحت کی ہے کہ اس وقت ان کے سروں پر تلواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ مگر وہاں موجود عام لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ سب معاویہ کے ساتھ متفق ہیں۔ چنانچہ سب لوگوں نے یزید کی بیعت کر لی۔ اس طرح مکر اور فریب سے معاویہ کی اس خواہش کی تکمیل ہو گئی اور انھوں نے دوسرے شہروں کی طرح، یزید کی بیعت سے مدینہ کی موافقت کا اعلان بھی کر دیا۔

معاویہ یہ سب کچھ کر کے شام واپس چلے گئے لیکن ان کے دل میں کھٹکا لگا رہا کہ ان کی مخالفت سب سے پہلے عراق سے سر اٹھائے گی۔ وہاں کے لوگ امام حسینؑ کو خط لکھ کر بلائیں گے تاکہ ان کی بیعت کریں۔ پھر حالات خواہ کچھ بھی ہوں وہ انکی دعوت کو

منظور کر لیں گے۔ چنانچہ مؤرخوں کے ایک گروہ کے مطابق اسی لیے انھوں نے یزید کو امام حسینؑ پر فتحمند ہونے کی صورت میں، ان سے درگزر کرنے کی وصیت کی تھی۔ میں اس وصیت کے صحیح ہونے کی صورت میں اس کے بارے میں اپنی رائے پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں۔ پس اگر یہ صحیح بھی ہو تو اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ معاویہ کو یہ احساس تھا کہ جب کبھی کوئی شخص بنی امیہ سے حکومت چھیننا چاہے گا وہ ان کے خلاف قتل حسینؑ کو ایک زبردست حربے کے طور پر استعمال کرے گا۔

امام حسینؑ عہد یزید میں

معاویہ ابن ابی سفیان نے سنہ ۶۰ھ میں وفات پائی۔ ان کی زندگی گناہوں، ناجائز کاموں اور اسلام کے اصولوں کی کھلی خلاف ورزیوں سے بھری ہوئی تھی لیکن ان سب پر طرہ یہ تھا کہ انھوں نے اپنے بیٹے یزید کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا، حالانکہ وہ اس کی بدکرداری سے واقف تھے۔ باوجودیکہ ان کے ناپسندیدہ اقدام کے خلاف ہر طرف سے آوازیں اٹھ رہی تھیں، پھر بھی وہ اس پر اڑے رہے اور لوگوں سے وعدہ و وعید کے ذریعے اس کے حق میں بیعت لیتے رہے۔ پھر جیسے ہی وہ ان کے بعد حکومت پر قابض ہوا، اس نے نتائج سے بے پروا ہو کر امام حسینؑ سے اپنی حکومت کی شرعی حیثیت کی تصدیق کرانے کی کوشش شروع کر دی چنانچہ اس نے مدینہ کے گورنر کو لکھا: سب لوگوں سے عموماً اور امام حسینؑ سے خصوصاً میری بیعت لے لو۔ نیز اس پر زور دیا کہ وہ امام حسینؑ کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور ان سے کسی قسم کی رعایت نہ کرے تا اینکہ وہ بیعت کر لیں۔ جونہی گورنر کو وہ خط ملا، اس نے امام حسینؑ کے بارے میں مشورہ کے لیے مروان بن حکم کو بلا بھیجا کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ یزید کی بیعت نہ کریں گے، اس لیے یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ مروان نے اس کو یہ رائے دی ہو کہ وہ امام حسینؑ کو روکے رکھے تاکہ وہ بیعت کر لیں، ورنہ ان کو قتل کر دے۔ اس لیے کہ وہ محمدؐ و آل محمدؐ کا بدترین دشمن تھا اور فی الوقت خود حکومت حاصل کرنے کی فکر میں تھا کیونکہ جب معاویہ نے اس سے یزید کو ولی عہد بنانے کے بارے میں مشورہ کیا تھا تو اس نے اس تجویز کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ بعض مؤرخین کا خیال ہے، اسی بنا پر معاویہ نے اس کو مدینے سے معزول کر کے ایک دوسرے شخص کو گورنر مقرر کر دیا

تھا۔ مروان یہ بھی جانتا تھا کہ قتل حسینؑ نہ صرف ابوسفیان کے گھرانے کے لیے بدترین نتائج پیدا کرے گا بلکہ وہ حکومت کی طمع اور خواہش رکھنے والوں کے ہاتھ میں سب سے با اثر ہتھیار کا کام دے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ البتہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ جب اس نے گورنر کو یزید کی بیعت نہ کرنے کی صورت میں امام حسینؑ کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت بغض اہلبیتؑ کے علاوہ یہ بات بھی اس کے دل میں رہی ہو۔ تاہم ولید بن عتبہ بن ابی سفیان خاصا عقلمند ثابت ہوا اور مروان اس سے ایسے جرم کا ارتکاب کرانے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کی مثال تاریخ میں نابود ہے۔

چنانچہ ولید نے امام حسینؑ کو رات کے وقت بلا بھیجا۔ جب قاصد پہنچا تو آپ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت تک معاویہ کے مرجانے کی خبر لوگوں میں نہ پھیلی تھی۔ تب امامؑ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ولید نے آپ کو مرگ معاویہ کی اطلاع دینے اور نئے حکمران کی بیعت لینے کے لیے بلایا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے بھائیوں، بیٹوں اور دوستوں کو بتلایا کہ گورنر نے مجھے بلایا ہے۔ مزید فرمایا کہ: مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ مجھ سے ایسی بات کا مطالبہ کرے گا جو میں نہ مانوں گا۔ اس لیے ممکن ہے میرے اور اس کے درمیان اختلاف ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو کہا کہ تم میرے ساتھ چلے چلو۔ ساتھ ہی یہ سمجھا دیا کہ تم لوگ دروازے پر ٹھہرے رہنا تاوقتیکہ میں تمہارے پاس واپس نہ آجاؤں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: البتہ اگر تم سنو کہ گھر کے اندر میری آواز بلند ہوئی ہے تو تم سب یکدم وہاں آجانا۔ چنانچہ وہ سب لوگ آپ کے ساتھ آئے۔ تاہم امامؑ تنہا ہی اندر تشریف لے گئے جہاں پہلے تو گورنر نے ان کو معاویہ کی خبر مرگ سنائی۔ پھر اس نے آپ کے سامنے یزید کا وہ خط پڑھا جس میں اس نے امام حسینؑ سے سخت رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا تھا تاآنکہ وہ بیعت کر لیں۔ اس پر امامؑ نے یہ جواب دیا: یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو علانیہ طور پر اتمام پذیر ہونا چاہیے۔ پس جب صبح کے وقت اور لوگ جمع ہوں گے تو ہم بھی اس پر غور کریں گے۔ مروان، جو اس موقع پر وہاں موجود تھا، اس نے گورنر کو یہ مشورہ دیا: امام حسینؑ کو روکے رہو، یہاں تک کہ وہ بیعت کر لیں۔ ورنہ ان کی گردن اڑا دو کیونکہ اگر یہ اس وقت بیعت کیے بغیر چلے گئے تو پھر تم کبھی ان پر قابو نہ پا سکو گے۔ اس پر امامؑ نے

مروان کو ڈانٹا: اے ابن زرقاء! تو اس کو میری گردن اڑانے کا مشورہ دے رہا ہے۔ اس سے دونوں طرف غصّے کے آثار ظاہر ہو گئے۔ تب امامؑ نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ اس طلب بیعت کے بارے میں گورنر پر اپنی رائے واضح کر دیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: ہم اہلبیتؑ نبوت اور معدن رسالت ہیں۔ ہم ہی سے اللہ نے دین کی ابتدا کی اور ہم ہی پر اس کی انتہا بھی کی ہے۔ پھر تم جانتے ہی ہو کہ یزید ایک کھلا ہوا بدکار اور اسلام کی تحقیر کرنے والا شخص ہے۔ پس سمجھ رکھو کہ مجھ ایسا شخص اس کی بیعت نہیں کریگا۔ پھر بھی ہم تم کو صبح کا انتظار کرنا چاہیے۔

اب گورنر ڈرا کہ کہیں امام حسینؑ اور مروان کا اختلاف اتنا نہ بڑھ جائے کہ جس کے نتائج مصلحت کے خلاف ہوں۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہاشمی نوجوان دروازے پر امام حسینؑ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے آپ سے کہا: اے ابو عبداللہ! اس وقت آپ گھر چلے جائیے۔ اب ہماری اور آپ کی ملاقات کل مسجد میں ہوگی۔

جب امام حسینؑ والیٔ مدینہ کے ہاں سے چلے گئے تو مروان نے اس سے کہا: تم نے میرا کہنا نہ مانا۔ بخدا! اب تمہیں ایسا موقع کبھی نہ ملے گا۔ اس پر وہ بولا: ارے مروان وائے ہو تم پر۔ کیا تم مجھ کو رسول اکرمؐ کے نواسے کو قتل کرنے کا مشورہ دیتے ہو؟ قسم بخدا! جو شخص قیامت میں خون حسینؑ کا جرم لیے ہوئے مقام حساب میں کھڑا ہوگا، اللہ کے سامنے اس کا پلہ ہلکا ہی رہے گا۔

ادھر امام حسینؑ نے وہاں سے آتے ہی سواریاں تیار کرانا شروع کر دیں تاکہ مدینہ کی حدود سے باہر چلے جائیں، کیونکہ آپ نے موقع کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ جیسا کہ بیشتر روایات بتاتی ہیں، پھر چند ہی روز کے اندر آپ اپنے اہل و عیال سمیت، رات کی تاریکی میں مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس وقت یہ آیت آپ کے ورد زبان تھی:

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ...

یعنی "وہ وہاں سے خوف کی حالت میں نکلے اور کہتے جاتے تھے کہ بارِ الٰہا مجھ کو ظالموں سے نجات دلا دے" (سورۂ قصص۔ آیت ۲۱)

آپ اسی راستے سے جا رہے تھے، جس سے لوگ عموماً جایا کرتے تھے۔ آپ سے کہا بھی گیا کہ آپ بھی راستہ تبدیل فرما کر سفر کریں، جیسا کہ عبداللہ بن زبیر نے کیا۔

جو امام حسینؑ سے چند روز پیشتر مکہ کی طرف چل کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن آپ نے کوئی دوسرا راستا اختیار کرنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا: قسم ہے اللہ کی میں شاہراہ کو ترک نہ کروں گا تا اینکہ اللہ وہ فیصلہ کردے جو اس کی مرضی کے مطابق ہو۔

آپ ۳ شعبان ۶۰ھ کو مکہ میں داخل ہوئے۔ پھر شعبان کے باقی ایام، ماہ رمضان، شوال اور ذیقعد میں آپ وہیں قیام پذیر رہے۔ حتیٰ کہ آٹھویں ذو الحجہ کو آپ مکہ سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت محمد بن حنفیہ کے سوا آپ کے سب بھائی آپ کے ساتھ تھے۔

البتہ محمد بن حنفیہ کے بارے میں مختلف روایات بیان کی گئی ہیں۔ بعض روایات بتاتی ہیں کہ وہ سخت بیمار تھے اور کسی کام کے لیے اٹھ بیٹھ یا چل پھر نہ سکتے تھے لیکن بعض روایات میں ہے کہ امام حسینؑ نے ان کو حجاز میں اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ وہاں کے لوگوں اور ان کی حرکات پر نگاہ رکھیں۔ چنانچہ آپ نے ان سے فرمایا: پیارے بھائی! آپ کے لیے ضروری ہے کہ مدینہ ہی میں ٹھہرے رہیں اور ان لوگوں پر میری طرف سے نگہداری فرماتے رہیں تاکہ ان کی خبریں مجھ سے پوشیدہ نہ رہیں۔ اس پر محمد بن حنفیہ نے آپ سے کہا: پیارے بھائی! آپ یزید کی بیعت سے باز رہیے اور جہاں تک ممکن ہو بڑے شہروں سے بھی دور رہیے۔ البتہ آپ اپنے قاصدوں کو لوگوں کے پاس بھیجیے۔ اگر وہ آپ کی بیعت کر لیتے ہیں تو اللہ کا شکر ہے اور اگر وہ آپ کے علاوہ کسی اور پر اتفاق کرتے ہیں تو اس سے آپ کے دین اور آپ کی عقل میں کوئی کمی نہ آئیگی، آپکے مقام و مرتبہ میں کوئی فرق نہ پڑیگا۔ اس پر امام حسینؑ نے فرمایا میرے بھائی خدا آپکو جزائے خیر دے کہ آپ نے نصیحت اور شفقت کا حق ادا فرمایا ہے۔ ہاں تو میں بردست اپنے بھائیوں، بھتیجوں اور مددگاروں کیساتھ مکہ جارہا ہوں۔ پیارے بھائی! قسم بخدا! اگر دنیا میں میرے لیے کوئی بھی جائے پناہ اور مقام امن نہ رہے گا، تب بھی میں ہرگز یزید کی بیعت نہ کروں گا۔ اس کے بعد جیسا کہ بیشتر روایات بتاتی ہیں، آپ نے انکو بعض اہم امور کے بارے میں ہدایات دیکر رخصت فرمایا۔

بیشتر روایات میں جو یزید کی بیعت کے متعلق امام حسینؑ کے موقف سے بحث کرتی ہیں وہ بتلاتی ہیں کہ مکہ کے راستے میں عبداللہ بن مطیع نے امام حسینؑ سے ملاقات کی اور کہا: میری جان آپ پر فدا ہو، آپ کہاں کا ارادہ رکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

سر دست تو مکہ کی طرف جاتا ہوں لیکن آئندہ کے لیے میں اللہ سے استخارہ کروں گا۔ اس پر عبداللہ بولے: اللہ آپ کی مدد فرمائے اور ہم کو آپ کا فدیہ قرار دے۔ آپ مکہ تشریف لے جا رہے ہیں لیکن آپ کوفے ہرگز نہ جائیے گا۔ وہاں آپ کے والد بزرگوار کو قتل کیا گیا۔ پھر آپ کے بھائی کا ساتھ چھوڑ دیا گیا اور ان پر ایسا پر فریب حملہ کیا گیا کہ اس میں ان کی جان ہی چلی جاتی۔ پس آپ کعبہ ہی میں رہیے۔ آپ عرب کے سردار ہیں۔ اہل حجاز میں سے کوئی آپ سے روگردانی نہ کرے گا اور لوگ ہر طرف سے آپ کے پاس آتے رہیں گے۔ اے ابوعبداللہ! میرے چچا اور ماموں سب آپ پر فدا ہوں، آپ ہرگز کعبہ سے نہ ہٹیے گا۔ اگر آپ مارے گئے تو قسم بخدا! آپ کے بعد ہم سب برباد ہو جائیں گے۔

امام حسین ع مکہ میں

امام حسین ع اپنے اہل و عیال، بھائیوں، بھتیجوں اور بعض مددگاروں کے ساتھ مدینے سے روانہ ہوئے۔ آپ نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو وہیں چھوڑا تاکہ وہ آپ کو حکومت کے کارندوں کے افعال سے باخبر رکھیں۔ قبل اس کے کہ آپ مدینہ سے روانہ ہوں، آپ اپنے نانا، اپنی والدہ اور اپنے بھائی کے مزاروں پر حاضر ہوئے۔ آپ نے امت کی طرف سے کیے ہوئے ظلم و جور اور احکامِ دین کی تحقیر کے بارے میں ان سے شکایت فرمائی۔ آپ نے مکہ کی جانب انہی مہینوں میں سفر فرمایا جن میں مسلمان وہاں عمرہ اور حج ادا کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ آپ مکہ میں چار ماہ اور کچھ دن مقیم رہے۔ اس زمانہ میں آپ لوگوں کے دلوں اور ذہنوں کے مرجع بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسلمان آپ کے گرد جمع رہتے اور آپ سے احکام اسلام اور حلال و حرام کے مسائل معلوم کرتے تھے۔ بیشتر اوقات اور لوگوں کے ساتھ ابن زبیر بھی آپ کی خدمت میں آتے تھے۔ مکہ کے گورنر یحییٰ بن حکیم نے امام سے کوئی تعرض نہیں کیا اور آپ کو آپ کے حال پر چھوڑے رکھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ یزید نے اس کو اس عہدے سے برطرف کر دیا اور اس کی بجائے عمر بن سعید بن العاص کو گورنر بنا دیا۔ پھر اس سے اگلے مہینے یعنی رمضان میں مدینہ کو بھی اسی کے تحت کر دیا اور ولید بن عتبہ کو وہاں سے برطرف کر دیا، کیونکہ ابن قتیبہ کے بقول قبل ازیں اس نے بھی امام حسین ع کے ساتھ معتدل رویہ اختیار کیا تھا۔

اس دوران میں مختلف علاقوں کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے عام لوگوں خاص کر اہل کوفہ کی نظریں آپ کی طرف اٹھنے لگیں کیونکہ اس زمانے میں وہ یزید کے بارے میں سب سے زیادہ بددل تھے اور ان میں سے بیشتر افراد امام حسینؑ کی طرف مائل تھے۔ انہی دنوں وہ سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان میں جمع ہوئے، تب سلیمان نے ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: تم سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ معاویہ وفات پا گئے اور ان کے بعد یزید نے حکومت سنبھال لی ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ امام حسینؑ نے یزید کی بیعت نہیں کی اور وہ اپنے اہل و عیال سمیت مدینہ سے مکہ چلے گئے ہیں۔ تم لوگ جو ان کے انصار ہو، اس وقت ان کو تمہاری نصرت کی سخت ضرورت ہے۔ پس اگر تم ان کے مددگار اور ان کے دشمن سے جنگ کرنے والے ہو تو ان کو لکھ بھیجو۔ ہاں اگر تم کو اپنی کمزوری اور کم ہمتی کا اندیشہ ہے تو پھر ان کو دھوکے میں نہ رکھنا۔ اس پر سب نے کہا کہ ہم ضرور ان کے دشمن سے جنگ کریں گے اور اپنی جانیں ان پر قربان کر دیں گے۔ چنانچہ باہم گفتگو اور مشورہ سے ان کی یہ رائے طے پائی کہ اپنا ایک وفد امامؑ سے ملاقات کرنے مکہ بھیجیں۔ چنانچہ ان میں سے ممتاز اور ذی حیثیت افراد نے اسی وفد کے ہاتھ ایک خط بھی لکھ بھیجا جس میں کہا گیا تھا:

پس بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک آپ کے سوا کوئی دوسرا امام نہیں ہے۔ آپ ہماری طرف تشریف لے آیئے تاکہ اللہ آپ کے ذریعے ہم کو حق پر متحد کر دے۔ اس وقت یہاں کا گورنر نعمان بن بشیر ہے لیکن ہم اس کے ساتھ جمعہ و جماعت میں شریک نہیں ہوتے، نہ اس کے ساتھ نماز عید کے اجتماع میں جاتے ہیں۔ آپ کی تشریف آوری کی اطلاع پر ہم اس کو کوفے سے نکال باہر کریں گے تاکہ وہ شام چلا جائے۔ بعد ازاں ان لوگوں کے خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ دس، بیس اور پچاس تک پہنچ گئے۔ ان میں سے بیشتر خطوں میں وہ لوگ یہ کہتے تھے: علاقہ سرسبز ہے اور پھل تیار ہیں۔ ہمارے نزدیک آپ کے سوا کوئی اور امام نہیں ہے۔ پس آپ تشریف لے آیئے کیونکہ آپ ہی حکومت کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ بلکہ آپ ہی خلافت اور امامت کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ ان کے یہ خطوط

وقتاً فوقتاً آپ کے پاس پہنچتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد اتنی ہوگئی کہ ان سے دو تھیلے بھر گئے۔ چنانچہ آپ مکہ سے عراق روانہ ہوئے تو اہل کوفہ کے یہ خطوط اپنے ساتھ لے گئے تاکہ اگر ان لوگوں کی طرف سے کوئی خرابی یا انحراف کی صورت سامنے آئے تو آپ ان خطوں کی بنیاد پر اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیں۔

بعض روایات واضح کرتی ہیں کہ عراق کے علاوہ اسی مضمون کے خط مدائن اور دوسرے مقامات سے بھی آئے تھے۔ نیز عراق، یمن اور دیگر اسلامی علاقوں سے وفد بھی آتے رہے جو آپ سے بیعت کرنے کی پیشکش کرتے اور یزیدی حکومت کے خلاف اپنے اتحاد کا اظہار کرتے تھے۔ بایں ہمہ امام حسینؑ ان لوگوں کی خواہش کو پورا کرنے کا ارادہ نہ رکھتے تھے، تاوقتیکہ آپ اصل حالات معلوم کر لیں اور ان لوگوں کو اس طرح آزمالیں کہ جس میں کسی الجھاؤ کی گنجائش نہ ہو۔ چنانچہ آپ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو شہر کوفہ بھیجا۔ وہ آپ کے نزدیک قابل اعتماد اور علم، عقل اور شجاعت میں سب سے برتر تھے۔ آپ نے ان کو ہدایت کی کہ اگر وہ اہل کوفہ کو ان کے خطوں کے مطابق پائیں تو اس بات سے آپ کو مطلع کر دیں، پھر ان کے بعد آپ بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔

بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم بن عقیل اپنے اس سفر کو کوئی نیک فال نہیں سمجھ رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اہل عراق اپنی بات سے کس طرح پلٹ جاتے تھے۔ جیسا کہ وہ ان کے چچا امیر المومنین امام علیؑ کے ساتھ اپنے پیمان سے منحرف ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امیر المومنینؑ یہ تمنا کرنے لگے تھے کہ ان کو موت یا قتل کے ذریعے ایسے غداروں سے چھٹکارا مل جائے۔ اسی طرح ان لوگوں نے ان کے عم زاد بھائی امام حسنؑ کے ساتھ بھی بے وفائی کی اور ان کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ معاویہ کے حق میں حکومت سے دستبردار ہو جائیں۔ مسلم بن عقیل نے اس معاملے میں امام حسینؑ کے سامنے وضاحت بھی پیش کی لیکن آپ نے ان کو اس مہم سے الگ نہ ہونے دیا۔ چنانچہ وہ کوفہ روانہ ہو گئے۔ گو اب بھی وہ اس مہم کو بدشگونی پر محمول کر رہے تھے۔ بعد میں جب ان کے دونوں رہبر راستہ بھول گئے اور ان میں سے ایک پیاس کی شدت سے مر گیا تو انہوں نے ایک بار پھر امام حسینؑ کو لکھا کہ انہیں اس مہم پر جانے سے معذور سمجھا جائے

لیکن آپ نے ان پر زور دیا کہ وہ کوفہ کی جانب اپنا یہ سفر جاری رکھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس سفر کو جاری رکھا۔ یہاں تک کہ کوفہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں کے لوگوں نے کشادہ دلی سے ان کا استقبال کیا اور وہ مختار بن ابو عبیدہ ثقفی کے یہاں مہمان ٹھہرے۔ وہیں وہ لوگوں سے ملاقاتیں کرتے اور امام حسینؑ کے مقاصد کی تشہیر کرتے رہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے امامؑ کی تا مرگ بیعت کا اقرار کیا، ان کی تعداد کم و بیش چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس زمانے میں نعمان بن بشیر، یزید کی طرف سے کوفے کا گورنر تھا۔ مؤرخوں کا کہنا ہے کہ وہ امن پسند تھا، تفرقے سے نفرت کرتا تھا اور سکون کو ترجیح دیتا تھا، اسی وجہ سے اس پر کمزوری اور بدنظمی کا الزام عائد کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کے کچھ ساتھی جو یزید کے حامی تھے، انھوں نے کوشش کی کہ اس کو مسلم بن عقیل کے ساتھیوں سے بھڑا دیں لیکن اس نے سختی اور درشتی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا۔

لوگوں کو امام حسینؑ کی طرف دعوت دیے جانے کا سلسلہ کوفہ اور اس کے نواح میں پھیلتا رہا۔ چنانچہ لوگوں میں آپ کا اس قدر چرچا ہو گیا کہ اب وہ نعمان اور اس کے حاشیہ برداروں کو شاق گزرنے لگا۔ چنانچہ بنی امیہ کے کسی بہی خواہ نے مسلم بن عقیل کی تحریک اور نعمان بن بشیر کی کمزور پالیسی کی خبر یزید تک پہنچا دی۔ اس نے اپنے خط میں لکھا کہ: اگر آپ کو عراق پر حکومت کرنے میں ذرا بھی دل چسپی ہے تو یہاں کسی ایسے آدمی کو بھیجیے کہ جس کے ارادے، قوت اور پختگی پر آپ کو بھروسہ ہو۔ اس خط کے ملنے پر یزید نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ اس موقع پر اس کے باپ کے ایک قریبی ساتھی سرجون رومی نے کہا: تمہارا کیا خیال ہے، اگر اس وقت معاویہ تمہارے سامنے آجائیں اور تم کو مشورہ دیں تو کیا تم اس پر عمل کرو گے؟ اس نے کہا: ہاں! میں ان کے مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔ تب اس نے ایک خط نکالا جو معاویہ نے اپنی وفات کے وقت سرجون کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ خط اس بارے میں تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا جائے۔ پس یزید نے اس خط کے مضمون پر عمل کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کی اور اسی وقت ابن زیاد کو حکم بھیج دیا کہ کوفہ جا کر اقتدار سنبھالے اور وہاں کے معاملات کو درست کرے۔ اس نے یہ امر اسی پر چھوڑ دیا کہ وہ جس کو مناسب سمجھے،

اس کو بصرہ میں اپنی جگہ مقرر کردے۔ نیز اس کو یہ حکم بھی دیا کہ اگر اس میں اللہ اس کی مدد کرے تو وہ مسلم بن عقیل کو قتل کر دے، پھر امام حسینؑ سے بھی جنگ کرے اور ہو سکے تو ان کو بھی قتل کر دے اور ان کا سر میرے پاس بھیج دے۔ یہ خط ملتے ہی ابن زیاد نے بصرے کی امارت اپنے ایک مددگار کے سپرد کر دی اور تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنا بھیس بدلے اور منہ کو چھپائے ہوئے کوفہ میں داخل ہوا۔ تب وہ لوگ اس کو حسینؑ بن علیؑ سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ جب وہ اہل کوفہ کے کسی گروہ کے قریب سے گزرتا تو وہ اس کو کشادہ دلی سے خوش آمدید کہتے۔ پھر ہر طرف سے یہ آوازیں بلند ہوتی تھیں کہ اے فرزندِ رسولؐ! خوش آمدید، آپ کو ہزار بار خوش آمدید، یہاں آپ کی تشریف آوری اور قیام مبارک ہو، لیکن وہ اس وقت خاموش تھا اور بالکل بولتا نہ تھا۔ کسی کو سلام بھی کرتا تو صرف اشارہ ہی کر دیتا تھا لیکن وہ غصے اور جلن سے کھول رہا تھا جس میں ہر گھڑی اضافہ ہوا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گورنر کے محل پر جا پہنچا، لیکن نعمان نے امام حسینؑ کے حامیوں کے خوف سے اس کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا: اے فرزند رسولؐ! خدا کی قسم میں آپ سے جنگ نہیں کروں گا تاوقتیکہ آپ مجھ سے جنگ نہ کریں لیکن میرے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کمی کروں۔ پس آپ یہاں سے تشریف لے جائیے اور کوفہ میں جہاں چاہیں قیام فرمائیے۔ خدا کی قسم جب تک آپ مجھ سے دور رہیے گا، میں آپ سے جنگ نہ کروں گا۔

اب تو عبید اللہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ عوام محل کے راستے میں حائل ہیں اور امام حسینؑ کے نام کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کوفہ کا گورنر لوگوں سے الگ اور اپنے قصر میں بند ہے۔ اب اس کے بس میں کچھ نہیں ہے اور اس پر اتنا خوف طاری ہے کہ جس سے اس کی روح اس کے جسم سے مفارقت کر جائے۔ تب اس نے کہا: دروازہ کھولو، ورنہ میں خود ہی کھول لوں گا۔ میں عبید اللہ بن زیاد ہوں! تمہارے فرمانروا نے مجھ کو اس شہر کا حاکم بنا کر بھیجا ہے۔

مسلم بن عقیل کے ساتھ غداری

جیسے ہی نئے گورنر نے قصر میں قدم رکھا اور اقتدار سنبھالا، اس کے ساتھ ہی اس نے

مسلم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے نتائج سے بے پروا ہو کر لوگوں کو منتشر کرنے اور مسلم کو گرفتار کرنے کے لیے ہر قسم کی تدابیر بروئے کار لانا شروع کر دیں۔ ادھر بات کی بات میں ابن زیاد کے کوفہ آنے کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ وہاں کے لوگ اس کی طبیعت کی درشتی ارادے کی پختگی اور سخت گیری سے پہلے ہی واقف تھے لہٰذا فطری طور پر ان لوگوں کی صفوں میں ہلچل پڑ گئی جو مسلم بن عقیل کی قیادت میں یزید کے طرز عمل کی مخالفت کر رہے تھے۔
ان حالات میں مسلم نے امام حسینؑ کے حق میں اپنی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے ایک نیا راستا اختیار کیا۔ چنانچہ اب وہ ہانی بن عروہ کے مکان میں منتقل ہو گئے اور اپنی سرگرمیوں کو چند خاص افراد کے سوا سب سے پوشیدہ رکھنے لگے۔ ادھر ابن زیاد نے اپنے خاص داؤ پیچ سے ان کی تلاش شروع کر دی۔ چنانچہ وہ اپنی ایک تدبیر کو کام میں لا کر مسلم بن عقیل کے خفیہ مرکز کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ ہانی اس زمانے میں بنی مراد کے سردار تھے اس لیے کوفہ میں ان کی بات سنی اور ان کی رائے مانی جاتی تھی۔ یہیں سے وہ واقعات ظاہر ہونے لگے جو مورخوں میں مشہور ہیں کیونکہ ان کا تعلق اسی واقعہ کربلا سے ہے جو اپنے وقوع پذیر ہونے کے وقت سے تمام آنے والی نسلوں میں برابر مرکز گفتگو ہے اور اہلبیتؑ سے وابستگی کا نمایاں نشان بنا رہا ہے۔ مزید یہ کہ جب تک صفحۂ ہستی پر ایسے افراد کا وجود باقی ہے جو بہادری کے کارناموں، عظیم قربانیوں اور مثالی کرداروں کی قدر کرتے ہیں جن کے عملی نمونے امام حسینؑ نے پیش کر دکھائے، یہ تاریخ انسانی کا ممتاز ترین اور سب سے زیادہ سبق آموز واقعہ مانا جاتا رہے گا۔ لیکن اس خیال سے کہ یہاں میں اپنے قاری کو زیادہ دیر تک روکے نہ رہوں، میں اس مرحلہ سے جلد گزر جاؤں گا جس میں سید الشہداء امام حسینؑ نے اپنی زندگی کے اٹھاونویں سال کو ختم فرمایا جو کل کی کل نیکی، جہاد، عطاء اور ہر معنی سے شرافت، فضیلت اور عظمت سے بھرپور تھی۔

بات ہو رہی تھی ابن زیاد کی، چنانچہ جب یہ نیا گورنر حیلے بہانے سے ہانی بن عروہ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا، جنھوں نے امام حسینؑ کے سفیر (مسلم بن عقیل) کو پناہ دی، ان کی اچھی مہمانداری کی اور رائے اور تدبیر میں ان کے ساتھ شریک رہے تھے۔ اس نے ان کو گرفتار کرنے کے بعد قتل کر دیا اور ان کی لاش قصر کے اوپر سے عوام الناس

کی جانب پھینک دی جو وہاں چاروں طرف سے ہجوم کیے ہوئے تھے۔ اس سے لوگوں پر خوف طاری ہوگیا اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ چنانچہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کی طرف چل دیا اور کسی کو اس معاملے کی پرواہی نہ رہی۔

جب مسلم بن عقیل کو معلوم ہوا کہ ہانی پر کیا گزری اور یہ کہ مذحج ایسا باوسیلہ قبیلہ بھی ان کو چھوڑ کر چلا گیا ہے تو وہ اپنے ساتھیوں کو لیکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے منادیوں نے لوگوں میں اس کا اعلان کر دیا اور وہ ان سب کے ساتھ گورنر کے محل کا محاصرہ کرنے کو چل پڑے۔ ابن زیاد اس محاصرے کی ابتدا میں تو سخت پریشان ہوا، لیکن پھر اپنے حیلے بہانوں سے اس پریشانی سے نکلنے اور لوگوں کو مسلم بن عقیل سے گریزاں کر دینے میں کامیاب ہوگیا۔ چنانچہ سب لوگ ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ جب نماز مغرب کا وقت آیا تو انھوں نے ان چند آدمیوں کے ساتھ نماز ادا کی جو ان کے ساتھ رہ گئے تھے لیکن جب آپ مسجد سے باہر تشریف لائے تو آپ بے یار و مددگار اور تن تنہا رہ گئے تھے، کوئی ان کو راستا بتانے والا بھی نہ تھا۔ مزید یہ کہ لوگوں نے ان پر اپنے گھروں کے دروازے بھی بند کر رکھے تھے۔ چنانچہ وہ اس تلاش میں چلے کہ کسی گھر میں ان کو آج کی رات کے لیے پناہ مل جائے۔ وہ رات کی تاریکی میں ادھر ادھر پھر رہے تھے کہ ایک مکان کے دروازے پر ان کو ایک عورت کھڑی نظر آئی جیسے وہ کسی کے انتظار میں تھی۔ انہوں نے اس سے اپنا تعارف کرایا اور اس کے یہاں رات گزارنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے خوش دلی سے ان کو اپنے گھر میں بلا لیا اور کھانا پیش کیا لیکن انھوں نے کچھ نہ کھایا۔ اتنے میں اس عورت کے لڑکے کو وہاں آپ کے مقیم ہونے کی خبر لگ گئی جبکہ ابن زیاد نے ان کے متعلق خبر دینے والے کے لیے انعام مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی وہ لڑکا گورنر کے محل میں گیا اور محمد بن اشعث کو مسلم بن عقیل کی جائے قیام کی خبر دیدی۔ جیسے ہی ابن زیاد کو یہ خبر پہنچی، اس نے اپنے بہت سے سپاہیوں کو محمد بن اشعث کی قیادت میں اس مکان کی طرف روانہ کر دیا جس میں مسلم بن عقیل پناہ گزیں تھے۔ انہوں نے ٹاپوں کی آواز سنی تو سمجھ گئے کہ لوگ ان کی تلاش میں آ پہنچے ہیں۔ چنانچہ آپ اپنی تلوار لے کر اس گھر سے نکلے اور ان کی طرف بڑھے۔ وہ دو سو سے کچھ اوپر سپاہی تھے جنہوں نے گھر کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ پھر بھی وہ

اکیلے مسلم سے شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ ان کے اس طرح کمزوری دکھانے پر ابن زیاد نے ان کی کمک کے لیے مزید سوار اور پیادے بھیج دیے۔ پھر تو ان کے اور ابن زیاد کے سپاہیوں کے درمیان سڑکوں پر خونریز مقابلہ ہوا جس میں ان لوگوں نے مسلم پر بلند مقامات سے آگ اور پتھر برسائے۔ تاہم انھوں نے جنگ سے ہاتھ صرف اس وقت روکا جب ابن اشعث نے ان کو امان دینے کا وعدہ کیا۔

اب وہ ان کے ساتھ گورنر کے محل گئے لیکن جب ابن زیاد کے پاس پہنچے تو انہوں نے اس کو سلام نہیں کیا۔ اس کے بعد دونوں میں بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، جس میں مسلم بن عقیل پوری آزادی، جرأت اور استدلال سے باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ابن زیاد عاجز ہو کر رہ گیا اور اس کی رگیں پھول گئیں۔ تب وہ علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو برا کہنے پر اتر آیا۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مسلم کو محل کی چھت پر لے جا کر قتل کر ڈالو اور ان کی لاش لوگوں کے سامنے اوپر سے نیچے پھینک دو اور اس کو کوفہ کی سڑکوں پر خوب گھسیٹو۔ اس کے بعد مسلم بن عقیل کی لاش کو بھی ہانی بن عروہ کی لاش کے برابر میں پھانسی پر لٹکا دو۔ افسوس کہ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور اہل کوفہ سڑکوں پر اس طرح کھڑے رہے گویا ان کو مسلم کے معاملہ کا کوئی علم ہی نہیں ہے۔

فرزدق نے اس کے متعلق یہ اشعار کہے ہیں:

> "اگر تم نہیں جانتے ہو کہ موت کیا ہے تو سربازار ہانی بن عروہ اور مسلم بن عقیل کی لاشوں کو دیکھو۔ ہاں تم اس نوجوان کو دیکھو کہ جس کا رنگ موت نے بدل ڈالا ہے اور اس کو بھی دیکھو کہ جس کو قتل کرنے کے بعد سولی پر چڑھایا گیا ہے۔ اگر تم لوگ اپنے بھائی کے خون کا بدلہ نہیں لے سکتے ہو تو اس عورت کی طرح بیٹھ رہو جو ذرا سی چیز پر راضی ہو جاتی ہے۔

مسلم بن عقیل نے ابن اشعث سے خواہش کی تھی کہ کوفہ میں یہ جو کچھ ہوا ہے وہ امام حسینؑ کو اس کی اطلاع دیدے اور ان سے کہدے کہ آپ ان لوگوں کے پاس نہ آئیں۔ ابن اشعث نے ان سے اس کا وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔

امام حسینؑ کی مکہ سے عراق روانگی

اب ہم تھوڑی دیر کے لیے کوفہ چھوڑ کر جہاں ابنِ مرجانہ (عبیداللہ بن زیاد) ظلم و ستم کرنے میں مصروف ہے اور امام حسینؑ کے دوستوں کو چن چن کر نکال رہا ہے، مکہ واپس چلتے ہیں۔ تاکہ جہاں تک ممکن ہو انتہائی اختصار کے ساتھ امامؑ کے کربلا کی جانب سفر کا مطالعہ کریں۔ اس المیہ کی خاطر جو ان تمام قربانیوں میں زیادہ حیرت خیز مانا جاتا ہے جو انسان نے ماضی اور حال میں پیش کی ہیں اور جو آج تک ایک ایسا زندہ مثالی واقعہ بنا ہوا ہے کہ جس پر امامؑ کے چاہنے والوں، نیز دوسروں نے بھی دسیوں کتابیں لکھی ہیں۔

جیسا کہ ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں، امام حسینؑ مکہ میں آغاز شعبان ۶۰ھ میں فروکش ہوئے جبکہ آپ سے چند روز قبل عبداللہ بن زبیر بھی وہاں پہنچ چکے تھے، اس لیے کہ مؤرخوں کے بیان کے مطابق وہ بھی یزید کے اقتدار سنبھالنے پر نالاں تھے۔ تاہم ابن زبیر کو امام حسینؑ کا مکہ میں موجود ہونا برا لگ رہا تھا کیونکہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ جب تک امام حسینؑ یہاں موجود رہیں گے لوگ میری طرف متوجہ نہ ہوں گے اور نہ ہی وہ مجھے کوئی اہمیت دیں گے۔ وہ یہ بھی جان رہے تھے کہ لوگ کسی بھی شخص کو امام حسینؑ کے برابر نہ مانیں گے۔ پھر بھی جب تک امام حسینؑ مکہ میں قیام پذیر رہے، عبداللہ بن زبیر آپ کی صحبت سے علیحدہ نہیں ہوئے اور مسلسل آپ سے ہم کلام ہوتے اور آپ کی باتیں سنتے رہے۔ جب ان کو اہل کوفہ کے خطوں کے آنے کا علم ہوا تو انھوں نے امامؑ کو ان کی دعوت قبول کرنے اور وہاں تشریف لے جانے کا مشورہ دیا اور کہا: میرے پاس آپ کے انصار جیسے لوگ ہوتے تو میں ان کی دعوت کو قبول کرنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہ کرتا۔ پھر اس خیال سے کہ امام حسینؑ ان کے یہ بات کہنے کا برا نہ مانیں، خود اپنے لیے بھی اس کو پسند کیا اور تمنا ظاہر کی کہ کاش! آپ کے انصار جیسے میرے بھی انصار ہوتے۔ مزید کہا کہ اگر آپ چاہیں تو انھیں ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں اور تا مرگ آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔

تاہم امام حسینؑ پر ان کے اندرونی خیالات، نیز ان کی فریب کاری، غداری اور نفاق چنداں پوشیدہ نہ تھا۔ جیسا کہ اپنی تحریک میں اس طرح کے لوگوں سے مدد لینے کا نتیجہ آپ سے مخفی نہ تھا۔ علاوہ ازیں آپ اپنے موقف پر پورا وثوق رکھتے تھے کیونکہ

آپ نے اس کی شرائط اور اس کے نتائج کے ہر پہلو کو سمجھ کر قدم آگے بڑھایا تھا۔

امام حسینؑ نے ملاحظہ فرمالیا تھا کہ یزید کی بیعت کر لینا اسلام کے لیے ایسا خطرہ تھا کہ جس کی تلافی ممکن نہ تھی۔ آپ نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ سبھی لوگوں کی نظریں آپ پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اس معاملے میں آپ کے فیصلے کے منتظر تھے۔

آپ اہل عراق کی کیفیت کو بھی دوسرے لوگوں سے زیادہ جانتے تھے کیونکہ آپ کے والد بزرگوار اور برادر عالی قدر کو ان کی غداری اور بے وفائی کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ آپ کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ لوگ یزید اور اس کے ساتھیوں کے خلاف جنگ میں آپ کی مدد کریں گے۔ لیکن آپ یزید ایسے ظالم فرمانروا کے ساتھ نیازمندانہ طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے، اس پر خواہ آپ اور آپ کے بچے قتل ہو جائیں اور آپ کی عورتیں قیدی بنا لی جائیں۔ تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں نہ ہو کہ جس اسلام کی نمائندگی امام حسینؑ کر رہے ہیں، وہ اسی قسم کی فرمانروائی پیش کرتا ہے۔

چنانچہ آپ نے نتائج سے بے پروا ہو کر عراق جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ادھر مسلم بن عقیل نے آپ کو جلد ہی آنے کے لیے لکھا اور بتلایا تھا کہ کس طرح لوگوں نے میرا خیر مقدم کیا اور آپ کو بسرعت پہنچنے پر اصرار کیا تھا، جبکہ یزید اور اس کے ساتھی بھی کوفہ کے واقعات سے باخبر تھے۔ چنانچہ انھوں نے حج کے موقع پر اپنے سپاہی مکہ بھیجے تاکہ وہ امام حسینؑ کو بہر حال قتل کر دیں، خواہ آپ غلاف کعبہ ہی میں پناہ گزیں ہوں، لیکن آپ کو اس بات کا علم ہو گیا۔ تب آپ نے فوراً حج کو عمرہ میں بدل کر احرام کھول دیا اور ۸ ذی الحجہ کو مکہ سے روانہ ہو گئے، تاکہ آپ کہیں خانۂ کعبہ میں قتل نہ کر دیے جائیں، آپ کا خون ضائع نہ ہو جائے اور پھر اس سے وہ نتیجے حاصل نہ ہو سکیں، جو بعد میں آپ کے قتل ہونے سے حاصل ہوئے کہ جن سے ظالموں اور جفاکاروں کے کرداروں کی سیاہی واضح ہو گئی۔

اگر یزید کے سپاہی آپ کو چھپ کر قتل کر دینے میں کامیاب ہو جاتے جیسا کہ آپ سے پہلے اس کے باپ کے ہاتھوں آپ کے والد بزرگوار کے ساتھ ہوا تھا جبکہ وہ مسجد میں نماز ادا فرمارہے تھے تو وہ لوگ یہی مشہور کر دیتے کہ امام حسینؑ کسی خارجی

کی تلوار سے مارے گئے۔ اس طرح وہ آپ کے خون سے بری الذمہ ہو جاتے جیسا کہ آپ کے والد بزرگوار کے خون سے بری ہو گئے۔ پھر ان کا یہی قول عام ہو جاتا اور تاریخی حقیقت کے طور پر مان لیا جاتا۔

وہ روایات جو یہ بیان کرتی ہیں کہ امام حسینؑ مکہ سے چلے گئے تھے، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس صبح کو آپ روانہ ہوئے اس سے پہلے کی رات میں آپ نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ سے فرمایا: میرے بھائی! مجھ کو یہ اندیشہ تھا کہ یزید کے سپاہی مجھ کو خانہ کعبہ ہی میں دھوکے سے قتل کر ڈالیں گے، جس سے مقدس گھر کی حرمت زائل ہو جائے گی۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ کو امام حسینؑ نے عمرہ کے لیے احرام باندھا اور خانۂ کعبہ کا طواف فرمایا، صفا اور مروہ کے مابین سعی کی اور اپنے سر کے بال منڈوا دیے۔ اس کے بعد آپ نے احرام کھول دیا اور اپنے سگے اور چچیرے بھائیوں، بھتیجوں اور اپنے اصحاب اور اپنی خواتین کو لے کر مکہ سے روانہ ہو گئے۔ چنانچہ عام لوگ تو اس روز عرفات کی طرف رواں تھے اور آپ مکہ سے عراق کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ اس موقع پر ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام مخزومی نے اہل کوفہ کی غدّاری اور بے وفائی کا حوالہ دیا اور آپ کو عراق جانے سے منع کیا۔ اس نے آپ کو یہ مشورہ بھی دیا کہ آپ ان لوگوں سے کنارہ کش رہیں لیکن آپ نے رکنے سے انکار فرما دیا اور اپنی راہ چلتے رہے۔ اسی طرح عبداللہ بن عباس نے بھی اہل عراق کی غدّاری کا ذکر کیا اور آپ کے والد بزرگوار اور برادر عالی قدر کے ساتھ ان کی پچھلی سیاہ کاریاں یاد دلائیں، لیکن آپ اپنی رائے پر قائم رہے۔ تب ابن عباس نے آپ سے کہا: اگر میں یہ سمجھتا کہ آپ کا دامن پکڑ کر اور گردن میں بازو ڈال کر روکے رہنے اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لینے سے آپ میرا کہنا مان لیں گے تو میں ضرور ایسا کرتا۔ اس پر امام حسینؑ نے ارشاد کیا: اے بھائی اس معاملے میں اللہ اپنا فیصلہ صادر کر چکا ہے۔ پس اب اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

ابن عباس مایوس ہو گئے اور آپ سے رخصت ہوتے ہوئے رو پڑے۔ جب امام حسینؑ کے پاس سے چل دیے تو راستے میں ان کو عبداللہ بن زبیر مل گئے۔ ابن عباس نے ان سے کہا: کتنے خوش قسمت آدمی ہو تم کہ تمہارے لیے فضا صاف ہو گئی۔ دیکھو! حسینؑ وہ جا رہے ہیں،

اب تم خوشیاں مناؤ اور مزے اڑاؤ۔

آپ کو کوفہ جانے سے باز رہنے کا مشورہ دینے اور آپ کو اہل کوفہ کی غداری اور نفاق سے آگاہ کرنے والے صرف ابن عباس ہی نہ تھے، بلکہ عبداللہ ابن جعفر، محمد بن حنفیہ اور پھر عبداللہ بن مطیع نے بھی آپ کو یہی مشورہ دیا۔ چنانچہ جب عبداللہ ابن جعفر کی آپ سے مکہ کے باہر ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا: "میں آپ کو اسلام کی حرمت کی خاطر اللہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ میں آپ کو قریش کی بزرگی اور عرب کے وقار کی قسم دیتا ہوں۔ اگر آپ بنی امیہ سے ان کا اقتدار لینا چاہیں گے تو وہ ضرور آپ کو قتل کر ڈالیں گے۔ اگر انہوں نے آپ کو قتل کر دیا تو پھر وہ کسی سے نہ ڈریں گے۔ پس آپ کوفہ نہ جائیے اور بنی امیہ کا سامنا نہ فرمائیے۔"

آپ کو عراق نہ جانے کا مشورہ دینے والوں میں عبداللہ بن عمر بھی تھے۔ جب انھوں نے سنا کہ امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہو گئے ہیں تو وہ فوراً سوار ہوئے اور آپ سے ملنے چل دیئے یہاں تک کہ وہ ایک منزل پر آپ سے جا ملے اور پھر کہنے لگے: اے فرزندِ رسولؐ! کہاں کا ارادہ ہے؟ آپ نے فرمایا: عراق کا! اس پر وہ بولے کہ آپ اپنے نانا کے مقدس وطن کو لوٹ جائیے، لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ جب انہوں نے عراق جانے پر آپ کا اصرار ملاحظہ کیا تو کہنے لگے: اے ابو عبداللہ! ذرا وہ جگہ مجھ کو دکھائیے کہ جہاں رسول اکرمؐ آپ کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ پس امام حسینؑ نے اپنے بدن کی وہ جگہ ان کے سامنے کر دی۔ انہوں نے تین بار اس جگہ پر بوسہ دیا اور رو کر کہنے لگے: اے ابو عبداللہ! میں آپ کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

وہ لوگ جو امامؑ کو مکہ میں مقیم رہنے کا مشورہ دے رہے تھے، ان کے جواب میں آپ نے آخری بات یہ فرمائی کہ آپ کا مکہ میں یا کہیں اور جا کر رہنا، آپ کو امویوں کے چنگل سے نجات نہ دے گا کیونکہ وہ لوگ آپ کے پیچھے پڑے رہیں گے کہ یا تو یزید کی بیعت کریں یا قتل کر ڈالے جائیں، یہاں تک کہ راوی کے بقول اگر آپ پاتال میں بھی چلے جائیں گے تو وہ بھی آپ کے پیچھے وہاں پہنچ جائیں گے۔

پس امام حسینؑ کا قافلہ عراق کی سمت چلتا رہا۔ وہ ان لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑ گیا

جو آپ کو حجاز میں قیام کی رائے دے رہے تھے۔ ادھر یہ لوگ بھی آپ کے بارے میں بے چین تھے اور آنکھیں لگائے ہوئے تھے کہ دیکھیں ان سرکشوں کے ہاتھوں آپ پر کیا گزرتی ہے۔
امامؑ چلے جارہے تھے کہ راستے میں فرزدق شاعر سے ملاقات ہوگئی۔ جب آپ نے ان سے اہل کوفہ کا حال دریافت کیا تو انھوں نے کہا: اے فرزند رسولؐ! آپ واپس مکہ تشریف لے چلیے کیونکہ ان لوگوں کے دل تو آپ کی طرف ہیں لیکن ان کی تلواریں بنی امیہ کا ساتھ دینے والی ہیں، لیکن کیا کیا جائے کہ ہر فیصلہ آسمان سے صادر ہوتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اس پر امام حسینؑ نے ان سے کہا: جو اللہ کا فیصلہ ہے وہ ہو کر رہے گا۔ پھر آپ کا قافلہ اپنے راستے پر رواں رہا۔ جب آتا جاتا کوئی شخص مل جاتا تو آپ اس سے اہل عراق کے متعلق دریافت فرماتے تھے، یہاں تک کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کا قتل ہوتا اور اس کے قبل و بعد کے واقعات آپ کو معلوم ہو گئے۔[1]

وہ بیشتر روایات جو امام حسینؑ کے سفر کربلا کو بیان کرتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے منزل ثعلبیہ پر قیام فرمایا تو غروب آفتاب کے قریب آپ سے بنی اسد کے دو آدمی آکر ملے اور آپ کو مسلم اور ہانی کے قتل کی اطلاع دی۔ اس پر آپ نے کئی بار "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۶) کی تلاوت فرمائی۔ تب ان دونوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم خود آپ کی، اور آپکے عیال کی سلامتی کے لیے اللہ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ یہاں سے واپس چلے جائیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہے۔ اس پر بنو عقیل تڑاخ سے بولے کہ ہم اپنے خون کا بدلہ لیے بغیر ہرگز نہ ٹلیں گے یا پھر ہم بھی مسلم کی طرح مارے جائیں گے۔ تب امام حسینؑ نے ان کے چہروں پر نظر ڈال کر فرمایا: ان عزیزوں کے قتل ہو جانے کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں رہے گا۔ ان دونوں کا بیان ہے کہ پھر ہم سمجھ گئے کہ آپ کا ارادہ پختہ ہے اور آپ ہرگز واپس نہ ہوں گے۔
آپ کے بعض اصحاب نے آپ سے کہا: بخدا! آپ مسلم بن عقیل کی طرح نہیں ہیں،

---

[1] تاریخ طبری جلد ۶ صفحات ۲۱۶ - ۲۱۷

اگر آپ کوفہ پہنچیں گے تو لوگ تیزی سے آپ کے پاس آجائیں گے لیکن منزل زبالہ میں آپ کو عبداللہ بن یقطر کے قتل کی اطلاع بھی ملی، جن کے ہاتھ آپ نے مسلم بن عقیل اور کوفہ کے کچھ لوگوں کو خط بھیجا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تک آپ کو مسلم بن عقیل کے مارے جانے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ چنانچہ حصین بن نمیر نے عبداللہ بن یقطر کو قادسیہ سے گرفتار کرکے عبیداللہ بن زیاد کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس نے ان کو حکم دیا کہ تم منبر پہ جاکر حسینؑ اور ان کے والد پر لعنت کرو۔ پھر اتر آنا تاکہ میں تمہارے متعلق فیصلہ کروں لیکن عبداللہ نے منبر پہ جاکر معاویہ، یزید بن معاویہ اور عبیداللہ بن زیاد پر لعنت کی اور کہا: اے لوگو! میں تمہاری طرف حسینؑ بنت فاطمہؑ بنت رسول اللہؐ کا یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ تم ان کی نصرت کرو اور ابن مرجانہ کے خلاف ان کا ساتھ دو۔ اس پر عبیداللہ کے حکم سے ان کو محل کے اوپر سے گرا دیا گیا جس سے ان کی ہڈیاں چور چور ہوگئیں۔ پھر ایک شخص نے آکر ان کو ذبح کر دیا، جس پر لوگوں نے اس کو بہت کچھ برا بھلا کہا۔

تاریخ طبری میں ہے کہ جب امام حسینؑ کو مسلمؑ، ہانی اور ابن یقطر کے قتل کی خبر ملی اور معلوم ہوا کہ کوفہ شراب بنی امیہ کے حق میں پوری طرح آمادہ ہے تو آپ نے اپنے اہل خاندان، اصحاب اور ان تمام عربوں کے سامنے تقریر فرمائی جو راستے میں آپ کے ساتھ ہوگئے تھے۔ آپ نے ان کو اہل کوفہ کی حالت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ انہوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا: تم میں سے جو کوئی جانا چاہے آزاد ہے، ہمارا اس پہ کوئی ذمہ نہیں ہے۔ چنانچہ عام لوگ آپ کے سامنے سے اٹھ اٹھ کر دائیں اور بائیں کو چل پڑے۔ یہاں تک کہ آپ کے ساتھ صرف وہ ساتھی رہ گئے جو آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے۔ آپ نے یہ اس لیے کیا کہ آپ جان رہے تھے کہ جو لوگ راستے سے آپ کے ساتھ ہو لیے تھے ان کا خیال تھا کہ آپ ایک ایسے مقام کی طرف تشریف لیجا رہے ہیں جہاں کے لوگ آپ کی اطاعت پر قائم ہیں۔ پس آپ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ وہ لوگ اس خیال سے آپ کے ساتھ چلیں۔ کیونکہ آپ ایک ایسے خطرے کی طرف پیشقدمی فرما رہے تھے جس کے مقابلے میں صرف وہی افراد ٹھہر سکتے تھے جو آخرت کو دنیا پہ ترجیح دیتے ہوں اور سرکشوں اور ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنے کو بدبختی کا موجب قرار دیتے ہوں۔

امام حسینؑ اپنے مخلص اصحاب، اہل خاندان اور بھائیوں کے ہمراہ اپنی راہ پر رواں تھے۔ اتنے میں آپ نے اور آپ کے اصحاب نے دیکھا کہ کچھ سائے ان کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ بعضوں نے ان سایوں کو کوفہ کے باغات اور درخت خیال کیا۔ تب امام حسینؑ نے ان سایوں کو غور سے دیکھا جو آپ کے قافلے کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: نہ یہ کوفہ ہے نہ اس کے باغات، جیسا کہ تم لوگ سمجھ رہے ہو، بلکہ یہ گھوڑوں کی گردنیں نیزوں کی انیاں اور لشکریوں کے جسم ہیں۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد قافلے والوں پر عیاں ہو گیا کہ جو سائے ان کی طرف بڑھے آ رہے تھے۔ وہ ایک ہزار سوار ہیں، جن کو عبیداللہ بن زیاد نے حر بن یزید ریاحی کی سرکردگی میں اس حکم کے ساتھ بھیجا تھا کہ امام حسینؑ کا راستا روک لے اور ان کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرے۔ جب وہ سوار امام حسینؑ کے قافلہ کے قریب پہنچ گئے تو ان لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کس غرض سے آئے ہیں۔ اس پر حر نے ان سے کہا: ہم کو یہ حکم ملا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ لگے رہیں اور تم کو ایسی جگہ ٹھہرنے پر مجبور کریں، جہاں نہ پانی ہو اور نہ کوئی جائے پناہ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تم لوگ یزید اور عبیداللہ بن زیاد کی فرمانبرداری قبول کر لو۔ اس پر طرفین کے درمیان طویل گفتگو ہوئی لیکن وہ کسی ایسے نتیجے پر نہ پہنچ سکے جو دونوں کے لیے قابل قبول ہو کیونکہ حر اس پر راضی نہ ہوا کہ امام حسینؑ حجاز واپس چلے جائیں یا اس راستے پر گامزن رہیں جو کوفہ جاتا تھا۔ ادھر امام حسینؑ اس پر تیار نہ تھے کہ یزید اور ابن زیاد کے سامنے سر جھکا دیں۔ چنانچہ جب حر نے سب کے ساتھ نماز ادا کر لی تو امام حسینؑ نے ایک تقریر فرمائی جس میں آپ نے کہا: میں تمہاری طرف صرف اس وقت آیا ہوں جب تمہارے خطوط مجھ کو ملے، بلکہ تمہارے خط اور قاصد لگاتار میرے پاس آتے رہے لیکن اگر تم مجھ کو ناپسند کرتے ہو تو میں اس پر تیار ہوں کہ حجاز واپس چلا جاؤں یا اللہ کی زمین پر موجود دوسرے علاقوں کی طرف نکل جاؤں۔ پھر آپ نے عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کے خط لا کر دکھائے۔ اس پر حر نے آپ سے کہا: اے ابو عبداللہ! ہم میں سے کسی نے یہ خط آپ کو نہیں لکھے ہیں۔

بعد ازاں قافلہ اپنے راستے پر چلتا رہا لیکن حر اسے کوفہ جانے سے روکنے کی کوشش

کرتا رہا۔ ادھر امام حسینؑ کے انصار یہ کوشش کرتے رہے کہ اس کو جنگ پر اکسائیں اور اسی جنگل میں ہی اس کو مقابلہ آزمائی پر مجبور کر دیں، اس معاملے میں زہیر بن قین بہت پیش پیش تھے۔ چنانچہ انہوں نے امام حسینؑ کی خدمت میں عرض کیا: ہمارے لیے ان لوگوں سے اس وقت لڑ لینا زیادہ آسان رہے گا، بہ نسبت اس کے کہ ان کے علاوہ دوسروں سے لڑا جائے، لیکن امام حسینؑ نے اس تجویز کو ناپسند فرما دیا، کیونکہ ان لوگوں نے آپ سے جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا، لہذا آپ نے فرمایا کہ میں ان سے جنگ میں ابتدا نہ کروں گا۔

ابھی ان لوگوں کو اس وسیع صحرا میں چلتے ہوئے چند ہی دن گزرے تھے جبکہ حُرؓ امام حسینؑ کے ساتھ ساتھ چلا آرہا تھا۔ اس دوران میں وہ آپ کو بنی امیہ کے ساتھ جنگ کرنے سے ڈراتا اور آپ کو اہل کوفہ کی آپ کے والد بزرگوار اور برادر عالی قدر کے ساتھ غداری اور بے وفائی کا حوالہ دیتا رہا تھا۔ ادھر کوفہ سے عمر بن سعد ایک لشکر لے کر نکلا۔ جس کی تعداد بعض روایات میں تیس ہزار اور بعض نے اس سے بھی زیادہ بیان کی ہے تیسری روایت یہ ہے کہ ابن زیاد نے کوفہ اور اس کے اطراف کے تمام لوگوں کو امام حسینؑ سے جنگ کرنے کا حکم دیدیا تھا۔ اس نے ان کو یہ دھمکی دی کہ جو کوئی بھی ہتھیار بندی کے قابل ہوا اور وہ امام حسینؑ سے جنگ کرنے کو نہ آیا تو اس کو قید یا قتل کر دیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قید خانے امام حسینؑ کے دوستوں سے بھر گئے اور ان میں سے کچھ لوگ روپوش بھی ہو گئے۔ البتہ بنی امیہ کے ساتھی نیز لالچی اور مصلحت پرست افراد امام حسینؑ سے جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور کوفہ میں ایسے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی۔ البتہ اس لشکر کی تعداد پانچ ہزار بتانے والی روایت، جو بعض لوگوں نے گھڑ لی ہے، ایک طرف تو وہ مرسل ہے، یعنی اس کے راویوں کا سلسلہ کٹا ہوا ہے۔ پھر وہ حالات جو ایسے واقعات سے متعلق ہوتے ہیں، وہ بھی اس کی تائید نہیں کرتے۔ کیونکہ کوئی بھی شخص ان تمام امکانات اور حالات کا مطالعہ کیے بغیر اس روایت کو قبول نہیں کر سکتا۔ خصوصاً ایسا شخص جو اہل کوفہ کی قلابازیوں اور تلوّن مزاجیوں سے واقف ہو۔

بہرحال کوفہ سے آنے والے لشکروں نے امام حسینؑ کا راستا روک لیا اور آپ کو مجبور کیا کہ آپ کربلا میں ایسے مقام پر فروکش ہوں جو جنگ کے نقطہ نظر سے

نامناسب اور پانی سے دُور ہو۔ پھر عبیداللہ بن زیاد کے احکام کے مطابق ان لوگوں نے امام حسینؑ پر شدت کرنا شروع کردی اور وہ آپ کے اور پانی کے درمیان حائل ہو گئے۔ جب امام حسینؑ نے ان کی کثرت تعداد ملاحظہ فرمائی اور دیکھا کہ اگر آپ یزید بن معاویہ کی اطاعت قبول نہیں کرتے تو یہ لوگ آپ سے جنگ ضرور کریں گے۔ تب آپ نے رسول اکرمؐ کا عمامۂ مبارک زیب سر فرمایا اور اپنے ہتھیار لگا کر ناقہ پر سوار ہوئے اور ان کے لشکر کے اتنے قریب جا پہنچے کہ وہ لوگ آپ کو سن سکیں۔ چنانچہ اللہ کی حمد کے بعد آپ نے ان لوگوں کے بھیجے ہوئے خطوں اور ان کے پیمان کے بارے میں ان سے سوال و جواب فرمائے، لیکن اُن لوگوں نے آپ کی باتوں کو جھٹلایا۔ تب آپ نے وہ خط منگوائے جو دو بڑے تھیلوں میں بھرے ہوئے تھے۔ وہ آپ نے ان لوگوں کے سامنے پھیلا دیے۔ اب آپ نے نام لے لے کر ان لوگوں کو آواز دی جنہوں نے وہ خط لکھے تھے اور نصرت کے عہد و پیمان کیے تھے۔ وہ سب چپ ہو رہے اور انھوں نے آپ کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس کے بعد آپ نے ان لوگوں سے دریافت فرمایا کہ وہ کیوں آپ کے قتل کے درپے ہیں؟ کیا انکا کوئی خون آپ کے ذمہ ہے یا آپ نے ان کا کوئی مال چھین لیا ہے یا آپ نے اسلام میں کسی بدعت کو رواج دیا ہے۔ پھر آپ نے لوگوں کے نام لے لے کر دریافت کرنا شروع کیا کہ کیا وہ آپ کے علاوہ صفحۂ ارض پر اپنے نبیؐ کی بیٹی کے کسی اور بیٹے سے آگاہ ہیں۔ کیا انھوں نے آپ کے نانا یعنی نبیؐ کو یہ کہتے نہیں سنا ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ اہل جنت کے سردار ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ اگر تم نے خود رسول اکرمؐ سے نہیں بھی سنا ہے تو آج مسلمانوں میں وہ لوگ موجود ہیں کہ اگر تم ان سے پوچھو گے تو وہ تم کو بتائیں گے کہ نبئ اکرمؐ نے یہ حدیث بارہا بیان فرمائی۔ جیسے جابر بن عبداللہ انصاریؓ، زید بن ارقم ہیں اور ان کے علاوہ بھی آپ نے متعدد نیک عمل صحابہ کے نام گنائے۔ آپ نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے فرمایا: پھر بھی اگر تم اپنے خطوں سے انکار کرتے ہو تو مجھ کو وہیں چلا جانے دو جہاں سے میں آیا ہوں۔ یا میں اللہ کی وسیع زمین پر کہیں چلا جاؤں گا یا میں کسی سرحد پر جا کر کفار سے جنگ کرتا ہوں، یہاں تک کہ مرجاؤں۔ آپ نے یہ سب کچھ اتمام حجت کے لیے فرمایا تھا۔

تاہم ان لوگوں نے ان میں سے کوئی بات بھی نہ مانی بلکہ اپنی سرکشی اور باطل پرستی

پر اڑے رہے۔ پھر انہوں نے وہی جواب دیا جو اہل مدین نے اپنے نبی کو دیا تھا، جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

"وہ کہنے لگے کہ ہم تمہاری بیشتر باتوں کو سمجھ ہی نہیں رہے ہیں اور ہم تم کو کمزور پاتے ہیں۔" (سورۂ ہود۔ آیت ۹۱)

پس اگر آپ ابن زیاد کے آگے جھک جائیں تو وہ آپ کے متعلق فیصلہ کر دے گا۔ ورنہ ہم آپ سے ایسی جنگ کریں گے کہ جس کا کم سے کم نتیجہ یہ ہو گا کہ سر کٹ کٹ کر گرتے ہوں گے اور ہاتھ پیر جدا ہوں گے۔

امام حسینؑ رنجیدہ ہو کر اپنے خیام کی طرف واپس آ گئے۔ تب آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: یہ لوگ جنگ پر اصرار کر رہے ہیں اور ان کا نشانہ میرے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ اگر وہ مجھ پر غالب آ جائیں گے تو ان کو تم سے کوئی سروکار نہ ہو گا۔ پس جب رات ہو جائے تو تم میں سے ہر ایک ایسی جگہ چلا جائے جہاں اس کو امن حاصل ہو۔ تم مجھ کو اور ان ظالم لوگوں کو یہاں چھوڑ جاؤ۔

لیکن آپ کے باوفا اصحاب اور پاکباز اہل خاندان نے آپ سے مفارقت اختیار کرنا اور اپنی جانوں کو آپ سے زیادہ عزیز رکھنا گوارا نہیں کیا۔ وہ سب آپ سے وابستہ ہو گئے، حالانکہ آپ نے ان کے سامنے حالات کی صحیح تصویر پیش فرما دی تھی۔ اگرچہ کسی دوسرے کے لیے اپنی جان دینا سب سے بڑی قربانی ہے۔ پھر بھی ان لوگوں نے یک زبان ہو کر آپ سے کہا: ہم آپ سے ہرگز جدا نہ ہوں گے اور نہ آپ کے سامنے شہید ہونے کے بجائے آپ کے بعد اس دنیا کی زندگی کو پسند کریں گے۔ ان میں سے کسی نے آپ سے کہا: اے ابو عبداللہ! قسم بخدا اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میں قتل کر دیا جاؤں گا، پھر زندہ ہو جاؤں گا، پھر قتل ہو جاؤں گا اور یہ عمل میرے ساتھ ستر مرتبہ کیا جائے گا لیکن اس طرح آپ اور آپ کے اہل و انصار اس یزیدی گروہ کے چنگل سے بچ جائیں گے تو میں اس کو گوارا کرنے میں ذرا بھی تامّل نہ کروں گا۔ آپ کے اصحاب اور اہل خاندان نے ایسے ہی باہم ملتے جلتے الفاظ کہے۔ جنگ کرنے کا پختہ ارادہ ظاہر کیا اور آپ کے سامنے شہادت حاصل کرنے کو اپنی خوش بختی قرار دیا۔

حُر بن یزید ریاحی پر امام حسینؑ کے کلمات اور ان کے صحیح موقف کا اتنا اثر ہو چکا تھا کہ وہ اپنے سابق طرز عمل پر نادم ہو گئے۔ وہ کبھی اپنے گھوڑے کو امام حسینؑ کے لشکر کے قریب لے آتے اور کبھی اس سے دور لے جاتے۔ ان کے چہرے پر رنج اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ یہاں تک کہ ان کے ایک ساتھی نے ان سے کہا: قسم بخدا! میں نے تم کو کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا، بلکہ اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ اہل کوفہ میں سب سے بہادر کون ہے تو میں تم کو نظرانداز نہ کرتا۔ اب حُر نے اس سے اپنے دل کی کیفیت بیان کر دی اور کہا: سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میں اپنے لیے جنت و جہنم اور دنیا و آخرت کے مابین فیصلہ کر رہا ہوں۔ کسی بھی عقلمند کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ آخرت اور جنت پر کسی دوسری چیز کو ترجیح دے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور امام حسینؑ کے خیمہ کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ امامؑ باہر تشریف لائے تو حُر ادب سے جھک گئے اور آپ کے ہاتھوں پر بوسہ دے کر آپ سے معافی مانگنے لگے۔ اس کے بعد کہنے لگے: میرے آقا! وہ میں ہی ہوں کہ جس نے آپ کو اس جگہ آنے پر مجبور کیا اور واپس جانے سے روک دیا۔ اگر مجھ کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ یہ کچھ کریں گے تو میں ہرگز ایسا نہ کرتا، تو کیا اب میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں! ہاں! اللہ تمہاری توبہ قبول فرمالے گا۔ وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اس پر حُر نے آپ سے کہا: میں توبہ کا صرف یہی مطلب سمجھتا ہوں کہ آپ کے سامنے جنگ کرتے ہوئے آپ پر نثار ہو جاؤں۔ یہ کہہ کر وہ میدانِ وغا میں چلے گئے، جہاں وہ خوب لڑے، پھر لوگوں نے ان کو گھیر لیا اور قتل کر ڈالا۔

امام حسینؑ اور عمر بن سعد کے مابین گفتگو اور تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ امام حسینؑ مکہ واپس چلے جائیں، یا اللہ کی وسیع زمین پر کسی اور جگہ فروکش ہو جائیں، چنانچہ عمر بن سعد نے عبیداللہ بن زیاد کو لکھا کہ وہ اس سمجھوتے کو منظور کر لے۔ اس پر اس نے کہا: اس وقت جبکہ وہ پوری طرح ہمارے چنگل میں آ گئے ہیں تو اب وہ بچ کے نکل جانا چاہتے ہیں۔ نہیں۔ قسم بخدا ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ بس اب تو ان کو اسیری کی حالت میں، ذلت کے ساتھ میرے پاس آنا ہوگا۔ پھر چاہوں تو میں ان کو معاف کر دوں اور چاہوں تو ان کو قتل کر دوں۔ یہی کچھ اس نے ابن سعد کو بھی لکھ بھیجا۔ جس وقت اس

نے یہ خط پڑھا تو کہنے لگا: لیکن جب تک حسینؑ کے پہلو میں ان کے باپ کا دل ہے وہ ہرگز اس پستی کو قبول نہ کریں گے۔

چنانچہ جب آپ کو ان مذاکرات کی ناکامی کا علم ہوا تو آپ نے ایسی زندگی پر کہ جس میں عبیداللہ بن زیاد کا قیدی بننا ہو، موت کو ترجیح دی اور فرمایا: قسم بخدا! میں ہرگز تمہارے سامنے ذلیل بن کر نہ جاؤں گا اور نہ غلاموں کی طرح سر جھکاؤں گا۔ ہاں میں ان حالات میں موت کو خوش بختی اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو بدبختی تصور کرتا ہوں۔

ابن زیاد نے عمر بن سعد کو حکم دیا کہ نو یں محرم ۶۱ھ کو اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر امام حسینؑ پر حملہ کردے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اسی روز شام کے وقت امام حسینؑ کے خیموں کی طرف یلغار کردی۔ جبکہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ان کے اس اچانک حملے کا خیال تک بھی نہ تھا۔ تاہم امام حسینؑ اور آپ کے ساتھی شیروں کی طرح اپنے خیموں سے باہر نکل آئے لیکن امامؑ نے یہ ارادہ کیا کہ ان سے ایک رات کی مہلت حاصل کرلیں۔ پس آپ نے اپنے بھائی عباسؑ کو ان لوگوں کے پاس بھیجا، لیکن ابن سعد نے اگلی صبح تک کی مہلت دینے سے انکار کردیا۔ جیسا کہ راوی کہتے ہیں، اس وقت عمرو بن حجاج زبیدی نے کہا: اے سبحان اللہ! قسم بخدا اگر یہ لوگ ترک و دیلم بھی ہوتے تو ہم ان کے ایسے سوال کو رد نہ کرتے اور مان لیتے۔ بہرحال اپنے سرداران لشکر کے ساتھ خاصی ردوبدل کے بعد عمر بن سعد نے آپ کو دسویں محرم کی صبح تک کی مہلت دے ہی دی۔

اس رات امام حسینؑ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور حمد و ثنا کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے ہم کو نبوت کا اعزاز عطا کیا۔ ہم کو قوت بصارت و سماعت و فہم عطا کی۔ ہم کو قرآن کی تعلیم دی اور دین کے احکام سکھائے۔ پس تو ہم کو اپنا شکر گزار بنالے۔ اما بعد میں نے اپنے اصحاب اور اپنے اہل خاندان سے زیادہ نیک اور باوفا کسی کو نہیں پایا۔ اللہ تم سب کو بہترین جزا دے، لیکن تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دشمن میرے علاوہ کسی اور کے درپے نہیں ہیں۔ میں تم سب کو چلے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ میری طرف سے تم آزاد ہو، تمہارے لیے نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ تم پر کوئی ذمہ داری ہے۔ اس وقت رات کا اندھیرا تم پر پردہ کیے ہوتے ہے، اسی تاریکی میں تم لوگ چلے جاؤ اور اپنے آپ کو بچالو۔ اس پہ

آپ کے بھائیوں اور بیٹوں نے کہا: کیا ہم ایسا اس لیے کریں کہ آپ کے بعد زندہ رہیں؟ اللہ ہمیں ایسا دن کبھی نہ دکھائے۔ ان کے بعد آپ کے اصحاب بولے اور یک زبان ہو کر کہا: قسم بخدا، اے ابو عبداللہ! ہم ہرگز آپ کو نہ چھوڑیں گے تا اینکہ ہم ان دشمنوں کے سینوں میں اپنے نیزے توڑ نہ ڈالیں۔ ہاں! جب تک ہمارے ہاتھوں میں تلواروں کے قبضے رہیں گے ہم ان کو مارتے رہیں گے۔ اگر ہمارے پاس ان سے لڑنے کے لیے ہتھیار نہ رہیں گے تو ہم ان کو پتھروں سے نشانہ بنائیں گے۔ یہاں تک کہ ہم آپ کے ساتھ شہید ہو جائیں۔ اس پر امام حسینؑ نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے لیے جزائے خیر کی دعا کی اور پھر ان درجات کی بشارت دی جو اللہ نے ان کے لیے جنت میں مہیا کیے ہیں۔

اس رات آپ اپنے خاص خیمہ میں تشریف فرما تھے اور ابوذر کے غلام جون آپ کی تلوار صاف کر رہے تھے۔ اس وقت آپ کی زبان پر یہ اشعار جاری تھے:

اے زمانے! تو کیسا خراب دوست ہے۔ تو ہر صبح و شام کیسے کیسے دوست اور ساتھی چھین لیتا ہے۔ یہ زمانہ کسی کا بدل لے کر مطمئن نہیں ہوتا۔ ہاں اصل فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ہر زندہ اسی کے راستے پر رواں ہے۔

آپ کی ہمشیرہ زینبؑ بنت علیؑ نے آپ کا یہ کلام سن لیا۔ ان سے رہا نہ گیا اور وہ اپنے دامن کو سنبھالتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں کہ: ہائے کیا مصیبت آپڑی ہے۔ کاش! موت مجھ کو ختم کر دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میری ماں فاطمہؑ، میرے باپ علیؑ اور میرے بھائی حسنؑ آج ہی فوت ہوئے ہیں۔ اے بزرگوں کی یادگار اور ہماری زندگی کے سہارے بھائی حسین! امامؑ نے ان کو دیکھا تو فرمایا: اے بہن! ایسا نہ ہو کہ شیطان آپکو بے صبر بنا دے۔ پھر آپ نے ان کو اپنے بارے میں دلاسہ دیا۔ صبر کی تلقین فرمائی اور اپنے اہل وعیال کے بارے میں ان کو وصیتیں فرمائیں۔ پھر وہ رات آپ نے اور آپ کے اصحاب نے نمازیں ادا کرنے اور قرآن پڑھنے میں کاٹ دی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

محرم کی دسویں تاریخ کو صبح ہوتے ہی یزید کی فوج امام حسینؑ کے خیام پر حملہ آور ہو گئی۔ آگے آگے عمر بن سعد تھا۔ اس نے ایک تیر اپنی کمان کے چلے پر چڑھا کر امام حسینؑ کے خیموں کی طرف چلا دیا اور کہنے لگا: دیکھو! گورنر کے سامنے یہ گواہی ضرور دینا کہ

حسینؑ اور ان کے اصحاب کی طرف سب سے پہلا تیر میں نے چلایا ہے۔ اب تو ہر طرف سے امام حسینؑ کے خیموں اور حرم سرا پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔ تب امامؑ نے اپنے اصحاب کو یوں ابھارا: یہ تیر دشمنوں کے قاصد ہیں جو تمہاری طرف آ رہے ہیں۔ اس پر وہ لوگ خونخوار شیروں کی طرح نکل پڑے۔ ان کو نہ موت کا خوف تھا نہ دشمنوں کا ڈر تھا کیونکہ وہ صرف اللہ سے ملاقات کرنے کی آرزو رکھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اپنے ان درجات کو دیکھ رہے ہیں جو انبیاءؑ، صدیقین اور اللہ کے دیگر صالح بندوں کے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے جو بھی میدان میں جاتا اس کی زبان پر یہی آخری الفاظ ہوتے تھے: سلام ہو آپ پر اے ابو عبداللہ! بعدہٗ وہ آپ کے اصحاب کو وصیت کرتا تھا کہ وہ بھی آپ پر اپنی جان اور روح کو فدا کر دیں۔ اب طرفین میں جنگ زور پکڑ گئی چنانچہ امام حسینؑ کا ہر ساتھی شہید ہونے سے پہلے دس بیس دشمنوں کو تہ تیغ کر دیتا تھا۔ تاہم چند ہی گھنٹوں میں باری باری ان سب کا خاتمہ ہو گیا۔ اب خود امام حسینؑ ان کے بھائی، بیٹے اور رشتہ دار رہ گئے۔ یہ لوگ جنگ کے لیے اس بہادری سے آگے بڑھے کہ جس کی مثال اس سے قبل دیکھنے اور سننے میں نہ آئی تھی۔ ان میں سے جو بھی قتل ہو جاتا امام حسینؑ اس کو جنگاہ سے لا کر اپنے مقتول اصحاب کے برابر لٹا دیتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ وقت بھی آ گیا کہ آپ کے بیٹے علی اکبر جنگ کے لیے نکلے۔

راویوں کا کہنا ہے کہ آپ رفتار و گفتار میں رسول اکرمؐ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ چنانچہ کسی ہمعصر شاعر نے آپ کے بارے میں کہا تھا:

آنکھ نے آج تک آپ کا سا نہ پیدل چلنے والا دیکھا، نہ سوار ———

حضرت علی اکبر کی رخصت کے وقت امام حسینؑ نے فرمایا: اے اللہ! اس قوم کے بارے میں گواہ رہنا کہ اب ان کے مقابلے کے لیے وہ جوان جا رہا ہے، جو صورت و سیرت میں تیرے رسولؐ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ ہے، لہٰذا جب کبھی ہم تیرے رسولؐ کی زیارت کرنا چاہتے تھے تو اس پر نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ اے اللہ ان لوگوں سے دنیا کی برکتیں سلب کر لے۔ ان میں باہمی تفرقہ اور آپس کی جدائی پیدا کر دے۔ ان کو متعدد گروہوں میں تقسیم کر دے اور ان میں کبھی محبت قائم نہ ہونے دے۔ جیسا کہ راوی

بیان کرتے ہیں کہ آپ نے عمر بن سعد کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: اللہ تجھ کو تیرے قرابتداروں سے اسی طرح جدا کر دے جس طرح تو نے میرے جگر پاروں کو ذبح کیا ہے۔ تو نے رسول اکرمؐ سے میری قرابت کا کوئی لحاظ نہیں کیا ہے۔ پھر علی اکبر نے دشمن پر حملہ کیا اور نامور بہادروں کی طرح جنگ کرتے رہے، یہاں تک کہ یزیدیوں میں سے دو سو افراد کو قتل کر ڈالا جیسا کہ ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے جن میں معرکہ کربلا کا بیان آیا ہے۔

امام حسینؑ کی طرف سے آپ کے بھائیوں اور اہل خاندان میں سب سے بڑے جنگ آزما عباس بن علیؑ تھے۔ وہ خود اور ان کے تین بھائی جو ان سے پہلے شہید ہوتے وہ سب ایک ہی ماں سے تھے کہ جن کا نام فاطمہ بنت حزام تھا اور وہ ام البنین کہلاتی تھیں۔ جب امام حسینؑ کے اصحاب، بھائیوں اور بیٹوں میں سے کوئی اور باقی نہ رہا تو حضرت عباسؑ نے امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر دشمن سے لڑنے کی اجازت طلب کی۔ امامؑ ان کو گلے لگا کر روئے اور پھر اجازت مرحمت فرما دی۔ حضرت عباس جب اہل کوفہ پر حملہ کرتے تو وہ اس طرح بھاگنے لگتے جیسے خونخوار بھیڑیے کے سامنے سے بکریاں بھاگتی ہیں۔ آپ نے دشمنوں کو اس کثرت سے تہ تیغ کیا کہ اہل کوفہ چلا اٹھے۔ جب آپ شہید ہو گئے تو امام حسینؑ نے یہ الفاظ ادا فرمائے: اب تو میری کمر ٹوٹ گئی۔ میری راہ مسدود ہو گئی اور میرے دشمن خوش ہو گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ امام حسینؑ اور حضرت عباس ایک ساتھ جنگ کے لیے آگے بڑھے۔ وہ دونوں جس طرف بھی رخ فرماتے صفیں الٹ کر رکھ دیتے۔ جس رسالہ کی طرف جاتے وہاں کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ بالآخر دشمن ان دونوں بھائیوں کے مابین حائل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ تب انہوں نے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر حضرت عباس پر حملہ کیا اور ان کو قتل کر ڈالا۔ اب امام حسینؑ تنہا رہ گئے تھے۔ چنانچہ دشمن کے جتھے آپ پر ٹوٹ پڑے۔ حمید بن مسلم نے آپ کی جنگ کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا کہ جس کے برادر، فرزند، رشتہ دار اور مددگار قتل کیے جا چکے ہوں اور وہ آپ سے زیادہ دلیر، زور آور اور جنگ آزما ہو۔ آپ یکہ و تنہا ہوتے ہوئے بھی ان پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے لیکن وہ اپنی تیس ہزار کی تعداد کے

باوجود بھی آپ کے سامنے سے ٹڈیوں کی طرح پراگندہ ہو جاتے۔ اس پر آپ اپنے خیام اور یزیدی لشکر کے درمیان آ کھڑے ہوتے تھے۔ اس وقت آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری تھے: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

ابن سعد نے جب یہ حال دیکھا تو اس نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ وہ آپ پر پتھر برسائیں اور تیروں کی بارش کریں۔ چنانچہ ہر طرف سے آپ پر تیر اور پتھر پڑنے لگے۔ یہاں تک آپ نڈھال ہو گئے۔ اس مرحلے پر شمر بن ذی الجوشن نے اپنے ساتھیوں کو لے کر آپ کے خیام کا رخ کیا، جس سے وہاں عورتوں اور بچوں کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ تب آپ نے فرمایا: وائے ہو تم پر اے آل ابوسفیان کے ساتھیو! اگر تمہارا کوئی دین نہیں ہے اور تم کو قیامت کے دن کا کوئی خوف نہیں تو دنیا کے غیرت داروں ہی کا سا طریقہ اختیار کرو اور اگر تم اپنے خیال میں عرب ہو تو بھی اپنے بزرگوں کے راستے پر چلو۔ ارے لڑائی تو میرے اور تمہارے درمیان ہو رہی ہے، اس لیے عورتوں پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ پس جب تک میں زندہ ہوں، تم میرے اہل حرم کو ستانے سے باز رہو۔ امام حسینؑ کی اس ملامت کو سن کر وہ لوگ آپ کے خیام سے تو ہٹ آئے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے آپ کو تیروں، نیزوں اور پتھروں سے مارنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ آپ نیزوں، تلواروں، تیروں اور پتھروں کے زخموں سے چور ہو کر گر پڑے۔ پھر وہ ظالم اور ستمگار آپ تک پہنچ گئے جبکہ آپ موت کو گلے لگانے کے لیے تیار تھے۔ پس شمر نے آپ کا گلا کاٹ دیا اور آپ راہِ خدا میں شہید ہو گئے۔

ابن حجر نے صواعق میں بیان کیا ہے کہ قتل حسینؑ کے وقت اللہ کا غضب اس طرح ظاہر ہوا کہ آسمان تیرہ و تار ہو گیا اور دن میں ستارے نظر آنے لگے۔ پھر عذاب خدا ہر شخص پر نازل ہوا جو آپ کے قتل میں شریک تھا۔ وہ مزید کہتے ہیں:

کیا وہ قوم جس نے حسینؑ کو قتل کیا، قیامت کے روز ان کے نانا کی شفاعت کی امید کر سکتی ہے؟

مقریزی نے سدّی سے روایت کی ہے کہ جب امام حسینؑ قتل ہو گئے تو آسمان نے گریہ کیا اور آفتاب کو گہن لگ گیا۔ آسمان کا رونا اس کی شفق ہے۔ جیسا کہ علی بن میسرہ

نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھ سے میری دادی نے بیان کیا کہ امام حسینؑ کے قتل کے دنوں میں وہ ابھی نوجوان تھی۔ تب کئی دن تک آسمان ایسے رہا گویا کہ وہ جما ہوا ہے۔ زہری سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: مجھ کو بتایا گیا ہے کہ قتل حسینؑ کے روز بیت المقدس میں جو پتھر اٹھایا جاتا اس کے نیچے سے خون ابلتا تھا۔ دنیا تین روز تک تیرہ و تار رہی اور آسمان سے خون کی بارش ہوئی۔ ایسے ہی کچھ اور واقعات کے بارے میں بہت سی روایات ہیں لیکن ان کے راویوں کے سلسلے پورے نہیں ہیں۔ بہرحال اللہ کے لیے ایسے امور چنداں مشکل بھی نہیں، جبکہ ایسا کرنا اس کی مصلحت کے مطابق ہو۔

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد دشمنوں نے آپ کے گھوڑے کا سامان اتار لیا۔ آپ کے خیموں کو تاراج کیا۔ عورتوں کی چادریں اور ان کے زیور چھین لیے۔ پھر ابن زیاد کی ہدایت پر عمر بن سعد نے دس سواروں کو حکم دیا اور انھوں نے اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے آپ کے جسد پاک کو پامال کر ڈالا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے مقتولین کے جسموں سے ان کے سروں کو کاٹ کر علحدہ کیا، نیزوں پر بلند کیا، یہ سب اٹھہتّر (یا بہتّر) سر تھے جن کو ان قبیلوں کے لوگوں نے باہم بانٹ لیا جنھوں نے ان کے قتل میں شرکت کی تھی۔ اس کے بعد عمر بن سعد کے حکم سے عورتوں کو بے کجاوہ اونٹوں پر ننگے سر سوار کرا دیا گیا اور ان کو اس طرف سے لیجایا گیا جہاں ان کے عزیزوں کے سربریدہ جسم ریت پر پڑے تھے۔ چنانچہ بی بی زینبؑ نے جب اپنے بھائی کے جسم کو نیزوں، تلواروں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے پارہ پارہ دیکھا تو اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے فرمایا: بارالہا! ہماری اس قربانی کو قبول فرمالے۔ غضب یہ تھا کہ ابن سعد نے اپنے مقتولین کو دفن کیا لیکن امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب کو بیابان کربلا میں اسی طرح پڑا رہنے دیا۔ بیشتر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شہیدوں کا کفن دفن امام زین العابدینؑ کے ہاتھوں تین دن کے بعد تکمیل کو پہنچا تھا۔ مؤرخوں کا بیان ہے کہ جنگ ختم ہو جانے پر عمر ابن سعد سرہائے شہداء کو کوفہ لے گیا۔ امام حسینؑ کا سر خولی بن یزید اصبحی کے پاس تھا۔ اس نے ابن زیاد کے محل کا دروازہ بند پایا تو وہ امام کے سر اقدس کو اپنے گھر لے گیا اور اس کو ایک برتن میں رکھ کر بستر پر چلا گیا۔ تب اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تیرے پاس دنیا کی ایک بڑی دولت لایا ہوں۔ دیکھ یہ

سر حسینؑ تیرے پاس گھر میں موجود ہے۔

طبری کی روایت میں ہے کہ جب اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ وہ امام حسینؑ کا سر اقدس لایا ہے تو وہ بہت غصّے ہوئی اور کہنے لگی: وائے ہو تجھ پر! لوگ تو سونا اور چاندی لے کر آتے ہیں اور تو رسولؐ کے بیٹے کا سر لے آیا ہے۔ قسم بخدا! اب کبھی میرا اور تیرا سر اس گھر میں اکٹھا نہ ہوں گے۔ یہ کہہ کر وہ اس کے پاس سے اٹھی اور گھر کی ایک جانب چلی گئی۔ پھر کہنے لگی: میں برابر ایک نور دیکھتی رہی جو اس برتن میں سے ایک ستون کی مانند بلند ہو رہا تھا اور میں نے کچھ سفید پرندے بھی اس کے چاروں طرف اڑتے ہوئے دیکھے۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ ابن زیاد نے لوگوں کو عام اجازت دیدی کہ وہ محل میں آجائیں جبکہ امام حسینؑ کا سر مبارک اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ تب وہ آپکے دندان مبارک پر اپنی چھڑی لگائے جاتا تھا۔ زید بن ارقم نے یہ حال دیکھا تو بول اٹھے: ان ہونٹوں پر سے اپنی چھڑی ہٹالے، مجھے قسم ہے اس خدا کی کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ میں نے بارہا رسول اکرمؐ کو انہیں پر بوسہ لیتے دیکھا ہے۔ اس کے بعد وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ اس پر ابن زیاد نے ان سے کہا: اگر تم بڈھے نہ ہوگئے ہوتے اور تمہاری عقل مختل نہ ہوتی تو میں تم کو قتل کر ڈالتا۔ یہ سنکر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے چل پڑے: اہل کوفہ! آج سے تم غلام بن گئے ہو۔ تم نے حسینؑ کو قتل کر ڈالا اور اپنے اوپر ابن مرجانہ کو حاکم بنالیا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ابن زیاد امام حسینؑ کے دندان مبارک پر چھڑی لگاتا اور یہ شعر پڑھتا جاتا تھا:

ہم ایک ایسے شخص کا سر کچل رہے ہیں جو ہمارے لیے نہایت سخت نافرمان اور ظالم تھا۔

اس موقع پر صحابی رسولؐ ابو برزہؓ موجود تھے۔ انہوں نے اس سے کہا: ابن زیاد! ایسا نہ کر کیونکہ میں نے ان دانتوں پر تیری چھڑی کی جگہ رسول اللہؐ کے ہونٹوں کو دیکھا ہے۔

جب قیدی ابن زیاد کے سامنے حاضر کیے گئے تو جناب زینب بنت علیؑ ایک جانب ہوگئیں اور خود کو اوٹ میں کرلیا۔ اس وقت ابن زیاد نے ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا:

یہ غیر معروف سی عورت کون ہے؟ آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے دوبارہ اور سہ بارہ بھی سوال کیا۔ آپ نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ اس پر اس کے درباریوں میں سے کسی نے اس سے کہہ دیا کہ یہ زینبؑ بنت فاطمہؑ بنت رسول اللہؐ ہیں۔ تب اس نے ان کی طرف دیکھ کر کہا: اللہ کی حمد ہے، جس نے تم کو ذلیل کیا، تم کو قتل کرا دیا اور تمہارے دعووں کو جھٹلا دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: ہاں حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہم کو اپنے نبی محمدؐ کے واسطہ سے عزت بخشی اور ہم کو برائیوں سے اچھی طرح پاک رکھا۔ ہاں! اے ابن مرجانہ! بے شک فاسق ذلیل ہوتا ہے اور بدکار جھوٹا ثابت ہوتا ہے اور وہ ہمارے علاوہ دوسرے لوگ ہیں۔ اس پر اس نے آپ سے کہا: تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے تمہارے بھائی حسینؑ کے ساتھ کیا کیا؟ آپ نے فرمایا: میں نے تو بھلائی ہی بھلائی دیکھی ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کا قتل ہونا مقدر کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی جائے آرام پر پہنچ گئے۔ عنقریب اللہ تجھ کو اور ان کو ایک جگہ اکٹھا کرے گا، جہاں تو چیخ چیخ کر روئے گا۔ او ابن مرجانہ! تیری ماں تجھے روئے۔ پھر اس روز دیکھنا کہ کس کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اس بھرے دربار میں ثانیٔ زہراؑ کا یہ دوبدو جواب سن کر اس کو بہت غصہ آیا اور وہ آپ کو مارنے کا ارادہ کرنے لگا۔ اس پر عمرو بن حریث نے اس سے کہا: یاد رکھو کہ یہ ایک عورت ہیں اور عورتوں کو ان کی باتوں پر پکڑا نہیں جاتا۔ تب اس نے آپ کی تضحیک کرنے کے لیے پھر سے جلی کٹی باتیں کرنا شروع کیں اور بولا: اللہ نے تمہارے سرکش سردار حسینؑ اور تمہارے خاندان کے پُرغرور اور باغی افراد کے قتل سے میرے دل کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اس وقت آپ کے دل پر چوٹ لگی، آپ رونے لگیں اور بولیں: قسم بخدا! تو نے ہمارے بڑوں کو قتل کر ڈالا، ہماری شاخوں کو کاٹ دیا اور ہماری جڑ کو اکھاڑ پھینکا۔ اگر یہ تیرے دل کے ٹھنڈا ہونے کا باعث ہوا ہے تو پھر ضرور تیرا دل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔

اس نے امام علیؑ بن حسینؑ سے بھی اسی طرح کی سخت گفتگو کی تھی جس میں آپ نے اس کی سطوت سے کوئی خوف نہ کھایا اور نہ ہی آپ اس کے اقتدار سے ڈرے۔ اس پر مارے غصہ کے ابن زیاد کی رگیں پھول گئیں اور اس نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن بی بی زینبؑ ان سے لپٹ گئیں اور ان کی بجائے خود مرنے پر تیار ہو گئیں۔ پھر اس سے کہنے لگیں:

تونے ہمارے جتنے خون کرڈالے تمہارے لیے وہی بہت ہیں۔ اب اگر توان کو بھی قتل کرنا چاہتا ہے توان کے بجائے مجھے قتل کردے۔ اس پر اس کے درباریوں میں سے کسی نے اس سے کہا کہ علیؑ ابن حسینؑ کی بیماری ہی ان کی موت کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ اس نے ان کو چھوڑ دیا اور کہنے لگا: "کیسی عجیب محبت ہے کہ یہ بی بی ان کی بجائے مرجانے کی خواہشمند تھیں۔"

امام زین العابدینؑ اور بی بی زینبؑ کی ابن زیاد، یزید اور اہل کوفہ کے ساتھ گفتگوؤں کے بارے میں راویوں نے بہت کچھ کہا ہے اور مؤلفین نے بھی امام حسینؑ کے عظیم اقدام اور واقعات کربلا کے سلسلے میں ان کا ذکر کیا ہے۔ البتہ میں نے بخوفِ طوالت یہاں آپ کی حیات طیبہ، عظیم قربانی اور اس کے بعد رونما ہونیوالے واقعات میں سے صرف انہی چند پہلوؤں کے تذکرے پر اکتفا کی ہے۔

مختصر یہ کہ قتل حسینؑ نے عالم اسلام کو ہلا ڈالا اور لوگوں کے دلوں کو دہلا دیا۔ مسلمانوں کے دلوں کو اس سے جو صدمہ پہنچا وہ اس سے یہ سمجھے کہ گویا آفتاب کو گہن لگ گیا ہے۔ ستارے ٹوٹ کر تباہ ہوگئے ہیں۔ آسمان خون برسا رہا ہے اور ہر طرف سے جنوں کی غیبی آوازیں آرہی ہیں کہ تم نے اپنے نبیؐ کے بیٹے کو مار ڈالا اور اپنے رسولؐ کی عترت کو تباہ کردیا ہے۔ پس اب تم دنیا اور آخرت میں عذاب اور ذلت کا انتظار کرو۔ یہانتک کہ جب امویوں نے دنیا میں ادھر سے ادھر تک اس واقعہ کے بارے میں مسلمانوں کا ردعمل دیکھا اور اموی خاندان کے خلاف ان کا غم و غصہ ملاحظہ کیا تو وہ ندامت کا اظہار کرنے لگے اور کربلا کے تمام واقعات سے اپنی بریت کا اعلان کرنے لگے۔ چنانچہ مروان کے سگے بھائی، یحییٰ بن حکم نے یہ شعر کہہ ڈالے:

> کیا غضب ہے کہ ابن زیاد ایسے کمینے اور دوغلے حسب و نسب والے شخص کی قرابت دار سمیّہ کی نسل کنکروں کی طرح پھیل جائے اور رسول اللہؐ کی بیٹی فاطمہؑ زہراؑ کی نسل فرات کے کنارے قطع ہوجائے۔

اسی طرح معاویہ بن یزید بھی خوب رویا اور جب اس سے رونے کا سبب پوچھا گیا تو کہنے لگا: میں اس پر نہیں رو رہا ہوں کہ حکومت ہاتھ سے جاتا رہا بلکہ اس پر رنج کر رہا ہوں

کہ اب بنی امیہ کے گناہوں میں میرے گناہ بھی شامل ہوجائیں گے۔

اس زمانے میں جو صحابی باقی تھے انہوں نے لوگوں کو بتلایا کہ: ہم نے خواب میں نبی اکرمؐ کو دیکھا ہے کہ آپ کے گیسو غبار آلودہ ہیں اور آپ ہاتھ میں ایک شیشی لیے ہوئے ہیں جس میں خون ہے۔ تب ہم نے ان سے دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا: میں نے حسینؑ کو قتل ہوتے دیکھا تو ان کا خون اس شیشی میں جمع کر لیا ہے۔ جس روز ان کے قاتل اپنے اللہ کے سامنے پیش کیے جائیں گے میں ان پر اس خون کا دعویٰ کروں گا۔

بنی امیہ پر مسلمانوں کے غصہ اور عتاب کی وجہ سے یزید بن معاویہ بھی مجبور ہوگیا کہ قتل حسینؑ کی ذمہ داری ابن زیاد پر ڈال دے۔ چنانچہ وہ کہنے لگا: اللہ ابن مرجانہ پر لعنت کرے۔ قسم بخدا کہ میں نے اس کو قتل حسینؑ کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ اس پر راضی ہوا ہوں۔ اس نے میرے اوپر اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا ہے جسے میں اپنی ہمت سے زیادہ محسوس کر رہا ہوں۔ قسم بخدا! میں تو دل سے چاہتا تھا کہ چاہے میں ہر چیز سے محروم رہ جاؤں لیکن حسینؑ قتل نہ ہوں۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اس نے یہ اس وقت کہا جب اس کو یہ اطلاع پہنچی تھی کہ قتل حسینؑ سے تمام مسلمان بے قرار ہوگئے ہیں اور اب ملک کے مختلف علاقوں میں اس کی حکومت کے خلاف شورش کی تیاریاں کر رہے ہیں حالانکہ ان خبروں کے آنے سے پہلے اس نے ابن زیاد کو اپنا مقرب بنایا اور اس کے اس ظلم پر اس کی تعریف و توصیف کی تھی۔

امام حسینؑ کا سر اقدس

اس امر پر مؤرخوں کا اتفاق ہے کہ جب عبید اللہ بن زیاد نے یزید کے حکم سے عمر بن سعد کو امامؑ سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا تو اس کو ہدایت کی تھی کہ بعد شہادت وہ آپ کے اعضاء قطع کر ڈالے اور آپ کا سر اقدس اس کے پاس بھیج دے۔ نیز یہ کہ عمر ابن سعد نے امام حسینؑ، آپ کے اہل خاندان اور اصحاب کے اعضاء قطع کر کے ان کے سر ہائے مبارک کوفہ بھیج دیے۔ پھر ابن زیاد نے ان کو قیدیوں کے ساتھ یا بعض روایات کے مطابق ان سے پہلے شام بھیج دیا۔ مزید یہ کہ ابن سعد نے اپنے مقتولین کو تو دفن کیا لیکن امام حسینؑ، ان کے عزیزوں اور ان کے ساتھیوں کی لاشوں کو میدان کربلا میں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد

امام حسینؑ، حضرت عباسؑ اور ان کے تمام ساتھیوں کی لاشیں انہی مقامات پر دفن ہوئیں جہاں اس وقت ان کے مزارات واقع ہیں۔ اس میں محدثین و مؤرخین میں سے کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابن زیاد نے امام حسینؑ کا سر اقدس، دوسرے سروں کے ساتھ شام بھیج دیا جہاں یزید نے اس کو ایک طشت میں اپنے سامنے رکھوایا اور بعض راویوں کے بقول آپ کے دندان مبارک کو چھڑی سے ضربیں لگاتے ہوئے یہ اشعار پڑھنے لگا:

کاش! بدر کی جنگ میں مارے جانے والے میرے بزرگ آج تلواریں لگنے سے خزرج کے لوگوں کی سراسیمگی دیکھتے۔ یقیناً وہ مارے خوشی کے جھوم جاتے، اپنے معبودوں کی حمد کرتے اور کہتے کہ اے یزید! تجھ کو کبھی زوال نہ ہو۔

اس کے بعد آپ کے سر اقدس کو دفن کر دیا گیا لیکن کب اور کہاں؟ اس کے متعلق راویوں اور مؤرخوں کے متعدد اقوال ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق اس بارے میں نو قول پائے جاتے ہیں۔ البتہ اکثر شیعہ اس روایت پر اعتماد کرتے ہیں کہ آپ کا سر اقدس بھی آپ کے جسدِ اطہر کے ساتھ کربلا میں مدفون ہے کیونکہ امام زین العابدینؑ نے اپنے والد کا سر یزید سے طلب فرمایا اور اس نے وہ ان کو دے دیا تھا۔ چنانچہ شام سے مدینہ جاتے ہوئے جب آپ کربلا سے گزرے تو آپ نے امام حسینؑ کے سر اقدس کو ان کے جسد اطہر کے ساتھ ہی دفن کر دیا تھا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یزید نے امامؑ کے سر مبارک کو مدینہ بھیج دیا تھا۔ پھر وہاں کے گورنر عمرو بن سعید بن العاص نے اس سر کو بقیع میں آپ کی والدۂ گرامی اور برادر عالی قدر کے برابر میں دفن کر دیا۔ ابوالفداء کی اس رائے کو عمر بن الوردی نے اپنی تاریخ کی پہلی جلد میں اور علی بن عبداللہ سمہودی نے وفاء الوفاء میں اختیار کیا ہے۔ البتہ انہوں نے اس پر اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ ابن ابی الدینار بلاذری کے بقول لوگوں کو یزید بن معاویہ کے خزانہ میں امام حسینؑ کا سر اقدس ملا تو انھوں نے اس کو کفنا کر دمشق شہر کے باب الفرادیس کے قریب دفن کر دیا۔

اسعاف الراغبین میں روایت ہے کہ یزید بن معاویہ نے حکم دیا کہ امام کے سرِ اقدس کو مختلف علاقوں میں پھرایا جائے۔ چنانچہ جب یہ عسقلان میں پہنچا تو وہاں کے حاکم نے اس کو وہیں دفن کر دیا۔ بعد میں جب عسقلان پر انگریزوں کا تسلط ہوا تو فاطمیوں کے ایک وزیر صالح طلائع نے اس کو کثیر رقم کے عوض ان سے حاصل کر لیا۔ وہ اس کو لینے کے لیے کئی منزلیں پیدل چل کر گیا۔ پھر اس کو آبنوس کی ایک کرسی پر سبز رنگ کے ریشمی جزدان میں رکھ دیا اور اس کے نیچے مشک اور دوسری خوشبوئیں بکھیر دیں۔ بعد میں اس کے اوپر مشہد حسینی تعمیر کرایا جو قاہرہ میں خان خلیلی کے قریب ایک مشہور جگہ ہے۔

نور العین فی مشہد الحسینؑ کے مؤلف نے مرشد الزوّار الی طریق الابرار کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے: عہد فاطمیین کے ایک عالم نے بیان کیا ہے کہ قاہرہ میں امام حسینؑ کا وہ سر مبارک ہے جو عسقلان میں تھا۔ عباس نے خلیفہ ظاہر فاطمی کو لکھا کہ انگریزوں نے عسقلان پر تسلط جما لیا ہے، وہاں وہ سر دفن ہے جس کو حسینؑ ابن علیؑ کا سر کہا جاتا ہے۔ آپ کسی کو اختیار دے کر بھیجیے تاکہ وہ اس کو حاصل کر لے۔ چنانچہ انھوں نے مکنون الخادم کو کچھ آدمی دیکر بھیجا اور وہ اس سرِ اقدس کو عسقلان سے مصر لے آئے۔ پھر اس کو قصر میں لے جایا گیا جہاں وہ اب تک ہے۔ خلیفہ ظاہر نے مسجد فاکہانی اسی غرض سے بنوائی کہ یہ سرِ اقدس اس میں رکھا جائے۔ نیز طلائع بن زریک نے بھی اس سر کو رکھنے کے لیے باب زویلہ کے باہر ایک مسجد بنوائی جس کو جامع صالح کہتے ہیں لیکن اس کے بعد ان سب نے یہ کیا کہ اس کو قصر کے اس قبہ دیلم میں رکھ دیا جائے جو اس محل کے باب الخدام کے قریب واقع ہے۔ اس بارے میں مہذب بن زبیر نے ایک طویل قصیدہ نظم کیا جس کے ایک شعر میں وہ کہتا ہے:

ہائے افسوس! ان سرہائے مبارک پر جو دفن کے بعد بھی اِدھر اُدھر لے جائے جا رہے ہیں۔

مقریزی کہتا ہے کہ افضل ابن امیر الجیوش ایک بڑا لشکر لے کر بیت المقدس کی طرف بڑھا جبکہ ارتق کے بیٹے سقمان اور ایلغازی بھی اپنے عزیزوں اور کثیر ترک فوجیوں سمیت اس کے مقابلے پر نکلے۔ سامی بک کی کتاب قاموس الاعلام میں ہے کہ یہی وہ

ارتق ہے جو بنی ارتق کی اس حکومت کا بانی ہے کہ جس میں دیار بکر، حلب اور ماردین کے علاقے شامل تھے جن پر ارتق کے بیٹے سقمان اور ایلغاری ۴۸۴ھ سے ۵۱۶ھ تک حکمران رہے ہیں۔ چنانچہ افضل بن امیرالجیوش نے ان دونوں بھائیوں کو لکھا اور ان سے یہ خواہش کی کہ وہ قدس کا علاقہ بغیر جنگ کے ان کے سپرد کر دیں۔ انہوں نے اس بات کو نہ مانا لہٰذا اس نے شہر پہ حملہ بول دیا اور منجنیق سے سنگ باری شروع کر دی۔ اب تو ان دونوں کے سامنے ہار مان لینے کے علاوہ کوئی صورت نہ رہی، اس لیے انہوں نے قدس اس کو دیدیا۔ اب یہ اپنے لشکر میں واپس آیا اور پھر عسقلان میں داخل ہو گیا جہاں ایک بوسیدہ مکان میں امام حسینؑ کا سر اقدس موجود تھا۔ اس نے سر اقدس کو نکال کر عطر لگایا اور صندوق میں بند کر کے ایک اور مکان میں رکھوا دیا۔ پھر اس مکان کی تعمیر و تجدید کرائی کہ جس میں وہ سر اقدس پہلے رکھا ہوا تھا۔ جب وہ مکان بن کر تیار ہو گیا تو افضل، امامؑ کے سر اقدس کو سینے سے لگا کر پیدل سے چلا اور اس کو اسی پہلے مقام پر رکھ دیا۔ بعدہٗ ۵۴۸ھ میں یہ سر اقدس عسقلان سے قاہرہ منتقل کیا گیا تو امیر سیف المملکت اور قاضی موئتمن بن مسکین اس کو عسقلان سے قاہرہ لائے اور اس کو شاہی محل کے باب الخدام کے قریب قبۂ دیلم میں دفن کیا گیا۔ پس جو کوئی بھی وہاں جاتا اس مقبرے کی زمین کو بوسہ دیتا تھا۔[1]

ان معاملات کے بارے میں تحقیق کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر سر اقدس کا قاہرہ میں ہونا صحیح ہے تو پھر یہ دو مرحلوں سے گزر کر وہاں پہنچا ہے۔ وہ اس طرح کہ ابتداءً یہ دمشق میں یزید بن معاویہ کے حکم سے باب فرادیس کے قریب ایک مکان میں دفن کیا گیا یا یہ یزید کے خزانے میں سے ملا اور اس کو باب فرادیس کے قریب دفن کیا گیا۔ ابن ابی الدینار بلاذری اور واقدی نے بھی سر اقدس کے دمشق میں دفن کیے جانے کو ترجیح دی ہے۔ تاہم بعض لوگوں کی رائے ہے کہ امام حسینؑ کا سر اقدس باب فرادیس کے قریب دفن ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یزید بن معاویہ نے اس کو اپنے باپ کی قبر میں دفن کیا تھا۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ مسجد میں دفن ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شہر کی فصیل میں دفن ہوا

---

[1] خطط مقریزی۔ جلد اول

اور اس کے بعد فاطمیوں کے ہاتھوں دمشق سے عسقلان پہنچا اور پانچویں صدی ہجری تک وہیں رہا۔ یہ رائے عثمان مدوخ نے اپنی کتاب "العدل الشاہد فی تحقیق المشاہد" میں اختیار کی ہے۔ چنانچہ وہ ان مختلف مرحلوں کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی عالم نے باب فرادیس کے قریب ایک مکان کو گرانا شروع کیا تاکہ وہ اپنی کتابوں کے لیے محافظ خانہ بنائے۔ وہاں اس کو دیوار میں ایک طاق دکھائی دیا جو ایک بڑے پتھر سے بند تھا۔ اس پر کچھ ایسے نقش کھدے ہوئے تھے جن سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ امام حسینؑ کے سر اقدس کی جاء دفن ہے۔ انہوں نے حاکم شام کو اس کی اطلاع دے دی۔ اس نے خود آ کر اس کو دیکھا اور کہا کہ وہ اس مکان میں کوئی تبدیلی نہ کریں۔ اس کے بعد اس نے یہ معاملہ سلطان عبد المجید خاں بن سلطان محمود خاں کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ اس طاق کو تمام علماء، امراء اور ممتاز افراد کے سامنے کھولا جائے۔ چنانچہ لوگوں نے وہ بڑا پتھر اپنی جگہ سے ہٹایا تو وہاں ان کو خالی جگہ ملی کہ جس میں کچھ بھی نہ تھا۔ جب وہاں موجود لوگوں نے اس کو اچھی طرح دیکھ لیا تو حاکم شام نے کہا کہ اس کو اسی طرح بند کر دیا جائے جیسا کہ وہ پہلے سے تھا۔ پھر یہ معاملہ سلطان عبد المجید تک پہنچایا گیا۔ تب انہوں نے حکم دیا کہ اس پتھر کے چاروں طرف چاندی کا ایک طاق بنا دیا جائے۔ عثمان مدوخ مزید لکھتے ہیں: میں اس طاق کے وزن کی مقدار بھی جانتا ہوں اور میرے خیال میں یہ سات ہزار درہم ہوگا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سر اقدس پہلے دمشق میں دفن ہوا اور پھر تقریباً سو سال کے بعد عسقلان کے مقبرہ میں پہنچا جہاں سے شاہ صالح طلائع کے ذریعے سے چھٹی صدی ہجری میں وہ قاہرہ منتقل ہوگیا۔

امام حسینؑ کے سر اقدس کے قاہرہ میں اب تک موجود ہونے کو عبد الرحمٰن کتخدا نے اس وقت ثابت کیا جب مسجد مبارک کے مجاور نے مسجد کی توسیع کرنی چاہی۔ چنانچہ کہا گیا کہ امامؑ کے سر اقدس کا یہاں دفن کیا جانا کوئی مسلمہ بات نہیں ہے۔ اس پر کتخدا نے تحقیق کرنی شروع کر دی۔ پس اس نے جائے دفن کو لوگوں کے سامنے کھولا اور پھر استاد جوہری شافعی اور استاد شیخ جلوی مالکی اس کے اندر اترے، جو دونوں ہی عظیم علمائے با عمل میں سے تھے۔ انھوں نے وہاں ساگوان کی ایک کرسی دیکھی جس پر سونے کا ایک طشت رکھا تھا اس

میں ریشم کی سبز دستار تھی اور اس کے اندر سر اقدس موجود تھا۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کو یہ سب کچھ بتلا دیا۔ تب وہاں مسجد اور مقبرہ بنایا گیا اور ان کے لیے جائدادیں وقف کر دی گئیں جن کی آمدنی ان پر صرف کی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام حسینؑ کا سر اقدس شہر رقّہ کی مسجد میں دفن ہے۔ یہ رائے عبداللہ بن عمرو راق نے اپنی کتاب مقتل میں ظاہر کی اور لکھا کہ جب ابن زیاد نے امام حسینؑ کا سر اقدس یزید بن معاویہ کے پاس بھیجا تو وہ کہنے لگا کہ میں اس کو عثمان کے سر کے بدلہ میں آل ابی معیط کے پاس بھیجے دیتا ہوں۔ چونکہ وہ لوگ اس وقت رقّہ میں رہتے تھے لہٰذا اس نے وہ سر اقدس ان کے پاس وہیں بھیج دیا اور وہاں انہوں نے اس کو اپنے کسی مکان میں دفن کر دیا۔ بعد میں یہ مکانات مسجد میں داخل کر لیے گئے۔ اس طرح اب وہ سر اقدس وہاں سدرہ کی جانب دفن ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ امامؑ کا سر اقدس دمشق ہی میں ہے اور وہاں سے باہر نہیں گیا۔ ذہبی نے تاریخ اسلام میں ابوبکر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے دمشق میں ولید بن یزید پر حملہ کیا اور اس کے خزانوں کو لوٹا تھا۔ تب میں نے وہاں سے ایک صندوق اٹھا لیا اور میں سمجھتا تھا کہ اس میں بہت زیادہ دولت ہے پس میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کو اپنے آگے رکھ لیا۔ جب میں پھاٹک سے نکل گیا تو میں نے اس کو کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں ایک سر ہے اور اس پر ریشمی کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ جس کے اوپر لکھا ہوا ہے کہ یہ حسینؑ ابن علیؑ کا سر ہے۔ میں گھوڑے سے اتر پڑا اس کے لیے اپنی تلوار سے قبر کھودی اور اس کو دفن کر دیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام مظلومؑ کا سر اقدس سلیمان بن عبدالملک کے زمانے تک شاہی خزانے میں رہا۔ پھر اس نے اس کو دفن کیا لیکن جب حبشیوں کا تسلط ہوا تو انہوں نے وہ جگہ دریافت کر کے اسکو کھود نکالا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سر اقدس تیمور لنگ کے زمانے تک مدفون رہا۔ پھر وہ لوگ اس کو نکال کر اپنے ملک لے گئے اور وہاں دفن کر دیا۔ اسی طرح ابن تیمیہ سمیت کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ امام حسینؑ کا سر اقدس قاہرہ کی اس نامبردہ جگہ پر نہیں ہے۔ بہر حال جائے دفن کے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے، لیکن جن لوگوں نے یہ اقوال پیش کیے ہیں انھوں نے کوئی قطعی دلیل یا قابل اطمینان

روایت بیان نہیں کی ہے۔ یہاں تک کہ جن شیعہ علماء نے یہ کہا ہے کہ امام حسینؑ کا سر اقدس آپ کے جسد مطہر کے ساتھ کربلا میں دفن ہے، انہوں نے بھی کوئی اطمینان بخش دلیل پیش نہیں کی ہے۔ اتنی بات یقینی ہے کہ جسد اطہر تو کربلا ہی میں دفن ہے جہاں آپ کا مزار ہے۔ البتہ سر اقدس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ قیدیوں کے ساتھ شام لے جایا گیا تھا۔

رہی یہ بات کہ سر اقدس دمشق سے عسقلان، رقہ، مدینہ یا قاہرہ لے جایا گیا تھا یا بنی امیہ کے خزانوں میں پڑا رہا تو اس کے لیے ان کتابوں میں جو ہمارے پاس موجود ہیں، کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی کہ جس سے کسی ایک قول پر اطمینان حاصل ہو سکے۔ بہت ممکن ہے کہ یزید بن معاویہ نے اس کو مسجد دمشق کے پہلو میں یا وہاں کے قبرستان میں دفن کر دیا ہو، کیونکہ اس نے اسلامی مملکت کے مختلف علاقوں میں اپنے خلاف غم و غصے کا احساس کر لیا تھا اور خوب سمجھ لیا تھا کہ خود اس کے لیے اور تمام بنی امیہ کے لیے امام حسینؑ کو قتل کرنے کے نتائج نہایت ناگوار ثابت ہوں گے اس لیے وہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنے اس جرم کی تلافی کرے کہ جس کی مثال تاریخ میں نایاب ہے۔ چنانچہ وہ امام زین العابدینؑ اور ان کے ساتھی قیدیوں کی طرف جھک رہا تھا، جبکہ ابن زیاد سے دوری اختیار کرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی محفلوں میں اس پر لعنت کرتا اور کہتا تھا کہ ابن مرجانہ نے مجھ پر ایسا بوجھ ڈال دیا ہے جو مجھ سے اٹھائے نہیں اٹھتا۔

اس رنج اور غم سے بھری ہوئی فضا میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ اس نے امام حسینؑ کے سر اقدس کو اپنے پاس یا اپنے خزانے میں رکھ چھوڑا ہو، کیونکہ اس کا وجود لوگوں کے رنج کو تیز کرتا اور ان کے ذہنوں میں اس عظیم المیہ کی تصویریں ابھارتا کہ جس کی تلخی سب مسلمان محسوس کر رہے تھے۔ نیز اس سے ایسے نتائج پیدا ہوتے کہ جن کی تلافی امکان سے باہر ہوتی۔ ان وجوہ کی بنا پر میں اس خیال کو ترجیح دیتا ہوں کہ امام حسینؑ کا سر اقدس دمشق لے جانے کے بعد جلد ہی باب فرادیس میں یا کسی قبرستان میں یا کسی اور جگہ دفن کر دیا ہو گا۔ پھر وہاں سے اس کا عسقلان، قاہرہ یا کسی دوسری جگہ منتقل کیا جانا بھی محال نہیں ہے لیکن اس کو ثابت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہونی چاہیے تاہم اس ضمن میں لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بطور دلیل قابل قبول نہیں ہے۔ بہرصورت

جہاں ایک طرف امام حسینؑ اس وسیع دنیا کے کسی چھوٹے سے قطعہ زمین میں مدفون ہیں۔ دوسری طرف وہ لاکھوں پاکباز مومنوں کے دلوں میں جاگزیں ہیں۔ اگرچہ محققوں، مورخوں حتیٰ کہ ان سے ساتھ محبت کرنے والوں کی نگاہوں سے امامؑ کا وہ مدفن پوشیدہ ہی کیوں نہ ہو گیا ہو تو بھی وہ دل کہ جن میں حسینؑ مقیم ہیں اور جنہوں نے ان کو اپنا امام، اپنا قائد اور اپنے لیے اعلیٰ نمونہ عمل بھی مان لیا ہے۔ ان سے امام حسینؑ، ان کے انصار اور ان کے مخلص پیروؤں کی محبت، کشش اور عقیدت مٹنے والی نہیں ہے۔ یقیناً حسینؑ ہر اس شخص کے دل میں جاگزیں ہیں جو حق، نیکی، عدالت۔ نیز مظلوموں اور کمزوروں کی مدد پر خندہ پیشانی سے آمادہ رہتا ہے۔ ظالموں، سرکشوں، جابروں، خیانت کاروں اور منافقوں سے نفرت کرتا ہے اور اللہ کی راہ میں اپنی جان، مال اور اولاد کی قربانی دیتا ہے۔ چونکہ میرا قلب بھی ایسے ہی قلوب میں سے ہے جن میں حسینؑ جاگزیں ہیں اس لیے میں ان کے سرِ اقدس کی جائے دفن کی جستجو کرنے والوں سے فخر و مباہات کے ساتھ کہتا ہوں کہ:

حسینؑ کے سرِ اقدس کو مشرق و مغرب میں مت تلاش کرو۔ بلکہ سب اطراف کو چھوڑ کر میری طرف آؤ کہ میرے گوشۂ دل میں مدفون ہے۔[1]

صلح حسنؑ اور جہادِ حسینؑ پر ایک نظر

محدثین اور مورخین میں صلح حسنؑ اور جہادِ حسینؑ کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ نے صلح حسنؑ کو صحیح اور جہادِ حسینؑ کو غلط قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ امام حسنؑ کو غلطی پر اور امام حسینؑ کو صحیح راہ پر قرار دیتا ہے۔ جبکہ ایک تیسرا گروہ ان دونوں بھائیوں کو راہِ صواب پر قرار دیتا ہے۔ تاہم بیشتر مستشرقین امام حسینؑ کو اپنے اقدام میں غلطی پر سمجھتے ہیں اور عرب کے بہت سے قدیم و جدید مؤلفین بھی انہی کے ہمنوا ہیں۔ پچھلے ابواب میں امام حسنؑ ابن علیؑ کی صلح اور ان کی معاویہ کے حق میں حکومت سے دستبرداری کے ذکر میں ہم بیان

---

[1] ہم نے جو کچھ امام حسینؑ کے سرِ اقدس کے متعلق لکھا ہے، اس کے لیے علی جلال حسینی کی کتاب "حسینؑ ابن علیؑ" کے صفحات ۱۳۹ و ما بعد پر انحصار کیا ہے۔

کر چکے ہیں کہ ان کا موقف حد درجہ حکیمانہ تھا اور ان کو اس کے اختیار کرنے پر اسلام کی عظیم مصلحت نے آمادہ کیا تھا۔ اگر اس فضا میں وہ معاویہ سے اپنی پیکار جاری رکھتے کہ جس میں لوگ آپ کے خلاف ان کی مدد پر آمادہ تھے۔ پھر خود معاویہ بھی اپنی طرف سے صلح پر آمادگی ظاہر کر کے یہ کہہ چکے تھے کہ امر و نہی کے تمام احکام امام حسنؑ ہی جاری کیا کریں گے جبکہ یزید کے ذمے صرف ان کی تعمیل ہی ہوگی۔ ان حالات میں اگر وہ جنگ جاری رکھتے جبکہ خود ان کا لشکر ٹوٹ ٹوٹ کر اور ان کو چھوڑ چھوڑ کر معاویہ سے ملتا جا رہا تھا تو معاویہ کے لیے امام حسنؑ ان کے بھائیوں عزیزوں اور ان کے مخلص شیعوں کو نابود کر دینا اور اسلام کو مسخ کر ڈالنا خاصا آسان ہو جاتا۔ اگر ایسا ہو ہی جاتا تو پھر معاویہ کے لیے اس میں کوئی رکاوٹ نہ رہتی کہ وہ اپنے آباء و اجداد کے خواب کو پورا کر دکھائیں جو کچھ اوپر بیس سال تک اسلام سے برسرِ جنگ رہ چکے تھے۔ پھر ادھر سے اُدھر تک کسی بھی مسلمان سے خوف نہ کھاتے جبکہ امام حسنؑ، امام حسینؑ اور بچے کھچے نیک نفس مسلمانوں کے ہوتے ہوتے بھی انھوں نے ایسی ایسی بدعتیں نکالیں کہ جس سے اسلام اور شریعت کی جڑیں تک ہل گئیں۔ ان کی یہ بدعتیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اپنے اقتدار اور حکمرانی کی خاطر اسلام کو مسخ کر دینے یا مٹا ڈالنے پر تیار تھے۔ اس سے پہلے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہؐ کے ساتھ اپنے اس حسد اور دشمنی کو اپنے مقربین سے چھپا نہ سکے تھے کیونکہ آنحضرتؐ کا نام نامی روزانہ سیکڑوں مرتبہ اذانوں میں اور منبروں پر دہرایا جاتا تھا۔ یہ وہ امور ہیں جو ہم پچھلے ابواب میں بیان کر چکے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان کے ساتھ امام حسنؑ کے موقف کی بنیاد اسلام کی وہ عظیم مصلحت تھی جو اہل بیت کرامؑ کے تمام اعمال و افعال میں کارفرما تھی۔

وہ لوگ جو حسینی اقدام کو تنقید و اعتراض کا نشانہ بناتے ہیں وہ اپنے اندھے تعصب یا بنی امیہ کی بے جا حمایت میں ایسا کرتے ہیں۔ جیسے ابو بکر بن عربی نے اپنی کتاب العواصم من القواصم میں کیا ہے۔ اس میں وہ یزید کی مدح کرتا ہے اور اس کے خلاف امام حسینؑ کے اقدام کو ان کی وہ غلطی قرار دیتا ہے کہ جس کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے: جب خلافت ان کے بھائی کے ہاتھوں سے نکل گئی، حالانکہ ان کے پاس ایک عظیم

لشکر تھا اور بڑے بڑے آدمی ان کو چاہتے بھی تھے تو پھر وہ کوفہ کے اوباشوں کے ذریعے ان کے ہاتھ کیسے آ سکتی تھی۔ وہ مزید کہتا ہے: حسینؑ کے لیے بہتر یہ تھا کہ وہ اپنے نانا کی اس حدیث پر عمل کرتے، جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ: عنقریب کچھ مصیبتیں آئیں گی۔ اگر اس وقت کوئی شخص امت کی جمعیت میں تفرقہ ڈالے تو اس کو تلوار سے مار ڈالو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ اس لیے یہ بہتر تھا کہ حسینؑ، یزید کی بیعت کر لیتے اور اپنے گھر میں بیٹھے رہتے۔ پس انکو یزید یا اس کے گورنر ابن زیاد نے قتل نہیں کیا بلکہ ان کو کوفہ کے ان اوباشوں ہی نے قتل کیا جنہوں نے ان کو بلایا تھا۔

پھر ابن حزم اندلسی اور ابن تیمیہ وغیرہ نے بھی ابن عربی ہی کے قدم پر قدم رکھا ہے، کیونکہ یہ سب خارجیوں کے ظاہریہ، سلفیہ اور اباضیہ وغیرہ ایسے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، جو اپنے کٹڑپن اور غلو میں بہت ہی بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے ہم خیال لوگ یزید کو اس لیے قابل تعریف سمجھتے ہیں کہ اس نے امام حسینؑ کو قتل کیا ہے۔ وہ یوم عاشورہ کو عید مناتے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے اور خوب تقریبیں منعقد کرتے ہیں کیونکہ اس روز حسینؑ بن علیؑ کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ لوگ الجزائر وغیرہ کے اطراف میں آباد ہیں جہاں آج بھی یوم عاشور کو عید کے ایک بہت بڑے تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔

جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں ان کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر ان کا استدلال یہ ہے: حسینؑ نے یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے جماعت میں تفرقہ ڈالا اور مسلمانوں میں فتنہ کھڑا کیا، کیونکہ یزید نے یا کوفہ کے گورنر ابن زیاد نے شر و فساد کی ابتدا نہیں کی بلکہ اس کا آغاز حسینؑ ہی نے کیا تھا۔ پس انھوں نے ایسا کام کیا کہ جس سے ان کا خون بہانا جائز ہو گیا تاکہ امت کی وحدت محفوظ رہے اور اس کی عزت و وقار محفوظ رہے۔ یہ سب کچھ انکے نانا کے اس قول کی تعمیل میں کیا گیا کہ جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر کوئی اس امت کی جمعیت میں تفرقہ ڈالے تو اس کو تلوار سے مار ڈالو، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ اموی گھرانے کی حد سے زیادہ طرفداری کرنے والوں مثلاً ابن تیمیہ اور غزالی وغیرہ کی طرف سے اس بات کو شہرت دی گئی کہ: حسینؑ اپنے نانا محمد رسول اللہؐ کی تلوار سے قتل ہوئے۔ اسی طرح کے اور بھی اقوال ہیں جو ان لوگوں کے علیؑ اور آل علیؑ سے حسد اور کینے کو ظاہر کرتے ہیں۔

اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ جو لوگ رسول اکرمؐ کی طرف منسوب ایک قول کی بنا پر یزید کے افعال کو حق بجانب ٹھہراتے ہیں، وہ اس قول کو معاویہ بن ابی سفیان پر منطبق نہیں کرتے۔ جنہوں نے پوری امت کی مخالفت کی، اس کی وحدت میں تفرقہ ڈالا اور اسکی یک جہتی کو ختم کر دیا۔ حالانکہ وہ مسلمانوں کے سردار یعنی امام علیؑ پر متفق تھی اور آپ کی بیعت ان سب لوگوں نے کر لی تھی جنہوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی۔ اس طرح آپ کی خلافت کو مملکت اسلامی کے تمام علاقوں میں بابرکت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے اس وقت بھی امت اور جماعت کی مخالفت کی جب وہ حسنؑ بن علیؑ کے ساتھ جفا کاری کرنے لگے جو نواسۂ رسولؐ اور جوانانِ جنت کے سردار تھے۔ جبکہ اس وقت کے بقیہ مہاجرین و انصار اور مملکت اسلامی کے ان تمام علاقوں کے لوگوں نے ان کی بیعت کر لی تھی جو ان کے والد بزرگوار کی بیعت میں تھے۔ نیز معاویہ نے امام حسنؑ کے ساتھیوں اور ان کے لشکریوں کو زر و مال دیکر اور جھوٹے وعدے کر کے بہکا دیا۔ یہاں تک کہ آپ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ آپ چند شرائط پر وہ حکومت معاویہ کے سپرد کر دیں، جن میں سب سے اہم اور نمایاں شرط یہ تھی کہ وہ اپنے بعد حکومت کا معاملہ امام حسنؑ یا عام مسلمانوں پر چھوڑ جائیں گے تاکہ وہ اپنے دین اور دنیا کے لیے جس کو مناسب سمجھیں اختیار کر لیں لیکن انہوں نے ساری ہی شرطوں کو پامال کر دیا اور امام حسنؑ کو قتل کرانے کا اہتمام کیا۔ پھر اپنے بدکار اور گناہوں میں ڈوبے ہوئے بیٹے یزید کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا حالانکہ وہ اس سے نفرت کرتے تھے اور اپنی جانوں سے زیادہ شریعت محمدیہ کے بچاؤ کی خاطر اس سے ڈرتے تھے۔ اس کے باوجود برادران اہل سنت کی ایک عظیم اکثریت کے نزدیک انہی معاویہ کا شمار رسول اکرمؐ کے بلند مرتبہ انصاف پرور اور پاکباز صحابہ میں ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ مبیّنہ حدیث کہ جس کے مطابق وہ لوگ امام حسینؑ کے قتل کو جائز کہتے ہیں، وہی حدیث معاویہ کو بھی واجب القتل قرار دیتی ہے۔ علاوہ بریں صحابی عمار بن یاسر کے قتل کے بارے میں آنحضرتؐ کی وہ حدیث کہ جس کو وہ لوگ بھی مانتے ہیں، وہ معاویہ کو باغی قرار دیتی ہے اور از روئے قرآن باغی کا قتل کیا جانا واجب ہے۔

یعنی "اگر مومنوں کی دو جماعتیں ایک دوسرے سے قتال کریں تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے زیادتی کرے، تو جو زیادتی کرے اس سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف پلٹ آئے۔" (سورۂ حجرات آیت ۹)

کیا معاویہ نے اپنی بغاوت سے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ نہیں! بلکہ انہوں نے تو الٹا صلح کی شرائط کی خلاف ورزی کرکے مسلمانوں کے منبروں پر علیؑ کو برا کہنے کا حکم جاری کیا اور یہ اتنی مدت تک جاری رہا کہ بچے جوانی تک اور جوان بڑھاپے تک پہنچ گئے۔ نیز انہوں نے حجر بن عدی جیسے سیکڑوں پاکباز اور نیک افراد کو تہ تیغ کر ڈالا۔ پھر انہوں نے امام حسنؑ کو قتل کیا کہ جو رسول اکرمؐ کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے امام تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے سنت رسولؐ اور اجماع امت کے خلاف زیاد بن سمیہ کو ابوسفیان کا بیٹا قرار دے دیا۔ مسلمانوں کا مال اپنے ساتھیوں اور حمایتیوں میں لٹاتے رہے اور مرنے سے پہلے اپنے بدکردار اور قابل نفرت بیٹے کو مسلمانوں کی گردنوں پر سوار کر گئے۔

مختصر یہ کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کے مطابق یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون امت میں تفرقہ ڈالنے کے درپے تھا جبکہ وہ ایک ایسے شخص پر متفق ہو چکی تھی جو اللہ کے احکام پر قائم تھا۔ شریعت پر عمل کرنے والا تھا اور مسلمانوں کی بہبودی کا خواہاں اور ان کے حقوق کا پاسبان تھا۔ البتہ جب حاکم یزید کی طرح ظلم کرنے والا ہو۔ علانیہ برائیوں اور بدکاریوں کا ارتکاب کرتا ہو، شریعت اور اس کے اصولوں کے خلاف چلتا ہو تو اسلام اور قرآن کے احکام کے مطابق امت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس ظالم اور بدکار حاکم سے جنگ کرے، ورنہ اس کو بھی اس کی تمام بداعمالیوں اور بے راہ رویوں میں شریک تصور کیا جائے گا۔ پس یہی وہ صورت حال تھی کہ جس کے تحت امام حسینؑ کو یزید کے خلاف اٹھنا پڑا تھا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے مسلح جنگ ان کی مصلحت کے خلاف ہے۔ البتہ جیسا کہ ہم ایسے متعصب ناقدین اور غلط کیش افراد کے خیالات پر اس تبصرہ کے بعد ثابت کریں گے کہ اس کے نتائج اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر تھے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ امام حسینؑ کے اقدام پر تنقید اور تعریض کرنے والے لوگ

بنی امیہ کے طرفدار اور ان کے دوست ہیں، یا اس کو سیاسی اور جنگی نقطۂ نظر سے دیکھنے والے ہیں۔ مثلاً مستشرقین اور بعض عرب مؤلفین کہ جو ان حالات پر نظر نہیں ڈالتے، جو امام حسین ع کو گھیرے ہوئے تھے یا ان دینی عوامل اور ان کے نتائج کو نہیں دیکھتے کہ جو آپ کی شہادت کا باعث بنے تھے۔ حالانکہ تاریخ عالم کسی ایسی جنگ سے واقف نہیں ہے کہ جس میں امام حسین ع اور انکے ساتھیوں کی طرح "ایک فریق کی جانیں یکسر ختم ہوئی ہوں۔ مگر اس نے حکومت اور مذہب پر اپنے ایسے اثرات چھوڑے ہوں، جیسے کربلا کی اس جنگ نے چھوڑے، کیونکہ نہ کسی جنگ نے اس کے ظاہری فاتحوں کی خوابگاہوں کو اس طرح متاثر کیا۔ نہ فاتحوں نے کبھی ندامت سے اپنی انگلیاں کاٹیں۔ یہ باتیں صرف اور صرف معرکۂ کربلا کے خصوصیات میں شامل ہیں۔

پھر تاریخ نے اس کے جتنے کچھ بھی فوائد بتلائے ہوں، اس گروہ کے اہل قلم اس واقعہ کو اسی سطحی نظر سے دیکھتے اور امام حسین ع پر وقتی حالات کا غلط اندازہ لگانے اور ایک نامناسب موقف اختیار کرنے کا الزام دھرتے ہیں کہ جس سے آپ کو اپنی اولاد، اپنے بھائیوں اور اپنے اہل خاندان کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھنا پڑا۔ ان لوگوں کی رائے میں لامحالہ یہ سب کچھ ان کو پیش آنا ہی تھا۔

چنانچہ فلہوزن اپنی کتاب "الخوارج والشیعہ" میں کہتا ہے کہ: حسین ع بن علی ع نے ایک بچے کی مانند چاند کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بڑے بڑے دعوے کیے لیکن وہ ان میں سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا مقصد حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہ ہوئے۔ بلکہ انہوں نے یہ سب کچھ دوسروں پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ وہ پہلے ہی مرحلے میں بے بس ہو گئے۔ تب انھوں نے چاہا بھی کہ اس محاصرے سے نکل جائیں لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ پس وہ محض دیکھتے ہی رہے اور ان کے انصار ان کی خاطر مرتے رہے لیکن انھوں نے خود کو آخری لمحے تک بچائے رکھا۔ وہ مزید کہتا ہے: عثمان کا قتل تو یقیناً ایک ناگہانی المیہ تھا لیکن قتل حسین ع ان کی جلدبازی اور مایوسی کا نتیجہ تھا۔ البتہ ان کے شخصی عیوب اس لیے پوشیدہ رہے کہ ان کی رگوں میں رسول اکرم ص کا خون دوڑ رہا تھا اور وہ ان کے اہلبیت ع میں شامل تھے۔

مستشرق جولدتسہر اپنی کتاب "العقیدۃ والشریعۃ" میں لکھتا ہے: حسین ع حکومتِ یزید کے خلاف اقدام کرنے میں شیعوں کے غصے اور کم نظری کے باعث کھنچ لیے گئے۔ اسطرح

ان لوگوں نے ان کے گھرانے کو خاندان امیہ کے ساتھ اس طرح کے دائمی جھگڑوں میں الجھا دیا۔

تاہم سر ولیم میورؔ ہر معاملے کو رسوخ واقتدار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ وہ حکومت کے خلاف ہر عمل کو فتنہ تصور کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے: حسینؑ نے حکومت کے خلاف خفیہ سازش میں شریک ہو کر ایک ایسے جرم کا ارتکاب کیا جس سے معاشرے کا ڈھانچہ متزلزل ہو گیا اور اموی اقتدار کے فوری خاتمے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

لامنس نے بھی بالکل یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اس نے امام حسینؑ کے اقدام پر اسی لہجہ میں تنقید کی ہے جو عموماً اسلامی مباحث پر اس کے بیانات میں ہوتا ہے جو اسلام پر، اسلامی شخصیتوں پر اور اہل بیت نبیؐ کے کارناموں کو چھپانے اور ان پر جھوٹے الزام لگانے سے بھرے ہوتے ہیں۔

ان لوگوں نے امام حسینؑ کو اس نظر سے دیکھا ہے کہ گویا آپ اپنے مٹھی بھر اہل خاندان اور انصار کی مدد سے حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان اہل قلم کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ زیر نظر مسائل کا مطالعہ اس طریقے سے کرتے ہیں جو ان کے متصل حالات اور واضح حقائق سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ حالانکہ کوئی بھی محقق اس امر کی ایک سے زیادہ تاریخی شہادتیں ڈھونڈ سکتا ہے کہ امام حسینؑ اپنی تحریک کے دوران میں دشمن سے نبرد آزمائی کے لیے جنگی قوت فراہم کرنے کی کوئی کوشش نہیں فرما رہے تھے اور نہ آپ حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اس لیے کہ آپ کے اعلانات اور آپ کی تصریحات سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ خوب سمجھ رہے تھے کہ آپ اس تحریک میں قتل ہو جائیں گے۔ آپ یزید بن معاویہ کے خلاف اسی وقت اٹھے، جب آپ نے ان خطرات کو بھانپ لیا جو امت اسلامیہ کو گھیرے ہوئے تھے اور جن کا تدارک اس قربانی کے بغیر ممکن نہ تھا جس کا آپ نے عزم فرما لیا تھا اور جس کو آپ نے عملاً پیش فرمایا۔ نیز ایک صاحب نظر اس بات کے متعدد شواہد بھی تلاش کر سکتا ہے کہ آپ مکہ سے روانہ ہونے سے پہلے ہی ان نتائج کا احساس کر رہے تھے جو جلد ہی رونما ہونے والے تھے۔

اس بات کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ نے سفر عراق سے روکنے والوں کے ہر مشورے کو رد کر دیا۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر آپ کے چاہنے والے تھے جیسے عبداللہ بن عباسؓ

عبداللہ ابن جعفر، محمد ابن حنفیہ اور عبداللہ بن مطیع کہ جنہوں نے آپ کو دو مرتبہ یہ مشورہ دیا کہ عراق جانے کا خیال بھی نہ کریں۔ پہلی مرتبہ اس وقت جبکہ آپ مکہ کی طرف جارہے تھے اور دوسری مرتبہ اس وقت جب وہ آپ کو عراق کے راستے میں ملے۔ نیز ابوہرہ اسدی، عبداللہ بن سلیم، ابن المشعل اور فرزدق وغیرہ کہ جنہوں نے آپ کی خدمت میں اہل کوفہ کے رویے کی تصویر کشی کرکے آپ کو اس صورت حال سے مطلع کیا تھا، جس سے آپ دوچار ہوئے۔ چنانچہ اگر آپ خلافت ہی کے خواہشمند ہوتے تو کوفہ کی طرف سے آپ کو نظر ہٹا لینے کے لیے یہی کافی تھا۔

اسی طرح وہ خطبہ کہ جو آپ نے مکہ سے روانگی کے وقت دیا، یہ صراحت کرتا ہے کہ آپ اس معاملے کو بخوبی سمجھتے تھے جو بعد میں درپیش ہوا۔ آپ نے اس خطبے کو شروع ہی اس قول سے فرمایا: موت کا طوق بنی آدم کے گلے میں اس طرح پڑا ہے۔ جیسے کسی دوشیزہ کے گلے میں ہار ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: دیکھو! ہمارے ساتھ وہی چلے جو اللہ سے ملاقات کی تمنا میں اپنی جان پیش کرنے پر آمادہ ہو۔ میں تو انشاءاللہ کل صبح ہی روانہ ہونیوالا ہوں۔

جب آپ کے بھائی محمد بن حنفیہ نے دوسری بار خصوصاً یہ اصرار کیا کہ آپ کوفہ نہ جائیں تو آپ نے فرمایا: جب میں آپ سے جدا ہوا تو رسول اکرمؐ نے مجھ سے خواب میں فرمایا کہ اے حسینؑ! اب تم چل ہی پڑو، کیونکہ اللہ چاہتا ہے کہ وہ تم کو مقتول دیکھے۔ اس پر آپ کے بھائی ابن حنفیہ نے کہا: اگر آپ قتل ہونے ہی کے لیے جارہے ہیں تو پھر ان عورتوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا کیا مقصد ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی یہ مرضی بھی ہے کہ یہ قیدی بنائی جائیں۔ اسی طرح جب ابن عباس آپ کے سامنے گڑگڑائے کہ آپ کو عراق جانے کے ارادہ سے باز رکھیں، تو آپ نے فرمایا: مجھ کو رسول اکرمؐ نے خواب میں ایک امر کے پورا کرنے کا حکم دیا ہے اور میں اسی کو پورا کرنے کے لیے جارہا ہوں۔

ایک اور شخص کہ جو آپ کو راستے میں ملا اور اس نے کوفہ کے حالات بتا کر آپ کو وہاں جانے سے روکا تو آپ نے فرمایا: یہ بات مجھ پر بھی پوشیدہ نہیں ہے لیکن اللہ کے فیصلے پر کوئی بھی غالب نہیں آسکتا۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا: قسم بخدا! بنی امیہ جب تک میرا پیٹ چاک نہ کرلیں گے، ہرگز میرا پیچھا نہ چھوڑیں گے۔ اگر میں کسی جانور کے بل میں بھی جا گھسوں گا تو بھی یہ

لوگ مجھ کو نکال کر قتل کر ڈالیں گے۔ اس طرح وہ ہاشمی افراد جو آپ کے ساتھ نہ چلے، آپ نے ان کو لکھا کہ جو کوئی مجھ سے وابستہ رہے گا وہ شہادت کا مرتبہ پائے گا اور جو مجھ سے دور رہے گا وہ کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ آپ کے اور بھی ایسے اقوال اور بیانات ہیں جن سے ذرا بھی شک باقی نہیں رہتا کہ آپ پہلے ہی سے اس نتیجے کو اچھی طرح جانتے تھے، جو آخر میں رونما ہوا۔ نیز یہ کہ آپ حکومت حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے اور نہ اپنے مخالفین پر فتح پانے کے خواہاں تھے بلکہ آپ ایک ایسے امر کے لیے اٹھے تھے جو براہِ راست اسلام سے متعلق تھا اور ان عظیم خطرات کو اس سے دور کرنیوالا تھا جس سے اسلام معاویہ کے دور میں دوچار ہوا اور پھر یزید کی بدکاریوں کی صورت میں اس کو گھیرے ہوئے تھے۔ تاہم معاویہ کے مقاصد حصولِ حکومت سے بھی کچھ آگے تک وسیع تھے کیونکہ وہ اقتدار پر قابض ہو کر عوام کو گمراہ کرنا چاہتے تھے اور اسلام کے اصلی اعتقادات کو بدل دینا چاہتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ عوام کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ جب میرے اور علی ؑ کے درمیان خلافت کے بارے میں تنازعہ ہوا تو اللہ نے اس کا فیصلہ میرے حق میں کیا اور وہ مجھے مل گئی۔

اس کے بعد جب انہوں نے اہل حجاز سے اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو صاف صاف اعلان کر دیا کہ خلافت کے لیے یزید کو منتخب کرنا" میرا ایسا ناقابل تردید فیصلہ ہے کہ جس میں لوگوں کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسی طرح معاویہ ہر موقع پر مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کرتے تھے کہ خلیفہ کی طرف سے جاری کیا ہوا ہر حکم، خواہ اس میں اللہ کے احکام کی مخالفت ہی کیوں نہ ہوتی ہو، وہ تقدیر الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے اور اس کو تسلیم کرنا رعایا پر فرض ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کے دل و دماغ میں پستی اور بے بسی کا احساس اور حاکموں کے سامنے سرنگوں رہنے کا جذبہ پیدا کر دیں، خواہ وہ حاکم گناہ، ظلم اور سرکشی بھی کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ وہ عوام کے سامنے اپنی بداعمالیوں کے لیے جوابدہ نہ ہوں، کیونکہ جب ان کی وہ بداعمالیاں ناقابل تردید حکم کی حیثیت رکھتی ہوں تو نہ لوگوں کو ان میں کوئی دخل دینے کا اختیار رہے اور نہ ان کے بارے میں کوئی مواخذہ کرنے کا حق ہے کیونکہ وہ ان سے تقدیر الٰہی کے ماتحت سرزد ہوئی ہیں۔

ان کا بیٹا یزید ان سے زیادہ خواہش پرست تھا۔ وہ غالباً ان سے بھی زیادہ بری نیت اور بدعقیدگی کا حامل تھا۔ جیسا کہ عبداللہ بن حنظلہ نے بیان کیا ہے، جن کے والد غسیل الملائکہ (ملائکہ کے غسل دیے ہوئے) کہلاتے تھے، وہ کہتے ہیں: ہم یزید کے خلاف صرف اس وقت اٹھے جب ہم کو یہ ڈر ہوا کہ ہم پر آسمان سے پتھر پڑیں گے کیونکہ وہ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کرتا، شراب پیتا اور علانیہ نماز روزہ ترک کیے رہتا تھا۔ قسم بخدا! اگر ایک آدمی بھی میرا ساتھ نہ دے، تب بھی میں اس کے ساتھ شدید جنگ کروں گا۔

یہ تنقید کرنے والے امام حسینؑ کے اقدام کو اسی زاویہ نظر سے جانچتے ہیں جس میں کسی اقدام کے لیے خوب ساز و سامان اور مناسب حالات کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جس طرح وہ ان جنگی تحریکات کے بارے میں رائے قائم کرنے کے عادی ہیں جن میں تحریک چلانے والے فریق کو شکست ہوئی ہو اور مطلوبہ مقاصد حاصل نہ ہوئے ہوں، چنانچہ اس لحاظ سے ان لوگوں نے آپ کو بے سوچے سمجھے خطرے میں کود پڑنے والا قرار دے دیا اور کہا کہ آپ اس خاص معاملہ کے لیے ضروری انتظام کیے بغیر اس میں الجھ گئے، حالانکہ یہ لوگ غور سے دیکھتے اور گہرا مطالعہ کرتے تو وہ آپ کو اس سے مختلف پاتے اور ان کو معلوم ہو جاتا کہ آپ کے افعال کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ آپ اسلام کے دفاع کے ذمہ دار اور رسالتمآبؐ کے فرزند تھے۔ چنانچہ ہر طرف سے لوگوں کی نظریں آپ پر لگی ہوئی تھیں اور تاریخ کے اس اہم موڑ پر اسلام کے مستقبل کو آپ کے موقف سے وابستہ کیے ہوئے تھیں۔

اگر امام حسینؑ کے اس اقدام پر تنقید کرنے والوں کے خیال کے مطابق آپ یزید کی بیعت کر لیتے، جیسے ابن عمر اور دوسرے کمزور ارادے کے افراد نے کی تو یزید کے لیے یہ بہت آسان ہو جاتا کہ وہ اپنی خلافت کو شرعی رنگ دیدے اور اپنی تمام بدکاریوں اور اسلام سوز افعال پر اعتراض کرنے والوں کا منہ بند کر دے لیکن آپ نے اس کی بیعت سے انکار کر دیا اور اپنے اہل خاندان اور مٹھی بھر انصار کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے، پھر اس خاص طرز سے جام شہادت نوش فرمایا اور اس طرح اپنے مخالفوں پر حجت تمام فرمادی کہ ان کے لیے آپ کو اور آپ کی اولاد و انصار کو قتل کرنے اور آپ کی عورتوں کو قیدی بنانے کا کوئی جواز باقی نہ رہا۔ اس طرح آپ نے معاویہ اور ان کے بعد ان کے بیٹے کی تمام تدبیروں کو تہس نہس

کردیا۔ چنانچہ آپکی شہادت کے بعد مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی اور خاص طور پر اہل کوفہ میں شرم و ندامت کا احساس جاگ اٹھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے اپنی زبان، مال اور جان سے امام حسینؑ کا ساتھ نہیں دیا۔ پس جب ہم اپنے نبیؐ سے ملاقات کرینگے تو ہمارے پاس اس بے تکلفی کا کیا عذر ہوگا۔ چنانچہ توابین کی تحریک اٹھی، اسکے بعد مختار نے خروج کیا جس میں انہوں نے کربلا کے تمام شرکا کا قلع قمع کر ڈالا۔ اسیطرح اہل حجاز اٹھ کھڑے ہوئے جن میں رسول اللہؐ کے باقیماندہ صحابی بھی تھے۔ انہوں نے یزید کی اطاعت ترک کر دی اور امویوں کو انکے ظلم و ستم کے باعث ذلیل کیا جو انہوں نے حسینؑ اور انکے انصار اور عیال کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد بھی امویوں کے خلاف مسلسل تحریکیں اور شورشیں ہوتی رہیں۔ چنانچہ ان میں امام حسینؑ کا خون کاٹ کے لحاظ سے سارے ہتھیاروں سے زیادہ شدید ثابت ہوا۔ اسی کے سہارے عباسی اور فاطمی خاندان برسر اقتدار آئے۔ پھر حکومت کا ہر خواہشمند اسی کو اپنا ذریعہ بنانے لگا۔ حتٰی کہ علیؑ اور آل علیؑ کا ابن زبیر ایسا سخت دشمن بھی اپنی مصلحت کے لیے اسی کا سہارا لیتا رہا۔

میری رائے میں جس طرح امام حسینؑ کی شہادت نے اسلام کی بنیادوں کو مضبوط کیا، بنی امیہ کے منصوبوں کو برباد کیا اور مسلمانوں کو بیدار کیا، اسی طرح اہل شام میں سے علیؑ کے دشمنوں اور اہل عراق میں سے ان کا ساتھ چھوڑ دینے والوں کو ذلت و رسوائی سے ہمکنار کیا۔ کیونکہ علیؑ کی جنگ اور حسنؑ کی صلح، دشمنوں کی ریشہ دوانیوں، ساتھیوں کی غداری اور معاویہ کے اپنے معروف طریقوں سے عوام کو گمراہ کرنے کے باعث بے نتیجہ قرار پاسکتی تھی، لیکن جب امام حسینؑ شہید ہو گئے اور بنی امیہ نے آپ کے سر اقدس اور آپ کے خاندان کی عورتوں کو شہر بہ شہر پھرایا تو بیشتر مسلمانوں پر واضح ہو گیا کہ علویوں اور امویوں کے مابین یہ پیکار انہی جنگوں کا شاخسانہ ہے جو محمد رسول اللہؐ اور ابوسفیان بن حرب میں ہوا کرتی تھیں۔

المختصر امام حسینؑ کا اقدام انتہائی دانشمندی سے تیار کیا ہوا ایک مضبوط منصوبہ تھا۔ اگر آپ مشورہ دینے والوں کے کہنے سے خانہ نشین ہو جاتے اور سر تسلیم خم کر دیتے تو گویا یزید کی حکومت کو شرعی رنگ عطا کر دیتے اور اگر یمن یا کسی دوسرے مقام کی طرف جاکر اپنے انصار اور حامیوں کو جمع کرتے تو آپ پر فتنہ برپا کرنے اور تفرقہ پردازی کا اتہام

عائد کر دیا جاتا، جس سے آپ کے نظریے کی حقیقت زائل ہو جاتی۔ چنانچہ آپ اسی عزم پر قائم رہے کہ اپنے ساتھ اپنے اہل خاندان اور اپنی عورتوں کو لے کر جائیں گے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ بنی امیہ آپ کے ساتھ کیسا مجرمانہ سلوک کرتے ہیں، جس کو نہ دین حق بجانب قرار دے سکتا ہے نہ ضمیر نہ انسانیت ہی اس کو قابل قبول مانے گی۔ اس طرح صحرا میں بہائے گئے آپ کے خون کی بدولت آپ کا نظریہ زائل نہیں ہو سکے گا، خواہ دیکھنے والا آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے مابین ہونیوالے کسی اور معاملے پر نظر ڈالے یا نہ ڈالے۔

ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی اپنی کتاب "بطلۂ کربلا" میں رقمطراز ہیں: "حسینؑ کی بہن زینبؑ نے بنی امیہ اور ابن زیاد کے لیے فتح کا مزہ کرکرا کر دیا اور فتحمندوں کے پیالوں میں کڑواہٹ بھر دی۔ چنانچہ وہ تمام سیاسی واقعات جو اس کے بعد رونما ہوئے، جیسے امیر مختار اور ابن زبیر کی معرکہ آرائی، اموی حکومت کا زوال، عباسی حکومت کا قیام اور شیعہ جماعت کا استحکام۔ ان سب تحریکوں کو پیدا کرنے والی اور ابھارنے والی کربلا کی شیر دل خاتون جناب زینبؑ کی انقلابی تقریریں ہی تھیں۔

ڈاکٹر احمد محمود صبحی اپنی کتاب "شیعہ اثنا عشریہ کا نظریۂ امامت" میں لکھتے ہیں: حالانکہ آپ کو جنگی پیکار میں بظاہر شکست ہوئی اور سیاسی میدان میں بھی نقصان پہنچا تاہم تاریخ کسی ایسی شکست سے واقف نہیں ہے کہ جس سے شکست خوردہ جماعت کے لیے ایسا نتیجہ برآمد ہوا ہو جیسا کہ خون حسینؑ کا ـــــ کیونکہ آپ ہی کی شہادت کی بازگشت سے ابن زبیر کی شورش اور امیر مختار کی تحریک پیدا ہوئی اور پھر یہ ٹھنڈی نہیں پڑی، یہاں تک کہ معاملہ کچھ اور شورشوں تک پہنچا اور اموی حکومت کو زوال آ گیا۔ مزید یہ کہ "انتقام خون حسینؑ" ایک نعرہ بن گیا جس سے شاہی تخت الٹے گئے اور حکومتیں ختم کی گئیں۔ چنانچہ عباسیوں اور پھر فاطمیوں کی حکومتیں اسی کے سہارے پر قائم ہوئیں۔ نیز عرب، فارس اور روم میں بادشاہ اور فرمانروا انتقام خون حسینؑ ہی کے نعرے کو اپنا کر پروان چڑھتے رہے۔

ڈاکٹر صبحی مزید لکھتے ہیں: گو حسینؑ کو اپنی جان دینا پڑی، مگر وہ ان لوگوں کو دائمی رنج اور عبرت کے ایک ایسے عالم میں ڈال دینے میں کامیاب ہو گئے جنہوں نے آپ کے

والد بزرگوار کے ساتھ بے وفائی کی اور ان کے قتل کو کوئی اہمیت نہ دی۔ نیز آپ کے بھائی کے ساتھ غداری کی اور اس ذلت کی کوئی پروا نہ کی جس میں ان کو انہوں نے امویوں کے رحم وکرم پر چھوڑا تھا۔ اب خواہ کتنے ہی سال اور صدیاں بیت جائیں ان لوگوں کا یہ غم زائل نہ ہوگا اور کبھی تسکین حاصل نہ ہوگی۔

اسی طرح آپ امویوں کے خلاف غم وغصہ اور نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے جبکہ وہ امام حسنؑ سے صلح ہو جانے کے بعد اپنی حکومت کو شرعی رنگ دے رہے تھے۔ اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں: اس طرح حسینؑ مسلمانوں کے لیے ہر اس تحریک کے امام بن گئے جو ایسے بادشاہوں کو مٹانے کے لیے ابھرے، جو ناحق اپنی حکومت کو خلافت کا نام دیتے ہوں۔ اسی طرح عقیدے پر آپ کی شہادت کے اثر سے تشیع کے معنی حسینی ہو گئے کیونکہ ڈاکٹر صبحی کے بقول حسینؑ اپنے والد بزرگوار کے بعد شیعوں کے سب سے بڑے امام ہیں۔ اس لیے کہ عقیدے کے معاملے میں آپ کی شہادت نے وہ اثر چھوڑا ہے جو علیؑ کے بعد شیعوں کے اماموں میں سے کسی اور نے نہیں چھوڑا۔

امام حسینؑ کے اقدام کے نتائج اور دائمی اثرات کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

ایک جرمن مستشرق نے ان سب نکات کو معلوم کر لیا کیونکہ اس نے دوسرے مستشرقین کی طرح امام حسینؑ کے اقدام کو صرف جنگی زاویۂ نظر سے دیکھ کر سطحی فیصلہ نہیں کیا۔ چنانچہ مستشرق "ماربین" نے امام حسینؑ کے اقدام کو ایک ایسا منصوبہ قرار دیا کہ جس کو آپ نے معینہ مقاصد کے لیے تیار فرمایا تھا اور آپ کو اس کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ گویا یزید کے خلاف آپ کی پیش قدمی ایک عظیم دل کا پختہ ارادہ تھا۔ ان کے لیے اطاعت کرنا بھی مشکل تھی اور فوری فتح حاصل ہونا بھی مشکل تھی۔ پس انھوں نے اپنے اہل خاندان اور چند دوستوں کو ساتھ لیکر اقدام کیا جس میں ان کو موت کے بعد کامیابی حاصل ہونا تھی۔ اس سے حکومت الٰہیہ کا وہ نظریہ زندہ ہوا جو اس قربانی کے بغیر زندہ نہ ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر صبحی کہتے ہیں: ان تمام امور کے بعد امام حسینؑ کے اقدام کو ایک ایسے شخص کا فعل قرار نہیں دیا جا سکتا جو کسی غلط مقصد کے لیے اٹھا ہو اور جسے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والا کہا جا سکے، کیونکہ آپ نے اپنے دشمن کے سامنے تمام دلائل پیش کر دیے تھے اور

ان کے لیے کوئی ایسا بہانہ نہیں چھوڑا تھا جس سے وہ آپ کو قتل کرنے میں حق بجانب ٹھیریں۔ اس لیے کہ آپ نے ان کے سامنے اپنی شرائط پیش کر دی تھیں۔ اس کے باوجود کہ آپ اور آپ کے سب ساتھی، آپ کی عورتیں اور بچے پیاس کی شدت برداشت کر رہے تھے۔ آپ نے اس وقت تک ان سے جنگ نہیں کی جب تک انہوں نے آپ کے لیے حجت پیش کرنے کے تمام دروازے بند نہیں کر دیے۔ پھر بھی آپ نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے ان کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر فرمائی، جس کے دوران آپ نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کیوں آپ کے قتل کے درپے تھے۔ جبکہ نہ آپ کے ذمہ ان کا کوئی خون تھا، نہ آپ نے ان کا کوئی مال چھینا تھا۔ نہ ان کو آپ کے ــــ نبیؐ کی بیٹی کا بیٹا ہونے میں شک تھا۔ نیز آپ کے پاس ان لوگوں کے بھیجے ہوئے خطوط سے بھرے ہوئے دو بڑے تھیلے تھے جن میں آپ کو یہاں آنے کے لیے کہا گیا تھا۔ چنانچہ آپ نے وہ سب خط ان لوگوں کے سامنے پھیلا دیے۔

اس طرح امام حسینؑ کے یہ اقدامات ان کی اس سیاسی اور نظریاتی تحریک کے ان اسباب کو واضح کر دیتے ہیں جو آپ نے اس وقت بیان نہیں فرمائے تھے، جب مشورہ دینے والے آپ کو اس سے روک رہے تھے۔ علاوہ بریں یزید کے خلاف آپ کا اس وقت کا اقدام کسی تردد پر مبنی نہ تھا کیونکہ اس کی بیعت کرنا ایک عظیم گناہ تھا۔ یہ بیعت نہ تقیہ کے ماتحت برحق ہو سکتی تھی، نہ اس کے لیے کوئی اور عذر موجود تھا۔ چنانچہ آپ اپنے اس اقدام سے بنی امیہ کی حکومت کو تباہی کی راہ پہ ڈال دینے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح آپ نے تاریخ کو اس رخ سے ہٹا دیا جس پر اس کو بنی امیہ چلانا چاہتے تھے۔

استیعاب ابن عبدالبر میں حسن بصری سے روایت ہے کہ امام حسینؑ کے ساتھ آپ کے اہل خاندان کے ایسے ایسے افراد قتل ہو گئے جن کی مثال آج بھی صفحۂ ارض پر موجود نہیں ہے۔

شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید میں ہے کہ ایک شخص جو کربلا میں عمر بن سعد کے ساتھ موجود تھا۔ اس سے کہا گیا: "وائے ہو تم پر۔ کیا تم نے رسول اکرمؐ کی اولاد کو قتل کر ڈالا۔ اس پر اس نے کہا: اگر تم وہ منظر دیکھتے جو میں نے دیکھا تو تم بھی وہی کرتے جو میں نے کیا۔ جس گروہ نے ہمارا مقابلہ کیا ان کا یہ حال تھا کہ ان کے ہاتھوں میں تلواروں کے قبضے تھے اور وہ خونخوار شیروں کی مانند سواروں کو داہنے اور بائیں گراتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح

موت کے سامنے پیش کر رہے تھے جیسے ان کو نہ امان چاہیے نہ مال۔ گویا ان کے اور موت کے یا ملک پر قبضہ حاصل کرنے کے مابین کوئی رکاوٹ تھی ہی نہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہم ان کے سامنے ذرا بھی نرمی دکھاتے تو وہ پورے لشکر پر حاوی ہو جاتے، پھر ہم ایسا کیوں نہ کرتے؟

ان میں سے بعض مؤرخوں نے نیز اصفہانی نے مقاتل الطالبین حضرت علی اکبرؑ کے متعلق بیان کیا ہے کہ آپ عمر کے انیسویں یا دوسری روایت کے مطابق تیرھویں سال میں تھے۔ آپ کی والدہ معظمہ لیلیٰ بنت ابی مرۃ بن عروۃ بن مسعود ثقفی تھیں اور کثیر التعداد روایتیں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ کربلا میں امام حسینؑ کے ساتھ موجود تھیں اور انھوں نے اپنے بیٹے کی شہادت دیکھی۔

عبداللہ بن حسینؑ چھوٹے بچے تھے۔ امام حسینؑ نے ان کو اپنی بہن زینب سے لیا تاکہ اپنی حیات کے آخری لمحوں میں ان کو الوداع کہیں، اتنے میں ان کی گردن پر ایک تیر آ لگا، جبکہ وہ اپنے والد بزرگوار کی گود میں تھے۔ بیشتر روایات میں ہے کہ امام حسینؑ ان کو خود خیمے سے باہر لے گئے تاکہ دشمنوں سے ان کے لیے پانی طلب کریں کیونکہ وہ پیاس کے مارے جاں بلب تھے۔ اس وقت حرملہ بن کاہل نے ان کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا جو ان کی گردن پر لگا اور وہ اسی وقت قضا کر گئے۔ ان کی ماں رباب بنت امراءالقیس بن عدی تھیں۔

حمید بن مسلم جس نے کربلا کے بیشتر واقعات بیان کیے ہیں، اس سے روایت ہے کہ امام حسینؑ نے ایک چھوٹے بچے کو بلا کر اپنی گود میں بٹھا لیا لیکن عقبہ بن بشیر نے اس کو ایک تیر کا نشانہ بنایا اور مار ڈالا۔ پس حسینؑ نے اس کا خون اپنے ہاتھوں میں لیکر آسمان کی طرف پھینکا اور فرمایا: اے اللہ! یہ تیرے نزدیک ناقۂ صالحؑ سے کم نہیں ہے۔

ابن مہنا کی عمدۃ الطالب میں ہے کہ ابوالفضل العباس بن علیؑ جو سقّا کے لقب سے مشہور ہیں، امام حسینؑ اور ان کے اہل وعیال کے لیے دریائے فرات سے پانی لایا کرتے تھے۔ لیکن آخری دنوں میں جب دشمنوں نے امام حسینؑ پر محاصرہ میں شدت کر دی تب حسب معمول وہ آخری مرتبہ پانی لینے گئے تو شہید ہو گئے، واپس نہیں آئے۔ اور وہیں دریا کے قریب دفن ہوئے۔ ان کی مادر گرامی ام البنین تھیں، ان کے تین سگے بھائی ان سے پہلے امام حسینؑ پر قربان ہوئے۔ عباسؑ بڑے خوش شکل اور خوب صورت تھے۔ مورخ بیان کرتے ہیں کہ وہ بلند

اور توانا گھوڑے پر سوار ہوتے، تب بھی ان کے پیر زمین کو لگتے جاتے تھے۔ان کے القاب قمر بنی ہاشم اور سقّا تھے۔ باوجود اپنے صبر اور قوت قلب کے امام حسینؑ ان پر روئے اور فرمانے لگے: "اب میری کمر ٹوٹ گئی۔" شہادت کے وقت آپ کی عمر چونتیس سال تھی۔

عبداللہ بن علیؑ بن ابی طالب کی والدہ گرامی ام البنین تھیں۔حضرت عباس نے ان کو بلا کر کہا: چلو اور حسینؑ پر نثار ہو جاؤ تاکہ اللہ کے نزدیک تمہارا مرتبہ بلند ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے بڑھ کر بہادرانہ جنگ کی لیکن لوگوں نے ہجوم کر کے ان کو قتل کر ڈالا۔

جعفر بن علیؑ بھی حضرت عباسؑ کے سگے بھائی تھے۔یہ عنفوان شباب میں تھے۔کربلا کے واقعات لکھنے والوں کا بیان ہے کہ وہ بیس سال کے بھی نہ ہوئے تھے۔وہ بھی بڑی بہادری کے ساتھ دشمنوں سے لڑے۔ان پر بھی لوگوں نے ہجوم کر لیا اور وہ قتل ہو گئے۔اسی طرح ان کے بعد ان کے بھائی عثمان بن علیؑ آگے بڑھے اور وہ بھی قتل ہو گئے۔عباس اور یہ تینوں بھائی فاطمہ بنت حزام سے تھے۔انھی کی وجہ سے ان کی کنیت ام البنین ہو گئی تھی۔راویوں کا کہنا ہے کہ بیٹوں کے قتل کے بعد وہ بقیع کی طرف نکل جایا کرتیں۔تب ان کی حالت اور رونا دیکھ کر دشمن اور دوست سب ہی رونے لگتے تھے۔وہ بین کیا کرتی تھیں:

> وائے ہو تم پر! اب مجھے ام البنین مت کہا کرو۔اس طرح تم میرے بہادر شیروں کی یاد تازہ کر دیتے ہو۔ہاں کبھی تھے میرے بیٹے، جن کی بدولت میں ام البنین کہلاتی تھی، لیکن ہائے اب میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔

محمد الاصغر بن علیؑ بن ابی طالب، جیسا کہ طبری کی روایت ہے ان کی والدہ گرامی اسماء بنت عمیس تھیں۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ایک کنیز کی اولاد تھے۔ابوبکر بن علیؑ، ان کی ماں لیلیٰ بنت مسعود تھیں۔مدائنی کا بیان ہے کہ وہ بھی مقتولین میں پائے گئے لیکن ان کا قاتل معلوم نہیں ہو سکا۔ابوبکر بن حسنؑ کہ ابھی بلوغ کی عمر کو نہ پہنچے تھے۔ارباب مقاتل کا کہنا ہے کہ انکو عقبہ غنوی نے قتل کیا۔قاسم بن حسنؑ، یہ ابوبکر بن حسنؑ کے سگے بھائی تھے۔حمید بن مسلم کہتا ہے کہ ہمارے سامنے ایک لڑکا نمودار ہوا، جس کا چہرہ گویا چاند کا ٹکڑا تھا۔اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔وہ قمیص، پاجامہ اور جوتے پہنے ہوا تھا جن میں سے ایک کا تسمہ ٹوٹا ہوا تھا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ بایاں ہی تھا۔عمرو بن سعد بن نفیل ازدی نے کہا: قسم بخدا میں اس کی طرف بڑھتا

ہوں۔ وہ اس وقت میرے قریب تھا۔ میں نے اس سے کہا: اس لڑکے کے لیے تو وہی لوگ کافی ہوں گے، تم دیکھتے ہو کہ وہ اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ ابھی اپنا رخ بھی بدلنے نہ پایا تھا کہ اس کے سر پر تلوار کا وار ہوا، وہ منہ کے بل گر پڑا اور چلایا: اے چچا! قسم بخدا اس وقت حسینؑ آگ کی چنگاری کی طرح چمک کر نکلے اور شیر کی طرح عمرو پر تلوار سے حملہ کیا، لیکن عمرو نے اپنی کلائی سے اس کو روکا۔ پس انہوں نے اس کلائی کو کہنی سے الگ کر دیا۔ اب بنی سعد کے سواروں نے حملہ کر کے اس کو امام حسینؑ سے چھڑانا چاہا، لیکن اسطرح اپنے ہی سواروں نے اس کو کچل ڈالا اور وہ مر گیا۔ جب گرد ہٹی تو معلوم ہوا کہ حسینؑ اس لڑکے کے سر کی طرف بیٹھے ہیں اور وہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ حسینؑ کہتے جاتے ہیں: اے میرے بیٹے! اب جبکہ ان لوگوں نے تجھ کو قتل کر ڈالا۔ تیرے چچا پر یہ امر کتنا سخت ہے کہ تو پکارے اور وہ جواب نہ دے سکے اور اگر جواب دے بھی تو کچھ کر نہ سکے۔

انہی شہداء میں عبداللہ بن حسنؑ، عون بن عبداللہ بن جعفر، محمد بن عبداللہ بن جعفر کے علاوہ عقیل کے تین بیٹے یعنی عبداللہ، جعفر اور عبدالرحمٰن بھی ہیں۔ ابن کثیر کی بدایہ و نہایہ میں ہے کہ شہیدوں میں جعفر بن عقیل کے ایک صاحبزادے خالد بن جعفر بھی ہیں۔ اسی طرح امام حسینؑ کے ساتھ قتل ہونے والوں میں محمد بن ابی سعید بن عقیل، عبداللہ بن مسلم، محمد بن مسلم اور عبیداللہ بن جعفر بن ابی طالب بھی شامل ہیں۔ چنانچہ محمد بن فتح بدران اور فواد علی وفا نے اپنی اپنی کتابوں "غصن الرسولؐ" اور "حسینؑ بن علیؑ" میں لکھا ہے کہ علوی شہیدوں کی تعداد اکیس تک پہنچتی ہے۔

جیسا کہ واقعۂ کربلا کے متعلق روایات بیان کرتی ہیں، امام حسینؑ کی اولاد میں سے امام زین العابدینؑ زندہ رہ گئے کیونکہ وہ ان دنوں بیمار تھے۔ البتہ قیدیوں کے کوفہ پہنچنے اور ابن زیاد کے سامنے حاضر کیے جانے کے وقت ابن زیاد نے چاہا تھا کہ آپ کو بھی قتل کر دے لیکن آپ کی پھوپھی جناب زینبؑ آپ سے لپٹ گئیں اور آپ پر اپنے آپ کو گرا کر کہنے لگیں: "اگر تو ان کو قتل کرنا چاہتا ہے تو مجھ کو ان سے پہلے قتل کر دے۔ چنانچہ ان کی وجہ سے اس نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ اس وقت شادی شدہ تھے اور آپکے ایک بیٹے (امام) محمد باقرؑ آپکے ہمراہ تھے، جن کی عمر اس وقت دو سال یا اس سے کم و بیش تھی۔

الامامت والسیاست ابن قتیبہ میں امام محمد بن علی الباقرؑ سے روایت ہے کہ ہم بارہ لڑکے ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے تھے اور ہم صرف ایک ایک قمیص پہنے ہوئے تھے۔ جب ہم یزید بن معاویہ کے سامنے پہنچے تو وہ کہنے لگا: تم نے اپنے آپ کو اہل عراق کا غلام بنا لیا ہے۔ مجھ کو ابوعبداللہ کے خروج کا کوئی علم نہ تھا، جب تک کہ وہ ہم پر چڑھ نہیں آئے اور نہ ان کے قتل کا علم تھا، جب تک کہ وہ قتل نہ ہوگئے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس طرح وہ خود امام حسینؑ کے قتل سے بری ہوجائے، حالانکہ اُسی نے اس کا حکم دیا تھا اور اس کا سامان کیا تھا۔ وہ ایسی باتیں اس لیے کر رہا تھا کہ اب اس کو ہر طرف سے اپنے خلاف غم وغصے کا احساس ہو رہا تھا۔ نیز اس کو اور اس کے گھرانے کو ہر طرف سے خطروں نے گھیر لیا تھا۔ چنانچہ اس کو معلوم ہوگیا تھا کہ اگرچہ مسلمانوں نے اُس کے اور اس کے باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم وستم برداشت کر لیے تھے لیکن اب وہ حسینؑ کا قتل اور ان کی عورتوں کا قید کیا جانا برداشت نہ کریں گے۔

شہادت امام حسینؑ کی شیعہ تعبیر ڈاکٹر احمد صبحی وغیرہ کی نظر سے

امام حسینؑ کی شہادت پر شیعی نقطۂ نظر پر ڈاکٹر صبحی وغیرہ کی رائے پیش کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ امام حسینؑ کی شہادت کے متعلق شیعوں کا عقیدہ بیان کردوں۔ گو میں پچھلے صفحات میں اس بارے میں لکھ چکا ہوں تاکہ ان افترا پردازوں کے خیالات کی تردید ہوسکے جو ارادتاً یا بلاارادہ شیعہ عقیدوں کی شکل کو ایسی حدیثوں کی بنا پر بگاڑنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں جو بعض شیعہ کتب میں موجود ہیں، جبکہ خود شیعہ نہ ان حدیثوں پر عقیدہ رکھتے ہیں، نہ ان کو کسی شمار میں لاتے ہیں۔ ایسے موضوعات پر قلم اٹھانے والوں سے میری یہ تمنا رہتی ہے کہ وہ کامل مطالعہ اور تحقیق کرنے سے پہلے اپنے فیصلوں میں جلدی نہ کیا کریں تاکہ ان کے فیصلے ایسے ہلکے نہ ہوا کریں۔

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ حسینؑ اپنے والد بزرگوار اور اپنے برادر عالی قدر کے بعد تیسرے امام ہیں، کیونکہ آپ کی اور آپ کے بھائی کی امامت پر آپ کے جد بزرگوار رسول اکرمؐ نے اس حدیث شریف میں صراحت فرما دی ہے جو سنی اور شیعہ دونوں گروہوں کے محدثین میں مشہور رہے اور اس کو سنی محدثین نے صحیح قرار دیا ہے، یعنی اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ

اِمَامَانِ قَامَا اَوْ قَعَدَا پس حسنؑ اور حسینؑ دونوں امام ہیں۔ وہ کھڑے ہوں (جنگ کریں) یا بیٹھے ہوں (یعنی صلح کریں)۔ اس حدیث کے ماخذ کے بارے میں ہم زیرِ نظر کتاب کی ابتدائی فصلوں میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اسی طرح ہم آپ کے، آپ کے بھائی اور آپ کے والد بزرگوار کے متعلق آپ کے نانا رسول اکرمؐ کی وہ حدیثیں بھی بیان کر چکے ہیں جو معنی کے لحاظ سے متواتر ہیں۔

مسلمان آپ کی زندگی میں آپ کو مقدس مانتے رہے، آپ کی تعظیم کرتے رہے اور ان کو آپ کی شخصیت میں آپ کے جدِ بزرگوار کا خاکہ نظر آتا رہا۔ اس لیے نہیں کہ آپ رسول اکرمؐ کے محبوب فرزند تھے بلکہ اس لیے کہ آپ اپنے نانا کی سیرت اور اسلام کی تعلیمات کا مجسمہ تھے، نیز آپ ہر لحاظ سے آنحضرتؐ کی سیرت اور سنت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ چنانچہ ہم پچھلی فصلوں میں آپ کی سیرت کے بیان میں ان میں سے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

جب حکومت امویوں کے ہاتھوں میں آگئی تو وہ ناجائز افعال کے ارتکاب اور اسلام کے اصول اور تعلیمات کی خلاف ورزیوں میں بہت بڑھ گئے۔ جب وہ نیک اور پارسا افراد پر شدید قسم کے ظلم و ستم ڈھانے لگے تو مسلمان امام حسینؑ سے طالبِ پناہ ہوئے، کیونکہ آپ نواسۂ رسولؐ اور شریعت کے محافظ تھے۔ اس وقت آپ کے لیے ان سرکشوں کے خلاف اقدام کرنا ضروری ہو گیا، خواہ آپ کو اس کی کچھ بھی قیمت دینا پڑے۔ آپ نے یزید بن معاویہ کی حکومت سے ٹکر لینے کے لیے تمام امکانی صورتوں اور اسلام کے مفاد میں ان سے برآمد ہونیوالے نتائج پر نظر ڈالی تو آپ نے اس سے زیادہ مناسب اور مفید کوئی صورت نہ پائی کہ آپ خود اپنی اور اپنے مٹھی بھر اہل خاندان اور انصار کی جانوں کی قربانیاں پیش کریں اور اپنی عورتوں اور بچوں کو قیدیوں کی حیثیت سے شہر بہ شہر تشہیر کے لیے پیش کریں۔ چنانچہ آپ اپنے ساتھ اپنے بیٹوں، بھائیوں، چچا زاد بھائیوں اور اصحاب کو لے کر چل کھڑے ہوئے، کیونکہ آپ پر اپنی ذمے داریاں پوری طرح عیاں تھیں اور آپ کو اپنی راہِ عمل پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ نہ آپ اس اقدام سے باز رہنے کا مشورہ دینے والوں کے مشوروں کی پروا کرتے تھے، نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے تھے بلکہ آپ بہادرانہ شان سے زندہ رہے اور بہادرانہ روش ہی کے ساتھ مرے۔ اس طرح آپ ہر اس شخص کے لیے

ایک پاکیزہ نمونۂ عمل، بہترین نمونۂ حیات اور بہادری کی اعلیٰ مثال بن گئے جو نیزوں کے سائے میں حاصل ہونے والی موت کو خود سر ظالموں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر ترجیح دیتا ہے۔ آپ اس راہ پر گامزن رہے جو آپ کے لیے ایک فریضے کے طور پر معین تھی۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے میں ان ظالموں کیساتھ زندہ رہنے کو بدبختی اور موت سے ہمکنار ہونے کو سعادت سمجھتا ہوں۔

تاریخ کسی ایسی جنگ کے ذکر سے خالی ہے، جس میں ہارنے والے کے لیے ایسے مفید نتائج نمودار ہوئے ہوں، جیسے امویوں کے ساتھ آپ کی جنگ سے برآمد ہوئے۔ آپکی شہادت کے بعد جو بھی سیاسی تحریک ابھری، اس نے آپ ہی کے اصول، عزم اور کامیابی سے تقویت حاصل کی۔

کتنی بار فتح سے شکست کی خرابیاں پھوٹ پڑتی ہیں اور ظالموں کے مکانات کھنڈر بن کر رہ جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ زاویۂ نگاہ جس سے شیعہ امام حسینؑ کی شہادت کو دیکھتے ہیں۔ وہ ہر سال آپ کے ذکر کے لیے اجتماع منعقد کرتے ہیں اور اکثر اوقات وہ یہی خواہش کرتے ہیں کہ اس لَو کا شعلہ نہ بجھے نہ چھپے بلکہ مسلسل روشن رہے تاکہ آنے والی نسلیں ظلم و سرکشی کے خلاف ہر زمانے اور ہر مقام پر اٹھنے والی تحریکوں میں اس سے ہمت و جرأت حاصل کرتی رہیں۔

ائمۂ اہلبیتؑ اس ذکر کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے خواہشمند رہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو باقی رکھنے اور پھیلانے کا حکم فرمایا کیونکہ یہ اسلام کے عظیم مقاصد اور اعلیٰ مطمح نظر سے علیحدہ نہیں ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے عاشورۂ محرم کے روز اپنے اصحاب کی ایک جماعت سے فرمایا: کیا تم لوگ اس بات کو یاد کرتے ہو کہ میرے دادا حسینؑ پر کیا گزری؟ قسم بخدا ان کو اس طرح ذبح کیا گیا جیسے مینڈھے کو ذبح کیا جاتا ہے۔ پھر ان کے ساتھ ان کے سترہ ایسے بیٹے، بھائی اور رشتے دار بھی مارے گئے جن کا مثل صفحۂ ارض پر نہ تھا۔

باقہم شیعہ جانتے ہیں کہ اس سے امامؑ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ لوگوں کے جذبات اور احساسِ غم کو ابھار کر ان کو رونے پر آمادہ کریں، بلکہ آپ چاہتے تھے کہ ان دلدوز واقعات کو بار بار یاد دلا کر ان کے ذہنوں میں حق کی عظمت نقش کر دیں، جس کے لیے اور جس کی راہ میں حسینؑ ہر چیز کو ہیچ قرار دیتے ہوئے شہید ہو گئے اور اپنی ہر شے یعنی مال، اولاد اور خود

اپنی جان تک اس پر قربان کر دی۔

امام حسینؑ، ان کے اہل خاندان اور اولاد پر جو کچھ گزرا تھا اس کو امام رضاؑ نے اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے سامنے بیان کرتے ہوئے اور ان کے ذہنوں میں کربلا کے واقعات کی یاد تازہ کرتے ہوئے فرمایا: جب کبھی تم ان کا ذکر کیا کرو تو کہا کرو: یَا لَیْتَنَا کُنَّا مَعَکُمْ فَنَفُوزَ فَوْزًا عَظِیمًا ۔ یعنی "کاش! ہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے اور عظیم کامیابی پر فائز ہوتے۔" آپ چاہتے تھے کہ آپ کے اصحاب، آپ کے شیعہ اور عام مسلمان اپنی روحوں اور اپنے عزائم کے لحاظ سے امام حسینؑ، نیز ان افراد کے ساتھ رہیں جو ہر زمانے میں اور ہر مقام پر انسان کی بھلائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں، کیونکہ امام حسینؑ ظلم کے خلاف اقدام کر کے اسلام کے ان پہلوؤں کا مظہر بن گئے ہیں۔

امام رضاؑ اپنے اصحاب اور شیعوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں: ہر زمانہ میں یزید جیسے ظالم اور بنی امیہ ایسے جابر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ پس تم لوگ اسی طرح ظالموں اور جابروں کے خلاف رہو جس طرح حسینؑ اپنے زمانے میں یزید اور اس کے ساتھیوں کے مخالف رہے ائمہ کرامؑ کے موقف کی ایسی بہت ساری مثالیں ہیں۔ وہ یہ کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کے ذہنوں کو ظالموں کے خلاف نفرت سے بھر دیں اور حق انسان کی عزت اور آزادی کی راہ میں ہر دوسری چیز کو بے وقعت قرار دیدیں۔ آج کل کے شیعہ عوام امام حسینؑ کے اقدام کے اغراض کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور انہوں نے ان مجالس میں جو امام حسینؑ کے لیے ہر سال جگہ جگہ منعقد کی جاتی ہیں اس کے صحیح مقاصد سے ہٹ کر کچھ غیر مفید چیزیں داخل کر لی ہیں لیکن حسینؑ، ان کی شہادت اور اس کے اثرات کے بارے میں شیعوں کی رائے اور عقیدے سے ان چیزوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ڈاکٹر احمد محمود صبحی نے اپنی کتاب "شیعہ اثنا عشریہ کا نظریہ امامت" میں شیعوں اور ان کے اماموں کے بارے میں لکھا ہے اور کتاب کے بعض حصوں میں ایک ایسے مطالعہ کرنے والے کی طرح نظر ڈالی ہے جو حقیقت کی تلاش میں ہو۔ انہوں نے واقعات کو مجرد کر کے مناسب اہمیت دی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ہم ان کو اور ہر ایسے لکھنے والے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، خواہ وہ کسی رنگ یا نسل کا فرد ہو لیکن کتاب کے بعض دوسرے

حصوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں انہوں نے اس نظر اور اس جذبے سے کام نہیں لیا جس سے انہوں نے دوسری فصلیں لکھی ہیں۔ ہم قاری کے لیے اس طرح کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ کتاب مذکور کے صفحہ ۴۴۳ پر "شہادت حسین ع کی شیعی تفسیر" کے تحت لکھا ہے:

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ رسول اکرم ص نے اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات پر رنج و غم کا اظہار فرمایا اور آپ کی قبر پر روتے ہوئے فرمایا: اے ابراہیم تم پر آنکھ آنسو بہا رہی ہے، دل شکستہ ہو رہا ہے اور میں رنج میں ڈوبا ہوا ہوں۔ تب اللہ نے آنحضرت ص کو ان کی وفات کے سبب سے آگاہ کیا۔ چنانچہ جبرئیل ع نے حاضر ہو کر کہا: اللہ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے: آپ چاہیں تو ابراہیم کی زندگی لے لیجیے، اللہ ان کو دوبارہ زندگی عطا کر کے آپ کے بعد نبوت پر سرفراز کر دے گا۔ اس کے بعد آپ کی امت ان کو قتل کر دیگی اور اللہ امت کو جہنم میں ڈال دیگا، یا ان کی موت قائم رہے اور آپ کے لیے حسین ع زندہ رہیں۔ اللہ ان کو امام قرار دیدے گا۔ پھر آپ کی نصف امت ان کو قتل کر دے گی، جن میں ان کے قاتل ہوں گے قاتلوں کے مددگار ہوں گے، ان کا ساتھ چھوڑ دینے والے ہوں گے اور وہ لوگ ہونگے جو ان کے قتل پر راضی رہیں گے۔ اللہ ان سب کو جہنم میں ڈال دے گا۔ پس آنحضرت ص نے اپنی امت کے لیے دونوں نقصان دہ صورتوں میں سے کم نقصان کی صورت کو پسند فرمایا اور امام حسین ع کے قتل کیے جانے پر راضی ہو گئے۔ اس پر انہوں نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ: حسین ع کی شہادت کے بارے میں شیعوں کا عقیدہ اس عقیدے سے بہت ملتا ہے جو مسیح کے بارے میں عیسائیوں کا ہے۔ یعنی یہ کہ حسین ع نے اس لیے اپنی جان کی قربانی پیش کی کہ گنہگار شیعوں کی بخشش کا باعث بن جائیں۔ جیسا کہ عیسائی مسیح ع کے بارے میں کہتے ہیں۔ یہ عبارت انھوں نے مستشرق رونالڈ کی کتاب عقیدۃ الشیعہ سے نقل کی ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں: شیعہ اس مشابہت کو چھپاتے نہیں ہیں جس سے شیعیت اور مسیحیت

میں یہ نظریۂ نجات ابھرا ہے، کیونکہ وہ مسیحؑ اور حسینؑ میں تشابہ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: کبھی کوئی بچہ چھ ماہ کے حمل سے پیدا نہیں ہوا سوائے عیسٰیؑ ابن مریمؑ اور حسینؑ کے۔

ڈاکٹر صبحی آگے چل کر کہتے ہیں: بعض ہندوستانی شیعہ معاصر بیان کرتے ہیں کہ وجود کا اصلی باعث حسینؑ ہی ہیں۔ وہ علت و معلول کے مابین جوہری رابطہ اور اللہ اور انسان کے درمیان ایک سنہری کڑی ہیں۔ وہ اپنے اس قول کو ان جملوں پر ختم کرتے ہیں: ایک ہندوستانی شیعہ مصنف نے حسینؑ کو الٰہی صفات سے متصف کیا ہے، جس کی نظیر ہم کو مسیح کے متعلق عیسائیوں کے عقیدے میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر اور بھی باتیں ہیں جو ان کی کتاب میں ملتی ہیں کہ شہادت حسینؑ کے بارے میں شیعہ عقائد میں ان باتوں کی نہ کوئی جڑ ہے نہ بنیاد۔ اسی طرح ابراہیم کی حیات و موت کے متعلق رسول اکرمؐ اور جبرئیلؑ کے درمیان انہوں نے جو گفتگو نقل کی ہے، صحیح شیعہ روایتوں میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے اور کوئی شیعہ اس کو نہیں مانتا۔ شیعوں، ان کے علماء اور ائمہ کرامؑ کے نزدیک شہادت حسینؑ کی صحیح تفسیر وہی ہے جو ہم نے بارہا آپ کی سیرت کے ذیل میں بیان کی ہے، جو کردار کے اعلٰی نمونوں، قربانیوں، آداب و اخلاق اور ہر اس صفت سے بھری ہوئی ہے جو دنیا و آخرت میں انسان کو رفعت بخشتی ہے۔

شیعہ اور محرم کا پہلا عشرہ

ماہ محرم کی دسویں کو امام حسینؑ کے شہید ہو جانے کے وقت سے اس ماہ کے ابتدائی ایام میں سالانہ ماتم اور رنج و غم منایا جاتا ہے۔ شیعوں کے امام بھی اس بات کے خواہشمند رہے ہیں کہ یہ المیہ اپنے بلند مقاصد کے ساتھ ایک مثال کے طور پر لوگوں کے ذہنوں میں موجود رہے۔ شیعہ روایات بتاتی ہیں کہ امام زین العابدینؑ المیۂ کربلا کو بار بار دہراتے تھے اور اُمویوں نے آپ کے والد بزرگوار کے ساتھ جو ظلم و جور کیا تھا، اس کو یاد کر کے گریہ فرمایا کرتے تھے۔ حتٰی اینکہ "بکّاء" (بہت رونے والا) آپ کا ایک لقب قرار پا گیا۔ یہی حال دوسرے اماموں کا تھا۔ چنانچہ شیعوں نے ماہ محرم کے ان دنوں کو امام حسینؑ پر رونے اور نوحہ کرنے کے دن قرار دے لیا، جن میں وہ خاص مقامات پر جمع ہو کر آپ کی اور آپ کے اہل خاندان کی

مرگ و شہادت اور قید و بند کے مصائب بیان کر کے ان پر جی بھر کے روتے رلاتے ہیں نیز ان میں سے بہت سے افراد ہر سال آپ کی قبر مطہر کی زیارت کے لیے بھی جاتے ہیں۔ چنانچہ اقتدار میں آنے والی حکومتوں نے بھی اس معاملے میں کسی کو نہیں روکا۔ البتہ جب متوکل عباسی خلیفہ بنا، جو علویوں سے اپنی شدید دشمنی میں مشہور تھا تو اس نے امام حسینؑ کی قبر مسمار کرا دی اور لوگوں کو اس کی زیارت کرنے سے روک دیا۔ اس نے آپ کا ماتم کرنے اور آپ کی زیارت کے لیے جانے پر جائیداد کی ضبطی اور موت کی سزا مقرر کر دی۔

تاریخ ابن کثیر میں ۲۳۶ھ کے حالات میں آیا ہے کہ متوکل عباسی، امام علیؑ اور آپ کے اہل خاندان سے سخت بغض رکھتا تھا، یہاں تک کہ جس کسی کے متعلق اس کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ علیؑ اور حسینؑ سے محبت رکھتا ہے، وہ اس کے مال کی ضبطی اور اس کے قتل کا ارادہ کر لیتا تھا۔ مزید یہ کہ اس نے اپنے مصر کے گورنر کو حکم بھیجا کہ آل ابوطالب کو مصر سے نکال کر عراق بھیج دے، کیونکہ یہ لوگ مصر میں علیؑ سے محبت کا اظہار کیا کرتے تھے اور حسینؑ پر کربلا میں جو کچھ گزرا تھا اس کو بیان کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مصر کے گورنر اسحٰق بن یحییٰ نے رجب ۲۳۶ھ میں ان لوگوں کو وہاں سے نکال دیا اور جو کوئی اہل بیتؑ کا ہم خیال تھا وہ روپوش ہو گیا۔

اس کے عہد میں خود اس کے اور اس کے صوبائی اور ضلعی حاکموں کے تعصب کی بدولت شیعوں اور علویوں پر سخت ظلم و ستم ہوتا رہا۔ جس میں وہ لوگ ہر طرف سے گھرے ہوئے تھے۔

جیسا کہ ابن اثیر وغیرہ نے کہا ہے، متوکل کی موت اور اس کے بیٹے مستنصر کے خلیفہ بن جانے پر وہ سختیاں کچھ کم ہو گئیں جن کے باعث یہ لوگ تباہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ ۲۴۸ھ کے حالات میں لکھتا ہے کہ مستنصر نے مزارات علیؑ و حسینؑ کی زیارت کی اجازت دیدی، علویوں کو امان دی، ان کی جائیدادیں واگذار کر دیں اور فدک ان کو واپس دیدیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ کیا کہ مدینہ سے صالح بن علی کو معزول کیا، جو ان لوگوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھاتا رہا تھا۔ پھر اس کی جگہ پہ علی بن حسن بن اسمٰعیل بن عباس بن محمد کو مقرر کیا۔ جب وہ مدینہ جانے کے لیے رخصت ہونے کو آیا تو اس نے اس سے کہا: اے علی! میں تم کو اپنے گوشت، پوست، خون اور دست و بازو کی طرف بھیج رہا ہوں۔ پس خیال رکھنا کہ تم ان سے کیا سلوک کرتے ہو اور ان کے ساتھ میری طرف سے کس طرح پیش آتے ہو۔

شیعوں نے اپنا یہ مستقل وطیرہ بنا لیا کہ ان کو جب بھی موقع ملتا وہ شیعیت کے تمام مظاہر کے ساتھ غم حسینؑ کیلئے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ خواہ وہ کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں ان کا غلبہ ہو، جیسے عراق اور فاطمین کے زیر حکومت افریقہ یا وہ علاقہ ہو جہاں وہ دوسروں کے مقابلے میں اقلیت میں ہوں۔ مصر میں کافور اخشیدی کے دور میں بھی ان کا یہی طریقہ تھا جو بعض مؤرخین کے نزدیک شیعوں سے سخت تعصب رکھتا تھا۔ تاہم اس کے عہد میں بھی یہ لوگ دوسروں کے مقابلے میں کم تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے طریقوں پر جمے رہے۔ چنانچہ وہ ان کے افعال سے چشم پوشی کرنے پر مجبور تھا جو وہ اہل بیتؑ کے مصائب پر رنج و غم کے اظہار کے لیے کرتے تھے۔

مصر میں سختیاں صرف اسی وقت ختم ہوئیں جب وہاں فاطمیوں کا تسلط ہوا اور المعزّ لدین اللہ وہاں کا فرمانروا ہوا۔ اب تو دوسروں نے بھی اس کے لیے مناسب فضا پیدا کر دی اور یہ ذکر زندہ رکھنے میں شریک ہو کر فراخدلی سے اس میں مال و دولت خرچ کرنے لگے۔ چنانچہ اس کے عہد میں شیعوں کو بڑا عروج حاصل ہو گیا۔

مقریزی اپنی کتاب خطط میں کہتا ہے: فاطمین یوم عاشورہ پر اونٹ اور گائیں ذبح کرتے اور خوب نوحہ و بکاء کرتے تھے۔ ان کا یہ دستور ان کی سلطنت کے ختم ہونے تک قائم رہا۔ اس پر انھوں نے المعز لدین اللہ کی سیرت کے ذیل میں ابن زولاق کی اس روایت کا اضافہ کیا ہے کہ ۳۶۳ھ کے یوم عاشورہ پر کچھ شیعہ جن کے ہمراہ اپنے لوگوں کے علاوہ افریقی سوار بھی تھے، وہ ام کلثوم اور نفیسہ کی قبروں پر گئے تاکہ سب مل کر حسینؑ پر گریہ کریں۔ تب ان لوگوں نے شدت جذبات میں وہاں پانی پلانے والوں کے برتن توڑ ڈالے۔

۳۹۶ھ میں حسب معمول یہ حکم جاری ہوا کہ بازار بند کر دیے جائیں اور ذاکرین جامع قاہرہ میں جا کر وہاں نوحہ و بکاء کرنے کے لیے جمع ہوں۔ اس کے بعد مقریزی فاطمین کی وہ کیفیت بیان کرتا ہے جو ۱۰ محرم کو حکومت اور قوم کی طرف سے رنج و غم کے مظاہروں میں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ لکھتا ہے: جب محرم کی دسویں تاریخ ہوتی تو خلیفہ عوام سے روکش ہو جاتا۔ جب دن چڑھ آتا تو قاضی القضاۃ اور دوسرے ارکان حکومت غم انگیز ہیئت میں سوار ہو کر نکلتے، امام حسینؑ کے روضہ پر جا کر بیٹھ جاتے اور اہل بیتؑ کے غم میں مرثیہ پڑھتے۔ یہ عمل

تین گھنٹے تک جاری رہتا۔ پھر خلیفہ ان کو اپنے قصر میں بلا لیتا۔ جب قاضی القضاۃ، خطیب اور ساتھ والے لوگ باب الذہب پر پہنچتے تو وہاں ان کو دہلیزوں کے آگے چٹائیاں بچھی ہوئی ملتیں۔ چنانچہ قاضی، ان کے پہلو میں خطیب اور دیگر ہر طبقے کے افراد ان چٹائیوں پر بیٹھ جاتے۔ پہلے قرآن پڑھا جاتا پھر ذاکرین مصائب پڑھتے۔ اس کے بعد سب لوگ دسترخوان کی طرف بڑھتے، جس پر پنیر، دودھ، شہد وغیرہ چنے ہوتے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر نوحہ خواں وہاں سے چلے جاتے اور نوحہ خوانی کرتے ہوئے قاہرہ میں چکر لگاتے۔ اس روز دکاندار اپنی دکانوں کو بالکل بند رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مقریزی نے ان تمام مظاہر کا ذکر کیا ہے۔ جس پر فاطمی حکومت اپنے قیام کے زمانے میں عمل پیرا رہی۔

جب ایوبیوں کا دور آیا تو انھوں نے ان تمام طریقوں کو پلٹ کر رکھ دیا۔ اب دسویں محرم کو خوشی اور مسرت کا دن قرار دیا گیا۔ جس میں لوگ رنگارنگ کپڑوں، اچھے اچھے کھانوں، لذیذ مٹھائیوں اور نئے نئے برتنوں کا استعمال کرکے خوشی مناتے تھے تاکہ شیعوں کی مخالفت اور توہین کریں، جیسا کہ مقریزی نے خطط میں لکھا ہے۔

بنی بویہ کے عہد میں شیعہ عوام اور حکام عراق میں اسی طرح عمل کرنے لگے جیسے مصر میں فاطمیین کے دور میں تھا۔ چنانچہ تاریخ ابو الفداء میں ۳۵۲ھ کے حالات میں آیا ہے کہ محرم کے دسویں روز معز الدولہ بازار بند کروا دیتا اور پھر یہ حکم دیتا تھا کہ حسینؑ کے غم میں مرد نوحے پڑھتے ہوئے اور عورتیں بال بکھرائے، لباس چاک کیے اور منہ پر تھپڑ مارتی ہوئی نکلیں۔

بدایہ و نہایہ میں ابن کثیر نے بھی حکومت بنی بویہ کے حالات میں یہ ذکر کرتے ہوئے اس کی تائید ہے کہ وہ بغداد میں ہر سال دسویں محرم اور اس سے پہلے کے دنوں میں یہ عمل کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ راویوں نے رنج و غم کے اور بھی مظاہر بیان کیے ہیں جو شیعہ حاکم اور عوام اختیار کیا کرتے تھے۔ ادھر سنی فرمانروا اور عوام اس کے مقابلے میں شیعوں اور ان کے طریقوں کی مخالفت میں خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ ہم اللہ سبحانہ سے توفیق چاہتے ہیں کہ وہ ہم کو قول میں پختگی اور عمل میں خلوص عطا کرے۔ نیز یہ توفیق بھی چاہتے ہیں کہ ہم حسینؑ کے اس مثالی اقدام سے مظلوم اور ستائے ہوئے لوگوں کی مدد کرنے کی راہ میں "قربانی دینے کا طریقہ سیکھ لیں۔

امام زین العابدین ع

آپ محدثین میں ابن خیرتین (دو بہترین شخصیتوں کے فرزند) مشہور ہیں، کیونکہ آپ کے والد بزرگوار امام حسین ع بن علی ع ابن ابی طالب ہیں اور آپ کی والدہ ماجدہ ایران کے بادشاہ یزدجرد کی صاحبزادی ہیں۔ ربیع الابرار زمخشری میں ہے کہ اللہ کے بندوں میں دو منتخب گروہ ہیں۔ عرب میں بنی ہاشم اور غیر عرب میں سے ایرانی۔ آپ کے متعلق ابوالاسود دوئلی کہتا ہے:

کسریٰ اور ہاشم کے خاندانوں کے اشتراک سے پیدا ہونے والا بچہ تمام ہستیوں میں سب سے زیادہ صاحب شرف ہے۔

راویوں کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کی والدہ ایران کے باشرف افراد میں سے تھیں۔ البتہ ان کے نام، امام حسین ع سے تزویج اور ایران پر مسلمانوں کے تسلط کے وقت کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بحارالانوار میں جعفر بن بابویہ سے روایت ہے کہ ان کا نام شہر بانو بنت یزدجرد بن شہریار ہے، لیکن الکامل ابن اثیر میں ان کا نام سلافہ وخولہ وبرۃ بتایا گیا ہے۔

کافی میں امام محمد باقر ع سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جب یزدجرد کی بیٹی عمر بن خطاب کے سامنے آئیں تو اپنا چہرہ ڈھانپ کر فارسی زبان میں بولیں، جس کا مفہوم یہ

تھا کہ: ہرمز کے دن کیسے تاریک ہو گئے۔ دنیا اس کے لیے کیسی بری ہو گئی اور زمانہ کیسا اس کے خلاف ہو گیا کہ اس کی اولاد ایک ایسے معمولی شخص کے حکم سے قیدی بنا لی گئی ہے۔ جب وہ بول رہی تھیں تو عمر یہ سمجھے کہ وہ اس کو برا کہہ رہی ہیں۔ اس پر امیرالمومنین علیؑ نے ان کا اصل مطلب واضح فرما دیا۔

شیخ مفید کی روایت میں کہا گیا ہے کہ عمر بن خطاب نے ان کو بیچ ڈالنا چاہا لیکن امیرالمومنین علیؑ نے ان سے کہا کہ بادشاہوں کی بیٹیاں کبھی بیچی نہیں جاتیں، خواہ وہ کافر ہوں۔ بلکہ ان کو پیشکش کریں کہ یہ کسی شخص کو اپنے لیے پسند کر لیں۔ پس جس کو یہ پسند کریں اسی سے ان کی تزویج کر دیں۔ پھر اس عطاء کو اس شخص کو دی جانے والی روزینہ کی رقم میں محسوب کریں۔ چنانچہ ان کو یہ اختیار دیا گیا تو انھوں نے اپنے لیے امام حسینؑ کا انتخاب کیا اور ان کی تزویج انہی سے ہو گئی۔ امیرالمومنین علیؑ نے امام حسینؑ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو ہر طرح کے تحفظ کا یقین دلائیں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ نیز راوی کے بقول اُن سے یہ بھی فرمایا: اے حسینؑ! اس سے تمہارے یہاں دنیا بھر میں بہترین بیٹا پیدا ہو گا۔ چنانچہ ان سے امام علی زین العابدینؑ پیدا ہوئے۔ امام حسینؑ ان سے فرمایا کرتے تھے: تم دو بہترین شخصیتوں کے بیٹے ہو۔ عربوں میں پسندیدہ قریش اور قریش میں بنی ہاشم ہیں اور غیر عرب میں اہل فارس!

اس روایت کی تائید احمد بن علی بن مہنا نے اپنی کتاب "عمدۃ الطالب فی مناقب آل ابی طالبؑ" میں کی ہے اور اس پر یہ اضافہ کیا ہے: یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ علی بن ابی طالبؑ کی خلافت کے زمانے میں قید ہو کر آئیں۔ جبکہ حارث بن جابر حنفی نے یزدجرد کی دو بیٹیاں آپ کے پاس بھیجیں۔ پس آپ نے ان دونوں میں سے ایک اپنے بیٹے حسینؑ کو عطا کر دی اور ان سے امام علیؑ بن الحسینؑ پیدا ہوئے۔ دوسری محمد بن ابوبکر کو عنایت کی اور ان سے قاسم بن محمد پیدا ہوئے جو تابعین کے زمانہ میں مشہور فقیہہ گزرے ہیں۔ اس روایت کی تائید ابن کلبی نے بھی کی ہے جس سے علی جلال الدین حسینی نے اس کو اپنی کتاب "حسینؑ بن علیؑ" میں نقل کیا ہے۔ اول الذکر روایت کی تائید شبلنجی نے نورالابصار میں اور زمخشری نے ربیع الابرار میں کی ہے۔ نیز دونوں نے اس پر یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ جب عمر بن خطاب کے پاس فارس

کے قیدی لائے گئے تو ان میں یزدجرد کی تین بیٹیاں تھیں۔ انھوں نے ان قیدیوں کو فروخت کر دیا لیکن جب وہ یزدجرد کی بیٹیوں کو بیچنے لگے تو امیرالمومنینؑ نے ان سے کہا: بادشاہوں کی بیٹیوں کے ساتھ اوروں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا، بلکہ ان کی قیمت لگوائی جائے اور مسلمانوں میں سے جو بھی ان کو پسند کرے، وہ معینہ قیمت ادا کر دے۔ چنانچہ جو لوگ وہاں موجود تھے انھوں نے ان کی قیمت لگا دی، تب امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالب نے ان کو لیکر ان میں سے ایک حسینؑ کو عطا کر دی، جن سے امام زین العابدینؑ پیدا ہوئے۔ ایک عبداللہ بن عمر کو دیدی جن سے سالم بن عبداللہ پیدا ہوئے اور ایک محمد بن ابوبکر کو دی، جن سے قاسم بن محمد پیدا ہوئے۔ چنانچہ یہ تینوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے۔

ابن بابویہ کی روایت میں ہے کہ عثمان بن عفان کی خلافت کے زمانے میں جب عبداللہ بن عامر نے خراسان کو فتح کیا تو وہاں سے کسریٰ کی دو بیٹیاں عثمان کے پاس بھیج دیں۔ پس انھوں نے ایک حسنؑ کو اور ایک حسینؑ کو دیدی۔ بعد میں وہ دونوں حالت زچگی میں وفات پا گئیں۔ اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو امام رضاؑ سے روایت کیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ نے محمد بن سہیل بن قاسم نوشجانی سے فرمایا: ہمارے اور تمہارے درمیان ایک رشتہ قائم ہے۔ انھوں نے دریافت کیا وہ کیا ہے؟ امام نے فرمایا: عبداللہ بن عامر بن کرز کو یزدجرد بن شہریار کی دو بیٹیاں ملیں۔ اس نے ان کو عثمان کے پاس بھجوا دیا۔ انھوں نے ان میں سے ایک حسنؑ کو اور دوسری حسینؑ کو دیدی۔ وہ دونوں حالت زچگی میں وفات پا گئیں۔ امام حسینؑ کی بیوی علیؑ بن حسینؑ کی ولادت کے وقت فوت ہوئیں۔

ان تینوں روایات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ راویوں اور مؤرخوں کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امام سجادؑ کی والدہ فارس کے بادشاہ کی بیٹی تھیں اور وہ امام حسینؑ کو ملیں۔ نیز ان کی ایک یا دو بہنیں بھی ان کے ساتھ جنگی قیدی بنی تھیں۔ البتہ اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا وہ عمر بن خطاب، عثمان بن عفان یا امیرالمومنین علیؑ کے عہد میں بلاد مشرق میں آپ کے عامل، حارث بن جابر حنفی کے ذریعے قید ہو کر آئیں۔ آخری دو روایتیں اس لیے قابل ترجیح ہیں کہ امام زین العابدینؑ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے وقت اکیس یا پچیس سال کے تھے۔ جبکہ عمر بن خطاب کی وفات اور واقعۂ کربلا کے درمیان

تقریباً چالیس سال یا اس سے قدرے کم و بیش مدت حائل تھی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ امام سجادؑ کی والدہ نے آپ کی ولادت کے چند ہی دن کے بعد وفات پائی تھی۔ انہی دنوں محمد بن ابی بکر مصر میں قتل ہو گئے۔ تب امام حسینؑ نے انکی بیوہ یعنی امام سجادؑ کی والدہ کی بہن سے تزویج فرمائی تھی۔ اس طرح وہی آپ کی تربیت کی نگراں ہوئیں۔ بعض راویوں کا کہنا ہے کہ وہ امام حسینؑ کے ساتھ رہیں اور معرکۂ کربلا میں موجود تھیں۔ انہوں نے امام حسینؑ کی شہادت پر شدت غم کے باعث خود کو دریائے فرات میں ڈبو دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی روایتیں ہیں۔ البتہ ہم اس معاملے میں تحقیق کرنا نہیں چاہتے۔ راویوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اہل مدینہ میں سے کوئی کنیزوں سے تزویج کرنا پسند نہ کرتا تھا، تا اینکہ امام علیؑ بن الحسینؑ پیدا ہوئے تب لوگ کنیزوں سے شادیاں کرنے لگے۔

بہرحال بیشتر راویوں کا بیان ہے کہ آپ کی ولادت شعبان ۳۷ھ یا ۳۸ھ ہجری میں ہوئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نیمۂ ماہ جمادی الثانی میں ہوئی۔ اس بنا پر جب آپ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد منصب امامت پر فائز ہوئے، اس وقت آپ کی عمر ۲۲ یا ۲۳ سال تھی۔ البتہ اس روایت کی بنا پر کہ آپ کی ولادت ۳۶ھ ہجری میں ہوئی، آپ کے والد بزرگوار کی شہادت کے وقت آپ کی عمر تئیس سال ہو گی۔ آپ کی امامت چونتیس سال تک جاری رہی، جس کے دوران یزید بن معاویہ، مروان بن حکم اور عبدالملک بن مروان فرمانروا ہوئے جیساکہ بیشتر شیعہ روایات بتلاتی ہیں، آپ کی وفات محرم ۹۵ھ میں ولید بن عبدالملک بن مروان کے زمانے میں زہر خورانی سے واقع ہوئی لیکن اس سے مختلف روایت بھی بیان کی گئی ہے۔

آپ کے مشہور القاب زین العابدینؑ، سجادؑ، ذوالثفنات، بکّاء اور عابد ہیں۔ ان میں زین العابدینؑ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ آپ کو اس سے اسی طرح پکارا جاتا تھا جس طرح آپ کے نام سے۔ محمد بن شہاب زہری کی روایات میں آیا ہے کہ قیامت کے روز ایک ندا دینے والا ندا دے گا کہ اپنے زمانے میں عبادت گزاروں کا سردار کھڑا ہو جائے۔ تب علیؑ بن حسینؑ کھڑے ہو جائیں گے۔ تذکرۃ الخواص ابن جوزی میں آیا ہے کہ آپ کا یہ نام رسول اکرمؐ نے رکھا تھا۔

آپ کا لقب ذوالثفنات ہونے کے بارے میں حلیۃ الاولیاء اور کافی کلینی میں ہے

کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: سجدوں کے طول اور کثرت کی وجہ سے میرے پدر بزرگوار کے سجدہ کے مقامات پر پکے گٹے پڑ گئے تھے جن کو آپ ہر سال کاٹا کرتے تھے۔ شیخ صدوق سے روایت ہے کہ آپ ان گٹوں کو کاٹ کر جمع کرتے جاتے تھے اور آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کو آپ کے ساتھ قبر میں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ آپ کے ساتھ دفن کر دیے گئے تھے۔

آپ کا لقب بکّاء ہونے کے بارے میں راویوں نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: علیؑ ابن الحسینؑ اپنے پدر عالی قدر پر بیس سال تک اس طرح روتے رہے کہ اس زمانے میں جب بھی آپ کے سامنے کھانا لایا جاتا آپ رونے لگتے۔ آپ کے کسی موالی نے آپ سے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! میں آپ پر فدا ہو جاؤں۔ میں ڈرتا ہوں کہ آپ اس گریہ میں کہیں جان سے نہ گزر جائیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: میں اللہ سے اپنے دل کا درد اور رنج بیان کرتا ہوں۔ مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم حاصل ہے جو تم کو نہیں ہے۔ میں جب بھی اپنے باپ اور بھائیوں کو یاد کرتا ہوں، تب شدت گریہ سے میرا سانس رکنے لگتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ کے کسی موالی نے کہا کہ اب تو آپ کا رنج ختم ہو جانا چاہیے اور آپ کا رونا کم ہو جانا چاہیے۔ اس پر آپ نے فرمایا: وائے ہو تم پر یعقوب نبیؑ کے بارہ بیٹے تھے، جن میں سے اللہ کی مصلحت سے ایک غائب ہو گیا تو ان کی آنکھیں کثرت گریہ سے سفید ہو گئی تھیں اور کمر جھک گئی تھی۔ حالانکہ ان کا وہ بیٹا دنیا میں زندہ موجود تھا۔ جبکہ میں نے اپنے باپ، چچاؤں، بھائیوں اور سترہ چچازاد بھائیوں کو جانوروں کی طرح ذبح کیا ہوا دیکھا ہے۔ میں نے اپنی پھوپھیوں اور بہنوں کو اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ اپنے مقتولین پر رو رہی ہیں اور راہل کوفہ ان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ قسم بخدا جونہی میں اس دن کو یاد کرتا ہوں گریہ و بکاء میرا سانس روک دیتے ہیں۔

امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ رونے والے پانچ ہیں: آدمؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، فاطمہؑ بنت محمدؐ اور علیؑ بن حسینؑ۔ آدمؑ اس وقت سخت رنجیدہ ہوئے اور روئے جب اللہ نے ان کو جنت سے نکالا۔ یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسفؑ پر روتے رہے یہاں تک کہ

ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں۔ ان سے کہا گیا کہ اللہ اللہ آپ یوسفؑ کو اس قدر یاد کرتے ہیں کہ آپ گھُل گھُل کر ہلاک ہو جائیں گے۔ اُدھر یوسفؑ اپنے والد بزرگوار کی جدائی میں اس قدر روئے کہ قید خانہ میں ان کے ساتھی تنگ آگئے۔ فاطمہؑ بنت محمدؐ اپنے پدر عالی قدر پر اس قدر روئیں کہ آنحضرتؐ سے جا ملیں اور آپ کے شب و روز روتے رہنے سے اہل مدینہ تنگ آگئے۔ پھر ان لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ نے رو رو کر ہم کو تنگ کر ڈالا ہے۔ اس کے بعد سے آپ بقیع میں شہداء کی قبروں کی طرف چلی جایا کرتیں اور دن بھر وہیں روتی رہتی تھیں شام ہو جاتی تو اپنے گھر واپس آجاتی تھیں۔ علیؑ بن حسینؑ اپنے والد بزرگوار پر بیس سال سے زیادہ عرصے تک روتے رہے۔ جب بھی آپ کے لیے کھانا یا پانی لایا جاتا آپ فرمایا کرتے: میں کیسے کھانا کھا لوں، حالانکہ ابو عبداللہ بھوکے قتل کر دیے گئے اور میں کیسے پانی پی لوں، جبکہ ابو عبداللہ پیاسے قتل کر دیے گئے۔

اس کے علاوہ راویوں نے ہر اس موقع پر آپ کے گریہ کرنے کو بیان کیا ہے، جب آپ کو وہ دکھ اور مصیبتیں یاد آجاتی تھیں جو کربلا میں آپ پر اور آپ کے اہل خاندان پر گزری تھیں اور جن کی تلخی آپ عمر بھر محسوس کرتے رہے۔ جب بھی آپ کی خدمت میں کوئی جماعت یا گروہ دُور دراز علاقوں سے آتا تو آپ ان کے سامنے ان مصائب کو بیان فرماتے تھے۔ اگر کبھی آپ بازار میں نکل جاتے اور دیکھتے کہ قصاب بکری یا کسی دوسرے جانور کو ذبح کرنے والا ہے تو آپ اس کے قریب جا کر کہتے: آیا تو نے اس کو پانی پلا لیا ہے یا نہیں؟ تب وہ جواب دیتا کہ جی ہاں! اے فرزند رسولؐ۔ ہم اس وقت تک کسی جانور کو ذبح نہیں کرتے، جب تک اس کو پانی نہ پلا لیں، خواہ تھوڑا ہی سہی۔ تب آپ رو کر فرماتے: ہائے ابو عبداللہ پیاسے ذبح کر دیے گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز آپ نے ایک اجنبی کو دیکھا تو اس کو سلام کر کے کھانے کے لیے اپنے مکان پر بلا لیا۔ پھر تمام لوگوں کی موجودگی میں اس سے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے، اگر تم کو اس حالت میں موت آجائے کہ تم اپنے اہل خانہ سے دور ہو تو کیا تم کو کوئی غسل دینے والا اور دفن کر دینے والا مل جائے گا۔ اس پر سب ہی لوگ بول پڑے۔ اے فرزند رسولؐ! ہم سب ہی اس فرض کو ادا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ تب آپ نے رو کر فرمایا کہ

ابو عبد اللہ حالت مسافرت میں قتل کر دیے گئے اور تین دن تک بے غسل و کفن دھوپ میں پڑے رہے۔

آپ اپنے ان بیشتر اقوال کے ذریعے یہ کوشش فرماتے تھے کہ لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کریں، ان کو ظلم اور ان ظالموں کے خلاف قیام پر آمادہ کریں جو اپنے شاہی تختوں کو قائم رکھنے اور اپنی حرص و ہوس کی خاطر حرام افعال کو جائز قرار دیتے اور دین کو بے وقعت کرتے رہتے تھے۔ آپ کا یہ طریقۂ تبلیغ بار آور ہوا اور جلد ہی حجاز اور عراق وغیرہ میں مسلم عوام ظالم حکام سے مقابلہ کرنے پر تیار ہو گئے۔ چنانچہ کوفہ کے باشندوں نے حسینؑ کا ساتھ نہ دینے پر ندامت کا اظہار کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی طرح مدینے والوں نے بھی محسوس کر لیا کہ کربلا کے اس شدید واقعہ نے اسلام کو بڑی گہرائی تک متاثر کیا ہے۔ پس انہوں نے یزید کی سرکشی سے نالاں ہو کر اس کے گورنر کو نکال باہر کیا۔ اس معرکہ میں یزید کے جرنیل مسلم بن عقبہ نے مدینۃ الرسولؐ کو اپنے لشکریوں پر مباح قرار دیدیا۔ چنانچہ ان کے ہاتھوں دس ہزار سے زیادہ ذی علم اور بلند مرتبہ مسلمان مارے گئے۔

آپ کی صفات اور لباس

آپ کی صفات کے بارے میں فرزدق شاعر نے بیان کیا ہے کہ آپ خوش شکل اور خوب صورت تھے۔ آپ کا چہرہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ حسین اور آپ کا بدن سب سے زیادہ خوشبو دار تھا۔ آپ کی آنکھوں کے بیچ میں نشان سجدہ نمایاں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی آنکھوں کے درمیان سجدوں کا نشان ابھر آیا تھا، اسی لیے آپ کا لقب ذو الثفنات قرار پایا تھا۔ فرزدق نے اپنے مشہور قصیدۂ میمیہ میں آپ کی شان میں کہا ہے:

> آپ کی پیشانی کے نور سے اندھیرا اس طرح چھٹ جاتا ہے جس طرح آفتاب کے نکلنے سے تاریکی زائل ہو جاتی ہے۔
>
> اللہ نے آپ کو ازل ہی سے شرف اور عظمت عطا کی ہے اور اس کا نقش آپ کے لیے لوح قدرت پر لکھ دیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ اپنے ہم عصروں میں اخلاق و بذل و عطا اور ناداروں کے ساتھ حسنِ سلوک میں پیش پیش تھے۔ نیز لوگوں کو راہ حق کی ہدایت کرنے میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔

آپ ہر قریب اور دُور والے کے لیے مرکز ہدایت وصاحب تعظیم تھے۔ آپ عادتاً پچاس دینار میں اونی چادر خرید فرماتے اور سردی کا موسم گزر جانے پر اس کو بیچ کر اس کی قیمت ناداروں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ گرمی کے موسم میں آپ بہترین لباس زیب تن فرمایا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ زینت کی وہ چیزیں اور پاکیزہ رزق جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے، انہیں کون حرام قرار دے سکتا ہے۔

امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ جب سردی کا موسم ختم ہو جاتا تھا تو میرے والد امام علیؑ بن حسینؑ اپنی چادر غریبوں کو بطور صدقہ دیدیتے تھے۔ نیز جب گرمی کا موسم ختم ہو جاتا تب بھی اپنی چادر صدقہ کر دیتے تھے جس میں پشم زیادہ ہوتا تھا۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ اپنا لباس ایسے لوگوں کو دیدیتے ہیں جو اس کی عظمت کو نہیں جانتے اور نہ اس کے پہننے کے لائق ہوتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت صدقہ کرتے۔ آپ نے فرمایا: مجھ کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ میں اس کپڑے کو بیچ ڈالوں جس میں نماز پڑھتا رہا ہوں۔ آپ کے بارے میں متواتر روایتوں میں آیا ہے کہ آپ بہترین قسم کے کپڑے پہنتے تھے۔ جب اللہ کے حضور میں کھڑے ہوتے تو پہلے غسل فرماتے اور خوشبو لگا لیتے تھے۔ چنانچہ لباس اور ظاہری بود و باش کے معاملے میں بیشتر ائمہؑ کا طریقہ یہی تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات جو زہد فی الدنیا اختیار کیے ہوئے تھے اس کے نہ یہ معنی تھے کہ پاکیزہ چیزوں سے کنارہ کشی کی جائے اور نہ یہ کہ زندگی میں تکلیف اٹھائی جائے بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اللہ جو حکم دیتا ہے اس پر عمل کیا جائے۔ جو اس نے حرام قرار دیا ہے اور جس سے اس نے منع کر دیا ہے اس سے دُور رہا جائے۔ نیز جو مال دنیا دوسرے افراد کے پاس ہے اس پر نظر نہ کی جائے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ زہد کا اعلیٰ ترین درجہ وہی ہے جو ورع یعنی اللہ سے ڈرتے رہنے کا سب سے نچلا درجہ ہے۔

راویوں کا بیان ہے کہ ابن عیینہ نے امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ سے کہا کہ آپ کے دادا علیؑ بن ابی طالب کھردرے کپڑے پہنا کرتے تھے اور آپ مرد کا قہوی رنگ کا نفیس لباس استعمال فرماتے ہیں۔ تب آپ نے فرمایا: وائے ہو تم پر اے ابن عیینہ! علیؑ مسلمانوں کی تنگدستی کے زمانہ میں تھے لیکن اب کشادگی کا زمانہ آگیا ہے۔ پس نیک افراد اس سے مستفید ہونے کے

زیادہ حقدار ہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے اپنے دادا امام علیؑ بن حسینؑ کے بارے میں فرمایا: میرے دادا اس طرح چلتے تھے گویا ان کے سر پر طائر بیٹھا ہوا ہے۔ ان کا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ سے آگے نہ ہوتا تھا۔ نہ آپ اپنا ہاتھ بلند کرتے تھے۔ آپ کے چہرے پر شرافت اور وقار کا جلوہ نظر آتا تھا۔

عبداللہ بن سلیمان سے روایت ہے کہ میں اپنے باپ کے ساتھ مسجد میں تھا۔ اتنے میں علیؑ بن حسینؑ تشریف لے آئے۔ میں ان سے واقف نہیں تھا، وہ سیاہ عمامہ زیب سر کیے ہوئے تھے، جس کے دونوں سرے ان کے دونوں شانوں پر پڑے تھے۔ میں نے اپنے قریب کے ایک آدمی سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے؟ اس نے مجھ سے کہا: تم کو کیا ہو گیا ہے، اس شخص کے علاوہ جو لوگ مسجد میں آئے تم نے کسی کے بارے میں مجھ سے نہیں پوچھا۔ میں نے کہا کہ میں نے ان کے علاوہ کسی کو اتنا خوبصورت نہیں پایا۔ تب اس نے بتایا کہ یہ علیؑ بن حسینؑ ہیں۔

امام زین العابدینؑ کوفہ و شام میں

امام علیؑ بن حسینؑ نبوت کے گھر اور وحی کے مقام نزول میں پلے۔ اس گھر میں جس کو اللہ کی راہ میں سخت ترین رنج، مشقت اور مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ آپ بچپن میں اپنے عظیم دادا علی المرتضیٰؑ کے غم شہادت سے دوچار ہوئے جو مسجد کوفہ میں اپنے خون میں لت پت ہو گئے تھے۔ جب آپ شباب کی طرف بڑھ رہے تھے تو اپنے تایا حسنؑ کی شہادت کا غم اٹھانا پڑا جو اس زہر کے اثر سے خون کے ساتھ اپنے جگر کے لوتھڑے اگل رہے تھے جو ان کو معاویہ نے دلوایا تھا۔ پھر اپنی جوانی میں جبکہ آپ ایک ایسے مرض میں مبتلا تھے جو آپ کے جسم کو گھلائے دے رہا تھا، آپ نے اپنے والد بزرگوار، چچاؤں اور بھائیوں اور بھتیجوں کا قتل ہونا اور اپنی پھوپھیوں اور بہنوں کا کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام میں قیدی بن کر جانا دیکھا۔ آپ کے تمام اہل خاندان اور اصحاب حسینؑ کے نیزوں پر بلند کیے ہوئے سر ساتھ ساتھ تھے اور آپ کے والد ماجد کا سر سب سے آگے تھا۔ نیز آپ نے عبیداللہ بن زیاد اور یزید بن معاویہ کو دیکھا کہ وہ عداوت اور قساوت سے آپ کے والد ماجد کے دندان مبارک کو اپنی چھڑی سے مارتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے خود آپ پر بھی ایک سے زیادہ مرتبہ تلوار اٹھائی،

لیکن مشیئت الٰہی نے ان کے ارادوں کو پورا نہیں ہونے دیا۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ علیؑ ابن حسینؑ اپنے والد ماجد کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ کربلا میں موجود تھے لیکن بیماری نے ان کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ وہ میدان میں نہ جا سکتے تھے۔

ابو مخنف نے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جس صبح کو میرے والد ماجد شہید ہوئے اس رات میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور میری پھوپھی زینبؑ میری تیمارداری میں مصروف تھیں، اس وقت میرے والد اپنے خیمۂ خاص میں تھے اور ابوذر کے غلام جون ان کی تلوار صاف کر رہے تھے، جبکہ میرے والد یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

> اے زمانے! تو کیسا برا دوست ہے۔ ہر صبح و شام کیسے کیسے دوستوں اور ساتھیوں کو مار ڈالتا ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی بدل نہیں ہوتا۔ تاہم ہر زندہ اسی راستے پر رواں ہے جو وعدۂ قضا کو جاتا ہے۔

اپنے والد کے یہ اشعار سن کر شدتِ گریہ سے میرا سانس رک گیا لیکن میں نے مجبوراً سکوت اختیار کیا اور میں سمجھ گیا کہ جنگ شروع ہو گئی ہے لیکن جب میری پھوپھی زینبؑ نے وہ دردانگیز کلام سنا جو میں نے سنا تھا تو ان سے رہا نہ گیا اور وہ اپنے دامن کو سنبھالتی ہوئی جھپٹ کر ان کے پاس جا پہنچیں اور چلائیں کہ کاش موت نے آج کے دن سے قبل ہی میری زندگی ختم کر دی ہوتی۔ اے بزرگوں کی یادگار اور اے زندہ رہنے والوں کی زندگی کے سہارے، معلوم ہوتا ہے کہ گویا میرے نانا محمدؐ، میرے باپ علیؑ، میری ماں فاطمہؑ اور میرے بھائی حسنؑ کو آج ہی موت آئی ہے۔ اس پر میرے والد نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا: بہن! شیطان تمہارے صبر کو زائل نہ کرے۔ پھر آپ نے ان کو صبر کرنے اور بچوں کی نگہداشت کرنے کے لیے وصیت فرمائی۔

امام علیؑ بن حسینؑ نے کربلا کی مقابلہ آزمائیوں کے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں۔ اسی طرح آپ نے اپنے والد ماجد کا وہ خطبہ بھی روایت کیا ہے جو انہوں نے اپنی شہادت سے قبل اہل کوفہ کے سامنے دیا تھا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بابا حسینؑ میرے بستر کے پاس تشریف لائے اور اپنی وصیتیں فرما کر نبوت کے تبرکات میرے سپرد فرمائے۔ انہوں نے مجھ کو آخری وصیت یوں فرمائی: اے بیٹے! اب میں تم کو

وہ وصیت کرتا ہوں جو تمہارے نانا رسول اکرمؐ نے وصال کے وقت میرے بابا علیؑ کو فرمائی۔ پھر تمہارے دادا علیؑ نے تمہارے تایا حسنؑ کو اور انھوں نے مجھ کو فرمائی تھی۔ یعنی کسی ایسے شخص پر سختی نہ کرنا جس کا اللہ کے سوا کوئی مدد گار نہ ہو۔ اس کے بعد آپ مجھ سے رخصت ہو کر اس آخری جنگ کے لیے روانہ ہو گئے جس میں انھوں نے شہادت پائی تھی۔

امام سجادؑ ہی نے اپنے والد حسینؑ، ان کے مقتول خاندان اور انصار کو دفن کیا۔ جیسا کہ بیشتر روایات میں آیا ہے، آپ نے بنی اسد کو شہداء کی قبریں اور ان کے نام بتا دیے تھے۔ وہ لوگ خود بھی ۱۲ محرم کو ان سب کے دفن کے وقت موجود تھے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ آپ ہی نے ان سب کے دفن کی نگرانی فرمائی تو جیسا کہ روایتوں میں بیان کیا گیا ہے، آپ اس کام کے لیے اسی طرح نکل آئے ہوں گے جس کی توجیہہ اللہ کی مشیئت کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

جب آپ اور آپ کی پھوپھیاں کوفہ میں داخل ہوئیں تو لوگ جمع ہو گئے۔ ان سب کو اس واقعہ نے ششدر کر دیا اور وہ رونے اور نوحہ کرنے لگے۔ اگرچہ اس وقت آپ بیمار تھے لیکن پھر بھی آپ نے لوگوں کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا اور کمزوری کے باوجود آپ نے کھڑے ہو کر اللہ کی حمد کی۔ نبی اکرمؐ کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد کہا: اے لوگو! جو مجھ کو پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہے۔ جو نہیں پہچانتا اس کو میں خود بتائے دیتا ہوں۔ میں علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ ابن ابی طالب ہوں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کی حرمت ضائع کی گئی، کھانا پینا بند رکھا گیا، بے جرم مار ڈالا گیا، مال لوٹا گیا اور اس کے اہل وعیال کو قیدی بنا لیا گیا ہے۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کو فرات کے کنارے ذبح کر ڈالا گیا ہے۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کو دھوکے سے بلا کر قتل کیا گیا ہے اور یہی قربانی فخر کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد آپ نے اہل کوفہ کو ان کا امام حسینؑ کو خطوط بھیجنا، ان سے جھوٹے وعدے کرنا اور پھر ان کے کریہہ جرائم یاد دلائے، یہاں تک کہ راوی کے بقول وہ لوگ زور زور سے رونے اور چلانے لگے۔ البتہ مجھ کو شک ہے کہ آپ نے اور آپ کی پھوپھی نے اپنے خطبوں میں وہ سب کچھ کہا ہو گا جو بیان کیا جاتا ہے کیونکہ ابن زیاد ان کو ہرگز ایسا موقع نہیں دے سکتا تھا جس سے رائے عامہ میں ہیجان پیدا ہو اور لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھیں۔ اس نے ان لوگوں کے کوفہ میں داخل ہونے کے وقت یقیناً تمام پیش بندیاں کر لی تھیں تاکہ کسی شخص کو ایسا موقع نہ ملنے پائے۔

جب آپ کو اپنی پھوپھیوں کے ساتھ ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا تو راوی کے بقول اس نے آپ سے پوچھا تم کون ہو؟ آپ نے فرمایا: میں علیؑ بن حسینؑ ہوں۔ اس نے پلٹ کر کہا: کیا اللہ نے علیؑ بن حسینؑ کو قتل نہیں کیا؟ امامؑ نے جواب دیا میرے ایک بھائی جن کا نام علی تھا، ان کو لوگوں نے قتل کر ڈالا۔ اس پر ابن زیاد بولا: ان کو اللہ نے قتل کیا ہے۔ اب امامؑ نے قرآن کی آیت تلاوت فرمائی: "اللہ ہی موت کے وقت جانوں کو واپس بلا لیتا ہے۔" (سورہ زمر۔ آیت ۴۲)۔

اب تو ابن زیاد بپھر گیا اور بولا: تم کو اتنی جرأت ہے کہ میری بات کو رد کرو۔ پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ آپ کو قتل کر دیں لیکن آپ کی پھوپھی زینبؑ آپ سے چمٹ گئیں اور آپ کو اپنے بازوؤں میں لے کر کہنے لگیں: اے ابن زیاد! تو نے ہمارے جو خون بہا لیے وہی بہت ہیں۔ قسم بخدا! میں ان سے ہرگز جدا نہ ہوں گی۔ اگر تو ان کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو ان کے ساتھ مجھے بھی قتل کر دے۔ اس پر وہ کچھ نرم پڑ گیا اور اس نے آپ کو چھوڑ دیا۔

جب یزید بن معاویہ نے عبیداللہ کو حکم بھیجا کہ امام حسینؑ کا سر اقدس اور دوسرے مقتولین کے سرہائے مقدس کو قیدیوں کے ساتھ شام بھیج دے تو اس نے سب کو مخضر بن ثعلبہ عائذی، شمر بن ذی الجوشن اور اپنے لشکر کے کچھ سپاہیوں کے ساتھ وہاں روانہ کر دیا۔ راوی کہتا ہے کہ آپ لوہے میں جکڑے ہوئے تھے۔ جب یہ ستم رسیدہ دمشق پہنچے تو وہاں کے لوگ رنگارنگ لباس پہنے خوشی کے عالم میں ان سب کا نظارہ کرنے کے لیے نکلے۔

کامل بہائی اور بحار میں سہل بن سعد ساعدی سے روایت کی گئی ہے کہ میں بیت المقدس کی طرف روانہ ہوا، جب خطۂ شام کے وسط میں پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ ایک شہر ہے جس میں بہت سی نہریں اور ہرے بھرے درخت ہیں۔ وہاں کے باشندوں نے اپنے مکانوں پر ریشمی پردے لٹکائے ہوئے ہیں۔ وہ ڈھول تاشے بجاتے اور خوشیاں مناتے ہوئے ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اہل شام میں کوئی ایسی عید تو نہیں ہوگی، جس کو ہم نہ جانتے ہوں۔ چنانچہ میں کچھ لوگوں کے قریب گیا جو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا: اے لوگو! کیا تم اہل شام میں کوئی ایسی عید بھی ہوتی ہے جس کو ہم نہیں جانتے۔ وہ بولے، اے شیخ ہمارا خیال ہے کہ تم یہاں اجنبی ہو۔ تب میں نے ان سے کہا: میں صحابی رسولؐ سہل بن سعد ساعدی ہوں۔ میں نے رسول اکرمؐ کی

زیارت کی ہے اور آنحضرتؐ سے ان کی حدیث سنی ہے۔ تب وہ کہنے لگے کہ اے سہل کوئی تعجب نہیں کہ آسمان خون برسائے اور زمین ساری آبادی سمیت دھنس جائے۔ میں نے ان سے کہا: یہ کیوں؟ وہ بولے: یہ حسینؑ ابن علیؑ کا سر اقدس ہے جو عراق سے یزید بن معاویہ کے پاس ہدیتہً لایا جارہا ہے۔ تب میں نے کہا: بڑے تعجب کا مقام ہے کہ حسینؑ کا سر اقدس آیا ہے اور وہ لوگ اس طرح خوشیاں منارہے ہیں، جیسا کہ میں دیکھ رہا ہوں۔ ہاں مجھے بتائیں کہ یہ کس باب سے شہر میں داخل ہوگا۔ اس پر ان لوگوں نے اس دروازہ کی طرف اشارہ کیا جس کو "باب ساعات" کہتے تھے۔ ہم لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں آگے پیچھے جھنڈے آنے لگے۔ تب میں نے دیکھا کہ ایک سوار کے ہاتھ میں نیزہ ہے۔ جس کی انی نکلی ہوئی ہے اور اس پر حسینؑ کا سر اقدس ہے جو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ رسول اکرمؐ سے مشابہ تھے۔ اس کے پیچھے بے کجاوہ اونٹوں پر عورتیں ہیں۔ میں نے سب سے آگے والی بی بی کے قریب ہو کر کہا: اے لڑکی! تم کون ہو؟ انہوں نے کہا، میں سکینہ بنت الحسینؑ ہوں۔ میں نے ان سے کہا، میں سہل بن سعد ساعدی ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے آپ کے نانا رسول اکرمؐ کی زیارت کی ہے، کیا آپ کو مجھ سے کوئی حاجت ہے؟ انھوں نے کہا: اے سہل، اس سر کو لے جانے والے سے کہد یجیے کہ وہ اس سر کو لے کر ہمارے آگے آگے چلے تاکہ لوگ سر کو دیکھنے میں لگ جائیں اور رسول اکرمؐ کے ناموس سے نظریں ہٹالیں۔ سہل بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے اس سر کو لے کر چلنے والے کے قریب جا کر کہا کہ کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ میری ایک حاجت پوری کردو اور مجھ سے چارسو دینار لے لو۔ اس نے پوچھا وہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سر کو عورتوں کے سامنے کی طرف لے آؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا اور میں نے اس کو یہ رقم دیدی۔

دوسری روایت میں ہے کہ وہ امام زین العابدینؑ تھے جنہوں نے سہل سے کہا کہ شہداء کے سروں کو لے چلنے والے کو کچھ دیدیں۔ پھر یزید بن معاویہ نے شام کے معزز اور ممتاز افراد کو بلا کر اپنے ارد گرد بٹھایا۔ تب علیؑ ابن حسینؑ، سرہائے شہداء اور قیدیوں کو لائے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ سب اس کے سامنے اس طرح لائے گئے کہ رسی میں بندھے ہوئے تھے۔ اس وقت علیؑ ابن حسینؑ نے یزید سے کہا: اے یزید! میں تجھے اللہ کا واسطہ

دے کر پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اکرمؐ ہمیں اس حالت میں دیکھیں تو اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس پر سب حاضرین رو پڑے۔ پس یزید نے حکم دیا کہ رسیاں کاٹ دی جائیں۔ جب سرہائے شہداء اس کے سامنے رکھے گئے تو وہ یہ شعر پڑھنے لگا:

ہم ان لوگوں میں سے ایک شخص کا سر کچل رہے ہیں جو ہمارے لیے نہایت سخت، نافرمان اور ظالم تھے۔

اس وقت مروان بن حکم کا حقیقی بھائی یحییٰ بن حکم دربار میں موجود تھا۔ جب اس نے یزید کو خوشی سے جھومتے ہوئے دیکھا تو اس نے یہ اشعار پڑھے:

کیا غضب ہے کہ عبید اللہ ابن زیاد ایسے کمینے اور دوغلے حسب و نسب والے شخص کی بدنام دادی سمیہ کی نسل تو کنکریوں کی طرح پھیلے اور فرات کے کنارے رسول اکرمؐ کی بیٹی کی نسل قطع ہو جائے۔

تب یزید نے اس کے سینے پر ٹھوکا لگا کر کہا: چپ رہو۔ پھر اس نے امام علیؑ بن حسینؑ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: تمہارے باپ نے میری قرابت کا خیال نہ کیا۔ میرے حق کو نظر انداز کیا اور میری حکومت کے معاملے میں مجھ سے جھگڑا کیا۔ اب تم نے دیکھ لیا کہ اللہ نے ان کا کیا حال کیا۔ علیؑ بن حسینؑ نے (قرآن کی آیت سے) جواب دیا:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭاِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ . لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتَاكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ .

یعنی جو مصیبتیں دنیا میں یا تمہارے اوپر گزرتی ہیں وہ کتاب میں موجود ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان کو ظاہر کریں یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔ تاکہ جو تم کو نہیں ملا اس پر افسوس نہ کرو اور جو اللہ نے تم کو دیا ہے اس پر خوشی نہ مناؤ۔ اللہ غرور کرنے والے اور فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ (سورۂ حدید آیت ۲۲، ۲۳)

یزید نے اپنے بیٹے خالد سے کہا کہ وہ امامؑ کو اس کا جواب دے لیکن خالد کوئی جواب نہ دے سکا۔ تب یزید نے اس سے کہا کہ تم ان سے یہ کہو:

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔

یعنی جو کچھ تم پر گزرتا ہے وہ تمہارا ہی کیا دھرا ہے اور اللہ بیشتر سے تو درگزر کرتا رہتا ہے۔ (سورۂ شوریٰ۔ آیت ۳۰)

اس پر امام زین العابدینؑ نے فرمایا: اے یزید! اے معاویہ، ہند اور صخر کے بیٹے! میرے باپ دادا کے پاس نبوت اور حکومت اس وقت سے رہی ہے جب تو پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ بدر، احد اور احزاب کی جنگوں میں میرے دادا علی بن ابی طالبؑ کے ہاتھ میں رسول اکرمؐ کا عَلَم ہوتا تھا اور تیرے باپ اور دادا کے ہاتھ میں کفار کا۔ وائے ہو تجھ پر اے یزید کہ اگر تجھ کو معلوم ہوتا، تو نے میرے باپ اور ان کے خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تو پھر تو پہاڑوں میں بھاگ جاتا، مٹی پر لیٹ رہتا اور چیختا پکارتا رہتا۔ بس اب تو سمجھ لے کہ قیامت کے روز تجھ کو لوگوں کے اجتماع میں ذلت اور ندامت کا سامنا ہوگا۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ یزید بن معاویہ نے اپنے ایک حمایتی کو حکم دیا کہ وہ منبر پر جا کر علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو برا کہے اور معاویہ کی مدح کرے۔ اس خطیب نے منبر پر جا کر خوب خوب معاویہ کی تعریفیں کیں اور علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو برا کہا۔ اس پر امام سجادؑ نے کہا: وائے ہو تجھ پر اے تقریر کرنے والے، تو نے اللہ کے غصے کے عوض بندے کی مرضی خریدی اور اس طرح تو نے اپنا ٹھکانا جہنم میں تیار کر لیا۔ پھر آپ نے یزید سے فرمایا: کیا تو مجھ کو موقع دے سکتا ہے کہ میں بھی اس منبر پر جا کر تقریر کروں جس میں اللہ کی رضا اور یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے اجر و ثواب ہو۔ یزید نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس پر کسی درباری نے کہا: اے امیر ان کو بولنے دو۔ ذرا ہم بھی سنیں کہ یہ کیا کہتے ہیں۔

یزید بن معاویہ نے اس کے جواب میں کہا: یہ منبر پر گئے تو میری اور آل ابوسفیان کی برائی کیے بغیر نہ اتریں گے۔ تب اس سے کہا گیا کہ یہ تو ایک لڑکا ہے کیا کہہ سکے گا۔ تب راویوں کے بقول اس نے کہا: یہ اہلبیتؑ کے فرد ہیں جن کو علم سے بھر دیا گیا ہے۔ تاہم وہ لوگ برابر یزید کے پیچھے پڑے رہے۔ یہاں تک کہ اس نے اجازت دیدی۔ چنانچہ آپ نے منبر پر

تشریف لے جا کر اللہ کی حمد و ثنا کی اور پھر فرمایا: اے لوگو! ہم کو چھ چیزیں عطا کی گئی ہیں اور ہماری سات بزرگیاں ہیں۔ ہم کو دیا گیا ہے علم، حلم، سخاوت، فصاحت، شجاعت اور مومنوں کے قلب میں محبت۔ ہماری بزرگیاں یہ ہیں: کہ اللہ کے منتخب نبیؐ ہم میں سے ہیں۔ صدیق ہم میں سے ہیں۔ طیار (ملائکہ کی مانند اڑنے والے) ہم میں سے ہیں اور اسد رسولؐ ہم میں سے ہیں۔ عالمین کی عورتوں کی سردار ہم میں سے ہیں اور اس امت میں رسولؐ کے دو نواسے بھی ہم میں سے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

اے لوگو! جو مجھ کو پہچانتا ہے، وہ تو پہچانتا ہے۔ جو نہیں پہچانتا میں اس کو اپنا حسب و نسب بتلاتا ہوں۔ میں مکہ و منیٰ کا فرزند ہوں۔ میں زمزم و صفا کا فرزند ہوں۔ میں اس کا فرزند ہوں جس نے غریبوں کے لیے زکات وصول کی۔ میں چادر اوڑھنے والوں اور لباس پہننے والوں میں بہترین فرد کا فرزند ہوں۔ میں طواف اور سعی کرنے والوں میں بہترین شخص کا فرزند ہوں۔ میں بیت اللہ کا حج کرنے والوں اور لبیک کہنے والوں میں بہترین شخص کا فرزند ہوں۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کو براق پر ہوا میں لے جایا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کو راتوں رات مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (عرش) تک لیجایا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کے ساتھ جبرئیل سدرۃ المنتہیٰ تک گئے۔ میں اس کا فرزند ہوں جو تجلیات سے اسقدر قریب ہوئے کہ دو کمانوں یا اس سے کم فاصلے پر پہنچ گئے۔ میں اس کا فرزند ہوں جس نے ملائکہ سمٰوات کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کو اللہ نے وحی فرمائی۔ میں فرزند ہوں محمد مصطفیؐ اور علی مرتضیٰؑ کا۔ میں اس کا فرزند ہوں جس نے لوگوں کی ناکوں کو نیچا کیا۔ یہاں تک کہ وہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے لگے۔ میں اس کا فرزند ہوں جس نے رسول اکرمؐ کی حفاظت کے لیے دو دو تلواروں سے جنگ کی، وہ جو دو بیعتوں میں شریک رہا، جس نے دو نیزوں سے حملے کیے۔ جس نے دو مرتبہ ہجرت کی۔ جو بدر و حنین میں لڑا اور جس نے ایک لمحہ کے لیے بھی کفر اختیار نہیں کیا۔ آپ اسی طرح بولتے رہے اور مجمع کے سامنے اپنے بزرگوں، رسول اکرمؐ، علی مرتضیٰؑ اور اپنے والد بزرگوار ابو عبداللہ حسینؑ کے کارنامے گناتے اور جو کچھ کربلا میں ہوا بیان فرماتے رہے۔ یہانتک کہ لوگ رونے اور چیخنے لگے۔ اس وقت جیسا کہ راوی کہتے ہیں، یزید کو خوف ہوا کہ اہل شام

اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ چنانچہ اس نے مؤذن کو حکم دیا کہ وہ اذان شروع کر دے تاکہ آپ کی تقریر کا سلسلہ بند ہو جائے۔ پس جب مؤذن نے کہا: اَللّٰہُ اَکْبَر تو آپ نے فرمایا: یقیناً اللہ سے بڑی کوئی شئے نہیں۔ جب اس نے کہا: اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ تو امامؑ نے فرمایا: خون، گوشت، جسم اور میرے بال بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ جب اس نے کہا: اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ تب علیؑ بن حسینؑ نے یزید بن معاویہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: یہ محمدؐ میرے نانا ہیں یا تیرے۔ اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ تیرے نانا ہیں تو پھر یقیناً تو جھوٹا ہے اور کافر ہو گیا ہے لیکن اگر تو یہ مانتا ہے کہ وہ میرے نانا ہیں تو پھر تو نے ان کی عترت کو کس لیے قتل کیا؟

راوی نے امام زین العابدینؑ اور یزید بن معاویہ کے مابین اس گفتگو کو بیان کرتے ہوئے مزید کہا ہے کہ تب یزید کے دربار میں ایک یہودی عالم بھی موجود تھا۔ اس نے یزید سے پوچھا: یہ لڑکا کون ہے؟ اس نے کہا: یہ علیؑ بن حسینؑ ہے۔ تب یہودی نے آپ کے دادا، باپ اور ماں کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے اس کو آپ کے نسب کے متعلق بتلایا یہاں تک کہ بات رسول اکرمؐ تک پہنچی۔ وہ یہودی بولا: سبحان اللہ تم نے اتنی جلدی اپنے نبیؐ کی بیٹی کے بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ تم نے ان کے بعد ان کی ذریت کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کیا۔ قسم بخدا! اگر موسیٰؑ بن عمران ہمارے درمیان اپنا ایک نواسہ چھوڑ جاتے تو ہمارا خیال ہے کہ ہم اللہ کی بجائے اس کی عبادت کرنے لگتے۔ مگر تم وہ ہو کہ ابھی کل تمہارے نبیؐ تم سے جدا ہوئے ہیں اور تم ان کے بیٹے پر جھپٹ پڑے اور اس کو قتل کر ڈالا۔ کیسی بری امت ہو تم لوگ۔

راوی مزید کہتا ہے کہ ایک روز امام زین العابدینؑ اس مکان سے باہر نکلے جو یزید نے قیدیوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ آپ بازار میں تھے کہ اتنے میں آپ کے سامنے منہال بن عمرآ پہنچے۔ انہوں نے آپ کا حال دریافت کیا۔ امامؑ نے فرمایا: ہم کو آل فرعون کے درمیان بنی اسرائیل کی مانند سمجھ لو، کیونکہ وہ بھی ان کے بیٹوں کو قتل کر دیتے اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ پھر امامؑ نے ان سے فرمایا: اے منہال! عربوں نے عجمیوں پر یہ فخر کرنا شروع کیا کہ محمدؐ ان میں سے ہیں۔ قریش نے سارے عرب پر فخر کیا

کہ محمدؐ ان میں سے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ جو ان کے گھرانے والے ہیں لیکن ہم کو قتل کر ڈالا گیا اور ہم کو بے گھر کر دیا گیا ہے۔ اس طرح گزر رہے ہیں ہمارے دن رات، اے منہال!

ایک دوسری روایت ہے کہ امامؑ نے ان سے اس کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ وہ شخص جو یزید کا قیدی ہو، اس کی کیا زندگی؟

لہوف میں ہے کہ یزید بن معاویہ نے علیؑ بن حسینؑ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کی کوئی سی تین خواہشیں پوری کردے گا۔ ایک روز اس نے آپ سے کہا کہ اپنی تین خواہشیں بیان کیجیے، جن کے پورا کرنے کا میں نے آپ سے وعدہ کر رکھا ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا: میری پہلی خواہش تو یہ ہے کہ مجھے میرے والد ماجد کا چہرہ دکھا دے تاکہ میں جی بھر کر اس کو دیکھ لوں۔ دوسری یہ کہ کربلا میں ہم سے جو کچھ چھینا گیا ہے وہ واپس کردے۔ تیسری یہ کہ اگر تیرا ارادہ مجھ کو قتل کرنے کا ہے تو ان عورتوں کے ساتھ کسی ایسے شخص کو بھیج دے جو ان کو رسول اکرمؐ کے روضہ پر واپس پہنچا دے۔

راوی کہتا ہے کہ یزید نے آپ سے کہا: اپنے باپ کا سر آپ کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔ ان عورتوں کو آپ کے علاوہ کوئی اور مدینے واپس نہیں لے جائے گا۔ آپ کی جو چیزیں چھینی گئی تھیں، ان کی قیمت کا کئی گنا میں آپ کو دیے دیتا ہوں۔ اس پر امامؑ نے اس سے کہا: ہم کو تمہارا مال نہیں چاہیے جو تمہارے پاس بہت زیادہ ہے۔ البتہ میں نے تم سے چھینا ہوا مال اس لیے طلب کیا ہے کہ اس میں میری جدّۂ ماجدہ فاطمہؑ کا دوپٹہ، ہار اور قمیص ہے۔ چنانچہ یزید نے یہ چیزیں آپ کو واپس دیے جانے کا حکم دیدیا اور ان کے ساتھ دو سو دینار کا اضافہ بھی کر دیا جو آپ نے اس سے لے کر ناداروں میں تقسیم کر دیے۔

بعض راوی بیان کرتے ہیں کہ یزید بن معاویہ نے امام زین العابدینؑ کو شام میں مقیم رہنے یا مدینہ واپس جانے کا اختیار دیا۔ آپ نے مدینہ واپس جانا پسند فرمایا۔ اس پر یزید نے ان کو ضروری سامان مہیا کر دیا، نیز ان کے معاملات کے انتظام اور راستے میں ان کی دیکھ بھال کے لیے کچھ افراد ان لوگوں کے ساتھ کر دیے۔ تب اہلبیتؑ نے ایک نشر سے خواہش کی کہ وہ ان کو کربلا کی طرف سے لے چلے اور اس نے یہ بات مان لی۔ ادھر جابر بن عبداللہ انصاری اور بعض بنی ہاشم امام حسینؑ کے مرقد کی زیارت کے لیے بڑی سرعت

سے مدینے سے کربلا کا سفر طے کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ ان قیدیوں کے کربلا پہنچنے سے ایک روز قبل وہاں پہنچ گئے۔ جابر اور ان کے ساتھ والے قبروں کے درمیان گھوم رہے تھے کہ شام کی طرف سے امام سجادؑ کی سواری ان کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ جابر نابینا تھے تب ان کے رہبر نے ان سے کہا کہ مجھ کو شام کی طرف سے کوئی چیز اپنی طرف بڑھتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس پر ان کو خوف ہوا کہ یہ یزید یا ابن زیاد کے سپاہیوں کی سواریاں ہوں گی۔ پس جابر نے اس سے کہا کہ تم جاؤ اور جلدی سے ان کا حال معلوم کر کے آؤ۔ اگر یہ یزید کے آدمی ہوں گے تو ہم کو کسی اور جگہ پناہ لینا پڑے گی اور اگر یہ علیؑ بن حسینؑ اور انکی بہنیں اور پھوپھیاں ہیں تو تم بفضل خدا ہر خوف سے آزاد ہو۔ چنانچہ وہ گیا اور تیزی سے واپس آکر کہنے لگا: اے جابر! اٹھیے اور حرم رسولؐ کا استقبال کیجیے۔ یہ امام زین العابدینؑ اپنی پھوپھیوں اور بہنوں کو لیکر آئے ہیں۔ جابر اٹھ کھڑے ہوئے اور پا پیادہ چل کر زین العابدینؑ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ بوسے لینے کے لیے امامؑ پر گر پڑے اور ساتھ ہیں روتے جاتے تھے۔ تب کثرت گریہ سے میدان کربلا گویا محشر آ گیا۔ امامؑ نے ان سے کہا: اے جابر! قسم بخدا! یہیں پر ہمارے مرد قتل کر ڈالے گئے، ہمارے بچے ذبح کر دیے گئے، ہماری عورتیں قیدی بنائی گئیں اور ہمارے خیمے جلا دیے گئے۔

ابن طاؤس اپنی کتاب لہوف میں لکھتے ہیں کہ جب اہلبیتؑ کربلا پہنچے تو انھوں نے جابر بن عبداللہ انصاری اور بنی ہاشم کے کچھ مردوں کو وہاں پایا، جو امام حسینؑ کی قبر کی زیارت کے لیے آئے تھے۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر روتے رہے اور وہاں ان سب نے مجلس عزا برپا کی۔ اس وقت ان لوگوں میں کربلا کے قریب فرات کے کنارے بسنے والے بنی اسد بھی آکر شریک ہو گئے۔ ان روایات کے مطابق جو ان قیدیوں کا عراق سے شام اور وہاں سے حجاز کے سفر کا حال بیان کرتی ہیں، یہ قافلہ کربلا میں چند دن قیام کر کے مدینے روانہ ہو گیا۔

راویوں نے راہ شام اور پھر دمشق میں امام زین العابدینؑ کے بیانات نیز دوران سفر اور دربار یزید میں آپ سے اور حسینؑ کے سر اقدس سے ظاہر ہونے والی ایسی ایسی کرامات نقل کی ہیں جو تنقید اور تجزیے کے سامنے قائم نہیں رہ سکتیں۔ حالانکہ یہ چیزیں ان ذوات سے باعث حیرت بھی نہیں ہیں، نہ یہ امر اللہ کی قدرت سے بعید ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کی بات مان لے

جنھوں نے اسکی بات مان کر اپنی عزیز ترین متاع کو نیز اپنی جانوں کو اس کی راہ میں فدا کر ڈالا۔
البتہ اس میں شک نہیں کہ یزید بن معاویہ اور اس کے ظالم ساتھیوں نے امام حسینؑ کے ساتھ کربلا میں اور اسیران اہل حرم کے ساتھ کوفہ و شام میں ایسا سلوک کیا جو ہر زمانے اور ہر دور کے لوگوں کی نظر میں اس قدر برا ہے کہ اس سے پہلے اس کی نظیر تاریخ عرب میں نہیں ملتی۔ یہ باتیں یزید سے کچھ بعید بھی نہیں ہیں، کیونکہ وہ ایسا خود پرست اور بدنہاد تھا کہ خود اپنے گھرانے کے بے لگاموں میں بھی سب سے بڑھا ہوا تھا۔ امام حسینؑ کی شہادت اور اس کے بعد کے واقعات کے بارے میں جو روایات پیش کی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر مرسل ہیں اور بہت کم قابل اعتبار ہیں۔ البتہ ان روایات میں جو سقم پائے جاتے ہیں وہ ان تمام تفصیلات یا ان کے نصف سے بھی متعلق نہیں ہیں۔ اسی طرح مجھ کو اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ایک زمانہ حسینؑ سے محبت کرنیوالوں اور ان کا انتقام لینے والوں کا بھی آیا، جب راویوں نے وہ واقعات قلمبند کر ڈالے جن سے معرکۂ کربلا کے متعلق کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

امام زین العابدینؑ مدینہ میں

بعض راویوں کا بیان ہے کہ جب امام زین العابدینؑ مدینے کے قریب پہنچے تو آپ نے اپنی سواری رکوا کر ایک خیمہ نصب کروایا اور اس میں عورتوں اور بچوں کو اتارا گیا۔ آپ کے ساتھ بشیر بن جذیم تھا۔ آپ نے اس سے کہا کہ اے بشیر! اللہ تمہارے باپ پر رحم نازل کرے، وہ تو شاعر تھے، کیا تم بھی کچھ شعر کہہ لیتے ہو۔ اس نے کہا، جی ہاں! اے فرزندِ رسولؐ۔ تب آپ نے فرمایا کہ ذرا شہر میں جاؤ اور میرے والد بزرگوار ابو عبداللہ حسینؑ کی خبر شہادت لوگوں کو سنا دو۔ بشیر کہتا ہے کہ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چل پڑا۔ یہاں تک کہ مدینے میں داخل ہو گیا اور پھر مسجد نبویؐ کے قریب پہنچا، تب میں نے بلند آواز سے رو کر یہ اشعار پڑھنا شروع کیے:

> اے مدینے کے رہنے والو! یہ مقام تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے، کیونکہ حسینؑ قتل کر دیے گئے ہیں۔ پس تم مسلسل روتے رہو۔ انکا جسم مطہر کربلا میں خون آلود پڑا ہے اور سر اقدس نیزے پر پھرایا جا رہا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اے اہل مدینہ! علیؑ بن حسینؑ اپنی پھوپھیوں اور بہنوں کیساتھ

آکر تمہارے شہر کے باہر خیمہ زن ہو گئے ہیں۔ میں ان کا قاصد بن کر تم کو بتانے آیا ہوں۔ راوی کہتا ہے کہ مدینے میں کوئی پردہ نشین عورت ایسی نہ رہی جو پردہ سے باہر نہ نکل آئی ہو۔ بلکہ مدینے میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو باہر نہ نکلا ہو۔ تب وہ سب کے سب رو پیٹ رہے تھے۔

بشیر بن جذیم کہتا ہے کہ جب میں نے اہل مدینہ کو امام حسینؑ کی خبر شہادت سنا دی تو ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو شہر سے نکل نہ پڑا ہو۔ اس وقت میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور واپس ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ تمام راستے اور مقامات لوگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں گھوڑے سے اتر پڑا اور لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا امام علیؑ بن حسینؑ کے خیمہ پر جا پہنچا۔ جب لوگ آپ کے خیمے کے چاروں طرف جمع ہو گئے تو آپ باہر تشریف لائے۔ آپ ایک کپڑا لیے ہوئے تھے جس سے اپنے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔ ایک خدمت گار نے آپ کے لیے ایک کرسی لاکر رکھ دی۔ جس پر آپ جلوہ افروز ہو گئے لیکن آپ کے آنسو رو کے نہ رک رہے تھے۔ لوگ چیخ چیخ کر رو رہے تھے اور آپ کے والد بزرگوار کا پرسہ دے رہے تھے۔ آپ نے ان لوگوں کو خاموش ہو جانے کا اشارہ فرمایا اور کہنا شروع کیا: حمد ہے اس اللہ کے لیے جو ساری دنیاؤں کا پروردگار ہے۔ وہ رحمٰن اور رحیم ہے، یوم جزا کا مالک ہے۔ ساری کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ دور ہے ان معنی میں کہ اونچے آسمانوں کی طرح بلند مرتبہ ہے۔ وہ قریب ہے ان معنی میں کہ سرگوشی تک بھی سن لیتا ہے۔ ہم اس کی حمد کرتے ہیں بڑے معاملات پر، زمانہ کی ڈالی ہوئی مصیبتوں پر، مصیبتوں کی تکلیفوں پر، سختیوں کی چیخ و پکار پر، عظیم تباہیوں پر۔ بڑی مشکلوں پر جو تباہ کرنے والی، ایذا پہنچانے والی، ہمہ گیر اور وسیع ہیں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا: اے لوگو! اللہ نے جو سزاوار حمد ہے ہم کو بڑی آزمائش میں مبتلا کیا، جب کہ اسلام میں سخت رخنہ پڑ گیا تھا۔ ابو عبداللہ حسینؑ اور ان کے بیٹوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا گیا۔ ان کے سر اقدس کو نیزہ کی انی پر رکھ کر شہر بہ شہر پھرایا گیا۔ یہ ایک ایسی مصیبت ہے جس کے مثل کوئی اور مصیبت نہیں ہے۔

اے لوگو! کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو ان کے قتل ہو جانے کے بعد خوش رہ سکے۔ کونسا دل ہے جو ان کی وجہ سے غم زدہ نہ ہو۔ تم میں سے کس کی آنکھ ہے جو اپنے آنسوؤں کو روک

سکے اور گریہ کو دبا سکے۔ کونسا دل ہے جو ان کے قتل پر بے چین نہ ہو۔ کونسا دل ہے جو ان کے لیے نہ پسیجے اور کونسا کان ہے جو اسلام میں اس دراڑ کے پڑ جانے کو سنے اور بہرا نہ ہو جائے۔

اے لوگو! ہم وطن سے نکالے گئے۔ دربدر کیے گئے اور شہر بہ شہر ہنکائے گئے۔ اپنے گھر سے اور اپنے شہروں سے دور کر دیے گئے، جبکہ نہ ہم نے کوئی جرم کیا تھا نہ کوئی ناجائز فعل کیا تھا۔ نہ اسلام میں کوئی رخنہ ڈالا تھا۔ ہم نے ایسی بات اپنے پیشرو آباؤ اجداد میں کبھی نہ سنی تھی۔ یہ نئے افتراء کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ قسم بخدا! اگر رسول اکرمؐ ان لوگوں کو ہمارے قتل کی وصیت فرماتے، جیسے آنحضرتؐ نے ان کو ہمارے حق میں وصیت فرمائی تھی تو یہ لوگ اس حد تک زیادتی نہ کرتے۔ پس ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔ ہم اس عظیم مصیبت سے گزر کر، جو کیسی عظیم ہے، کیسی دکھ پہنچانے والی ہے، کیسی کچل ڈالنے والی ہے، کیسی تلخ اور کیسی شدید ہے۔ پس جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے اور جو ہم نے کیا ہے، اس کا حساب ہم اللہ کے یہاں کریں گے کیونکہ اللہ ہی بڑا قدرت والا اور انتقام لینے والا ہے۔

آپ کی تقریر نے اس مجمع کے دلوں میں رنج و غم کی لہر دوڑا دی جو آپ کے چاروں طرف اکٹھا ہو گیا تھا۔ سارا علاقہ رونے اور چیخنے کی آوازوں سے تھرا اٹھا۔ مسلمانوں نے اس شدید صدمے کی تلخی محسوس کی، جس نے اسلامی معاشرے کو ہلا ڈالا تھا۔ اس نے ان کو اپنی اس عظمت کے دفاع کی خاطر جس پر ہر طرف سے خطرے گھبرا ڈال رہے تھے۔ ان سے مقابلہ کرنے کے لیے ان کی رگوں میں نئی لہریں، ان کے ضمیروں میں نئی چنگاریاں پیدا کر کے ان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اب ہر مسلمان کے ضمیر میں احساس گناہ پیدا ہوا اور اس نے سوچا کہ جب حسینؑ نے ہم سے مدد طلب فرمائی تھی تو ہم نے آپ کی مدد نہ کی، آپ کی پکار کو سنا اور اس پر لبیک نہ کہا۔ چنانچہ اس کے بعد اسلامی معاشرے میں وقتاً فوقتاً مسلح تحریکیں اٹھنے لگیں، جن کو وہ لوگ برپا کر رہے تھے جن میں احساسِ خطا و تقصیر پیدا ہو گیا تھا اور جنہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ حسینؑ جو رسول اکرمؐ کے چمن کے پھول تھے، ان کے قتل کیے جانے اور ان کی عورتوں کے قیدی بنائے جانے کے بعد سے ہر مسلمان کی آبرو یزید بن معاویہ اور اُمویوں کے قدموں کے نیچے آن پڑی تھی۔ چنانچہ امام حسینؑ کی شہادت کے تین ہی سال کے اندر اندر یزید بن معاویہ کے خلاف توابین، مختار ثقفی اور مدینہ اور اس کے اطراف کے مسلمانوں کی تحریکیں

اٹھیں۔آپ ہی کی شہادت ان تحریکوں کے برپا کرنے والوں کو آنچ بہم پہنچاتی رہی اور ان کو آپ کی نصرت سے کنارہ کش رہنے اور ظالموں اور ان کے ساتھیوں کے سامنے جھک جانے کی بجائے ـــــــ موت کا مقابلہ کرنے کی قوت بخشتی رہی۔اس کے بعد اموی حکومت کے خلاف انتقام لینے والوں کا سلسلہ جاری رہا جن کی قیادت معرکۂ کربلا کے بلند مقاصد ہی کر رہے تھے، جن کی بدولت یہ لوگ جس امر کو حق خیال کرتے تھے اس کے لیے قربانیاں دیتے رہے اور اس کے لیے پوری قوت سے کوشاں رہے، یہاں تک کہ کربلا میں امام حسینؑ اور آپ کے عظیم صحابیوں پر گزرنے والے مصائب کی بدولت اموی حکومت کی بنیادیں اکھڑ گئیں اور اس کی بجائے عباسی حکومت قائم ہو گئی۔ پھر بھی ظلم وجور اور فساد کے خلاف وہ تحریکیں جن کی قیادت کربلا کی روح کر رہی تھی دسیوں بلکہ سیکڑوں سال تک پیہم جاری رہیں۔

اپنی اس تقریر کو تمام کرنے کے بعد امام زین العابدینؑ مدینے میں داخل ہوئے جبکہ آپ اپنے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اہل مدینہ پر غم واندوہ کے باعث وحشت طاری ہو گئی ہے اور آپ کے اہل خاندان کے مکانات خالی پڑے اپنے رہنے والوں کا ماتم کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ اپنے قیام کے ابتدائی سالوں میں لوگوں سے کنارہ کش رہے اور دنیا کی کسی شے میں دلچسپی نہ لیتے تھے۔صرف اپنے والد بزرگوار اور اپنے بھائیوں پر رویا کرتے تھے جو ان کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ محدثین نے آپ کا شمار رونے والوں میں کیا ہے کیونکہ آپ اپنے والد بزرگوار پر بیس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے تک گریہ کرتے رہے۔

حلیۃ الاولیاء میں بہ سند ابو حمزہ ثمالی امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: علیؑ بن حسینؑ سے آپ کی کثرت گریہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: مجھ کو کچھ نہ کہا کرو، کیونکہ یعقوبؑ پیغمبر کی اولاد میں سے صرف یوسفؑ ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔اس پر وہ اس قدر روئے کہ ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں جبکہ میں نے کربلا کی ریتی پر اپنے گھر کے چودہ افراد کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کا غم میرے دل سے مٹ سکتا ہے؟

ابن شہر آشوب نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ امام سجادؑ کے سامنے جب بھی کھانا رکھا جاتا، آپ رونے لگتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے ایک غلام نے کہا:

میں آپ پر فدا ہو جاؤں، اے فرزند رسولؐ! مجھ کو خوف ہے کہ اس شدید گریہ میں آپ جان سے گزر جائیں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا: میں اپنے رنج و غم کا حال اپنے اللہ سے بیان کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے مجھ کو وہ چیز معلوم ہے جو تم نہیں جانتے ہو۔ میں جب بھی بنی فاطمہؑ کے قتل ہونے کو یاد کرتا ہوں روتے روتے میرا سانس رکنے لگتا ہے۔

شیخ صدوق نے خصال میں روایت کی ہے کہ آپ اپنے والد بزرگوار حسین مظلومؑ پر بیس سال تک روئے۔ ایک غلام نے آپ سے کہا: سانحہ کربلا پر طویل مدت گزر چکی ہے۔ اب تو آپ کا غم ختم ہو جانا چاہیے۔ اس پر آپ نے فرمایا: وائے ہو تجھ پر۔ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے اللہ نے صرف یوسفؑ کو ان کے سامنے سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ پس ان پر روتے روتے ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، بال سفید ہو گئے اور غم کے بوجھ سے کمر خمیدہ ہو گئی تھی، حالانکہ وہ بیٹا دنیا میں زندہ و موجود تھا۔ جبکہ میں نے اپنے چاروں طرف اپنے باپ، چچا اور اپنے خاندان کے سترہ افراد کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر میرا رنج کیسے ختم ہو سکتا ہے۔

یہ بات راویوں میں اور ان تمام لوگوں میں مشہور تھی جنہوں نے آپ کی سیرت اور تاریخ پر قلم اٹھایا ہے۔ اس لگاتار رونے کے ساتھ ساتھ آپ کوئی مناسب موقع کبھی نہ چھوڑتے تھے جس میں کربلا میں اپنے والد بزرگوار اور اپنے گھرانے پر گزرے ہوئے حالات کا ذکر نہ کرتے ہوں۔ چنانچہ آپ مدینے میں قصابوں کے بازار سے گزرتے تو رک کر ان سے دریافت کرتے کہ کیا انہوں نے ذبح کرنے سے پہلے بکری کو پانی پلا لیا ہے؟ جب آپ ان کو یہ کہتے ہوئے سنتے کہ ہم لوگ کسی جانور کو پانی پلائے بغیر ذبح نہیں کرتے ہیں خواہ وہ تھوڑا سا ہی ہو، تب آپ رو کر فرماتے: ہائے! ابو عبداللہ عالم مسافرت میں پیاسے قتل کر دیے گئے۔ آپ کے گریہ کرنے سے سب لوگ رونے لگتے۔ یہاں تک کہ رونے کی آوازیں بلند ہو جاتیں اور لوگ آپ کے پاس جمع ہو جاتے۔

آپ کو راستے میں کوئی مسافر مل جاتا تو آپ اس کو اپنے گھر کھانے پر بلا لیتے اور رو کر فرماتے: ہائے! ابو عبداللہؑ میدان کربلا میں عالم مسافرت میں بھوکے پیاسے قتل کر دیے گئے۔ نیز آپ اپنے والد بزرگوار کے قتل کے بعد کے ابتدائی سالوں میں ایسی تدبیریں اختیار فرماتے تھے جن سے لوگوں کے ذہنوں میں ظالموں سے دشمنی کے علاوہ یزید اور اس کی حکومت سے نفرت پیدا ہو تاکہ وہ مناسب وقت پر راہ حق میں قیام کے لیے تیار رہیں۔ آپ کی پھوپھی زینب کبریٰؑ

آپ کی ایسی سیاسی تدابیر میں برابر شریک رہتی تھیں جو غم واندوہ کے اظہار کی راہ سے عوام کے جذبات میں ہیجان پیدا کرتیں اور یزید اور اس کی حکومت کے خلاف ان کے غم و غصے کو ابھارتی تھیں۔ چنانچہ مدینے کے لوگوں پر رنج و غم کی ایسی فضا طاری ہوگئی جس سے کسی وقت بھی کوئی نئی صورت پیدا ہوسکتی تھی۔ چنانچہ مدینے میں یزید بن معاویہ کے سب سے بڑے اہلکار عمرو بن سعید الاشدق نے یزید کو ایک خط لکھا اور اس پر واضح کر دیا کہ عقیلۂ بنی ہاشم زینبؑ بنت علیؑ کے طرز عمل سے اس کو اور اس کے تخت کو کیا خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

اس خط میں یہ بھی تھا کہ ان کا وجود اہل مدینہ کے جذبات کو ابھار رہا ہے کیونکہ وہ فصیحہ بھی ہیں اور عاقلہ بھی ——— نیز وہ معاملات میں باریک نظر رکھنے والی ہیں پس انہوں نے اپنے بھائی حسینؑ کے خون کا بدلہ لینے کی ٹھان رکھی ہے۔ اس کے جواب میں یزید نے عمرو بن سعید اشدق کو حکم دیا کہ وہ ان کے افعال پر پابندی لگادے اور ان کے اور لوگوں کے درمیان تفرقہ پیدا کر دے[1]

ظاہر ہے کہ جناب زینبؑ کی تحریک اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ نوحہ و بکاء کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں کو یزید اور اس کی ظالمانہ حکومت کے خلاف اٹھنے کے لیے آمادہ کریں، کیونکہ امام حسینؑ کے قتل کے بعد یہ حکومت کسی کے لیے باعث خوف نہ رہی تھی۔ چنانچہ آپ کے بیٹے امام زین العابدینؑ اور آپ کی بہن زینب لوگوں کے ذہنوں کو تحریک کے لیے آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ البتہ وہ لوگ اس کے لیے مناسب موقع تلاش کر رہے تھے۔

امام حسینؑ کی شہادت سے پیدا ہونیوالی انقلابی تحریکوں پر ایک نظر

بعض راویوں کا بیان ہے کہ مدینے کے گورنر عثمان بن محمد بن ابی سفیان نے اہل مدینہ کا ایک وفد یزید بن معاویہ کے پاس بھیجا، جس میں عبداللہ بن حنظلہ انصاری (غسیل الملائکہ) عبداللہ ابی عمرو بن حفص بن مغیرہ مخزومی، منذر بن زبیر اور مدینہ کے چند باعزت افراد شامل تھے۔ یہ لوگ یزید بن معاویہ کے پاس پہنچے تو اس نے ان کی مدارات کی، ان کے ساتھ اچھا سلوک

---

[1] زینب الکبریٰؑ از جعفر نقدی صفحہ ۱۲۰-۱۲۲، بطلۂ کربلا از ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی

کیا اور ان کو بڑے بڑے انعامات دیے لیکن انھوں نے دیکھا کہ یزید اخلاق، دین اور تمام مذہبی قدروں، نیز مقدس چیزوں کی تذلیل کرتا تھا۔ پس جب وہ مدینہ واپس آئے تو انھوں نے اہل مدینہ کے سامنے یزید کا دین کے ساتھ ذلت آمیز سلوک، اسکی بدکاریاں اور بے حیائیاں بیان کیں اور خود کو اس کی بیعت اور اطاعت سے آزاد قرار دیدیا۔ اس کے خلاف ان کے اس غیظ و غضب کا نمایاں ترین سبب امام حسینؑ کا قتل تھا۔ جیسا کہ مسعودی جیسے مؤرخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، حتیٰ کہ عام لوگوں کے ذہنوں کو یزید اور اس کے گھرانے کے خلاف دشمنی اور نفرت سے بھرے ہوئے دیکھ کر علویوں کے دشمن اپنی مصلحتوں کے تحت اس سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے لگے۔ چنانچہ طبری نے اپنی تاریخ میں، ابن اثیر نے کامل میں اور ابن کثیر نے بدایہ و نہایہ میں کہا ہے: ۶۱ھ میں جب امام حسینؑ قتل ہوگئے تو عبداللہ بن زبیر نے اہل مکہ کے درمیان کھڑے ہو کر تقریر کرتے ہوئے آپ کی شہادت کو ایک عظیم واقعہ قرار دیا، پھر تمام اہل عراق اور خاص طور پر اہل کوفہ کو ملامت کی اور آپ کو قتل کرنے والوں پر لعنت کی۔ انہوں نے کہا کہ اہل عراق دھوکہ دینے اور گناہ کرنے والے ہیں اور ان میں سے اہل کوفہ بدترین افراد ہیں۔ انہوں نے حسینؑ کو دعوت دی کہ ہم آپ کی نصرت کریں گے اور آپ کو اپنا حاکم بنالیں گے لیکن جب آپ وہاں گئے تو ان لوگوں نے آپ کو گھیر لیا اور کہا کہ یا تو آپ اپنے آپ کو ہمارے حوالہ کردیں، تاکہ ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس بھیج دیں اور وہ آپ کے بارے میں فیصلہ کرے۔ ورنہ آپ ہم سے جنگ کیجیے۔ قسم بخدا! جب آپ کے اصحاب نے دیکھ لیا کہ وہ ایک بڑی تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ اللہ نے کسی کو یہ علم غیب نہیں دیا ہے کہ وہ قتل ہونے والا ہے لیکن حسینؑ نے ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دی۔ اللہ حسینؑ پر رحم فرمائے اور ان کے قاتل کو ذلیل کرے۔ ہائے! ان لوگوں نے حسینؑ کو قتل کر ڈالا، جو رات میں دیر دیر تک نمازوں میں مصروف رہتے اور بیشتر دنوں میں روزہ رکھتے تھے۔ انہوں نے قرآن کی تلاوت کی بجائے موسیقی اور روزہ داری کی جگہ شراب خوری کو اختیار نہیں کیا تھا، جیسا کہ یزید بن معاویہ کرتا تھا۔ مختلف طریقوں سے اسی طرح امام حسینؑ کے قتل پر غم و اندوہ کا اظہار کیا کرتے اور ان کے قتل کا حکم دینے والے (یزید) کے خلاف لوگوں کو ابھارا کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ یزید کے خلاف اہل مدینہ کے سینے غصے سے بھر گئے۔ پھر امام سجادؑ اور جناب زینبؑ

کے طرزِ عمل نے ان لوگوں کو اور بھی متنفر کر دیا۔ نیز ان کی ایک جماعت یزید کے پاس گئی، حالانکہ اس نے ان کی عزت کی، ان کو دل کھول کر رقمیں دیں اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا۔ پھر بھی ان لوگوں نے واپس آکر اس کی بیعت توڑ ڈالی۔ چنانچہ عبداللہ بن حنظلہ نے کہا کہ میں تمہارے پاس ایسے آدمی سے مل کر آیا ہوں کہ اگر میرے ساتھ میرے ان بیٹوں کے علاوہ کوئی اور شخص نہ بھی ہو، تب بھی میں اس سے ضرور جنگ کروں گا۔ اگرچہ اس نے میری عزت کی اور مجھ کو بہت سارا مال بھی دیا ہے، لیکن میں نے اس کا یہ مال صرف اپنی قوت بڑھانے کے لیے لیا ہے۔

یزید بن معاویہ کے پاس جانے والے وفد میں منذر بن زبیر بھی شامل تھے۔ انہوں نے کہا: یزید نے مجھ کو ایک لاکھ کی رقم دی ہے، لیکن اس کا یہ انعام بھی مجھ کو اس کے بارے میں تم لوگوں کو صحیح صحیح اطلاع دینے سے باز نہیں رکھ سکتا، کیونکہ میرا فرض ہے کہ میں تم لوگوں کو اس کے متعلق خبر دوں اور اس کے حالات تمہیں سچ سچ بتا دوں۔ قسم بخدا! وہ بکثرت شراب پیتا ہے۔ وہ نشہ میں اس قدر چور ہو جاتا ہے کہ نماز گنوا دیتا ہے۔ اور وہ تو سارے ہی ناجائز افعال کا ارتکاب کرتا ہے۔ حتٰی کہ حرام عورتوں کو حلال سمجھ کر اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ پھر وفد کے دوسرے اراکین نے بھی اسی سے ملتی جلتی باتیں کہیں۔

تاریخ خمیس کی دوسری جلد میں ہے کہ اہل مدینہ نے امام حسینؑ کو قتل کرنے اور اس کی دوسری بدکاریوں کے باعث یزید کی بیعت توڑ ڈالی اور اس کے دشمن بن گئے۔ مسعودی کی روایت کے مطابق اہل مدینہ نے عبداللہ بن حنظلہ اور عبداللہ بن مطیع کو اپنے اوپر حاکم قرار دے کر یزید کے گورنر عثمان بن محمد بن ابی سفیان کو نکال باہر کیا۔ نیز بنی امیہ کو مروان کے گھر میں محبوس کر دیا اور پھر ان کو مدینے سے نکال دیا۔ یہ واقعہ ۶۳ھ کا ہے۔ محمد بن علی بن طباطبا عرف ابن طقطقی کی کتاب الفخری کے صفحہ ۱۰۳ پر ہے کہ اہل مدینہ نے امام حسینؑ کے قتل کے بعد ۶۲ھ میں یعنی آپ کے قتل کے ایک سال بعد یزید کے خلاف تحریک کھڑی کر دی۔

اسی سال واقعہ حرّہ ہوا۔ یہ مدینے کے باہر ایک مقام ہے۔ جب مروان اور دیگر بنی امیہ شام کی طرف چلنے لگے تو انھوں نے اپنے اہل و عیال کو مدینہ میں چھوڑ دیا۔ چنانچہ مروان بن حکم نے عبداللہ بن عمر سے بات کی کہ وہ اپنے عیال ان کی حفاظت میں چھوڑ جائے لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ تب اس نے امام علیؑ بن حسینؑ سے کہا اور آپ اس پر رضامند ہو گئے۔ چنانچہ مروان

کے گھر والے آپ کی حفاظت میں رہے تا اینکہ وہ معرکہ ختم ہو گیا۔ جب یزید کو معلوم ہوا کہ اہل مدینہ نے کیا سے کیا کر ڈالا ہے تو اس نے مسلم بن عقبہ مری کی قیادت میں ایک لشکر روانہ کیا۔ جب یہ لشکر حرہ پہنچا تو اہل مدینہ عبداللہ بن حنظلہ کی قیادت میں لڑنے کے لیے نکلے۔ طرفین میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں لشکر شام کو غلبہ حاصل ہوا۔ پس عبداللہ نے اپنے آٹھوں بیٹوں کو آگے بڑھایا اور خود بھی ان کے ساتھ قتل ہو گئے۔

مسعودی مروج الذہب میں کہتے ہیں: اس معرکہ میں آدمیوں کی بہت بڑی تعداد ماری گئی۔ جن میں بنی ہاشم، قریش، انصار اور باقی تمام لوگ شامل تھے۔ وہ مزید کہتے ہیں: ان میں آل ابوطالب میں سے دو افراد یعنی عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب اور جعفر بن محمد بن علیؑ بن ابی طالب مارے گئے۔ آل ابوطالب کے علاوہ بنی ہاشم میں سے فضل بن عباس بن ربیعہ بن حرث بن عبدالمطلب، حمزہ بن عبداللہ بن نوفل بن حرث بن عبدالمطلب اور عباس بن عتبہ بن ابی لہب اور کچھ اور پر لوے افراد قریش کے۔ اتنے ہی انصار اور عوام الناس میں سے چار ہزار جو شمار میں آئے۔ انؑ کے علاوہ اور بھی ہیں جن کا پتا ہی نہیں چلا۔ پھر لوگوں نے اس امر پر بیعت کی کہ وہ سب یزید کے غلام ہیں۔ جس کسی نے اس سے انکار کیا وہ مسلم بن عقبہ کے حکم سے تہ تیغ کر دیا گیا، سوائے علیؑ بن حسینؑ اور علی بن عبداللہ بن عباس کے۔ اس پر وہ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ علیؑ بن حسینؑ رسول اکرمؐ کی قبر مطہر پر پناہ گزین ہیں تو وہ آپ کو مسلم بن عقبہ کے پاس لے آئے، جبکہ وہ غصے میں بھرا تھا اور آپ پر اور آپ کے آباءِ کرامؑ پر لعنت کر رہا تھا لیکن جب اس نے آپ کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو کانپ گیا اور کھڑے ہو کر آپ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ پھر بولا: اپنی حاجت مجھ سے بیان فرمائیے لیکن آپ نے کوئی حاجت ظاہر نہیں کی۔ البتہ جو کوئی قتل کیے جانے کے لیے لایا جاتا آپ اس کی سفارش کر دیتے تھے۔ پھر آپ اس کے پاس سے چلے گئے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس نے آپ سے کہا: غالباً آپ کے گھر والے پریشان ہوں گے۔ آپ نے فرمایا، بخدا یقیناً، تو اس نے اپنا گھوڑا منگوایا، اس پر زین کسوائی اور آپ کو اس پر روانہ کر دیا۔

مسعودی کا بیان ہے کہ جب علیؑ بن حسینؑ اس کے پاس سے چلے گئے تو لوگوں نے

اس سے کہا کہ ہم دیکھ رہے تھے کہ تمہارے ہونٹ ہل رہے تھے۔ بتاؤ اس وقت تم کیا کہہ رہے تھے۔
اس نے کہا: میں یہ کہہ رہا تھا کہ اے میرے اللہ! سات آسمانوں اور جو کچھ ان کے زیر سایہ ہے سات زمینوں اور جو کچھ ان کے اوپر ہے، اے ان سب کے پروردگار! اے باعظمت عرش کے پروردگار! اے محمدؐ اور ان کی آل پاک کے پروردگار! میں ان کے حق میں شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور تیری حمایت میں ان سے ملاقات کرتا ہوں۔ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھ کو ان کے ساتھ بھلائی کی توفیق عطا کر اور ان کے ساتھ برائی سے مجھ کو محفوظ رکھ۔

لوگوں نے مسلم بن عقبہ سے کہا: ہم نے دیکھا کہ تم ان صاحبزادے کو اور ان کے اسلاف کو برا کہہ رہے تھے لیکن جب ان کو تمہارے پاس لایا گیا تو تم نے ان کی عزت کی! اس پر وہ بولا: اس وقت میرا ارادہ سلب ہو گیا تھا اور میرے دل پر ان کا رعب چھا گیا تھا۔

طبری کی روایت میں ہے کہ یزید بن معاویہ نے مسلم بن عقبہ کو امام علیؑ بن حسینؑ کے بارے میں ہدایت کر دی تھی۔ چنانچہ مروان اور اس کے بیٹے عبدالملک کی معیت میں جب آپ اس کے پاس پہنچے تو اس نے آپ کو دیکھ کر کہا: آپ ان دونوں کے ساتھ میرے پاس آئے ہیں۔ بخدا اگر معاملہ انہی دونوں پر ہوتا تو میں آپ کو ضرور قتل کرتا لیکن امیر یزید نے مجھ کو آپ کے بارے میں وصیت کر دی ہے۔ میرے نزدیک وہی آپ کے لیے فائدہ مند رہی نہ کہ آپ کا ان دونوں کے ساتھ آنا۔

کچھ بعید نہیں ہے کہ یزید نے مسلم بن عقبہ کو علویین کے ساتھ اچھے سلوک کی ہدایت کی ہو۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بھلائی کرنا چاہتا تھا یا کسی کی بھلائی چاہتا تھا، نہ اس لیے کہ وہ محمد رسول اللہؐ یا امام علیؑ کی اولاد میں سے کسی کی زندگی کا خواہشمند تھا بلکہ اس لیے کہ اس کو اپنے اس ظلم کا شدید احساس ہو گیا تھا جو اس نے امام حسینؑ اور ان کی اولاد پر کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے تخت کو ہر طرف سے خطرہ ہی خطرہ ہے کیونکہ اس کی ساری مملکت میں خون حسینؑ کے انتقام کی آوازیں گونج رہی ہیں جن پر ہر طرف سے لبیک کہا جا رہا ہے۔
اہل مدینہ کی تحریک بھی کربلا میں حسینؑ اور ان کی اولاد کی شہادت کے باعث برپا ہوئی تھی۔
اس کے بعد بھی اس ظالم اموی حکومت کے خلاف مزید تحریکیں اٹھنے والی تھیں، جن کی بنیاد حسینؑ کے وہ اصول تھے جن کے لیے وہ شہید ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد

یزید بن معاویہ کو ان سب باتوں کا احساس ہو گیا تھا۔ ان تلخ نتائج کے بعد غالباً اس کو اپنے باپ کی اس وصیت کا راز بھی معلوم ہو گیا ہو گا، جس میں اپنی موت سے قبل انہوں نے کہا تھا کہ اہل کوفہ امام حسینؑ کو صرف اس لیے بلائیں گے کہ وہ ان کو بنی امیہ کے خلاف کھڑا کر دیں۔ پس اگر تم کو ان پر غلبہ حاصل ہو جائے تو ان کو کوئی گزند نہ پہنچانا، کیونکہ ان کے ساتھ تمہاری قرابتداری ہے۔

معاویہ اپنے بیٹے یزید سے نہ تو ذہنی طور پر زیادہ کشادہ تھے اور نہ ان کا دل اس سے زیادہ پاکیزہ تھا۔ نہ معاویہ اور ان کے باپ یا ان کے گھرانے نے، اسلام کے خلاف ان پہلے معرکوں میں قرابتداری کا کوئی لحاظ کیا تھا جو نبیؐ اکرمؐ اور علیؑ بن ابی طالب کے ساتھ ہوتے رہے تھے۔ ابھی جنگ احد میں حمزہ بن عبدالمطلب کے ساتھ ہندہ اور ابوسفیان کا برا سلوک ذہنوں سے محو نہ ہوا تھا لیکن معاویہ اپنے بیٹے کے مقابلے میں واقعات کے نتائج کے بارے میں زیادہ دور اندیش اور ان کا احساس رکھنے والے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے مقاصد کو آسان ترین طریقوں سے حاصل کرنے کے خواہشمند رہتے تھے۔

پس یہ بعید نہیں ہے کہ یزید بن معاویہ نے اپنے جرنیل مسلم بن عقبہ کو علیؑ بن حسینؑ کے حق میں ہدایت کر دی ہو کیونکہ معرکہ کربلا کے بعد جا بجا لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، وہ بھی جن پر حسینؑ کا وجود اس سے کچھ زیادہ ناگوار تھا جتنا کہ یزید بن معاویہ کے لیے تھا۔ وہ بھی آپ پر روتے اور لوگوں کو یزید اور دوسرے امویوں کے خلاف ابھارتے رہتے تھے۔ بہرحال امام علیؑ بن حسینؑ اور ان کے اہل خاندان اور وہ لوگ جو آپ کے گھر میں پناہ گزین ہو گئے وہ سب مسلم بن عقبہ کے مظالم سے محفوظ رہے۔ راویوں کا بیان ہے کہ چار سو سے زیادہ خاندان علیؑ بن حسینؑ کی پناہ میں آ گئے تھے۔

زمخشری کی ربیع الابرار میں ہے کہ جب یزید بن معاویہ نے مسلم بن عقبہ کو اہل مدینہ سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا تو امام زین العابدینؑ نے چار سو عورتوں، ان کے بچوں اور نوکروں وغیرہ کو اپنی کفالت میں لے کر اپنے عیال میں شامل فرما لیا۔ آپ ان کے اخراجات اس وقت تک برداشت فرماتے رہے جب تک مسلم بن عقبہ کا لشکر مدینہ سے چلا نہیں گیا۔ ان میں سے ایک عورت قسم کھا کر بیان کرتی تھی کہ میں نے اپنے باپ کے گھر میں بھی اتنا چین اور آرام نہ پایا تھا جتنا کہ علیؑ بن حسینؑ کے گھر میں پایا۔

ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ تاراجیٔ مدینہ میں انصار و مہاجرین میں سے مرنے والوں کی تعداد ایک ہزار سات سو تک پہنچ گئی تھی جبکہ عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر دیگر مقتولین کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی۔ وہ مزید کہتے ہیں: مسلم بن عقبہ کے لشکر کا ایک آدمی ایک انصاری عورت کے پاس پہنچا، جو زچگی کی حالت میں اپنے بچے کو لیے ہوئے تھی، وہ بولا: کچھ مال ہے؟ اس نے کہا۔ نہیں بخدا ہمارے پاس لوگوں نے کچھ نہیں چھوڑا۔ تب وہ بولا: مجھ کو کچھ نہ کچھ نکالکر دے، ورنہ میں تجھ کو اور تیرے بچے کو مار ڈالوں گا۔ اس نے کہا، وائے ہو تجھ پر یہ ابوکبشہ انصاری کا بیٹا ہے جو رسول اللہؐ کے صحابی ہیں۔ اس شخص نے اس بچے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا جب کہ پستان اس کے منہ میں تھا، پھر اسے دیوار سے دے مارا جس سے اس کا بھیجا زمین پر بکھر گیا۔

جنگ کے دوران اور خاص کر ان تین دنوں میں جبکہ مسلم بن عقبہ نے مدینہ کو قتل عام کے لیے مباح قرار دیدیا تھا، مدینہ کے لوگوں میں سے کوئی عورت یا مرد اہل شام کے لشکر سے محفوظ نہیں رہا، سوائے اس کے جو بھاگ گیا ہو یا جس نے علیؑ بن حسین کے گھر میں پناہ لے لی ہو۔

ادھر یزید بن معاویہ مدینہ میں خروج کرنے والوں کا پیچھا کر رہا تھا۔ ادھر کوفہ کے توابین یزید اور اس کے ساتھیوں پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے اس المیہ کی تلخی اس وقت سے محسوس کرنا شروع کر دی تھی جب امام زین العابدینؑ نے ان لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے غم و اندوہ کا بیان فرمایا تھا جو کوفہ کی سڑکوں پر سرہائے شہداء اور قیدیوں کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ نے اہل کوفہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> اے لوگو! میں تم کو اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ تم نے میرے والد بزرگوار کو خط لکھے اور پھر ان کو دھوکا دیا۔ تم نے ان سے عہد و پیمان کیا اور پھر انہی سے جنگ کی۔ کتنی بری ہے تمہاری رائے اور کتنے برے ہیں وہ اعمال جو اپنے لیے تم نے آگے بھیجے ہیں۔ تم رسول اللہؐ کی طرف کس طرح نظر اٹھا سکو گے، جب آنحضرتؐ تم سے فرمائیں گے: تم نے میری عترت کو قتل کر ڈالا اور میری حرمت کو برباد کر ڈالا۔ پس تم میری امت میں سے نہیں ہو۔

راوی کہتے ہیں کہ اس پر ہر طرف سے لوگوں کے رونے کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور وہ سب ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے: تم ہلاک ہو گئے اور تم کو اس کی خبر بھی نہیں ہے

جناب زینبؑ بنت علیؑ نے ان لوگوں کو روتے اور واویلا مچاتے دیکھ کر فرمایا: بخدا! اب تم روؤ گے بہت اور ہنسو گے کم، کیونکہ تم سے بہت ذلت اور بے حیائی کا کام ظاہر ہوا ہے جس کی کالک کو کبھی دھو نہ سکو گے۔ ہاں! تم خاتم الانبیاءؐ کے نواسے اور سردارِ جوانانِ جنت کے داغ کو دھو بھی کیسے سکتے ہو؟

راویوں کا بیان ہے کہ ان واقعات کے بعد کوفہ کے لوگ باہم ملے اور ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہائے افسوس کہ ہم نے اپنے نبیؐ کی بیٹی کے بیٹے کو بلایا اور وہ ہمارے ہاں آ کر قتل ہو گئے کیونکہ ہم نے ان سے اپنی جانوں کو چرایا۔ نہ زبان سے ان کی حمایت کی، نہ اپنے ہاتھ پاؤں سے ان کی مدد کی، نہ اپنے مال سے ان کو سہارا دیا۔ اب اللہ کے سامنے اور نبی اکرمؐ سے ملاقات کے وقت ہمارے پاس کیا عذر ہو گا؟ نہیں! بخدا! اس کے علاوہ کوئی عذر نہیں ہو سکتا کہ ہم ان کو قتل کرنے والوں کو قتل کر ڈالیں یا اس کوشش میں خود قتل کر ڈالے جائیں۔ ممکن ہے کہ اس طرح اللہ ہماری توبہ قبول کر لے۔

سلیمان بن صرد خزاعی نے کہا: پہلے تو ہم گردنیں اٹھا اٹھا کر اپنے نبیؐ کی آل کے آنے کا انتظار کرتے رہے اور ان کو فتح و نصرت کی امید دلا کر یہاں آنے کی دعوت دیتے رہے لیکن جب وہ آ گئے تو ہم ان سے بے نیاز ہو گئے اور بے عمل ہو کر صرف یہ دیکھتے رہے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے سامنے ہمارے نبیؐ کے فرزند ان کی نسل اور ان کے جگر کے ٹکڑے کو قتل کر دیا گیا۔ بس اٹھ کھڑے ہو کہ تمہارا پروردگار تم پر غضبناک ہے۔ اب اپنی عورتوں اور بچوں کے پاس ہرگز واپس نہ جاؤ تا اینکہ اللہ تم سے راضی نہ ہو جائے۔ میرے خیال میں وہ اس وقت تک راضی نہ ہو گا جب تک فرزند رسولؐ کے قتل ہو جانے کے عوض تم اپنے آپ کو مٹا نہ ڈالو گے یا تباہ نہ ہو جاؤ گے۔ انھوں نے مزید کہا: دیکھو موت سے ہرگز نہ ڈرنا۔ بخدا جو کوئی موت سے ڈرتا ہے وہ ذلیل ہو جاتا ہے۔

سلیمان بن صرد نے سعد بن حذیفہ بن الیمان اور دوسرے شیعوں کو مدائن میں اور مثنیٰ بن محربہ عبدی کو بصرہ میں خط لکھے اور امام حسینؑ کے خون کا انتقام لینے کے لیے بلایا۔

خود سلیمان اوران کے وہ ساتھی جو قتل حسینؑ کے وقت کوفہ میں تھے، تیاریاں کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک لشکر تیار ہو گیا جو تاریخ میں لشکر توابین کے نام سے مشہور ہے۔ ان لوگوں نے اپنی بات کو کسی سے پوشیدہ نہیں رکھا۔ بلکہ ہتھیار اور جنگ کی دوسری ضروریات خریدنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ ہر طرف اعلان کرتے جاتے تھے کہ اے اللہ! ہم دنیا نہیں چاہتے، نہ اس کے لیے فوج کشی کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم صرف خون حسینؑ کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی تحریک روز بہ روز ترقی کرنے لگی۔ خاص کر یزید بن معاویہ کی موت کے بعد یہ آواز کوفہ، بصرہ اور مدائن کے ہر گھر تک پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ سلیمان بن صرد اور ان کے ساتھیوں کی بیعت کرنے والوں کی تعداد سولہ ہزار تک پہنچ گئی۔

پھر جونہی ۶۵ ویں سال ہجری کا آغاز ہوا۔ "یَا لِثَارَاتِ الْحُسَیْنِ" (اے خون حسینؑ کا انتقام لینے والو!) کے نعرے سے بنی امیہ اوران کے ساتھیوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ لوگ مسلح ہو کر کوفہ کی گلیوں اور سڑکوں پر آگئے اور لوگوں کو کہنے لگے کہ حسینؑ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر خدا سے توبہ کریں اور اب حسینؑ کو قتل کرنے والے ظالموں سے انتقام لینے میں شریک ہو جائیں۔

شب جمعہ ۵ ربیع الثانی ۶۵ھ کو یہ لوگ کوفہ سے امام حسینؑ کے مزار کی طرف چلے۔ وہ یہ آیت تلاوت کرتے جاتے تھے:

فَتُوبُوٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ فَاقْتُلُوٓا اَنْفُسَکُمْ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ عِنْدَ بَارِئِکُمْ.

تم اپنے پروردگار کے سامنے توبہ کرو۔ پس اپنے آپ کو قتل کر ڈالو۔ یہ تمہارے پروردگار کے نزدیک تمہارے لیے بھلائی کا باعث ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۵۴)

قبر مطہر پر پہنچ کر سب کے سب رونے اور نوحہ کرنے لگے۔ وہاں ایک دن، رات ٹھہرے وہ کہتے تھے:

اے اللہ! ہم نے تیرے نبیؐ کی بیٹی کے بیٹے کو تنہا چھوڑ دیا۔ ہماری توبہ قبول کرلے اور ہماری مغفرت فرما۔ بیشک تو بڑا توبہ قبول کرنے اور رحم کرنیوالا ہے" نیز حسینؑ اور ان کے اصحاب پر رحمت نازل فرما" جو شہید ہوئے اور صدیقین میں شامل ہیں۔ خداوندا! ہم تجھ کو گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پر قائم ہیں جس پر

وہ قتل کیے گئے۔ اگر تو ہم کو نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم یقیناً گھاٹے میں رہیں گے۔

قبر مطہر سے رخصت ہو کر یہ لوگ شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ بہت سے ایسے لوگوں کو کوفہ میں ہی چھوڑ آئے جو کربلا کی جنگ میں شریک رہے تھے۔ اس وقت مروان بن حکم حکومت پر قابض ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے عبیداللہ بن زیاد کی قیادت میں شام سے ایک لشکر بھیجا تاکہ وہ کوفہ کی اس تحریک کو کچل دے۔ تب یہ دونوں لشکر عین الوردہ کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ پس یہ طالبین قصاص موت سے بے پروا ہو کر ایک طوفان کی مانند عبیداللہ ابن زیاد کے لشکر پر جھپٹ پڑے۔ پھر دونوں میں وہ شدید لڑائی ہوئی کہ قریب تھا کہ ابن زیاد اور اس کا لشکر ختم ہو جائے لیکن ان کو شام سے برابر کمک پہنچ رہی تھی۔ پھر بھی یہ لوگ کئی روز تک نبرد آزما رہے۔ حتٰی کہ ایک ایک کر کے وہ سب ہی اپنی جانوں سے گزر گئے۔

اعشٰی ہمدانی نے ان کے مرثیہ میں یوں کہا ہے:

اس کے بعد شام کی فوج ان کے مقابلے کے لیے آتی رہی جس طرح سمندر کی موجیں ہر طرف سے آتی ہیں۔ پھر بھی یہ لوگ ڈٹے رہے۔ یہاں تک کہ وہ سب حسینؑ ابن علیؑ پر نثار ہو گئے۔ حتٰی کہ میدان جنگ میں عماموں کے سوا کچھ باقی نہ بچا۔ یہ تمام اہل صبر وہاں مرے پڑے تھے اور ان پر ہوائیں ادھر سے ادھر چل رہی تھیں۔

یہ توابین توبہ اور تلافی کے شہیدوں کی حیثیت سے ختم ہو گئے لیکن اپنے پیچھے عزم اور صبر کی روشنی چھوڑ گئے جس کی لو ایک پشت سے دوسری پشت تک پہنچتی رہے گی۔

امیر مختار کی تحریک

۶۶ھ میں مختار کوفہ سے اٹھے اور انھوں نے انتقام خون حسینؑ کے لیے لوگوں کو ترغیب دینا شروع کی۔ وہ بڑے بڑے گروہوں اور مجمعوں میں واقعات کربلا بیان کرتے اور وہاں اہل کوفہ کے جرائم کو دہراتے رہتے تھے۔ چنانچہ شیعہ ان کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے بیت المال پر قبضہ کر کے اسے کوفہ والوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح آپ کا اقتدار جم گیا۔ پھر انھوں نے چاہا کہ دعوت کا یہ کام امام علیؑ بن حسینؑ

کے سپرد کر کے خاص کر شیعوں میں اپنی حیثیت کو مضبوط بنا لے۔ چنانچہ مختار نے آپ کو خط لکھا اور بہت سا مال بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی یہ پیشکش بھی کی کہ میں کوفہ میں آپ کی بیعت کر لوں گا اور لوگوں کو آپ کی جانب دعوت دوں گا۔

یہاں مؤرخوں کی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ امامؑ نے مال قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ بلکہ آپ نے مسجد نبویؐ میں لوگوں کے سامنے مختار کو برا کہا۔ چنانچہ آپ کی طرف سے مایوس ہونے پر اس نے آپ کے چچا محمد بن حنفیہ کو لکھا اور بیعت کی پیشکش کی۔ ابن حنفیہ نے امام زین العابدینؑ سے مشورہ لیا۔ آپ نے مشورہ دیا کہ بیعت کی پیشکش مسترد کر دیں اور جو مال مختار نے بھیجا ہے وہ قبول نہ کریں، بلکہ لوگوں پر اس کے عیب ظاہر کر کے اس سے برائت کا اظہار کریں۔ البتہ ابن عباس نے اس امر کو ترجیح دی کہ مختار کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار نہ کریں، ان سے رابطہ قائم رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے رہیں کہ ابن زبیر کا کیا حال ہوتا ہے کیونکہ وہ حجاز میں جم گئے تھے اور وہاں ان کا اقتدار مضبوط ہو چلا تھا۔ چنانچہ مسعودی وغیرہ کے بقول ابن عباس نے مختار کی بات کو تسلیم کر لیا اور اس کی برائی کے بارے میں سکوت کیا۔

یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو لیکن یہ بات بہر حال مسلّم ہے کہ مختار نے امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے والوں اور ان کے قاتلوں کا اس طرح پیچھا کیا کہ ان میں سے کوئی بچ نہیں سکا، سوائے اس کے جو کوفہ سے بھاگ کر شام جا پہنچا یا ابن زبیر سے جا ملا۔ مختار کے منادی نے کوفہ اور اس کے گرد و نواح میں اعلان کر دیا کہ جو کوئی اپنا دروازہ بند کرے گا اس کو امان مل جائے گی سوائے اس کے جو آل محمدؐ سے جنگ میں شریک رہا تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ حسینؑ سے لڑنے والوں اور ان کے قاتلوں کو پکڑ کر لائیں۔ جب وہ انہیں لا کر اس کے سامنے کھڑا کرتے تو وہ ان کے ساتھ وہی کچھ کرتا جو انھوں نے حسینؑ اور آپ کے اصحاب کے ساتھ کیا تھا۔

عمر بن سعد ڈرتے ڈرتے ہر لمحہ اپنی گرفتاری کا انتظار کر رہا تھا۔ چنانچہ مختار نے اس کی طرف ایک آدمی بھیجا جو اس کو قتل کر کے اس کا سر لے آیا۔ مختار نے اس سر پر نظر ڈالی جبکہ اس کا بیٹا حفص دربار میں موجود تھا۔ مختار نے حفص سے دریافت کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟

اس نے کہا: ہاں اور اب ان کے بعد زندگی میں کوئی لطف نہیں رہا۔ مختار نے کہا کہ تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ تم اس کے بعد زندہ رہو گے۔ پھر اس کے قتل کا حکم دیدیا اور اس کا سر بھی اس کے باپ کے سر کے برابر رکھوا دیا۔ پھر کہا کہ یہ حسینؑ کے لیے اور یہ علیؑ بن حسینؑ کے لیے لیکن ان میں کوئی برابری نہیں اور پھر رو پڑے۔ مزید کہا کہ بخدا اگر میں حسینؑ کے قصاص میں تین چوتھائی قریش کو بھی قتل کر ڈالوں تو بھی یہ ان کی ایک انگلی کے برابر نہ ہوگا۔ پھر مختار نے ان دونوں کے سر امام علیؑ بن حسینؑ کے پاس بھجوا دیے، بقولے محمد بن حنفیہ کے پاس بھجوائے۔

امام حسینؑ کے قاتلوں اور آپ سے جنگ کرنے والے جن لوگوں کو مختار نے تلاش کروایا، ان میں محمد بن اشعث بھی تھا۔ یہ کوفہ کے باہر ایک بستی میں رہتا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اس کی تلاش ہو رہی ہے تو وہ اپنے محل سے بھاگ گیا اور کوفہ سے بھاگنے والے دوسرے لوگوں کی مانند مصعب بن زبیر سے جا ملا۔ مختار نے اس کا مکان گروا کر اس کی مٹی اور پتھروں سے حجر بن عدی کا مکان بنوا دیا، جس کو عبیداللہ بن زیاد نے شیعوں کے گھروں کے ساتھ گروا دیا تھا۔

مختار، عبیداللہ بن زیاد کے گرفتار ہونے کے لیے گن گن کر دن کاٹ رہا تھا۔ جب اس کو خبر ملی کہ وہ ایک بڑا لشکر لیکر شام سے عراق کی طرف روانہ ہوا ہے اور موصل پہنچ کر اس پر قابض ہو گیا ہے تو اس نے ابراہیم بن اشتر کو کوفہ کے تجربہ کار اور آزمودہ کار شہسواروں پر مشتمل لشکر کے ساتھ ابن زیاد سے جنگ کے لیے روانہ کیا۔ یہ ۲۲ ذی الحجہ ۶۶ھ کا واقعہ ہے۔ دونوں لشکروں کا مقابلہ موصل کے قریب خاذر کے مقام پر ہوا۔ ان میں ایسی شدید جنگ ہوئی کہ تاریخ اسلام اس سے زیادہ خونریز جنگ سے واقف نہ ہو گی۔ اس دوران میں عبیداللہ ابن زیاد، ابراہیم بن اشتر کے مقابلہ پر آ گیا کیونکہ وہ ان کو پہچانتا نہ تھا۔ چنانچہ ابراہیم نے اس کو قتل کر دیا۔ اس پر تمام شامی سپاہی کھڑے ہوئے اور اپنے ہزاروں مقتولوں کو دریائے خاذر کے کنارے چھوڑ گئے۔ یہ شدید جنگ دس محرم ۶۷ھ کو واقع ہوئی۔ ابراہیم بن اشتر کو خیال ہوا کہ انہوں نے عبیداللہ بن زیاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھ والوں سے کہا: ان مقتولوں میں اس آدمی کو تلاش کرو جس کو میں نے تلوار ماری تو اس سے مشک کی خوشبو برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھ مشرق کی طرف اور پیر مغرب کی طرف جا پڑے تھے۔ لوگوں نے تلاش کیا تو وہ عبیداللہ بن زیاد

نکلا۔ جس کو ابن اشتر کی ضربت نے دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ لوگوں نے اس کا سر کاٹ کر مختار کے پاس بھیج دیا اور اس نے علیؑ بن حسینؑ کے پاس مدینہ بھجوا دیا۔ جب وہ سر آپ کی خدمت میں لیجایا گیا تو آپ صبح کا کھانا تناول فرما رہے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: اے سبحان اللہ! میرے پدر عالیقدر کا سرِ اقدس اس شخص کے پاس لایا گیا تھا تو یہ بھی صبح کا کھانا کھا رہا تھا۔ یہ طبقات ابن سعد اور استیعاب ابن عبدالبر کی روایت ہے۔

رجال کشی میں عمر بن علیؑ بن حسینؑ سے روایت ہے کہ جب مختار نے علیؑ بن حسینؑ کی خدمت میں عبیداللہ بن زیاد اور عمر بن سعد کے سر بھیجے تو آپ نے سجدہ میں گر کر فرمایا: حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے میرے لیے میرے دشمنوں سے خونِ حسینؑ کا انتقام لے لیا۔ اللہ تعالیٰ مختار کو جزائے خیر دے۔

امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: کسی ہاشمی خاتون نے پانچ سال تک سرمہ اور خضاب نہ لگایا تھا جب تک عبیداللہ بن زیاد کا سر مدینہ نہیں آیا۔

فاطمہ بنت امیرالمومنین علیؑ سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا: جب تک مختار نے عبیداللہ بن زیاد کا سر مدینہ نہیں بھیجا، ہم میں سے کسی عورت نے نہ خضاب کیا نہ آنکھوں میں سرمہ لگایا اور نہ کوئی اور سنگار کیا۔

ابن اثیر نے روایت کی ہے کہ ابن زبیر نے ابن عباس سے کہا: کیا تم کو کذّاب (جھوٹے) کے قتل کی خبر نہیں پہنچی۔ انھوں نے پوچھا: وہ کذّاب کون ہے۔ انھوں نے کہا: "ابن ابی عبیدہ!" انھوں نے کہا: ہاں مجھ کو مختار کے قتل کی خبر پہنچی ہے۔ اس پر وہ بولے: تو گویا تم کو اسے کذّاب کہا جانا برا لگا۔ انھوں نے کہا: یہ وہ شخص ہے جس نے ہمارے قاتلوں کو قتل کیا، ہمارے خون کا انتقام لیا اور ہمارے سینوں کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اس کی جزا یہ نہیں ہے کہ اب اس کو برا کہا جائے اور اس پر ہنسا جائے۔

ائمۂ علیہم السلام سے مختار کی راستبازی، مدح اور اس کے لیے رحمت میں کثیر روایات وارد ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایسی روایتیں بھی آئی ہیں جو اس کی غلط روی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور جن میں مؤرخوں اور محققوں نے اس سے ایسے باطل نظریات کو نسبت دی ہے جو اسلام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔

البتہ ممتاز شیعوں کی ایک جماعت نے، جیسے علامہ حلّی، ابن طاؤس اور محقق اردبیلی وغیرہ نے اس کو ایسی باتوں سے بری قرار دیا ہے جو اسکی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ جیسا کہ سید عبدالرزاق مکرم نے اپنی کتاب تنزیہہ المختار میں بیان کیا ہے۔

مختار، امویوں اور زبیریوں کے سخت دشمن تھے۔ یہ دونوں عراق پر دباؤ ڈالے ہوئے تھے لیکن مختار نے علویوں کے نام پر اس کو دونوں سے آزاد کرا لیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اہلبیتؑ سے دوستی اور محبّت کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے ان لوگوں میں سے کسی کو بھی قتل کیے بغیر نہیں چھوڑا جنھوں نے کربلا کی جنگ میں شرکت کی تھی۔ جب کہ عبداللہ بن زبیر محض حکومت کی خاطر امویوں کی مخالفت کرتے تھے۔ گویا کہ اموی اور زبیری، علویوں اور ہاشمیوں سے عداوت رکھنے میں یکساں تھے لیکن اس کے علاوہ ہر معاملے میں وہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے۔ اموی ایک طویل عرصے تک رسول اکرمؐ کی مخالفت کر چکنے کے بعد اب اپنے منبروں پر سے علیؑ کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ پھر انھوں نے نبی اکرمؐ کی عترت کو قتل بھی کر ڈالا۔ پس اگر مختار نہ ہوتے تو ابن زبیر بھی امویوں ہی کا سا طرز عمل اختیار کرتے۔ جیسے ان دونوں یعنی امویوں اور زبیریوں نے یہ عذر کر کے جمعہ کے خطبوں سے نبی اکرمؐ کا ذکر نکال دیا کہ جب آنحضرتؐ کا ذکر ہوتا ہے تو لوگ فخر اور احساس عظمت سے اپنے سر کو بلند کرنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان دونوں گروہوں سے کچھ بعید نہیں کہ وہ مختار سے ایسی باتیں منسوب کر دیں اور ان کو گمراہ کرنے والوں میں شامل کریں کیونکہ وہ ان کے مشترک دشمن یعنی علویوں کا ساتھ دیتے تھے۔ جن لوگوں نے تاریخیں لکھی ہیں وہ فرمانرواؤں کی باہمی آویزشوں پر نظر رکھتے ہوئے قلم اٹھاتے تھے نہ کہ حق اور حقیقت کے مطابق حالانکہ ہر اس شخص پر حقیقت از خود واضح ہو جاتی ہے جو ان حالات کا مطالعہ کرے، جن کو بڑے مؤرخوں نے قابل اعتبار سمجھا ہے۔ بہر صورت مختار نے امام حسینؑ اور ان کے ہمراہیوں کے قاتلوں کے بارے میں جو موقف اختیار کیا اس کو نہ تاریخ نظر انداز کر سکتی ہے، نہ رسول اکرمؐ اور ان کی اولاد میں ہونے والے ائمہ علیہم السلام ہی بھلا سکتے ہیں۔ انھوں نے اہل بیتؑ کے لیے المیہ کربلا کے رنج و غم کو ایک حد تک کم کر دیا، جس پر نبی اکرمؐ نے دسیوں سال پہلے گریہ کیا تھا اور جس کی تلخی ائمہ اہلبیتؑ کے بعد بھی ان کے شیعوں کے دلوں میں تا حیات

قائم رہے گی۔ شہدائے کربلا ظلم وعدوان کے خلاف تحریک برپا کرنے والے ہر شخص کے لیے ایک مثال بنے رہیں گے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے اور ان کو اللہ کی راہ میں مال و جان سے جہاد کرنیوالوں کی جزا دے۔ بیشک وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

امام زین العابدینؑ کے اخلاق وصفات پر نظر

امام زین العابدینؑ نے بیماری کے عالم میں اپنے والد بزرگوار اور بھائیوں کی شہادت کا المیہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس پر رنج کے تلخ گھونٹ آپ نے چکھے، اس کے بعد اگر آپ کسی قسم کے اقتدار کی خواہش کرتے، لوگوں پر بھروسہ کرتے یا کسی شکل میں سیاسی معاملات میں دخل دیتے تو یہ امر اس المیہ سے بھی شدید ہوتا۔ پس آپ امامت کے روحانی فرائض کی جانب متوجہ ہو گئے۔ جیسے عبادت، احکام دین، اخلاق کی اشاعت، فقرا اور مساکین سے ملاقات اور اسی قسم کے دوسرے اعمال کہ جن میں آپ سیاست اور سیاست والوں سے کنارہ کش رہ کر مشغول رہے۔ آپ نے فقہ و حدیث کے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس میں اہلبیتؑ کے پیروؤں کی کثیر تعداد شریک رہا کرتی تھی۔ چنانچہ شیخ طوسیؒ نے کتاب رجال میں اور دیگر مؤلفین رجال نے اپنی کتابوں میں ان کی تعداد ایک سو ساٹھ سے اوپر بتائی ہے جو آپ کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے اور آپ سے روایت حدیث کرتے تھے۔ ان میں سعید بن مسیّب، ابن جبیر، جبیر بن مطعم، قاسم بن محمد بن ابی بکر، جابر بن عبداللہ انصاری، یحییٰ بن ام الطویل اور دوسرے ممتاز تابعین شامل تھے۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ علیؑ بن حسینؑ صاحب وثوق، با اعتماد، کثیر الروایت، عالی نفس، بلند مرتبہ اور متّقی تھے۔

محاضرات راغب اصفہانی اور مناقب ابن جوزی میں ہے کہ ایک موقع پر جب امام علیؑ بن حسینؑ، عمر بن عبدالعزیز کی صحبت سے اٹھ کر گئے تو انھوں نے حاضرین سے دریافت کیا کہ سب سے زیادہ صاحب شرف کون ہے؟ تب ان کے کسی خوشامدی نے کہا: آپ ہیں اے امیرالمومنینؑ! اس پر انھوں نے کہا: ہرگز نہیں۔ انسانوں میں سب سے زیادہ صاحب شرف یہ ہیں جو ابھی ابھی میرے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو چاہتے ہیں کہ لوگ ان سے نفع حاصل کریں، یہ نہیں چاہتے کہ وہ کسی سے کچھ پائیں۔

شیخ صدوق نے کفایتہ العلل میں سفیان بن عیینیہ پر منتہی ہونے والی سند سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے محمد بن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا آپ علی بن حسینؑ سے ملے ہیں؟ انھوں نے کہا: ہاں! میں ان سے ملا ہوں اور میں آج تک ان سے زیادہ کسی صاحب فضیلت سے نہیں ملا۔ بخدا! میں نے ان کا کوئی دل سے دوست رکھنے والا اور کھلا ہوا دشمن نہیں دیکھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ یہ کیسے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا کہ خواہ وہ ان سے دوستی رکھتا ہو، لیکن ان کے فضل و شرف کی وجہ سے ان سے حسد نہ کرتا ہو اور نہ کوئی ایسا شخص دیکھا کہ خواہ وہ ان سے دشمنی رکھتا ہو لیکن خود اپنے ساتھ ان کے حسن سلوک کی وجہ سے ان کا لحاظ نہ کرتا ہو۔

شیخ مفیدؒ ارشاد میں کہتے ہیں: علماء نے آپ سے مختلف علوم کی حامل روایات اس کثرت سے نقل کی ہیں کہ جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اسکے علاوہ انہوں نے آپ سے فضائل قرآن ادعیہ، نصائح اور حلال و حرام کے متعلق بڑے جامع احکام حاصل کیے جو علماء میں مشہور ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں: عبداللہ بن حسن بن امام حسنؑ نے بیان کیا ہے کہ: میری ماں فاطمہ بنت حسینؑ تھیں۔ میں جب کبھی امام علیؑ بن حسینؑ کی صحبت میں بیٹھا، کوئی نہ کوئی بھلائی کی چیز لیکر اٹھا۔ جیسے اللہ کا خوف جو میرے دل میں آپ کا خوفِ خدا دیکھ کر پیدا ہو جاتا تھا یا وہ یقینی علم جو مجھ کو ان سے حاصل ہوتا تھا۔

اس پر مورخوں کا اتفاق ہے کہ آپ عبادت، تبلیغ، علم اور تدریس میں اس لیے منہمک ہو گئے تھے کہ اس سے آپ کی روح کو غذا اور دل کو تسلی بہم پہنچتی تھی۔ آپ ہر عالم کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے خواہ وہ لوگوں کی نظر میں بلند مرتبہ ہو یا بلند مرتبہ نہ ہوتا وقتیکہ لوگ اس کے علم سے فائدہ حاصل کرتے رہیں۔ جب آپ مسجد میں داخل ہوتے تو لوگوں میں سے گزرتے ہوئے زید بن اسلم کے پاس جا کر بیٹھ جاتے۔ اس پر نافع بن جبیر نے بُرا مانتے ہوئے کہا: اللہ آپ کی مغفرت فرمائے، آپ سردارِ خلق ہیں اور پھر بھی تمام لوگوں نیز اہل علم اور قریش میں سے گزرتے ہوئے اس سیاہ فام غلام کے پاس بیٹھتے ہیں۔ تب امام نے ان سے کہا: علم جہاں کہیں بھی ہو اسے محسوس کر لیا جاتا ہے، حالانکہ وہ غلاموں میں سے ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میں اس سے وہ باتیں سننا چاہتا ہوں جن سے اللہ ہم سب کو فائدہ پہنچائے۔

اس میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو لوگوں تک وہ چیز پہنچائے جو ہم پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ علم و فقہ کی اشاعت میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ لوگوں پر رحم دل، سخی اور مہربان تھے۔ تاریخ نے آپؑ کے متعلق ایسی ایسی باتیں بیان کی ہیں جو کسی اور کے لیے نہیں کیں۔ چنانچہ کلینی نے کافی میں روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: میرے لیے غصّے کے اس گھونٹ سے زیادہ پسندیدہ کوئی گھونٹ نہیں ہے جس کو پی کر کسی ترکیب سے بدلہ نہ لوں۔

آپ کے ایک چچازاد بھائی نے آپ کے پاس آکر تلخ کلامی کی اور بہت کچھ کہا لیکن آپ نے ان سے کوئی کلام نہیں کیا۔ جب وہ چلے گئے تو آپ نے اپنے ہم نشینوں سے فرمایا: تم لوگوں نے سنا یہ کیا کہہ رہے تھے۔ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو، یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنے اس فعل کے برُے نتائج دیکھ لے۔ پس وہ لوگ آپ کے ساتھ چلے جبکہ آپ فرماتے جاتے تھے: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ. وہ ایسے لوگ ہیں جو غصّے کو پی جاتے ہیں، لوگوں کی خطائیں معاف کر دیتے ہیں اور اللہ نیک عمل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ادھر وہ شخص بھی بدتمیزی کرنے کے لیے نکل آیا۔ اس کو یقین تھا کہ آپ اس سے اس بدکلامی کا بدلہ لینے آئے ہیں جو اس نے کچھ دیر پہلے کی تھی۔ اس وقت امام علیؑ بن حسینؑ نے اس سے فرمایا: اے بھائی! آپ نے ابھی میرے پاس آکر جو کچھ کہنا چاہا وہ مجھ کو کہہ ڈالا۔ جو کچھ آپ نے کہا اگر میں ویسا ہی ہوں تو پھر میں اللہ سے بخشش کا خواہاں ہوں اور اگر میں ویسا نہیں ہوں تو میں آپ کے لیے اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ اس پر وہ آپ کے سامنے معذرت کرنے لگا اور بولا کہ میں نے جو کچھ کہا آپ ویسے نہیں ہیں بلکہ میں ہی اس کا زیادہ سزاوار ہوں۔

آپ کے حِلم، عفو اور درگزر کے بارے میں راویوں کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک کنیز آفتابہ لیے آپ کے وضو کے لیے پانی ڈال رہی تھی۔ اچانک وہ آفتابہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آپ کے چہرہ پر لگا اور خون بہنے لگا۔ آپ نے اس کو ڈانٹنے کے لیے اپنا سر اٹھایا تو وہ کہنے لگی: اللہ کا قول ہے: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ۔ (وہ لوگ بھی ہیں جو غصہ کو پی جاتے ہیں) اس پر آپ نے فرمایا: میں نے اپنا غصہ پی لیا۔ پھر اس نے کہا: وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ (اور لوگوں سے درگزر کر دیتے ہیں)۔ آپ نے فرمایا: اللہ تجھے معاف فرمائے۔ اب اس نے کہا: وَاللّٰهُ

یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (اللہ نیک عمل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔ آپ نے فرمایا: جا تو اللہ کی راہ میں آزاد ہے۔

مناقب ابن شہر آشوب اور کشف الغمہ میں ہے کہ ایک رات امامؑ کے یہاں مہمان آئے۔ آپ نے اپنے خادم سے کہا کہ تنور میں سے بھنا ہوا گوشت جلدی سے نکال لائے۔ خادم گوشت لے کر تیزی سے چلا تو گر پڑا اور جلتا ہوا روغن آپ کے ایک بچے کے سر پر گر پڑا جس سے وہ فوراً مر گیا۔ اس پر وہ خادم خوف زدہ اور پریشان ہو گیا۔ امامؑ نے اس کو ایسی حالت میں دیکھا تو اس سے فرمایا کہ تم نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا ہے۔ جاؤ تم اللہ کی راہ میں آزاد ہو۔

مزید برآں راویوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ آپ کا ایک غلام آپ کے کھیت میں کام کر رہا تھا۔ جہاں اس نے کام کچھ زیادہ ہی خراب کیا۔ تب امامؑ کو اس پر غصہ آیا اور آپ نے اس کو اپنے کوڑے سے مارا لیکن گھر واپس آکر جب آپ نے اس غلام کو بلوایا تو وہ ڈرتا ڈرتا آپ کے پاس آیا۔ لیکن دیکھتا کیا ہے کہ آپ برہنہ بدن ہیں اور ایک کوڑا آپ کے سامنے رکھا ہے۔ وہ سمجھا کہ آپ اس کو مزید سزا دینا چاہتے ہیں۔ مگر آپ نے اس سے کہا: میں نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا جیسا کسی کے ساتھ نہیں کیا۔ اب یہ کوڑا موجود ہے۔ تم مجھ سے اپنا بدلہ لے لو۔ اس پر وہ کہنے لگا: میرے آقا! بخدا میں سمجھ رہا تھا کہ آپ مجھ کو اور سزا دینے والے ہیں کیونکہ میں واقعی سزا کا مستحق ہوں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ سے بدلہ لوں۔ آپ نے فرمایا: وائے ہو تم پر، بدلہ لے بھی لو۔ اس نے کہا: اللہ کی پناہ آپ کے لیے تو وجہ بھی ہے اور قدرت بھی، جبکہ میرے لیے کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ جب غلام بالکل نہ مانا تو امامؑ نے غصے سے فرمایا: اچھا اگر تم یہ بات نہیں مانتے ہو تو پھر یہ کھیت میری طرف سے تمہارے لیے عطیہ ہے۔

واقدی کی روایت ہے کہ ہشام بن اسماعیل بن ہشام بن ولید مخزومی، عبدالملک بن مروان کی طرف سے مدینہ میں گورنر تھا۔ وہ امامؑ کا بہت برا پڑوسی ثابت ہوا اور اس سے آپ کو سخت تکلیف پہنچی۔ جب عبدالملک کی وفات ہو گئی تو ولید بن عبدالملک نے اس گورنر کو معزول کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا تاکہ وہ اس سے اس کے مظالم کا بدلہ لے لیں۔ تب وہ کہنے لگا کہ بخدا مجھ کو علیؑ بن حسینؑ کے سوا کسی سے ڈر نہیں ہے۔ تاہم جب امامؑ اس کی طرف سے گزرے تو اس کو سلام کیا اور اپنے خدمتگاروں سے فرمادیا کہ تم

میں سے کوئی شخص اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کرے۔ نیز اس سے کہلوادیا کہ جو مال تم سے طلب کیا جارہا ہے، اگر تمہارے پاس اس سے کم ہے تو ہم تمہاری یہ کمی پوری کر سکتے ہیں۔ تم بخوشی ہم سے مال اور ہمارے ماننے والوں کی طرف سے اپنے آپ کو مطمئن رکھو۔ اس پر ہشام بن اسماعیل نے آپ سے کہا: بے شک اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس کو عطا کرے۔

طبقات ابن سعد میں روایت ہے کہ عبداللہ بن علیؑ بن حسینؑ بیان کرتے ہیں کہ جب ولید بن عبدالملک نے ہشام بن اسماعیل کو معزول کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ لوگ اس سے اپنا اپنا بدلہ لیں تو میرے والد بزرگوار علیؑ بن حسینؑ نے ہم سب کو جمع فرمایا اور کہا کہ یہ شخص معزول کر دیا گیا ہے اور ولید نے اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ پھر بھی تم میں سے کوئی اس کے ساتھ بُرا سلوک نہ کرے۔ اس پر میں نے کہا کہ اے بابا! یہ کیوں؟ بخدا اس نے ہمارے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ ہم تو اس دن کے انتظار میں تھے۔ تب امامؑ نے فرمایا: اے بیٹے! اس کو اللہ سزا دے گا۔ بخدا حسینؑ کی اولاد میں سے کوئی اس کے ساتھ بُرائی نہ کرے، یہاں تک کہ اس کا کام تمام ہو جائے۔

امام سجادؑ نے اسی پر اکتفا نہیں کی اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، آپ نے اسے پیغام بھیج کر اتنے مال کی پیشکش فرمائی جو اس کی ضروریات کو پورا کر دے۔ حالانکہ روایات کے مطابق وہ آپ کے ساتھ کیے ہوئے بُرے سلوک کے باعث صرف آپ ہی کی طرف سے خائف تھا۔ اسی طرح اس سے قبل آپ نے اہلبیتؑ کے بدترین دشمن اور بدترین مخالف مروان بن حکم کے ساتھ بھی حسن سلوک فرمایا تھا۔ یہ وہی مروان ہے جس نے ولید کو امام حسینؑ کے قتل کا مشورہ دیا تھا۔ پھر جس روز اس کو حسینؑ کے قتل ہونے کی خبر پہنچی تو اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔ نیز وہ بصرہ اور صفین میں قاسطین و ناکثین کے ساتھ رہا تھا۔ وہ معاویہ کا طرفدار اور اہل بیتؑ کا دشمن رہا۔ وہ ان کو سخت تکلیفیں پہنچاتا رہا۔ اس کے باوجود علیؑ بن حسینؑ نے اس کے ساتھ ویسا ہی حسن سلوک کیا جیسا ہشام کے ساتھ کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ اتنا ہی اچھا سلوک کیا، جتنا بُرا سلوک اس نے آپ کے والد بزرگوار، آپ کے تایا اور آپ کے دادا کے ساتھ کیا تھا۔ نیز جب اہل مدینہ نے امویوں کے خلاف اقدام کیا اور ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہی تو اب مروان بن حکم پر بھی حالات تنگ ہو گئے۔ تب وہ مہاجرین اور انصار سے طالب رحم ہوا،

لیکن سوائے علیؑ ابن حسینؑ کے اس کو کوئی ایسا شخص نہ ملا جو امویوں کے اہل و عیال کو بچائے۔ پس آپ نے ان سب کو اپنے خاندان کے ساتھ ملا لیا اور ان کو اسی طرح سے رکھا جیسے آپ اپنے گھر والوں کو رکھتے تھے۔

عام لوگوں کے اخلاق اور طبیعت کے لحاظ سے تو یہ ایک حیرت خیز بات ہے لیکن ان ذوات مقدسہ سے ایسے امور کا ظاہر ہونا کوئی حیرت خیز بات نہیں ہے، جن کو اللہ نے چنا ہو اور ان کو عصمت اور بزرگی عطا کی ہو۔ بے شک امام زین العابدینؑ کو اخلاق اور خصوصیات آپ کے اجداد یعنی محمد رسول اللہؐ اور علی ولی اللہؑ سے ہی منتقل ہوئے ہیں۔ جیسا کہ رسول اکرمؐ نے شرک اور نفاق کے سردار، ابوسفیان پر غلبہ حاصل کر لینے کے بعد اس کو معاف کر دیا اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک فرمایا اور اسی طرح آپ نے اس کی بیوی ہندہ کو بھی معافی دی اور اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا، حالانکہ اس نے حضرت حمزہ کا پیٹ چاک کر کے ان کا جگر نکالا اور وحشیانہ طور پر چبایا تھا اور پھر اس کو مکہ لے گئی تھی تاکہ اسے دیکھ کر خوشی حاصل کرتی رہے۔ اس کے علاوہ آپ نے مکہ میں مروان کے باپ حکم پر غلبہ حاصل کیا تو اس کو معاف فرمایا۔ حالانکہ وہ بھی آپ کو اذیت پہنچاتا اور ہر قسم کا بُرا سلوک کیا کرتا تھا۔ حتٰی کہ فتح مکہ کے بعد ظاہراً اسلام قبول کر لینے پر بھی آپ کا مذاق اڑاتا اور آپ پر جھوٹ باندھتا تھا لیکن آنحضرتؐ نے اس پر کوئی سختی نہیں کی۔ بس اس کو اور اس کے بیٹے کو مدینہ سے شہر بدر کر کے طائف روانہ کر دیا تھا۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے مکہ کے تمام مشرکوں، ستم کیشوں اور ہر اس شخص کو جو آپ کے ساتھ برائی سے پیش آتا رہا تھا معاف کر دیا اور اپنا مشہور حکم صادر فرمایا کہ: جاؤ تم سب آزاد کر دیے گئے ہو۔

آپ کے دادا امیرالمومنین علیؑ نے مروان کو اس وقت معاف فرما دیا جب وہ آپ کے خلاف بصرہ کی جنگ میں فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ آپ کو اس پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور وہ آپ کے ہاتھوں میں قیدی تھا۔ تاہم آپ نے اس کو چھوڑ دیا حالانکہ آپ سمجھ رہے تھے کہ وہ معاویہ سے جا ملے گا اور آئندہ آپ سے پھر جنگ کرے گا۔ بعد میں جب معاویہ کو اقتدار مل گیا اور انھوں نے مروان کو مدینہ کا گورنر بنایا تو وہ امام حسنؑ کو تکلیفیں پہنچاتا اور ان کو غصہ کے گھونٹ پلاتا رہتا تھا، بلکہ کربلا کا عظیم سانحہ بھی اس کی دلی خواہش کے مطابق رونما

ہوا تھا لیکن امیرالمومنینؑ کا قول تو یہ تھا کہ جب تم اپنے دشمن پر غالب آجاؤ تو اس کے ساتھ عفو اور درگزر کا برتاؤ کرو تاکہ تم کو دوہری فتح کی عزّت حاصل ہو۔ اس لحاظ سے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ امام زین العابدینؑ ان لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے رہے جنھوں نے آپ کے ساتھ بُرائی کی تھی۔

راویوں نے جس طرح آپ کے عفو و درگزر کے دسیوں واقعات روایت کیے ہیں، اسی طرح آپ کی سخاوت اور جود و عطا کے واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ چنانچہ جب بھی آپ کو کسی ایسے شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ وہ مقروض ہے اور وہ آپ سے اعانت کا طلبگار ہے تو آپ اس کا قرض اس کی طرف سے ادا کر دیتے تھے۔ جب کبھی کوئی تنگدست آدمی آپ کے پاس آتا آپ اس کی تنگدستی دُور فرما دیتے تھے۔ جب کوئی سائل آتا تو آپ اس کو اتنا عطا کر دیتے تھے کہ اس کو کسی دوسرے سے مانگنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ ایک روز آپ محمد بن اسامہ بن زید کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ جب آپ نے ان کو نالہ کرتے دیکھا تو دریافت فرمایا: تم کس بات پر رو رہے ہو؟ انھوں نے کہا: مجھ پر پندرہ ہزار دینار کا قرض ہے۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: بس وہ کُل کا کُل مجھ پر ہے اور پھر آپ نے اسی وقت وہ قرض اس کی طرف سے ادا فرما دیا۔

جب کوئی سائل آپ کے پاس آتا تو آپ فرماتے: خوش آمدید ہے اس شخص کو جو روزِ قیامت کے لیے میرا سامان اٹھا کر لے جاتا ہے۔ نیز آپ جس قدر کھانا کھاتے تھے اسی قدر صدقہ بھی کر دیتے تھے۔ احمد بن حنبل اور شیخ صدوق نے امام باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ مدینہ کے ایک سو کنبوں کی کفالت کیا کرتے تھے۔

ابونعیم حلیۃ الاولیاء میں بیان کرتے ہیں کہ: مدینہ میں ایسے بہت سے کنبے تھے جو امام علیؑ بن حسینؑ کے صدقات پر گزر بسر کیا کرتے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی گزر بسر کہاں سے ہو رہی ہے۔ البتہ جب علیؑ بن حسینؑ نے وفات پائی تو اُنکا روزینہ بند ہو گیا، تب ان کو معلوم ہوا کہ وہ آپ ہی تھے جو ان لوگوں کی کفالت فرمایا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہم کو نامعلوم ہاتھ سے ملنا اسی وقت بند ہوا جب علیؑ بن حسینؑ اِس دنیا سے رحلت فرما گئے۔

شیخ صدوق، سفیان بن عیینہ سے روایت کرتے ہیں کہ ـــــ جب محمد بن شہاب زہری نے دیکھا کہ ایک سرد رات میں علیؑ بن حسینؑ اپنی کمر پہ آٹا اُٹھائے ہوئے پیدل تشریف لے جا رہے ہیں، تو انھوں نے کہا: اے فرزند رسولؐ! یہ کیا؟ آپ نے فرمایا کہ میرا ارادہ سفر کرنے کا ہے۔ اس لیے ضروری سامان محفوظ مقام پہ لے جا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا: میرا غلام حاضر ہے۔ آپ کی بجائے یہ اس کو اٹھائے گا۔ جب امامؑ نہ مانے تو انھوں نے کہا: اچھا تو پھر مجھے اٹھا لینے دیجیے تاکہ میں آپ کو اس کے اٹھانے کی زحمت سے بچا لوں تب آپ نے فرمایا: لیکن میں اپنے آپ کو اس چیز سے محروم نہیں رکھنا چاہتا جو مجھ کو میرے سفر سے نجات دلا دے اور جس کے پاس میں جانا چاہتا ہوں اس تک میری رسائی کو آسان بنا دے۔ میں تم کو اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم مجھ کو میرے حال پر رہنے دو اور اپنے کام سے جاؤ۔ جب چند روز کے بعد ابن شہاب آپ سے ملے تو انھوں نے کہا: اے فرزند رسولؐ! میں اس سفر کی کوئی علامت نہیں پاتا ہوں جس کا آپ ذکر فرما رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ہاں اے زہری وہ سفر ویسا نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے تھے۔ بلکہ وہ موت کا سفر ہے اور میں اسی کے لیے تیاری کرتا رہتا ہوں۔ موت کے لیے تیاری کا مطلب یہ ہے کہ حرام سے کنارہ کش رہا جائے اور اپنے مال و جان کو بھلائی کے کاموں میں لگایا جائے۔

آپ رات کی تاریکی میں چہرے پر نقاب ڈال کر محتاجوں کے گھروں پر جایا کرتے، جن میں سے بیشتر اپنے دروازوں پر کھڑے آپ کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ جب ان کی نظریں آپ پر پڑتیں تو کہتے تھے: "وہ بوری والا آگیا"۔

ابن طاؤس نے 'الاقبال' میں امام جعفر صادقؑ پر منتہی ہونے والی سند سے بیان کیا ہے کہ امام علیؑ بن حسینؑ ماہ رمضان میں اپنے کسی غلام یا کنیز کو اس کی غلطی پہ ہرگز سزا نہیں دیتے تھے، بلکہ آپ ان کی خطاؤں کو لکھتے جاتے تھے۔ جب ماہ رمضان کی آخری شب آتی تو آپ ان سب کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتے اور ان کی خطاؤں کا پرچہ ان کے سامنے رکھ دیتے تاکہ وہ بھی اپنی خطاؤں سے واقف ہو جائیں۔ پھر آپ ان سے فرماتے تھے اب تم سب یہ کہو کہ: اے علیؑ بن حسینؑ! جس طرح آپ نے ہمارے افعال کو لکھ لیا ہے، اسی طرح آپ کے رب نے بھی آپ کے اعمال کو لکھ رکھا ہے۔ اس کے پاس وہ کتاب ہے

جو آپ کے بارے میں صحیح صحیح اطلاع دے گی اور اس میں ہر چھوٹے بڑے فعل کا ذکر موجود ہے۔ اس میں آپ وہ سب کچھ پائیں گے جو آپ نے کیا ہے۔ جیساکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا کیا دھرا آپ کے پاس لکھا ہے۔ پس آپ ہم سے درگزر کیجیے اور معاف فرما دیجیے۔ اللہ آپ سے درگزر کرے گا اور آپ کو معاف فرما دے گا۔ اس وقت آپ ان سب کے درمیان کھڑے ہو کر رونے لگتے اور یہ کہتے جاتے کہ: "بارِ الٰہا! تو نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم ان لوگوں کو معاف کر دیں جنھوں نے ہم پر ظلم کیا ہے۔ پس ہم نے تیرے حکم کے مطابق انکو معاف کر دیا ہے۔ اب تو بھی ہم کو معاف کر دے کیونکہ تو ہم سے اور اپنے دوسرے بندوں سے بڑھ کر اس کا اختیار رکھتا ہے۔"

پھر آپ ان سب سے مخاطب ہو کر فرماتے: "میں نے تم سب کو معاف کر دیا لیکن جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے، بتاؤ کیا تم نے مجھے اس سے معاف کر دیا؟ ہاں! اب تم سب چلے جاؤ کہ میں نے تم کو معاف کر دیا ہے تاکہ اللہ مجھ کو معاف کر دے اور مجھ کو نارِ جہنم سے آزاد کر دے۔" جب عید کا روز آتا تو آپ ان سب کو اتنے عطیات دیتے کہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں صاحبِ حیثیت ہو جائیں۔

آپ فرمایا کرتے: ماہ رمضان کی ہر رات میں اللہ ستر ہزار نفوس کو آتشِ جہنم سے نجات دیتا ہے اور جب اس ماہ مبارک کی آخری رات آتی ہے تو مزید اتنے ہی نفوس کو آزاد کرتا ہے جتنے پورے ماہ میں ہو چکے تھے۔ میں اس کو بہت پسند کرتا ہوں کہ میں اس دنیا میں اپنے مملوکہ آدمیوں کو آزاد کر دیا کروں تاکہ اللہ مجھ کو آتشِ جہنم سے آزاد فرما دے۔

راوی کہتے ہیں کہ جب آپ نماز کے لیے وضو فرمانے لگتے تو آپ کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔ لوگ آپ سے کہتے کہ وضو کے وقت آپ کو یہ کیا ہونے لگتا ہے تو آپ فرماتے کہ تم جانتے ہو کہ میں کس کے سامنے جانے لگا ہوں؟ جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو آپ کانپنے لگتے۔ آپ سے کہا جاتا: اے فرزند رسولؐ! یہ آپ کی کیا حالت ہے تو آپ فرماتے، کیا تم نہیں جانتے ہو کہ اب میں کس سے ہمکلام ہونے والا ہوں۔ ایک بار آپ کے گھر میں آگ لگ گئی جبکہ آپ نماز کے سجدے میں تھے۔ لوگوں نے چلانا شروع کیا: "آگ! آگ! اے فرزند رسولؐ!" لیکن آپ نے نہ سجدہ کو توڑا نہ سر اٹھایا، یہاں تک کہ آگ بجھ گئی۔

آپ سے کہا گیا کہ آپ کو کس چیز نے اس پر متوجہ نہ ہونے دیا؟ آپ نے فرمایا اس سے بڑی آگ نے۔

اسی قسم کی بہت سی روایات ہیں جو آپ کی نیکی، پسندیدہ عادات، کشادہ دلی اور عبادت و سخاوت میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ تمام روایات جو موافق و مخالف سبھی مؤرخوں اور محدثوں میں مشہور ہیں، خاص طور پر اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ آپ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ خدا ترس اور سب سے زیادہ سخی تھے۔

اس تواضع اور انکسار کے باوجود آپ بڑے بارعب اور صاحبِ عظمت تھے۔ چنانچہ ایکبار آپ عبدالملک بن مروان سے ملاقات کے لیے گئے، حالانکہ وہ آپ سے دشمنی رکھتا تھا لیکن جب اس نے آپ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس نے آپ کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور آپ کی بڑی قدر و منزلت کی۔ بعد میں لوگوں نے اس کے بارے میں اس سے پوچھا تو کہنے لگا: جب میں نے ان کو دیکھا تو مجھ پر ان کا رعب طاری ہو گیا تھا۔ اسی طرح جب آپ مسلم بن عقبہ سے مدینے میں ملے تو اس کا بیان ہے کہ "میرے دل پر ان کا خوف چھا گیا تھا۔"

طبقات الشافعیہ میں سبکی سے روایت ہے کہ ایک سال ہشام بن عبدالملک حج کو آیا، خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اس نے حجرِ اسود کو بوسہ دینا چاہا لیکن لوگوں کی کثرت کے باعث وہاں تک نہ پہنچ سکا۔ تب اس کے درباریوں نے حرم کے قریب اس کے لیے ایک کرسی لا کر رکھ دی اور وہ اس پر بیٹھ کر حجرِ اسود کے قریب ہجوم کے کم ہونے کا انتظار کرنے لگا، جبکہ اہل شام اس کے چاروں طرف کھڑے تھے، لیکن عین اسی وقت جبکہ وہ لوگوں کی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا، امام زین العابدینؑ تشریف لے آئے۔ راوی کے بیان کے مطابق آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوش شکل اور خوش رنگ تھے۔ آپ نے خانۂ کعبہ کا طواف فرمایا اور آپ حجرِ اسود پر پہنچے تو لوگ آپ کے جلال اور عظمت کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور آپ کی خاطر اس کے پاس سے ہٹ گئے۔ تب آپ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور لوگ آپ کو اس طرح دیکھتے رہے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ جب آپ وہاں سے چلے گئے تو لوگ پھر سے طواف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ہشام بن عبدالملک اور وہ اہل شام جو اس کے ساتھ تھے،

یہ سب کچھ دیکھتے رہے ۔جبکہ ہشام کا خون حسد اور جلن کی وجہ سے کھولتا رہا۔ شام کے وہ ممتاز افراد جو اس کے ساتھ تھے، وہ پہچان نہ سکے کہ وہ کون شخص تھا کہ جس کے وقار کو دیکھ کر سب لوگ حجرِ اسود کے پاس سے ہٹ گئے ۔حالانکہ خلیفہ اور اس کے سپاہی اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح حجرِ اسود تک رسائی ہو جائے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے ۔چنانچہ ان میں سے کسی نے ہشام بن عبدالملک سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا کہ جس کے آتے ہی لوگ خود ہی پیچھے ہٹ گئے تھے تو اس ڈر سے کہ کہیں یہ لوگ ان کی جانب راغب نہ ہو جائیں، اس نے جواب میں کہہ دیا کہ بھئی میں تو اس کو نہیں جانتا۔ اتفاقاً اس وقت وہاں فرزدق شاعر بھی موجود تھا۔اس نے کہا کہ میں اس شخص کو اچھی طرح پہچانتا ہوں ۔ اس پر ایک شامی نے پوچھا: اے ابوفراس! یہ کون ہیں ؟ تب فرزدق بولے کہ یہ علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں جو فاطمہؑ بنت رسولؐ کے فرزند ہیں ۔ پھر انھوں نے ان لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر جو وہاں جمع تھے، یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیے :

یہ وہ ہیں جن کے قدم مبارک کو بطحاء ، خانۂ کعبہ اور ان کے اطراف کی زمین کے ذرات بھی پہچانتے ہیں۔

یہ فرزند ہیں اس کے جو اللہ کے بندوں میں سب سے بہتر ہے ۔یہ پرہیزگار ہیں، پاکیزہ ہیں، معصوم ہیں اور صاحبِ علم ہیں۔

خانۂ کعبہ کا رکن حطیم، ان کی ہتھیلی کو اس قدر پہچانتا ہے کہ جب یہ اس کی طرف بوسہ دینے کے لیے بڑھتے ہیں تو وہ خود آپ کو چھو لیتا ہے۔

قریش ان کو دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں کہ ان پر فضیلتوں کا خاتمہ ہے ۔

اگر تم نہیں جانتے تو سن لو ۔ یہ فاطمہؑ بنتِ محمدؐ کے فرزند ہیں ۔ ان ہی کے جد بزرگوار پر انبیاءؑ کا سلسلہ ختم ہوا ہے۔

ان کے بارے میں تمہارا جان کر انجان بننا ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ انھیں تو سارا عرب اور عجم جانتا پہچانتا ہے ۔

وہ خود حیاء کے باعث آنکھیں نیچی رکھتے ہیں لیکن لوگ ان کے رعب کے باعث ان کے آگے اپنی آنکھیں نیچی کیے رہتے ہیں ۔ ان کی ہیبت ایسی

ہے کہ ان سے صرف اسی وقت بات کی جا سکتی ہے جب وہ مسکرا رہے ہوں۔
وہ فضائل کی اس بلندی سے منسوب کیے جاتے ہیں، جس کے حاصل کرنے سے
لوگوں کے ہاتھ اور پیر قاصر ہیں۔
ان کے جد بزرگوار وہ ہیں جن کے آگے تمام انبیاءؑ کے فضائل سرنگوں
ہیں اور ان کی امت وہ ہے جس کے آگے ساری امتیں سرنگوں ہیں۔
ان کی پیشانی مبارک سے نور ہدایت اس طرح نمودار ہوتا رہتا ہے، جیسے
آفتاب نکل کر تاریکی کو زائل کر دیتا ہے۔
اللہ نے ان کو ہمیشہ سے شرف و فضیلت سے سرفراز کیا ہے۔ گویا اللہ نے
یہ ان کے لیے لوح محفوظ پر قلم قدرت سے لکھ دیا تھا۔
ان کے دونوں ہاتھ برستے بادلوں کی مانند ہر ایک کے لیے فیض رساں ہیں۔
لوگ ان سے برابر مدد حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی وہ کبھی خالی ہاتھ
نہیں ہوتے۔

فرزدق امام چہارم کے فضائل اسی طرح بیان کرتے رہے تا آخرِ قصیدہ کہ جو طبقات شافعیہ میں ابن جوزی اور سبکی کی روایت کے مطابق تقریباً تیس اشعار پر مشتمل ہے۔

ابو فراس فرزدق کے اشعار کی تعداد میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بیشتر مورخین اور محدثین نے ہشام بن عبدالملک کے سامنے اس کے اظہار حق کا یہ واقعہ بیان کیا ہے جس کے ذریعے انھوں نے ان ظالم فرمانرواؤں کے اقتدار کو نیچا دکھایا ہے۔ جن کی عزّت کا دارومدار ملک اور لشکر پر تھا لیکن اس موقع پر جبکہ عوام ہشام کے حجرِ اسود کو بوسہ دینے میں حائل ہو رہے تھے۔ اس کی حکومت اور لشکر کچھ بھی کام نہ آیا۔ البتہ جب امام زین العابدینؑ حجرِ اسود کی طرف بڑھے جو اللہ کی طرف سے عزّت پائے ہوئے ہیں تو وہاں ہجوم کرنے والے خود ہی چھٹ گئے اور خانہ کعبہ کے اس رکن کو چھوڑ کر الگ کھڑے ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمین ان سب کو اپنی گہرائیوں کی طرف کھینچے ہوئے ٹھیر گئی ہے۔ یہاں تک کہ امامؑ نے اپنی تمنّا پوری کر لی اور آپ اس مقام سے واپس چلے گئے۔ تب وہ لوگ بھی پہلے کی طرح ایک دوسرے کے آگے بڑھنے لگے اور پھر سے راستے میں حائل ہو گئے۔ ادھر تو یہ ہوا اور

ادھر اہل شام اس حیرت خیز منظر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ کوئی ان کو اس جوان شخص کے نام و نشان سے آگاہ کرے، جس کا رعب لوگوں پر طاری تھا اور وہ اس کی تعظیم کر رہے تھے۔ حالانکہ ان کے خلیفہ نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں اس شخص سے واقف نہیں ہوں۔ اصل میں وہ چاہتا تھا کہ اہل شام ان کو پہچان ہی نہ سکیں کیونکہ اس نے اور اس کے اموی اسلاف نے اہل شام کو یہ بتا رکھا تھا کہ ہم ہی وہ آل رسولؐ ہیں کہ جن کی محبّت کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ مگر اس کو یہ خیال تک بھی نہ تھا کہ اس موقع پر ابوفراس اس کے منہ پر ایسے زناٹے دار تھپڑ لگائے گا جو اس نے یہ کہہ کر لگائے کہ: امام علی بن حسینؑ کے بارے میں تمہارا یہ جان کر انجان بن جانا ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ جس ہستی کو جاننے سے تم انکار کر رہے ہو اسے تو سارا عرب اور عجم جانتا پہچانتا ہے۔

"یہ علیؑ بن حسینؑ ہیں، ان کے باپ رسول خداؐ ہیں۔ جن کے نور سے تمام قومیں ہدایت پاتی ہیں۔ اگر تم ان کو نہیں پہچانتے ہو تو سن لو، یہ فاطمہؑ کے فرزند ہیں۔ انہی کے جد بزرگوار پر انبیاءؑ کا سلسلہ ختم ہوا ہے۔"

راویوں کا کہنا ہے کہ ہشام بن عبدالملک، فرزدق پر بہت برہم ہوا اور ان کو مکہ اور مدینہ کے درمیان عسفان کے مقام پر قید کیے جانے کا حکم دے دیا اور ان پر سختی کرنے کی تاکید کر دی۔

راوی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ امام علیؑ بن حسینؑ نے فرزدق کو ایک ہزار دینار بھیجے لیکن انہوں نے قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ خدا و رسولؐ کی خاطر کہا تھا۔ میں کسی سے اللہ کی اطاعت کی قیمت لینے والا نہیں ہوں۔ مگر امامؑ نے اس کو یہ کہلا بھیجا کہ ہم اہلبیتؑ ہیں۔ ہم جو کچھ ایک مرتبہ دیدیتے ہیں پھر اس کو واپس نہیں لیا کرتے۔ چنانچہ فرزدق نے وہ رقم قبول کر لی۔

فرزدق، ہشام کی قید میں بہت زمانہ تک پڑے رہے اور آخر میں انھوں نے اس کی ہجو میں یہ اشعار کہے:

"وہ مجھے مدینہ اور اس شہر کے درمیان قید میں رکھے ہوئے ہے جس کی طرف لوگوں کے دل لگے رہتے ہیں۔

اس کا سر وہ ہے جو سردار کا سر نہیں ہے اور اس کی آنکھ بھینگی ہے، جس کا عیب نمایاں ہے۔“

راوی کہتے ہیں کہ اپنی اس ہجو کا علم ہونے پر ہشام نے ان کے قید خانہ سے آزاد کیے جانے کا حکم دیدیا۔ اللہ، فرزدق پر رحم کرے اور ان کو جزائے کثیر عطا کرے کیونکہ ہشام بن عبدالملک کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتے سے وہ اللہ کی راہ میں افضل المجاہدین شمار ہو گئے جیسا کہ رسول اللہؐ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

”اللہ کی راہ میں افضل المجاہدین تو حمزہ بن عبدالمطلب ہیں۔ پھر ہر وہ شخص جو کسی ظالم حکمران کے روبرو کلمۂ حق ادا کرے۔“

بعض راوی بیان کرتے ہیں کہ جب عبدالملک بن مروان کو معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کی تلوار امام علیؑ بن حسینؑ کے پاس ہے تو اس نے آپ سے کہلوایا کہ وہ مجھ کو دیدیں اور اس کے لیے بہت اصرار کیا لیکن آپ نے رسول اللہؐ کی تلوار دینے سے انکار فرما دیا۔ تب عبدالملک نے آپ کو خط لکھا اور یہ دھمکی دی کہ بیت المال سے آپ کا روزینہ بند کر دیا جائے گا۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس نے اپنے ایک آدمی کو حجاز بھیجا کہ وہ امامؑ کو گرفتار کر کے شام لے آئے۔ بہرحال امامؑ نے اس خط کے جواب میں لکھا: بعدہٗ یہ کہ اللہ نے صاحبانِ تقویٰ کے لیے ایسی راہ سے کشادگی دینے کا وعدہ کیا ہے جو شاید ان پر گراں ہو اور ایسی سمت سے رزق پہنچانے کی ضمانت دی ہے کہ جو ان کے تصور میں بھی نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: اِنَّ اللہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ۔ بے شک اللہ کسی مغرور خیانت والے کو پسند نہیں کرتا۔ (سورۂ حج۔ آیت ۳۸) اب تو خود دیکھ لے کہ ہم دونوں میں سے ایسا کون ہے!

وہ روایت جو یہ بیان کرتی ہے کہ خلیفہ نے اپنے آدمی کو بھیجا، تاکہ وہ امامؑ کو گرفتار کر لائے۔ اس کو ابن جوزی نے ”تذکرہ“ میں ابن حمدون سے روایت کیا ہے اور ابن حمدون نے اسے اپنی کتاب ”تذکرہ“ میں زہری سے لیا ہے۔

اس روایت میں کہا گیا ہے کہ عبدالملک نے امام علیؑ بن حسینؑ کو مدینہ سے بیڑیاں پہنا کر نکالا اور آپ پر محافظ معین کر دیے۔ زہری کہتے ہیں کہ میں نے ان سے اجازت طلب

کی کہ میں آپ سے الوداعی ملاقات کر لوں۔ انھوں نے اجازت دیدی تو میں ان کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ میں نے رو کر کہا کہ کاش آپ کی جگہ میں ہوتا اور آپ عافیت میں ہوتے۔ اس پر آپ نے فرمایا: اے زہری! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ جو میرے جسم اور میری گردن میں پڑا ہے میرے لیے باعثِ تکلیف ہے۔ ہاں سن رکھو کہ اگر میں چاہوں تو ایسا ہرگز نہ ہو، لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس سے مجھ کو عذابِ الٰہی کی یاد آتی رہتی ہے۔ محمد بن شہاب زہری مزید کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ نے اپنے ہاتھ پیر کڑیوں اور بیڑیوں سے نکال لیے۔ چار ہی دن گزرے تھے کہ آپ پر معین محافظ آپ کے پیچھے مدینہ آئے، لیکن آپ ان کو نہ ملے۔ میں نے ان میں سے ایک سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ ہم کو وہ تو نہیں ملے۔ البتہ لوہے کی وہ چیزیں مل گئیں جو ان کے ہاتھوں اور پیروں میں ڈالی گئی تھیں۔

زہری نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اس کے بعد میں عبدالملک بن مروان کے پاس گیا۔ اس نے مجھ سے آپ کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے آپ کا حال بیان کر دیا۔ تب وہ کہنے لگا کہ جس روز آپ محافظوں کو نہیں ملے، آپ میرے پاس آئے اور کہنے لگے: میرے اور تمھارے درمیان کیا معاملہ ہے؟ میں نے کہا: آپ میرے پاس قیام فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: یہ مجھ کو پسند نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ چلے گئے۔ بخدا ان کی اس باطنی قوت کی وجہ سے میرے دل پر خوف طاری ہو گیا ہے۔

بعض راویوں نے آپ کے بارے میں اس کے علاوہ اور بھی کرامات بیان کی ہیں جو تنقید اور تجزیہ کے تحت صحیح ثابت نہیں ہوتیں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ بعض کرامات جو آپ سے اور کچھ دوسرے حضرات سے منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ ان داستان گویوں کی گھڑی ہوئی ہیں، جو انھوں نے عام لوگوں کے عقائد کو متاثر کرنے کے لیے مشہور کر دی تھیں اور تاریخ ایسی شہادتوں سے بھری پڑی ہے۔ اس کے باوجود بھی میرا اعتقاد یہ ہے کہ اگر وہ حضرات اللہ تعالےٰ سے اپنی خواہش کے مطابق کسی چیز کا سوال کرتے تو وہ ضرور عطا کر دیتا لیکن وہ شدائد اور تکالیف پر برابر صبر کرتے رہتے تھے کیونکہ وہ اس ثواب پر نظر رکھتے تھے جو اللہ نے صابروں اور اس کی رضا پر راضی رہنے والوں کے لیے

مقدر کر رکھا ہے۔ جیساکہ ان کی وہ باشرف اور بے عیب تاریخ ثابت کرتی ہے جو نیکی، حسن عمل اور اللہ کی راہ میں قربانیوں سے بھرپور ہے۔

امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ امام علیؑ بن حسینؑ نے بیان فرمایا کہ ایک روز میں بیمار پڑا تھا۔ میرے والد بزرگوار نے مجھ سے کہا: بیٹا! کیا تم کو کوئی خواہش ہے؟ میں نے کہا: میری خواہش ہے کہ میں ایسا ہو جاؤں کہ اس کے علاوہ کچھ طلب نہ کروں جو اللہ نے میرے لیے مہیا کر دیا ہے۔ اس پر میرے والد بزرگوار نے فرمایا: بیٹا تم نے تو ٹھیک ابراہیم خلیل اللہؑ کی طرح بات کی ہے کہ جب ان سے جبرئیلؑ نے کہا: کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟ انھوں نے فرمایا: میں اللہ سے از خود کوئی سوال کرنا نہیں چاہتا۔ وہ میرے لیے کافی ہے اور بہترین محافظ ہے۔

آپ اپنے شیعوں اور دوستداروں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ آپ کے متعلق حدیثیں بیان کرنے میں مبالغہ نہ کریں اور آپ کی تعظیم کرنے میں بھی اعتدال سے کام لیں۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں بیان کیا ہے کہ امام زین العابدینؑ فرمایا کرتے تھے کہ: اے لوگو ہم سے اسلام کی خاطر محبّت کرو۔ بخدا ہم سے تمہاری محبت کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ ہمارے لیے باعث ننگ ہے اور اس نے ہم کو لوگوں کی عداوت کا نشانہ بنا دیا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ اپنے شیعوں سے فرماتے تھے کہ ہمارا ذکر اللہ کی کتاب میں ہے، ہمارا نسبی تعلق رسول اللہؐ سے ہے اور ہماری ولادت پاکیزہ ہے۔ گویا آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ لوگ ہماری اتنی ہی صفات پر اکتفا کیا کریں اور لوگوں سے ایسی باتیں بیان نہ کیا کریں جن کو عام اذہان برداشت نہ کر سکیں۔

مناقب ابن شہر آشوب میں آیا ہے کہ آپ سے کہا گیا: اے فرزند رسولؐ! کیا بات ہے کہ جب آپ سفر کرتے ہیں تو اپنے ساتھیوں سے اپنے آپ کو چھپائے رکھتے ہیں؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ امر ناپسند ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کی بدولت میرے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جیسا میں دوسروں کے ساتھ نہ کر سکوں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک مرتبہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ سفر پر گیا جو مجھ کو پہچانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہؐ کی وجہ سے میرے ساتھ ایسا سلوک

کیا جس کا میں مستحق نہیں تھا۔ پس میں اپنے معاملہ کو چھپائے رکھنا پسند کرنے لگا۔

صحیفۂ سجادیہ

امام علیؑ بن حسینؑ کو وہ زمانہ ملا جب لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے تھے اور ان پر ان کے فرمانرواؤں کا طرزِ زندگی چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ رسالت کے مفہوم اور اسلام کے اخلاق و آداب سے دور ہو گئے تھے۔ ادھر آپ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ منبروں پر جا کر یا لوگوں کے گروہوں میں کھڑے ہو کر ان کو اسلام کے اخلاق، آداب اور احکام کی تعلیم دیں تاکہ آپ ان کے حالات درست کر سکیں اور انکو ان جفاکیش افراد سے نجات دلائیں جو اسلام کو اپنے سرکشی پر مبنی طرزِ عمل سے مسخ کر رہے تھے کیونکہ وہ کسی بات کے جائز اور ناجائز ہونے سے اپنی بے پروائی اور دین کی اہانت میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ پس آپ نے اسلام کے پیغام کو نشر کرنا شروع کر دیا اور لوگوں کو دین حق، کتاب خدا، اسلامی اخلاق اور رسول اکرمؐ کی سنت اور سیرت کی طرف متوجہ کرانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی آپ حکامِ وقت کو حق کوشی، قیامِ عدل اور ناداروں اور ستم رسیدہ لوگوں سے انصاف کا برتاؤ کرنے کی طرف رغبت دلاتے تھے۔ آپ ان کو یہ بھی بتلاتے تھے کہ حکام میں کیا صفات ہونی چاہئیں۔ نیز آپ ان کو یاد دلاتے تھے کہ ان کے وہ کیا فرائض ہیں کہ جن کو ادا کرنے سے امن بحال رہے، عدل قائم رہے اور مملکت کی سرحدیں محفوظ رہیں۔ آپ ان کو یہ بھی بتلاتے تھے کہ ان فرائض کو ادا کرنے کی صورت میں ان کے رعیت پر کیا حقوق ہیں۔ آپ مسلسل ایسی ہی تعلیمات ان تک پہنچاتے تھے کہ جن سے رعیت پر ریاست کے حقوق کے ساتھ ساتھ ہر انسان کے لیے باعزت زندگی کے حق کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

امام علیؑ بن حسینؑ کی شدید خواہش تھی کہ طبقاتی اختلافات کے باوجود آپ لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں جو ان پر اللہ کے لیے اور انسانوں کے لیے عائد ہوتی ہیں لیکن آپ نے یہ کام عام واعظوں، ناصحوں اور مقرروں کی طرح انجام نہیں دیا۔ بلکہ آپ نے اپنی سادہ دعاؤں کے ذریعے اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونے، اس سے عرض حال کرنے، اس سے رحمت طلب کرنے اور اس کی بزرگی کا ذکر کرنے کا طریقہ استعمال فرمایا جو اب صحیفۂ سجادیہ نامی ایک کتاب میں جمع کی جا چکی ہیں۔ یہ دعائیں امام محمد باقرؑ اور آپ کے ایک دوسرے فرزند زید بن علی نیز آپ کے بعد کے ائمۂ طاہرینؑ کے معتبر اصحاب نے آپ سے روایت کی ہیں اور

آپ کے بعد آپ کے شیعوں نے ان کو مدوّن کیا ہے۔

یہ کتاب نیک عمل شیعوں میں بڑی محترم اور مقدّس مانی جاتی ہے۔ یہ لوگ اس میں شامل دعاؤں کو رات دن اور صبح و شام طلب حاجات کے لیے پابندی سے پڑھتے رہتے ہیں۔

اس کی شب ہائے ماہ رمضان کی بعض دعاؤں میں آیا ہے کہ: بارِ الٰہا! تیرا گناہ کرنے سے میرا مطلب تیری مخالفت کرنا نہیں تھا۔ جب میں نے تیری نافرمانی کی تو میں تیری نافرمانی کا قصد نہیں رکھتا تھا نہ میں تجھ سے شکایت کر رہا تھا اور نہ تیری سزا کو حقیر سمجھ رہا تھا۔ نہ تیرے عذاب پر اعتراض کر رہا تھا۔ البتہ میرے نفس نے مجھ کو دھوکا دیا اور اس پر تیری ستر پوشی نے میری اعانت کی۔ اب مجھ کو تیرے عذاب سے کون بچائے گا اور اگر تو مجھ سے اپنی رسّی کو قطع کرے گا تو پھر میں کس رسّی کو پکڑوں گا۔ جب کل (قیامت) کا دن ہوگا اور گناہوں کے ہلکے وزن والوں سے کہا جائے گا کہ گزر جاؤ اور گناہوں کے بھاری وزن والوں سے کہا جائیگا کہ تم یہیں گر پڑو۔ تو کیا میں ان چھوٹے گناہگاروں کے ساتھ گزر سکوں گا یا بڑے گناہگاروں کے ساتھ (عذاب میں) پڑا رہوں گا۔

اسی دعا میں آپ کہتے ہیں: اے اللہ! میرے اوپر رحم کر۔ میری حجت قطع ہوگئی ہے۔ میری زبان تیرے سامنے جواب دینے سے قاصر ہے اور میری عقل تیرے سوال پر بے بس ہوگئی ہے۔

اے اللہ اگر تو معاف کرتا ہے تو معاف کرنے کے لیے تجھ سے زیادہ سزاوار کون ہے؟ اور اگر تو عذاب کرتا ہے تو فیصلہ کرنے میں تجھ سے زیادہ عادل کون ہے۔ (اے اللہ) مجھ پر رحم کر، اس دنیا میں میری حالتِ مسافرت پر، موت کے وقت میری بے چینی پر، قبر میں میرے اکیلے پن پر اور لحد میں میری تنہائی پر۔

(اے اللہ) میرے اوپر رحم کر، جب میرے احباب بستر پر مجھ کو کروٹیں بدلواتے ہوں، اس وقت جب میں تختۂ غسل پر لٹا دیا جاؤں اور میرا نیک پڑوسی مجھ کو غسل دے۔ جب میں (دفن کے لیے) لے جایا جاؤں اور میرے رشتے دار میرے جنازے کے چاروں طرف موجود ہوں، اس نئے گھر میں میری تنہائی اور اس لحد میں مجھ پر رحم فرما!

اس کے بعد اپنی اس دعا میں، امامؑ اپنے لیے، اپنے اہل وعیال کے لیے، اپنے بھائیوں کے لیے، اپنے پڑوسیوں کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا فرماتے ہیں اور پھر کہتے ہیں:

میرے اللہ، میرے آقا! تیری عزت و جلال کی قسم کہ اگر تو میرے گناہوں کے متعلق مجھ سے سوال کرے گا تو میں تجھ سے تیرے عفو کا طلبگار رہوں گا۔ اگر تو میری خطاؤں کی پرسش کرے گا تو میں تجھ سے تیری بخشش کا طالب ہوں گا۔ اگر تو مجھ کو آتش جہنم میں ڈالے گا تو میں اہل جہنم کے سامنے تجھ سے اپنی محبت کا ذکر کروں گا۔ اے اللہ اگر تو صرف اپنے دوستوں اور اطاعت کرنے والوں کو بخشے گا تو گنہگار کس کی پناہ تلاش کریں۔ اگر تو صرف اپنے وفا کرنے والوں ہی کی بخشش کرے گا تو خطاکار کس سے فریاد کریں۔ اے خدا اگر تو مجھ کو جہنم میں ڈال دے گا تو اس میں تیرے دشمنوں کو خوشی ہو گی لیکن اگر تو مجھ کو جنت میں داخل کرے گا تو اس سے تیرے نبیؐ کو خوشی ہو گی۔ بخدا میں خوب جانتا ہوں کہ تیرے لیے تیرے نبیؐ کی خوشی اپنے دشمن کی خوشی سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اے اللہ مجھے اپنے دین کے لیے خوفِ جہنم، اپنے احکام کے لیے سمجھ اور اپنے علم کے لیے ادراک عطا کر دے۔ مجھ کو وہ پرہیزگاری دے جو مجھے تیری نافرمانی سے بچالے۔

اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کاہلی سے، بزدلی سے، کنجوسی سے، بے پروائی سے، سنگدلی سے، ذلّت سے، مسکینی سے، ناداری سے اور فاقہ کشی سے۔ اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں، ایسے نفس سے جس میں قناعت نہ ہو، ایسے شکم سے جو سیر نہ ہوتا ہو، ایسے قلب سے جو خوف نہ کرے، ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے اور ایسے عمل سے جو نفع نہ بخشے۔

اے اللہ تو نے اپنی کتاب میں عفو نازل کیا ہے اور ہم کو حکم دیا ہے کہ جو کوئی ہم پر ظلم کرے ہم اس کو معاف کر دیا کریں۔ ہم نے ضرور اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ پس تو ہم کو معاف کر دے، کیونکہ تو معاف کر دینے کا ہم سے زیادہ سزاوار ہے۔

دُعائے مَکارِمُ الاَخلاق

اے اللہ میرے لیے اپنے رزق میں وسعت کر دے، لیکن افراط سے میری آزمائش نہ کر۔ مجھ کو عزت عطا کر، لیکن مجھ کو غرور میں مبتلا نہ کر۔ مجھے اپنا عبادت گزار بنا لے لیکن میری عبادت کو گھمنڈ سے خراب نہ ہونے دے۔ میرے ذریعے سے لوگوں میں بھلائی پھیلا دے لیکن اس کو احسان جتانے سے برباد نہ ہونے دے۔ اے اللہ لوگوں کے درمیان میرے مرتبہ میں کوئی درجہ بلند نہ کر جب تک میں اپنے نفس کو اتنا ہی کچل نہ ڈالوں۔ مجھ کو اس وقت تک ظاہری عزّت عطا نہ کر

جب تک میں اسی حد تک اپنے نفس کو باطن میں ذلیل نہ کرلوں۔ اے اللہ مجھ میں کوئی عیب دار خصلت ایسی نہ رہنے دے کہ جس کی میں اصلاح نہ کرلوں۔ نہ ایسی خرابی رہنے دے۔ جو داغدار بناتی ہو اور جس کو میں درست نہ کرلوں۔ نہ کسی اچھے عمل میں ایسی کمی رہنے دے جس کو میں پورا نہ کردوں۔

اے اللہ مجھے اس شخص کی فرمانبرداری کی توفیق دے جو میری اصلاح کرے اور اس کی اطاعت کرنے کی جو مجھے راہ دکھادے۔ مجھے ایسا راست رو بنادے کہ جو شخص مجھ کو ورغلائے میں اس کو نصیحت کروں، جو مجھ سے کنارہ کشی کرے میں اس کے ساتھ نیکی سے پیش آؤں۔ جو مجھ کو کسی شئے سے محروم کرے میں اس کے ساتھ سخاوت کا برتاؤ کروں۔ جو میری قرابت کا خیال نہ کرے میں اس کی مدد کروں اور جو میری غیبت کرے میں اس کا مقابلہ اس کے اچھے ذکر سے کروں۔

اے اللہ! مجھے ایسا بنادے کہ میں اچھے سلوک پر شکریہ ادا کروں اور برائی سے چشم پوشی کروں۔

اسی مناجات میں آپ فرماتے ہیں:

اے اللہ مجھ کو ایسا کردے کہ میں ضرورت کے وقت تیری طرف رجوع کروں۔ حاجت کے لیے تجھ ہی سے سوال کروں۔ تنگدستی کی حالت میں تیرے ہی سامنے اپنی حالت بیان کروں۔

اے اللہ میری اس طرح آزمائش نہ کرکہ جب میں پریشان ہوں تو تیرے علاوہ کسی اور سے مدد طلب کروں۔ جب میں نادار ہو جاؤں تو تیرے علاوہ کسی اور کے سامنے سوال کرنے کے لیے جھکوں کیونکہ میں ایسا جب ہی کروں گا جب تو مجھ کو چھوڑ دے گا، مجھ کو محروم رکھے گا اور مجھ سے روکش ہو جائے گا اے سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے۔

اس کے لیے امام ع کی دعا جس نے آپ پر ظلم کیا

جو کوئی آپ سے بُرا سلوک کرتا آپ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے ہی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ سے عفو اور بخشش کی دعا کرتے اور فرماتے: اے اللہ اگر کسی شخص نے مجھ کو تکلیف دی ہے اور جو رنج مجھ کو اس

سے پہنچا ہے اس پر اس کو معاف کر دے اور ایسے لوگوں کو میری طرف سے معاف کر دینے اور ان کے ساتھ میرے سلوک کو صدقہ دینے والوں ہیں۔ بہترین صدقہ اور مقرب بندوں کی بہترین عطا قرار دے اور میرے ان کو معاف کر دینے کے عوض تو مجھ کو معاف کر دے تاکہ ہم میں سے ہر ایک تیرے فضل کی بدولت سعادت حاصل کرے اور تیرے احسان کے سائے میں عذاب سے نجات حاصل کر لے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ حقوق عباد کے ادا کرنے میں اپنے آپ کو بری الذمہ خیال نہ کرتے تھے اور اللہ کے حضور میں اس کے لیے معذرت فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دعا میں آپ فرماتے ہیں:

اے اللہ میں تیرے حضور میں معذرت کرتا ہوں، اس شخص کے بارے میں جس پر میرے سامنے ظلم کیا گیا اور میں نے اس کی مدد نہیں کی۔ ایسی نیکی کے بارے میں جو کسی نے میرے ساتھ کی ہو اور میں نے اس کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ ایسی برائی کے لیے جس کی معذرت کسی نے مجھ سے کی اور میں نے عذر قبول نہیں کیا، ایسے صاحبِ احتیاج کے بارے میں جس نے مجھ سے سوال کیا اور میں نے اس کو اپنے اوپر ترجیح نہیں دی۔ کسی مسلمان کے ایسے گناہ کے بارے میں جو میرے اوپر ظاہر ہو گیا اور میں نے اس کو چھپایا نہیں اور ہر ایسے گناہ کے بارے میں جس کا موقع مجھ کو ملا اور میں اس سے کنارہ کش نہیں رہا۔ میں جن خطاؤں میں جا پڑا ان پر میری ندامت کو اور میرے اس عزم کو کہ جو برائیاں میرے سامنے آئیں گی میں ان سے باز رہوں گا، میری توبہ قرار دے کہ جو مجھ کو تیری محبت کا حقدار بنا دے۔ اے توبہ کرنیوالوں سے محبت کرنیوالے۔

آپ تنہائی کے لمحات میں اللہ تعالیٰ سے مسلمانوں کے سرحدی علاقوں میں لڑنے والوں اور حفاظتی فرائض انجام دینے والوں کے لیے دعا کیا کرتے تھے اور اللہ سے ان کے لیے صبر اور دشمنان اسلام کے خلاف تائید اور نصرت طلب فرمایا کرتے تھے۔

سرحدی علاقوں کی سپاہ اور کفار سے جنگ کرنیوالوں کیلئے آپکی دعا

اے اللہ!

محمدؐ و آل محمدؐ پر صلوات بھیج اور اپنی قدرت سے مسلمانوں کی سرحدوں کی حفاظت فرما۔ اپنی قوت سے ان کی حفاظت کرنے والوں کی مدد فرما۔ اپنی عظمت سے ان کے روزینہ میں وسعت بخش دے۔ ان کی تعداد میں زیادتی عطا کر، ان کے ہتھیاروں کو تیز کر دے۔ ان کی اقامت گاہوں کی حفاظت فرما۔ ان کی پناہ گاہوں سے خطروں کو دور رکھ۔ ان کی جمعیت کو یکجا رکھ۔ ان کے معاملات کا انتظام فرما۔ ان کو صبر کے ذریعہ قوت عطا فرما۔ اپنی نصرت سے ان کی اعانت کر۔ دشمن سے مقابلہ کے وقت فریب کار دنیا کی یاد ان کے ذہنوں سے مٹا دے۔ ان کے دلوں سے فتنہ خیز مال کا خیال دُور کر دے۔ جنت کو ان کی آنکھوں میں بسا دے تاکہ ان میں سے کوئی پیٹھ پھیرتے اور دشمن کے مقابلہ سے فرار کا خیال نہ کرے۔ اے اللہ! اگر تیرے ماننے والوں میں سے کوئی شخص ان کفار سے جنگ کرے یا تیرے دین کی پیروی کرنے والوں میں سے کوئی مجاہد ان سے جہاد کرے تاکہ تیرا دین بلند تر ہو جائے۔ تیری جماعت قوی تر ہو جائے اور تیرا مقصد زیادہ قابل حصول ہو جائے، تو اس کے لیے آسانی پیدا کر دے، اس کے لیے سازو سامان مہیا کر دے۔ اس کو کامیابی سے ہمکنار کر دے۔ اس کو صبر کی قوت عطا کر۔ اس کے لیے نصرت کو آسان کر دے۔ اس کے لیے اچھے ساتھی مہیا کر۔ اس کے سامانِ خورد و نوش میں وسعت عطا کر۔ اس کو قلبی مسرت عطا کر اور سلامتی میں رکھ۔ اس کو بزدلی سے دُور رکھ۔ اس کو جرأت عطا کر۔ سخت کوشی کی قوت دے۔ اس کو نصرت سے سرفراز کر اور اس کے فکر اور ذکر کو، اس کی حالت سفر اور اس کے حضر کو اپنے لیے قرار دے لے۔ اے سب رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحیم!

آپ محافظین و مجاہدین کے لیے اس دعا کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

اے اللہ! مشرکوں کو مشرکوں سے مصروف پیکار کر کے ان کو مسلمانوں کی سرحدوں سے دور رکھ۔ ان کی تعداد میں کمی کر دے تاکہ رفتہ رفتہ نابود ہو جائیں۔ ان کو پراگندہ کر دے تاکہ وہ مسلمانوں پر چڑھائی نہ کر سکیں۔ اے اللہ ان کے دلوں کو اطمینان سے اور جسموں کو قوت سے محروم کر دے۔ ان کے دلوں سے مکر و فریب کو بھلا دے۔ ان کے طاقتور لشکریوں کو غازیان اسلام کے مقابلہ میں کمزور کر دے۔ ان کو بہادروں سے

مقابلہ میں بزدل بنادے۔ ان سے کافروں کی مدد کو دُور رکھ۔ ان کے ذہنوں پر رعب طاری کردے اور ان کے ہاتھوں کی قوت سلب کرلے۔

اے اللہ! جو مسلمان کسی غازی یا سرحد کے محافظ کے گھر کا نگہبان ہو یا محاذ پر جانیوالے کسی مجاہد کی غیر موجودگی میں اس کے عیال کی دیکھ بھال کرے یا اپنے مال سے اسکی اعانت کرے یا اس کے لیے ہتھیار مہیّا کرے یا اس کو جہاد کے لیے ترغیب دلائے یا اس کے سامنے خود بھی اس کے بعد جانے کی آمادگی ظاہر کرے یا اس کے پیچھے اس کی حرمت کا خیال رکھے تو اس کو بھی اس کے برابر اور اسی نوعیت کی جزا دے اور اس کے اس فعل کے بدلہ میں فوری نفع اور مسرّت عطا کر یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جس کے لیے تو نے اپنے فضل و کرم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

اے اللہ جو مسلمان اسلام کے لیے فکر مند ہو کر اور اہل شرک کی مسلمانوں کے خلاف گروہ بندی سے متاثر ہو کر لڑنے کا ارادہ کرے، لیکن کمزوری کی وجہ سے بیٹھا رہ جائے یا ناداری کی وجہ سے رک جائے یا کوئی حادثہ اس کو ٹھیرا دے یا کوئی رکاوٹ اس کے ارادہ میں حائل ہو جائے تو اس کا نام عبادت گزاروں میں درج فرمالے اور اس کو مجاہدوں کا سا ثواب عطا کر اور اس کو شہداء و صالحین کے زمرے میں شمار فرما!

آپ اپنے والدین کے لیے یہ دعا فرماتے تھے :

اے اللہ! مجھ کو ایسا بنادے کہ میں اپنے والدین سے اس طرح ڈروں جیسے کسی جابر فرمانروا سے ڈرا جاتا ہے۔ میں ان کے ساتھ ایسی نرمی سے پیش آؤں جیسے مہربان ماں اولاد پر شفقت کرتی ہے۔ میرے والدین کے لیے میری اطاعت اور نیک سلوک کو میری آنکھوں کے لیے نیند سے زیادہ شیریں بنادے۔ میرے دل کے لیے اس کو پیاسے کے لیے شربت سے زیادہ ٹھنڈا بنادے تاکہ میں اپنی خواہش پر ان کی خواہش کو ترجیح دوں اور اپنی مرضی پر ان کی مرضی کو مقدم قرار دوں۔ ان کی تھوڑی نیکی کو بھی اپنے اوپر زیادہ سمجھوں اور ان کے ساتھ اپنے نیک سلوک کو کم خیال کروں خواہ وہ زیادہ ہی ہو۔

اے اللہ میری تربیت کرنے کے عوض میرے والدین کو جزائے خیر دے۔ میرے اوپر مہربانی کرنے کے بدلہ میں ان کو ثواب عطا کر۔ ان کو میرے بچپنے میں میری حفاظت کرنے کا

صلہ دے۔ اے اللہ! میری طرف سے ان کو جو تکلیف پہنچی ہو یا کوئی رنج دامنگیر ہوا ہو یا ان کا کوئی حق ضائع ہوا ہو تو اس کو ان کے گناہوں کے لیے ذریعۂ بخشش، ان کے مراتب میں بلندی کا وسیلہ اور ان کی نیکیوں میں اضافے کا موجب قرار دے۔ اے سب رحم کرنیوالوں سے زیادہ رحیم۔

دعاؤں کے ان منتخب ٹکڑوں کے علاوہ صحیفۂ سجادیہ میں طلب رزق، ادائے قرض، طلب حاجات، عفو و مغفرت، دشمنوں کی چالوں سے حفاظت کے لیے دسیوں دعائیں شامل ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ ان کے ذریعہ سے اپنے والدین، اپنی اولاد اور اپنے پڑوسیوں کے لیے دعا کرتا رہے۔ علاوہ ازیں صبح و شام، ایام ہفتہ، موت کی یاد اور ماہ رمضان کے لیے دعائیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس صحیفہ میں احکام، آداب اور اخلاق پر مشتمل بڑا قیمتی مواد ہے۔ جس کو پڑھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے انسان روحانی ترقی کرتے ہوئے اللہ کا تقرب حاصل کرسکتا ہے۔

رسالۂ حقوق

اکثر محدثین نے اپنی کتب حدیث میں یہ روایات بیان کی ہیں کہ امام زین العابدینؑ نے وہ سب حادثات دیکھے جو آپ کے آباءؑ کرامؑ کو پیش آتے رہے۔ چنانچہ جب آپ نے دیکھا کہ اموی عہد حکومت میں امت ظلم و ستم کا شکار ہے اور یہ فرمانروا پیغام الٰہی کے مفہوم کو بدل ڈالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں تو آپ نے اپنے اصحاب اور اپنے آباءؑ کرامؑ کے ماننے والوں کے لیے ایک رسالہ رقم فرمایا۔ یہ رسالہ پچاس مباحث پر مشتمل ہے۔ اس میں لوگوں کے حقوق اور ان کے فرائض درج کیے گئے تھے۔

یہ رسالہ محدثین کے درمیان "رسالۂ حقوق" کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ صدوق نے اس کو اپنی کتاب الخصال میں امامؑ سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام زین العابدینؑ کے حالات کے ضمن میں بیشتر مصنفین نے اس رسالے کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً علی بن شعبہ نے اس کو اپنی کتاب "تحف العقول" میں ابی حمزہ ثمالی پر منتہی ہونے والی سند سے روایت کیا ہے۔ امامؑ نے اس کی ابتداء اپنے اس قول سے فرمائی ہے:

اللہ تم پر رحم فرمائے، تم کو جاننا چاہیے کہ تم پر اللہ کے کچھ حقوق ہیں، جو ہر اس

حرکت پر جو تم کرو، تمہارے ہر سکون پر جب تم پر سکون رہو، تمہارے ہر مقام پر جہاں تم جاؤ، ہر عضوِ بدن پر جس سے تم کام لو اور ہر اس چیز پر وہ حقوق حاوی ہیں جو تم استعمال کرو۔

پس تم پر اللہ کے سب سے اہم حقوق وہ ہیں جو تمہارے سر سے پیر تک مختلف اعضاء کے بارے میں تم پر واجب ہیں۔ چنانچہ تمہاری آنکھ کے لیے تم پر حق ہے، کان کے لیے تم پر حق ہے، تمہاری زبان کے لیے تم پر حق ہے، تمہارے ہاتھ کے لیے تم پر حق ہے اور تمہاری شرمگاہ کے لیے تم پر حق ہے۔ پھر امامؑ اعضاء کے حقوق سے افعال کے متعلق حقوق کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے ان حقوق کی طرف جاتے ہیں جو انسان پر اپنے معاشرہ کے لیے، اپنے بھائیوں کے لیے، اپنے پڑوسیوں کے لیے، اپنے حاکم کے لیے، اپنے خاص دوستوں کے لیے، اپنے ہم نشینوں کے لیے، اپنے ساتھیوں کے لیے، اپنے شرکاء کے لیے، اپنے خدمت گاروں کے لیے اور اپنی بیویوں کے لیے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ دوسرے حقوق بھی ہیں۔

حاکم کے حقوق کے بارے میں اس میں ہے کہ: اس کو راضی رکھنے کے لیے سرکاری واجبات اس قدر خوشدلی سے ادا کرو کہ تم اس کی گرفت سے دور رہ سکو اور وہ تمہارے دین کے لیے ضرر رساں نہ ہو۔ پھر اس معاملہ میں اللہ سے مدد بھی طلب کرتے رہو۔ مزید یہ کہ تم اس سے دشمنی نہ رکھو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کے ساتھ بھی اور خود اپنے ساتھ بھی زیادتی کرو گے کیونکہ اس طرح تم اپنے آپ کو اس کے بُرے سلوک کا نشانہ بنا لو گے اور اس کو اس بات پر آمادہ کر لو گے کہ وہ تم کو تباہ و برباد کر ڈالے۔ تمہارے لیے یہ زیادہ مناسب ہے کہ تم اپنی خاطر اس کے مددگار رہو اور جو کچھ وہ تمہارے لیے کرتا ہے اس میں شریک رہو اور طاقت صرف اللہ ہی کی ہے۔

معلّم کے حقوق بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: تم پر اس کا حق ہے کہ تم اس کی تعظیم کرو۔ اس کی مجلس کا وقار قائم رکھو، اس کی بات کان لگا کر سنو، خود اس کی طرف بڑھو اور اس کے ساتھ اس طرح رہو کہ تم اس کے علم سے بے نیاز نہیں ہو۔ گویا کہ تمہاری عقل اس کے سامنے بیدار رہے، تمہاری سمجھ اس کے سامنے حاضر رہے، تمہارا

دل اس کے لیے صاف رہے، تمہاری نظر اس کے لیے روشن رہے اور تم لذتوں اور خواہشوں کو ترک کیے رہو۔ اس کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کرو۔ وہاں تم کسی کے سوال کا جواب نہ دو۔ بلکہ وہی معلم جواب دے۔ اس کی صحبت میں تم کسی اور سے بات مت کرو۔ اگر تمہارے سامنے اس کی برائی کی جائے تو تم اس کی طرف سے صفائی پیش کرو۔ اس کے عیوب کو چھپاؤ، اس کی خوبیوں کو نمایاں کرو، اس کے دشمن کی صحبت اختیار نہ کرو اور اس کے دوست سے دشمنی نہ کرو۔

اولاد پر ماں کے حقوق کے متعلق آپ نے فرمایا: تمہاری ماں کا حق یہ ہے کہ تم اس بات کو مدِّنظر رکھو کہ اس نے تم کو اس طرح اٹھائے رکھا کہ جس طرح کوئی کسی کو نہیں اٹھاتا۔ اس نے تم کو اپنے دل کے جو ہر سے غذا پہنچائی ہے جو کوئی اور کسی کو نہیں پہنچاتا۔ اس نے خوشی خوشی اپنے کان، اپنی آنکھ، اپنے ہاتھ، اپنے پیر، اپنے بالوں، اپنے چہرہ اور اپنے تمام اعضاء کے ذریعے سے تمہاری پرورش کی اور اس کے لیے اپنے اوپر ناگواری، رنج، ملال اور غم برداشت کیا ہے۔ یہاں تک کہ قدرت نے تم کو اس میں سے نکالا اور تم کو زمین پر لا رکھا۔ اب وہ اس پر خوش رہی کہ تم کو سیر کرے اور خود بھوکی رہ جائے، تم کو پہنائے اور خود محروم رہ جائے، تم کو سیراب کرے اور خود پیاسی رہ جائے، تم کو سایہ بہم پہنچائے اور خود دھوپ میں جھلسا کرے، تم کو آسائش میں رکھے اور خود دکھ اٹھایا کرے اور تم کو آرام کی نیند سلائے اور خود بے چینی میں جاگا کرے۔ پس تم اپنی ماں کے ان احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے اور نہ اللہ کی مدد اور توفیق کے بغیر تم اس پر قدرت رکھتے ہو۔

ایک بھائی پر اپنے بھائی کے حقوق کے متعلق آپ نے فرمایا: وہ تمہارا ہاتھ ہے جس کو تم پھیلاتے ہو، وہ تمہاری کمر ہے جس پر تم سہارا لیتے ہو، وہ تمہاری عزت ہے جس پر تم بھروسہ کرتے ہو اور وہ تمہاری قوت ہے جس کے ذریعہ تم دشمن پر قابو حاصل کرتے ہو۔ پس تم اپنے اس بازو کو اللہ کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بناؤ، نہ بندگانِ خدا پر ظلم کرنے کا سامان قرار دو۔ خود اس بھائی کے نفس کے خلاف اس کی نصرت کرنے، دشمن کے خلاف اس کی مدد کرنے، اس کے اور اس کے شیطانوں کے درمیان حائل ہونے،

اس کو نصیحت کرنے اور اللہ کے معاملہ میں اس کی مخالفت کرنے سے کبھی دریغ نہ کرو۔ پس اگر وہ اللہ کی جانب مائل ہو جائے اور اس کے احکام مانتا ہے تو خیر ورنہ اللہ اس سے زیادہ تم سے مواخذہ کرے گا۔

پڑوسیوں کے حقوق کے متعلق آپ نے فرمایا: پڑوسی کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اس کی غیر موجودگی میں اس کے ناموس کی حفاظت کرو، اس کی موجودگی میں اس کی عزّت کرو اور ان دونوں حالتوں میں اس کی نصرت اور مدد کرتے رہو۔ اس کی کسی باعث شرم بات کا پیچھا نہ کرو، نہ اس کے کسی عیب کو کرید کر معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تم کو ایسی بات بلا ارادہ معلوم بھی ہو جائے تو جو کچھ تم کو معلوم ہو گیا ہے اس کے لیے تم محفوظ قلعہ اور رازداری کا ایسا مقام بن جاؤ کہ اگر اسکو نیزے سے بھی کریدیں تو وہ اس کے رازوں تک رسائی نہ پاسکیں۔ اس کی باتوں کو ایسی حالت میں سننے کی کوشش نہ کرو کہ اس کو تمہاری موجودگی کا علم نہ ہو۔ اس کی تنگی میں اس کا ساتھ نہ چھوڑو اور فراخی کی حالت میں اس سے حسد نہ کرو۔ اس کی خطاؤں کو معاف کرو اور غلطیوں سے درگزر کرو۔ اگر وہ تم سے جہالت کا برتاؤ کرے، پھر بھی تم اس سے حلم سے پیش آؤ۔

ایک ہم نشین کے حقوق کے متعلق آپ نے فرمایا: تم پر فرض ہے کہ جس قدر تمہاری رسائی ہے اس سے بھی بڑھ کر اپنے اس ہم نشین کے ساتھ سلوک کرو۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر تمہارا یہ سلوک انصاف سے ہٹ کر نہ ہو۔ تم اس کی ویسی ہی عزت کرو جیسی وہ تمہاری کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس عزت کرنے کے عمل میں وہ تم پر سبقت لے جائے۔ اگر وہ سبقت لے جائے تو تم اپنی طرف سے اس کمی کو پورا کردو۔ اپنے اوپر لازم سمجھتے ہوئے اس کو نصیحت کرتے رہو۔ اس کی آبرو کی حفاظت کرتے رہو۔ اللہ کی اطاعت میں اس کی دستگیری کرتے رہو۔ جن معاملات میں اس کو اللہ کی نافرمانی کا خوف دامنگیر ہو، ان میں اس کے نفس کی مدد کرو۔

ایک انسان کے اپنا مال صرف کرنے کی حدود کے متعلق فرمایا: تم پر فرض ہے کہ دولت صرف حلال طریقہ سے حاصل کرو اور صرف حلال ہی طریقہ پر صرف کرو۔ اس کو اس کے خرچ کے لیے مقررہ مقامات سے نہ ہٹاؤ، کیونکہ وہ اللہ سے ملی ہے، اس لیے

اس کو اسی کی خاطر اور اسی تک پہنچنے کا ذریعہ بناؤ۔ وہ کسی ایسے کو مت دو کہ جو کہ نہ تو تمہارا شکریہ ادا کرے گا اور نہ اس سے اللہ کی فرمانبرداری کے کام کرے گا، بلکہ اس کو غنیمت کے طور پر لے کر اس سے گناہ، اندوہ، ندامت اور دوسرے بُرے نتائج حاصل کرے گا۔

انسان پر کسی نصیحت کرنے والے کے حقوق کے متعلق فرمایا: تم پر فرض ہے کہ ایسے شخص کے سامنے اپنے بازوؤں کو انکساری کے طور پر جھکا دو۔ اس کے لیے اپنا قلب کشادہ کر دو۔ اس کے سامنے اپنے کان کھلے رکھو۔ تاکہ تم اس کی نصیحت کو سمجھ سکو اور اس پر غور کرو۔ اگر نصیحت کرنے میں وہ شخص اللہ کی طرف توفیق پائے ہوئے ہے تو خوب ورنہ تم نے اس کے ساتھ نیک سلوک کیا اور اس کو قابل الزام نہیں ٹھیرایا۔ نیز تم کو معلوم ہو گیا کہ وہ تم کو نصیحت کرنے سے دریغ نہیں کرتا ہے۔ اگر وہ تمہارے نزدیک قابل الزام ہے تو کسی حال میں بھی اس کے معاملہ میں دخل نہ دو۔ اللہ کے علاوہ کوئی صاحب قوت نہیں ہے۔

جو شخص دوسروں کو مسرت بہم پہنچائے، اس کے حقوق کے متعلق فرمایا: اگر اس نے خاص ارادے سے تم کو مسرت بہم پہنچائی ہے تو پہلے اللہ کی حمد بجالاؤ۔ پھر اس شخص کا شکریہ ادا کرو اور نیکی میں پہل کرنے پر اس کو اچھا بدلہ دینے کا موقع دیکھتے رہو۔ اگر یہ مسرت بہم پہنچانے میں اس کا ارادہ شامل نہ تھا تو پہلے اللہ کی حمد بجالاؤ، پھر اس کا شکریہ ادا کرو۔ کیونکہ وہ تم کو اس نعمت الٰہی کے حاصل ہونے کا سبب بنا۔ تم اس کے لیے جزائے خیر کی دعا کرو۔ اس لیے کہ نعمت کے حاصل ہونے کے اسباب بہرحال باعث برکت ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کہیں سے بھی وجود میں آئیں اور کسی کے خاص ارادہ کا نتیجہ نہ بھی ہوں۔

اہل ذمّہ کے حقوق کے متعلق آپ نے فرمایا: ان کے بارے میں حکم یہ ہے کہ تم ان سے وہ قبول کر لو جو اللہ نے قبول کیا ہے۔ ان کے لیے وہ پیمان اور عہد کافی ہے جو اللہ نے ان سے کیا ہے۔ جب تمہارے اور ان کے مابین کوئی معاملہ پیدا ہو جائے تو ان کے بارے میں ویسا ہی فیصلہ کرو جیسا تم اپنے آپ کے لیے کرتے۔ تمہارے ان پر ظلم کرنے کی راہ میں یہ امر حائل رہنا چاہیے کہ اللہ اور اسکے رسولؐ کے پیمان کی رعایت اور عہد کی وفا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جس کسی نے اپنے فریق معاہدہ پر ظلم کیا میں اس کا مدمقابل ہو جاؤں گا۔ پس تم کو ان کے معاملہ میں ڈرتے رہنا چاہیے اور اللہ کے

علاوہ کوئی صاحب طاقت وقوت نہیں ہے۔

امام زین العابدینؑ کے اقوال

روایت ہے کہ آپ نے اپنے ایک بیٹے سے فرمایا: اللہ تیرے لیے مجھ سے راضی ہے اور میرے لیے تجھ سے راضی نہیں ہے۔ ہاں تو اس نے تجھ کو میرے حق میں وصیت کی لیکن تیرے حق میں مجھ کو وصیت نہیں کی۔ پس تجھ پر میرے ساتھ نیکی کرنا لازم ہے کیونکہ یہ ایک بڑا قیمتی تحفہ ہے۔

آپ نے فرمایا لوگوں سے حاجت طلب کرنا زندگی کے لیے باعثِ ذلت ہے۔ یہ رویہ حیاء کو زائل کرتا ہے، وقار کو کم کرتا ہے اور یہ ناداری کی دلیل ہے۔ اس طرح حاجتوں کے طلب کرنے میں کمی کرنا سیر چشمی کی علامت ہے۔

امامؑ نے فرمایا: تم میں اللہ کے نزدیک محبوب وہ ہے جو سب سے زیادہ نیک عمل کرتا ہے۔ تم میں اللہ کے نزدیک عمل میں سب سے عظیم وہ ہے جو اللہ کی طرف زیادہ رغبت رکھتا ہے۔ تم میں عذابِ خدا سے نجات پانے کا زیادہ حقدار وہ ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرتا ہے۔ تم میں سب سے بڑھ کر اللہ سے قریب وہ ہے جس کے اخلاق میں سب سے زیادہ وسعت ہے۔ تم میں اللہ کی رضا کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہے جو اپنے عیال کو سب سے بڑھ کر آسائش پہنچاتا ہے۔ تم میں سب سے بڑھ کر باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی نافرمانی سے دور رہتا ہے۔

آپ نے اپنے کسی بیٹے سے فرمایا: بیٹے! خیال رکھنا کہ پانچ شخصوں سے نہ صحبت رکھنا نہ ہمکلام ہونا اور نہ ان کا ہمسفر ہونا۔ بیٹے نے پوچھا: بابا جان! وہ کون ہیں؟ اس پر آپ نے فرمایا: (۱) جھوٹے کی صحبت سے بچے رہنا کیونکہ اس کی مثال سراب کی سی ہے کہ وہ تم کو دُور کی چیز قریب اور قریب کی چیز دُور کر کے دکھاتا ہے۔ (۲) بدکار کی صحبت سے بچے رہنا کیونکہ وہ تم کو ایک وقت کے کھانے یا اس سے بھی کم میں بیچ ڈالے گا۔ اس پر آپ کے بیٹے نے کہا: کھانے سے کم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جس چیز کی خواہش ہو اور وہ حاصل نہ ہو سکے۔ (۳) کنجوس کی صحبت سے بچے رہنا کیونکہ وہ تم کو اس وقت چھوڑ دے گا جب تم کو اس کی مدد کی زیادہ ضرورت ہو گی۔ (۴) بیوقوف کی صحبت سے بچے رہنا کیونکہ وہ چاہے گا کہ تم کو فائدہ پہنچائے لیکن

الٹا نقصان پہنچادے گا۔ (۵) رشتہ داروں سے بے رخی کرنے والے سے بچے رہنا کیونکہ میں نے اس کو کتاب خدا میں ملعون پایا ہے۔

آپ نے فرمایا: تین خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی مومن میں ہوں تو وہ اللہ کی پناہ میں رہے گا۔ قیامت کے روز اللہ اس کو عرش کے سایہ میں جگہ دے گا اور اس عظیم دن کی پریشانی سے امن عطا کرے گا۔ پہلا وہ جو دوسروں سے ویسا ہی سلوک کرے جیسا وہ ان سے اپنے لیے چاہتا ہے۔ دوسرا وہ جو نہ ہاتھ ہلاتا ہے نہ پیر جب تک یہ معلوم نہ کرلے کہ اس کا اقدام اللہ کی اطاعت میں ہے یا اس کی نافرمانی میں۔ تیسرا وہ جو اپنے بھائی پر کوئی عیب نہیں لگاتا تاوقتیکہ اس کو اپنے آپ سے دُور نہ کرے۔ پس آدمی کے لیے بہتر کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے عیبوں کے بجائے اپنے عیب دیکھتا رہے۔

آپ نے اپنے فرزند امام باقرؑ سے فرمایا: ہر اس شخص کے ساتھ بھلائی کرو جو تم سے اس کا خواہشمند ہو کیونکہ اگر وہ اس کا حقدار ہے تو تم نے اس عمل کو صحیح مقام پر انجام دیا ہے۔ اگر وہ اس کا حقدار نہیں ہے تو پھر تم تو ضرور بھلائی کرنے کے اہل تھے۔ نیز یہ کہ اگر کوئی شخص تم کو داہنی طرف آکر بُرا کہے اور بائیں طرف جاکر معذرت کرے تو تم اس کے عذر کو قبول کرلو۔

طاؤس یمانی بیان کرتے ہیں: میں نے ایک شخص کو خانۂ کعبہ میں میزاب (پرنالہ) کے نیچے نماز ادا کرتے اور رو رو کر دعائیں مانگتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ اپنی نماز سے فارغ ہوا تو میں نے جاکر دیکھا کہ وہ امام زین العابدین علی بن حسینؑ ہیں۔ میں نے آپ سے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! میں نے آپ کو اس حالت میں دیکھا ہے حالانکہ آپ میں تین ایسی خصوصیات ہیں کہ میں امید کرتا ہوں کہ وہ آپ کو ہر خوف سے امن دیتی ہیں۔ پہلی یہ کہ آپ رسول اللہؐ کے فرزند ہیں، دوسری آپ کے نانا کی شفاعت اور تیسری اللہ کی رحمت!

اس پر آپ نے فرمایا: اے طاؤس! یہ تعلق کہ میں رسول اللہؐ کا فرزند ہوں، مجھ کو عذاب آخرت سے نہیں بچاتا کیونکہ میں نے اللہ کا یہ کلام سنا ہے: فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ. یعنی اس روز لوگوں کے مابین رشتے نہ رہیں گے۔ (سورۂ مومنون۔ آیت ۱۰۱)

اسی طرح میرے نانا کی شفاعت بھی مجھ کو امن نہ دے سکے گی کیونکہ اللہ فرماتا ہے کہ: وَ لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى۔ یعنی وہ صرف اس کی شفاعت کریں گے جس سے اللہ راضی ہو۔ (سورۂ انبیاء-آیت ۲۸)۔ رہی اللہ کی رحمت تو اللہ فرماتا ہے، اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ یعنی اللہ کی رحمت اچھا عمل کرنے والوں کے قریب ہے۔ (سورۂ اعراف-آیت ۵۶)۔ جبکہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ میں نیک عمل کرنے والوں میں ہوں۔

ایک دوسری روایت کے مطابق، طاؤس یمانی نے بیان کیا ہے کہ میں نے امام علیؑ بن حسینؑ کو اپنی دعا میں یہ کہتے سنا کہ: اے خدائے پاک! تیری نافرمانی یوں کی جاتی ہے جیسے کہ اس کو تو دیکھتا ہی نہیں اور پھر تو اس کو اس طرح گوارا کرتا رہتا ہے گویا تیری نافرمانی ہوتی ہی نہیں۔ تو اپنے بندوں سے اس طرح حسن سلوک اور محبت ظاہر کرتا رہتا ہے گویا ان سے تیری کوئی حاجت وابستہ ہے۔ حالانکہ اے میرے مالک! تو ان سب باتوں سے بے نیاز ہے۔ اس کے بعد آپ سجدہ میں چلے گئے۔

طاؤس کہتے ہیں کہ تب میں نے امامؑ کے قریب جا کر ان کو گلے لگا لیا اور رونے لگا۔ یہاں تک کہ میرے آنسو ان کے رخساروں پر رواں ہو گئے۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھے اور بولے: کس نے مجھ کو اپنے پروردگار کے ذکر سے ہٹا دیا۔ میں نے کہا کہ میں طاؤس یمانی ہوں اور عرض کی کہ اے فرزند رسولؐ! یہ کیسا رونا اور کیسی پریشانی ہے؟ حالانکہ ایسا ہم کو کرنا چاہیے، جو گناہگار اور تہی دامن ہیں۔ اے میرے آقا! آپ کے والد بزرگوار حسینؑ بن علیؑ، آپ کی ماں فاطمہ زہراؑ اور آپ کے نانا رسول اللہؐ ہیں۔ طاؤس کا بیان ہے کہ اس پر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے:

ہائے افسوس اے طاؤس! میرے باپ، ماں اور نانا کی بات نہ کرو کیونکہ اللہ نے جنت اس کے لیے بنائی ہے جو اس کی اطاعت کرے گا اور نیک اعمال بجا لائے گا خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اس نے دوزخ اس کیلئے بنائی ہے جو اسکی نافرمانی کرے اور برے اعمال کا مرتکب ہو خواہ وہ قریشی سردار ہی کیوں نہ ہو۔ کیا تم نے اللہ کا یہ قول نہیں سنا ہے کہ: فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ۔ پھر اس دن جونہی صور پھونکا جائیگا، لوگوں کے مابین رشتے نہ رہیں گے (سورۂ مومنون-آیت ۱۰۱)۔

بخدا! قیامت کے روز نیک عمل کے سوا تم کو کوئی چیز فائدہ نہ دے گی۔

اصول کافی میں ابو حمزہ ثمالی کی سند سے روایت ہے کہ علیؑ بن حسینؑ اپنی مناجات میں رو رو کر فرمایا کرتے تھے: میرے آقا! کیا تو مجھ پہ عذاب کرے گا، حالانکہ میرے دل میں تیری محبت جاگزیں ہے۔ تیری عزت کی قسم! اگر تو نے ایسا کیا تو گویا مجھ کو اور ان لوگوں کو یکجا کر دے گا جن سے میں مسلسل تیری خاطر دشمنی کرتا آیا ہوں۔

امام علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو ادائے امانت کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی کہ جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ اگر میرے والد بزرگوار امام حسینؑ کا قاتل میرے پاس وہ تلوار امانت کے طور پر رکھتا کہ جس سے اس نے انھیں قتل کیا تھا، تو بھی میں اس کو واپس دیدیتا۔

آپ نے احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا: قیامت کے روز اللہ اپنے بندے سے پوچھے گا، کیا تو نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا کہ جس نے تیرے ساتھ حسن سلوک کیا تھا۔ وہ جواب دے گا: اے اللہ! میں نے تیرا شکر ادا کیا تھا۔ اس پہ اللہ کہے گا کہ اگر تو نے اس شخص کا شکریہ ادا نہیں کیا تو پھر میرا شکر بھی ادا نہیں کیا۔

روایت ہے کہ آپ نے اپنا وقتِ وفات قریب آنے پر اپنے فرزند امام ابوجعفر محمد الباقرؑ سے فرمایا: اے میرے بیٹے! ایسے شخص پر سختی نہ کرنا جس کا تمہارے مقابلہ کے لیے اللہ کے سوا کوئی مددگار نہ ہو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر کسی نے اپنے ایک بھائی کو اجرت پر رکھا اور پھر اس کی اجرت ادا نہ کی تو اس سے اللہ کی دوستی قطع ہو گئی۔

آپ فرماتے تھے: اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ لوگ قیامت کے روز امن میں ہوں گے۔ جو کوئی کسی مومن کو خوشی مہیا کر دے، اللہ قیامت کے روز اس کے دل کو خوش رکھے گا۔

نیز آپ فرماتے تھے: آدمی کی زبان ہر روز صبح کو دوسرے اعضاء کے پاس آ کر کہتی ہے کہ کیسا حال ہے تم سب کا۔ وہ سب کہتے ہیں اگر تم ہم کو چھوڑے رکھو تو بخیر ہی ہیں کیونکہ انسان کو ثواب اور عذاب اسکی زبان ہی کی بدولت ملتا ہے۔

راویوں کا بیان ہے کہ اہل عراق کے ایک گروہ نے امام علیؑ بن حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر ابو بکر، عمر اور عثمان کا ذکر برائی سے کیا اور ان کو نا سزا کہا۔ اس پر امامؑ نے ان سے فرمایا: ذرا مجھ کو بتاؤ کہ تم کون لوگ ہو۔ کیا تم ان سب سے پہلے کے مہاجرین میں سے ہو جو اپنے گھروں سے نکالے اور مال و متاع سے الگ کیے گئے۔ ”وہ خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار رہیں۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے ایماندار ہیں۔“[1]

وہ بولے کہ ہم ان میں سے نہیں ہیں۔

تب آپ نے فرمایا: پھر کیا تم لوگ ان میں سے ہو جو ان سے بھی پہلے ہجرت کے گھر (مدینہ) میں آباد تھے اور اپنے ایمان پر قائم رہے۔ وہ ان لوگوں سے محبت کرتے تھے جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئے تھے۔ ”وہ اپنے سینوں میں اس چیز کی طمع نہیں رکھتے تھے جو ان کو دی گئی تھی۔ وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے، حالانکہ خود ان کو تنگدستی لاحق تھی۔“[2] اس پر ان لوگوں نے کہا: نہیں ہم ان لوگوں میں سے بھی نہیں ہیں۔

تب امامؑ نے فرمایا: اب تم نے مان لیا کہ تم ان دونوں فریقوں (مہاجر و انصار) میں سے نہیں ہو اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان دونوں میں سے نہیں ہو، جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے کہ: ”جو لوگ ان کے بعد آئے وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں دشمنی نہ آنے دے۔“[3]

تم لوگ اب یہاں سے نکل جاؤ۔ اللہ تم کو کوئی برکت نہ دے۔[4]

امام زین العابدینؑ کی اولاد

شیخ مفید نے ارشاد میں اور ابن صباغ نے فصول المہمہ میں بیان کیا ہے کہ آپ کے پندرہ بچے تھے۔ ان میں گیارہ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ ان میں سن اور منزلت کے لحاظ

---

[1] سورۂ حشر۔ آیت ۸ [2] سورۂ حشر۔ آیت ۱۰ [3] سورۂ حشر۔ آیت ۹

[4] اس روایت کی ضروری جرح و تعدیل کے بغیر اس کے نفس مضمون کو یقینی طور پر ردّاً یا قبولاً نہیں کیا جا سکتا۔ (ناشر)

سے سب سے بڑے امام محمدؑ بن علیؑ تھے کہ جن کا لقب باقر تھا۔ ان کی والدۂ گرامی فاطمہ بنت حسنؑ (نواسۂ رسولؐ) تھیں۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ فاطمہ بنت حسنؑ سے آپ کے چار بچے ہوئے حسن، حسین اکبر، محمد الباقر اور عبداللہ۔ ظاہراً آپ کی اولاد میں امام محمد باقرؑ سب سے بڑے تھے کیونکہ وہ ۵۷ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور آپ کی کنیت 'ابو محمد' انہی کے نام پر تھی۔ وہ کربلا میں بھی موجود تھے اور ان کی عمر اس وقت تین سال تھی۔ آپ کے بیٹوں میں زید بن علی و علی بن علیؑ بھی تھے، جن کی ماں ایک کنیز تھیں۔ جیسا کہ تذکرۃ الخواص میں بتایا گیا ہے۔

ابن خشاب نے اپنی کتاب "موالید اہل بیتؑ" میں کہا ہے کہ: امام زین العابدینؑ کے آٹھ بیٹے تھے لیکن کوئی بیٹی نہ تھی۔ تاہم اس کے علاوہ کچھ اور اقوال بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور اور بلند مرتبہ امام محمد باقرؑ تھے۔ ان کے متعلق ہم اس کتاب کے ایک علٰحدہ باب میں لکھیں گے۔ زید بن علیؑ شہید جو باب مدینۃ العلم امام علیؑ بن ابی طالب کے پڑپوتے تھے، ان کی نشو و نما امام زین العابدینؑ کے گھر میں ہوئی۔ یہ وہ گھر تھا جس کو علم و حکمت کا گہوارہ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ زید اسی گھر میں پلے بڑھے۔ یہیں ان کے افکار اور میلانات کی تشکیل ہوتی رہی۔ پس اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ابتدائی دور ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور پھر علم حدیث کی طرف توجہ کر لی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے حدیث میں مہارت حاصل کی اور تھوڑے ہی عرصے میں وسیع علم رکھنے والے فقیہ کے طور پر ابھرے۔ آپ قرآن اور سنت رسولؐ سے احکام اخذ کرتے اور دوسرے لوگوں کے لیے احادیث بیان کرتے تھے۔

جب آپ کے والد بزرگوار کا وصال ہوا، اس وقت آپ چودہ سال کے تھے۔ اب آپ کی غور و پرداخت اور کفالت آپ کے بھائی امام محمد باقرؑ نے اپنے ذمے لے لی، جو اپنے والد بزرگوار کے بعد ان کے جانشین اور امامت کے امام تھے۔ چنانچہ زید بن علیؑ نے آپ سے فقہ، حدیث اور تفسیر کے علوم پوری توجہ سے حاصل کیے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں شمار ہونے لگے اور مدینہ کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی انکو حدیث

اور دوسرے علوم میں مرجع مانا جاتا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ ایک وقت میں آپ بصرہ تشریف لے گئے جہاں آپ نے بہت سے علماء سے ملاقات کی اور واصل بن عطاء الغزال سے مناظرہ بھی کیا جو اس وقت معتزلہ کے پیشوا تھے۔ چنانچہ آپ نے ان سے اصول عقائد پر مناظرہ کیا۔ بصرہ اس وقت اسلام کے مختلف عقائد رکھنے والے متعدد فرقوں کا وطن تھا۔ ابوحنیفہ بھی اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں وہاں جایا کرتے تھے، جبکہ وہ علم کلام کی طرف متوجہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بعدہٗ آپ وہاں کم و بیش بائیس مرتبہ گئے تاکہ معتزلہ، قدریہ، جہمیہ جیسے فرقوں اور خدا کی صفات پر بحث کرنے والے متکلمین کے ساتھ مناظرہ کریں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بصرہ میں واصل بن عطاء کی شاگردی کے لیے نہیں گئے تھے، جس کا شہرستانی نے ملل و نحل میں دعویٰ کیا ہے۔ اسی طرح وہ کسی اور سے حصول علم کے لیے نہیں گئے تھے۔ اگرچہ اس وقت وہ اسی سن کے تھے جو حصول علم کے لیے مناسب ہوتا ہے لیکن برعکس اس کے وہ محض اس لیے بصرہ گئے کہ وہاں بعض علماء کے درمیان اسلام اور اس کے عقائد کے متعلق عجیب و غریب بحثیں شروع ہو گئی تھیں۔

زید بن علیؑ کے حالات زندگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ملکی سیاست اور اقتدار حاصل کرنے کی طرف از خود توجہ نہیں کی، بلکہ اس وقت کے حکمرانوں نے ان کو اس کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ اس لیے آپ ان سے ٹکر لیتے رہے۔ یہاں تک کہ پھر ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہ رہی کہ وہ چھوٹی سی جماعت کی معیت میں ظالم حکمرانوں کے خلاف جنگ کریں، کیونکہ اہل عراق نے ان کے ساتھ غداری کی تھی، جس طرح ان کے آباؤ اجداد کے ساتھ کر چکے تھے۔

ان حکمرانوں نے زید بن علیؑ سے خود ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی کیونکہ وہ اکثر کوفہ آتے جاتے رہتے تھے، جہاں شیعیان اہلبیتؑ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ تاہم خالد قسری جو عراق کا گورنر تھا وہ ان ظالم حکمرانوں کے برعکس زید بن علیؑ سے تعصب نہ رکھتا تھا بلکہ وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا اور ان سے اچھی طرح ملتا تھا۔ چنانچہ اس کے عہد میں کوفہ کے شیعوں کے لیے زید بن علیؑ اور دوسرے علویوں سے ملنا جلنا آسان تھا۔ مگر خالد قسری کی یہ پالیسی یوسف بن عمرو ثقفی کو پسند نہ آئی کیونکہ اس سے

اموی حکومت خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ پس اس نے ہشام بن عبدالملک کو لکھ بھیجا کہ بنی ہاشم برسوں سے بھوکوں مر رہے تھے اور ان میں سے کسی کو اپنے اہل و عیال کی روزی مہیا کرنے کی طاقت بھی نہ تھی لیکن جب خالد قسری نے عراق کی گورنری سنبھالی تو اس نے ان کو اس قدر دولت دے دی کہ جس سے ان میں خاصی قوت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ اب یہ لوگ خلافت حاصل کرنے کے متمنّی ہیں۔

خالد قسری کا شیعوں کے ساتھ یہ حسن سلوک اس کا باعث بنا کہ ہشام بن عبدالملک نے اس کو معزول کرکے یوسف بن عمرو ثقفی کو عراق کا گورنر بنا دیا۔ اس نے شیعوں پر سختیاں کرنے میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں۔ پھر زید کے خلاف اپنی کوششوں کے سلسلہ میں اس نے ہشام کو لکھا کہ خالد قسری نے چھ لاکھ درہم زید بن علیؑ کے پاس امانت رکھے تھے لیکن زید ان کا انکار کرتے ہیں۔ اس پر ہشام نے زید بن علیؑ کو اپنے پاس بلا بھیجا۔ تب زید مدینہ سے شام گئے اور انھوں نے ہشام کو بتایا کہ ان کو اس امانت کا کوئی علم نہیں ہے جس کا یوسف بن عمرو ثقفی ادّعا کرتا ہے۔ ہشام بن عبدالملک نے ان سے کہا کہ وہ خود یوسف بن عمرو ثقفی کے پاس جا کر اس سے آمنے سامنے بات کریں لیکن زید نے ایسا کرنے سے بہ شدت انکار کر دیا کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان ساری کوششوں کا مقصد یہ ہے کہ یوسف بن عمرو ثقفی ان پر قابو پاتے ہی ان کے بارے میں امویین کی دلی خواہش کو پورا کر دے۔ چنانچہ انہوں نے ہشام کو قسم دلائی کہ وہ ان کو یوسف بن عمرو کے پاس نہ بھیجے لیکن ہشام ان کے عراق بھیجے جانے پر برابر اصرار کرتا رہا۔

جب اس نے دیکھا کہ اس کی یہ کوشش ناکام ہو رہی ہے تو اس نے ایک ایسے وقت میں جبکہ اس کا دربار شام کے امراء اور ممتاز افراد سے بھرا ہوا تھا ــــــ زید کو رسوا کرکے ان پر دباؤ ڈالنا چاہا۔ چنانچہ اس نے ان سے کہا: مجھ کو معلوم ہے کہ تم اپنے آپ کو خلافت کا اہل سمجھتے ہو، جبکہ تم ایک کنیز کے بیٹے ہو۔ اس پر زید بن علیؑ نے ہشام سے کہا: اے ہشام! تجھ پر وائے ہو۔ کیا میری ماں کی حیثیت مجھ کو کم مرتبہ کر سکتی ہے؟ بخدا اسحاقؑ آزاد خاتون سے پیدا ہوئے تھے اور اسماعیل ایک کنیز کے بیٹے تھے۔ تاہم یہ امر اس فیصلے میں حارج نہیں ہوا اور اللہ نے ان کو اپنا نبی قرار دیا۔ پھر انہی کی نسل میں عرب و عجم

کے سردار محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیدا کیا۔ پس مائیں کسی طرح بھی لوگوں کے مقاصد میں حائل نہیں ہوتیں۔ اے امیرالمومنین! اپنے نبیؐ کی ذریت کے بارے میں اللہ کا خوف کرو۔ ہشام کو غصہ آگیا اور وہ بولا: اے زید! تم ایسا (محکوم) شخص مجھ ایسے (حاکم) کو اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہے! زید نے جواب دیا کہ: نہ کوئی اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اسے اللہ سے ڈرنے کی ہدایت نہ کی جائے اور نہ کوئی اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرنے کی ہدایت نہ کرے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب زید نے ہشام بن عبدالملک کو لاجواب کر دیا تو اس نے ان سے کہا: تمہارے بھائی بقرہ کیا کرتے ہیں؟ اور اس سے اس کی مراد امام محمد باقرؑ تھے۔ اس پر زید نے اس سے کہا: رسول اللہؐ نے ان کا نام باقرالعلم رکھا ہے اور تم بوجہ مخالفت ان کو بقرہ کہہ رہے ہو۔ پس عنقریب تم جہنم میں ڈالے جاؤ گے اور وہ جنت میں بھیجے جائیں گے۔ تب ہشام نے ان سے کہا: اے زانیہ کے بیٹے! نکل جاؤ یہاں سے۔ چنانچہ زید بن علیؑ وہاں سے نکل آئے، جبکہ وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

خوف نے اس کو ہراساں اور ذلیل کر دیا ہے۔ جو کوئی جنگ سے کراہت کرتا ہے اس کا یہی حال ہوتا ہے۔

اس کے دونوں ہاتھ زخمی ہیں اور وہ تکلیف میں چلا رہا ہے۔ اس کو تیز ہتھیار کاٹے ڈال رہے ہیں۔

ایسے شخص کے لیے مرجانا ہی بہتر ہے۔ ویسے بھی موت ہر شخص کی گردن پر سوار ہے۔

اگر اللہ اس شخص کو ملک دیدے تو یہ علاقوں کو راکھ کے ڈھیر بنا کے رکھ دے۔

پھر وہ کوفہ کی طرف روانہ ہوگئے اور کہہ رہے تھے کہ: جو کوئی زندگی سے محبت کرتا ہے اس کو اکثر ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ جب زید کوفہ پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے نیکی کی ہدایت کرنے، بدی سے باز رکھنے، کمزوروں کی حفاظت کرنے اور مظلوموں کے ساتھ انصاف کرنے پر ان کی بیعت کر لی۔ البتہ کچھ علویوں اور ہاشمیوں نے ان کو یہ مشورہ بھی

دیا کہ وہ اہل عراق پر بھروسہ نہ کریں۔ انھوں نے ان کو یاد دلایا کہ اس سے پہلے یہ لوگ آپ کے جدا مجد امیرالمومنین علیؑ، چچا حسنؑ اور دادا حسینؑ کے ساتھ کیا سلوک کر چکے ہیں۔ لیکن وہ اپنے اس لائحہ عمل کو مکمل کرنے پر اصرار کرتے رہے۔ چنانچہ ان کو بہت سے پاکباز فقیہوں اور نیک نہاد مسلمانوں کی وسیع تائید حاصل ہوگئی۔

جیسا کہ ابو حنیفہ نے کہا: زید بن علیؑ کی یہ جنگی مہم، بدر کے روز رسول اللہؐ کی جنگی پیش قدمی کے مانند ہے۔ انہوں نے ان کو کچھ رقم بھجوادی تاکہ ظالموں کے خلاف جنگ میں کام آئے۔ بعض مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد زید بصرہ گئے اور وہاں کے لوگوں کو دعوت دی کہ وہ بنی امیہ کے خلاف ان کی نصرت کریں۔ اس کے ساتھ ہی مدائن، موصل اور دیگر مقامات پر اپنے نمائندے بھیجے۔ اس طرح یہ اعلان عراق کے اندر اور تمام نواحی علاقوں میں بھی پھیل گیا۔ جب ان کی اس تحریک کی خبر ہشام بن عبدالملک کو پہنچی تو اس نے عراق میں اپنے گورنر یوسف بن عمرو ثقفی کو حکم بھیجا کہ وہ ان کے خلاف سخت اقدام کرکے ان کو وہاں سے نکال دے۔ چنانچہ یوسف بن عمرو نے وہ تمام امکانی تدابیر اختیار کیں کہ جن کے نتیجے میں لوگ زید کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اس پر ان کو بھی آنے والے خطرے کا احساس ہوگیا اور انہوں نے پیش قدمی میں جلدی کی۔ یوسف بن عمرو نے ان کے پاس ایک جاسوس بھیجا، جس نے ان سے ابوبکر و عمر کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے اس سے کہا کہ اللہ ان دونوں پر رحم فرمائے۔ میں نے اپنے آباء و اجداد میں سے کسی کو ان سے برائت اختیار کیے ہوئے نہیں دیکھا۔[1] اس پر ان کے بہت سے ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ان کے اسی فعل کی بنا پر ان کا نام رافضی پڑ گیا، کیونکہ انھوں نے زید بن علیؑ کے ساتھ ہوکر جنگ کرنے سے رفض کیا یعنی علیٰحدگی اختیار کی تھی۔

جس وقت ان کے اور یوسف بن عمرو کے درمیان جنگ میں شدت پیدا ہوئی تو ان کے دو سو اٹھارہ آدمیوں کے علاوہ کوئی ثابت قدم نہ رہا۔ پھر خود ان کو ایک

---

[1] اندریں صورت یہ روایت تحقیق کی طالب ہے۔

تیر آلگا جس سے آپ شہید ہو گئے۔ ان کے ساتھیوں نے ان کو ایک ندی کے بیچ میں دفن کر دیا تاکہ بعد میں ان کی لاش کی بے حرمتی نہ کی جائے لیکن جب دشمنوں کو اس بات کا پتا چلا تو انھوں نے ان کی لاش وہاں سے نکال کر ان کے اعضاء قطع کیے اور ان کا سر کاٹ کر شام اور پھر وہاں سے مدینہ بھیج دیا۔ ان کا جسم پچاس ماہ تک سولی پر لٹکا رہا۔ جیسا کہ مروج الذہب وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے، بعدہٗ ولید بن یزید کا عہد حکومت آیا تو اس نے کوفہ کے گورنر کو لکھ بھیجا کہ وہ زید کی لاش اسی سولی کی لکڑیوں سے جلا دے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

زید کے قتل سے بیشتر اسلامی علاقوں میں عام بددلی پھیل گئی اور اہلبیتؑ میں پھر سے غم کی لہر دوڑ گئی۔ حتٰی کہ ان پر امام جعفر صادقؑ بھی روئے۔ آپ نے ان کے لیے دعائے خیر کی اور ان کا سوگ منایا۔ فضیل بن یسار روایت کرتے ہیں کہ زید بن علیؑ کے قتل ہونے کے بعد جب میں امام جعفر صادقؑ سے ملنے گیا تو انھوں نے مجھ سے فرمایا: اے فضیل! میرے چچا زید بن علیؑ مارے گئے۔ میں نے عرض کیا: ہاں اے فرزند رسولؐ! آپ نے فرمایا: اللہ ان پر رحم فرمائے۔ وہ یقیناً مومن، عارف، عالم اور قابل اعتماد تھے۔ اگر وہ ملک حاصل کر لیتے تو ان کو معلوم تھا کہ یہ کس کا حق ہے۔

امام رضاؑ فرماتے ہیں: زید بن علیؑ نے حق کے لیے جنگ کی تھی اور لوگوں سے کہا کہ میں تم کو رضائے آل محمدؐ کی طرف بلا رہا ہوں، لیکن وہ تقویٰ اور خوفِ خدا میں اس سے بھی بلند تھے۔

ایک تیسری روایت میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اللہ زید بن علیؑ پر رحم فرمائے کہ انھوں نے رضائے آل محمدؐ کی طرف دعوت دی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو ضرور اس عہد کو پورا کرتے جس کی طرف انھوں نے دعوت دی تھی۔ انھوں نے مجھ سے اپنی جنگی پیش قدمی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس پر میں نے ان سے کہا تھا کہ چچا جان! اگر آپ خود کو کناسہ پر پھانسی چڑھائے جانے کو پسند کرتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ پھر جب دشمن ان پر مسلّط ہو گئے تو امامؑ نے فرمایا: وائے ہو اس پر جس نے ان کی پکار کو سنا اور پھر ان کا ساتھ نہیں دیا۔

ابو حمزہ ثمالی سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا: میں اپنے آقا و مولا علیؑ بن حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو بیٹھا ہوا پایا۔ جبکہ ان کے زانو پر ایک بچّہ تھا اور آپ اس سے اظہار محبت فرما رہے تھے۔ یعنی کبھی تو اس کو بوسہ دیتے اور کبھی سینے سے لگاتے تھے۔ پھر جب وہ بچّہ اٹھ کر چلنے لگا تو دروازے کے قبضہ سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ امامؑ نے جھٹ سے بڑھ کر اس کو سنبھال لیا اور ایک کپڑے سے اس کا خون صاف کرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی یہ کہہ رہے تھے: اے بیٹے میں تم کو کناسہ میں پھانسی پر لٹکائے جانے سے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا: حضور! یہ کناسہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کوفہ کا ایک علاقہ ہے۔ آپ نے مزید فرمایا: اس خدا کی قسم کہ جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اگر تم میرے بعد زندہ رہے تو دیکھ لینا کہ میرا یہ بیٹا کوفہ کے نواح میں تیر سے مارا جائے گا اور اس کو دفن کر دیا جائے گا لیکن پھر اس کو قبر سے نکال کر کناسہ میں پھانسی پر لٹکایا جائے گا اور اس کے بعد اس کو جلا کر ہوا میں اڑا دیا جائے گا۔ میں نے کہا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں۔ اس بچہ کا نام کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: یہ میرا فرزند زید ہے۔

راوی کہتا ہے کہ یہ باتیں بتاتے ہوئے آپ روتے جاتے تھے۔ ابو حمزہ ثمالی مزید بیان کرتے ہیں کہ امامؑ نے مجھ سے کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تم سے اپنے اس بیٹے کا قصہ بیان کروں؟ میں نے کہا: ضرور! آپ نے فرمایا: ایک رات میں اپنی محراب عبادت میں حالت سجدہ میں تھا کہ مجھ کو نیند آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ گویا میں جنت میں ہوں اور رسول اللہؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ سب جمع ہیں۔ پھر ان لوگوں نے وہاں میری تزویج کر دی۔ تب میں نے ہم بستری کی اور سدرۃ المنتہیٰ کے قریب غسل کیا۔ اب میں نے ہاتف غیبی کی آواز سنی، جو کہہ رہا تھا: کیا تم پسند کرتے ہو کہ میں تم کو ایک لڑکے کی بشارت دوں جس کا نام زید ہوگا۔ اس وقت میں نیند سے جاگ گیا اور پھر میں نے صبح کی نماز ادا کی۔ اتنے میں ایک آنے والے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازے پر جا کر دیکھا تو وہاں ایک شخص کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک کنیز تھی جو چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ میں نے اس شخص سے کہا: تم کو کیا

چاہیے ؟ اس نے کہا : میں آپ کے پاس مختار کا بھیجا ہوا قاصد ہوں ۔ انھوں نے آپ کو سلام کے بعد کہا ہے کہ یہ کنیز ہمارے پاس لائی گئی تھی ۔ ہم نے اس کو چھ سو دینار میں خرید لیا اور اب اس کو آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے ۔ علاوہ ازیں یہ چھ سو دینار بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہیں ۔ آپ ان کو اپنے طور پر خرچ کر سکتے ہیں ۔ یہ کہہ کر اس نے وہ رقم میرے حوالے کر دی اور وہ خط بھی جو مختار کے پاس سے لایا تھا ۔ پھر اس کنیز کو بھی میرے سپرد کر دیا ۔ میں نے اس کنیز سے پوچھا : تمہارا نام کیا ہے ؟ اس نے کہا : " حوریہ " تب میں نے کہا کہ یہ میرے پہلے سے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر ہے کہ جس کو اللہ نے سچ کر دکھایا ۔ چنانچہ وہی کنیز میرے اس بیٹے کی ماں بنی ۔ جب یہ پیدا ہوا تو میں نے اس کا نام زید رکھ دیا ۔ اب آنے والے زمانے میں تم وہ بھی دیکھ لوگے جو میں نے تم سے بیان کیا ہے ۔ ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں کہ : قسم بخدا ! میں نے زید کو مقتول دیکھا ۔ وہ دفن کیے گئے پھر قبر سے نکالے گئے اور پھانسی چڑھائے گئے ۔ وہ کئی برس پھانسی پر لٹکے رہے ۔ یہاں تک کہ ایک فاختہ نے ان کے شکم مبارک میں اپنا گھونسلہ بنا لیا تھا ۔ بعد میں ان کو آگ میں ڈالا گیا اور ان کے بدن کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیا گیا ۔

بہر حال زید بن علیؑ ، امام محمد باقرؑ کے علاوہ اپنے تمام بھائیوں میں سب سے نمایاں ، معزز اور اصول اسلام اور فقہ اہل بیتؑ کے زبردست عالم تھے ۔ جن پر ان کے آبائے کرامؑ عمل پیرا رہے تھے ۔ انہی موضوعات پر انہوں نے معتزلہ اور قدریہ وغیرہ سے مناظرے کیے جو اسلام کے صحیح راستے سے منحرف ہو رہے تھے ۔ وہ اپنے زمانہ کے ارباب حکومت کے خلاف کبھی جنگ نہ کرتے ، مگر ان حکام نے ان کو جلا وطن کر کے اس کے لیے مجبور کر دیا ، اس وجہ سے ان پر جنگ کرنا فرض ہو گیا تھا ۔ وہ لوگوں کو رضاء اہلبیتؑ کی طرف بلاتے تھے ۔ اگر وہ ظفر مند ہو جاتے تو وہ اپنے اس وعدے کو پورا کر دیتے ، جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے بیان کیا ہے ۔

تاہم زید بن علیؑ نے کبھی امامت کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ان کی زندگی میں کسی اور نے ان کی طرف سے کوئی ایسا اعلان کیا ۔ ان کی امامت کی بات ان کی شہادت کے بعد اس وقت ابھری جب عباسی خلفاء یہ کوشش کر رہے تھے کہ ائمہ کے بارے

ہیں شیعوں کے عقیدے میں اختلاف ہو جائے۔ چنانچہ زید بن علی ع کو انہوں نے ائمہ اہلبیت ع کا مدِّ مقابل اور مخالف ظاہر کیا۔ پھر بڑھتے بڑھتے ایک مستقل مذہب بن گیا جس کی قوت اور بقاء کا دارو مدار اہلبیت ع میں سے کسی ایک بلند مرتبہ فرد سے نسبت رکھنے پر تھا۔ یہ مذہب اپنے بیشتر اصول، نظریات اور احکام میں فقہ امامیہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ جیسا کہ فرقہ زیدیہ کی فقہ سے ظاہر ہے جو بنیادی طور پر زید بن علی ع کے ان نظریات اور ان فقہی احکام کے مجموعہ پر مبنی ہیں جو ان کے شاگردوں نے ان سے روایت کیے ہیں اور ابو خالد عمرو بن خالد واسطی نے ان کو زید بن علی ع سے منسوب کر دیا ہے۔

خدا زید بن علی ع پر اپنی رحمت نازل فرمائے کہ جو اپنے آباء کرام ع کی الٰہی تعلیمات پر قائم رہے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی طرح جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے اور ہمیشہ زندہ رہنے والوں کے زمرے میں شامل ہو گئے۔

عبداللہ، عمر اور حسین، فرزندان امام زین العابدین ع

کتب انساب میں امام علی ع بن حسین ع کی اولاد میں جن افراد کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں عبداللہ بن علی ع بھی ہیں کہ جن کا لقب 'باہر' تھا اور وہ ایک فاضل اور فقیہ تھے۔ انھوں نے رسول اللہ ص کی بہت سی حدیثیں اپنے آباء کرام کے واسطہ سے روایت کی ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ جب امام ابوجعفر محمد باقر ع سے پوچھا گیا کہ آپ کے بھائیوں میں کون سب سے افضل ہے تو آپ نے فرمایا کہ عبداللہ میرے وہ بازو ہیں کہ جن سے میں کام کرتا ہوں۔ عمر میری وہ آنکھیں ہیں کہ جن سے میں دیکھتا ہوں۔ زید میری وہ زبان ہے کہ جس سے میں بولتا ہوں۔ حسین وہ بردبار ہیں کہ جو روئے زمین پر انکساری سے چلتے ہیں۔ جب کبھی جاہل لوگ ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں "تم کو سلام" ہے۔

جیسا کہ الارشاد، شیخ مفید وغیرہ میں آیا ہے کہ عبداللہ بن علی ع بن حسین ع، رسول اللہ ص اور امیرالمومنین علی ع کے اوقاف پر نگراں تھے۔

عمر بن علی ع بن حسین ع کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ فاضل، متقی اور سخی تھے۔ یہ (اپنے بھائی عبداللہ کے بعد) رسول اللہ ص اور امیرالمومنین علی ع کے اوقاف کے نگراں بنے تھے۔

جو کوئی ان باغوں کے پھلوں کو خریدتا تھا وہ اس سے یہ شرط طے کر لیتے تھے کہ وہ خریدار بیرونی دیوار میں ایک دریچہ کھول دے گا تاکہ ادھر سے گزرنے والے لوگ وہاں سے کچھ پھل لے کر کھا لیا کریں اور یہ کہ وہ ایسا کرنے سے کسی کو منع نہ کرے گا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ انھوں نے کہا: ہماری محبّت میں افراط کرنے والا ویسا ہی ہے جیسے ہماری دشمنی میں افراط کرنے والا۔ تم لوگ ہم کو اسی مقام پر رکھو جہاں اللہ نے ہم کو رکھا ہے۔ ہمارے بارے میں وہ بات مت کہو جو ہم میں نہیں ہے۔ اگر اللہ ہم پر عذاب کرے گا تو ہمارے گناہوں کے باعث اور اگر ہم پر رحم کریگا تو وہ اس کے رحم اور فضل کا نتیجہ ہوگا۔

حسین بن علیؑ بن حسینؑ کے بارے میں شیخ مفید نے ارشاد میں بیان کیا ہے کہ وہ فاضل اور متقی تھے۔ انھوں نے اپنے والد بزرگوار علیؑ بن حسینؑ اور اپنی پھوپھی فاطمہ بنت حسینؑ سے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں۔ امام حسینؑ مدینہ سے کربلا روانگی کے وقت اپنی وصیت انہی فاطمہ کو دے کر آئے تھے۔ نیز انھوں نے اپنے بھائی امام ابوجعفر محمد باقرؑ سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں۔ چنانچہ 'رجال' شیخ طوسی میں ان کو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں شمار کیا گیا ہے۔

امام علیؑ بن حسینؑ کا وصال محرم ۹۵ھ میں ہوا۔ بیشتر راویوں اور محدثین کا کہنا ہے کہ آپ کو ولید بن عبدالملک بن مروان کے حکم سے زہر دیا گیا تھا۔ محمد بن شہاب زہری سے روایت ہے کہ ولید بن عبدالملک نے ایک روز مجھ سے کہا: جب تک علیؑ بن حسینؑ دار دنیا میں موجود ہیں، میرے لیے کوئی راحت نہیں ہے۔

اپنی وفات سے قبل امام علیؑ بن حسینؑ نے اپنی تمام اولاد کو جمع کیا اور ان کو اللہ کی بندگی اور انکے بھائی امام محمد باقرؑ کی اطاعت کرنے کی وصیت فرمائی نیز اپنے ممتاز شیعوں کو بھی اپنے بعد ان کی امامت سے مطلع کر دیا۔

آپ کے عہد میں انسانیت جن مصائب سے دوچار تھی۔ آپ اسے ان میں سے نکالنے کے لیے سخت اور طویل جہاد کرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ آپ زندگی بھر لوگوں کے سامنے المیہ کربلا کا ذکر کرتے رہے اور اس پر روتے رہے تاکہ یہ المیہ

ہمیشہ ہمیشہ لوگوں کو ظلم کے خلاف اٹھنے اور اللہ کی راہ میں قربانی دینے پر آمادہ کرتا رہے۔
آپ رات دن عبادت میں منہمک رہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کا نام سجّاد اور لقب
زین العابدینؑ ہو گیا۔ آپ کا نسب بیک وقت نبی اکرمؐ سے اور فارس کے بادشاہ
کسریٰ سے ملتا تھا، اس لیے آپ کو ابن خیر تین (دو بہترین افراد کا فرزند) کہا جاتا تھا۔

امام محمّد باقرؑ

امام محمد بن علیؑ کہ جن کا لقب باقر ہے یکم رجب ۵۷ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ایک اور قول کے مطابق اسی سال یکم صفر کو پیدا ہوئے۔ آپ کا وصال ۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ اور دوسری روایت کے مطابق اسی سال کے ماہ ربیع الاوّل میں ستاون سال کی عمر میں ہوا۔ ان میں سے تقریباً چار سال آپ اپنے دادا حسینؑ کے ساتھ رہے۔ انکے بعد پینتیس سال تک اپنے والد بزرگوار سیّد سجادؑ کے سایہ میں بسر کیے۔ اپنے والد ماجد کے بعد آپ اٹھارہ یا بقولے انیس سال زندہ رہے اور یہی آپ کی مدّت امامت ہے۔ آپ کی وفات ہشام بن عبدالملک کی بادشاہت کے آخری سالوں میں اور بقولے ابراہیم بن ولید بن یزید بن عبدالملک کے ابتدائی دَور میں ہوئی۔ آپ کے بچپنے میں جبکہ آپ ابھی طفولیت کی منزل میں تھے، اہلبیتؑ پر کربلا کا عظیم سانحہ گزرا جس میں آپکے جدِّ امجد امام حسینؑ، ان کے بھائی اور اصحاب قتل ہوگئے۔ تب آپ نے بھی سب بچّوں اور عورتوں کے ساتھ اس المیہ کی تلخیاں چکھیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔

اس کے بعد آپ ان تمام شدائد اور مصائب میں شریک رہے جو آپ کے والد بزرگوار اور آپ کے گھرانے پر ان ظالم حکمرانوں کی طرف سے پے بہ پے ڈالے گئے جو پست خواہشات میں غرق تھے اور مذہب و اخلاق کے ان تمام اصولوں کی خلاف ورزی

کر رہے تھے، جن کی اسلام نے تعلیم دی اور جن کی خاطر رسول اللہؐ نے بیس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے تک جہاد فرمایا تھا۔

بنی امیہ پیغامِ الٰہی کے مفہوم سے دُور ہو گئے تھے اور طرح طرح کی بدکاریوں کا ارتکاب کر رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے شاہی محلات میں، اپنی محفلوں میں اور اپنے سفر و حضر میں علانیہ فسق و فجور میں سرشار تھے۔ یہ سیلاب جو خلیفاؤں، حکمرانوں اور گورنروں کے ایوانوں سے رواں ہوا وہ اب بیشتر مسلمانوں پر چھا گیا تھا۔ جیسے مثل مشہور ہے کہ: اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ یعنی عام لوگ اپنے حاکموں کے طریقے پر چلتے ہیں۔ عام مسلمان زندگی کی لذّتوں، دنیا کی فریب کاریوں اور ہر قسم کے ناجائز امور میں سرشار تھے۔

بنی امیہ نے اپنی حکومت کی بنیاد ظلم و تشدد، ایذا اور قتلِ صالحین پر رکھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے تخت و تاج کی بقا اور اپنی خواہشات کی خاطر عوام کا مال کھسوٹنے پر دلیر تھے۔ ان کی اس بربریت پر مبنی پالیسی سب سے بڑھ کر علویوں اور ان کے شیعوں کے لیے بلائے جان بنی، کیونکہ علویوں میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو انکو رسول اکرمؐ کی خلافت کا اہل ثابت کرتی اور عوام میں مقبول بناتی تھیں۔

شرح نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ امام محمد باقرؑ نے اپنے چند اصحاب سے اس زمانہ کے حالات بیان فرمائے۔ آپ نے ان حکام کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان کو بتایا کہ یہ شیعوں پر تشدد کرتے اور بے گناہوں کا خون بہاتے ہیں۔ یہ لوگوں کو لذیذ کھانے کھلاتے اور ان پر دولت کا مینہ برساتے ہیں تاکہ ان کے ہاتھوں رسول اللہؐ کی احادیث کو الٹ دیں اور ان میں جھوٹ کی آمیزش کر دیں۔

آپ نے اپنے بیان میں حجاج بن یوسف کے اس ظالمانہ دَور کا ذکر بھی کیا جس نے شیعوں کو شہروں سے نکالا اور ان پر قسم قسم کی سختیاں کیں اور ہر طرح کے عذاب ڈھائے۔ یہاں تک کہ ان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ان میں سے ہر شخص یہ تمنا کرنے لگا کہ اس کو زندیق کہہ کر پکارا جائے مگر شیعہ نہ کہا جائے۔

ظلم و فساد سے بھرا ہوا وہ ماحول جو امام محمد باقرؑ کو ملا تھا۔ اس کے دوران آپ کے والد بزرگوار رحلت فرما گئے، اس وقت آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ اس

کے بعد جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں آپ اٹھارہ سال زندہ رہے۔ آپ پر اور آپکے آباء کرامؑ کے شیعوں پر نیز کمزوروں اور ناداروں پر یہ امر نہایت شاق تھا کہ یہ حکام اپنی بے راہ روی پر قائم تھے۔ آپ نے دیکھا کہ آپکے آباء کرامؑ کو ماضی میں جن حالات کا سامنا کرنا پڑا نیز یہ کہ لوگوں نے مصیبت کے وقت بار بار ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ان وجوہات کے باعث آپ نے سیاسی لوگوں اور سیاسی معاملوں سے علٰحدہ رہنے کا طریقہ اپنایا۔

پس آپ ہر طرف سے منہ موڑ کر خدمت اسلام کی طرف متوجہ ہو گئے تاکہ اسلام کے اصولوں اور اساسی نظریوں پر ہونے والے حملوں کا دفاع کریں۔ اس کی تعلیمات اور احکام کی اشاعت کریں اور ان لوگوں کے ساتھ علمی مناظرے کریں جو اسلام کے اعلٰی مقاصد اور عمیق فکر سے دُور ہو گئے تھے، کیونکہ اب اسلام عرب کے دائیں بائیں واقع ملکوں میں پھیل گیا تھا اور اس کے سامنے ایسی قومیں اور قبیلے جھک گئے تھے جن کا ماضی تہذیب و تمدّن سے مالامال تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے طرز فکر اور ان کی زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب رونما ہو گیا تھا۔ اس طرح سے رنگ برنگ کی بحثیں اور گفتگو کی نئی راہیں پیدا ہو گئی تھیں جن کے پیچھے کفر و الحاد کا چھپا چھپایا انتقامی جذبہ کارفرما تھا۔ غالباً خود حکام بھی اس انقلاب یا فکری انتشار کی پشت پر تھے جو فکر اسلامی پر طاری تھا۔ بلکہ وہ یہاں تک بڑھ گیا کہ اسلام کے اصلی عقیدہ کے لیے خطرہ بن گیا کیونکہ جن لوگوں نے ان نئے فکری رجحانات کو ابھارا اور انھیں آگے بڑھایا تھا۔ ان میں سے بیشتر ان قوموں میں سے تھے جو اسلام پر اعتقاد نہ رکھتی تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ وہ نام کے مسلمان بھی تھے، جو دنیاوی مفاد کی خاطر امویوں کے محلّات شاہی سے وابستہ ہو جاتے تھے اور یہ خیالات لے کر معاشرے میں آتے تھے کیونکہ ان حکمرانوں کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی تھی کہ مسلمان ان الجھیڑوں میں پھنسے رہیں تاکہ ان کے مظالم اور زیادتیوں سے ان کی توجہ ہٹی رہے۔

چنانچہ بعض مسائل میں یہ باہمی جدال انتہائی حد تک بڑھ گئی جیسا کہ جبر اور ارجاء کے مسئلے کہ جن کا پیدا ہونا اور پھیلنا حکمرانوں کے علاوہ ان کے لگے بندھے دوسرے معصیت کاروں کے مفاد میں تھا کیونکہ جبر کا مسئلہ ان پر سے ان کی ظالمانہ کارروائیوں کی جوابدہی کو زائل

کر دیتا تھا جبکہ ارجاء کا مسئلہ بہرحال ان کو مومنوں کی صف میں لا کھڑا کرتا تھا، حالانکہ اس کے بالمقابل معتزلہ ان کے ایمان کو اور خوارج ان کے اسلام ہی کو تسلیم نہ کرتے تھے۔

اپنے دینی عقائد میں مسلمانوں کی اس باہمی کشمکش کی فضاء میں امام محمد باقرؑ نے اس بات کو محسوس کر لیا، بلکہ دین اسلام کے مفاد نے آپ پر فرض کر دیا کہ آپ اسلامی عقائد کو محفوظ رکھنے پر متوجہ ہو جائیں اور اسلام کی اصل تعلیمات کی اشاعت کریں۔ آپ کے اس عزم کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں شیعہ علماء نیز طالبان علم اور متلاشیان حدیث آپ کے گرد جمع ہو گئے۔

ابن جوزی نے تذکرۃ الخواص میں یہ بتاتے ہوئے "تبقر" کے معنی علم میں وسعت رکھنا ہیں۔ مزید لکھا ہے کہ امام محمد باقرؑ اپنی وسعت علم کی وجہ سے اس صفت سے موصوف ہو گئے تھے۔ ابن سعد طبقات میں کہتے ہیں کہ آپ عظیم القدر عالم اور عابد ہونے کے ساتھ ساتھ تمام مسلمانوں میں بااعتماد مانے جاتے تھے۔ چنانچہ ابو حنیفہ اور دوسرے ائمۂ علم و مذاہب، آپ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔

جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: مجھ کو رسول اللہؐ نے بتلایا کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں گا جبکہ آپ کی اولاد میں سے اس فرد کو دیکھوں جو سب سے زیادہ آنحضرتؐ سے مشابہ ہوگا۔ چنانچہ آپ نے مجھ کو حکم دیا کہ میں اُن کو آپ کا سلام پہنچاؤں۔ ان کا اسم گرامی محمدؑ ہوگا اور وہ علم کو دُور و نزدیک ہر طرف پھیلا دیں گے۔

راویوں کا بیان ہے کہ جابر بن عبداللہ، اصحاب رسولؐ میں سب سے آخر تک زندہ رہے۔ چنانچہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ مسجد میں باآواز بلند کہا کرتے تھے: اے باقرؑ! آپ جو علوم آل محمدؐ کو پھیلانے والے ہیں۔ میں مدتوں سے آپ کا شوق ملاقات رکھتا ہوں۔ پھر جب وہ ان سے ملے تو جابر بڑی بے تابی سے آپ کے ہاتھ، پیر چومنے کے لیے آگے بڑھے اور انھوں نے آپ کو رسولؐ کا پیغام پہنچایا۔

ابن جوزی کے تذکرۃ الخواص میں ایک ممتاز تابعی، عبداللہ بن عطاء سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے علمائے اسلام کو کسی کے سامنے علم میں اس قدر عاجز نہیں

پایا، جیسے امام ابوجعفر محمد باقرؑ کی مجلس میں کیونکہ میں نے ان کے حضور حکم بن عینیہ کو ایک بے بس چڑیا کی مانند دیکھا جو اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتی ہو۔

آپ کے حالات بیان کرنے والوں کا کہنا ہے کہ امام محمد بن علیؑ بن حسینؑ کہ جن کا لقب باقرؑ ہے وہ اپنے بھائیوں میں سے اپنے والد بزرگوار علیؑ بن حسینؑ کے جانشین، وصی اور آپ کے بعد امامت پر فائز ہوئے۔ وہ سب میں علم، زہد، فضیلت اور قیادت میں فوقیت حاصل کیے ہوئے تھے۔ وہ ان سب سے زیادہ مشہور و معروف اور عوام و خواص کے نزدیک سب سے بڑھ کر صاحب منزلت تھے۔ حتٰی کہ امام حسنؑ و حسینؑ کے بیٹوں میں سے کسی کے ذریعے سے حدیث، سنت، تفسیر اور سیرت کے علوم اور دیگر فنون اس قدر ظاہر نہیں ہوئے جس قدر آپ سے ہوئے۔ آپ سے اس زمانے میں موجود ممتاز صحابہ تابعین اور فقہاؑ نے احادیث روایت کی ہیں۔

قرطبی نے آپکے متعلق کہا: (شعر کا ترجمہ)

آپ صاحبانِ تقوٰی کے لیے علم کی تفسیر کرنے والے ہیں اور دنیا کے تمام بہترین افراد میں ممتاز ہیں۔

مالک بن اعین جہنی نے آپ کی مدح میں یہ اشعار کہے ہیں:

جب بھی لوگوں کو علم قرآن کی تلاش ہوئی تو ان کو قریش میں سے (آل محمدؐ) ہی اس کے خزینہ دار ملے۔

جب یہ دریافت کیا گیا کہ رسولؐ کی بیٹی کی اولاد کہاں ہے تو انہی کو ان کی سرسبز شاخ قرار دیا گیا۔ یہ وہ ستارے ہیں جو راہگیروں کی ہدایت کے لیے چمکتے رہتے ہیں اور یہ علم کے وہ پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے کے وارث ہوتے آئے ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز کو اطلاع دی گئی کہ علیؑ بن حسینؑ دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں، تو انھوں نے کہا: ہاں! وہ دنیا کا چراغ، اسلام کا جمال اور عابدوں کی زینت تھا کہ جس نے رحلت کی ہے۔ پھر ان کو بتایا گیا کہ آپ نے اپنے بعد اپنے بیٹے ابوجعفر کو چھوڑا ہے اور ان کی بجائے وہی امامت کے منصب پر فائز ہوئے ہیں۔

جیسا کہ یعقوبی نے روایت کی ہے، اس مرحلے پر عمر بن عبدالعزیز نے امام محمد باقرؑ کو ایک خط لکھا جس میں ان کا احوال دریافت کیا۔ امام ابو جعفر محمد باقرؑ نے خط کا جواب لکھا اور اس میں ان کو کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ تب عمر نے کہا: ذرا ان کا وہ خط تو میرے پاس لانا جو انھوں نے سلیمان کے نام لکھا ہے۔ جب وہ خط لایا گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس میں آپ نے سلیمان کی مدح کی تھی۔ اس پر عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ میں اپنے گورنر کو حکم بھیجا کہ: تم محمد بن علیؑ کو بلا کر کہو کہ یہ سلیمان کے نام آپ کا خط ہے، جس میں آپ نے اس کی تعریف کی، لیکن عمر بن عبدالعزیز کو خوف دلایا ہے۔ حالانکہ وہ انصاف اور حسنِ عمل کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ گورنر نے آپ کو بلایا اور جو کچھ عمر نے لکھا تھا اس کی اطلاع دی۔ اس پر امام محمد باقرؑ نے فرمایا: سلیمان ایک ظالم حکمران تھا۔ اس کو میں نے وہ لکھا جو ظالموں کو لکھا جاتا ہے۔ مگر تمہارا آقا عدل و انصاف کی راہ پر چلتا ہے، اس لیے میں نے ان کو وہ لکھا جو نیکوکاروں کو لکھا جاتا ہے۔

مدینہ کے گورنر نے امامؑ کا یہ جواب عمر بن عبدالعزیز کو لکھ بھیجا۔ انھوں نے اس کو پڑھا تو بول اُٹھے: اس گھرانہ کے افراد کو اللہ کبھی فضیلت سے محروم نہیں رکھتا۔

مرآۃ الجنان میں ہے کہ محی الدین بن شرف نووی متوفی ۶۶۷ھ نے آپ کے متعلق لکھا ہے کہ محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ قریشی و ہاشمی ہیں اور آپ باقرؑ کے لقب سے مشہور ہیں۔ یہ لقب آپ کو اس لیے دیا گیا ہے کہ آپ نے علوم کو شگافتہ کیا ہے جس سے اس کی اصلی اور مخفی باتیں معلوم ہو گئیں۔ آپ جلیل القدر تابعی ہیں، عالی صفت امام ہیں اور آپ کی جلالت شان پر سب متفق ہیں۔ آپ کا شمار مدینہ کے فقہاء اور ائمہ میں ہوتا ہے۔ آپ نے رسول اللہؐ کے صحابیوں جابر اور انس کے علاوہ ممتاز تابعین سے احادیث سنی ہیں۔ آپ سے ابو اسحاق سبیعی، عطاء بن ابی رباح، عمر بن دنیار اعرج، زہری، ربیعہ رائی اور دوسرے بڑے بڑے ائمہ نے احادیث روایت کی ہیں۔

ابن عماد حنبلی نے شذرات کی پہلی جلد میں آپ کے متعلق کہا ہے کہ: ابو جعفر محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ مدینہ کے فقہاء میں سے تھے۔ آپ کو باقرؑ کہا جاتا تھا کیونکہ آپ نے علم کی گتھلیوں کو شگافتہ کیا۔ اس کی جڑ بنیاد معلوم کر لی اور اسے ہر طرف پھیلا دیا۔

آپ اہلبیتؑ میں ہونے والے بارہ اماموں میں شامل ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ عبداللہ بن عطاء نے آپ کے بارے میں کہا ہے کہ میں نے کسی کے سامنے علماء کو علم میں اس قدر عاجز نہیں دیکھا جتنا محمدؑ بن علی باقرؑ کے حضور میں۔

آپ کے متعلق محمد بن طلحہ قرشی عدوی شافعی مطالب السؤل میں کہتے ہیں: محمد بن علیؑ باقرؑ علم کے بند دروازوں کو کھولنے والے اور اس کے مختلف موضوعات کو جمع کرنے والے ہیں۔ آپ نے اپنے علم کو پھیلایا اور اس کے جھنڈے کو بلند کیا۔ آپ اس کی حیثیت کو اونچا کرنے والے، اس کو آگے بڑھانے والے، اس کے موتیوں کو جلا دینے والے اور اس کو مزین کرنے والے ہیں۔ آپ کا قلب پاک اور آپ کا عمل صاف ہے۔ آپ کا نفس باطہارت اور آپ کے اخلاق باعظمت ہیں۔ آپ کے اوقات اطاعتِ الٰہی کے لیے وقف ہیں۔ آپ کے قدم اللہ کے خوف میں جمے ہوئے ہیں۔ خوبیاں آپ کی طرف بڑھتی ہیں اور اعلیٰ صفات آپ کی ذات سے شرف حاصل کرتی ہیں۔ آپ کے تین لقب ہیں۔ باقر العلم، شاکر اور ہادی۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور باقرؑ ہے۔ آپ کا یہ لقب علم میں آپ کی دقیق نگاہی اور علم کو وسعت دینے کے باعث ہے۔

کتاب جوہرۃ الکلام میں محمود بن عبدالفتاح حنفی آپ کے بارے میں کہتے ہیں:

محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ کو باقرؑ نام بقر الارض یعنی زمین کو شگافتہ کرنے والے اور اس میں دبی اور چھپی ہوئی چیزوں کو برآمد کرنے کے انداز پر دیا گیا۔ کیونکہ آپ نے علوم کے پوشیدہ خزانوں، اسلامی احکام اور دیگر علمی باریکیوں کی حقیقتوں کو اس طرح ظاہر فرمایا کہ وہ عقل کے اندھوں کے علاوہ کسی پر پوشیدہ نہیں رہیں۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب باقر علم یعنی علم کا شگافتہ کرنے والا، جمع کرنے والا اور بلند کرنے والا ہو گیا۔ آپ کا قلب پاک ہے اور آپ کا علم و عمل صاف ہے۔ آپ کا نفس باطہارت، آپ کا اخلاق باعظمت اور آپ کے اوقات اپنے رب کی اطاعت میں وقف رہے۔

آپ کی کنیت ابوجعفر ہے۔ آپ کے لقب تین ہیں۔ باقر، شاکر اور ہادی۔ ان میں زیادہ مشہور باقرؑ ہی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ آپ کے بارے میں وہی کافی ہے جو ابن مدینی نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے۔ جو انھوں نے اس وقت کہا تھا جب آپ

چھوٹے ہی تھے اور وہ یہ کہ: " رسول اللہؐ نے آپ کو سلام کہا ہے" اس پر ان سے کہا گیا کہ اے جابر! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں بیٹھا تھا اور حسینؑ آپ کی گود میں تھے۔ آپ ان سے پیار کر رہے تھے۔ اس وقت آنحضرتؐ نے مجھ سے فرمایا: اے جابر! ان کی اولاد میں ایک لڑکا پیدا ہوگا کہ جس کا نام علیؑ ہوگا۔ قیامت کے روز ایک ندا دینے والا کہے گا کہ سید العابدینؑ کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت ان کا بیٹا علیؑ کھڑا ہو جائے گا۔ پھر فرمایا کہ ان علیؑ بن حسینؑ کا ایک بیٹا ہوگا کہ اس کا نام محمدؑ ہوگا۔ پس اگر تم اس کے زمانہ تک جیتے رہو تو اے جابر! اس کو میرا سلام کہنا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جو پرانے لوگوں نے بیان کیا ہے اور مصنفین اسے ممتاز افراد کے ذیل میں آپ کے وصف اور مدح میں بیان کیا ہے۔

ہم قارئین کی اکتاہٹ کے خوف سے انہی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ مجھے ان بیانات کو طول دینے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ امام باقرؑ کی ذات اس بات کی محتاج نہیں ہے کہ ان کے تعارف کے لیے کوشش کی جائے، کیونکہ ان کو پوری دنیا جانتی پہچانتی ہے۔

جب کوئی شے طویل ہو جائے تو وہ خود ہی قائم رہتی ہے اور آفتاب کی روشنی ہر تاریکی کو زائل کر دیتی ہے۔

جامعۂ اہلبیتؑ

میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص جو جہالت اور تعصب سے بری ہو، مجھ کو غلو یا جنبہ داری کا مورد الزام نہ ٹھہرائے گا، اگر میں ان کثیر التعداد افراد کو جو مدینہ کی مسجد میں امام محمد باقرؑ کی خدمت میں جمع ہوا کرتے تھے، اس کو جامعہ کا نام دیدوں کیونکہ اس طریقہ پر وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں سے سیکڑوں افراد فقہ، حدیث، فلسفہ، تفسیر اور لغت وغیرہ متعدد علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا کرتے تھے اور جب سے امام محمد باقرؑ نے اس کی بنا ڈالی تھی، اس وقت سے لے کر آپ کے فرزند امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں اس کی ترقی اور تکمیل کے آخری مرحلہ تک یہاں مختلف علاقوں کے ہزاروں افراد جمع ہوتے رہے، جو فقہ، حدیث، فلسفہ، تفسیر اور لغت وغیرہ کے علوم میں مہارت حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔

پروفیسر عبدالعزیز نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: کوفہ، بصرہ، واسط اور حجاز کے لوگ مدینہ میں قائم اس جامعہ اہلبیتؑ میں اپنے ناتراشیدہ پارہ ہائے جگر کو بھیجتے تھے، جو وہاں سے عظیم علماء، محدّثین اور راویان حدیث بن کر نکلتے تھے۔ جیسا کہ حسن بن علی الوشا نے کوفہ میں نو سو علماء کو امام جعفر صادقؑ اور آپ کے پدر عالی قدر امام محمد باقرؑ سے حدیثیں روایت کرتے اور درس دیتے دیکھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ایک ساتھی سے باتیں کرتے ہوئے اس سے یہ بھی کہا کہ: میں نے مسجد کوفہ میں نو سو ایسے علماء دیکھے کہ جن میں سے ہر ایک کہتا تھا کہ "مجھ سے جعفرؑ بن محمدؑ نے بیان کیا۔"

یہ حسن بن علی الوشا امام علی رضاؑ کے ہم عصر تھے اور وہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے اس مدرسہ کے قیام سے تیس سال بعد یہ کہہ رہے تھے کہ میں نے اس جامعہ سے تعلیم حاصل کرنے والوں کی تالیفات کا شمار کیا تو مجھ کو ان کی چھ ہزار کتابیں ملیں جن میں سے چار سو صرف اصول کے موضوع پر ہیں اور شیعہ محدّثین میں معروف ہیں۔ غالباً ان چاروں کتابوں یعنی کافی، من لایحضرہ الفقیہ، وافی اور استبصار میں جو احادیث درج ہیں، وہ انہی کتب اصول سے لی گئی ہیں۔

اب جبکہ ہم اس جامعہ اہلبیتؑ کا ذکر کر رہے ہیں، جس کو امام محمد باقرؑ نے قائم کیا تھا، تو ہم کو اس طرف اشارہ کرنے کو بھول نہیں جانا چاہیے کہ یہ عظیم کام جو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے انجام دیا اور جس کے ایسے قابل قدر نتائج برآمد ہوئے۔ یہ ایسا اہم ترین کام ہے جو ہمارے ہر امام کے پیش نظر رہا ہے لیکن وہ حالات جو امام محمد باقرؑ اور جعفر صادقؑ کو میسّر آئے وہ دوسرے اماموں کے عہد میں موجود نہیں رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام محمد باقرؑ کی امامت کا زمانہ وہ تھا کہ جب اموی سیاست پر شدید پریشانیوں کی چوٹیں پڑ رہی تھیں اور مختلف علاقوں میں ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے شورشیں اٹھ رہی تھیں۔ چنانچہ بنی امیہ کی طرف سے علویوں کے ساتھ کی جانے والی سختیاں اور بے رحمیاں ان کے دشمنوں کے ہاتھ میں ایک کارگر ہتھیار ثابت ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں وہ ائمۂ اہلبیتؑ اور ان کے شیعوں کے ساتھ پہلے کے مقابلہ میں معتدل طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جب امام جعفر صادقؑ کا زمانہ آیا تو اموی حکومت اپنی زندگی

کے آخری سانس لے رہی تھی اور ان کے دشمن بنی عباس کو مسلسل فتوحات حاصل ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی حکمرانی کا چھتر ٹوٹ گیا اور پھر حکومت عباسیوں کے ہاتھ میں آگئی۔

ان خاص حالات میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کو اتنی آزادی ضرور مل گئی کہ وہ پیغام الٰہی کے تحفّظ اور اس کی تبلیغ کے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو ادا فرمائیں۔ چنانچہ یہ ذمہ داری دو زمانوں میں پوری ہوئی۔ جن میں سے ایک زمانہ بنی امیہ کی مصیبتوں اور ناکامیوں میں گھرا ہوا تھا اور دوسرا بنی عباس کی کامرانی کی صبح اور حکومت پر اقتدار حاصل کرنے کے خوابوں کی تعبیر کا زمانہ تھا۔

یہ نئی حکومت علویوں کے نام پر قائم ہوئی تھی اور ایسے حالات ائمۂ اہلبیتؑ میں سے کسی اور کو میسر نہیں آئے تھے۔ البتہ جب حکومت پر عباسیوں کے پنجے اچھی طرح گڑ گئے کہ جنھوں نے اب تک اہل بیتؑ اور ان کے شیعوں کے سامنے ان سے اپنے بغض کو چھپائے رکھا تھا۔ اب وہ بھی ان سے ویسا ہی بُرا سلوک کرنے لگے، جیسا کہ اموی ان کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک کہنے والے نے کہا:

اے کاش کہ بنی مروان کا ظلم ہم پہ جاری رہتا اور بنی عباس کا یہ عدل جہنّم میں چلا جائے۔

اس جامعہ اہلبیتؑ کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب اموی حکومت ہر طرف سے خطروں میں گھری ہوئی تھی۔ اس میں طالب علموں کی تعداد چار ہزار سے کچھ اوپر تک جا پہنچی تھی، لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب مسلمانوں پر ایک صدی سے زائد ایسا زمانہ گزر چکا تھا جس میں ان کو اہلبیتؑ کی فقہ سے کوئی سروکار نہ تھا اور نہ ان کو کسی ایسی حدیث سے کوئی واسطہ تھا، جس کا راوی اس کو علانیہ طور پر ان سے منسوب کرے۔ سوائے اس کے جو کبھی کبھار صرف لکھنے کی حد تک ان سے روایت کی گئی ہو، کیونکہ امویین اہلبیتؑ کے آثار کو مٹانے اور ہر اس شخص کو جو ان کی محبّت کا دم بھرے، جور و ستم کا نشانہ بنانے کے درپے رہتے تھے۔

اگر امیرالمومنین امام علیؑ کے بعد آنے والے ائمہ کو یہ موقع مل جاتا کہ وہ اس راہ پر گامزن ہو جائیں جس پہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ چلے تھے تو فقہ اہل بیتؑ ہی

وہ مروجہ فقہ ہوتی کہ جس پر عام مسلمانوں کا عمل ہوتا کیونکہ یہ فقہ امیرالمومنینؑ ہی سے چلی ہے اور فقہ اور قضاء میں اوّل و آخر بلا اختلاف آپ ہی صاحب رائے مانے جاتے ہیں۔ آپ نے مدینہ اور کوفہ میں جو علمی آثار چھوڑے وہ ان تمام مشکل مسائل کے حل کے لیے کافی ہیں جو کسی بھی جگہ پر مسلمانوں کو درپیش ہوں، لیکن دشمن فرمانروا آپ کے ان علمی و عملی آثار کو مٹانے کا کام کرتے رہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خاص طریقوں سے کام لے کر کسی افراد کو آپ کا ہم پلّہ اور مخالف بنا کر کھڑا کر دیا۔ جیسا کہ بعد میں وہ ان کے بیٹوں کے مقابلے کرتے رہے اور ان کے شیعوں کی گھات میں لگے رہے۔ وہ ہر اس شخص کا پیچھا کرتے اور اس کو سخت سزائیں دیتے تھے جو ان کی رائے پر چلتا یا ان سے حدیث روایت کرتا ہو۔ حالانکہ ان حکام نے اپنی مملکت کے مرکزی اور صوبائی دارالحکومتوں اور دوسرے اہم مقامات پر موجود اپنے پروردہ علماء اور طالبان علم کو کھلی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جو حدیث چاہیں بیان کریں اور جو فتویٰ چاہیں جاری کریں۔ چنانچہ مکہ اور مدینہ میں سالم بن عبداللہ بن عمر، عروہ بن زبیر، زہری، محمد بن شہاب، یحییٰ بن سعید اور عطا وغیرہ جیسے غلام اور آزاد افراد فتوی جاری کرنے میں امام کی حیثیت رکھتے تھے جبکہ کوفہ میں اور لوگوں کے علاوہ ابراہیم نخعی اور شعبی حدیث بیان کرتے اور فتوے دیتے تھے۔ حالانکہ نخعی نے ان لوگوں سے فقہ اخذ کی تھی جنھوں نے یہ امام علیؑ سے حاصل کی تھی۔ لیکن وہ امیرالمومنینؑ کی رائے کو خود اپنی رائے کہہ کر پیش کرتے تھے۔ چنانچہ لوگ ان کو ان لوگوں میں شمار کرتے تھے جو اپنی رائے پر عامل ہوں۔ یہی حال بصرہ کے فقیہہ حسن بصری اور یمن کے فقیہ طاؤس کا تھا۔ اس طرح ان لوگوں نے ہر شہر میں ایک سے زیادہ عالم مقرر کر دیے تھے تاکہ وہاں کے لوگ حلال و حرام کے معاملہ میں ان سے رجوع کیا کریں۔ البتہ وہ شیعہ فقہاء کہ جو تقریباً اس طبقہ کے ہم عصر تھے جیسے سعید بن مسیّب قاسم بن محمد اور ایسے ہی دوسرے افراد اس زمانہ کے علماء میں فقہ میں صرف اس لیے نمایاں مانے جاتے تھے کہ ان کے فتووں میں صریحی طور پر شیعی رنگ نہیں تھا۔ سعید بن مسیب کے بارے میں ایک زمانہ میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ وہ اس وقت کے علماء کے علاوہ کسی اور کی یا گزرے ہوئے صحابہ اور تابعین کی رائے کے مطابق جواب دیتے ہیں۔

یہ اس ڈر سے ہوا کہ مبادا ان کو بھی وہی کچھ پیش نہ آجائے جو سعید بن جبیر اور یحییٰ بن ام طویل وغیرہ کے ساتھ ہو چکا تھا کیونکہ وہ صرف علیؑ اور اولاد علیؑ کی پیروی کی بنا پر قتل اور تباہی کا شکار بنائے گئے تھے۔

مختصر یہ کہ اللہ کی مرضی سے اس جامعہ اہل بیتؑ نے کچھ زمانہ امن اور اطمینان سے گزار لیا جو ان آثار کی نسبت سے اتنا طویل نہیں تھا جو اس نے ایک تہائی صدی میں وسیع اسلامی مملکت کے مشرق و مغرب میں چھوڑے۔

اللہ کی یہ بھی مرضی تھی کہ مذہب اہلبیتؑ اور ان کی فقہ کہ جو علیؑ بن ابی طالب کی فقہ ہے جنہوں نے اس کو براہ راست رسول اللہؐ سے اخذ کیا وہ ان کے پوتے امام جعفر بن محمد الصادقؑ سے منسوب ہو جو اس جامعہ کے قیام میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ شریک رہے اور ان کی وفات کے بعد خود انہوں نے اس کو جاری رکھا، لیکن ان کی طرف فقہ کی یہ نسبت اس لیے نہیں کہ وہ اصول مذہب یا اصول فقہ میں اپنے اسلاف یا اخلاف سے مختلف رائے کے حامل تھے کیونکہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میری حدیث، میرے باپ کی حدیث ہے۔ میرے باپ کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے۔ میرے دادا کی حدیث رسول اللہؐ کی حدیث ہے اور رسول اللہؐ کی حدیث اللہ کا قول ہے۔ تاہم ان کی طرف اس فقہ کی نسبت اس لیے ہے کہ ان کو اور ان کے والد بزرگوار کو ایسے حالات مل گئے، جو ان دونوں کے علاوہ کسی اور امام کو نہیں ملے۔ چنانچہ وہ تھوڑا سا عرصہ کہ جس میں سیاسی ابتری پھیل گئی تھی وہ حالات آپ دونوں باپ بیٹے کے مفاد میں تھے جن کے نتیجے میں وہ اس قابل ہو گئے کہ ملک کے شرق و غرب کو اہلبیتؑ کے آثار و فقہ سے بھر دیں۔ انھوں نے وہ مقصد حاصل کر لیا جو ان دونوں سے قبل اور ان کے بعد ہونے والے ائمہ حاصل نہ کر سکے۔ لہٰذا آثار و فقہ اہلبیت امام صادقؑ سے منسوب ہو گئے۔ جیسا کہ ہر شخص پر واضح ہے جو فقہ اور عقائد میں اہلبیتؑ کی پیروی کرتا ہے۔

اب جبکہ ہم امام محمد باقرؑ کے حالات اور اس جامعہ کی بنیاد ڈالنے میں آپ کے عملی کارنامہ کا بیان کر رہے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان افراد کا ذکر بھی کریں جنہوں نے اس جامعہ سے تکمیل علم کرنے کے بعد اس کے آثار کو مختلف علاقوں میں پھیلایا۔

ان میں سے کچھ یہ ہیں:

ابان بن تغلب بن ریاح البکری۔

ابان بن تغلب نے تین ائمۂ اہلبیتؑ کا زمانہ پایا اور ان سے علم حاصل کیا۔ بعض لوگوں نے راویوں کے جو حالات قلمبند کیے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابان بن تغلب کا تعلق امام محمد باقرؑ سے بہ نسبت امام سجادؑ اور امام جعفر صادقؑ کے زیادہ طویل تھا۔ انھوں نے ان دونوں کے مقابل ان سے زیادہ اخذ علم کیا۔ نجاشی نے ابراہیم بن یزید نخعی سے روایت کی ہے کہ ابان بن تغلب علم کی مختلف شاخوں یعنی فقہ، حدیث، ادب، لغت اور نحو میں پیش پیش تھے۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ انھوں نے بہت سی کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے ایک تفسیر غریب القرآن ہے۔ نیز یہ کہ امام ابوجعفر محمد الباقرؑ نے ان سے فرمایا: تم مسجد مدینہ میں بیٹھ جاؤ اور لوگوں کے لیے فتوی جاری کیا کرو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ میرے شیعوں میں تم ایسے شخص کو دیکھیں۔

راویوں کے حالات لکھنے والوں کا بیان ہے کہ ابان بن تغلب جب امام جعفر صادقؑ سے ملنے آتے تو آپ ان سے مصافحہ کرتے، گلے ملتے، ان کے لیے تکیہ منگواتے اور ان کے آنے پر خوشی کا اظہار فرماتے۔ اسی طرح جب وہ مسجد نبوی میں جاتے تو ان کے لیے نبی اکرمؐ کا ستون خالی کر دیا جاتا اور لوگ ان کے پاس لپک کر آجاتے تھے۔

عبدالرحمٰن بن حجاج سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ہم ابان بن تغلب کی صحبت میں تھے کہ ان کے پاس ایک جوان آیا اور کہنے لگا: اے ابوسعید! مجھے بتائیے کہ نبی اکرمؐ کے کس کس صحابی نے علیؑ بن ابی طالب کا ساتھ دیا تھا۔ انھوں نے کہا: شاید تم علیؑ کی فضیلت معلوم کرنا چاہتے ہو کہ کس کس صحابی نے ان کی پیروی کی۔ پھر انھوں نے کہا کہ ہم اصحاب کی فضیلت ان کے علیؑ کی پیروی کرنے ہی سے معلوم کرتے تھے۔

علم رجال و درایہ پر لکھنے والے بتلاتے ہیں کہ انہی ابان نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے مختلف موضوعات پر تیس ہزار سے زیادہ حدیثیں روایت کی ہیں

جن میں سے بیشتر فقہ کے بارے میں ہیں۔ کہا گیا ہے کہ کسی شخص نے ان کو امام محمد باقرؑ سے روایت کرنے پر برا کہا تو انھوں نے جواب دیا: تم مجھ کو ایسے امامؑ سے روایت کرنے پر کیسے برا کہہ سکتے ہو کہ جب بھی میں ان سے کچھ دریافت کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں: رسول اللہؐ یہ فرماتے ہیں! پھر ایک موقع پر امام جعفر صادقؑ نے سلیم بن ابی حیّہ سے کہا کہ تم ابان بن تغلب کے پاس جاؤ، کیونکہ انھوں نے مجھ سے بہت سی احادیث سنی ہیں۔ جو کچھ وہ بیان کریں تم اس کو میری طرف سے روایت کیا کرو۔

سنی علماء اور محدّثین نے بھی ان کو قابل اعتماد قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ ان کے شیعہ ہونے کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کی شیعیت میں پختگی کے ساتھ ساتھ روایت حدیث میں ان کے سچّا ہونے کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم کو ان کے بیان کی سچائی سے سروکار ہے۔ رہی ان کی بدعت تو اس کا بار خود ان پر ہے۔ بدعت سے ذہبی کی مراد ان کا امام علیؑ کو دوسرے بڑے صحابہ پر فضیلت دینا اور ان سے محبت کرنا ہے۔

ابن ندیم نے الفہرست میں ان کی تین کتابوں کو جگہ دی ہے۔ یعنی کتاب فی القرآتؑ، کتاب فی معانی القرآن اور کتاب فی اصول الحدیث علیٰ مذہب الشیعہ۔

زرارہ بن اعین: زرارہ، امام محمد باقرؑ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ وہ مذہب اہلبیتؑ میں فقہ و حدیث کے مرجع تھے۔ ان کے بارے میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اگر زرارہ نہ ہوتے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے والد بزرگوار کی احادیث ضائع ہو جاتیں۔ انکی جلالتِ شان اور علوّ قدر کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ جب یونس بن عمار نے امام جعفر صادقؑ کے سامنے وہ حدیث پیش کی جو زرارہ نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ: باپ، ماں، بیٹے اور بیٹی کی موجودگی میں کوئی اور شخص وراثت نہیں پا سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا: جو کچھ زرارہ نے میرے والد امام محمد باقرؑ سے روایت کیا ہے، میرے لیے جائز نہیں کہ اس کی تردید کروں۔

ابراہیم بن عبدالحمید وغیرہ کی روایت میں ہے کہ امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ فرمایا کرتے تھے: اللہ زرارہ بن اعین پر رحمت نازل فرمائے، کیونکہ اگر زرارہ اور ان جیسے

افراد نہ ہوتے تو میرے پدر عالی قدر کی احادیث فنا ہو جاتیں۔ اسی طرح آپ نے اپنے اصحاب کے بارے ہیں کہ جن میں زرارہ بن اعین، ابو بصیر لیث مرادی، محمد بن مسلم اور یزید بن معاویہ عجلی شامل ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو ہماری فقہ کا ظاہر کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ یہ دین کے محافظ اور حلال و حرام کے بارے میں میرے والد بزرگوار کے امین اور دنیا و آخرت میں ہماری طرف آنے والوں میں پیش پیش ہیں۔

زرارہ کے حالات کے بیان میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنی ایک مجلس میں ان سے فرمایا: قسم بخدا تم مجھے سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو اور میرے والد بزرگوار کے زندہ اور مردہ اصحاب میں سب سے زیادہ پیارے ہو۔ انہوں نے دو کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ایک جبر و تفویض پر اور دوسری استطاعت پر۔ جیساکہ قمی کی سفینۃ البحار اور شیخ محمد طٰہٰ نجف کی انقان المنتعال میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا شمار امام ابو جعفر محمد باقرؑ کے ان چھ اصحاب میں ہوتا ہے جن کے بارے میں راویوں کا اتفاق ہے کہ جو کچھ ان سے وارد ہوا ہے سب کا سب صحیح ہے۔

محمد بن مسلم ثقفی: وہ بھی امام محمد باقرؑ کے ممتاز شاگردوں میں ہیں۔ چنانچہ انہی محمد بن مسلم ثقفی، زرارہ بن اعین، محمد بن علی بن نعمان (مومن طاق) اور یزید بن معاویہ عجلی کے متعلق امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ: "یہ چار افراد مجھ کو زندہ اور مردہ لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب ہیں"۔

ابن ابی یعفور نے امام جعفر صادقؑ سے کہا کہ میں ہر وقت آپ کی خدمت میں آنے اور ملاقات کا شرف حاصل کرنے سے قاصر ہوں لیکن کوئی نہ کوئی شخص میرے پاس آتا ہی رہتا ہے اور پھر وہ ایسے مسائل پوچھتا ہے کہ مجھ سے ان کا جواب بن نہیں پڑتا۔ امام نے فرمایا کہ: تم کو محمد بن مسلم ثقفی کے پاس جانے میں کیا رکاوٹ ہے انہوں نے میرے والد بزرگوار سے حدیث سنی ہے اور وہ ان کے نزدیک بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔

انہی محمد بن مسلم ثقفی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک رات میں بالاخانہ پر سو رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ایک بی بی کو دردِ زہ ہوا اور وہ اسی حالت میں مر گئی

ہے لیکن بچّہ اس کے پیٹ میں حرکت کر رہا ہے۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟ میں نے کہا کہ جب اسی طرح کا سوال علیؑ بن حسینؑ سے کیا گیا تھا تو انھوں نے فرمایا کہ میّت کا بطن چاک کرکے بچّے کو نکال لیا جائے۔ پس تم بھی ایسا ہی کرو۔ میں نے مزید کہا کہ اے کنیزِ خدا! میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم کون ہو۔ تب اس نے کہا کہ اللہ تم پر رحم کرے۔ ابھی میں نے ابوحنیفہ کے پاس جاکر یہ سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ البتہ تم محمد بن مسلم ثقفی کے پاس جاؤ کہ وہ ضرور تم کو بتادیں گے لیکن جو حکم وہ بتائیں، پلٹ کر مجھ کو بھی بتاتی جانا۔

محمد بن مسلم کہا کرتے تھے: جب میرے ذہن میں کوئی بات آتی تو میں اس کے متعلق امام ابوجعفر محمد باقرؑ سے دریافت کر لیتا تھا۔ اس طرح میں نے آپ سے تیس ہزار حدیثیں حاصل کیں۔ پھر میں نے ان کے بیٹے، امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ سے سولہ ہزار حدیثیں اخذ کیں۔ جیسا کہ رجال کشی اور علم رجال کے بیشتر مؤلفین نے بیان کیا ہے۔

محمد بن علی بن نعمان: ان کا لقب مومن طاق تھا۔ ابوالعباس نجاشی نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے تین ائمہ یعنی علیؑ بن حسینؑ، محمد بن علیؑ اور جعفرؑ بن محمدؑ سے علم حاصل کیا۔ ان کا لقب طاق اس لیے ہو گیا کہ وہ کوفہ کے ایک محلہ باب الطاق میں صراف کا کام کرتے تھے۔ یہ ان چار افراد میں شامل تھے، جن کی زندگی اور موت ہر دو حالتوں کے لیے امام جعفر صادقؑ نے دعا فرمائی اور رحمت طلب فرمائی تھی۔

ابوخالد کابلی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے مومن طاق کو ایک باغ میں دیکھا کہ مدینہ کے لوگوں نے ان کی قبا کے بٹن کھول دیے ہیں اور وہ تھکے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی لوگ ان پر سوال کیے چلے جا رہے ہیں اور وہ ہر سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ میں نے ان کے قریب جاکر کہا: ارے بھائی! ہم کو تو امام جعفر صادقؑ نے بولنے سے منع کر رکھا ہے۔ اس پر مومن طاق نے کہا: کیا تم کو مجھ سے بات کرنے کو کہا ہے؟ میں نے کہا: بخدا، نہیں! بلکہ مجھے تو آپ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں کسی سے بات نہ کروں۔ تب انہوں نے کہا: جاؤ اور جو حکم انہوں نے دیا ہے اس کی اطاعت کرو۔ کابلی کہتے ہیں کہ پھر میں امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے صاحب طاق کا یہ قصّہ

بیان کیا۔ نیز یہ کہ میں نے ان سے کیا کہا اور انہوں نے کیا جواب دیا۔ امامؑ مسکرائے اور آپ نے فرمایا: اے ابو خالد! جب مومن طاق لوگوں سے بات کرتا ہے تو اونچا جاتا ہے اور ان کی کاٹ کرتا ہے لیکن جب وہ لوگ تم سے کوئی بات کرتے ہیں تو تم اونچے نہیں جاتے ہو۔

ان کے حالات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی دلیلیں مضبوط ہوتی تھیں اور وہ بڑے اونچے درجے کے مناظر تھے۔ ان کا ہر مقابل ان سے مات کھا جاتا تھا۔ خواہ وہ علم میں ان سے کتنا ہی بڑھا چڑھا ہو۔ اسی لیے امامؑ نے ان کو بحث و مناظرہ سے منع نہیں فرمایا تھا۔ البتہ امامؑ ان لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کر دیتے تھے جو مناظرہ اور استدلال کے اصول سے ناواقف ہوں اور اپنے مقابل کے سامنے جم نہ سکیں۔ جیسا کہ آپ کی اس بات سے ظاہر ہے جو آپ نے ابو خالد کابلی سے فرمائی کہ مومن طاق لوگوں سے بات کرتا ہے تو اونچا جاتا ہے اور جب لوگ تم سے کوئی بات کرتے ہیں تو تم اونچے نہیں جاتے ہو۔

ان کے حالات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ وہ کوفہ کے ایک ممتاز خارجی کے پاس گئے اور اس سے کہا: میں اپنے دین سے اچھی طرح واقف ہوں اور میں نے سنا ہے کہ تم عدل کی صفت کے حامل ہو، اس لیے میں نے تمہارے پاس آنا پسند کیا ہے۔ اس نے اپنے اصحاب سے کہا کہ ان کا تمہارے پاس آنا تمہارے لیے فائدہ مند ہوگا۔ اب مومن طاق نے اس سے کہا کہ تم علیؑ ابن ابی طالب سے کیوں علٰحدہ ہو گئے ہو۔ نیز ان سے لڑنے اور ان کو قتل کرنے کو کیونکر حلال قرار دیتے ہو۔ اس خارجی نے کہا: اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے دین میں انسانوں کو حَکَم قرار دیا۔ انہوں نے کہا: گویا کہ ہر وہ شخص جو دین خدا میں اپنا حکم جاری کرے، تم اس کا قتل جائز قرار دیتے ہو۔ اس نے کہا: ہاں ایسا ہی ہے۔ تب انہوں نے اس سے کہا: اچھا تو مجھے اس دین کے متعلق بتاؤ جس کے لیے میں تم سے مناظرہ کرنے آیا ہوں تاکہ میں بھی اس میں تمہارے ساتھ داخل ہو جاؤں۔ اگر میری دلیل تمہاری دلیل پر غالب آجائے تو ہم میں سے کون غلطی کرنے والے کی غلطی بتائے گا اور کون صحیح بات کہنے والے کے بارے میں صحیح ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ اس پر اس خارجی نے اپنے اصحاب میں

سے ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا: ہمارے درمیان یہ حکم ہو گا۔ اب مومن طاق نے وہاں موجود خوارج کی طرف متوجہ ہو کر کہا: دیکھو تمہارے اس سردار نے دین خدا میں ایک انسان کو حکم بنایا ہے۔ پس ان لوگوں نے اپنے اس سردار کو اپنی تلواروں پر رکھ لیا۔ یہاں تک کہ وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ ان کے اور بھی ایسے بہت سے واقعات ہیں جبکہ وہ مختلف فرقوں کے رہبروں اور ان کے علماء سے اپنی ہر بحث میں ان پر فتحمند ہو کر نکلتے تھے۔ ان کے مناظروں اور دلائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انتہائی ذہین اور استدلال میں قوی تھے۔ وہ اپنے مقابل کو ایسے نکتے پر اپنی گرفت میں لیتے تھے جس کا اس کو خیال بھی نہ ہو۔ پھر وہ اس کو اپنے دلائل سے دبا لیتے تھے۔ جیسا کہ اس خارجی کے ساتھ ان کی مذکورۂ صدر گفتگو سے معلوم ہوتا ہے۔

یزید بن معاویہ عجلی: راویوں کے حالات لکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ یہ امام محمد باقرؑ کے ممتاز اصحاب میں سے تھے اور ان کے بعد امام جعفر صادقؑ کے دامن سے وابستہ رہے۔ جیسا کہ آپ کے اور بھی بیشتر اصحاب تھے کہ جنہوں نے کچھ نہ کچھ امام جعفر صادقؑ کا زمانہ بھی پایا۔ بلکہ ان میں سے بعض تو امام موسیٰ کاظمؑ کے عہد تک زندہ رہے اور انہوں نے آپ سے بھی روایت کی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے ان یزید بن معاویہ عجلی کو عالی نسب اور اللہ کے حلال و حرام کا امین قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ان کے بارے میں جمیل بن دراج کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔

داؤد بن سرحان سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ فرمایا کرتے تھے: اگر میرے اصحاب مجھ سے سن کر میری اطاعت کریں تو میں بھی ان کو اسی طرح تعلیم دوں جس طرح میرے والد بزرگوار نے اپنے اصحاب کو تعلیم دی تھی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میرے والد بزرگوار کے اصحاب ہمارے لیے اپنی زندگی اور موت ہر حال میں باعث زینت تھے۔ انہیں میں امامؑ نے یزید عجلی کو بھی شمار فرمایا اور ان کو عدل اور صدق کے قائم کرنے والے اور نیکیوں میں پیش پیش رہنے والے قرار دیا۔

جابر جعفی: جیسا کہ راویوں کے حالات پر مشتمل کتابوں میں ہے کہ انھوں نے امام محمد باقرؑ سے مختلف موضوعات پر تقریباً پچاس ہزار حدیثیں روایت کی ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں اور یہ بعید بھی نہیں ہے کہ اس تعداد میں مبالغہ ہے، پھر بھی اس میں شک نہیں کہ انہوں نے

امام محمد باقرؑ سے بہت بڑی تعداد میں حدیثیں روایت کی ہیں۔ چنانچہ ایسا بہت ہی کم ہوگا کہ کسی محقق کو ابواب فقہ میں کسی اسلامی موضوع پر کوئی ایسا باب ملے کہ جس میں انکی روایتیں موجود نہ ہوں۔ امام محمد باقرؑ کے انہی اصحاب میں فضیل بن یسار، ابوبصیر اسدی، عبداللہ بن مسکان، ابان بن عثمان احمر، حریز بن عبداللہ، عبداللہ بن جندب، علی بن نعمان اور صفوان الجمال بھی ہیں ——— ان میں سے آخر الذکر تینن اشخاص نے خانۂ کعبہ میں باہم عہد کیا کہ اگر ہم میں کوئی ایک، دوسرے سے پہلے وفات پا جائے گا تو ہم میں سے جو زندہ ہوگا وہ اس کی طرف سے روزے رکھے گا، حج ادا کرے گا اور اس کی طرف سے ہر سال اتنا مال زکات میں دیگا جو وہ خود دیا کرتا تھا۔ نیز تمام وہ اعمال خیر بجالائے گا جو وہ بجالایا کرتا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن جندب اور علی بن نعمان، صفوان بن مہران سے پہلے وفات پا گئے۔ پس وہ ہر روز ایک سو پچاس رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے اور سال میں تین ماہ روزے رکھتے تھے اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے زکات ادا کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ جو بھی عمل خیر خود بجالاتے وہی ان دونوں کی طرف سے بجالاتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی سیکڑوں افراد ہیں جو ائمۂ اہلبیتؑ میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے فقہ و حدیث کے علوم حاصل کرکے نکلے۔ پھر انھوں نے ان معلومات پر مبنی دسیوں کتابیں تالیف کیں۔ جیسا کہ ان مؤلفات سے ظاہر ہوتا ہے جو ان کی تاریخ اور آثار سے متعلق ہیں۔

امام محمد باقرؑ کے مناظرے

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ امام محمد باقرؑ کا دائرۂ عمل فقہ و حدیث تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ آپ اور آپ کے اصحاب، اصول اسلام پر دوسرے علماء سے مناظرے بھی کیا کرتے تھے۔ اس طرح وہ ان اصولوں کو لوگوں کے ذہنوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تاکہ اصول عقائد کے متعلق جو اختلافات اور بحثیں اس زمانے میں پیدا ہوگئی تھیں، وہ عام لوگوں کے لیے باعثِ پریشانی نہ بنیں۔

الوافی، ملّا محسن فیض کاشانی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں آیا ہے کہ نافع بن عبداللہ ازرق کہا کرتا تھا: اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی سواری مجھ کو زمین کے دونوں

سروں کے درمیان کسی ایسے شخص تک پہنچا دے گی جو میری اس بات کی مخالفت کرتا ہو کہ علیؑ نے اہل نہروان کو قتل کرنے میں ظلم نہیں کیا تو میں اس کے پاس ضرور ہی جاؤں۔ اس سے کہا گیا کہ جب ان کی اولاد موجود ہے تو پھر دُور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے کہا: کیا ان کی اولاد میں کوئی عالم ہے؟ جواب ملا کہ یہ بات تمہاری جہالت کی پہلی نشانی ہے۔ کیا یہ لوگ کسی زمانہ میں بھی علم اور عالم سے خالی رہے ہیں؟ تب اس نے پوچھا آج کل ان میں کون عالم ہے؟ کہا گیا کہ محمدؐ بن علیؑ بن حسینؑ! پس وہ اپنے اصحاب کے ایک گروہ کو لے کر چل پڑا اور وارد مدینہ ہوا۔ وہاں اس نے امام ابوجعفر محمد باقرؑ سے اذن حاضری طلب کیا۔ آپ نے فرمایا: وہ میرے پاس آکر کیا کرے گا، جبکہ وہ مجھ سے اور میرے آباءِ کرامؑ سے برائت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد امامؑ نے اپنے خدمت گار سے فرمایا: اس سے کہہ دو کہ وہ کل ہمارے پاس آجائے۔

اگلی صبح نافع بن عبداللہ اپنے اصحاب کو لیکر حاضر خدمت ہوا۔ امامؑ نے مہاجرین و انصار کی اولاد کو وہاں بلوالیا تھا۔ اب آپ نے ان سے فرمایا: تم میں سے جس کسی کو علیؑ کی کوئی فضیلت معلوم ہے میں اس کو قسم دیتا ہوں کہ وہ اسے بیان کرے۔ چنانچہ ان میں سے ایک گروہ نے وہ سب کچھ بیان کیا جو آپ کے فضائل و مناقب میں زبان زد عام تھا۔ ان لوگوں نے جو کچھ بیان کیا تھا، نافع بن عبداللہ ازرق اس میں سے کسی بات کا انکار نہ کر سکا۔ پھر بھی اس نے امام علیؑ کو کفر سے منسوب کیا، کیونکہ آپ نے صفین میں تحکیم پر رضامندی ظاہر فرمائی تھی۔ اس پر امامؑ نے اس کو خیبر کا واقعہ اور نبی اکرم کا یہ قول یاد دلایا کہ: کل میں علم اس مرد کو دوں گا جو اللہ کو اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے۔ اور اللہ اور رسولؐ بھی اس کو دوست رکھتے ہیں۔ نافع نے اس حدیث کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا۔

اب امام ابوجعفرؑ نے فرمایا: اب مجھ کو بتاؤ کہ جب اللہ اس روز علیؑ کو دوست رکھتا تھا تو وہ جانتا تھا کہ وہ اہل نہروان کو قتل کریں گے یا نہیں جانتا تھا۔ اب اس خارجی نے سکوت اختیار کر لیا۔ اب وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا کیا جواب دے کیونکہ اگر وہ کہتا ہے کہ اللہ نہیں جانتا تھا تو اللہ کو جہل سے منسوب کرتا ہے۔ اگر کہتا ہے کہ وہ جانتا

تھا تو اگر وہ لوگ قتل کے مستحق نہیں تھے تو یقیناً علیؑ بن ابی طالب ایک بڑی خطاء اور شدید ظلم کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اللہ ان کو دوست کیسے رکھ سکتا ہے جبکہ وہ اس کے بندوں پر ظلم ڈھاتے ہیں، کیونکہ اللہ ظالموں اور مجرموں کو دوست نہیں رکھتا۔

اب اس کے لیے یہ اعتراف کرنے کے علاوہ کوئی راستا نہ تھا کہ وہ لوگ قتل کے مستحق تھے۔ چنانچہ وہ شکست کھا کر امامؑ کی مجلس سے اٹھ کر چلا گیا۔

التوحید، شیخ صدوق میں ہے کہ عبداللہ بن سنان نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں امام باقرؑ کی صحبت بابرکت میں موجود تھا کہ ایک خارجی وہاں آیا اور آپ سے مخاطب ہو کر بولا: اے ابوجعفرؑ! آپ کس چیز کی عبادت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ اس نے کہا: کیا آپ نے اس کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کو آنکھیں اپنی پتلیوں سے نہیں دیکھتی ہیں، بلکہ دل اس کو حقیقتِ ایمان کی مدد سے دیکھتے ہیں۔ نہ اس کو قیاس سے پہچانا جاتا ہے نہ حواس سے اس کو جانا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کی شبیہہ پر نہیں ہے۔ اس کو صرف نشانیوں کے ذریعہ ہی پہچانا جاسکتا ہے اور وہ اپنے فیصلے میں ظلم نہیں کرتا۔ پس وہی وہ اللہ ہے کہ جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ اس پر وہ شخص یہ کہتا ہوا چلا گیا: بے شک اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنا عہدۂ رسالت کہاں قرار دے۔

التوحید، شیخ صدوق میں ہی محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام محمد باقرؑ سے اللہ کے اس قول کے بارے میں دریافت کیا:

يَاإِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ. (سورۂ صٓ۔ آیت ۷۵)

اے ابلیس: تجھے اس کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا کہ جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔ آپ نے فرمایا: عرب میں یَدٌ کے معنی قوت اور عظمت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً اللہ کہتا ہے: وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ. (سورۂ ذاریات۔ آیت ۴۷) ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔ یعنی بِقُوَّةٍ (قوت سے) نیز اللہ کا قول ہے: وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ. (سورۂ مجادلہ۔ آیت ۲۲) ان کو اپنی روح سے قوت بخشی۔ نیز جیسے کسی کو کہا جاتا ہے: عِنْدِي أَيَادٍ كَثِيرَةٌ. میرے پاس بہت ہاتھ ہیں۔ مطلب یہ کہ بہت فضیلت اور خوبی ہے۔ پھر یہ کہ وَلَهُ عِنْدِي يَدٌ بَيْضَاءُ میرے پاس اس کے لیے

ید بیضاء یعنی نعمت ہے۔

عمرو بن عبید نے امام محمد باقرؑ کے سامنے یہ آیت پڑھی: وَمَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ۔ (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۸۱) جس کسی پر بھی میرا غضب نازل ہوا، وہ برباد ہو گیا۔ پھر دریافت کیا کہ یہ غضب کیا چیز ہے؟ اس پر امام ابو جعفرؑ نے فرمایا: اس غضب کے معنی سزا کے ہیں۔ کیونکہ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اللہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا ہے تو وہ اس کو مخلوق کی صفات سے متصف کرتا ہے لیکن اللہ وہ ہے کہ جس کو کوئی شے متاثر نہیں کرتی اور نہ اس کے حال میں تغیر پیدا کرتی ہے۔

الارشاد شیخ مفید میں ہے کہ محمد بن ابی عمیر نے عبدالرحمٰن بن حجاج سے اور انہوں نے امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: محمد بن مکندر کہا کرتے تھے کہ میں سمجھتا تھا کہ امام علیؑ بن حسینؑ نے علم و فضیلت میں اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا ہے۔ حتیٰ کہ میں نے ان کے فرزند محمدؑ بن علیؑ کو دیکھا۔ میں نے چاہا کہ ان کو نصیحت کروں۔ تاہم انہوں نے ہی مجھ کو نصیحت فرمائی۔ وہ اس طرح کہ میں ایک مرتبہ گرمی کے وقت میں مدینہ کے نواح میں گیا۔ وہاں میری ملاقات محمدؑ بن علیؑ سے ہوئی۔ وہ فربہ جسم رکھتے تھے اور اپنے دو خدمتگاروں کے سہارے چل رہے تھے۔ میں نے سوچا: یہ قریش کے ایک سردار ہو کر ایسے وقت میں طلب دنیا میں اس طرح مصروف ہیں تو میں ضرور ان کو نصیحت کروں گا۔ چنانچہ میں نے قریب جا کر ان کو سلام کیا۔ تب انہوں نے مجھ کو بڑی بشاشت سے سلام کا جواب دیا، جبکہ وہ پسینہ میں شرابور تھے۔ اب میں نے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے۔ آپ قریش کے سرداروں میں سے ہیں اور اس تکلیف دہ حالت میں طلب دنیا میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو اسی حالت میں موت آ جائے تو کیا ہو۔ اس پر انھوں نے اپنے خدمت گاروں پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور سنبھل کر فرمایا: قسم بخدا! اگر مجھ کو اس حال میں موت آ جائے جبکہ میں اللہ کے ایک حکم کی اطاعت و فرمانبرداری میں مصروف ہوں، تو میں تم سے اور تمام لوگوں سے بہتر رہوں گا۔ البتہ مجھے اس وقت کی موت سے ڈر لگتا ہے جو اس حالت میں آئے جب مجھ سے اللہ کی کوئی نافرمانی ہو رہی ہو۔ اس پر میں نے عرض کیا: اللہ آپ پر رحم فرمائے! میں تو آپ کو نصیحت کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے مجھ کو نصیحت فرما دی۔

یہ ابن مکندر تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے، جیسے طاؤس یمانی اور ابراہیم بن ادھم وغیرہ۔ انھوں نے روزی کمانا ترک کر دی تھی اور عبادت میں منہمک ہو گئے تھے۔ اس طرح وہ زندگی گزارنے کے لیے لوگوں کے سہارے پر ہو گئے تھے۔ اس لیے امامؑ کا یہ جواب ان کے غلط طرز عمل پر سرزنش اور تنبیہہ کے طور پر تھا کیونکہ طلب رزق کی وہ کوشش جو کسی کو دوسرے انسانوں سے بے نیاز کر دے وہ بہترین عبادت ہے۔ نبی اکرمؐ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ فرمایا کرتے: ملعون ہے، ملعون ہے وہ شخص کہ جو اپنا بار زندگی دوسروں پر ڈال دے۔ آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا: ایک دن کا نیک عمل، سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔ اسی وجہ سے ابن مکندر نے امامؑ سے کہا: میں چاہتا تو یہ تھا کہ آپ کو نصیحت کروں لیکن آپ ہی نے مجھ کو نصیحت فرما دی۔

شیخ مفید کی روایت میں ہے کہ ایک روز نافع بن ازرق حلال و حرام کے بارے میں کچھ مسائل دریافت کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امام ابو جعفر محمد باقرؑ نے اس سے باتیں کرتے ہوئے فرمایا: اے نافع! تم ان بیعت شکنوں سے یہ تو پوچھو کہ تم نے امیرالمومنینؑ امام علیؑ سے کنارہ کشی اختیار کی حالانکہ تم نے ان کی اطاعت میں ان کے ساتھ رہ کر اپنے خون بہائے تھے اور تقرب الٰہی کے لیے ان کی نصرت کی تھی جب وہ تم کو یہ جواب دیں کہ ہم نے یہ اس لیے کیا کہ انھوں نے دین الٰہی کے معاملہ میں انسانوں کو حَکَم بنا لیا تھا۔ تب ان سے کہنا کہ: خود اللہ نے ہی اپنی شریعت میں مخلوق میں سے دو حَکَم بنانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے: فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَکَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا ۔ (سورۂ نساء۔ آیت ۳۵) پس تم ایک حَکَم مرد کی طرف سے اور ایک حَکَم عورت کی طرف سے قرار دو۔ اگر انکی خواہش اصلاح کی ہو گی تو اللہ ان دونوں کو نیک راہ دکھا دے گا۔ نیز رسول اللہؐ نے سعد بن معاذ کو بنی قریظہ کے لیے حَکَم بنایا تھا۔ پھر انھوں نے ان کے بارے میں وہی فیصلہ کیا جو اللہ کی مرضی کے مطابق تھا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ امیرالمومنینؑ نے دونوں حکموں کو ہدایت کی تھی کہ وہ قرآن کے مطابق فیصلہ کریں اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔ آپ نے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ انسانوں کا فیصلہ قرآن کے خلاف ہوگا تو وہ رد کر دیا جائے گا۔ پھر جب

ان سے کہا گیا کہ آپ نے ایسے کو اپنے اوپر حکم بنایا جس نے آپ کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔ تب آپ نے فرمایا تھا کہ میں نے اپنے اوپر مخلوق کو حکم نہیں بنایا، بلکہ قرآن کو حکم بنایا تھا۔ پس خارجی اس شخص کی گمراہی کا کیا ثبوت پاتے ہیں جس نے قرآن سے فیصلہ کرنے کی ہدایت کی تھی اور یہ شرط رکھی تھی کہ قرآن کے خلاف دیے گئے فیصلے کو رد کر دیا جائے گا۔ سوائے اس کے کہ ان کی یہ بدعت طرازی محض بہتان پر ہی قائم ہے۔ اس پر نافع بن عبداللہ ازرق بول اٹھے۔ بخدا یہ کلام ایسا ہے کہ کبھی میرے کانوں سے نہیں گزرا تھا اور مجھ کو ذرا بھی شک نہیں کہ یہ حق ہے۔

کلینی نے اصول کافی میں ابو حمزہ ثمالی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں مسجد نبوی میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے آکر سلام کیا اور کہا: اے بندۂ خدا! تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ میں کوفہ کا رہنے والا ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: کیا تم ابو جعفر محمدؑ بن علیؑ کو پہچانتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں! لیکن تم کو ان سے کیا مطلب جبکہ تم حق و باطل میں تمیز کر سکتے ہو۔ اس پر اس نے مجھ سے کہا: تم کوفہ والے وہ قوم ہو جس سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ جب ابو جعفرؑ تشریف لائیں تو مجھ کو بتا دینا۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ امام ابو جعفرؑ تشریف لے آئے، جبکہ اہل خراسان ان کے چاروں طرف پھیلے تھے اور آپ سے ارکان حج کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔ چنانچہ آپ آکر اپنی نشستگاہ پر بیٹھ گئے۔ اب وہ شخص بھی آپ کے قریب بیٹھ گیا اور میں بھی وہاں بیٹھ کر آپ کی باتیں سننے لگا۔ آپ کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ جب ان سب کی گفتگوئیں پوری ہوگئیں اور وہ چلے گئے تو آپ نے اس شخص کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا: تم کون ہو؟ اس نے کہا، میں قتادہ بن دعامہ بصری ہوں۔ امام ابو جعفرؑ نے اس سے فرمایا: تم اہل بصرہ کے فقیہ ہو؟ اس نے کہا: ہاں! تب آپ نے فرمایا: اے قتادہ، وائے ہو تم پر۔ اللہ نے کچھ افراد کو خلق فرما کر ان کو اپنی مخلوقات پر حجت قرار دیا۔ پس وہ سطح زمین پر کھونٹوں کی مانند ہیں۔ اللہ کے حکم کو قائم کیے ہوئے ہیں اور علم میں منتخب ہیں۔ اللہ نے اپنی مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ان کو اپنے عرش کے دائیں جانب اس کے زیر سایہ قرار دیا ہے۔ اس پر قتادہ دیر تک خاموش رہا اور پھر بولا: اللہ آپ کا بھلا کرے۔ بخدا میں فقہاء کے درمیان

حتٰی کہ ابن عباس کے پاس بھی بیٹھا ہوں لیکن ان میں سے کسی کے پاس بیٹھنے سے میرا قلب اس قدر کبھی نہیں لرزا تھا، جیسا آپ کے قریب بیٹھنے سے لرز رہا ہے۔ تب امام ابوجعفرؑ نے اس سے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تم اس وقت کہاں ہو؟ تم اس وقت ان گھروں کے سامنے ہو، جہاں اللہ کے اذن سے اس کے نام کو بلند کیا جاتا ہے۔ ان میں صبح و شام ایسے لوگ اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، جن کو اللہ کے ذکر، نماز کے قیام اور زکات کے ادا کرنے سے نہ کاروبار باز رکھتا ہے نہ ان کی خرید و فروخت۔ تم اس وقت وہیں ہو اور وہ لوگ ہم ہی ہیں۔ اس پر قتادہ بول اٹھا: بخدا! آپ سچ فرماتے ہیں۔ اللہ مجھے آپ کا فدیہ قرار دے۔ یہ وہ گھر ہیں جو پتھر اور مٹی کے نہیں ہیں۔

پھر قتادہ نے آپ سے کہا: مجھے پنیر کے متعلق بتا دیجیے۔ امام باقرؑ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: بس تم کو اتنا ہی پوچھنا ہے؟ اس نے کہا: اس کا شرعی حکم میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ امامؑ نے ان سے فرمایا: اس کے کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ قتادہ نے کہا: کبھی کبھی اس میں مردہ بکری کے معدہ کی جھلی بھی ڈالی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا: پھر بھی اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ کیونکہ اس جھلی میں رگیں، خون اور ہڈی نہیں ہوتی اور یہ اس کی خوراک کے ملغوبے اور خون سے بنتی ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کی مثال اس مری ہوئی مرغی کی سی ہے جس کے پیٹ سے انڈا نکالا جائے، تو کیا تم وہ انڈا کھاتے نہیں؟ قتادہ بولے: نہیں اور نہ میں اس کے کھانے کا حکم دیتا ہوں۔ اس پر امام ابوجعفرؑ نے فرمایا: اگر تم اس انڈے کو کسی مرغی کے نیچے رکھ دو اور اس میں سے بچہ پیدا ہو اور بڑا ہو جائے تو کیا تم اس کو کھاؤ گے نہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں! تب آپ نے فرمایا: اب بتاؤ کہ کس نے تمہارے لیے اس انڈے کو حرام اور اس سے پیدا ہونے والی مرغی کو حلال قرار دیا ہے؟ پس یہی حال اس جھلّی کا بھی ہے۔ ہاں یہ بات یاد رکھو کہ تم پنیر مسلمانوں اور نماز گزاروں کی دکان سے خریدا کرو، لیکن اس کی بابت خواہ مخواہ کے سوال مت کرو، تا اینکہ کوئی تم کو خود ہی کچھ بتا دے۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن معمر لیثی نے امام ابوجعفرؑ سے کہا: مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ متعہ کے حق میں فتویٰ دیتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: اللہ نے اپنی کتاب

میں اس کو حلال قرار دیا، رسول اللہؐ نے اس کو جاری کیا اور صحابہ نے اس پر عمل کیا ہے۔ اس پر عبداللہ نے کہا: لیکن عمر بن خطاب نے اس سے منع کر دیا ہے۔ تب امامؑ نے ان سے فرمایا: تم اپنے ایک ساتھی کا قول پیش کر رہے ہو اور ہم رسول اللہؐ کے قول پر ہوں۔ عبداللہ بن معمر نے پلٹ کر یہ جواب دیا: کیا آپ کو یہ امر پسند ہو گا کہ آپ کی عورتیں اس پر عمل کریں۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: اے احمق! اس میں عورتوں کا کیا ذکر؟ جبکہ وہ ذات جس نے اس کو اپنی کتاب میں حلال قرار دیا اور اپنے بندوں کو اس کی اجازت دی ہے وہ تم سے اور اس سے جس نے یہ حکماً بند کیا ہے، زیادہ غیرت مند ہے۔

آپ نے مزید فرمایا: تو کیا تم کو یہ پسند ہے کہ تمہاری کوئی عورت یثرب کے کسی جولاہے سے نکاح کرلے۔ انہوں نے کہا: نہیں! امامؑ نے فرمایا: یہ کیوں؟ کیا تم اس عمل کو حرام قرار دیتے ہو جس کو اللہ نے حلال کیا ہے۔ وہ بولے نہیں۔ میں حرام قرار نہیں دیتا، بلکہ وہ جولاہا میرے لیے ہم پلہ نہیں ہے۔ امام ابوجعفرؑ نے فرمایا: اگر اللہ اس کے عمل سے خوش ہو اور پھر وہ اس کی تزویج جنت کی حور سے کر دے، تو کیا تم اس شخص سے جس کو اللہ پسند کرتا ہے نفرت کرو گے اور اپنے غرور کی وجہ سے ایک ایسے شخص کے سامنے اکڑے رہو گے جو حورِ جنت کا ہم پلہ ہے۔ اس پر عبداللہ ہنس پڑے اور بولے: آپ کے سینوں میں یقیناً علم کے شجر پیدا ہوتے ہیں۔ پس آپ کو ان کے پھل اور عام آدمیوں کو ان کے پتے ملے ہیں۔

ابوبصیر سے روایت ہے کہ ایک روز امام محمد باقرؑ اپنے مکان میں تشریف فرما تھے اور آپ کے چند اصحاب بھی آپ کے پاس تھے۔ اتنے میں طاؤس یمانی کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور امام ابوجعفرؑ سے بولے: کیا آپ مجھ کو سوال کرنے کی اجازت دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! جو چاہتے ہو پوچھو۔ انہوں نے کہا: بتایئے کہ ایک تہائی انسان کب ہلاک ہوئے؟ امامؑ نے فرمایا: اے شیخ تم کو دھوکہ ہوا، شاید تم ایک چوتھائی کہنا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں، اے فرزند رسولؐ! میرا مطلب یہی تھا۔ پس امامؑ نے فرمایا: ایک چوتھائی انسان اس روز مرے، جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ کیونکہ اس وقت سطح زمین پر آدمؑ، حوا، قابیل اور ہابیل کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ چنانچہ ہابیل

کے مرنے سے ان میں سے ایک چوتھائی مر گئے۔ اب طاؤس نے کہا: تو ان دونوں میں سے ہم انسانوں کا باپ کون ہوا؟ قاتل ــــ یا مقتول؟ امامؑ نے فرمایا: نہ یہ نہ وہ ابلکہ شیثؑ بن آدمؑ انسانوں کے باپ ہوئے ہیں۔ طاؤس نے کہا: آدمؑ کا نام آدم کیوں رکھا گیا؟ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ ان کی مٹی زمین کی نچلی سطح یعنی ادیم سے لی گئی تھی۔ اب انہوں نے پوچھا انکی بیوی کا نام حوا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا کیونکہ وہ آدمؑ کی زندہ پسلی سے پیدا کی گئیں انہوں نے کہا ابلیس کا یہ نام کیوں رکھا گیا؟ آپ نے فرمایا اسلیے کہ اسنے رحمتِ الٰہی سے ابلاس یعنی ناامیدی ظاہر کی اور وہ اس کی امید نہیں رکھتا۔ انہوں نے پوچھا: جنات کو جن کیوں کہا گیا؟ آپ نے فرمایا: کیونکہ انہوں نے جنان (پوشیدگی) اختیار کی اور وہ دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ طاؤس نے کہا: بتائیے کہ پہلا جھوٹ کونسا ہے اور وہ کس نے بولا تھا؟ آپ نے فرمایا: پہلا جھوٹ ابلیس نے بولا، جب اس نے کہا کہ میں آدمؑ سے برتر ہوں کیونکہ تو نے مجھ کو آگ سے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ انہوں نے کہا: بتائیے کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے گواہی سچی دی حالانکہ وہ جھوٹے ہیں۔ آپ نے فرمایا: منافقین، جنہوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں آپ اللہ کے رسولؐ ہیں لیکن اللہ نے گواہی دی ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔ انہوں نے کہا: مجھے بتائیے کہ وہ اڑنے والا کون ہے، جو ایک ہی مرتبہ اڑا کہ نہ کوئی اس سے پہلے اڑا تھا نہ اس کے بعد۔ اللہ نے اس کا ذکر قرآن میں بھی کیا ہے۔ امامؑ نے فرمایا وہ کوہِ طور ہے، جس کو اللہ نے بنی اسرائیل کے اوپر اڑایا اور اس کے ایک پہلو سے ان پر سایہ کیا جس میں قسم قسم کے عذاب تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے توریت کو قبول کر لیا۔ اس پر اللہ کا یہ قول ہے:

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ. (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۷۱)

جب ہم نے پہاڑ کو چلا کر ان کے سروں کے اوپر پہنچا دیا گویا کہ وہ ان کو ڈھانپے ہوئے تھا، جس سے ان کو گمان ہوا کہ وہ ان پر گرنے ہی والا ہے۔

پھر طاؤس نے کہا: مجھ کو بتائیے کہ وہ کون سا رسول (قاصد) ہے کہ جس کو اللہ نے بھیجا، لیکن وہ جنّ و انس اور ملائکہ میں سے نہیں ہے۔ تاہم اللہ نے اس کا

ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: وہ وہی کوّا ہے جس کو اللہ نے بھیجا جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تھا تاکہ وہ قابیل کو دکھائے کہ اب وہ اپنے مقتول بھائی کی میت کو کس طرح دفن کرے۔ اس کے بارے میں اللہ کا قول یہ ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۔

پس اللہ نے ایک کوّے کو بھیجا تاکہ وہ زمین کھود کر دکھائے کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کی میت کو دفن کرے۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۳۱)

طاؤس نے کہا: مجھے بتائیے کہ کس نے اپنی قوم کو تنبیہ کی، جو جنّ و انس اور ملائکہ میں سے نہیں اور اس کا ذکر بھی اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: وہ ایک چیونٹی ہے، جس نے کہا تھا:

يٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔ (سورۂ نمل۔ آیت ۱۸)

اے چیونٹیو! اپنے بلّوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمانؑ اور ان کے لشکر والے تم کو کچل نہ ڈالیں اور ان کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔

طاؤس نے کہا: وہ کونسی صلوٰۃ ہے کہ جو فرض ہے مگر بغیر وضو کے۔ وہ کون سا روزہ ہے جس کے رکھنے والے نے رکھا اور کھاتے پینے سے احتراز نہیں کیا۔ امامؑ نے فرمایا: وہ صلوٰۃ جو بغیر وضو کے ہوسکتی ہے وہ نبیؐ و آل نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجنا ہے اور جس روزے میں کھانا پینا ترک نہیں کیا گیا وہ بی بی مریم کا روزہ ہے جس کا ذکر اس قول میں ہے:

اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۔

میں نے اللہ کے نام پر روزہ رکھ لیا ہے۔ پس میں آج کسی انسان سے بات نہ کروں گی۔ (سورۂ مریم۔ آیت ۲۶)

راوی کہتا ہے کہ پھر طاؤس نے آپ سے پوچھا: وہ کونسی چیز ہے جو بڑھتی اور گھٹتی ہے۔ پھر وہ جو بڑھتی ہے گھٹتی نہیں اور جو گھٹتی ہے بڑھتی نہیں۔ امامؑ نے فرمایا:

جو چیز بڑھتی بھی ہے گھٹتی بھی ہے وہ چاند ہے۔ جو چیز بڑھتی ہے گھٹتی نہیں وہ سمندر ہے اور وہ چیز جو گھٹتی ہے بڑھتی نہیں، وہ عمر ہے۔

امام ابو محمد حسن عسکریؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک روز محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ تشریف فرما تھے۔ تب آپ نے فرمایا کہ جب رسول اللہؐ نے تبوک کے لیے روانگی کا حکم دیا، اس وقت آپ نے امیرالمومنین امام علیؑ کو اپنی بجائے مدینہ میں چھوڑا۔ امام علیؑ نے کہا: یارسول اللہؐ! مجھ کو یہ پسند نہیں ہے کہ کسی معاملہ میں آپ سے علٰحدہ رہوں۔ آپ کے دیدار سے محروم رہوں اور آپ کی طرف سے نگاہ ہٹاؤں۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: اے علیؑ! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ میرے ساتھ تمہاری وہی منزلت ہو جو ہارونؑ کی موسٰیؑ کے ساتھ تھی۔ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اے علیؑ! تم یہیں قیام کرو، بے شک یہاں بھی تمہارے لیے وہی اجر ہے جو تمہارے لیے اس صورت میں ہوتا جبکہ تم اللہ کے رسولؐ کے ساتھ جاتے۔ اس کے علاوہ تنہا تمہارے لیے ان لوگوں کے کل اجر کے برابر اجر ہے جو یقین اور اطاعت گزاری کی حالت میں اللہ کے رسولؐ کے ساتھ جارہے ہیں۔ اے علیؑ! تمہاری پرخلوص محبت کے باوصف اللہ نے تم کو یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ تم (قریب و بعید سے) ہر حال میں محمدؐ کو دیکھتے ہو اور اللہ کی اس قدرت و مشیئت کی بدولت جہاد اور دیدار میں سے کسی شے سے محروم نہ رہو گے۔ اس پر ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا: اے فرزند رسولؐ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ حق تو صرف انبیاءؑ کو حاصل ہے، کسی اور کو نہیں۔ تب امامؑ نے فرمایا: یہ محمد رسول اللہؐ کا معجزہ ہے، کسی اور کا نہیں کیونکہ اللہ محمدؐ کی دعا سے اس کو ممکن کر دیتا ہے۔

اس کے بعد امام محمد باقرؑ نے فرمایا: اس امت کا یہ کس قدر ظلم ہے علیؑ بن ابیطالب پر اور کس قدر کم ہیں ان جناب کے انصار! یہ لوگ علیؑ کو یہ مرتبہ بھی نہیں دیتے جو وہ دوسرے صحابہ کو دیتے ہیں، حالانکہ وہ جناب ان سب سے افضل ہیں۔ پھر کیونکر ان کو وہ مرتبہ نہیں دیتے جو وہ دوسروں کو دیتے ہیں۔ آپ سے کہا گیا: اے فرزند رسولؐ! یہ صورت کیسے پیش آئی؟ آپ نے فرمایا: تم لوگ ابوبکر بن قحافہ کے دوستوں سے محبت کرتے ہو اور ان کے دشمنوں سے اظہار بیزاری کرتے ہو، پھر خواہ وہ کوئی بھی ہوا کرے۔ اسیطرح عمر بن خطاب

اور عثمان بن عفان سے محبت کرتے ہو اور دونوں کے دشمنوں سے اظہار بیزاری کرتے ہو لیکن جب معاملہ امام علیؑ تک پہنچتا ہے تو تم کہنے لگتے ہو کہ ہم ان سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کے دشمنوں سے اظہار بیزاری نہیں کرتے، بلکہ ان سے بھی محبت ہی کرتے ہیں۔ اب سوچو کہ تمہارا یہ عمل کیسے جائز ہے؟ جبکہ علیؑ کے متعلق رسول اللہؐ نے فرمایا: بار الہا! اس کو دوست رکھ جو اسے دوست رکھے، اس سے دشمنی کر جو اس سے دشمنی کرے اور اس کو چھوڑ دے جو اس کو چھوڑے۔ کیا تم نے آنحضرتؐ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جو علیؑ سے دشمنی کرے اس سے دشمنی نہ کر اور جو اس کو چھوڑے اس کو نہ چھوڑ۔ پس یہ ہرگز انصاف کی بات نہیں ہے۔

راوی کہتا ہے کہ امامؑ مزید فرماتے رہے: اس کے علاوہ جب یہ لوگ امام علیؑ کی وہ صفات جو اللہ نے ان کو رسول اللہؐ کی دعا اور خود اپنے نزدیک ان کے مرتبہ کے باعث عطا کی ہیں، ان کو یاد کرتے ہیں تو ان میں اختلاف کرتے ہیں لیکن دوسرے صحابہ کے لیے ایسی ہی باتوں کو مان لیتے ہیں۔ پس وہ شے جس کو وہ علیؑ کے لیے نہیں مانتے اور دوسرے صحابہ کے لیے مان لیتے ہیں وہ عمر بن خطاب کے متعلق ہے کہ جب ان سے کہا جائے کہ وہ مدینہ میں منبر پر لوگوں سے خطاب کر رہے تھے کہ یکایک کہنے لگے: یا ساریۃ الجبل! (اے پہاڑ پر چڑھنے والی جماعت)۔ پھر جب وہ خطبہ ختم کر چکے اور نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ خطبہ کے دوران انھوں نے کیا کہا تھا؟ تو وہ بولے دیکھو! جب میں خطبہ دے رہا تھا، میری نظر اس سمت اٹھ گئی جہاں تمہارے بھائی نہاوند میں سعد بن وقاص کی قیادت میں کفار سے برسرپیکار ہیں۔ اس وقت اللہ نے میرے سامنے سے پردے اور رکاوٹیں ہٹا دیں اور میری نظر کو قوت عطا کر دی۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں کو اپنے سامنے پہاڑ پر دیکھا اور کچھ کفار مسلمانوں کے اس رسالہ کو گھیرے میں لینے کے لیے آگے بڑھے۔ تب میں نے پکارا کہ اے پہاڑ پر جانے والی جماعت! کہ وہ پہاڑ کی ایک جانب پناہ حاصل کر لے تاکہ پہاڑ ان کی پشت پر ہو اور ان کو گھیرے میں آجانے سے محفوظ رکھے۔ ہاں تو اللہ نے ہمارے ان مومن بھائیوں کے آگے کافروں کو زیر کر دیا اور ان کے علاقوں پر مسلمانوں کو تسلط عطا کیا ہے۔ تم اس وقت کو یاد رکھنا کہ عنقریب تمہارے پاس اس کی خبر پہنچ جائیگی۔ یاد رہے کہ مدینہ اور نہاوند کے مابین پچاس روز کی مسافت کا فاصلہ تھا۔ امام ابوجعفر محمد باقرؑ

نے مزید فرمایا: یہ بات جو بظاہر محال ہے، اگر عمر بن خطاب کی نسبت سے قابل قبول ہے تو پھر اسی قسم کی بات علیؑ بن ابی طالب کے لیے کیوں قابل قبول نہیں ہے؟ بس بات یہی ہے کہ یہ لوگ انصاف سے کام نہیں لیتے بلکہ دوسروں کو علیؑ سے آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

زرارہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں امام ابوجعفر کے پہلو میں بیٹھا تھا اور آپ قبلہ کی طرف رُخ کیے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ اس (یعنی کعبہ) کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔ اسی وقت قبیلۂ بجیلہ کا ایک آدمی وہاں آیا اور اس نے کہا: اے ابوجعفر! کعب احبار کہا کرتا تھا کہ کعبہ ہر صبح بیت المقدس کو سجدہ کرتا ہے۔ امام محمد باقرؑ نے پوچھا: تم کعب کے قول کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا کعب ٹھیک ہی کہتا تھا۔ امام ابوجعفرؑ نے فرمایا: کعب نے جھوٹ بولا اور اس کے ساتھ تم نے بھی جھوٹ بولا ہے۔ اس کی گفتار سن کر آپ غضبناک ہو گئے۔ زرارہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو کسی اور سے یہ کہتے نہیں سنا کہ تم نے جھوٹ کہا۔

امام محمد باقرؑ اور عبدالملک بن مروان

راویوں کا کہنا ہے کہ عبدالملک بن مروان کی کوشش تھی کہ اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں علویوں پر کم سے کم سختی کرے۔ چنانچہ اس نے حجاز میں اپنے گورنر کو منجملہ اور باتوں کے یہ لکھا کہ: مجھ کو آل ابی طالب کی خونریزی سے دور رکھنا کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ جب کبھی آل حرب نے ان پر فوج کشی کی، کامیاب نہیں ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات صحیح ہو کہ وہ اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں علویوں اور شیعوں کے ساتھ زیادہ نرم رَو تھا۔ شاید اس نے اس خرابی کا اندازہ لگا لیا ہو گا جو ان لوگوں کے ساتھ معاویہ اور ان کے بیٹے یزید کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوئی۔ پھر اس نے ان بے چینیوں کا بھی احساس کیا ہو گا جو اس کے نتیجے میں ملک کے مختلف اطراف میں پھیل گئی تھیں۔ خاص کر اس نے حجاز کے بارے میں نئی خواہشات کا اظہار کیا تھا اور عراق اور دوسرے علاقوں کے لیے بھی للچا رہا تھا لیکن عبدالملک کی یہ ظاہری پالیسی اس کے پورے زمانۂ حکومت تک قائم نہیں رہی، بلکہ جیسے ہی اس کے دشمن ابن زبیر کا خاتمہ ہوا، اس نے

اپنے عاملوں کو لکھ بھیجا کہ وہ اہل بیتؑ کے پیروؤں پر سختی کریں اور سنگدلی سے پیش آئیں۔ نیز حجاج کو عراق جانے کا حکم دیتے ہوئے اس سے کہا کہ: "شیعوں کو قتل کرنے کے بہانے تلاش کرو کیونکہ مجھ کو ان کے بارے میں بعض ناپسندیدہ خبریں ملی ہیں۔ جب تم کوفہ پہنچ جاؤ تو ایسے اقدامات کرو کہ جن سے اہل بصرہ بھی دہل جائیں۔"

اب وہ خود بھی ائمہؑ کے حالات پر نگاہ رکھنے لگا اور حجاز کے گورنر کو حکم دیا کہ وہ امام زین العابدینؑ کو اس کے پاس بھیج دے۔ جیسا کہ ہم آپ کی سیرت کے بیان میں ذکر کر چکے ہیں وہ آپ سے کینہ رکھتا تھا۔ حجاج نے عراق کے شیعوں کے ساتھ جو ظالمانہ برتاؤ کیا تاریخ میں اس سے بدتر برتاؤ کی مثال نہیں ملتی۔

اس کے باوجود بھی کہ عبدالملک، ائمہؑ اور ان کے شیعوں کے ساتھ ایسا برا سلوک کرتا تھا لیکن بعض مشکل اور سخت موقعوں پر جو اس کو در پیش آتے، وہ انہی سے رجوع کرتا تھا۔ وہ ان کے مرتبہ سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ کسی کو صحیح رائے دینے میں بخل نہیں کرتے خواہ وہ ان کا بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ خاص طور پر ان موقعوں پر جبکہ وہ رائے اسلام کے مفاد میں ہو۔

چنانچہ حیواۃ الحیوان دمیری، شذرات العقود، مقریزی اور بعض دوسری کتابوں میں کسائی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں ایک روز ہارون الرشید سے ملنے گیا، وہ اپنے ایوان میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے اتنی کثیر رقم پڑی تھی کہ جس سے چاند بھی ماند پڑ جائے۔ تاہم انہوں نے اس کی تقسیم کا حکم دیا۔ البتہ ان کے ہاتھ میں ایک درہم تھا کہ جس کی تحریر چمک رہی تھی اور وہ اس پر غور کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: تم جانتے ہو کہ سونے اور چاندی کے سکوں پر کس نے لکھائی شروع کی؟ میں نے کہا: میرے آقا! وہ عبدالملک بن مروان تھا۔ وہ بولے: اس کا سبب کیا تھا؟ میں نے کہا: مجھ کو اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے سکوں پر لکھائی شروع کی۔ انہوں نے کہا: میں تم کو بتلاتا ہوں۔ سنو! پہلے کاغذ روم سے آتا تھا اور وہ مصر میں بنایا جاتا تھا۔ مصر کے بیشتر افراد بادشاہ روم کے مذہب پر یعنی نصرانی تھے۔ اس لیے وہ اس کاغذ پر جو مہر لگاتے تھے، اس میں "باپ، بیٹا اور روح القدس" کے الفاظ بھی ہوتے تھے۔ اسلام کے تمام

ابتدائی دور تک یہی حال رہا۔ یہاں تک کہ عبدالملک بن مروان کا زمانہ آیا۔ سب سے پہلے اسی کو اس بات کا خیال آیا کیونکہ وہ ایک ذہین آدمی تھا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز اس کو ایک کاغذ ملا۔ اس نے اس پہ لگی ہوئی مہر دیکھی تو اس کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ جب ترجمہ اس کو سنایا گیا تو اس نے اس کو بہت ناپسند کیا اور بولا کہ یہ کیسی بُری بات ہے کہ اسلام کے اصولوں کے خلاف کاغذوں پر ایسی مہریں لگائی جاتی ہیں۔ پھر ان برتنوں، کپڑوں اور پردوں پر بھی ایسی تصویریں بنائی جاتی ہیں جو اسلام کو جھٹلانے کا ذریعہ ہیں۔ چونکہ یہ علاقہ بہت وسیع اور دولت مند ہے اس لیے وہاں ایسی بہت سی چیزیں تیار ہوتی ہیں اور ان پر بھی چھاپ لگائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی عبدالعزیز بن مروان کو جو مصر میں اس کی طرف سے گورنر تھا، یہ خط لکھا کہ وہ اس مہر کو منسوخ کردے اور کاغذ وغیرہ بنانے والے کاریگروں کو حکم دیدے کہ اب وہ اپنی بنائی ہوئی سبھی چیزوں پر اس غیر اسلامی مہر اور تصویروں کے بجائے قرآن کی کسی سورت کا نقش چھاپا کریں۔ چنانچہ کاغذ پر ایسا قرآنی نقش آج تک رائج ہے۔ نہ اس میں کوئی کمی ہوئی نہ زیادتی اور نہ کوئی تبدیلی۔ نیز اس نے اپنے تمام عاملوں کو لکھ بھیجا کہ روم کی مہروں اور تصویروں والے جو کاغذ ان کے یہاں رائج ہوں وہ ان کا استعمال بند کردیں۔ نیز اس حکم کے بعد اگر کسی کے پاس سے ایسی کوئی چیز نکلے، اس کو قید یا کوڑوں کی سزا دی جائے۔

پھر جب کاغذ اور دوسری چیزوں پہ نئی مہریں اور تصویریں بنائی گئیں اور وہ روم کے علاقوں میں پہنچیں تو ان کے بادشاہ کے لیے ان کا ترجمہ کیا گیا جو اس کو بُرا لگا اور وہ غصے میں بھر گیا۔ تب اس نے عبدالملک کو لکھا کہ کاغذ سازی کا کام مصر میں ہوتا ہے اور جو تصویریں وہاں تیار کی جاتی ہیں وہ سب روم کے طرز پر تیار ہوتی تھیں تا اینکہ تم نے ان کو بند کردیا۔ پس جو کچھ تم سے پہلے کے خلیفہ کرتے آئے وہ ٹھیک تھا تو تم نے غلطی کی اور اگر تم نے صحیح کام کیا تو وہ غلطی کرتے رہے۔ ان دونوں صورتوں میں سے جو تم چاہو، وہ پسند کرو اس کو قبول کرلو۔ رومی بادشاہ نے اپنے خط کے ساتھ عبدالملک کو قیمتی تحفہ بھی بھیجا اور یہ خواہش کی کہ جو طریقہ پہلے سے رائج تھا اس کو بحال کردیا جائے۔ عبدالملک بن مروان

نے اس کا تحفہ اور خط واپس کر دیا۔ بادشاہ روم نے دوبارہ اور سہ بارہ خط لکھا اور ہر مرتبہ تحفہ کی مقدار بڑھاتا رہا لیکن عبد الملک اس کی بات ماننے سے انکار کرتا رہا۔ آخر میں بادشاہ روم نے دھمکی دی کہ وہ اپنے ہاں کے درہم اور دینار پر آنحضرتؐ کی شان میں گستاخانہ کلمات نقش کرائے گا۔ چنانچہ دونوں میں اسی طرح کی بحث چلتی رہی اور کسی صورت حل ہونے میں نہ آئی اور بادشاہ روم اپنے اصرار پر ڈٹا رہا۔ اس وقت تمام درہم اور دینار جو اسلامی ممالک میں استعمال ہوتے تھے وہ روم کے بنے ہوئے ہوتے تھے اس لیے عبد الملک کو اس معاملہ میں مشکل درپیش ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے درباریوں، ساتھیوں اور اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ لیکن وہ کسی ایسے نتیجہ پر نہ پہنچ پائے کہ جس سے یہ قضیہ حل ہو جائے اور مسلمانوں کا قومی وقار محفوظ رہے۔ جب عبد الملک کی پریشانی زیادہ بڑھی تو اس نے روح بن زنباع سے مشورہ کیا۔ اس نے عبد الملک سے کہا: آپ اس معاملے کا حل بتانے والے کو خوب جانتے ہیں لیکن جان بوجھ کر گریز کر رہے ہیں۔ اس نے کہا: وہ کون ہے؟ تب اس نے کہا: آپ کو لازم ہے کہ اہلبیت نبیؐ میں سے امام محمد باقرؑ سے رجوع کیجیے۔ اس پر عبد الملک نے کہا: تم سچ کہتے ہو، لیکن ان کے بارے میں میری رائے اچھی نہ تھی۔

اب عبد الملک نے مدینہ میں اپنے گورنر کو لکھا کہ امام محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ کو عزت کے ساتھ میرے پاس بھیج دو۔ نیز یہ کہ ان کو ایک لاکھ درہم سامان سفر کے لیے اور تین لاکھ درہم ذاتی اخراجات کے لیے دیدو۔ جب گورنر نے امام محمد باقرؑ کی خدمت میں خلیفہ عبد الملک کا خط پیش کیا تو آپ تیاری فرما کر شام روانہ ہو گئے۔ جب آپ پہنچے تو اس نے خوش دلی سے آپ کا استقبال کیا اور آپ کو اپنے اور بادشاہ روم کے درمیان ہونیوالے قضیے سے مطلع کیا۔ پھر آپ سے کہنے لگا کہ اس مشکل کا حل بتائیے۔

امام محمد باقرؑ نے فرمایا: اس بات کا تم پر کوئی بوجھ نہیں ہونا چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم فوراً اپنے درہم و دینار تیار کراؤ۔ ان کی ایک طرف "لا الہ الا اللہ" اور دوسری طرف "محمد رسول اللہ" نقش کروا دو۔ اس کے بیچ میں اس شہر کا نام جہاں وہ سکہ ڈھالا گیا اور وہ سال جس میں وہ ڈھالا گیا ہے کندہ کرا دو۔ اس کے بعد امامؑ نے تفصیلاً بیان کیا کہ اسلامی سکے کس طرح تیار کیے جائیں تاکہ وہ وزن میں گھٹ بڑھ نہ سکیں۔ پھر آپ نے عبد الملک

سے کہا: جب تم یہ کام کر لو تو اس پر عمل درآمد کے احکام جاری کر دو اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سخت سزائیں مقرر کر دو۔ اس طرح تم بادشاہ روم کی چال کی کاٹ کر کے ان کے سکوں سے بے نیاز ہو جاؤ گے۔

عبدالملک نے یہ تجویز بہت پسند کی اور اس نے امامؑ کے مشورہ پر فوراً عمل شروع کر دیا۔ چنانچہ چند ہی مہینوں میں یہ کام مکمل ہو گیا اور اس نے تمام اسلامی علاقوں میں اپنے درہم اور دینار کے استعمال کیے جانے کا حکم دیدیا۔ پھر ہر اس چیز کے استعمال کو بند کرنے کے احکام جاری کر دیے جس پر رومی طرز کے نقش اور تصویریں بنی ہوئی ہوں۔ اس کے بعد بادشاہ روم سے کہہ دیا گیا کہ تم بادشاہ عرب کو جس چیز کی دھمکی دیا کرتے تھے اب اس پر عمل کر دیکھو۔ اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ اس ارادہ سے تھا کہ اس کو غصہ دلاؤں۔ تاہم میں عبدالملک پر اسی وقت تک دباؤ ڈال سکتا تھا جب تک سکوں وغیرہ میں مسلمان ہمارے محتاج تھے لیکن اب میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ اہل اسلام نے ہمارے سکّے میں لین دین ہی بند کر دیا ہے۔ یہ ہے مختصراً وہ قصہ جو مؤلفین نے دمیری کی حیواۃ الحیوان، المحاسن والمساوی، بیہقی اور شذرات العقود مقریزی سے نقل کیا ہے۔

ایک دوسری روایت کا خلاصہ حسب ذیل ہے: جب رومی اور اسلامی حکومتوں کے مابین سرحدوں کے تعین کے بارے میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ تب بادشاہ روم نے عبدالملک بن مروان کو یہ دھمکی دی کہ وہ اسلامی علاقوں میں رومی سکّوں کی آمد و رفت بند کر دے گا، چونکہ اس زمانہ میں مسلمان انہی سکّوں میں لین دین کرتے تھے، اس لیے عبدالملک کو اندیشہ ہوا کہ شاہ روم کی اس کارروائی سے اسلامی اقتصادیات میں جمود پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے مملکت کے ممتاز افراد کو جمع کیا اور اس مشکل سے نکلنے کی خاطر ان سے مشورہ کیا لیکن یہ لوگ خود کسی واضح نتیجہ پر نہ پہنچ سکے اور خلیفہ کو رائے دی کہ وہ امام محمد باقرؑ سے رجوع کرے۔ پس اس نے آپ کو خط کے ذریعے اپنے پاس بلایا۔ امامؑ نے اس کی درخواست قبول فرمائی اور شام تشریف لے گئے۔ تب عبدالملک نے بادشاہ روم کے ساتھ ہونے والا ماجرا شروع سے آخر تک آپ سے بیان کیا۔ امامؑ نے اس سے کہا: جو صورت حال تمہارے پیش نظر ہے اس سے خوف مت کرو۔ بلکہ

بادشاہ روم سے کہو کہ وہ تم کو اس معاملے پر غور کرنے کے لیے مہلت دے۔ اس عرصہ میں تم اپنے تمام حکام کو حکم بھیج دو کہ وہ اپنے اپنے علاقے کا سونا اور چاندی حتیٰ کہ عورتوں کے کانوں کی بالیاں تک جمع کرکے بھیج دیں۔ جب سونے چاندی کی خاصی مقدار جمع ہوجائے تو فوراً اس سے درہم و دینار بنوالو۔ امامؑ نے ان کا وزن، شکل اور نمونہ بتا دیا۔ آپ نے حکم دیا کہ سکّوں کے ایک طرف "محمد رسول اللہ" اور دوسری طرف وہ چیز لکھواؤ جو تم کو پسند ہو۔ اس کے علاوہ ہر سکّے کی قیمت بھی معین کردو اور ان کے علاوہ کسی دوسرے سکے کے ساتھ لین دین کرنے کی ممانعت کردو۔ یہاں تک کہ بادشاہ روم کو تم پر کوئی فوقیت حاصل نہ رہے۔ عبدالملک کو اس سے بہتر کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ تب اس نے اس پر عملدرآمد کے فوری احکام جاری کردیے۔ چنانچہ چند ہی مہینوں میں رومی سکّوں کے بجائے اسلامی سکّے عوام کے ہاتھوں میں پہنچ گئے اور انھوں نے ان کے ذریعے لین دین شروع کردیا۔ اُدھر رومی حکومت سمجھ رہی تھی کہ اس قسم کا اقتصادی دباؤ جس کی دھمکی اس نے مسلمانوں کو دی تھی، اس کے ہاتھ میں ایک فیصلہ کن ہتھیار ہے لیکن مسلمانوں کو اپنے نئے سکوں کی بدولت رومیوں سے بے نیازی حاصل ہوگئی۔ بادشاہ روم کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ چنانچہ اب اس کو مسلمانوں پر دباؤ ڈالنے کے لیے جنگ کی دھمکی کے علاوہ کوئی اور صورت نظر نہ آئی۔ چنانچہ اس نے باغیوں کے ان گروہوں کو جو فتح اسلامی کے بعد رومی حکومت سے جا ملے تھے شامی علاقوں میں تخریبی کارروائیوں کے لیے بھیج دیا۔ چنانچہ انھوں نے ساحلی علاقوں میں قتل و غارت شروع کردی اور لبنان کے ساحل تک رسائی حاصل کرلی۔ اس پر عبدالملک نے ان کو وہاں سے نکال باہر کرنے کے لیے ایک لشکر بھیجا جس کے ہاتھوں ان میں سے کچھ لوگ مارے گئے۔ کچھ قیدی بن گئے اور باقی شکست خوردہ لشکری لبنان کے پہاڑوں اور جنگلوں میں جا چھپے۔ اس کے بعد بھی یہ لوگ وقتاً فوقتاً اپنی پوشیدہ پناہ گاہوں سے رومیوں کے نام پر تخریب کاری کے لیے نکلتے تھے لیکن جونہی اسلامی علاقہ کے محافظ ان کی سرکوبی کرتے وہ پھر سے انھی پہاڑوں اور جنگلوں میں واپس چلے جاتے تھے۔ ایک زمانہ تک وہ اسی روش پر قائم رہے، یہاں تک کہ وہ اسی علاقہ میں بس گئے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اب کوئی چارۂ کار نہیں ہے وہ اسلامی حکومت کے سامنے سرنگوں ہوگئے۔ یہ لوگ صلیبیوں کے عہد میں پھر اُبھرے جو

عرصۂ دراز تک لبنان پر حکمرانی کرتے رہے۔ جب وہ وہاں سے نکلے تو اپنی نسل کے لاکھوں افراد کو وہیں چھوڑ گئے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں لبنان کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی انہی پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ اب بھی اپنے ان اجداد پر فخر کرتے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت سے نکل کر ان علاقوں میں جا رہے جیسا کہ بعض روایات میں ان کا ذکر ہے۔

یہ ہے اسلامی سکّہ کے متعلق روایات کا اجمالی خاکہ۔ البتہ بعض روایات بتلاتی ہیں کہ سب سے پہلے ۴۰ھ میں امام علی بن ابی طالبؑ نے بصرہ میں اسلامی سکّے ڈھالنے کا حکم جاری فرمایا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ "راس البغل" (خچروں کے نگران اعلیٰ) نے خلیفہ عمر کے لیے فارسی سکّہ کے درھم ڈھالے تھے اور اسی مناسبت سے درہم کو بغلی کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا بھی ہوا ہو لیکن پھر بھی لین دین رومی سکّوں میں ہی ہوتا رہا۔ پھر جب امام محمد باقرؑ کے حکم سے عبدالملک بن مروان نے اپنا سکہ جاری کیا تو اس کے علاوہ دوسرے سکّوں میں لین دین بند کرا دیا۔ البتہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ روایات بتا رہی ہیں کہ اسلامی سکّہ کے اجرا کا تعلق ۷۶ھ سے ہے، جبکہ عبدالملک نے اس کام کو امام محمد باقرؑ کے مشورہ سے انجام دیا لیکن اس وقت امام محمد باقرؑ کی عمر صرف بترہ سال کی تھی اور آپ کے والد بزرگوار امام زین العابدینؑ بھی موجود تھے جو ۹۵ھ تک زندہ رہے ہیں۔ پھر یہ کہ امام محمد باقرؑ کو امامت آپ کے بعد ہی منتقل ہوئی ہے۔ جبکہ عبدالملک کی وفات کو پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ عبدالملک کو مشورہ دینے والے نے اس کو امام علیؑ بن حسینؑ ہی سے مدد طلب کرنے کے لیے کہا ہو کیونکہ آپ ہی اس وقت امامؑ تھے اور اسلامی حلقوں میں مشہور تھے لیکن اسی طرح یہ بھی ممکن ہے اور بعید از قیاس نہیں ہے کہ یہ امام محمد باقرؑ ہی رہے ہوں کیونکہ وہ بھی اسلامی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ نیز ائمۂ کرام علیہم السلام کی صلاحیتوں کا اندازہ ان کی عمر سے نہیں کیا جاتا جیسا کہ ان حضرات کی شاندار تاریخ اور ان کے حالات و کمالات کا مطالعہ کرنے والے پر ظاہر و آشکار ہے، وہی کمالات کہ جو اللہ نے اپنے نبیؐ کو عطا کیے تھے اور پھر ورثہ میں ان حضرات کو ملتے چلے آئے تھے۔

امام محمد باقرؑ کے اقوال ونصائح

آپ نے فرمایا:
جب کسی شخص کے قلب میں غرور پیدا ہوتا ہے تو اسی قدر اس کی عقل میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ بھی فرمایا: جس عالم کے علم سے فائدہ اٹھایا جاتا ہو وہ ہزار عابدوں سے افضل ہے۔ بخدا کہ شیطان کے نزدیک ایک عالم کی موت ستر عابدوں کی موت سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

آپ نے اپنے ایک فرزند سے فرمایا: بیٹے! کاہلی اور پریشانی سے بچے رہنا کیونکہ کاہلی ادائے حق میں مانع ہوتی ہے اور پریشانی حق پر قائم رہنے سے روکتی ہے۔

آپ نے جابر جعفی سے فرمایا: اے جابر! دنیا کیا ہے؟ یا تو یہ ایک سواری ہے جس پر تم محدود مدت کے لیے سوار ہو لیتے ہو یا یہ لباس ہے جسے تم پہن لیتے ہو یا یہ ایک عورت ہے جس سے تم محبت کر لیتے ہو۔ اے جابر! مومن وہی لوگ ہیں جو دنیا میں باقی رہنے سے خوش نہیں ہوتے اور نہ آخرت کے وارد ہونے سے اپنے آپ کو بے فکر رکھتے ہیں۔ پس وہی ہیں جو پاکبازوں کا سا ثواب حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ اہل تقویٰ سازوسامان کے لحاظ سے دنیا کے لوگوں میں نادار ہوتے ہیں لیکن وہ دوسروں کی مدد کرنے میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر تم ان کو بھول جاؤ گے تو بھی وہ تم کو یاد رکھیں گے۔ اگر تم ان کو یاد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کریں گے۔ وہ اللہ کے نازل کیے ہوئے حق کو عام کرتے ہیں اور اللہ کے احکام پر قائم رہتے ہیں۔

اے جابر! دنیا میں اس طرح قیام کرو جیسے تم ایک منزل پر اترتے ہو اور وہاں سے چل دیتے ہو یا کوئی اچھی چیز ہو کہ جسے تم نے خواب میں پسند کیا ہو، لیکن جاگنے پر وہ تمہارے پاس نہیں ہوتی۔ بے شک ارباب دانش اور اللہ کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک اس دنیا کی مثال سائے کی سی ہے۔ پس جو دین و حکمت اللہ نے تم کو عطا کی ہے اس پر قائم رہو۔

آپ فرمایا کرتے تھے: اللہ کو اس سے زیادہ محبوب کوئی شے نہیں کہ اس سے سوال کیا جائے اس لیے کہ دعا کے علاوہ کوئی بھی شے تقدیر کو نہیں بدل سکتی۔ جس بھلائی کا ثواب جلد مل جاتا ہے وہ دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور جس برائی کی سزا جلد مل جاتی

ہے، وہ ہے فرمان الٰہی کے خلاف سرکشی کرنا۔

کسی شخص میں یہی عیب کافی ہے کہ وہ دوسروں کی اس برائی کو دیکھے جس سے وہ اپنے بارے میں بے خبر ہو۔ نیز وہ لوگوں کو اس بات کا حکم دے جس سے وہ خود باز نہ رہ سکتا ہو اور اپنے ہم نشین کو ایسی تکلیف میں ڈالے جس کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔

آپ نے ایک صحابی کی ہدایت کے لیے فرمایا کہ میں تم کو پانچ باتوں کی نصیحت کرتا ہوں: اگر تم پر ظلم کیا جائے تو بھی تم کسی پر ظلم مت کرو۔ اگر تمہارے ساتھ دھوکہ کیا جائے پھر بھی تم کسی کو دھوکہ نہ دو۔ اگر تم کو جھٹلایا جائے تو تم اس پر غصہ نہ کرو۔ اگر تمہاری مدح کی جائے تو اس پر خوشی نہ کرو۔ اگر تم کو بُرا کہا جائے تو اس پر ہائے وائے نہ مچاؤ، بلکہ جو کچھ تمہارے بارے میں کہا جائے اس پر غور کیا کرو۔ جو کچھ تمہارے متعلق کہا گیا ہے اگر اس کو تم نے مان لیا ہے تو پھر حق بات پر غصہ کرنے سے تمہارا اللہ کی نظر میں گرنا اس خفت سے بھی بڑی مصیبت ہے جو تمکو لوگوں کی نظر میں گرنے سے ہوگی۔ اگر تم ایسے نہیں ہو جیسا کہ کہا گیا ہے تو تم کو ایسا ثواب حاصل ہو جائے گا جس کے لیے تم نے کوئی مشکل نہ اٹھائی تھی۔ اگر تمہارے علاقہ کے لوگ کہیں کہ یہ شخص برا یا اچھا ہے تو تمکو رنج یا خوشی نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنے آپکو کتاب خدا کے سامنے پیش کرو۔ اگر تم برائی سے بچنے، نیکی کی راہ پر چلنے اور خدا سے ڈرنے میں اسکے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو تو تم اسی راہ پر قائم رہو اور اپنے آپ کو مبارکباد دو کہ جو کچھ تمہارے متعلق کہا گیا ہے وہ تم کو نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن اگر تم قرآن سے ہٹے ہوئے ہو تو پھر تم کس بات پر اپنے اوپر فخر کر سکتے ہو کیونکہ مومن ہمیشہ اپنے نفس سے برسر پیکار رہتا ہے۔ پھر کبھی تو وہ اللہ کی محبت میں اپنی خواہش نفسانی کی مخالفت کرتا اور اس پر قابو پا لیتا ہے اور کبھی اس کا نفس اس کو ہرا دیتا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ اس صورت میں اللہ اس کو سہارا دیتا ہے اور اس کی خطا سے درگزر کرتا ہے جبکہ وہ خود بھی اپنی حیثیت کو یاد کر کے خوفِ خدا اور توبہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اے جابر! اللہ کی طرف سے ملے ہوئے کم رزق کو زیادہ خیال کرتے رہو تاکہ اس کا شکر ادا کرنے میں پُرخلوص رہو۔ اس کے ساتھ ہی اپنی طرف سے اللہ کی اطاعت کو کم سمجھتے رہو تاکہ تمہارے نفس کو اپنے عمل کی کمی کا احساس رہے اور وہ طلبِ معافی پر مائل رہے۔

پھر آپ نے فرمایا: اس پر بھروسہ نہ کرو جو خود امن میں نہیں ہے۔ جان لو کہ عیب و آفت سے سلامتی طلب کرنے کے مانند کوئی علم نہیں، خواہش نفسانی کی مخالفت کے مانند کوئی عقلمندی نہیں، دل کی تنگی کے مانند کوئی ناداری نہیں۔ ذہن کے اطمینان کے مانند کوئی سیری نہیں۔ اپنے نفس کی معرفت کے مانند کوئی معرفت نہیں، عافیت کی مانند کوئی نعمت نہیں۔ توفیق حاصل ہونے کے مانند کوئی عافیت نہیں۔ ہمت کی بلندی کے مانند کوئی بزرگی نہیں۔ خواہش کی کمی کے مانند کوئی زہد نہیں۔ برابری کو ملحوظ رکھنے کے مانند کوئی عدل نہیں۔ خواہشات کی موافقت کرنے کے مانند کوئی ظلم نہیں۔ ادائے فرض کے مانند کوئی فرمانبرداری نہیں۔ عقل نہ ہونے کے مانند کوئی مصیبت نہیں۔ گناہ کو حقیر سمجھنے اور اس پر مطمئن رہنے کے مانند کوئی نافرمانی نہیں۔ خواہشات کی مخالفت کے مانند کوئی جہاد نہیں۔ غصّہ کو دُور کرنے کے مانند کوئی بہادری نہیں اور لالچ کے مانند کوئی ذلت نہیں ہے۔ غلط روی کا موقع آنے پر تم کو اس سے بچے رہنا چاہیے کیونکہ یہ ایسا میدان ہے جو اپنے یہاں آنیوالے لوگوں کو نقصان کی طرف لے جاتا ہے۔

آپ نے ایک صحابی سے فرمایا: اچھی بات ہر کہنے والے سے حاصل کر لو خواہ اس نے اس پر عمل نہ کیا ہو کیونکہ اللہ کہتا ہے: وہ لوگ جو بات کو سنتے ہیں اور پھر اچھی بات پر عمل کرتے ہیں وہ وہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی ہے۔ (سورۂ زمر۔ آیت ۱۸)

آپ کے اصحاب کی ایک جماعت نے آپ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی اپنے کسی ساتھی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جو چاہے نکال لیتا ہے، جس کا اس کو اندازہ ہی نہ ہو؟ لوگوں نے کہا: نہیں اے فرزند رسولؐ۔ اس پر آپ نے فرمایا: تو پھر جاؤ کہ تم ہمارے ویسے بھائی نہیں ہو، جیسا کہ تم خیال کرتے ہو۔

آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا: اس چیز سے دور رہو جس کا تم سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اپنے دشمن سے دور رہو، اپنے دوست سے ڈرتے رہو۔ بدکار کی صحبت مت اختیار کرو اور نہ اسے اپنا ہمراز بناؤ۔ اپنے معاملات میں ایسے لوگوں سے مشورہ کیا کرو جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اگر تم سے ہو سکے تو کسی ایسے شخص کے ساتھ تعلقات نہ رکھو جس پر تم کو فضیلت حاصل نہ ہو۔

آپ نے فرمایا: تین عادتیں باعثِ شرف ہیں: جو تم پر ظلم کرے اس کو معاف کر دو۔ جو تم سے قرابتداری کا لحاظ نہ کرے تم اس کا لحاظ کرو۔ جو تم سے جاہلانہ سلوک کرے تم اس کے ساتھ بردباری سے کام لو۔

آپ نے فرمایا: ظلم تین ہوتے ہیں۔ وہ ظلم جس کو اللہ معاف نہیں کرتا، وہ ہے اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔ وہ ظلم جس کو اللہ معاف کر دیتا ہے، یہ وہ ظلم ہے جو انسان اپنے آپ پر کرتا ہے اور یہ معاملہ اللہ کے اور اس کے مابین ہے۔ وہ ظلم جس سے اللہ درگزر نہیں کرتا، وہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم ہے۔

آپ نے اپنے اصحاب کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا: جو شخص اپنے مسلم بھائی کی مدد کرنے اور اس کی حاجت پوری کرنے کی کوشش سے کنارہ کش رہے گا، پھر خواہ وہ حاجت پوری ہو جائے یا نہ ہو۔ وہ شخص خود ایسی حاجت کے لیے دوڑ دھوپ میں مبتلا ہو جائے گا، جو اس کو گناہ میں ڈال دے گی اور اس کو اس کا کوئی اجر نہ ملے گا۔ نیز فرمایا: جو شخص ایسے معاملہ میں خرچ کرنے سے گریز کرے گا کہ جس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ پھر اس کو ایسے معاملہ میں کئی گنا خرچ کرنا پڑ جائے گا، جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔

آپ نے فرمایا: وہ شخص عالم نہیں ہے جو اپنے سے اونچے مرتبے والے سے حسد کرے اور اپنے سے کم مرتبے والے کو حقیر سمجھے۔ آپ نے فرمایا یہ تین عادتیں رکھنے والا اس وقت تک نہیں مرتا جب تک ان کا نتیجہ بد دیکھ نہ لے۔ خدا کی نافرمانی، قرابتداری سے بے پرواہی اور جھوٹی قسم کھانا، کیونکہ ان باتوں میں وہ اللہ سے مقابلہ آزما ہوتا ہے۔

شیعہ ہونے کا دعویٰ کرنے والوں سے مخاطب ہو کر آپ نے فرمایا: بخدا ہمارے شیعہ صرف وہ ہیں جو اللہ سے ڈرتے رہیں اور اس کی اطاعت کریں۔ وہ لوگ اپنی انکساری، نرم مزاجی، امانتداری، ذکرِ الٰہی کرنے، والدین سے نیک سلوک، نادار پڑوسیوں، یتیموں اور مقروضوں کی امداد، راست گوئی، تلاوت قرآن اور لوگوں سے صرف بھلائی کی بات کرنے سے پہچانے جاتے ہیں۔

شیعوں کی صفات کے بیان میں آپ نے مزید فرمایا: شیعہ علیؑ وہ ہیں جو ہماری ولایت کشادہ دلی سے قبول کرتے ہیں۔ ہم سے محبت کی وجہ سے ایک دوسرے

سے بھی محبت کرتے ہیں۔ دین کو زندہ رکھنے کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں غصہ میں ہوں تو ظلم نہیں کرتے، خوش ہوں تو اس میں حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ پڑوسیوں کے لیے باعث برکت اور اپنے تعلقداروں کے لیے سلامتی کا ذریعہ ہیں۔

آپ فرمایا کرتے: یہ زبان اچھائی اور برائی کی کنجی ہے۔ پس مومن کو چاہیے کہ اپنی زبان پر اسی طرح تالا لگائے رہے جس طرح وہ اپنے سونے چاندی والے صندوق کو تالا لگاتا ہے کیونکہ رسول اللہؐ کا فرمان ہے کہ اللہ رحم کرے اس مومن پر جو اپنی زبان کو ہر برائی سے بچائے رکھتا ہے۔ یہ اس کا اپنی ذات کے لیے صدقہ ہے۔ پس کوئی شخص گناہوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک وہ غیبت یعنی اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں وہ باتیں بیان کرنے سے نہ بچے، جن کو اللہ چھپائے ہوئے کیونکہ اگر وہ ایسی بات کہے گا جو اس میں ہے ہی نہیں تو یہ بہتان تراشی ہے۔ وہ شخص قیامت کے روز سب سے زیادہ افسوس کرتا ہوگا جو عدل کا ذکر تو کرے لیکن خود کسی کے ساتھ عدل نہ کرے۔ تمہارا فرض ہے کہ سچ بولو، اللہ سے ڈرتے رہو، محنت سے کام کرو، ہر شخص کی امانت ادا کرو، چاہے وہ نیک ہو یا بد، کیونکہ اگر علی بن ابی طالبؑ کا قاتل بھی میرے پاس کوئی امانت رکھواتا تو میں ضرور اس کو واپس کر دیتا۔

آپ نے اپنے فرزند ارجمند امام جعفر صادقؑ کو وصیت فرمائی: اللہ نے تین چیزوں کو تین چیزوں سے ڈھانپ دیا ہے: اپنی خوشنودی کو اپنی اطاعت سے ڈھانپ دیا ہے۔ پس اس کے کسی حکم کو حقیر نہ سمجھنا۔ ممکن ہے اس کی خوشنودی اسی میں ہو۔ اس نے اپنی ناراضی کو اپنی نافرمانی سے ڈھانپ دیا ہے۔ پس اس کے کسی حکم کو حقیر نہ سمجھنا، ہو سکتا ہے کہ اس کی ناراضی اسی میں ہو۔ نیز اس نے اپنے پیارے بندوں کو عام لوگوں میں چھپا دیا ہے۔ پس لوگوں میں سے کسی کو حقیر نہ سمجھنا، کیونکہ ممکن ہے کہ وہی اللہ کا پیارا بندہ ہو۔

آپ کی امامت کے متعلق رسول خداؐ کی صراحت کے علاوہ امام علیؑ بن حسینؑ نے تاکید فرمائی تھی، جیسا کہ کافی اور دیگر کتب حدیث میں روایات اہلبیتؑ کے عادل اور معتبر راویوں نے بیان کیا ہے۔ اسی طرح خود آپ نے بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں

میں اپنے جانشین امام جعفر صادقؑ کے بارے میں اعلان فرما دیا۔ پھر آپ اپنے رب کے جوار رحمت میں چلے گئے۔ وہ ۱۱۴ھ کا زمانہ تھا اور اس وقت آپ کی عمر ستاون سال تھی۔ ان دنوں ہشام بن عبدالملک اور بقولے یزید بن عبدالملک کی حکومت تھی۔ آپکے وصال کے بارے میں اس کے علاوہ اور بھی مختلف اقوال بیان کیے گئے ہیں۔

بیٹے بیٹیاں سب ملا کر آپ کے سات بچے تھے۔ ان میں سب سے بڑے جعفر بن محمد صادقؑ تھے اور آپ کی کنیت انہی کے نام پر تھی۔ آپ کے سب بچوں کی ماں فاطمہ یا قریبہ بنت قاسم بن محمد بن ابو بکر تھیں کہ جن کی کنیت ام فروہ تھی۔ ان ام فروہ کی ماں اسماء بنت عبدالرحمٰن بن ابی بکر تھیں۔ اسی بنا پر امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ "میں ابو بکر کی دوگونہ اولاد ہوں"

امام جعفر صادقؑ

امام جعفر صادقؑ ماہ ربیع الاوّل کے دوسرے پندھرواڑے کے ابتدائی ایام میں اور ایک دوسرے قول کے مطابق یکم رجب ۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ شیخ مفید اور کلینی کی روایت میں آیا ہے۔ نیز ایک اور قول کے مطابق آپ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۴۹ھ میں آپ اس دنیا سے اپنے رب کے جوارِ رحمت میں رحلت فرما گئے، جبکہ آپ کی عمر تاریخ ولادت کے اختلاف کے پیش نظر پینسٹھ اور اڑسٹھ سال کے درمیان تھی۔ اس میں سے بارہ یا پندرہ سال آپ نے اپنے جدّامجد علیؑ بن حسینؑ کے زیرِ سایہ ایک ایسے گھرانہ میں گزارے، جہاں مصائب اور پریشانیوں کے علاوہ کچھ اور نہ تھا کہ جن کی ابتدا کربلا کے غم انگیز المیہ سے ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی جوانی کی ابتدا میں اپنے چچا زید بن علیؑ پر گزرنے والے خونیں حادثہ کے غم واندوہ کے گھونٹ گلے سے اتارے۔ یہ واقعہ آپ پر اور آپ کے خاندان پر نہایت شاق گزرا تھا۔ پھر آپ اپنے آباءؑ کرامؑ کے ان شیعوں اور پیروکاروں کی آہ و زاری بھی سنتے رہے۔ جو ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنائے جا رہے تھے۔ آپ اپنے جدامجد کی شہادت کے بعد انیس سال تک اپنے والد بزرگوار کے زیرِ سایہ رہے۔ اس زمانہ میں آپ پختہ فکر اور کامل العلم ہو چکے تھے اور علماء و محدثین مختلف علوم نیز احادیث حاصل کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

چنانچہ آپ اس جامعہ کی بنا رکھنے میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ شریک رہے تھے جس کے آثار علم و فن نے دنیا کو معمور کر دیا۔ اپنے والد بزرگوار کے بعد آپ چونتیس سال زندہ رہے اور یہی آپ کا زمانۂ امامت ہے۔ اس مدت میں آپ نے ہشام بن عبد الملک، ولید بن یزید بن عبد الملک، یزید بن ولید بن عبد الملک ملقب بہ ناقص، ابراہیم بن ولید اور مروان بن محمد وغیرہ اموی خلیفاؤں کے علاوہ عبد اللہ بن محمد بن علیؑ بن عبد اللہ بن عباس المعروف سفّاح عباسی کی خلافت کا زمانہ بھی پایا۔ چنانچہ آپ کی وفات اس زمانے میں ہوئی تھی، جب منصور عباسی کی خلافت کے دس سال گزر چکے تھے۔

امام ابو عبد اللہ جعفر صادقؑ نے تقریباً اڑتالیس سال کا عرصہ امویوں کی حکمرانی میں گزارا۔ یہ دور ایسے واقعات سے بھرا ہوا تھا جو آپ کے دل میں غم و اندوہ پیدا کرتے اور آپ کی زندگی کو تلخ بناتے رہتے تھے۔ آپ دیکھتے تھے کہ امت کے نیک اور صالح افراد کو تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں اور ان کو فرداً فرداً یا گروہ در گروہ قید خانوں میں ڈالا اور موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ آپ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ آئے دن آپکے چچاؤں یعنی ابوطالب کی اولاد میں سے بوڑھوں اور جوانوں کو یکے بعد دیگرے خانہ ویراں کر کے موت کی نیند سلایا جا رہا تھا۔ تاہم آپ یہ ساری تلخیاں برداشت کر رہے تھے لیکن آپ انھیں ان سرکش حکام کی دست درازیوں سے بچا نہ سکتے تھے، جو دین اور اس کی مقدس قرار دی ہوئی چیزوں، امّت اور اس کی قدروں اور انسان اور اس کے وقار کی تحقیر کے درپے تھے۔ مزید یہ کہ ان لوگوں نے امت پر خراج کی شرح بڑھا دی اور ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا تھا۔ ادھر جزیہ کا بوجھ اہل کتاب کو مارے ڈال رہا تھا۔ جب ان سے بچنے کے لیے ان میں سے اکثر لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے تو انہوں نے ان پر جزیہ کے مشابہ ایک اور ٹیکس عائد کر دیا تھا۔

جیسا کہ جہشیاری نے بیان کیا ہے کہ یہ ستم کیش حاکم ان سے بھی جزیہ لیتے تھے جن پر وہ واجب ہی نہیں تھا۔ چنانچہ عبد العزیز بن مروان نے مصر میں پادریوں کو شمار کرایا اور پھر ان سے جزیہ لیا گیا۔ راوی کے خیال کے مطابق یہ پہلا جزیہ ہے جو اسلام میں پادریوں سے لیا گیا۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ امویوں نے بعض اضافی ٹیکس بھی

لگائے جیسے قنی ٹیکس، شادی ٹیکس اور عرضی نویسی ٹیکس۔ نیز وہ ساسانیوں کی طرح لوگوں سے نوروز کے تحفے بھی لیتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے معاویہ نے یہ تحفے وصول کیے جو نوروز کے موقع پر سیاہ فام لوگوں سے لیے جاتے تھے۔

تاریخ کامل، ابن اثیر میں ہے کہ عید مہرجان کے موقع پر ایک زمیندار، ہرات میں ہشام بن عبدالملک کے گورنر، اسد بن عبداللہ قسری کے لیے تحفے لیکر حاضر ہوا، جن کی قیمت دس لاکھ درہم تھی۔ تاریخ طبری میں ہے کہ سنہ ۱۲۰ھ میں ایک جاگیردار ہرات کے گورنر کے ہمراہ ہشام کے پاس ہدیے لیکر آیا جن میں نمونے کے دو قصر تھے، ان میں ایک سونے کا اور ایک چاندی کا تھا۔ نیز سونے چاندی کے آب دان تھے اور طشتریاں تھیں۔ اس کے علاوہ ریشمی اور زرتار کپڑے بھی تھے۔

عبدالملک بن مروان نے جزیرہ میں اپنے گورنر کو حکم دیا کہ وہاں کے لوگوں کی مردم شماری کر کے ان کو حکومت کا ملازم قرار دیدے۔ پھر ہر شخص کی سالانہ آمدنی کا تخمینہ لگا کر، اس میں سے اس کے کھانے پینے کے اخراجات نکال دے اور جو باقی بچے وہ سب وصول کرلے۔ چنانچہ اس گورنر نے مردم شماری کر کے سب لوگوں کو معین تنخواہوں پر ملازم تصور کر لیا۔ پھر ان کی سال بھر کی کمائی میں سے ان کے اخراجات منہا کر دیے۔ تب اس نے دیکھا کہ ہر شخص کے پاس چار دینار بچ رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے ان پر اس رقم کا ادا کرنا لازم قرار دیدیا۔[۱]

جہشیاری سے روایت ہے کہ اسامہ بن زید، جو سلیمان بن عبدالملک کی طرف سے مصر کے گورنر تھے۔ وہ وہاں سے جمع کیا ہوا خراج لے کر اس کے پاس آئے اور بولے کہ: اے امیرالمومنین! میں یہاں اسی وقت آیا ہوں جبکہ میں نے مصری رعایا پر بہت سختی کرلی اور ان کو خوب لوٹ لیا ہے۔ اگر آپ مناسب خیال کریں تو اب ہم ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں اور خراج میں کمی کردیں۔ اس سے علاقوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا اور معاش میں بہتری پیدا ہوگی۔ آپ اس تجویز کی منظوری دے دیجیے تاکہ آنے والے سال

---

[۱] امام صادقؑ و مذاہب اربعہ جلد ۲ صفحہ ۴۰

ہیں ان کی کمی پوری ہو جائے۔ سلیمان نے ان سے کہا: تمہاری ماں تمہارا غم دیکھے۔ تم دودھ دو ہتنے رہو۔ جب وہ ختم ہو جائے تو ان کا خون نچوڑ لانا۔

بعض اوقات خلیفہ ایسا سارا مال جو ان کے گورنروں کے پاس ہوتا انہی کو دیدیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کی مالیت لاکھوں درہم تک پہنچ جاتی تھی۔ جیسا کہ خراسان کے گورنر کے پاس اس مال کی مقدار دس لاکھ درہم تھی اور خلیفہ نے وہ سب اسی کو دے دیا۔ مزید برآں اس کے پاس اتنی دولت منقولہ اشیا کی شکل میں موجود تھی۔ چنانچہ ایک روز اس نے اپنے سیکرٹری سے کہا: مجھ کو حیرت ہے کہ مجھ کو نیند کیسے آجاتی ہے جبکہ میرے پاس اس قدر دولت جمع ہوگئی ہے۔ اس نے پوچھا کتنی دولت جمع ہوگئی ہے؟ گورنر نے کہا: میرے پاس اتنی دولت آگئی ہے کہ سو سال تک ایک ہزار درہم روزانہ کے حساب سے خرچ کر سکتا ہوں۔ حالانکہ مجھے غلام، سواریاں یا کسی قسم کا دیگر سامان خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر سیکرٹری نے اس سے کہا: اے امیر! اللہ آپ کی آنکھوں کو نیند بخشے۔ اس مال کے ہوتے ہوئے نیند آنے پر تعجب نہ کریں، بلکہ اس وقت تعجب کرنا جب یہ مال تلف ہو جائے اور آپ نیند بھر کے سوئیں۔

کچھ عرصے کے بعد اس کا یہ مال کُل کا کُل جاتا رہا اور اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ اس نے اپنا قرآن رکھنے کی چاندی کی صندوقچی بیچ ڈالی، تاکہ اس کی قیمت سے کھانے کا خرچ چلائے۔ پھر وہ ایک چھوٹے سے گدھے پر سواری کیا کرتا اور اس پر ناداری کے تمام آثار نمایاں تھے۔ ایک بار جب اس سے مالک بن دینار کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا: اس مال نے تم کو کیا فائدہ پہنچایا جس کے بارے میں تم نے وہ سب کہا تھا[۱] وہ کہنے لگا: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ. (یعنی اللہ کے سوا ہر شے معدوم ہونیوالی ہے) (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۸۸)

حالات اسی طرح چلتے رہے اور عوام حکمرانوں کے ظلم کے ہاتھوں پریشان ہو گئے۔ وہ اپنی جان و مال کی خاطر ان سے ڈرنے لگے۔ تاہم جب عمر بن عبدالعزیز کا دور آیا تو

۱۔ امام صادقؑ و مذاہب اربعہ جلد ۲

جس طرح انھوں نے دیگر مظالم کا ازالہ کیا تھا۔ اسی طرح ٹیکس اور جزیہ کی وصولی میں رعایت برتنے کا حکم دیا۔ چنانچہ انھوں نے کوفہ کے گورنر کو لکھا: اما بعد اہل کوفہ پر احکام الٰہی کے معاملہ میں بہت سختیاں کی گئی ہیں اور بُرے حاکموں نے ان میں بُری رسوم رائج کر دی ہیں۔ حالانکہ دین کی مضبوطی عدل و انصاف اور محبت و شفقت سے ہوتی ہے۔ چونکہ تمہارے لیے کوئی شے اپنے نفس سے زیادہ عزیز نہیں ہے، اس لیے تم اس پر جرم و گناہ کا بوجھ نہ لادو۔ کسی شخص کا گھر نہ ڈھاؤ بلکہ اس سے اتنا ہی وصول کرو جس کی وہ طاقت رکھتا ہو۔ پھر اس کو موقع دو تاکہ وہ خوشحال ہو جائے۔ سکہ سازی کا ٹیکس نیز نوروز اور عید مہرجان کے تحفے نہ لو۔ اس کے علاوہ قرآن کی قیمت، آمدنی کا ٹیکس، چولہا ٹیکس اور نکاح کی فیس لینا بھی بند کر دو۔ کوفہ کے مقامی آدمیوں میں سے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں، ان سے خراج نہ لو۔ ان تمام معاملات میں تم میرے احکام کی تعمیل کرو۔ کیونکہ میں نے تم کو وہی ذمہ داری دی ہے جو اللہ نے مجھ کو دی ہے۔ پس تم مجھ سے رجوع کیے بغیر کسی امر میں جلدی نہ کرنا۔

اسی طرح انھوں نے دیگر گورنروں کو بھی لکھا۔ اس کے نتیجے میں لوگوں نے انکی خلافت کے مختصر سے دور میں اطمینان کا سانس لیا اور زندگی میں مٹھاس کا ذائقہ پایا۔ البتہ بنی امیہ اور ان کے حامیوں کے لیے یہ زمانہ بڑا تلخ اور سخت ثابت ہوا۔ کیونکہ یہ لوگ امت اور اس کی اقدار اور وقار کو بالکل بے وقعت سمجھتے تھے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد حکومت کے معاملات پھر سے اپنی پچھلی ظالمانہ ڈگر پر واپس آگئے اور ان کا عہد ایک سہانے خواب کی مانند آیا اور گزر گیا۔ کیونکہ یزید بن عبدالملک نے از سر نو اپنے آباؤ اجداد کا وہی بدترین طریقۂ عمل اپنا لیا تھا۔

چنانچہ اس نے اپنے گورنروں اور اضلاع کے حکام کو جو ہدایات جاری کیں ان میں کہا کہ: اما بعد عمر بن عبدالعزیز غلط فہمی میں تھے۔ پس جو کچھ تم لوگ ان کے زمانہ میں کرتے تھے اسے چھوڑ کر لوگوں کو اسی پہلی حالت کی طرف پلٹا لاؤ۔ ہاں تو پیداوار خواہ کم ہو یا زیادہ، لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں اور وہ جئیں یا مریں تم ان سے خراج، ٹیکس اور تحفے پوری سختی کے ساتھ وصول کرو۔

ان احکام کے نتیجے میں لوگوں کی مشکلیں بڑھ گئیں۔ مصیبتوں میں شدت پیدا ہوگئی۔ قوم کے تمام طبقوں میں بے چینی پھیل گئی، لاقانونیت عام ہوگئی، بیشتر مسلمان ہر شورش پسند کا ساتھ دینے لگے اور اکثر علاقوں میں بغاوتیں سر اٹھانے لگیں۔ چنانچہ پہلے اردن میں شورش ہوئی۔ اس کے بعد مصر کے لوگوں نے اپنے گورنر حفص بن ولید حضرمی کو قتل کر دیا۔ پھر حمص کے لوگوں نے بھی اپنے گورنر عبداللہ بن شجرہ کندی کو قتل کر دیا۔ ادھر اہل مدینہ نے وہاں کے گورنر کو نکال باہر کیا۔ دوسری طرف خود امویوں میں اختلاف پیدا ہوگیا اور آپس میں لڑنے لگے۔ چنانچہ بدایہ و نہایہ، ابن کثیر میں ہے کہ شام میں ان کی جنگ ہوئی جس میں اٹھارہ ہزار آدمی مارے گئے اور فلسطین میں بھی بکثرت لوگ مقتول ہوئے۔ ابومسلم خراسانی نے خراسان کے اطراف میں اٹھنے والی شورش کی قیادت کی۔ اس سے پہلے اس نے غربی ایران میں مسلمانوں سے خطاب کیا اور بنی امیہ کی طرف سے عوام پر ظلم ڈھانے، رسول اللہؐ کی ذریت اور ان کے شیعوں کو قتل کرنے، نیز دین اور اس کی نشانیوں کی تحقیر کرنے کی تصویر کشی کی۔ اس کے بعد ان کے اور بنی امیہ کے حامیوں کے درمیان خونی معرکے ہونے لگے۔ ٹھیک اسی وقت عرب میں بنی عباس اٹھے اور انھوں نے وہاں شورش کی قیادت سنبھال لی۔ وہ اہلبیتؑ پر بنی امیہ کے مظالم کا سہارا لیکر ان تمام علاقوں میں ادھر سے ادھر تک پھیل گئے۔ جہاں کے لوگ بنی امیہ کے ستمکارانہ طرز عمل، ان کی طرف سے اہلبیتؑ کے ساتھ تشدد، قابل احترام مذہبی مقامات کی بے حرمتی اور تمام لوگوں کی تحقیر کرنے کی وجہ سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ البتہ بنی عباس نے اپنی تحریک کے ابتدائی زمانہ میں علویوں کے لیے اپنے اس بغض و کینہ کو ظاہر نہیں کیا، جیسے انہوں نے بعد میں بدترین شکل میں ظاہر کیا تھا۔ بلکہ اولاد علیؑ کے مقتولین پر آنسو بہاتے اور یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ انہی کے لیے لوگوں کو اپنی طرف بلا رہے ہیں۔

تاہم جب اموی حکومت متزلزل ہوگئی اور عباسیوں کو اپنی کامیابیوں کا یقین ہوگیا تو انھوں نے ۱۳۲ھ میں کوفہ میں عبداللہ بن محمد بن علی یعنی سفاح عباسی کو نئی حکومت کا سربراہ منتخب کر لیا۔ اس وقت مروان بن محمد موصل کے ایک مقام زاب میں تھا۔ چنانچہ سفاح نے اپنے ابتدائی دارالحکومت کوفہ سے مروان بن محمد کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر

اپنے چچا عبداللہ بن علی بن عبداللہ بن عباس کی قیادت میں روانہ کیا۔ ان دونوں میں خونریز تصادم ہوا جس میں مروان بن محمد بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد بھی طرفین میں متعدد معرکے ہوتے رہے۔ چنانچہ مصر میں ہونے والے ایک معرکے میں مروان بن محمد کوفہ شہر کے ایک آدمی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ پھر سفاح اور اس کے فوجی سردار امویوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تاکہ ان کے مددگاروں اور حامیوں کو قتل کریں جو مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان میں سے کسی کو بھی اپنی جان بچانے کے سوا کوئی اور فکر لاحق نہیں تھی۔ حتیٰ کہ کچھ خوفزدہ مرد اور عورتیں پناہ کی تلاش میں مشرکوں کے علاقوں میں جا پہنچے لیکن وہاں کے حکام نے ان کو اپنے یہاں سے نکال دیا۔ اس پریشان حال گروہ کی قیادت مقتول خلیفہ مروان بن محمد کے دو بیٹے عبداللہ اور عبیداللہ کر رہے تھے۔ ایک موقع پر ان کے سامنے ایسے دو راستے آ گئے، جن کے درمیان میں پہاڑ واقع تھا۔ تب ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک راستہ اختیار کر لیا کیونکہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ایک یا چند گھنٹوں میں دونوں ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ وہ دن بھر اپنے اپنے راستے پر چلتے رہے لیکن نہ تو وہ آپس میں مل سکے اور نہ واپس ہو پائے۔ اسی طرح کئی دن تک چلتے رہے جبکہ ایک کو دوسرے کی کوئی خبر نہ تھی۔ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کی مڈبھیڑ حبشیوں کے ایک رسالے سے ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ بن مروان کو مار ڈالا اور اس کے ساتھیوں کو قید کر لیا۔ پھر انھوں نے ان کی تمام چیزیں حتیٰ کہ ان کے تن کے کپڑے تک چھین لیے اور ان کو جنگلوں میں دھکے کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ ان اللہ کے ماروں کو بھوک اور پیاس نے اتنا ستایا کہ ہر آدمی کو اپنا پیشاب پینا پڑا۔ اسی حال میں اتفاقاً یہ لوگ اپنے بچھڑے ہوئے سردار عبیداللہ ابن مروان کے گروہ سے جا ملے۔ جبکہ ان پر بھی ویسے ہی مصائب گزرے تھے، جیسے ان سب پر گزرے۔ پھر اس کے ساتھ اپنے کنبے کی متعدد عورتیں بھی تھیں، جن کے پاؤں چلتے چلتے زخمی ہو گئے تھے اور پیشاب پیتے پیتے ان سب کے ہونٹوں میں شگاف پڑ گئے تھے۔ یہ لوگ اس مقام پر مہینہ بھر ٹھہرے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو اتنا کھانا، کپڑا اور دیگر ساز و سامان دیدیا کہ جس سے ان کی ضروریات پوری ہو گئیں۔ پھر وہ لوگ قلیوں کا بھیس بنا کر اس مقام سے

چلے گئے۔ جیسا کہ تاریخ یعقوبی اور عقد الفرید میں بیان کیا گیا ہے۔

شذرات الذہب، ابن عباد حنبلی میں ہے کہ جب بنی امیہ کا آخری تاجدار مروان جعدی قتل ہو گیا تو صالح بن علی سفاح کے لشکر کا ایک سردار عامر بن صالح خراسانی، مروان کے محل میں اس کے تخت پر جا بیٹھا اور اس کے گھر کی عورتوں کو بلا کر اس کا سر اس کی بیٹی کی گود میں رکھ دیا اور اس لڑکی کو جھڑکنے لگا۔ تب وہ کہنے لگی: اے عامر! زمانہ مروان کے خلاف ہو گیا اور اس نے تجھ کو اس کے تخت پر بٹھا دیا۔ یہاں تک کہ تو نے اس کا کھانا بھی کھا لیا ہے۔ پس اگر تو عقل سے کام لے اور سوچے تو یہ بات تجھے عبرت دلانے، خواب غفلت سے جگانے اور تجھے خبردار کرنے کے لیے کافی ہے۔

سلیمان بن علی نے بصرہ میں بنی امیہ کے ایک گروہ کو قتل کر ڈالا اور ان کو جنگل میں ڈلوا دیا، جہاں ان کو کتے اور جنگلی جانور چیر پھاڑ کر کھا گئے۔ تاہم بہت سے اموی لوگ روپوش ہو گئے اور وہ اس وقت تک باہر نہیں آئے جب تک کہ بنی عباس کی حکومت صحیح طور سے قائم نہ ہو گئی۔ اس طرح تاریخ نے ان کے ساتھ وہی کہانی دہرائی جو وہ ہر ظالم و سرکش کے ساتھ دہراتی ہے۔ چنانچہ ان کے زوال کے ملبے پر دوسری حکومت کا قیام عمل میں آیا جیسا کہ انسان کی اس دنیا میں آمد کے وقت سے تاریخ کا طریقۂ کار رہا ہے۔ وہ کچھ فرمانرواؤں کو ہلاک کر دیتی ہے اور ان کی جگہ دوسروں کو لے آتی ہے۔ "بے شک اللہ کے طریقۂ کار میں تم ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔" (سورۂ احزاب۔ آیت ۶۲)۔

امویوں کی سیرت کے اس پہلو کو یوں روا روی میں پیش کر کے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ ان تمام واقعات کے دوران موجود تھے لیکن آپ ان واقعات، سیاسی افراد اور حکام سے علیحدہ رہے۔ اس طرح آپ کو فرصت کے جو لمحات حاصل ہوئے آپ نے ان کو پیغام اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داری ادا کرنے میں صرف فرمایا چنانچہ جب آپ نے اموی حکومت کو اپنے ہی جھگڑوں میں الجھا ہوا پایا اور یہ حالات کہ جن کی ابتدا آپ کے والد بزرگوار ہی کے عہد میں ہو گئی تھی، انہی حالات کو آپ نے پیغام اسلام کو اپنی پوری قوت سے آگے بڑھانے کے لیے مناسب پایا، چنانچہ علماء، طلباء اور اسلام میں شک کرتے والے لوگ ہر طرف سے آپ کی خدمت میں آیا کرتے تھے یہاں تک کہ یہ

جامعہ جس کو آپ کے والد بزرگوار نے قائم کیا تھا اور خود امام جعفر صادقؑ نے بھی اس پر خوب محنت کی تھی، وہ آپ کے زمانہ میں متعدد اسلامی علوم میں ترقی کے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔

مختصر یہ کہ امام جعفر صادقؑ کی زندگی کے پچاس سال امویوں کے عہد خلافت میں اور کوئی پندرہ سال عباسیوں کے عہد میں بسر ہوئے۔ چنانچہ آپ نے امویوں کی بھرپور طاقت اور دبدبے کا زمانہ بھی دیکھا اور ان کے زوال اور شکست کا دور بھی آپ کی نظروں میں گزرا۔ اسی طرح آپ نے عباسیوں کا وہ ابتدائی دور بھی دیکھا کہ جب وہ امویوں کی تباہی کے کھنڈروں پر اپنی سطوت قائم کر رہے تھے۔ نیز وہ ان کی بدکاریوں سے کچھ نصیحتیں بھی حاصل کر رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی ان کی حکومت استوار ہو گئی ان کا یہ حال ہو گیا کہ لوگ کسی کہنے والے کا یہ قول دہرانے پر مجبور ہو گئے۔

اے کاش کہ بنی مروان ہی کا دَور ہمارے لیے باقی رہتا اور بنی عباس کا یہ عدل جہنم میں چلا جاتا۔

آپ نے اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد اپنے اوپر یہ ذمہ داری لے لی کہ آپ اسی طریقۂ عمل پر چلتے رہیں گے جو آپ کے والد بزرگوار نے اختیار کیا تھا۔ چنانچہ آپ فساد ظلم اور بے راہ روی کے خلاف جد و جہد کرتے رہے۔ اس ضمن میں آپ نے اپنے ان اصحاب کے لیے جو اصلاح و دعوت کا کام کرتے تھے یہ ضروری قرار دیا کہ پہلے خود اپنے قول و فعل میں مطابقت پیدا کریں اور نیکی کا نمونہ بن جائیں کیونکہ عوام الناس اپنے رہبروں کو ان کے اعمال کے واسطہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اقوال جو نیکی کی طرف بلانے اور بدی سے روکنے والے واعظین کی زبانوں پر جاری رہتے ہیں وہ ان کے اعمال سے زیادہ پر تاثیر نہیں ہوتے اس لیے کہ وہ تو کتابوں میں بھی لکھے ہوتے ہیں اور دیواروں پر بھی نقش ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے: میں تم کو ہدایت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اگر تمہارے پاس کوئی امانت رکھے تو اس کو واپس دیدیا کرو۔ کسی کے پاس بیٹھو تو وہاں اچھے طرز عمل کا اظہار کرو تاکہ تم اپنے بلند کردار کے ذریعے لوگوں میں ہمارے خاموش مبلغ بن جاؤ۔

آپ کا یہ ارشاد ان اصحاب کو عجیب سا معلوم ہوا کیونکہ نیکی کی طرف بلانے میں وہ خاموش

کیسے رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آپ سے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! اگر ہم خاموش رہیں تو لوگوں کو اللہ کی طرف کیسے بلائیں گے؟ آپ نے فرمایا: ہم نے اطاعت الٰہی کے بارے میں جو احکام تم کو دیے ہیں ان پر عمل کرو۔ لوگوں کے ساتھ راست گوئی اور عدل سے معاملہ کرو۔ امانت وقت پر واپس دیا کرو۔ نیکی کی نصیحت کرو۔ بدی سے روکو اور عوام الناس کے سامنے صرف بھلائی کی صورت میں آؤ۔ جب وہ تمہارا طرزِ عمل دیکھیں گے تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں شرف وفضیلت والے ہم ہی ہیں۔ پھر وہ خود سے ہماری تعلیم کی طرف رجوع کریں گے۔

آپ اپنی اس ہدایت کو اکثر دہراتے اور اپنے اصحاب کے سامنے اس پر زور دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: تم پر لازم ہے کہ اللہ سے ڈرو۔ پرہیز گاری اختیار کرو، بات سچی کہو، امانت ادا کرو، اچھی عادتیں اپناؤ، اچھے پڑوسی بنو اور محض اپنے کردار کی خوبی سے، زبان ہلائے بغیر لوگوں کو اپنی طرف بلاتے رہو۔

ابن ابی یعفور کا بیان ہے کہ: میں نے امام جعفر بن محمد الصادقؑ کو اپنے اصحاب سے یہ فرماتے سنا کہ: لوگوں کو زبان کی بجائے اپنے حسنِ عمل سے اپنی طرف بلایا کرو تاکہ وہ تم میں عبادت گزاری، راست گفتاری اور پرہیز گاری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

بہرحال امام جعفر صادقؑ یہ چاہتے تھے کہ ان کے داعی اور مبلغ اپنے قول کو عمل سے ملائے رکھیں اور ان کے اقوال ان کے اعمال ہی کی ایک شکل ہوں۔ کیونکہ یہ ان مظالم کا مقابلہ کرنے کا سب سے زیادہ نتیجہ خیز اور مؤثر ذریعہ تھا۔ جن سے مظلوم اور تکلیفوں میں گھرے ہوئے عوام ان سرکش حاکموں کے ہاتھوں دوچار تھے جو اسلام اور دین کے نام پر امت پر مسلّط تھے اور ہر اس شے کی تخریب اور بربادی کے محرک بنے ہوئے تھے جس کا اسلام سے قریب یا دُور کا کوئی بھی تعلق ہو۔

امام جعفر صادقؑ نے اموی حکومت کے ظلم و جبر کے سخت ترین اور بدترین واقعات ملاحظہ فرمائے۔ آپ آئے دن اپنے آباء کرامؑ کے شیعوں اور نیکوکار مسلمانوں کے قتل، قید اور جلاوطنی، چچا زاد بھائیوں اور گھرانے والوں کو قتل کرنے اور پھانسی دیے جانے کی خبریں سنتے رہتے تھے۔ ان لوگوں پر یہ ظلم صرف اس لیے ہوتا تھا کہ وہ حق کی طرف دعوت دیتے، نیکی

کی ہدایت کرتے اور بدی سے روکتے تھے۔

مزید یہ کہ پوری امت ان حکام کے ظلم وستم اور جبر و تعدی کا شکار تھی، جس سے اس کی خوبیاں زائل ہوگئی تھیں اور زندگی کا چین جاتا رہا تھا۔ چنانچہ اس نظام میں نہ فیصلوں میں عدل تھا، نہ حقوق میں مساوات تھی، نہ کسی کی شخصی آزادی اور عزت محفوظ تھی۔ بلکہ پورا سماج فساد اور لاقانونیت کا شکار تھا اور امت کی اقدار، خصائص اور وقار کو تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

امامؑ کی زندگی کا ایک حصہ اسی طرح گزرا۔ آپ مسلمانوں کے حاکموں کی اس روش اور ان کی طرف سے امت محمدی پر کی جانے والی زیادتیوں اور سختیوں کی وجہ سے رنجیدہ اور بے چین تھے۔ نیز یہ سب کچھ جو لوگوں کو اس وقت درپیش تھا، آپ ان کو اس سے نجات دلانے پر قادر نہیں تھے۔ پس آپ نے ظلم، سرکشی اور انحراف کے خلاف جدوجہد کرنے کا فیصلہ فرمایا اور اس کی قیادت خود سنبھال لی لیکن آپ کی یہ مہم ان خونیں تحریکوں کی مانند نہ تھی جو وقتاً فوقتاً جا بجا اٹھتی رہتی تھیں بلکہ یہ اسلامی شعائر کو زندہ کرنے اور مسلمانوں کو ان بلند اسلامی اخلاق کے اختیار کرنے کی دعوت تھی جن کے ذریعے مسلمانوں پر گناہوں سے اجتناب کرنا، اچھی صحبت میں بیٹھنا، اچھے ہمسایہ کی طرح رہنا، تکالیف میں صبر سے کام لینا، ایک دوسرے کی مدد کرنا، تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ آپ کی خواہش تھی کہ آپ کے اصحاب اپنے الفاظ سے پہلے اپنے اعمال کے ذریعہ لوگوں کو ان فضائل کی طرف خاموش دعوت دیں۔ آپ ان سے فرماتے: نیکی کی ہدایت دو اور بدی سے روکو کیونکہ نیکی کی ترغیب دلانا اور بدی سے روکنا نہ موت کو قریب کرتا ہے، نہ رزق کو دُور کرتا ہے۔ اس کے بعد فرماتے: وائے ہو ان لوگوں پر جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے اللہ کو قرض نہیں دیتے۔

پھر آپ ان کی طرف متوجہ ہوتے تاکہ ان کے ذہنوں سے خود پسندی کو دُور کریں اور ان کو دوسروں کی تکالیف کا اسی طرح احساس کرنا سکھا دیں، جس طرح وہ اپنی تکالیف اور ضرورتوں کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے: اپنے بھائی کے

لیے بھی وہی کچھ پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ نیز اس کے لیے وہ نہ چاہو جو اپنے لیے نہیں چاہتے ہو۔ پھر اس کی یوں تاکید فرماتے کہ: ایک مومن دوسرے مومن کے ساتھ جسدِ واحد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کسی ایک عضو میں تکلیف ہو تو پورے جسم کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ مومن مومن کا بھائی ہوتا ہے۔ وہ اس کی آنکھ ہے اور اس کو راستا بتانے والا ہے۔ نہ وہ اس کے ساتھ خیانت کرتا ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اس کو دھوکہ دیتا ہے اور نہ اس سے وعدہ کر کے توڑتا ہے۔ اسی طرح آپ مختلف طریقوں سے کوشش فرماتے تھے کہ ذہنوں کو ہموار اور پاکیزہ بنا کر فساد اور لاقانونیت کو ختم کریں تاکہ ظلم اور سرکشی کے خلاف جدوجہد میں پیش آنے والے شدائد اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسے قلوب اور اذہان کو تیار کریں جن میں کمزوری کا گزر اور خوف کی آمد نہ ہو۔ جیسا کہ آپ کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ — امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل نہ موت کو قریب کرتا ہے اور نہ رزق کو دُور کرتا ہے۔ تاہم ظلم اور ظالمین اور خدا کے ان باغیوں کے خلاف آپ کی یہ جدوجہد کسی اور ہی طرح کی تھی، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ یعنی ان ظالموں کے ساتھ یہ مقابلہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ اور ان پر عملاً قائم رہنے کے ذریعے سے تھا، کیونکہ ایک ایسا مسلمان جو اسلام کے احکام، اخلاق اور آداب کا پابند ہو، وہ ظلم و تعدی کے خلاف برسرِ پیکار رہتا ہے اور اپنے دین کے معاملہ میں کسی کی پروا نہیں کرتا خواہ اس کی شان کتنی ہی بلند اور سطوت کیسی ہی عظیم ہو۔

امام جعفر صادقؑ کی تحریک ایک ایسے دور میں اپنے خاص طرز پر یعنی سیاست اور سیاسی افراد سے الگ تھلگ رہ کر پھیلتی رہی جبکہ ان ظالم حکمرانوں کے خلاف مختلف علاقوں میں ہونے والی شورشوں کے بیشتر رہنما لوگوں کو آلِ علیؑ اور خوشنودیِ آلِ محمدؐ کی طرف دعوت دیتے تھے، یہاں تک کہ خود عباسی بھی یہی نعرہ لگاتے تھے۔ اس پر عوام کو یہ خیال ہوا کہ عباسیوں کی یہ دعوت خوشنودی آلِ محمدؐ کے لیے ہے اور امت ایک نئے دَور میں داخل ہو رہی ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اس خیال کے تحت سب کی نظریں امام جعفر صادقؑ کی طرف اٹھنے لگیں، لیکن آپ بنی عباس کی نیتوں اور ان کے مقاصد کو خوب جانتے تھے۔ نیز آپ کے آباءِ کرامؑ کے ساتھ اہلِ کوفہ کا طرزِ عمل بھی آپ سے

پوشیدہ نہ تھا۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ بنی عباس آپ کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کریں گے جو معاویہ نے آپ کے دادا امیر المومنین علیؑ اور آپ کے چچا امام حسنؑ کے ساتھ، یزید بن معاویہ نے امام حسینؑ کے ساتھ اور ہشام بن عبدالملک نے آپ کے چچا زید بن علیؑ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ کیونکہ اقتدار اور حکومت کا نشہ کسی پر رحم نہیں کرتا۔ یہ ضرور ہے کہ بنی عباس امام حسینؑ اور ان کے اصحاب پر نیز زید بن علیؑ اور دوسرے علویوں پر رویا کرتے تھے لیکن جب معاملات ان کے حق میں درست ہوگئے اور ان کی حکومت استوار ہوگئی تو انھوں نے علویوں پر ظلم ڈھانے کی اس سے بھی بُری مثالیں قائم کیں، جیسی ان کے پیشرو بنی امیہ کے ہاتھوں قائم ہوئی تھیں۔

امامؑ حکومت اور سیاست سے کنارہ کش رہے۔ یہاں تک کہ آپ اس کے متعلق بات بھی نہ کرتے تھے۔ نہ کسی اور کو یہ مجال تھی کہ وہ آپ کے ساتھ اس کے متعلق بات کرے۔ حالانکہ بہت سے لوگ خاص اسی مقصد سے آپ کی خدمت میں آتے تھے۔ جو لوگ علویوں کے مفاد میں برسرِ عمل تھے ان کے ایک قائد ابو سلمہ خلال بھی تھے۔ جب ان کو عباسیوں کی نیتوں اور بذاتِ خود اقتدار حاصل کرنے کے ارادہ کا علم ہوا تو انھوں نے علویوں میں سے تین افراد یعنی امام جعفر صادقؑ، عبداللہ محض اور عمرو اشرف کو الگ الگ خط لکھے اور انہی کے ایک حبدار کے ہاتھ روانہ کیے۔ انھوں نے قاصد سے کہا کہ پہلے پہل تم امام جعفر صادقؑ کے پاس جاؤ۔ اگر وہ اس امر کو قبول کرلیں تو پھر کسی اور کے پاس مت جانا اور بقایا دونوں خطوں کو ضائع کر دینا لیکن اگر تم کو امام صادقؑ سے مثبت جواب نہ ملے تو عبداللہ محض کے پاس جا کر ان کو خط دیدینا۔ اگر وہ تم کو ہاں میں جواب دیں تو پھر کسی اور کے پاس نہ جانا، ورنہ عمرو اشرف کے پاس جانا۔ چنانچہ قاصد نے ابو سلمہ کا خط امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پہ امامؑ نے فرمایا: مجھ کو ابو سلمہ سے کیا سروکار، وہ تو کسی اور کا پیروکار ہے۔ پھر آپ نے اپنے خدمتگار سے فرمایا: ذرا چراغ تو میرے پاس لانا۔ اس نے آپ کے حکم کی تعمیل کردی۔ تب آپ نے وہ خط لَو پر رکھ دیا اور وہ پورے کا پورا جل گیا۔ قاصد یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اب امامؑ نے اس سے کہا: یہ خط کا جواب ہے۔

پھر قاصد عبداللہ محض کے پاس گیا اور خط ان کو دیا۔ انہوں نے اس کو بوسہ دیا اور پھر فوری طور پر وہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے عرض کیا: یہ ابوسلمہ کا خط ہے جس میں انہوں نے مجھ کو خلافت کے لیے دعوت دی ہے۔ یہ خط میرے پاس اہل خراسان میں سے ہمارے کچھ شیعہ لے کر آئے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اہل خراسان کب سے تمہارے شیعہ ہو گئے؟ کیا ابومسلم کو تم نے وہاں بھیجا ہے یا تم وہاں کے کسی فردِ واحد کو بھی اس کے نام سے جانتے ہو؟ وہ کیونکر تمہارے شیعہ ہیں؟ جب کہ نہ تم ان کو جانتے ہو اور نہ وہ تم کو جانتے ہیں۔ عبداللہ نے جواباً عرض کیا: آپ یہ بات کسی خاص وجہ سے فرما رہے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: اللہ جانتا ہے کہ میں اپنے اوپر ہر مسلمان کو نصیحت کرنا واجب سمجھتا ہوں، تو پھر میں اس کو تمہارے حق میں کیسے ترک کر سکتا ہوں۔ دیکھو خلافت کی تمنا مت کرو، یہ عنقریب ان لوگوں کو مل جائے گی۔

اسی طرح سدیر صیرفی نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: اے ابوعبداللہ! آپ کب تک بیٹھے رہیں گے؟ آپ نے فرمایا: کس لیے اے سدیر! انہوں نے کہا: آپ کے دوستداروں، شیعوں اور انصار کی کثرت کی وجہ سے! اس پر آپ نے فرمایا: اے سدیر! کتنے ہوں گے یہ لوگ؟ انھوں نے کہا: ایک لاکھ۔ امام نے تعجب سے فرمایا: ایک لاکھ!! انہوں نے کہا: جی ہاں! بلکہ دو لاکھ۔

بعض روایات کے مطابق آپ نے فرمایا: اگر میرے ساتھ اس قدر افراد بھی ہوتے جتنے نبی اکرمؐ کے ساتھ یوم بدر میں تھے، میں ضرور اقدام کرتا۔ جب ہاشمیوں نے محمد بن عبداللہ بن حسن کی بیعت کی تو امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ نے فرمایا: ایسا مت کرو! کیونکہ حکومت تم کو ملنے والی نہیں ہے۔ پھر آپ نے ابوالعباس سفاح کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور اس کے بعد عبداللہ بن حسن کے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: بخدا! حکومت نہ تمہارے لیے ہے اور نہ تمہارے بیٹوں کے لیے، بلکہ یہ ان (عباسیوں) کے لیے ہے۔ مگر تمہارے دونوں بیٹے مارے جائیں گے۔ اب امام جعفر صادقؑ عبدالعزیز بن عمران زہری کے ہاتھ کا سہارا لیکر اٹھے اور فرمایا: تم اس زرد چادر والے شخص (یعنی منصور دوانیقی) کو دیکھتے ہو۔ زہری نے عرض کیا: جی ہاں! اے فرزند رسولؐ! آپ نے فرمایا: یہ عنقریب

ہی ان بنی حسنؑ کو قتل کر دے گا۔ زہری نے کہا: کیا یہ محمد کو قتل کر دے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! زہری کہتے ہیں: تب میں نے اپنے دل میں کہا: قسم بخدا! یہ ان سے حسد کی بنا پر کہا گیا ہے۔ زہری مزید کہتے ہیں: واللہ! میں نے اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے ہی دیکھ لیا کہ منصور نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔

ایک دوسری روایت میں ایک ایسی نشست کا ذکر ہے، جس میں امام صادقؑ، عبداللہ بن حسن، ابوالعباس سفاح اور منصور سبھی موجود تھے۔ تب امام جعفر صادقؑ نے عبداللہ سے کہا: بخدا! یہ حکومت تمہارے اور تمہارے بیٹوں کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ اس کے اور اس کے لیے ہے۔ آپ نے سفّاح اور منصور کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا اس کے بعد اس کے بیٹے کے لیے ہے اور انہی میں چلتی رہے گی۔ یہاں تک کہ یہ لوگ بچوں کو حکمران بنائیں گے اور عورتوں سے مشورہ کیا کریں گے۔ راوی کہتا ہے کہ امام صادقؑ، منصور کی طرف اشارہ کر کے بیان فرماتے رہے کہ یہ اس کو احجار الزیت کے مقام پر قتل کر دے گا اور اس کے بعد اس کے بھائی کو بھی قتل کر دے گا۔ اب امام غصہ میں اٹھے اور چل دیے جبکہ آپ کی چادر گھسٹ رہی تھی۔ تب منصور آپ کے پیچھے پیچھے گیا اور بولا: اے ابو عبداللہ! آپ سمجھتے بھی ہیں کہ آپ نے کیا کہا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! قسم بخدا کہ یہ ضرور ہو کر رہے گا۔[1]

مختصر یہ کہ امامؑ خلافت اور سیاست سے علیحدہ رہے اور ان حادثات میں سے کسی میں بھی شریک نہیں ہوئے جو اموی حکومت کے زوال کے زمانہ میں واقع ہوتے رہے، جن سے مملکت کا کوئی علاقہ محفوظ نہیں تھا، کیونکہ اس زمانہ میں متعدد جماعتیں سیاسی اور فوجی میدانوں میں باہم دست و گریباں تھیں اور ان میں سے ہر جماعت یہ تمنا کرتی تھی کہ آپ اس کی حمایت فرمائیں تاکہ وہ آپ کے ذریعہ سے اپنے مقاصد اور مصلحتوں کو چھپائے رکھے لیکن آپ نے اس حادثات میں الجھی ہوئی فضا سے کنارہ کش رہنے کو ترجیح دی اور اس موقع کو غنیمت خیال فرمایا کیونکہ اس میں حکام اور اقتدار کے بھوکے افراد اپنی ان مشکلات کی طرف متوجہ تھے جو اموی اور عباسی گھرانوں کی توجہات کو آپ سے اور ان ان عام علویوں سے ہٹلائے ہوئے تھیں جو وقتاً فوقتاً ایذاء، جلا وطنی اور مختلف قسم کی مصیبتوں کے باعث احتجاجاً خروج کرتے تھے۔ آپ ان سب باتوں سے کنارہ کش رہ کر

---

[1] احجار الزیت مدینہ کے باہر ایک مقام ہے جہاں ۱۴۵ھ میں محمد بن عبداللہ بن حسن قتل ہوئے۔

اسلام اور شریعت اسلام کی طرف متوجہ رہے اور چند ہی برسوں کے اندر اندر اسلام اور شریعتِ اسلام کے لیے وہ کام کرنے میں کامیاب ہو گئے جو نہ آپ سے پہلے ہو سکا اور نہ آپ کے بعد کے زمانہ میں ہوا۔

راویوں کا یہ کہنا صحیح ہو یا نہ ہو کہ آپ کو معلوم تھا کہ یہ فسادات آپ کے لیے پریشان کن ہوں گے۔ بہرحال آپ کی کنارہ کشی یہ ثابت کرتی ہے کہ آپ کی نگاہیں دوربین تھیں اور آپ نے ان حادثات کے نتائج کو صحیح طور پر دیکھ لیا تھا، جبکہ نیک دل مسلمان حتٰی کہ عوام کی توقعات بھی اس نتیجے کے خلاف تھیں۔

تاہم آپ پوری قوت سے دین کی جانب دعوت دینے، اس کی تعلیمات اور احکام کی اشاعت کرنے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت کو ظاہر کرنے پر متوجہ ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے علم کے ابواب میں سے کوئی باب ایسا نہیں چھوڑا جس پر عبور حاصل نہ کیا ہو۔ آپ نے زندیقوں، ملحدوں اور ان لوگوں سے مناظرے کیے جو اپنی سوچ اور زاویۂ نگاہ میں اسلام کے اصولوں سے منحرف ہو گئے تھے۔ ایسے مختلف گروہوں کے ساتھ آپ کے نتیجہ خیز مناظرے ہوئے۔ جن کی بدولت بہت سے افراد حق اور سچائی کی طرف واپس آ گئے۔ مختلف موضوعات پر آپ کی تعلیمات، آپ کے بعد آنے والوں کے لیے ایک قیمتی خزانہ ہیں۔ مزید برآں علماء اور مفکرین کو پیش آنے والی مشکلوں کے حل کے لیے ایک قابل رجوع مخزن بھی ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کے بارے میں بعض آراء

آپ کے متعلق اظہار رائے کرنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کا لقب 'صادق' اس لیے ہوا کہ آپ حدیث کی روایت کرنے، لوگوں سے بات کرنے اور اپنے عمل میں اس قدر سچے تھے کہ آپ اپنے زمانہ میں سب سے ممتاز ہو گئے تھے۔ ابن حجاج آپ کے بارے میں کہتا ہے: ترجمۂ اشعار

وہ میرے آقا ہیں۔ میں ان کی احادیث روایت کرتا ہوں، جو ایک تیز نگاہ فاضل کی حدیثیں ہوتی ہیں۔ میں امام جعفر صادقؑ سے حدیث کی روایت کرتا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے گویا میں نبی اکرم محمد مصطفےٰؐ سے روایت کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ کا مقصد پاکیزہ اور

آپ کی غایت بلند ہوتی تھی۔ حقیقت کی جستجو میں آپ کی کوئی ذاتی خواہش یا دنیاوی غرض شامل نہ ہوتی تھی، بلکہ آپ حق کو حق کی خاطر تلاش فرماتے تھے پھر اس میں کسی الٹ پھیر کی طرف نگاہ نہ کرتے تھے اور نہ کوئی امر آپ کو شبہ میں ڈالتا تھا۔ جب آپ کسی ایسے معاملہ سے دوچار ہوتے کہ جس میں کوئی شبہ ہو سکتا ہو تو آپ کی بصیرت اس کی حقیقت تک جا پہنچتی اور شبہات کے پردوں کو ہٹا دیتی تھی۔ نبی اکرمؐ نے اپنے اس قول میں آپ کی طرف اشارہ فرمایا ہے: اللہ شبہات وارد ہونے کے وقت دُور رس نگاہ والے کو اور خواہشوں کے نمودار ہونے پر کامل عقل والے کو پسند کرتا ہے۔

پس مالک بن انس، جو ائمہ مذاہب میں سے ایک ہیں، انہوں نے آپ کے بارے میں کہا ہے کہ: میں جب بھی امام جعفرؑ بن محمدؑ کی خدمت میں باریاب ہوتا تو آپ کو اکثر تبسم فرماتے ہوئے دیکھتا تھا لیکن جب کبھی آپ کے سامنے نبی اکرمؐ کا ذکر ہوتا تو آپ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا میں ایک زمانہ تک آپ کے پاس حاضر ہوتا رہا۔ تب میں آپ کو ان تین میں سے کسی ایک حالت میں پاتا تھا یعنی یا تو نماز میں ہوتے یا روزہ رکھے ہوئے یا قرآن کی تلاوت کر رہے ہوتے تھے۔ میں دیکھا کرتا کہ جب آپ آنحضرتؐ کی حدیث روایت فرماتے آپ طہارت سے ہوتے تھے۔ آپ کبھی ایسے معاملہ میں نہ بولتے جس کا آپ سے تعلق نہ ہو۔ آپ اللہ کے ان عابد و زاہد بندوں میں سے تھے جن پر ہمیشہ خدا کا خوف غالب رہتا ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں: علم، عبادت اور خوفِ خدا میں امام جعفر صادقؑ سے بڑھا ہوا نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا اور نہ کسی قلب نے تصور کیا۔ امام ابوحنیفہ نے آپ کے بارے میں کہا ہے کہ: میں نے امام جعفرؑ بن محمدؑ سے بڑا فقیہہ نہیں دیکھا۔ مجھ سے خلیفہ منصور نے کہا کہ لوگ امام جعفرؑ بن محمدؑ کو بہت بڑا فقیہہ مانتے ہیں۔ تم کچھ سخت قسم کے سوالات مرتب کر کے ان سے دریافت کرو۔ چنانچہ میں نے ایسے چالیس سوال تیار کیے کہ جن کو دیکھ کر منصور بھی حیران رہ گیا۔ چنانچہ اس نے ایک نشست قائم کی، جس میں مجھے

بھی بلایا اور دیگر نمایاں افراد کو بھی مدعو کیا گیا۔ چنانچہ جب میں وہاں گیا تو دیکھا امام جعفرؑ بن محمدؑ، خلیفہ منصور کی داہنی طرف تشریف فرما ہیں۔ جب میں نے ان پر نظر ڈالی تو مجھ پر ایسی ہیبت طاری ہوئی جو منصور کو دیکھنے سے بھی نہ ہوئی تھی۔ پس میں نے سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ منصور نے مجھ سے کہا: اے ابوحنیفہ! اپنے سوالات ابوعبداللہ کے سامنے پیش کرو۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں ایک کے بعد دوسرا سوال پیش کرتا رہا اور آپ ہر سوال کے جواب میں یوں فرماتے جارہے تھے: تم لوگ یہ کہتے ہو' اہل مدینہ یہ کہتے ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں۔ کبھی آپ ہماری مخالفت کرتے اور کبھی ان لوگوں کی۔ اسی طرح کبھی آپ ہم سے اتفاق کرتے اور کبھی ان سے۔ یہاں تک کہ میں نے چالیس سوال پیش کر ڈالے اور کوئی ایک بھی باقی نہ رہا۔ اس مناظرے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مجمع اور خود منصور بھی جو امام جعفر صادقؑ کو اس لیے تاک رہا تھا کہ وہ کسی مسئلہ میں تھوڑی ہی دیر کے لیے اٹک جائیں' ابوحنیفہ نے بہ آواز بلند کہا: "لوگوں میں سب سے بڑا عالم وہی ہے جو لوگوں کے باہمی اختلافات کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہو" اب منصور کو مایوسی ہوئی اور اس کی تمنائیں خاک میں مل گئیں۔ اس کی توقع اور تمنا یہ تھی کہ امام جعفر صادقؑ ان چالیس مشکل سوالات میں سے جو ابوحنیفہ نے آپ کے لیے تیار کیے تھے کسی ایک ہی پر اٹک جاتے۔

اس تدبیر سے منصور لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ امام جعفرؑ بن محمدؑ بھی دوسرے فقیہوں کی مانند محض ایک فقیہہ تھے نہ کہ عام سطح سے بلند تر جیسا کہ آپ کے شیعہ اصحاب اور بیشتر افراد آپ کو مانتے تھے لیکن امامؑ' ابوحنیفہ' منصور اور تمام لوگوں کے مقابلے پر اپنی فوقیت ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ابوحنیفہ متواتر دو سال تک امام جعفر صادقؑ کی شاگردی میں رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ابوہبیرہ کی قید سے فرار ہو کر حجاز میں پناہ گزین تھے۔ پھر وہ وہیں رہے یہاں تک کہ ابوالعباس سفاح کو اقتدار مل گیا۔ اسی مناسبت سے وہ کہا کرتے تھے: اگر یہ دو سال امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں نہ گزار لیتا تو نعمان (یعنی میں) ہلاک ہو جاتا۔ نیز انھوں نے مختلف اوقات میں حجاز کے جو سفر کیے ان میں بھی کئی بار آپ سے ملاقات کی ہے۔

جب امام جعفر صادقؑ نے ابن ابی العوجا سے مناظرہ کرنے کا قصد فرمایا تو اس سے کہا: تم کو بات کرنے سے کونسی چیز روکے ہوئے ہے؟ تب اس نے کہا: آپ کی بزرگی اور آپ سے خوف۔ کیونکہ آپ کے سامنے میری زبان بولنے سے قاصر ہے، حالانکہ میں نے علماء اور متکلمین سے مقابلے اور مناظرے کیے ہیں۔ لیکن اے فرزند رسولؐ! مجھ پر ان میں سے کسی کی ایسی ہیبت کبھی طاری نہیں ہوئی جیسی آپ کی ہیبت طاری ہوئی ہے۔

اگرچہ منصور آپ کے لیے ایک سخت ترین مخالف تھا تاہم وہ کہا کرتا تھا کہ: امام جعفرؑ بن محمدؑ نیکیوں میں پیش پیش ہیں اور وہ ان افراد میں سے ہیں جن کو اللہ نے اپنے بندوں میں منتخب قرار دیا اور اپنی کتاب کا وارث بنایا ہے۔ نیز وہ اپنی ایسی صحبتوں میں جن میں صرف اس کے خاص آدمی ہی ہوتے، کہا کرتا تھا: تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اہلبیتؑ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فرد ایسا ہوتا ہے جو حق کا امین ہوتا ہے اور آج کل حق کے وہ امین فرد امام جعفرؑ بن محمدؑ ہیں۔

راویوں کا خیال ہے کہ منصور دوانیقی نے امام جعفر صادقؑ کے متعلق یہ جملہ اس وقت کہا تھا جب آپ نے اس کی ایک سازش کا انکشاف کیا جو اس نے بعض ان علویوں پر حملہ کرنے کے لیے کی تھی جن سے وہ اپنے تخت کو خطرے میں سمجھ رہا تھا۔

اس سلسلے میں راویوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ: منصور نے محمد بن اشعث سے کہا: اے محمد! مجھ کو ایک ایسا آدمی مہیا کردو، جو عقل میں میری جگہ لے سکے۔ اس پر محمد نے کہا: میں نے تمہارے لیے ایسا آدمی ڈھونڈ لیا ہے اور وہ میرے ماموں ابن مہاجر ہیں۔ منصور نے کہا: تو پھر انہیں میرے پاس بھجوادو۔ جب وہ آگیا تو منصور نے اس سے کہا: اے ابن مہاجر! تم یہ مال لے کر مدینہ جاؤ۔ وہاں عبداللہ بن حسن، امام جعفرؑ بن محمدؑ اور علویوں کے دیگر ممتاز افراد سے ملاقات کرو۔ تم ان سے کہنا میں خراسان کا ایک شیعہ ہوں اور پھر یہ مال ان کو دیدینا۔ جب وہ مال لے لیں تو ان سے کہو: چونکہ میں قاصد ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھ سے جو مال لیا ہے مجھے اس کی رسید مل جائے۔

چنانچہ وہ مال لے کر مدینہ چلا گیا اور یہ کام انجام دیکر ابوجعفر منصور کے پاس

خوش خوش واپس آگیا۔ منصور نے پوچھا کیا کر آئے؟ اس نے جواب دیا: میں ان لوگوں کے پاس سے ہو آیا اور یہ ان کی وہ رسیدیں ہیں جو انھوں نے وہ مال لیکر مجھے دی ہیں۔ مگر یہ کہ ان میں امام جعفرؑ بن محمدؑ کی رسید نہیں ہے کیونکہ جب میں ان کی خدمت میں گیا تو وہ مسجد نبوی میں نماز ادا کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ اٹھ کے چلیں تو میں ان سے وہ بات کہوں جو ان کے دوسرے بھائی بندوں سے کہہ چکا ہوں۔ پھر وہ جلدی سے چل دیے اور میں ان کے پیچھے ہو لیا۔ تب وہ میری طرف متوجہ ہوکر بولے: اے شخص! اللہ سے ڈر اور اہلبیت محمدؐ کو دھوکہ مت دے کیونکہ وہ ماضی قریب میں بنی مروان کے زیر حکومت رہنے سے محتاج ہوگئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ تب انہوں نے اپنا سر میرے قریب کیا اور مجھ کو وہ سب کچھ بتا دیا جو میرے اور تمہارے درمیان طے پایا تھا۔ اس پر منصور نے کہا: اے ابن مہاجر! جان رکھو کہ اہلبیتؑ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فرد حق کا امین ہوتا ہے۔ پس آج کل ہمارے وہ فرد یہی امام جعفرؑ بن محمدؑ ہیں۔

اگرچہ امام جعفر صادقؑ کا وجود منصور پر تمام انسانوں سے زیادہ گراں تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنی مملکت کے معاملہ میں ہر انسان سے زیادہ آپ سے خائف رہتا تھا۔ کیونکہ وہ جہاں کہیں جاتا اور جہاں کہیں قیام کرتا تھا، وہ یہی دیکھتا کہ لوگ اپنے گروہی اور طبقاتی اختلاف کے باوجود امام جعفرؑ بن محمدؑ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ بلا ارادہ طور پر اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا کہ آپ کے بارے میں اپنے دل کی بات کہدے۔ چنانچہ ایک موقع پر اس نے آپ سے کہا: ہم ہمیشہ آپ کے فیضان کے سمندر سے استفاضہ کرتے رہتے ہیں اور آپ ہی کے ذریعے نابینائی میں بصارت حاصل کرتے اور تاریکی کو آپ کے نور سے زائل کرتے ہیں۔ اے ابو عبداللہ! ہم آپ کی پاکیزگی کے بادلوں اور علم سے ابھرے ہوئے سمندروں میں شناوری کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ اس نے اپنے دربان ربیع سے بھی کہا کہ: یہ بنی فاطمہؑ ہیں، ان کے حق سے صرف ایسا جاہل ہی ناواقف ہو سکتا ہے جس کو شریعت کا کوئی علم نہ ہو۔

نوح بن دراج نے بیان کیا ہے کہ: میں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے پوچھا کہ

کیا تم نے کبھی کسی کے کہنے سے اپنے قول کو پلٹا اور اپنے فیصلے کو بدلا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کبھی نہیں لیکن صرف ایک شخص کے قول پر۔ میں نے کہا: وہ کون ہے؟ وہ بولے امام جعفرؑ بن محمدؑ!

عمرو بن عبید نے آپ سے درخواست کی کہ مجھے گناہان کبیرہ کی تعداد بتا دیجیے، نیز یہ بھی کہا: میں چاہتا ہوں کہ میں ان کو کتاب الٰہی یا سنت رسولؐ سے معلوم کرلوں۔ انہوں نے آپ سے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ معتزلہ، خوارج اور مرجئہ کے درمیان گناہ کبیرہ کے مرتکب کے بارے میں سخت نزاع پیدا ہوگئی تھی۔ خوارج ایسے شخص کو کافر کہتے تھے جبکہ معتزلہ کا خیال تھا کہ وہ کفر و ایمان کی منزلوں کے درمیان ہے۔ مگر مرجئہ اس کو صاحب ایمان قرار دیتے اور کہتے تھے کہ معصیت خواہ کسی درجہ کی ہو وہ ایمان کو زائل نہیں کرسکتی۔

امامؑ نے گناہان کبیرہ کا یوں شمار کیا:

۱۔ **عقوق والدین**: اپنے والدین کے حقوق کا تلف کرنے والا ظالم اور بدبخت ہوتا ہے۔ جیسے قرآن میں آیا ہے کہ: "میں اپنی والدہ کے ساتھ خوش سلوک ہوں۔ اللہ نے مجھ کو ظالم اور شقی نہیں بنایا۔" (سورۂ مریم۔ آیت ۳۲)

۲۔ **نیک عورتوں پر تہمت**: پاکباز عورتوں پر الزام لگانے والا ملعون ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے: وہ لوگ جو پاکباز، باایمان لیکن بے خبر عورتوں پر الزام لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی جائے گی اور ان کے لیے عظیم عذاب ہے۔ (سورۂ نور۔ آیت ۲۳)

۳۔ **میدان جہاد سے فرار**: میدان جہاد سے بھاگ جانا بھی ایسا ہی گناہ ہے۔ کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے: وہ شخص جو لڑنے کے لیے یا اپنے کسی گروہ سے جا ملنے کے لیے کافروں کی طرف پیٹھ پھیرے، اس کے علاوہ جو بھی اس روز جنگ سے پیٹھ موڑے گا وہ اللہ کے غضب میں داخل ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم میں ہوگا جو بہت ہی بری جگہ ہے۔ (سورۂ انفال۔ آیت ۱۶)

۴۔ **قتل نفس**: انسان کو قتل کرنے والا بھی اسی طرح کا مجرم ہے کیونکہ خدا کا فرمان ہے: پس جو کوئی جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے اس کی سزا جہنم ہے جہاں وہ

ہمیشہ رہے گا۔ اللہ اس پر غضبناک ہو گا، اس پر لعنت کرے گا اور اس کو سخت عذاب میں ڈالے گا۔

۵۔ عہد شکنی اور قطع رحم: عہد کو توڑنے والا اور قرابتداری کا پاس نہ کرنے والا شخص بھی سخت گناہگار ہے کیونکہ اللہ کا اعلان ہے کہ: وہ لوگ جو عہد کرنے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں صلہ رحمی کے حکم کا پاس نہیں کرتے اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں وہ گھاٹا کھانے والے ہیں۔ (سورۃ بقرہ۔ آیت ۲۷)

چنانچہ امام گناہاں کبیرہ کا شمار فرماتے اور ہر ایک کی دلیل کتاب وسنت سے پیش کرتے رہے اور عمرو بن عبید آپ کا بیان جذب وشوق سے سنتا رہا۔ یہاں تک کہ امام علیہ السلام کا بیان اختتام کو پہنچ گیا۔ تب عمرو بن عبید نے کہا: برباد ہو جائے وہ شخص کہ جس نے آپ کے حقوق کو سلب کیا اور وہ بھی جو آپ کے علم و فضل میں تنازع کرے۔

کسی شخص نے ابو حنیفہ سے پوچھا: اگر کوئی شخص اپنا مال امام کے لیے وقف کر رہا ہو تو یہ کس امام کے لیے ہونا چاہیے؟ انہوں نے جواب دیا: اس کے مستحق امام جعفر صادقؑ ہیں کیونکہ وہی امام برحق ہیں۔

عبداللہ بن مبارک نے آپ کے بارے میں کہا ہے:

اے جعفر صادقؑ! آپکی مدح کرنا مشکل امر ہے اور آپ مدح سے بالاتر ہیں،
دیگر تمام صاحبانِ شرف گویا زمین ہیں اور آپ ان کے مقابل
آسمان کی مانند ہیں۔ ان افراد کے لیے مدح کی حدیں یقیناً ختم
ہوگئی ہیں کہ جن کی ولادت نبوت کے گھرانہ میں ہوئی ہے۔

مناقب ابن شہر آشوب میں ہے کہ زید بن علیؑ کہا کرتے تھے: ہر زمانہ میں ہم اہلبیتؑ میں ایک فرد ایسا ہوتا ہے جس کو اللہ اپنی مخلوق پر حجت قرار دیتا ہے۔ پس ہمارے زمانہ میں حجت خدا میرے بھتیجے جعفرؑ بن محمدؑ ہیں۔ جو کوئی ان کی پیروی کرے گا، گمراہ نہ ہوگا اور جو کوئی ان کی نافرمانی کرے گا ہدایت نہ پائیگا۔

شہرستانی نے ملل ونحل میں کہا ہے: ابو عبداللہ امام صادقؑ دین وادب

میں گہرا علم رکھتے تھے۔ وہ حکمت، سادہ روی اور تقوٰی میں کامل اور طلب دنیا سے دُور تھے۔ آپ ایک مدت تک مدینہ میں مقیم رہے اور اپنے ہاں آنے والے شیعوں اور دوسرے لوگوں کو مستفید فرماتے رہے۔ آپ نے کبھی خلافت کی خواہش نہ فرمائی اور نہ اس کے لیے کسی سے جھگڑا کیا۔ ہاں جو بحر معرفت میں داخل ہوگیا اس کو کناروں سے کیا مطلب؟ جو حقیقتوں کی بلندیوں تک پہنچ جائے اسے پستی کی کیا فکر؟ کیونکہ جو اللہ سے لَو لگا لیتا ہے وہ جھگڑوں سے گھبرانے لگتا ہے اور رجعت، بداء، تناسخ، غلو اور تشبیہہ ایسے مسائل سے بری ہو جاتا ہے۔[1]

اسی طرح آپ کے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ آپ کے بارے میں آپ کے ہمعصروں اور بعد میں آنے والوں نے جو کچھ کہا ہے، اگر کوئی اس کو جمع کرنا چاہے تو اس کو اس موضوع پر ایک بڑی کتاب لکھنا پڑے گی۔

جامعہ اہل بیتؑ اور امام جعفر صادقؑ

امام جعفر صادقؑ کے والد بزرگوار کہ جنہوں نے جامعۂ اہلبیتؑ کی بنا ڈالی تھی۔ آپ نے ان کے سائے میں پینتیس سال گزارے۔ دریں اثنا آپ نے اپنے شباب کے ابتدائی دَور میں وہ سخت ترین واقعات ملاحظہ کیے جو اموی حکومت کے زوال کا باعث بنے تھے۔ اس زمانہ اور اس سے مابعد کے زمانوں میں جو علمی حلقہ ہائے درس مسجد نبویؐ اور دوسری جگہوں میں تھے وہ سب آپ کے والد امام باقرؑ کے عظیم المرتبت صحابیوں پر مشتمل تھے۔ معتبر کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں مختلف اسلامی علاقوں کے سیکڑوں علماء اور طلباء موجود رہتے تھے۔ تب آپ اپنے والد بزرگوار کے دامان محبت میں تربیت پا رہے تھے اور وہ آپ کو علومِ دین اور اسرارِ کائنات سے آگاہ فرما رہے تھے جو انہوں نے اپنے آباءِ کرامؑ اور انہوں نے رسول اللہؐ سے وراثتاً پائے تھے۔

آپ اپنے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ کے ساتھ ان کی حیات کے آخری لمحہ تک رہے جبکہ ان کا مدرسہ فقہ، حدیث اور اسلامی علوم کے مختلف موضوعات کو آگے بڑھا

---

[1] رجعت اور بداء کے بارے میں شہرستانی کا یہ قول محتاج تحقیق ہے۔

رہا تھا اور وہ مقاد اسلام کے مطابق اس کی آبیاری فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۱۴ھ میں ان کی وفات واقع ہوگئی۔

اب امام جعفر صادقؑ نے دین کی سربراہی سنبھالی اور مسلمان ہر چہار طرف سے آپ کی خدمت میں آنے لگے۔ دوسری طرف اموی حکومت تیزی سے زوال کی طرف جا رہی تھی اور اس کے مخالفوں کو کامیابی پر کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔

اس لحاظ سے امام جعفر صادقؑ کی امامت ایسے دور میں شروع ہوئی جب بنی امیہ کا اقتدار آخری ہچکیاں لے رہا تھا اور لیلائے حکومت مسکرا مسکرا کر عباسیوں کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس وقت نئی اور پرانی دونوں ہی قوتوں کو آپ کے سکوت اور خوشنودی کی شدید ترین ضرورت تھی کیونکہ با اقتدار جماعت جو اس وقت زوال کے قریب پہنچ چکی تھی، اس کو اپنے اس سلوک اور اس کے نتیجے کا احساس ہوگیا تھا جو اس نے اہلبیتؑ کے ساتھ کیا تھا۔ اس لیے کہ ان کے خلاف اٹھنے والے بیشتر لوگ کربلا کے المیہ کو اہلبیتؑ اور ان کے شیعوں پر کیے گئے مظالم کو نیز زید بن علیؑ اور ان کے بیٹے یحییٰ بن زید کے ساتھ بنی امیہ کی ستم کاری اور اسی قسم کے دوسرے جرائم کو اپنے فائدہ کے لیے بیان کرتے تھے۔ چنانچہ اس ذریعے سے وہ حسب دلخواہ عوام کو اپنے ساتھ ملانے اور فرمانرواؤں کے خلاف کھڑا کر لینے میں کامیاب ہوگئے کیونکہ اموی حکمرانوں نے صالح افراد اور عام مسلمانوں پر طرح طرح کی زیادتیاں اور سختیاں کی تھیں۔

یہاں تک کہ جو لوگ امویوں کے خلاف تحریک کی قیادت کر رہے تھے، وہ علویوں کی بزرگی اور ان کے کارناموں کا سہارا لیتے اور ان کے دشمن بنی امیہ کے اس ظلم و تشدد کو ظاہر کرتے تھے جو ان لوگوں نے اپنے تقریباً اسی سال کے عہد حکومت میں ان پر روا رکھا۔ جس میں اہلبیتؑ کو کبھی زندگی کا چین نصیب نہ ہوا تھا۔ ایسی حالت میں یہ فطری امر تھا کہ ایسے وقت میں یہ لوگ امام صادقؑ کے لیے سکون اور آرام کے تمام اسباب مہیا کردیں اور آپ اپنے والد بزرگوار کے اس راستہ پر گامزن رہیں جس پر وہ آپ کو چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ طالب علم، محدث اور غیر اسلامی نظریوں کے حامل وہ افراد جو عقائد میں آپ سے مناظرہ کرنا چاہتے تھے ہر طرف سے مدینہ آیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان افراد کو چھوڑ کر

جو مختلف موضوعات پر مناظرہ کرنے کے لیے آتے تھے۔ آپ کے پاس چار ہزار کے قریب طالبان علم جمع ہو گئے تھے۔

امامین محمد باقرؑ و جعفر صادقؑ کی طرف لوگوں کے اس پر جوش رجوع اور ان پہ نشر علوم کے کام کا یہ دباؤ غالباً اس لیے پڑ رہا تھا کہ بنی امیہ کی حکومت اہلبیتؑ کے علوم اور فقہ کے بارے میں حد درجہ سخت اور شدید رویہ اختیار کیے ہوئے تھی حتیٰ کہ بعض فقیہوں کا یہ حال تھا کہ اگر ان کو کسی ایسی حدیث کا ماخذ بیان کرنا پڑتا، جو امام علیؑ سے آئی ہو تو وہ کہہ دیتے تھے کہ یہ 'ابو زینبؑ' نے کہا ہے۔

چنانچہ ابو الفرج بن جوزی کی کتاب 'تاریخ حسن بصری' میں ہے کہ جب وہ امام علیؑ کی کوئی حدیث بیان کرنا چاہتے تو یوں کہتے کہ "کہا ابو زینبؑ نے"۔ کیونکہ وہ بنی امیہ اور ان کے حامیوں کے خوف سے آپ کا نام لینے سے کتراتے تھے۔ پھر جب خاص خاص آدمیوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ 'ابو زینبؑ' سے امام علیؑ کو مراد لیتے ہیں تو ابان بن عیاش نے ان سے کہا: تم سے یہ کیا بات منسوب کی جاتی ہے، جو تم نے امام علیؑ کے متعلق اختیار کی ہے؟ انہوں نے کہا: اے بھتیجے! اس طرح میں ان ظالموں سے اپنی جان بچاتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھ پر کب کی تباہی آچکی ہوتی۔

بعض لوگ کہتے تھے کہ "کہا شیخ نے" جبکہ اس سے ان کی مراد "امام علیؑ" ہوتے تھے لیکن وہ ان کا نام لینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔

ابو حنیفہ سے روایت ہے کہ: جب ایک اموی نے مجھ سے کوئی فقہی مسئلہ دریافت کیا تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب کروں تو کیا کروں؟ کیونکہ میں اس میں امام علیؑ کی روایت پر ہوں۔ پس میں نے فیصلہ کیا کہ اسی حوالے سے فتویٰ دوں اور بتاؤں کہ یہی حکم اللہ کے دین کے مطابق ہے۔ مناقب ابو حنیفہ کی جلد اول میں ہے کہ انہوں نے مزید کہا: بنی امیہ امام علیؑ سے نہ حدیث اخذ کرتے اور نہ ان کے قول سے فتویٰ لیتے تھے۔ اسی لیے فقہاء بھی امام علیؑ کا نام نہ لیتے تھے، بلکہ آپ کے نام کی بجائے ان میں 'کہا شیخ نے' کی علامت رائج تھی۔

عیون الاخبار، ابن قتیبہ میں شعبی کا یہ قول آیا ہے کہ: آل ابو طالب کے لیے ہم

عجب مصیبت میں گرفتار تھے کیونکہ اگر ان سے محبت کریں تو قتل کر دیے جائیں اور ان سے دشمنی رکھیں تو جہنم میں جائیں۔

اہلبیتؑ کی احادیث اور ان کی فقہ کو مٹانے کے لیے امویوں کی خواہش اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے بعض فقیہوں کو خود آگے بڑھایا اور احکام بیان کرنے اور فتوے جاری کرنے کا کام انہی پر چھوڑ دیا۔ جیسے سلیمان بن موسیٰ اشدق متوفی ۱۱۹ھ اور عبداللہ بن ذکوان متوفی ۱۳۰ھ کہ جو بنی امیہ کا ایک غلام تھا اور ابو ہریرہ کی احادیث روایت کیا کرتا تھا۔ اسی طرح سلیمان بن یسار بھی ان کے محلات کا ملازم تھا جسے انہوں نے مدینہ کا فقیہ بنادیا نیز ابن عمر کا غلام نافع، بنی ہذیل کا غلام مکحول، بنی مخزوم کا غلام ابو حازم سلمہ بن دینار اعرج، سلیمان بن طرخان، اسماعیل بن خالد بجلی، ابن عباس کا غلام عکرمہ اور ابن شہاب زہری بھی تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسے ہی غلام علماء تھے جن کو انہوں نے تقرب بخشا اور ان کے لیے اپنے سینے اور خزانے کھول دیے تھے لیکن ان میں سے کسی کو اہلبیتؑ سے حدیث روایت کرنے اور فقہ یا کسی دوسرے اسلامی موضوع پر امام علیؑ یا ان کے بیٹوں میں سے کسی کی رائے کے مطابق فتویٰ دینے کی اجازت نہ تھی۔ اسی وجہ سے بہت سے ایسے فقہاء جو امام علیؑ اور ان کی اولاد طاہرہ کی فقہ کے بجائے کسی دوسری فقہ پر انحصار نہ کرتے تھے۔ وہ سخت تنگی میں گرفتار اور فقہ کے میدان سے خارج تھے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے افراد جو فقہاء الرائے کہلاتے تھے' وہ امام علیؑ کی رائے کے مطابق فتوے دیتے ہوں لیکن وہ صحابہ میں سے کسی کی سند کا ذکر کیے بغیر اس کو اپنے آپ سے منسوب کر دیتے تھے کیونکہ بنی امیہ کے کوڑے اور تلواریں جو ان کی گردنوں پر کھنچی رہتی تھیں ان کے خوف سے وہ کسی حدیث یا رائے کو امام علیؑ سے منسوب کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگوں نے ان کو "فقہاء الرائے" یعنی اپنی رائے سے فتویٰ دینے والوں میں شمار کر لیا۔

تاہم جب امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کو موقع مل گیا کہ وہ امام علیؑ اور رسول اللہؐ سے روایت کریں اور اہلبیتؑ کی فقہ اور احادیث کی اشاعت کریں تو ہر طرف اور ہر مقام کے طالبان علم اور علماء ان دونوں کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ چنانچہ

ان دونوں اماموں کے عہد میں ایک ایسا علمی انقلاب پیدا ہوا جو مملکت کے تمام اطراف میں پھیل گیا تھا۔ جس سے ایسے عقائد کا قلع قمع ہونے لگا، جن کے پیچھے کئی ایک خفیہ ہاتھ اسلام کے اصولوں کو مسخ کرنے اور اس میں ایسی تحریف کرنے کی کوشش میں مصروفِ عمل تھے جس سے اسلام کو نہیں اس کے دشمنوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ اس طرح عقائد و نظریات کا جو ٹکراؤ ہو رہا تھا اس نے مسلمانوں کو کئی فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسلامی معاشرے کے اس فکری انتشار کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے وہ صاحبانِ اقتدار تھے جن کی یہ خواہش تھی کہ مسلمان ان کے ظلم، جور اور زیادتی کو بھول کر اس قسم کے ٹکراؤ میں الجھ جائیں۔ پھر اس کے نتائج خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

بہرحال جب اہلبیتؑ اور عوام الناس کے مابین حائل رکاوٹیں دُور ہو گئیں تو تمام شہروں اور بستیوں سے مسلمانوں کے گروہ کے گروہ جامعہ اہلبیتؑ میں آنے لگے۔ پھر امام جعفر صادقؑ کے عہد مبارک میں یہ علمی تحریک اسلامی مملکت کے دُور دراز مقامات تک جا پہنچی اور اس میں علم حاصل کرنے والوں کی تعداد چار ہزار ہو گئی، جیسا کہ ابوالعباس احمد بن عقدہ متوفی سنہ ۳۳۲ھ نے اپنی کتاب 'مستقل' میں ان کا شمار کیا ہے اور شیخ نجم الدین نے اپنی کتاب 'المعتبر' میں اس کی تائید کی ہے۔ ان میں سے نوسو شیوخ سے حسن بن علی وشا نے ملاقات کی، جو امام علی رضاؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ مسجد کوفہ میں جمع ہوتے اور امام جعفرؑ بن محمدؑ سے لی ہوئی حدیثوں کی روایت کرتے اور لوگوں کو فقہ کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ واقعہ امام جعفر صادقؑ کی وفات کے بیس سال بعد کا ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہو کہ حسن بن علی وشا نے بیس سال بعد امام صادقؑ کے شاگردوں میں سے نوسو افراد سے ملاقات کی، تو یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کی خدمت میں مسلمانوں کے تمام علاقوں سے چار ہزار سے بھی زیادہ طلباء نے تحصیل علم کی تھی۔

محقق نے المعتبر میں کہا ہے کہ: آپ کے ممتاز شاگردوں نے آپ کی بیان کی ہوئی احادیث اور مسائل کے جوابات پر مشتمل چار سو کتابیں تالیف کیں جو آپ کے بعد 'اصول' کے نام سے مشہور ہوئیں اور محمد نامی تینوں محدثوں یعنی کلینی، صدوق اور طوسی نے اپنی چار کتابوں یعنی کافی، من لایحضرہ الفقیہ، تہذیب الاحکام اور استبصار میں انہی پر

انحصار کیا ہے۔

علم الرجال پر مشتمل شیعہ کتابوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے اصحاب نے مختلف موضوعات پر چار ہزار سے زیادہ کتابیں تالیف کی تھیں۔ اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ اس تعداد میں مبالغہ کا امکان ہے۔ پھر بھی اس میں شک نہیں کہ چار سو اصول کے علاوہ ان لوگوں نے حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی موضوعات پر سیکڑوں کتابیں تالیف کی تھیں۔ جیسا کہ اس امر سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ ان لوگوں کو جو کچھ بھی بتاتے تھے، ان کو اس کے لکھ لینے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس زمانہ میں تصنیف و تالیف کا عام رواج ہو گیا تھا اور علماء و ادباء تصنیف و تالیف میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

چنانچہ اس زمانہ میں ان لوگوں کے علاوہ حدیث، سیرت، تاریخ، تفسیر اور دیگر موضوعات پر دوسرے افراد کی دسیوں کتابیں ظہور میں آئیں لیکن ان شیعہ علماء کی یہ کتابیں کہاں چلی گئیں؟ ہاں! تاریخ نے ان کے ذکر کو اسی طرح فراموش کر دیا ہے، جس طرح علم الرجال میں ان کے مؤلفوں کو نظر انداز کیا ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بیشتر کتابیں چوتھی اور پانچویں صدی تک موجود تھیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ کتب اربعہ کے مؤلفوں نے اپنی کتابوں کی تالیف میں انہی شیعہ علماء کی تصانیف کا سہارا لیا ہے۔ ان میں سے اکثر کتابوں کو سلجوقیوں، تاتاریوں اور ایوبیوں نے اپنی جنگوں کے دوران اس وقت تلف کیا جب انھوں نے مکتبۂ وزیر سابور، مکتبۂ طوسی بغداد اور مکتبۂ قصر فاطمی قاہرہ کو تباہ کیا تھا۔

مزید یہ کہ مکتبۂ محمد بن عمیر کہ جس کو انھوں نے ہارون الرشید کے خوف سے خود ہی زمین میں دفن کر دیا تھا جبکہ اس نے ان کو قید کر دیا اور ان کا سارا مال ضبط کر لیا تھا۔ جب وہ قید سے چھوٹ کر آئے تو سب کتابیں گل چکی تھیں۔ ان میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے اصحاب کی سیکڑوں کتابیں شامل تھیں۔

محمد بن ادریس حلی کہ جو شیخ طوسی کے بعد ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب 'سرائر' سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان قدیم کتابوں میں سے کچھ کتابیں ان کے پاس محفوظ تھیں۔ چنانچہ

انہوں نے "سرائر" میں بزرگ علماء کی ان کتابوں کے مطالب بلا واسطہ اخذ کیے ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں: یہ وہ روایت ہے جو موسیٰ بن بکیر واسطی نے اپنی کتاب میں حمران بن اعین شیبانی سے نقل کی ہے۔ پھر کتاب مذکور سے ایک جملہ لکھنے کے بعد کہتے ہیں: یہ ایک نئی چیز ہے جو ہم کو معاویہ بن عمار کی کتاب میں ملی۔ اس کے بعد انہوں نے احکام حج وصلوٰۃ کے متعلق بعض احادیث ان سے اخذ کیں۔ اب کہتے ہیں: یہ بھی ایک نئی چیز ہے جو ہم نے احمد بن محمد ابو نصر بزنطی کی کتاب سے لی ہے۔ اسی طرح انہوں نے ابان بن تغلب، جمیل بن دراج، سیاری، بزنطی، حریز بن عبداللہ سجستانی، حسن بن محبوب سراد، عبداللہ بن بکیر اور دوسرے علماء کی کتابوں سے حدیثیں لی ہیں۔ ان کی عبارات سے اس امر کی صراحت ہوتی ہے کہ انہوں نے ان کتابوں سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں شہید کی ذکریٰ اور کفعمی کی مصباح سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان اصحاب ائمہؑ کی بعض کتابیں دونوں حضرات کے پاس بھی موجود تھیں۔ جیسا کہ حر عاملی نے وسائل کی قدیم اشاعت کی تیسری جلد کے چھٹے ضمیمہ میں لکھا ہے۔

مختصر یہ کہ جو بھی صورت رہی ہو، میں اس معاملہ میں اپنی تحقیق پیش نہیں کر رہا ہوں اور نہ وہ سب کچھ جمع کر رہا ہوں جو ان کتب میں جامعہ اہلبیتؑ اور اس کے شاگردوں کی تعداد یا ان نتائج کے بارے میں لکھا گیا ہے، جو اس جامعہ کی بدولت مختلف علمی میدانوں میں ظاہر ہوئے کیونکہ یہ ساری تفاصیل بیان کرنے کے لیے ایک کتاب کافی نہیں ہوسکتی۔

امام جعفر صادقؑ کے غالی اصحاب

غالباً سب سے سخت مشکل جو جامعہ اہلبیتؑ کو درپیش ہوئی وہ یہ کہ امام صادقؑ کے اصحاب میں چھپ چھپا کر بعض ایسے لوگ بھی داخل ہوگئے جو اسلام کی جڑیں کاٹنے اور اس کو مسخ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ہزاروں حدیثیں وضع کر کے ان احادیث میں داخل کر دیں جو آپ کے معتبر اصحاب نے آپ سے روایت کی تھیں۔ انھوں نے آپ سے ایسی ایسی باتیں اور ایسے ایسے نظریے منسوب کر دیے جو اصول اسلام اور اس کے

تصورات کے مطابق نہیں تھے۔ مثلاً انہوں نے آپ کی ذات کے بارے میں مبالغہ آمیزی کر کے آپ کو انسانی سطح سے بلند کر دکھایا اور آپ پر تمام الوہی صفات چسپاں کر دیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ لوگ عوام کے لیے آپ کے نمائندے اور داعی ہیں۔ ان میں سے بیشتر وہ موالی اور ایسے ہی اور لوگ تھے جو اسلام میں تخریب کاری اور گمراہی پھیلانے کے لیے اس میں داخل ہوئے تھے۔ بعض ان صاحبان اقتدار کی اغراض کی تکمیل کے لیے برسرِعمل تھے جن کو امام جعفر صادقؑ کے وجود، آپ کی شہرت اور آپ کی دینی سربراہی سے دلی تکلیف پہنچ رہی تھی کیونکہ ان کی سربراہی کے سامنے دوسری تمام سربلندیاں ہیچ تھیں۔ غالباً انہی لوگوں میں سے ایک وہب بن وہب المعروف ابوالبختری بھی تھا جس کے لیے حکام وقت نے اپنے سینے کھول دیے تھے اور اس کو محکمۂ انصاف کے اعلیٰ عہدے پر مقرر کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ حکام کی طلب کے مطابق حدیثیں گھڑتا اور امام صادقؑ پر جھوٹ باندھا کرتا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس مشکل سے نمٹنے کے لیے سخت موقف اختیار فرمایا اور مسلمانوں کے سامنے ایسے منحرف گروہوں اور افراد کی بے دینی کا اور ان سے اپنی علیحدگی کا اعلان فرما دیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: بخدا جو شخص ہم سے بغض رکھنے والا اور ہم سے برسرپیکار ہو وہ ہمارے لیے اس شخص سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے جو ہمارے متعلق ایسی بات کہنے والا ہے، جو ہم کو ناپسند ہو اور وہ ہم نے اس سے اپنے بارے میں بیان نہ کی ہو۔

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا: لوگ جھوٹ باندھ باندھ کر ہم پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ جب میں ان میں سے کسی سے حدیث بیان کرتا ہوں تو میرے پاس سے جانے سے پہلے ہی وہ اس کے ایسے معنی قرار دے لیتا ہے جو اس کی ظاہری ہیئت سے نہیں نکلتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ ہماری حدیثوں کے بیان سے وہ اجر حاصل کرنا نہیں چاہتے جو اللہ کے پاس ہے بلکہ وہ دنیا طلب کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک قوم کا رئیس بننا چاہتا ہے۔

آپ کے کسی صحابی نے کہا کہ اے فرزند رسولؐ! ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ: جب تم معرفت حاصل کر لو تو پھر جیسا چاہو ویسا عمل کرو۔ اس پر آپ نے فرمایا: میں نے یہ کہا ہے کہ جب تم معرفت حاصل کر لو تو عبادات میں سے جو عمل چاہو بجا لاؤ وہ قبول ہوگا۔

آپ فرمایا کرتے تھے: ہم اہلبیتؑ کے پیروکاروں میں شیطان پیہم کسی نہ کسی ایسے شخص کو داخل کرتا رہتا ہے، جو نہ ہم میں سے ہوتا ہے نہ ہمارے مذہب پر چلنے والوں میں سے ہے۔ جب وہ اس کو ایسے مرتبہ پر پہنچا دیتا ہے اور لوگ اس کی طرف نظر کرتے ہیں تو شیطان اس کو ہمارے خلاف جھوٹ بولنے پر ابھارتا ہے۔

آپ نے اپنے اصحاب کو نصیحت فرمائی: ہمارے نام سے راوی جو کچھ روایت کرتے ہیں اس کو جوں کا توں قبول نہ کیا کریں۔ پھر آپ نے اس کی صحت کو جانچنے کے لیے ایک قاعدہ مقرر فرمایا تاکہ لوگ اس سے کام لیا کریں۔ آپ نے فرمایا: ہمارے نام سے صرف اسی کو قبول کرو جو قرآن اور سنت کے مطابق ہو یا وہ بات کہ جس کی بابت ہماری پہلے کی حدیثوں سے ثبوت مل جائے۔

آپ نے ابو بصیر سے فرمایا: اے ابو محمد میں اس سے علٰحدگی ظاہر کرتا ہوں جو یہ سمجھتا ہے کہ ہم (ائمہؑ) رب ہیں یا یہ خیال کرتا ہو کہ ہم نبی ہیں۔ اس پر ابو بصیر نے عرض کیا: میں بھی اللہ کے سامنے ان سے علٰحدگی اختیار کرتا ہوں۔ پھر امامؑ نے فرمایا: جو یہ کہے کہ ہم (ائمہ) نبی ہیں اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

ان تخریب کاروں اور حکومتی گماشتوں میں یہ ایک ایسا گروہ ابھرا، جس کی تخریب اہلبیتؑ کی احادیث تک ہی محدود نہ تھی بلکہ انہوں نے جھوٹی حدیثوں میں کچھ ایسے فساد انگیز خیالات بھی بکھیر دیے، جو اسلام کے منافی اور شیعیت کے بنیادی اصولوں کے لیے بھی ایک ایسا خطرہ تھے کہ اگر امام جعفر صادقؑ اس گروہ سے برءت اور علٰحدگی کا طرز عمل اختیار نہ فرماتے تو وہ گروہ تشیع کی جڑیں کاٹ دیتا۔

امام جعفر صادقؑ ایسے لوگوں پر نگاہ رکھتے، ان کے کافرانہ نظریات کو ظاہر کرتے اور ان سے علٰحدگی کا اعلان فرماتے رہتے تھے۔ اس طرح آپ مسلمانوں کو ان سے اور انکی ریشہ دوانیوں سے خبردار کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے گمراہ کن افکار و خیالات تقریباً فنا ہو گئے اور قبل اس کے کہ وہ غلط نظریات روشنی پا کر لوگوں کے ذہنوں میں راہ پا لیتے، آپ کے بیانات سے ان کی حیثیت لوگوں پر واضح ہو گئی۔ پھر بھی بعض قدیم مصنفوں اور محدثوں نے ان لوگوں کو اسلام کے فرقوں میں سے ایک شیعہ فرقہ شمار کر لیا ہے۔ حالانکہ ائمۂ اہلبیتؑ اور شیعہ علمائے قدیم ترین زمانہ

سے ان کے کفر اور ان کے شیعیت اور اسلام سے خارج ہونے کا اعلان کرتے آئے ہیں۔ مزید یہ کہ ان کے خیالات کو اسلام اور شیعیت سے کینہ رکھنے والوں اور اس میں بگاڑ پیدا کرنے والوں کے علاوہ کسی نے بھی اختیار نہیں کیا۔

ان غلط نظریہ رکھنے والوں میں سے ایک محمد بن مقلاص عرف ابی خطاب اسدی ہے۔ جس کے بارے میں اسلامی مذاہب اور فرقوں کے عنوان پر لکھنے والوں نے بتلایا ہے کہ وہ موالی میں سے تھا۔ شہرستانی نے اس کا نام محمد بن زینب اسدی اجدع بتایا ہے۔ اس کو اس وجہ سے اجدع کہا جاتا تھا کہ وہ نکٹا تھا۔ مقریزی نے اس کی کنیت ابو ثور بتائی ہے لیکن اس کے نام اور کنیت کے بارے میں اور بھی اقوال ہیں۔ یہ شخص کوفہ میں ظاہر ہوا اور اس سے بعض فاسد خیالات منسوب ہیں۔ وہ شیعیت کے بھیس میں امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں داخل ہوا اور پھر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو امامؑ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے تھے، جن میں آپ کو نبوت اور پھر الوہیت سے نسبت دی جاتی اور اسی قسم کی اور باتیں بھی کہی جاتی تھیں جیسا کہ اسلامی مذاہب اور شیعہ فرقوں کے بارے میں لکھنے والے یعنی نوبختی وغیرہ کہتے ہیں۔ جب اس نکٹے محمد بن مقلاص کے غلط اقوال امام صادقؑ تک پہنچے تو اس بارے میں آپ نے ایک مضبوط موقف اختیار فرمایا اور مسلمانوں کو اس کے کذب و افتراء سے خبردار کیا۔ جیسے عیسٰی بن منصور بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو عبداللہ امام جعفر صادقؑ کو یہ کہتے سنا کہ: بار الٰہا! ابو الخطاب پر لعنت کر، کیونکہ اس نے میرے کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہونے کی حالت میں مجھے دھمکیاں دی ہیں۔ اے اللہ! اس کو تلوار کا مزا چکھا۔

عنبسہ بن مصعب سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ان سے فرمایا کہ: تم نے ابوخطاب کو کیا کہتے سنا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے اس کو یہ کہتے سنا ہے کہ: امام صادقؑ نے اپنا ہاتھ میرے سینہ پر رکھ کر فرمایا کہ اس بات کو بھولنا نہیں اور یاد رکھنا کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ پھر فرمایا کہ تم میرے علم کا ٹھکانہ اور ہمارے زندہ اور مردہ افراد کے لیے امین ہو۔ اس پر امام جعفر صادقؑ کھڑے ہو گئے اور بولے: بخدا کہ ایسا نہیں ہوا اور اس کے ہاتھ کے سوا میں نے اس کے جسم کے کسی حصے کو چھوا ہی نہیں۔ رہا اس کا یہ کہنا کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں تو اس خدا کی قسم کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، میں غیب نہیں جانتا

ہوں۔ بلکہ اگر میں نے ایسا کہا ہے تو خدا اس دنیا میں مجھے برکت نہ دے اور آخرت میں کوئی انعام نہ دے۔

مفضل بن یزید بیان کرتے ہیں کہ ابو عبداللہ امام جعفر صادقؑ نے مجھ سے ابوالخطاب اور دوسرے غالیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اے مفضل! نہ ان کے ساتھ اٹھو بیٹھو، نہ مصافحہ کرو، نہ کھاؤ پیو اور نہ کوئی لین دین کرو۔

سدیر صیرفی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ یعنی ائمہ اہلبیتؑ دراصل خدا ہیں اور آپ ہم لوگوں کو قرآن سے یہ پڑھ کر سناتے ہیں:

يَآ اَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۔

یعنی اے میرے پیغمبرو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو بے شک میں اس سے باخبر ہوں۔ (سورۂ مومنون۔ آیت ۵۱)

امامؑ نے فرمایا: اے سدیر! میرے کان، میری آنکھیں، میرے بال، میرا چہرہ، میرا گوشت اور میرا خون ان لوگوں سے بری ہے، نیز اللہ اور اس کا رسولؐ بھی ان سے بری ہیں۔ یہ لوگ میرے آباء کرامؑ کے دین پر نہیں ہیں۔ بخدا! جس دن اللہ مجھ کو اور ان کو یکجا حاضر کرے گا تو وہ ان پر غضبناک ہو گا۔ اسی قسم کے کچھ اور اقوال بھی ہیں جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہیں۔ چنانچہ اسلامی فرقوں کی بابت کتابیں لکھنے والوں کا بیان ہے کہ جب امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ نے یہ موقف اختیار فرمایا تو یہ نکٹا ابوخطاب اپنے خیالات کی ترویج میں ناکام ہو گیا۔ پھر وہ اپنے گمراہ اور تخریب کار ساتھیوں کو لے کر کوفہ میں حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ تب عیسیٰ بن موسیٰ نے اس کے مقابلہ کے لیے کچھ لوگوں کو بھیجا اور انہوں نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر کے صلیب پر لٹکا دیا تاکہ اس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔

اسلامی فرقوں کی بابت لکھی گئی کتابوں کے مطابق بزیع بن موسیٰ حائک بھی انہی غالیوں میں سے ہے جس سے فرقہ بزیعیہ منسوب ہے۔ وہ کفر اور الحاد کی طرف دعوت دیتا تھا۔ وہ نبوت کا دعویٰ کرتا اور کہتا تھا کہ جب میں آسمان پر گیا تو اللہ نے میرے سر پہ

ہاتھ پھیرا، اس لیے حکمت میرے سینے سے نکلتی ہے۔ اس کے بعض ساتھیوں نے کہا کہ وہ ابوالخطاب کے بعد امام ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو اس سے منسوب کی گئی ہیں۔ بعض مؤلفین نے اس فرقے کو خطابیہ فرقوں کی شاخوں میں شمار کیا ہے کیونکہ وہ سب کے سب امام جعفر صادقؑ کی الوہیت پر متفق ہیں۔ گو میں ان بہت سی باتوں میں شک کرتا ہوں جو ان لوگوں سے منسوب کی جاتی ہیں، تاہم مجھے ان کے اسلام سے منحرف ہو جانے میں کوئی شک نہیں ہے کیونکہ امام جعفر صادقؑ نے ان پر لعنت کی اور ان سے برائت کا اظہار فرمایا ہے۔ جیسا کہ راویوں کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا: بزیع، سرّی، بشار اشعری، حمزہ زیدی اور حائذ نہدی پر خدا کی لعنت ہو۔ نیز آپ نے فرمایا کہ: بنان، سری اور بزیع پر خدا لعنت کرتا ہے کیونکہ شیطان نے اپنے آپ کو انکی صورت میں ظاہر کیا ہے۔ وہ جھوٹا جو ہم پر جھوٹ باندھتا ہو یا ہمارے بارے میں غلط رائے رکھتا ہو، ہم اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ خدا ہم کو دروغ بافوں کے حملوں سے محفوظ رکھے اور ان کو تلوار کا مزہ چکھائے۔ اس کے علاوہ امامؑ نے مختلف علاقوں میں خطوط بھیجے اور وہاں کے لوگوں کو ان گمراہ افراد کے طور طریقوں اور ان کی ریشہ دوانیوں سے خبردار کیا جو یہ لوگ عوام کو بہکانے کے لیے اختیار کیا کرتے تھے۔

بشار شعیری بھی ایسے ہی افراد میں سے تھا جس نے کوفہ کو اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ وہ امام علیؑ کی شان میں غلو کرنے والا اور تعطیل و تناسخ کا قائل تھا۔ اس نے کوفہ میں شیعوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے اس شہر کو اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے منتخب کیا تھا لیکن امام جعفر صادقؑ اس کی ان گھناؤنی سرگرمیوں پر مسلسل نگاہ رکھتے تھے۔

چنانچہ مرازم بن حکیم ازدی مدائنی سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اے مرازم! یہودی دو میں ایک کو خدائے قادر کہتے تھے۔ نصاریٰ بھی تین میں ایک کو خدائے قادر مانتے تھے لیکن یہ بشار شعیری تو ایک بڑی ناروا بات کہتا ہے۔ پس جب تم کوفہ جاؤ تو اس کو میرا پیغام پہنچا دینا۔

مرازم کا بیان ہے کہ جب میں کوفہ پہنچا تو اپنا سامان سنگوا کر اس کے پاس گیا۔ میں نے لونڈی سے کہا، ابو اسماعیل کو بتاؤ کہ مرازم آیا ہے۔ پھر وہ باہر آیا

تو میں نے اس کو امام جعفر صادقؑ کا یہ پیغام دیا: اے نافرمان، اے کافر اور اے مشرک! میں تجھ سے بری ہوں۔ اس پر وہ کہنے لگا: کیا میرے آقا نے میرا نام لیا تھا؟ میں نے کہا: ہاں! انھوں نے تم کو انہی لفظوں کے ساتھ یاد کیا، جو میں نے تم سے کہے ہیں۔ اس نے کہا: جزاک اللہ! پھر وہ اس پیام کے پہنچانے پر میرا شکریہ ادا کرنے اور دعائیں دینے لگا۔

اسحاق بن عمار کہتے ہیں کہ امام ابوعبداللہ صادقؑ نے بشار شعیری سے فرمایا: تجھ پر خدا کی لعنت ہو، میرے پاس سے دور ہو جا۔ نہیں نہیں، قسم بخدا! میں اور تو ایک چھت کے نیچے جمع نہیں ہو سکتے۔ جب وہ نکل گیا تو امامؑ نے فرمایا: وائے ہو اس پر کہ اس نے وہی کہا جو یہود کہتے ہیں، نصاریٰ کہتے ہیں، مجوسی کہتے ہیں یا صابئی کہتے ہیں۔ بخدا کہ ان میں سے کسی نے اللہ کو اس قدر ناتواں کر کے پیش نہیں کیا، جیسا کہ اس شخص نے کیا ہے۔ یہ شیطان ہے اور شیطان کا بیٹا ہے۔ یہ سمندر سے اس لیے نکل آیا ہے کہ میرے اصحاب کو بہکائے۔ پس تم لوگ اس سے خبردار رہو اور جو حاضر ہے وہ غیر حاضر تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کیونکہ میں اللہ کا بندہ اور اللہ کے بندے کا بیٹا ہوں۔ میں ایک مدت صلبوں اور رحموں میں رہا ہوں۔ میں مروں گا اور حشر میں اٹھایا جاؤں گا پھر مجھ سے حساب کتاب لیا جائے گا۔ بخدا مجھ سے اس بارے میں بھی پوچھا جائے گا، جو یہ جھوٹا میرے بارے میں کہتا ہے۔ اللہ اس کو غم نصیب کرے، اس نے مجھ کو ایسا رنج پہنچایا اور بے چین کیا ہے کہ میری آنکھوں کی نیند اڑ گئی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے سری، حمزہ زیدی، حائد نہدی اور مغیرہ بن سعید کے ساتھ بھی بعینہٖ وہی موقف اختیار فرمایا جو بزیع حائک، بشار شعیری اور خطابیوں کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ آپ نے مسلمانوں کو ان کے دعووں کے جھوٹ اور ان کے مکر و فریب سے خبردار کیا۔ نیز آپ نے اپنی عام اور خاص مجلسوں میں ان پر لعنت کی۔ چونکہ ان لوگوں نے کوفہ کو اپنا مرکز بنا لیا تھا، اس لیے امام جعفر صادقؑ کے قاصد آپ کے خطوط لے کر وہاں آتے رہتے تھے جن میں آپ وہاں کے لوگوں کو ان گمراہ افراد سے الگ رہنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ نیز کوفہ یا اس کے قرب و جوار سے

جو بھی شخص آپ کی خدمت میں آتا، آپ اس کو ان کے جال میں پھنسنے سے خبردار کرتے اور ان کے باطل دعووں سے اظہار بیزاری فرماتے تھے۔

ان لوگوں میں مغیرہ بن سعید، فریب کاری، مغالطہ آفرینی اور شعبدہ بازی میں سب سے آگے تھا۔ جیسا کہ اشعری کی مقالات الاسلامیین میں ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس کے پاس اسم اعظم ہے جس سے وہ مردوں کو زندہ کر لیتا ہے۔ حالانکہ وہ عام سادہ لوح آدمیوں کے سامنے جادو اور شعبدہ بازی کے غیر معمولی کرتب دکھانے میں لگا رہتا تھا۔

تاریخ طبری میں ہے کہ: یہی مغیرہ بن سعید قبرستان میں جا کر گویا مُردوں سے باتیں کرتا اور قبروں پر ٹڈی کی مانند چھوٹا سا دکھائی دیتا تھا۔ مزید برآں وہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ پر کثرت سے جھوٹ باندھتا تھا۔

محمد بن عیسیٰ بن عبید کا بیان ہے کہ ہمارے ایک ساتھی نے میری موجودگی میں یونس بن عبدالرحمٰن سے کہا: اے ابو محمد کیا وجہ ہے کہ آپ حدیث بیان کرنے کے معاملہ میں اس قدر سخت ہیں اور جو روایات ہمارے ساتھی بیان کرتے ہیں ان کے بارے میں بھی آپ بڑے محتاط ہیں اور ان کو رد کرتے رہتے ہیں۔ اس پر یونس نے کہا: مجھ سے ہشام بن حکم نے بیان کیا ہے کہ امام ابو عبداللہ صادقؑ نے فرمایا: ہمارے متعلق صرف وہ حدیثیں قبول کیا کرو جو قرآن اور سنت سے مطابقت رکھتی ہوں اور تم کو ہماری پچھلی حدیثوں میں ان کی کوئی نظیر مل جائے۔ پس جان لو کہ مغیرہ بن سعید نے میرے والد بزرگوار کے اصحاب کی کتابوں میں چپکے سے کچھ ایسی احادیث بھی داخل کر دی ہیں جو انہوں نے بیان نہیں کی تھیں۔ ہاں تو اللہ سے ڈرو اور ہمارے متعلق کوئی ایسی بات قبول نہ کرو جو ہمارے رب کے قول یا ہمارے نبی کی سنت کے خلاف ہو۔ ایک دوسری روایت کے مطابق امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ: مغیرہ کے بعض ساتھی جو میرے والد بزرگوار کے اصحاب میں چھپے ہوئے تھے، وہ آپ کے اصحاب کی کتابیں لے کر مغیرہ کو دیتے تھے۔ پھر وہ ان میں کفر، الحاد اور زندقہ کی باتیں داخل کر دیتا اور ان کو میرے والد بزرگوار سے منسوب کر دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ وہی کتابیں اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دیتا تاکہ

ان کو شیعوں میں پھیلا دیں۔ پس غلو کی وہ باتیں جو میرے والد بزرگوار کے اصحاب کی کتابوں میں ہیں وہ وہی ہیں جو مغیرہ بن سعید نے داخل کر دی ہیں۔

مغیرہ بن سعید اور ایسے ہی دوسرے افراد کہ جنہوں نے سیکڑوں حدیثیں گھڑ گھڑ کر آپ سے اور آپ کے والد بزرگوار سے منسوب کیں اور ان میں آپ دونوں کو اللہ کے برابر قرار دیدیا تھا، امام جعفر صادقؑ نے لوگوں کو ان سے خبردار کرنے کے لیے فرمایا: خدا لعنت کرے مغیرہ بن سعید اور اس یہودن پر جس کے پاس جا کر وہ جادو ٹونے اور کرتب سیکھا کرتا تھا۔ چونکہ مغیرہ نے میرے والد بزرگوار پر جھوٹ باندھا تھا اس لیے اللہ نے اس کو ایمان سے محروم کر دیا۔ اسی طرح جن لوگوں نے مجھ پر جھوٹ باندھا اللہ نے ان کو تلوار کی کاٹ کا مزہ چکھایا۔ بخدا کہ ہم ائمۂ اہلبیتؑ خدا کے بندے ہیں۔ اس نے ہم کو پیدا کیا اور پھر اپنے لیے چن لیا۔ ہم اپنے نفع و نقصان پر قادر نہیں ہیں۔ اگر وہ ہم پر رحم فرمائے تو یہ اس کی رحمت ہے اور اگر وہ ہم کو عذاب دے تو یہ ہمارے کیے کا پھل ہوگا۔ بخدا! ہمارے پاس اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی عذر نہیں ہے اور نہ ہم ابھی سے مخلصی پائے ہوئے ہیں۔ بلکہ دوسروں کی طرح ہم بھی مریں گے، دفن ہونگے، اٹھائے جائیں گے، حاضر کیے جائیں گے اور پھر ہم سے بازپرس کی جائے گی۔ نہ جانے ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمیں خدا کہتے ہیں۔ اللہ ان پر لعنت کرے کہ ان لوگوں نے اپنے اس قول سے اللہ کو، اس کے رسولؐ کو، نیز امام علی مرتضیٰؑ، بی بی فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو اذیت پہنچائی ہے۔ دیکھو میں تمہارے سامنے ہوں، اپنے بستر پر سوتا ہوں تو خائف رہتا ہوں۔ آپ نے مزید فرمایا: میں ایک انسان ہوں اور رسول اللہؐ کی اولاد سے ہوں، تاہم مجھ کو اللہ کی طرف سے کوئی چھوٹ نہیں دی گئی۔ یعنی اگر میں اس کی اطاعت کروں گا تو وہ مجھ پر رحم فرمائے گا اور اس کی نافرمانی کرونگا تو وہ مجھ کو عذاب میں ڈالے گا۔

اسلامی فرقوں کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کے مطابق مغیرہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ مُردوں کو زندہ کر لیتا ہے۔ تاہم ابوبکر بن عیاش سے روایت ہے کہ جب خالد بن عبداللہ قسری نے اس کو اور اس کے پیروؤں کو پکڑا تو ان میں سے ایک شخص مارا گیا۔

تب قسری نے مغیرہ سے کہا: اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنے اس مردہ پیرو کو زندہ کرو۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ میں مردوں کو زندہ نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر خالد قسری نے اس کو قتل کر کے آگ میں جلا دیا۔

رجال کشی میں ہے کہ ابو منصور عجلی بھی ایک شعبدہ باز تھا جو کفر و الحاد کی تبلیغ کرتا تھا۔ وہ کوفہ میں تھا اور وہاں اپنی تعلیم کو پھیلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اہلبیتؑ سے محبت کا اظہار کرتا تھا کیونکہ وہ اس کو اپنی تحریک کی کامیابی تصور کرتا تھا۔ جب امام محمد باقرؑ کو اس کے بارے میں علم ہوا تو آپ نے اس پر لعنت کی اور اس سے اپنی برائت کا اظہار کیا۔ نیز آپ نے کوفہ میں اپنے اصحاب کو پیغام بھیجا کہ وہ اس شخص سے اور اس کے ماننے والوں سے خبردار رہیں۔ تاہم ابو منصور اپنی کفر و الحاد پر مبنی سرگرمیوں میں امام جعفر صادقؑ کے عہد تک مصروف رہا۔ چنانچہ آپ نے بھی عوام الناس کے سامنے اس سے اپنی برائت اور علیحدگی کا اظہار کیا اور ان کو اس سے کنارہ کش رہنے کا حکم دیا۔ آپ نے اہل کوفہ کے ایک گروہ کے سامنے اس پر لعنت کی اور اس کو شیطان کا چیلا کہا۔ بالآخر یوسف بن عمر نے اس کو قتل کیا اور سولی پر چڑھا دیا تاکہ دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔

چنانچہ اس کے قتل ہو جانے سے ایسے شعبدہ بازوں کا دور ختم ہو گیا، جو تفرقہ اور بے دینی پھیلانے میں کوشاں رہا کرتے تھے۔ اس طرح امام جعفر صادقؑ اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو گئے جو آپ نے ان لوگوں کا راستا روکنے اور ان کے برے آثار کو مٹانے کے لیے کی تھی کیونکہ قبل اس کے کہ ان لوگوں کی تحریک بڑھ کر ایک عظیم خطرہ بن جاتی، آپ اس کو ابتداء ہی میں ختم کر دینا چاہتے تھے تاکہ یہ افراد آنے والی نسلوں میں برائی کے ساتھ یاد کیے جائیں اور لوگ ان پر قیامت تک لعنت کی بوچھاڑ کرتے رہیں۔

یہ کہنا غلط ہے اور اس بات کا کوئی جواز نہیں ہے کہ ان لوگوں کی تحریک نے شیعہ حلقوں پر اثر ڈالا اور ان میں سے ہر ایک کے کچھ نہ کچھ پیرو پیدا ہوئے جن سے بعد میں کئی اور فرقے بن گئے۔ جیسا کہ نوبختی، شہرستانی اور وہ لوگ کہتے ہیں، جنہوں نے ان دونوں سے روایتیں لی ہیں۔ پھر وہ افراد کہ جنہوں نے اہل بیتؑ کی تعلیمات

کو مسخ کرنے کے لیے اس بات سے فائدہ اٹھایا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ان گمراہوں کے بارے میں اپنے اس بیان کو ختم کریں، جو یہ چاہتے تھے کہ اس طریقۂ تبلیغ کی راہ میں روڑے اٹکائیں جو امام محمد باقرؑ اور امام صادقؑ نے اختیار کیا تھا۔ ضروری ہے کہ ہم اس غلطی کی نشاندہی کر دیں جو پروفیسر محمد جابر عبدالعال کی کتاب "حرکات الشیعۃ المتطرفین" میں واقع ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے اور اہل بیتؑ سے تعصب رکھنے والے دوسرے مصنفین نے ان منحرف لوگوں کو شیعہ فرقوں میں شمار کر لیا ہے لیکن پروفیسر محمد جابر نے اپنی کتاب میں یہ بھی کہا ہے کہ جابر جعفی نے اس ملحدانہ تحریک کو قبول کر لیا تھا۔ چنانچہ مغیرہ کے ساتھیوں نے اسے وہی مرتبہ دیا جو ان کے نزدیک خود مغیرہ کے لیے تھا۔ حالانکہ ائمہ اہلبیتؑ یا شیعہ علماء نے کسی مرحلہ پر کوئی ایسی روایت بیان نہیں کی جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ جابر جعفی نے ائمہ کے بارے میں کوئی علٰحدہ رائے اختیار کی اور ان کو معبود کا درجہ دے دیا ہو۔ جبکہ یہ گمراہ افراد اور ان کے پیروکار اپنے نظریات میں مشرکوں سے بھی بدتر تھے اور وہ تمام انبیاءؑ اور ان کی تعلیمات کے خلاف برسرپیکار تھے۔ پھر ہم یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ خود امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے ان کے اور ان کے چیلے چانٹوں کے بارے میں کیا فرمایا ہے۔ پس یہ الزام جو جابر جعفی سے منسوب کیا گیا ہے، اس میں صحت کا معمولی سا شائبہ بھی نہیں ہے اور نہ معتبر کتابوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ پھر ان لوگوں کے نزدیک جابر جعفی میں کوئی نقص بھی نہ تھا، سوائے اس کے کہ وہ اہلبیتؑ سے بہ کثرت احادیث روایت کرتے تھے۔ تاہم سب سنی محدثین بھی جابر جعفی کی دیانت پر متفق نہیں تھے۔

تہذیب التہذیب ابن حجر میں ہے کہ ابن مہدی نے ان کے متعلق کہا "میں نے حدیث کے معاملہ میں جابر جعفی سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ شعبہ سے ابن علیہ اور یحیٰی بن بکیر نے روایت کی ہے کہ جب جابر یہ کہیں کہ ہم سے بیان کیا اور ہم نے سنا تو وہ سب آدمیوں سے زیادہ قابل اعتبار ہیں۔ وکیع کا قول ہے کہ تم کسی پہ کتنا ہی شک کرو لیکن جابر کے بارے میں کبھی شک نہ کرنا کیونکہ وہ صاحب اعتماد ہے۔ ابن عبدالحکیم نے بیان کیا ہے کہ میں نے شافعی کو یہ کہتے سنا ہے کہ سفیان ثوری نے شعبہ سے کہا کہ اگر تم جابر کے

متعلق کوئی بات کہوں تو پھر تمہارے بارے میں بھی کہوں گا۔ اسی طرح کی اور بھی شہادتیں ہیں جو اشارہ کرتی ہیں کہ وہ ہرگز ان شعبدہ بازوں اور گمراہ کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔

اس کے برعکس سنی محدثوں کی ایک جماعت نے جابر جعفی کو ضعیف قرار دیا اور ان پر جھوٹ اور ہیر پھیر کرنے کی تہمت لگائی۔ سنی علماء اور محدثین کے نزدیک ان کے ضعیف اور جھوٹا ہونے کا سب سے نمایاں سبب ان کی اہلبیتؑ سے وابستگی، ان کے فضائل نقل کرنا اور ان کی احادیث کی روایت کرنا ہے۔ جیسا کہ مطالعہ کرنے والے کو ان کتابوں سے معلوم ہو جائے گا، جن میں انہوں نے راویوں کے حالات پر بحث کی ہے۔ البتہ جب ہم ان پر سے ان بدعقیدہ اور گمراہ ٹولے کی راہ پر چلنے کی تہمت کو دور کرتے ہیں تو ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ ائمہؑ کے اصحاب اور ان سے احادیث روایت کرنے والوں کے اعلیٰ طبقہ میں شامل ہیں اور ان کی روایت کی ہوئی احادیث تنقید اور اعتراض سے بالاتر ہیں۔ سردست ہم ان پر سے وہ الزامات ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں جو پروفیسر محمد جابر وغیرہ نے ان پر عائد کیے ہیں۔ نیز اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عجلی، سرّی، مغیرہ، بشار اور خطابی جیسے گم گشتہ راہ افراد جو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں داخل ہو گئے تھے۔ ان لوگوں سے جو باتیں منسوب کی جاتی ہیں ——— اگر وہ صحیح ہیں تو وہ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر ٹھہرتے ہیں بلکہ امام جعفر صادقؑ نے تو ان کو کافر قرار دیا، ان پر لعنت کی اور ان سے بار بار اظہار بیزاری کیا تھا۔ مزید برآں وہ لوگ اسلام کے اصول و مبادیات کی تخریب کے لیے جو طریقے اختیار کرتے تھے امامؑ ان کی مذمت فرماتے رہے۔ ان لوگوں کی کرتوت یہ ہیں کہ انھوں نے ائمہؑ کے اصحاب میں داخل ہو کر ہزارہا حدیثیں بنا ڈالیں اور ان کو امام باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہوئی احادیث میں شامل کر دیا اور ان میں سے بعض کی سندوں کو ان کے معتبر اصحاب سے منسوب کر دیا۔ پھر انہی معتبر سندوں کو دیکھتے ہوئے راویوں نے بغیر چھان بین کیے انکو نقل کر لیا۔ پھر ائمہؑ نے صحیح و غیر صحیح حدیث کی جانچ کیلئے کچھ قواعد وضع کیے اور انکی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ شیعہ علماً نے روایتوں کی چھان بین کے معاملہ میں ان کے متن اور سندوں کے لحاظ سے اپنی کوششوں کو چند در چند کر دیا اور اصل حدیثوں کو محفوظ رکھنے کے لیے حدیث کی چار قسمیں قرار دیدیں۔

مختصر یہ کہ وہ جامعۂ اہلبیتؑ جس کو امام محمد باقرؑ نے قائم کیا تھا اور آپ کے بعد امام جعفر صادقؑ نے اس کو تیس سال سے زیادہ عرصے تک باقی رکھا، جہاں ہر علاقے اور مقام سے وسیوں علماء اور طالبان علم آیا کرتے تھے، اس نے اسلام کی فقہ اور شرعی دلائل کی تاریخ میں اپنا نہایت پاکیزہ اور گہرا اثر چھوڑا۔ چنانچہ حنفی مذہب کے امام ابو حنیفہ نعمان نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر وہ دو سال[1] نہ رہے ہوتے تو نعمان برباد ہو جاتا" اسی طرح ایک دوسرے امام مالک بن انس بھی ایک زمانہ تک اس جامعہ سے وابستہ رہے۔ جیسا کہ ان کے حالات پر مشتمل کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس جامعہ کا دائرہ عمل صرف اسلامی فقہ کے مطالعہ اور شرعی دلیلوں تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ جب اسلامی دائرہ فکر ان موضوعات سے آگے بڑھا اور پھر مسلمان دوسری قوموں اور ان کے تمدن کے مقابل گئے تو اسلامی اصول اس میں مددگار ثابت ہوئے۔ البتہ اسلامی اور غیر اسلامی تہذیبوں کے اس ٹکراؤ میں ان اسلامی اصولوں سے انحراف کی صورتیں بھی پیدا ہو گئیں۔ وہ اصول جو قرآن نے مقرر کیے تھے اور سنت نے ان کی تائید کی تھی، ان کے بارے میں متعدد رائیں سامنے آنے لگیں۔ جن سے فرعی موضوعات میں بھی متعدد رائیں پیدا ہو گئیں۔ پھر ہر فریق اپنے طرز عمل کے حق میں قرآن کے ظاہری الفاظ اور ایسے اقوال سے استدلال کرنے لگا کہ جو جھوٹوں پر جھوٹ رسول اللہؐ سے منسوب کر دیے گئے تھے۔ اس تصادم نے جو ان موضوعات پر جاری تھا شدید مخالفتوں کی شکل اختیار کر لی اور بالآخر متعدد فرقے اور مذاہب وجود میں آ گئے۔ اس طرح اسلام کے اندر وہ وسیع انتشار رونما ہوا جس کا مسلمانوں کے ماضی اور مستقبل پر ایسا برا اثر پڑا کہ جس کے نتائج سے وہ آج تک بھی دوچار ہیں۔

ائمہ اہلبیتؑ ان مناظرے کرنے والوں اور ان کے خیالات، تصورات اور اعتقادات کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اصحاب اور شاگردوں کو ان سے مقابلہ اور مناظرہ کرنے کی ہمت دلائی اور ان کو دفاع کے طریقوں اور براہین کی تعلیم و تربیت دے کر ان کی مدد فرمائی۔ مثلاً ایک روایت میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے عبد الرحمٰن بن حجاج بجلی سے فرمایا: تم ان غلط تصورات کے حاملوں اور اہل بدعت سے مناظرہ کیا کرو کیونکہ

[1] یہ وہی دو سال ہیں جو انھوں نے جامعۂ اہلبیتؑ میں گزارے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ یہ لوگ میرے تم ایسے شیعہ کو دیکھیں۔

حمزہ طیار نے آپ سے عرض کیا: مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ دوسرے لوگوں سے مقابلہ اور مناظرہ کرنے کو ناپسند فرماتے ہیں۔ تب آپ نے فرمایا: تمہاری بلند گفتگو نیچی گفتگو سے بہتر ہوتی ہے اور نیچی گفتگو بلند گفتگو سے بہتر ہوتی ہے۔ میں ایسی گفتگو میں مناظرہ کو ناپسند نہیں کرتا ہوں۔

آپ کی اس طرف توجہ کا یہ عالم ہو گیا کہ آپ خود مناظرہ کی مجالس منعقد کرنے لگے۔ جن میں اہل خلاف اور زندیقوں سے مناظرہ کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ چنانچہ کشی بیان کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے چند اصحاب کہ جن میں جمیل بن دراج، عبدالرحمن بن حجاج اور کچھ دوسرے افراد شامل تھے، جبکہ ان کی تعداد پندرہ یا اس سے زیادہ تک پہنچتی تھی، انہوں نے ہشام بن حکم سے گزارش کی کہ وہ ہشام بن سالم سے توحید اور صفات باری تعالیٰ پر مناظرہ کریں۔ یہاں آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ یہ دونوں امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں فقہ، کلام اور فلسفہ وغیرہ میں نمایاں تھے۔ چنانچہ اس مقصد سے ایک مجلس منعقد کی گئی اور اس میں ان تمام مفروضہ نکات پر بحث و گفتگو کی گئی، جو ان کے اور ان سے مقابلہ کرنے والے زندیقوں اور منحرفین کے درمیان موضوع بحث و گفتگو بن سکتے تھے۔

اسی طرح ابو عمر کشی نے اپنی کتاب رجال میں بیان کیا ہے کہ ایک شامی کہ جو امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں باریاب ہوا جبکہ آپ کے چند اصحاب بھی وہاں موجود تھے وہ آپ سے یوں مخاطب ہوا: مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ سے جو کچھ پوچھا جائے وہ آپ کے علم میں ہوتا ہے۔ اسی بنا پر میں آپ سے مناظرہ کرنے آیا ہوں۔ امامؑ کی صحبت میں اس وقت حمران بن اعین، ابان بن تغلب، مومن طاق اور ہشام بن حکم وغیرہ موجود تھے۔ تب ان حضرات نے اس سے بعض موضوعات پر مناظرہ کیا۔ یہاں تک کہ اس شامی کی مقاومت ختم ہو گئی اور وہ ششدر رہ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے غلط تصورات ترک کر دیے اور ایک طویل عرصہ تک ہشام بن حکم کی صحبت میں رہ کر جو کچھ چاہتا تھا حاصل کرتا رہا۔

ائمہ کرامؑ اور ان کے اصحاب بدعتیوں، زندیقوں اور غالیوں سے منطق اور

دلیل کے ساتھ بحث کرتے اور اسلامی عقیدوں اور دینی اصولوں کی حفاظت کرتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے نانا رسول اللہؐ کے دین محکم کو غالیوں اور شعبدہ بازوں کے داخل کیے ہوئے تصورات سے پاک کر دیتے تھے۔ چنانچہ ابن ندیم، نجاشی اور کشی کے بیان کے مطابق ہشام بن حکم نے زندیقوں اور ملحدوں کی ردّ میں ایک کتاب لکھی۔ اس نے کچھ اور کتابیں امامت، جبر و اختیار اور ثنویت پر بھی لکھیں۔ ان کے علاوہ ارسطو اور دوسرے ہندی اور یونانی فلسفیوں کے نظریات کی تغلیط نیز مذہب اہلبیتؑ کے مطابق فقہ اور اصول فقہ پر بھی کئی کتابیں تالیف کی تھیں۔

اسی طرح زرارہ بن اعین نے جبر و اختیار وغیرہ کئی موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ پھر محمد بن عمیر کہ جو امام موسیٰؑ بن جعفرؑ اور امام ابوالحسن علی رضاؑ کے شاگردوں میں تھے اور غالباً امام ابوجعفر محمد تقیؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھے۔ انہوں نے توحید اور امامت کے بارے میں بہترین کتابیں تالیف کیں۔ نیز یعقوب بن اسحٰق ابن سکیت نے ایک کتاب منطق پر، ایک کتاب الفاظ اور ان کی اضداد پر اور ایک کتاب الفاظ کے متعدد مشترک معانی پر لکھی۔ خلیفہ متوکل عباسی نے انہی ابن سکیت کو اپنے لڑکوں کی تعلیم کیلئے مقرر کیا تھا۔ ایک روز وہ آپ سے کہنے لگا: تم کو میرے یہ دونوں بیٹے معتز اور مویّد زیادہ محبوب ہیں یا امام علیؑ کے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ؟ انہوں نے جواب دیا: مجھ کو تو حسنؑ اور حسینؑ کا خدمتگار قنبر بھی تجھ سے اور تیرے دونوں بیٹوں سے زیادہ محبوب ہے۔ اس پر متوکل نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا اور انہوں نے ابن سکیت کی زبان کاٹ پھینکی۔ چنانچہ وہ اسی وقت جاں بحق ہو گئے۔

ابان بن عثمان نے تخلیق اور قیامت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی۔ اسی طرح محمد بن نعمان بجلی عرف مومن طاق نے امامت، معرفت، وصیت اور امر و نواہی کے ساتھ ساتھ ایک کتاب مناظروں پر لکھی، جس میں انہوں نے ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ اپنے مناظروں کی تفصیل رقم کی ہے۔ وہ ان سے خوب بحث کرتے تھے اور اپنے استدلال میں بڑے مضبوط تھے۔ امام جعفر صادقؑ کے انتقال کے بعد ابوحنیفہ نے ان سے مذاق میں کہا: تمہارے امام تو مر گئے۔ انہوں نے جواب دیا: لیکن تمہارا امام یوم قیامت تک انتظار کرنے والوں میں ہے۔

مختصر یہ کہ ائمۂ اہلبیتؑ کے اصحاب اور ان کے شاگردوں نے اپنے پیچھے ایسی بہت سی کتابیں چھوڑیں، جیسا کہ ہم جامعہ اہلبیتؑ اور مفادات اسلام کے لیے اُن کی خدمات کے ذیل میں اشارہ کر چکے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ اور خلیفہ منصور

امویوں کے عہد میں امام جعفر صادقؑ کے ساتھ منصور کے تعلقات بہت مضبوط تھے۔ جیسا کہ روایات میں آیا ہے وہ آپ کی صحبت میں بیٹھتا اور آپ کی گفتگو سنتا رہتا تھا۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امویوں کے زوال کے بعد جب اقتدار اس کو ملا تو اس نے آپ کو بلایا اور اپنے بیٹے مہدی کو بھی وہیں بلوالیا، پھر آپ سے کہا: اے ابو عبداللہ! آپ نے صلۂ رحم کے بارے میں ایک حدیث مجھ سے بیان کی تھی۔ اب آپ اسکو دوبارہ بیان فرمادیجیے تاکہ مہدی بھی اس کو سن لے۔ امامؑ نے فرمایا: مجھ سے میرے والد بزرگوار نے، ان سے ان کے والد ماجد نے، ان سے ان کے دادا نے اور ان سے امام علیؑ نے بیان کیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: "جو شخص فرابنداری کا لحاظ رکھے گا، اگر اس کی عمر کے تین سال باقی ہونگے تو اللہ انکو بڑھا کر تیس سال کر دیگا، لیکن جو قطع رحم کریگا اللہ اسکی عمر تیس سے گھٹا کر تین سال کر دیگا اس کے بعد آپ نے اللہ کے اس قول کی تلاوت فرمائی: "اللہ جو چاہتا ہے مٹا ڈالتا ہے، پھر جو چاہتا ہے لکھ دیتا ہے اور اصل کتاب تو اس کے پاس ہے۔" (سورۂ رعد-آیت ۳۹)

اس پر منصور نے کہا: یہ بھی نہایت اچھی بات ہے لیکن اے ابو عبداللہ! میرا کہنا اس کے لیے نہیں تھا۔ تب امامؑ نے فرمایا: مجھ سے میرے والد بزرگوار نے، ان سے ان کے والد ماجد نے، ان سے ان کے دادا نے اور ان سے امام علیؑ نے بیان کیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: "صلۂ رحم یعنی قرابتداری کا لحاظ کرنے سے عمریں بڑھتی ہیں اور گھر آباد ہوتے ہیں، خواہ ان کے ساکنان نیک نہ بھی ہوں۔"

منصور نے کہا: یہ بھی بڑی اچھی ہے، لیکن میرا مطلب ایک اور حدیث سے تھا۔ پس امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ نے فرمایا: مجھ سے میرے والد بزرگوار نے، ان سے ان کے والد ماجد نے، ان سے ان کے دادا نے اور ان سے امام علیؑ نے بیان کیا کہ رسول اللہؐ

فرمایا کرتے تھے کہ: صلۂ رحم حشر کے حساب کو آسان کر دیتا ہے۔ اس پر منصور بولا: ہاں! میری مراد اسی سے تھی۔

ان روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ منصور، امامؑ سے اپنی قرابت کا لحاظ رکھتا اور آپ کے ارشادات کو توجہ سے سنتا تھا۔ نیز آپ کے ساتھ اس کے برتاؤ میں کوئی بے مروتی اور سختی نہیں تھی، لیکن جب دنیا اس کے دل و نگاہ کا مرکز بن گئی اور اس کے دشمن امویوں کا دور ختم ہو گیا تو وہ انہی علویوں کی طرف سے خائف رہنے لگا کہ کل تک جن کے حقوق وہ خود طلب کرتا اور لوگوں کو ان کے نام پر امویوں سے جنگ کرنے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ چنانچہ جب اقتدار اس کو مل گیا تو اس کو ان کے علاوہ کسی اور کا دھڑکا نہ تھا۔ بلکہ وہ یہ خیال کرتا تھا کہ امام جعفر صادقؑ کا وجود اس کے لیے، اس کے تخت شاہی کے لیے اور اس کے پورے گھرانے کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے بارہا کوشش کی کہ وہ ان کو خاموشی سے قتل کرادے، لیکن مشیت الٰہی اس کے ارادہ میں حائل رہی۔

خلیفہ منصور کے ذاتی محافظ ربیع سے روایت ہے کہ جب خلافت منصور کو ملی اور اس کے حالات سازگار ہو گئے تو اس نے مجھ سے کہا: اے ربیع! امام جعفرؑ بن محمدؑ کو میرے پاس بلوا دو۔ چنانچہ میں نے ان کے ہاں جا کر کہا: اے ابو عبداللہ! چلیے کہ امیرالمومنین نے آپ کو بلوایا ہے۔ تب آپ میرے ساتھ چل دیے، یہاں تک کہ ہم دونوں منصور کے محل کے دروازے پر آپہنچے، امام جعفر صادقؑ اس وقت زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے کہ جس کو میں سمجھ نہیں سکا۔ پھر آپ منصور کے پاس پہنچ گئے اور آپ نے اس کو سلام کیا۔ اس نے آپ کے سلام کا جواب نہ دیا اور امامؑ کی جانب اپنا سر اٹھا کر کہنے لگا: اے جعفرؑ! وہ آپ ہی ہیں جو عوام کو اکساتے اور میرے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتے ہیں۔ آپ اس پر بہت ناراض ہوئے اور وہاں سے چلنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ تب اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے کہا: اے ابو عبداللہ! بیٹھ جائیے۔ پھر عطر منگا کر اپنے ہاتھ سے آپ کے سر و چہرہ پر لگانے لگا۔ جبکہ عطر اس کی انگلیوں پر سے ٹپکا پڑتا تھا۔ اس کے بعد اس نے آپ سے معذرت کی اور بولا: اے ابو عبداللہ! آپ چاہیں تو چلے جائیے۔ اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ حکم بھی دیا کہ میں اب آپ کو دی جانے والی رقم دگنی کردوں۔

ربیع مزید کہتا ہے کہ میں ابو عبداللہؑ کے ساتھ ہی باہر آگیا۔ تب میں نے آپ سے کہا: اے فرزند رسولؐ! جو میں نے دیکھا، آپ نے نہیں دیکھا اور جو میں نے سنا آپ نے نہیں سنا۔ آپ جب اس کے پاس آئے تھے تو وہ آپ پر جلا بھنا جا رہا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ آپ اس کے پاس جاتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو حرکت دے رہے تھے۔ پس پھر آپ کے ساتھ اس کا طرز عمل کتنی جلدی بدل گیا۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: مجھ کو میرے والد بزرگوار نے، ان کو ان کے والد ماجد نے، ان کو ان کے دادا نے اور ان کو نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جب کوئی معاملہ مجھ کو پریشان کرتا تو میں دعاء فرج کے ذریعہ سے دعا مانگتا۔ تب اللہ تعالیٰ میری اس پریشانی کو دور کر دیتا تھا۔ چنانچہ جب منصور نے مجھ کو بلوایا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میرے ساتھ برا سلوک کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے لیکن اسی دعائے فرج کی برکت سے اللہ نے مجھ کو اس کے شر سے محفوظ رکھا ہے۔

ایک اور موقع پر ربیع نے بیان کیا کہ منصور نے ایک شخص کے ذریعے امام جعفر صادقؑ کو بلوایا، کیونکہ اس کو آپ کے متعلق کوئی خبر پہنچی تھی۔ جب آپ منصور کے دروازہ کے قریب آئے تو دربان نے آپ کے پاس آکر کہا: اے ابو عبداللہؑ! میں آپ کے لیے اس جابر شخص سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ یہ شخص آپ کو سخت نقصان پہنچانے کے درپئے ہے۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: میرے اوپر اللہ کی طرف سے ایک ایسی ڈھال رکھی ہوئی ہے جو انشاء اللہ مجھ کو اس کے مقابلہ میں مدد پہنچائے گی۔ تم میرے لیے اس سے ملنے کی اجازت لے لو۔ پس جب اس نے آپ کو اجازت دی اور امامؑ اندر تشریف لے گئے تو منصور نے آپ سے کہا: اے جعفرؑ! آپ کو یقیناً معلوم ہوگا کہ رسول اللہؐ نے آپ کے جدامجد امام علی بن ابی طالبؑ سے فرمایا تھا کہ اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تمہارے بارے میں لوگ وہی نہ کہنے لگیں، جو عیسائی مسیحؑ کے حق میں کہتے ہیں تو میں تمہارے متعلق وہ بات کہتا کہ جب تم لوگوں کے کسی گروہ کے پاس سے گزرتے تو وہ تمہارے پیروں کے نیچے کی مٹی اٹھا لیا کرتے۔ تب امام علیؑ نے فرمایا: میرے معاملہ میں دو طرح کے افراد ہلاک ہوں گے، جبکہ انہوں نے میری کوئی ذاتی خطا نہ کی ہوگی۔ ایک میرے متعلق مبالغہ کرنے والا دوست اور دوسرا میری بابت کمی کرنے والا دشمن۔ یہ بات انہوں نے اس

یہ کہی تھی کہ ان کے دوست اور دشمن ان کے متعلق جو کچھ بھی کہتے تھے، آپ اس پر راضی نہ تھے۔ اسی طرح آپ کو بھی معلوم ہے کہ آپ کے متعلق کیا کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حجاز کے کم عقل اور کمینے لوگ کہتے ہیں کہ آپ زمانہ کے بڑے عالم، خدا کی حجت، اس کے ترجمان اور اس کے علم کا خزانہ ہیں۔ پس فرمایئے کہ سب سے پہلے جس نے حق کی آواز بلند کی وہ آپ کے نانا محمد رسول اللہؐ تھے اور جس نے سب سے پہلے اس کی تصدیق کی وہ آپ کے دادا امام علیؑ تھے۔ پس آپ ہی اس کے سزاوار ہیں کہ ان کے قدم بہ قدم چلیں اور ان کے راستا پر گامزن ہوں۔

تب امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: میں اسی شجرِ طیبہ کی ایک شاخ ہوں منصور بولا: میں ایک ایسے سمندر میں پھنسا ہوں کہ جس کے کنارے کی خبر ہے نہ گہرائی کا اندازہ! پس یہی وہ ہڈی ہے جو خلیفاؤں کے گلے میں پھنسی رہتی ہے کہ وہ اس کو نکالیں تو بھی مریں اور اس کو توڑیں تو بھی مریں۔ اگر میں اور وہ اسی شجر سے نہ ہوتے کہ جس کی جڑ پاک، شاخ طویل اور پھل میٹھا ہے۔ تو میں اس کے ساتھ وہی سلوک کرتا کہ جس کا نتیجہ قابل ستائش نہ ہوتا کیونکہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ ہماری طرف سے بہت بددل ہیں اور ہم کو برا کہتے ہیں۔ امامؑ نے اس بات کا اس طرح انکار فرمایا، گویا معذرت کر رہے ہوں۔ منصور آپ سے پھر مخاطب ہوا اور بولا: اے ابو عبد اللہ! آپ نے اپنی سچائی ظاہر فرما دی ہے۔ اب آپ مجھ کو ایسی بات بتلایئے کہ جس سے میں فائدہ اٹھا سکوں اور وہ مجھ کو خطروں سے بچائے رکھے۔ تب امامؑ نے فرمایا: تم کو چاہیے کہ بردباری اختیار کرو کیونکہ وہ علم کا رکن ہے۔ قدرت حاصل ہونے پر اپنے نفس کو قابو میں رکھو، کیونکہ اگر تم وہ کام کرو گے جس پر تم کو قدرت ہو تو تم اس شخص کی مانند ہو گے جو غصے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ دلی کینہ کے کہنے پر چلتا ہے اور اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا ذکر ہیبت کے ساتھ کیا جائے۔ یاد رکھو اگر تم مستحق کو سزا دو گے تو تم عدل سے منصف کیے جاؤ گے۔ وہ حالت جس میں شکر کرنے کا موقع ہو، اس حالت سے بہتر ہے جس میں صبر کرنا پڑے۔ اس پر منصور نے کہا: آپ نے یقیناً بہت اچھی نصیحت فرمائی اور آپ نے جو کچھ کہا بڑے اختصار کے ساتھ کہا۔

تذکرۃ الخواص سبط ابن جوزی میں ہے کہ ۱۴۴ھ میں اپنے سفر حج کے دوران

منصور جب مدینہ آیا تو اس نے فضل بن ربیع سے کہا: کسی ایسے شخص کو بھیجو جو امام جعفرؑ بن محمدؑ کو گھسیٹ کر میرے پاس لائے۔ اگر آج میں ان کو قتل نہ کر دوں تو اللہ مجھ کو ہلاک کر دے۔ فضل کہتا ہے کہ میں نے اس بات کو اس خیال سے ٹال دیا کہ شائد منصور اسے بھول جائے اور حالت سکون پر لوٹ آئے لیکن اس نے دوبارہ، سہ بارہ آپ کو بلانے کا حکم دیا۔ پس اب میرے لیے آپ کو بلوانے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ رہا، اس لیے میں نے آپ کو بلا بھیجا۔ جب آپ تشریف لائے تو میں نے عرض کیا: اے ابو عبداللہؑ! منصور نے آپ کو ایک عظیم معاملہ کے لیے بلوایا ہے۔ میرے خیال میں آپ اس کے ہاتھ سے بچ نہیں سکتے۔ امامؑ نے فرمایا: لاحول ولا قوۃ الّا باللہ العلی العظیم! پھر آپ منصور کے پاس گئے اور اس کو سلام کیا لیکن اس نے سلام کا جواب نہیں دیا اور کہنے لگا: اہل عراق نے آپ کو اپنا امام مان لیا ہے۔ وہ آپ کو زکات اور دیگر واجبات بھیجتے رہتے ہیں جس سے آپ لشکر تیار کرتے ہیں اور میرے اقتدار میں رخنہ ڈال رہے ہیں۔ پس اگر آج میں آپ کو قتل نہ کر دوں تو اللہ مجھ کو ہلاک کر دے۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: اے امیرالمومنین! حضرت سلیمانؑ کو ملک عطا ہوا تو انھوں نے شکر ادا کیا۔ حضرت ایوبؑ مصائب میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے صبر فرمایا اور حضرت یوسفؑ کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا تو انھوں نے درگزر فرمایا۔ اب آپ ان میں سے جس کی بھی تاسی کرنا چاہیں کر لیں۔

خلیفہ کے غصہ اور کینہ کی اس شدت میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے امامؑ کے سامنے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا کہ آپ سکون اور نرمی کا یہ رویہ اختیار فرمائیں کیونکہ اس خاص صورتِ حال میں ——— یہی طریقہ زیادہ مؤثر ہو سکتا تھا۔

امامؑ یہ چاہتے تھے کہ اس کے غصہ کو بڑھنے نہ دیں۔ چنانچہ آپ نے جو کچھ فرمایا اس کا مقصود یہ تھا کہ اللہ اپنے بندوں پر نعمت نازل کرے تو وہ ان کے شکریے کا سزاوار ہوتا ہے، جیسے حضرت سلیمانؑ نے اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اب تم کو بھی اللہ کی نعمتیں چہار طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ پس نیک کردار افراد کو صرف گمان اور تہمت کی بنا پر تمہارا یہ ایذا دینا اللہ کی نعمتوں کی نا قدری اور ان کا انکار کرنا ہے۔ اگر تم مجھ کو اپنے لیے مصیبت کا باعث سمجھتے ہو تو تم کو اس پر اسی طرح صبر کرنا چاہیے جس طرح سخت ترین

مصائب میں حضرت ایوبؑ نے صبر سے کام لیا تھا تاکہ تم بھی صابرین جیسا اجر حاصل کرو۔ پھر اگر تم مجھ کو اپنے حق میں ظالم خیال کرتے ہو تو بھی حضرت یوسفؑ کی طرح درگزر کرو جس طرح انہوں نے ظلم کرنے والوں سے درگزر فرمایا تھا۔ ایسا کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ نیک عمل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

امامؑ کے اس جواب نے منصور کے دل پر گہرا اثر کیا۔ اس نے تھوڑی دیر کے لیے سر جھکا لیا اور پھر امامؑ سے مخاطب ہوا لیکن اب اس کا چہرہ ویسا نہ تھا کہ جس سے اس نے پہلے آپ سے نظر ملائی تھی۔ اب اس نے اپنا چہرہ آپ کے قریب کیا۔ آپ کی ریش مبارک پر عطر ملا اور معذرت خواہ ہوا۔ جیسا کہ روایت میں ہے، پھر اس نے فضل بن ربیع سے کہا: ابو عبد اللہ کی خدمت میں ایک بہت بڑی رقم پیش کرو اور ان کے ساتھ قصر کے باہر تک جاکر ان کو رخصت کر آؤ۔

چنانچہ امامؑ اپنے مکان پر واپس آگئے جبکہ اللہ کی عنایت ان ظالموں کے شر سے آپ کی حفاظت کیے رہی جن پر آپ کا وجود مسعود گراں گزرتا تھا۔ جس طرح بنی امیہ کے سرکش فرمانرواؤں کے لیے آپ کے آباء کرامؑ کا وجود گراں گزرتا تھا ۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ اہل بیت اطہارؑ اپنے تمام اقوال و افعال میں حق، نیکی، عدالت اور حسنِ عمل کا نمونہ تھے جبکہ وہ لوگ اپنے طرزِ عمل میں ظلم، سرکشی اور باطل پرستی کا مجسمہ تھے۔

ایک اور موقع پر منصور نے محمد بن ربیع کو آپ کی خدمت میں یہ حکم دے کر بھیجا کہ امامؑ جس حالت میں بھی ہوں ان کو یہاں لے آؤ۔ چنانچہ محمد بن ربیع بیان کرتا ہے کہ میں آپ کے گھر گیا تو میں نے عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ امیر المومنین کے پاس چلیے۔ یہ بات سن کر آپ نے فرمایا: مجھے کپڑے بدل لینے دو۔ میں نے کہا میں آپ کو ایسا نہ کرنے دوں گا کیونکہ مجھ کو یہ حکم ملا ہے کہ آپ جس حالت میں بھی ہوں، آپ کو یہاں سے لے جاؤں۔ چنانچہ میں نے آپ کو اسی حالت میں لے جاکر منصور کے پاس پہنچا دیا۔ وہ جو آپ سے جلا بھنا بیٹھا تھا، جیسے ہی اس کی نظر آپ پر پڑی، جھٹ سے بولا: اے جعفرؑ! بنی عباس کے گھرانے سے آپ کا بغض اور کینہ ختم نہیں ہوتا بلکہ اور بھی شدید ہوتا جاتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ آپ جو چاہتے ہیں وہ نہیں کر پاتے۔ اس پر

امامؑ نے فرمایا: اے امیرالمومنین! بخدا میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں بنی امیہ کی حکومت کے زمانے میں بھی تھا اور آپ جانتے ہیں کہ وہ لوگ ہمارے اور آپ کے دشمن تھے۔ پھر ان کا حکومت پر کوئی حق بھی نہیں تھا لیکن بخدا کہ میں نے ان کے خلاف بھی کوئی اقدام نہیں کیا تھا اور نہ ان کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچا۔ بھلا آپ کے ساتھ میں ایسا عمل کیسے کر سکتا ہوں جبکہ آپ میرے ابن عم اور قرابت میں مجھ سے قریب تر ہیں۔ منصور نے لمحہ بھر سوچا اور پھر اپنے پہلو میں رکھا ہوا ایک گدا اٹھایا اور اس کے نیچے سے خطوں کا ایک پلندا نکالا، اسے آپ کی طرف پھینکا اور کہا: یہ ہیں اہل خراسان کے نام آپ کے وہ خط جن میں آپ نے ان کو میری بیعت توڑنے کو کہا ہے اور پھر اپنی بیعت کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: بخدا! میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ پھر فرمایا کہ اگر میں ایسا ارادہ کروں بھی تو اب میں اس عمر کو پہنچ چکا ہوں جو ایسے کاموں کا بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں ہے۔ اب منصور نے کچھ سوچا "تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈال کر اس کو بالشت بھر باہر نکالا" پھر واپس رکھ دیا اور بولا: اے جعفرؑ! آپ کو اپنے اس بڑھاپے میں اس بات پر شرم نہیں آتی کہ آپ غلط بات کہیں اور مسلمانوں کو ہم سے علٰحدہ کرائیں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ خون بہے اور رعایا میں فساد برپا ہو۔ پھر وہ بغض اور کینے سے بھرے ہوئے اسی انداز میں بولتا چلا گیا۔ امامؑ برابر یہ کہتے رہے: بخدا کہ میں نے ایسا کوئی اقدام نہیں کیا۔ نہ یہ میرے خط ہیں۔ نہ یہ میرا طرز تحریر ہے اور نہ یہ میری مہر ہے۔ وہ جو جو الزام آپ پر دھرتا جا رہا تھا، آپ قسم کھا کر اس سے اظہار برأت فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ منصور آپ کی طرف سے مطمئن ہو گیا اور بولا: میں آپ کو اس معاملہ میں سچا سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ علامہ مجلسی نے بحار میں بیان کیا ہے۔

راویوں کا کہنا ہے کہ منصور نے آپ کو تقریباً آٹھ مرتبہ اپنے پاس بلوایا کیونکہ وہ آپ سے سخت بغض رکھتا تھا اور آپ کو قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن جب وہ آپ سے ملاقات کرتا تو خود کو آپ کی تعظیم و تکریم پر مجبور پاتا تھا۔ البتہ مجھ کو بعض راویوں کے ان بیانات پر شک ہے جو انھوں نے اپنے مؤقف کے ذیل میں پیش کیے ہیں۔ کیونکہ منصور جانتا تھا کہ امام جعفر صادقؑ خلافت اور اس کی حکومت کے خلاف ہر طرح

کی شورش سے کنارہ کش تھے اور آپ تو اپنے ان چچازاد بھائیوں کے ساتھ بھی شریک نہیں تھے جو وقتاً فوقتاً اس کے خلاف اٹھتے رہتے تھے۔ بلکہ امامؑ نے ان سب کو ان کی تمام کوششوں کی ناکامی سے باخبر کر دیا تھا جو وہ حکومت پر تسلّط حاصل کرنے اور اس کو عباسیوں کے ہاتھ سے چھین لینے کے لیے کر رہے تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس علم کی وجہ سے جو آپ کو اپنے آباءِ کرامؑ سے ملا تھا، آپ نے بنی عباس کی حکومت قائم ہونے اور حالات کے ان کے حق میں سازگار ہونے کی خبر بھی دیدی تھی۔ جیسا کہ منصور نے بذاتِ خود اس خبر کو خوشی اور فخر سے سنا تھا، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ چنانچہ منصور آپ کے مرتبے کو جانتا اور آپ کی تعظیم کرتا تھا۔ بلکہ وہ کسی کو بھی فضیلت میں آپ کے برابر نہ سمجھتا تھا۔ اس لیے میں یہ تصوّر نہیں کرتا ہوں کہ وہ آپ کے قتل کے درپئے تھا یا اس کے متعلق سوچتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک ایسا کام ہے جو اس کے بس میں نہیں ہے۔

علاوہ بریں یہ روایات امام جعفر صادقؑ کو کچھ اس طرح پیش کرتی ہیں گویا آپ منصور سے معافی طلب کر رہے ہوں اور اس کی خوشنودی کے خواہاں ہوں۔ حالانکہ بیشتر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے دین کے معاملہ میں کبھی کسی سے مصالحت نہیں کی، بلکہ دین کی خاطر بعض اوقات آپ منصور پر اور ایسے ہی دوسرے لوگوں پر بجلی کی طرح کڑک جاتے تھے۔

چنانچہ حلیۃ الاولیاء میں ابونعیم کا بیان ہے کہ ایک روز منصور نے امام جعفر صادقؑ کو بلوا کر اپنے پہلو میں بٹھایا اور آپ سے پوری عزت و احترام کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں مکھی منصور کے منہ پر آ بیٹھی اور پھر اس کے منہ اور ناک پر بھنبھناتی رہی، حتیٰ کہ منصور اس سے تنگ آ گیا اور بولا: اے ابو عبداللہؑ! اللہ نے مکھی کو کس لیے پیدا کیا ہے؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: تاکہ اس سے ظالموں کی ناک نیچی کر دے۔ منصور بھنا گیا اور اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آپ کا یہ ایک فقرہ اس کو اتنا برا لگا کہ پھر آپ سے بولا ہی نہیں۔

جیسا کہ راوی کہتے ہیں۔ اس نے آپ کو اسی لیے بلوایا، تاکہ وہ آپ کے اس

سے دُور دُور رہنے پر اپنی ناراضی ظاہر کرے۔ تب وہ مدینہ آیا ہوا تھا اور امام جعفر صادقؑ اس سے ملنے کے لیے نہیں گئے تھے۔ حالانکہ دوسرے ممتاز افراد اس سے جاکر ملے تھے۔ پس اس نے آپ سے کہا کہ آپ ہمارے پاس کیوں نہیں تشریف لائے، جیسے اور لوگ آئے تھے؟ اس پر امامؑ نے اس کو جواب دیا کہ ہمارے پاس دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کی خاطر ہم تم سے خوف کریں، نہ تمہارے پاس آخرت کی کوئی شے ہے کہ جس کی ہم تم سے تمنا کریں۔ نہ تمہارے پاس کوئی ایسی نعمت ہے جس پر ہم تم کو مبارکباد دیں اور نہ تم کسی ایسی مصیبت میں ہو کہ ہم تم کو تسلی دیں۔ منصور نے کہا: آپ ہماری صحبت میں بیٹھ کر ہم کو نصیحت فرمایا کیجیے۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا: جو دنیا کو چاہتا ہے وہ تم کو نصیحت نہ کرے گا اور جو آخرت کا خواہاں ہے وہ تمہاری صحبت اختیار نہ کرے گا۔ اس کے علاوہ بھی کتنے ہی ایسے مواقع ہیں کہ جب آپ جابر حکام اور ظالم عمال کو ان کی برائیوں پر ٹوکتے اور ان کے ظلم اور سرکشی پر انکو خدا کے غضب اور اس کے سخت عذاب سے ڈراتے تھے۔

چنانچہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ مدینہ میں منصور کے ایک گورنر نے امام جعفر صادقؑ کی موجودگی میں اپنے جمعہ کے خطبہ میں امیر المومنین امام علیؑ کو بُرا کہا۔ جونہی اس گورنر نے خطبہ ختم کیا، امامؑ کھڑے ہوگئے۔ پہلے اللہ کی حمد کی، پھر رسول اللہؐ پر صلوات بھیجی اور پھر فرمایا کہ: جو خوبیاں تم نے بیان کی ہیں، ہم ان کے اہل ہیں، لیکن وہ برائیاں جو تم نے بیان کیں ان کے اہل تم خود اور تمہارے آقا ہیں۔ پھر آپ نے عوام کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: دیکھو میں تم کو اس شخص سے آگاہ کرتا ہوں، جو قیامت کے روز وزن میں سب سے ہلکا اور نقصان میں سب سے نمایاں ہوگا۔ وزن میں سب سے ہلکا وہ ہوگا جو اپنی آخرت کو دوسرے کی دنیا کی خاطر بیچ ڈالے گا اور وہ یہ بدکار ہے۔ اس پر وہ گورنر ذلت و خواری کی حالت میں چپ چاپ مسجد سے نکل گیا۔

جب داؤد بن علی مدینہ کا گورنر ہوا تو اس نے علویوں پر بہت سختیاں کیں اور ان کے حامیوں کے پیچھے پڑا رہا۔ اس سلسلے میں اس نے معلّٰی بن خنیس سے کہا کہ وہ ان کے بارے میں اس کو معلومات فراہم کرے لیکن معلّٰی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اب اس نے اس کو قتل کی دھمکی دی تاکہ وہ جان کے خوف سے اس کی بات مان لے لیکن وہ اپنے

انکار پر قائم رہا۔ اس پر داوٗد نے پولیس کے سربراہ کو حکم دیا کہ وہ اس کو قتل کر دے۔ جب امام جعفر صادقؑ کو معلّی کے قتل کا ماجرا معلوم ہوا تو اگرچہ آپ حکام کے ہاں نہ جاتے تھے، پھر بھی آپ بہ نفس نفیس گورنر کے پاس گئے اور اس سے کہا: تم نے میرے غلام کو قتل کیا اور میرا مال چھین لیا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ انسان بیٹے کے مر جانے پر تو سو سکتا ہے لیکن وہ ظلم کی گھڑی میں ہرگز نہیں سو سکتا۔ اس طرح امامؑ اور گورنر کے درمیان اس معاملہ میں سخت گفتگو ہوتی رہی جبکہ گورنر یہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ خود اس قتل کے جرم سے بری ہو جائے اور اس کی ذمہ داری سیرافی پر ڈال دے۔ چنانچہ اس نے مقتول کے وارثوں کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ قاتل سے قصاص لے لیں۔ پھر جب سیرافی کو قصاص میں قتل کرنے کے لیے پکڑا گیا تو وہ باآواز بلند چیخا: یہ حکام مجھے لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ جب میں ان کے حکم سے کسی کو قتل کر دیتا ہوں تو وہ اس کی ذمہ داری سے بری ہو جاتے ہیں اور میرے قتل کا حکم دیدیتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ امامؑ نے خود جا کر اس قاتل کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

الکافی میں روایت ہے کہ معلّی بن خنیس کے قصاص میں پولیس کے سربراہ سیرافی کے قتل ہونے کے بعد آپ نے مدینہ کے اس ظالم گورنر داوٗد بن علی سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنی دعا میں فرمایا: اے اللہ! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں، تیرے نور کے واسطہ سے جو کبھی بجھتا نہیں ہے، تیرے ارادوں کے واسطہ سے جو کبھی کمزور نہیں پڑتے، تیری عزت کے واسطہ سے جس سے تو نے موسیٰؑ کو فرعون سے نجات دی تھی۔ اب تو داوٗد بن علی کو مجھ سے ابھی اور اسی وقت دُور کر دے۔ بے شک تو قریب ہے اور دعا کا سننے والا ہے۔ پس جونہی آپ کی دعا ختم ہوئی، ادھر داوٗد بن علی کے گھر سے ایک چیخ سنی گئی۔

مختصر یہ کہ منصور کے عہد میں امام جعفر صادقؑ کو ان تکلیفوں اور سختیوں کا سامنا رہا جو آپ نے بنی امیہ کے عہد میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ آپ کا وجود اس پر گراں گزر رہا تھا کیونکہ وہ جہاں بھی جاتا وہاں کے لوگوں کی زبان پر آپ ہی کا تذکرہ پاتا اور یہ بھی دیکھتا کہ میدانی اور پہاڑی ہر علاقے سے آئے ہوئے علماء اور طلباء مدینۂ رسولؐ میں آپ کے در پر ہجوم کیے رہتے ہیں۔ آپ ان سب کو اپنی تعلیمات سے سیر کرتے اور ان کے سامنے اپنے خیالات اور فرمودات پیش کرتے ہیں۔ یہ تھی وہ دعوتِ حق جو عدل کو زندہ کرنے، مظلوم کو سہارا دینے

اور ان ظالم حکام کے دست ستم سے بچاؤ کے لیے تھی جو امت پر تسلط حاصل کر کے اس کی قسمت اور عزت کے مالک بن گئے تھے اور انہوں نے دین و اخلاق پر اپنی حرص و آز کو غالب کر رکھا تھا۔ چنانچہ آپ کی تعلیمات اور فرمودات میں یہ پہلو سب سے نمایاں ہوتے تھے۔

اسی کے ساتھ آپ فرمایا کرتے تھے کہ:

امامت صرف ایسے شخص کو سزاوار ہے جس میں تین خصلتیں ہوں۔ یعنی تقویٰ کہ جو اس کو حرام کاموں سے باز رکھے، حلم و بردباری کہ جس سے وہ اپنے غصہ پر قابو پائے اور حسن خلق کہ جس کی بدولت وہ رعیت پر ایک باپ کی طرح مہربان رہے۔

ادھر تو یہ صورت تھی، ادھر منصور یہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ امامؑ کو تنگ کرنے یا ان کو دھوکے سے قتل کر دینے کے باعث ایسے چند در چند مسائل پیدا ہو جائیں گے کہ جن کے خطرناک نتائج پر قابو پانا اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ آپ کے ساتھ بھی وہی کرتا جو اس نے دوسرے علویوں کے ساتھ کیا تھا۔ جیسا کہ اس نے کئی تنگ و تاریک قید خانے علویوں سے بھر دیے تھے اور ان پر اپنے جلادوں کو مسلط کر دیا تھا جو ان کو سخت سے سخت تکلیفیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی قیدی شدت تکلیف سے مر جاتا تھا تو اس کو دوسرے زندہ قیدیوں کے پاس ہی چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ اس کو دیکھتے رہیں اور اس کی لاش کے تعفن سے پریشان ہوا کریں۔ ان کا یہ حال تھا کہ وہ نماز کے اوقات کا اندازہ بھی قرآن کے پاروں کی تلاوت سے کرتے اور اسی سے رات اور دن کا تعین کر پاتے تھے۔ انجام کار یہ ہوا کہ منصور نے قید خانہ کی چھت کو ان پر گرا دیے جانے کا حکم دے دیا اور وہ سب مردہ و زندہ ہمیشہ کے لیے اس ملبہ کے نیچے دب کر رہ گئے۔

سبھی مورخین منصور کے اس خزانہ کا قصہ بیان کرتے ہیں جو اس نے مہدی کے لیے چھوڑا اور اس کی کنجیاں مہدی کی بیوی ریطہ کو دیدی تھیں۔ اس نے ریطہ کو تاکید کی تھی کہ جب تمہیں میری موت کا یقین ہو جائے اس وقت یہ کنجیاں مہدی کو دے دینا۔

وہ یہ خیال کرتی تھی کہ اس خزانہ میں بہت سی قیمتی اشیا' ہیرے جواہرات اور کثیر دولت ہوگی۔

تاریخ طبری میں ہے کہ جب منصور نے حج کا ارادہ کیا تو اس نے مہدی کی بیوی ریطہ بنت ابی العباس کو بلایا کیونکہ اس موقع پر اس کا شوہر وہاں موجود نہ تھا۔ تب اس نے اسے اپنے ارادہ سے آگاہ کیا اور اپنے خزانوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں۔ نیز اس سے یہ عہد و پیمان بھی لیا کہ نہ وہ خود ان خزانوں کو کھولے گی اور نہ مہدی کے علاوہ کسی اور کو اس کی خبر کرے گی۔ اس نے یہ تاکید کی کہ مہدی کو بھی اس کی خبر اس وقت تک نہ دے جب تک اس کو منصور کی موت کا یقین نہ ہو جائے۔ ہاں جب اس کو یہ یقین حاصل ہو جائے، تب مہدی اور وہ دونوں مل کر ان خزانوں کو کھولیں۔ اس کے بعد جب مہدی مدینۃ الاسلام واپس آیا تو ریطہ نے وہ کنجیاں اس کے حوالہ کر دیں اور منصور کی وصیت سے اس کو آگاہ کر دیا۔ بعد میں اس کو اس کی وفات کی خبر ملی اور وہ خلافت پر متمکن ہوگیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی موجودگی میں ان خزانوں کو کھولا تو وہاں ابوطالب کی اولاد کے مقتولین کا ایک انبوہ پایا کہ جن کے کانوں میں ان کے نسب ناموں کے پرچے پرو دیے گئے تھے اور ان میں بچے، جوان اور بوڑھے سبھی تھے۔ یہ دیکھ کر وہ کانپ گیا اور اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ پھر اس نے ان سب کو ایک بڑی قبر میں دفن کرا دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ منصور اپنے جانشین مہدی کو اپنی اس خاموش وصیت سے یہ ہدایت کرنا چاہتا تھا کہ اگر تم کو ملک پیارا ہے تو پھر اولاد علیؑ سے خبردار رہنا اور ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا جیسا میں نے کیا ہے۔ اس نے ان پاک جسموں کو غالباً اسی لیے محفوظ رکھا اور یہ وصیت کی کہ وہ اس کے حوالہ کر دیے جائیں تاکہ وہ اس کو ملکی سیاست میں سنگدلانہ طریقہ اختیار کرنے پر آمادہ کر دے۔

امام جعفر صادقؑ کے مناظرے

امام جعفر صادقؑ نے مسلمان عالموں اور کلامیوں کی ایک خاصی تعداد سے مناظرے کیے۔ اسی طرح آپ نے زنادقہ، ملاحدہ، معتزلہ، مجسمہ، قدریہ، خوارج اور دوسرے فرقوں سے بھی مناظرے کیے۔ ان میں آپ کا اسلوب ملائمت کے علاوہ ایسی دلیلوں اور حجتوں سے بھرپور ہوتا تھا کہ لوگوں کے لیے ان میں سے نکل جانے کا راستا نہ رہتا تھا۔

اب جبکہ ہم آپ کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو بیان کر رہے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ان کے بعض مناظروں کا تذکرہ بھی پیش کریں۔

اس ذیل میں بعض روایات بتلاتی ہیں کہ ایک مرتبہ ایام حج میں، ابن ابی العوجاء، ابن طالوت، ابن مقفع اور کچھ اور زندیق خانۂ کعبہ میں جمع ہوئے۔ اس زمانہ میں امام جعفر صادقؑ بھی وہاں جلوہ افروز تھے۔ لوگ آپ سے جو بھی مسائل دریافت کرتے، آپ روشن دلیلوں کے ساتھ ان کے جواب دیتے تھے۔ اس دوران میں آپ کئی ایک قرآنی آیات کی تفسیر بھی فرماتے تھے۔ تب بعض لوگوں نے ابن ابی العوجا سے کہا: وہ شخص جو سامنے بیٹھا ہے، کیا تم اس پر ایسے سوالات کر سکتے ہو کہ جن کے جوابات میں اس کی غلطیاں گنا کر اس کو ان لوگوں کی نظروں سے گرا دو جو اس کو گھیرے ہوئے ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح لوگ اس کے پروانے بنے ہوئے ہیں؟ ابن ابی العوجا نے کہا: ہاں! میں ایسا کر سکتا ہوں۔ پھر وہ مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور آپ کے سامنے آکر بولا: اے ابو عبداللہ! کیا آپ مجھ کو سوال کرنے کی اجازت دیں گے؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اگر پوچھنا ہی چاہتے ہو تو پھر پوچھو۔ ابن ابی العوجا نے دریافت کیا: آپ لوگ کب تک اس قطعۂ زمین کو اپنے پیروں تلے روندتے رہیں گے۔ اس کالے پتھر سے برکت طلب کرتے رہیں گے۔ اس اینٹ گارے کے مکان کی پرستش کرتے رہیں گے اور آوارہ اونٹوں کی مانند اس کے گرد چکر لگاتے رہیں گے؟ جو کوئی سوچتا اور غور کرتا ہے اس کی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ یہ کسی سمجھدار کا فعل نہیں ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کیونکہ آپ اس معاملہ کے سردار اور سربراہ ہیں اور آپ کے والد بزرگوار اس کی بنیاد اور اس کا ستون تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: جس کو اللہ گمراہ کر دے اور اس کے قلب کو اندھا کر دے، اس کو امر حق بے معنی سا لگتا ہے۔ اس لیے وہ اس کی پناہ میں نہیں آتا اور شیطان اس کا ولی اور رب بن جاتا ہے۔ پھر وہ اس کو ہلاکت کے گڑھے میں گرا دیتا ہے لیکن وہاں سے نکالتا نہیں۔ اب سنو کہ یہ وہ گھر ہے جس کے ذریعے اللہ نے اپنے بندوں کو عبادت کا حکم دیا ہے، تاکہ ان کے یہاں آنے اور اس کی زیارت اور تعظیم کرنے میں ان کی اطاعت کا امتحان لے۔ اس نے اس کو ان لوگوں کا قبلہ بنایا جو صرف اسی کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ پس یہ اس کی خوشنودی کا ایک وسیلہ اور اس کی مغفرت میں داخل

ہونے کا ایک راستا ہے۔ یہ کمال کے راستے کا نشان اور اس کی عظمت و جلال کا مظہر ہے اور اللہ نے زمین کے بچھائے جانے سے پہلے اس کو خلق کیا۔ پس اس کا سب سے زیادہ حقدار کہ جو حکم وہ دے اس کی اطاعت کی جائے اور جس سے وہ روکے اس سے باز رہا جائے وہی اللہ ہے کہ جو روحوں اور جسموں کا پیدا کرنے والا ہے۔

ابن ابی العوجا نے کہا: اے ابو عبداللہؑ! آپ نے نصیحت تو فرمائی لیکن آپ نے اس کا تمام تر دارومدار غائب ہی پر رکھا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے! وہ غائب کیسے ہو سکتا ہے، جو اپنی مخلوق کے ساتھ موجود ہے اور ان سے ان کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ان کی باتیں سنتا ہے اور ان کے بھیدوں سے واقف ہے۔ نہ کوئی مقام اس سے خالی ہے اور نہ کوئی مقام اس سے گھرا ہوا ہے۔ نہ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی نسبت سے زیادہ قریب ہے۔ اس پر اس کے نشان شاہد ہیں اور اس کے افعال اس تک رہنمائی کرتے ہیں۔ اسی نے محمدؐ بن عبداللہ کو واضح آیات اور روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور آنحضرتؐ ہی یہ عبادت لے کر ہمارے پاس آئے۔ اگر تم کو ان کے بارے میں شک ہے تو مجھ سے دریافت کر لو۔ میں تمہارے لیے اس کی وضاحت کر دوں گا۔

اب ابن العوجا خاموش ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس کے بعد وہ کیا کہے، پھر وہ آپ کے پاس سے چلا گیا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: میں نے تم سے شراب مانگی تھی، تم نے مجھے انگاروں پر ڈال دیا۔ اس پر وہ لوگ بولے: اب چپ ہو جاؤ، بخدا کہ تم نے وہاں اپنی حیرت اور خاموشی کے ساتھ ہماری رسوائی کا سامان کیا ہے۔ ہم نے اس سے زیادہ حقیر کوئی نہیں دیکھا، جیسے آج تم ان کی صحبت میں حقیر نظر آئے تھے۔ اس پر وہ بولا: ارے یہ مجھ سے کہہ رہے ہو؟ پھر حاجیوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یہ اس (نبیؐ) کا فرزند ہے جس نے ان سب کے سر منڈوا دیے۔

احتجاج طبرسی میں ہشام بن حکم سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ابن ابی العوجا، ابو شاکر دیصانی، عبدالملک بصری اور ابن مقفع خانہ کعبہ میں حاجیوں کا مذاق اڑانے اور قرآن پر فقرے کسنے لگے۔ ابن ابی العوجا بولا: آؤ ہم میں سے ہر ایک قرآن کے ایک چوتھائی حصے کی مثل بنا لائے۔ اب ہم سب یہ عہد کریں کہ اگلے سال اسی مقام

پر اکٹھا ہوں گے ۔ اس وقت تک ہم پورے قرآن کی مثل ایک کتاب تیار کر چکے ہونگے ۔ جب قرآن کی مثل ہم لے آئیں گے تو محمدؐ کی نبوت باطل ہو جائے گی ۔ ان کی نبوت کے باطل ہو جانے سے اسلام از خود باطل ہو جائے گا اور جس راستے پر اب ہم ہیں وہ صحیح ثابت ہو جائیگا۔ چنانچہ وہ سب اس بات پر متفق ہو کر ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو گئے ۔ جب اگلا سال آیا تو یہ سب خانۂ کعبہ میں جمع ہوئے ۔ ابن ابی العوجا نے کہا: جب سے ہم لوگ ایک دوسرے سے علٰحدہ ہوئے تھے، میں اس آیت کے متعلق سوچتا رہا :

فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا . (سورۂ یوسف ۔ آیت ۸۰)

جب وہ ان سے رہائی کے لیے مایوس ہو گئے ۔

لیکن میں اس پر قادر نہ ہو سکا کہ اس کی فصاحت اور اس کے تمام معانی میں کوئی چیز بڑھا سکوں ۔ اس کے متعلق میں نے اتنا سوچا کہ کسی دوسری آیت پر توجہ ہی نہ دے سکا ۔

عبد الملک بصری نے کہا : جب میں تم لوگوں سے جدا ہوا اس وقت سے میں اس آیت کے بارے میں سوچتا رہا :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ۚ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ

اے بنی نوع انسان ایک سبق آموز مثال کو غور سے سنو ۔ یقیناً وہ کہ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو ہرگز ایک مکھی تک نہیں پیدا کر سکتے چاہے وہ اس کام کے لیے سارے اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی کوئی چیز ان سے چھین لے تو یہ اس سے اسکو واپس نہیں لے سکتے ۔ طالب و مطلوب دونوں کمزور ہیں ۔ (سورۂ حج ۔ آیت ۷۳)

ابو شاکر دیصانی نے کہا : جب سے میں تم لوگوں سے علٰحدہ ہوا، اس آیت پر غور کرتا رہا: لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا . (سورۂ انبیاء ۔ آیت ۲۲)

اگر زمین اور آسمان میں اللہ کے سوا چند معبود ہوتے تو دونوں کب کے برباد ہو گئے ہوتے ۔

لیکن میں اس کا مثل لانے پر قادر نہ ہو سکا۔

ابن المقفع نے بیان کیا: اے لوگو! یہ قرآن انسان کے کلام کی صف میں سے نہیں ہے۔ جب سے میں تم سب سے علیحدہ ہوا، اس آیت پر غور کرتا رہا:

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ. (سورۃ ہود۔ آیت ۴۴)

اور کہا گیا: اے زمین پانی کو جذب کرلے اور اے بادلو چھٹ جاؤ اور پانی اتر گیا۔ اللہ کا امر پورا ہوا اور کشتی جودی پر ٹھیری اور کہا گیا کہ ظالم لوگوں سے دور رہو۔

لیکن میں اس کو پوری حقانیت کے ساتھ سمجھ نہ سکا اور نہ اس کی مثل لا سکا۔ اس پر ہشام بن حکم نے یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ لوگ اس گفتگو میں منہمک تھے کہ ادھر سے امام جعفر صادقؑ کا گزر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر جن و انس مل کر بھی اس قرآن کا مثل لانا چاہیں تو ہرگز نہ لا سکیں گے، خواہ وہ اس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں۔ اس پر وہ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور بولے: اگر اسلام میں حقانیت ہے تو محمدؐ کی وصیت کا مصداق امام جعفرؑ بن محمدؑ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ بخدا! جب بھی ہم انکو دیکھتے ہیں ہم پر انکی ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یونس بن یعقوب سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں ابو عبداللہؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شامی شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں فقہ، کلام اور فرائض کا عالم ہوں اور آپ کے اصحاب سے مناظرہ کرنے آیا ہوں۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ تمہارا یہ علم کلام رسول اللہؐ کا ہے یا تمہارا اپنا؟ اس نے کہا کچھ رسول اللہؐ کا ہے اور کچھ میرا اپنا ہے۔ تب امامؑ نے اس سے کہا: کیا تم رسول اللہؐ کے ساتھ شریک ہو؟ اس نے کہا نہیں! آپ نے کہا: تم نے اللہ کی طرف سے وحی سماعت کی ہے؟ اس نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: کیا تمہاری اطاعت اسی طرح واجب ہے جس طرح رسول اللہؐ کی۔ اس نے کہا: نہیں!

یونس بن یعقوب کہتے ہیں کہ اب امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: دیکھو تو یہ شخص مناظرہ کرنے سے پہلے خود ہی اپنی مخالفت کر رہا ہے۔ پھر فرمایا: اے یونس! اگر تم اچھی طرح مناظرہ کر سکتے ہو تو اس سے بات کر لو۔ یونس نے کہا: ہائے افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ پھر کہا: اے ابوعبداللہؑ! آپ تو علم کلام میں دلچسپی لینے سے منع فرماتے ہیں اور کہتے ہیں وائے ہو علم کلام والوں پر کہ وہ کہتے ہیں یہ قابل قبول ہے اور یہ قابل قبول نہیں ہے یا یہ روا ہے اور یہ روا نہیں ہے یا ہم ایسا سمجھتے ہیں اور ایسا نہیں سمجھتے۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: اس سے میری مراد وہ لوگ تھے جنہوں نے علم کلام کی خاطر میرے قول کو ترک کر دیا اور جو کچھ وہ خود چاہتے تھے اس کے پیچھے ہو لیے۔ آپ اٹھیں اور دروازے پر جا کر دیکھیں، وہاں علم کلام جاننے والے جو بھی افراد ہوں ان کو بلا لاؤ۔

یونس بن یعقوب کہتے ہیں کہ میں باہر گیا تو وہاں مجھ کو حمران بن اعین، محمد بن نعمان، ہشام بن سالم اور قیس الماصیر ملے جنہوں نے امام علیؑ بن حسینؑ سے علم کلام پڑھا تھا۔ میں ان کو اندر لے آیا اور ہم سب امام جعفر صادقؑ کے خیمے میں بیٹھ گئے، جو پہاڑ کی ایک جانب خانۂ کعبہ کے راستہ پر تھا۔ یہ حج سے کچھ روز پہلے کی بات ہے۔ اس وقت باہر ایک اونٹ مچل رہا تھا، اس کو دیکھنے کے لیے امام ابوعبداللہ نے اپنا سر خیمہ سے باہر نکالا تو ہشام نے کہا: اے اونٹ! رب کعبہ کے نام پر سنبھل جا۔ تب ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ہشام غالباً اولادِ عقیل میں سے ہیں کیونکہ وہ امام ابوعبداللہ سے گہری محبت کرتے تھے لیکن دراصل وہ ہشام بن حکم تھے جو سن میں ہم سب سے چھوٹے تھے۔ امام ابوعبداللہ نے ان کو بیٹھنے کی جگہ دیتے ہوئے فرمایا: یہ اپنے دل، زبان اور ہاتھ سے ہماری نصرت کرنے والے ہیں۔ پھر آپ نے حمران بن اعین سے فرمایا: اس شامی سے تم بات کرو۔ چنانچہ حمران نے اس سے مباحثہ کیا اور اس پر حاوی ہو گئے۔ اب آپ محمد بن نعمان احول کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اب تم اس سے بات کرو۔ تب انہوں نے اس سے بحث کی اور بقول راوی وہ بھی اس پر غالب آ گئے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے بقیہ اصحاب سے بھی فرمایا: کہ اب تم بھی اس سے بحث کرو۔ تب امامؑ اس شامی سے ان لوگوں کی گفتگو پر تبسم فرما رہے تھے۔ پھر آپ نے شامی سے کہا کہ اگر تم چاہو تو اس لڑکے سے بھی بات کر لو۔

آپ کی مراد ہشام سے تھی۔ چنانچہ شامی نے ہشام سے کہا: اے لڑکے! تم مجھ سے ان کی امامت کے متعلق سوال و جواب کرو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے امام جعفر صادقؑ کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ہشام بن الحکم کو غصہ آگیا اور وہ کہنے لگے: اے شخص! تو مجھ کو یہ بتا کہ اللہ اپنے بندوں کی بہتر حفاظت کرتا ہے یا خود بندے اپنی بہتر حفاظت کرتے ہیں؟ شامی نے کہا: اللہ اپنے بندوں کی خود ان سے بہتر حفاظت کرتا ہے۔ تب ہشام نے کہا: تو پھر بتاؤ کہ اس نے اپنے بندوں کے دین کی کس طرح حفاظت کی ہے؟ شامی نے کہا: اس نے ان کو احکام بتا کر ان پر اپنی حجت قائم کی ہے اور ان احکام کے اسباب کی وضاحت بھی کردی ہے۔ ہشام نے کہا: وہ کونسی دلیل ہے جو اس نے ان کے لیے قائم کی ہے۔ اس نے کہا: وہ رسول اللہؐ ہیں اور ان کے بعد کتاب اور سنت۔ ہشام نے اس کے جواب میں کہا: لیکن جب ہم آپس میں اختلاف کریں تو کتاب و سنت ہم کو کیا فائدہ دیں گے اور وہ ہمارے اختلاف کو کس طرح دور کریں گے؟ نیز یہ بتاؤ ہم تم میں اختلاف ہوا کہ تم شام سے اس پر ہمارے ساتھ مناظرہ کرنے آئے ہو۔ جبکہ تمہارا خیال ہے کہ اپنی رائے بھی دین کا ایک طریقہ ہے۔ حالانکہ تم اقرار کرتے ہو کہ ایسی رائے باہم اختلاف کرنے والوں کو ایک قول پر متحد کرنے سے قاصر ہے۔ اس پر وہ شامی خاموش ہوگیا۔ اب امامؑ نے اس سے فرمایا: کیا بات ہے، تم بولتے کیوں نہیں؟ تب اس نے کہا: اگر میں یہ کہوں کہ ہم میں اختلاف ہے ہی نہیں تو یہ ضدیت ہوگی اور اگر میں یہ کہوں کہ کتاب و سنت اختلاف کو دور کر دیتے ہیں تو یہ بھی غلط ہوگا کیونکہ ان دونوں میں بکثرت اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم اب میں بھی ان سے ایک ایسا ہی سوال کرنا چاہتا ہوں۔ امامؑ نے فرمایا: ہاں ضرور پوچھو، تم ان کو بردبار پاؤ گے۔ تب اس شامی نے وہی سوال دہرا دیے جو ہشام نے اس سے پوچھے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو اس کے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ ابتدا رکار میں رسول اللہ حجت تھے۔ آپ کے بعد یہ آپ کی عترت طاہرہ کا مقام ہے اور آجکل امام جعفر صادقؑ حجت ہیں۔ اس مرحلے پر شامی نے ان سے ایک اطمینان بخش دلیل طلب کی تو ہشام بن حکم نے یہ معاملہ امامؑ پر چھوڑ دیا۔ تب امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اے شخص میں تمہارے سوالوں

کے جواب بھی دوں گا لیکن پہلے میں تم کو تمہارے اس سفر کے حال سے آگاہ کروں کہ کس طرح تم شام سے روانہ ہوئے اور یہ کہ تم کو راستا میں کیا کچھ پیش آیا۔ پھر آپ نے اسے بتایا کہ فلاں فلاں دن تم شام سے چلے، تم نے فلاں فلاں راستا اختیار کیا اور پھر اس کے سفر کا حال آپ اس طرح تفصیل سے بتاتے رہے گویا کہ آپ اس کے ساتھ رہے تھے۔ چنانچہ اس شامی نے آپ کی امامت کا اعتراف کر لیا اور مذہب اہلبیتؑ کا قائل ہو گیا۔ راوی یہ بھی کہتا ہے کہ پھر امامؑ نے اپنے اصحاب کے طریقۂ بحث پر اظہار نظر فرمایا اور ہشام سے کہا کہ تم ایسے شخص کو ہی مخالف لوگوں سے مناظرہ کرنا چاہیے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ایک موقع پر امام جعفر صادقؑ نے ابوحنیفہ سے پوچھا: تم اہل عراق کو کس چیز سے احکام شرع بتاتے ہو؟ انھوں نے کہا: قرآن سے! آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ قرآن میں کیا ناسخ ہے، کیا منسوخ ہے، کیا محکم ہے اور کیا متشابہ ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: ہم نے ان (بستیوں) میں آمد و رفت مقرر کی تھی، کہ ان میں رات دن بے کھٹکے چلو پھرو۔ (سورۂ سبا۔ آیت ۱۸) پھر آپ نے ان سے پوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے؟ انھوں نے کہا: یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے۔

اب امام جعفر صادقؑ نے اپنے ہم نشینوں کی جانب ملتفت ہو کر فرمایا: میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ جب تم لوگ مکہ اور مدینہ کے درمیان راہ چلتے ہو تو کیا تمہارے خون اور مال محفوظ رہتے ہیں؟ ان لوگوں نے جواب دیا: نہیں! تب آپ نے فرمایا: اے ابوحنیفہ! اللہ صرف حق بات ہی کہتا ہے۔ مجھ کو اللہ کے اس قول کے بارے میں کہ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ (جو اس میں داخل ہوا، اس کو امن مل گیا۔ سورۂ آل عمران۔ آیت ۹۷) بتاؤ کہ یہ کون سا مقام ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ خانۂ کعبہ ہے۔ اب امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ اپنے ہم نشینوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ عبداللہ بن زبیر اور سعید بن جبیر کہ جو خانۂ کعبہ میں داخل ہو گئے تھے وہ قتل ہونے سے بچ نہ سکے۔ ان سب نے کہا: بخدا ایسا ہی ہے۔ اب ابوحنیفہ بولے۔ مجھ کو قرآن کا پورا پورا علم نہیں ہے۔ البتہ میں اپنے قیاس سے کام لیتا ہوں۔ تب امامؑ نے فرمایا: اگر ایسا ہی ہے تو اپنے قیاس سے جواب دو کہ اللہ کے نزدیک قتل بڑا گناہ ہے یا زنا؟ انہوں نے کہا:

قتل بڑا گناہ ہے ۔ آپ نے فرمایا: تو پھر اللہ نے کیوں قتل میں دو گواہ اور زنا کے معاملے میں چار گواہ رکھے ہیں ؟ اب یہ بتاؤ کہ نماز اور روزہ میں کونسی عبادت افضل ہے ؟ ابوحنیفہ نے کہا: نماز افضل ہے ۔ آپ نے فرمایا: تمہارے اس قیاس کے مطابق حائض عورت پر واجب ہونا چاہیے کہ وہ اپنی چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کرے، لیکن روزوں کی قضا نہ کرے ۔ حالانکہ اللہ نے اس پر روزہ کی قضا واجب کی اور نماز کی نہیں کی ہے ۔ اس کے بعد آپ نے ان سے فرمایا: پیشاب نجس تر ہے یا منی؟ انہوں نے کہا: پیشاب نجس تر ہے۔ تب آپ نے فرمایا: تو پھر تمہارے قیاس کے مطابق انسان کو پیشاب کرنے کے بعد غسل کرنا چاہیے نہ کہ جماع کے بعد۔ اس پر ابوحنیفہ بولے: دراصل میں اپنی رائے پر چلتا ہوں ۔ آپ نے فرمایا: اچھا تو اس معاملہ میں تمہاری رائے کیا ہے، ایک آقا اور اس کے غلام نے ایک ساتھ تزویج کی ۔ دونوں نے اپنی اپنی بیوی سے ایک ہی رات میں مباشرت کی ۔ اس کے بعد وہ اپنی بیویوں کو ایک ہی گھر میں چھوڑ کر سفر پر گئے ۔ کچھ عرصہ گزرا تو دونوں کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے، لیکن کسی وجہ سے وہ مکان ان سب کے اوپر گر پڑا، جس سے دونوں عورتیں مر گئیں اور دونوں لڑکے زندہ بچ گئے، تو اب تمہاری رائے میں دونوں لڑکوں میں سے کون مالک ہوگا اور کون مملوک ؟ کون وارث ہوگا اور کون موروث ؟ وہ بولے کہ میں تو صرف سزائیں (حدود) ہی بتا سکتا ہوں ۔ آپ نے فرمایا: اگر ایک اندھا شخص کسی آنکھوں والے کی آنکھ پھوڑ دے یا کوئی ہنتھ کٹا کسی کا ہاتھ کاٹ ڈالے تو ان دونوں پر کس طرح حد جاری کی جائے گی ۔ وہ کہنے لگے: میں تو دراصل بعثت انبیاء ؑ کا علم رکھنے والا ہوں ۔ آپ نے فرمایا: اللہ نے جب موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کو فرعون کے پاس بھیجا تو کہا تھا: لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۔ (سورہ طٰہٰ ۔ آیت ۴۴)

شاید کہ وہ (تم یعنی موسیٰ ؑ سے) نصیحت پکڑے یا ڈر جائے۔

کیا اس آیت میں لَعَلَّ شک کے معنیٰ میں نہیں ہے ؟ انہوں نے کہا: ایسا ہی ہے ۔ آپ نے فرمایا: تو کیا اللہ کو بھی شک تھا ؟ وہ بولے: میں یہ نہیں جانتا ہوں ۔ اس پر امام ؑ نے فرمایا: تمہارا خیال ہے کہ تم کتاب خدا کے مطابق فتوے دیتے ہو، جبکہ تم اس کتاب کے وارث نہیں ہو ۔ تم اپنا اہل قیاس ہونا بھی بتاتے ہو، حالانکہ

جس نے سب سے پہلے قیاس کیا وہ شیطان ہے۔ پھر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم رائے پر چلتے ہو لیکن رائے صرف رسول اللہؐ ہی کی صحیح ہوتی تھی، باقی ہر کسی کی غلط ہو سکتی ہے کیونکہ اللہ فرماتا ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۴۸) یعنی اے رسولؐ! ان لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو آپ پر اللہ نے نازل کیا ہے۔ لیکن اس نے کسی اور کے لیے ایسا نہیں کہا۔ تمہارا یہ بھی خیال ہے کہ تم حدود (سزائیں) بتا سکتے ہو۔ لیکن جس ذات گرامی پر وہ نازل ہوتی ہیں وہ ان کے علم کے زیادہ حقدار ہیں۔ پھر تم خیال کرتے ہو کہ تم انبیاءؑ کی بعثتوں کا علم رکھتے ہو، مگر خاتم الانبیاءؐ اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ اگر بعد میں یہ نہ کہا جاتا ہو کہ ابو حنیفہ فرزند رسولؐ سے ملنے گئے لیکن انہوں نے ان سے کوئی سوال ہی نہ کیا تو میں تم سے کچھ نہ پوچھتا۔ اس پر ابو حنیفہ نے کہا: میں آج سے رائے اور قیاس کی بات نہ کروں گا۔ امامؑ نے فرمایا: نہیں! تم کو سرداری کی یہ خواہش نہ چھوڑے گی، جس طرح اس نے تمہارے پیشرووں کو نہ چھوڑا تھا۔

عبدالمومن انصاری سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابو عبداللہؑ سے عرض کیا، لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَةٌ، یعنی میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ سچ کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: اگر انکا اختلاف رحمت ہے تو پھر ان کا اجتماع عذاب ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ بات نہیں جو تم اور دوسرے لوگ سمجھتے ہیں بلکہ رسول اللہؐ کی مراد اللہ کا یہ قول ہے کہ:

"ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ کیوں نہیں نکلتے کہ وہ علم فقہ حاصل کریں اور اپنی قوم میں جا کر ان کو عذاب سے ڈرائیں تاکہ وہ لوگ تنبیہ حاصل کریں۔" (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۲۲)

اس طرح اللہ نے ان کو حکم دیا ہے کہ پہلے وہ رسول اللہؐ کے پاس جا کر علم حاصل کریں، پھر اپنی قوم میں جا کر ان کو تعلیم دیں۔ پس رسولؐ کی اس سے مراد یہ تھی کہ لوگ مختلف شہروں میں پھیل جائیں اور عوام الناس کو تعلیم دیں، نہ کہ دین کے معاملہ میں اختلاف کریں۔

آپ کے زمانہ میں خلافت کے بارے میں بڑی طویل بحث ہوتی رہی۔ ایک طرف

معتزلہ اور دوسری طرف امویوں کے ساتھی تھے، جو ان کے غلبہ و قہر سے ڈرتے تھے۔ جب ولید بن یزید قتل ہو گیا اور شام میں اس بات پر اختلاف رائے ہوا کہ اس کے بعد کون حکومت سنبھالے گا۔ اس وقت معتزلہ، محمد بن عبداللہ بن حسن (نفس زکیہ) کی طرف ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے عمرو بن عبید، واصل بن عطاء اور حفص بن سالم امام جعفر صادق ؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ آپ پر اپنا نقطہ نظر واضح کریں۔ تب عمرو بن عبید نے آپ سے بات چیت کی اور کہا: اہل شام نے اپنے خلیفہ کو قتل کر دیا ہے اور وہ ایک دوسرے سے لڑ بھڑ رہے ہیں۔ اس طرح ان میں تفرقہ پڑ گیا ہے۔ ادھر ہم نے نظر دوڑائی تو ہم کو نفس زکیہ کے علاوہ کوئی اور مناسب شخص نظر نہ آیا۔ پس ہم نے ارادہ کر لیا کہ باہمی اتفاق سے ان کی بیعت کر لیں۔ پھر ان کے ہمراہ ہو کر اپنا معاملہ آگے بڑھائیں اور لوگوں کو ان کی طرف بلائیں۔ پس جو کوئی بیعت کرے گا ہم اس کا ساتھ دیں گے اور وہ ہمارا ساتھ دے گا اور جو ہم سے کنارہ کش رہے گا ہم بھی اس سے علٰحدہ رہیں گے۔ جو ہمارے راستے میں حائل ہو گا ہم اس سے جنگ کریں گے اور کوشش کریں گے کہ اس کو حق اور اہل حق کی طرف لے آئیں۔ اس مرحلے پر ہم نے چاہا کہ اپنا معاملہ آپ کے سامنے رکھ دیں کیونکہ آپ کے بلند مرتبہ اور آپ کے شیعوں کی کثرت کے پیش نظر ہم آپ کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔

باوجودیکہ معتزلہ نے جن بزرگ کو بیعت لینے کے لیے تیار کیا وہ خانوادۂ اہل بیت ؑ میں سے تھے اور بنی امیہ میں سے جو افراد سامنے آئے انکے مقابلے میں وہ علم و تقویٰ میں سب سے افضل تھے۔ پھر بھی امام جعفر صادق ؑ اس طریقۂ کار پر تنقید کرنے سے باز نہیں رہے، جو ان لوگوں نے نفس زکیہ کی بیعت کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں تم لوگوں سے عمرو بن عبید کے بیان کے تحت بات کروں گا۔ سب نے کہا: ٹھیک ہے اے فرزند رسول ؐ! پس آپ نے اللہ کی حمد کی، رسول اکرم ؐ پر صلوٰۃ بھیجی اور فرمایا: ہم اسی وقت برہم ہوتے ہیں جب اللہ کی نافرمانی کی جائے اور جب تک اللہ کی اطاعت کی جائے ہم خوش رہتے ہیں۔ اے عمرو! مجھ کو یہ بتاؤ کہ اگر امت حکومت کا معاملہ تمہارے سپرد کر دیتی، تم اس پر بغیر جنگ کے

قابض ہو جاتے اور پھر تم سے کہا جاتا کہ تم اس کو جس کے سپرد کرنا چاہو کر دو، تو تم یہ کس کے سپرد کرتے؟ انہوں نے کہا کہ میں مسلمانوں کے درمیان شوریٰ قائم کرتا۔ آپ نے فرمایا: کیا ان سب کے مابین! انہوں نے کہا: جی ہاں! میں قریش اور غیر قریش اور عرب و عجم کے فقہا اور نیک بندوں کے درمیان شوریٰ قائم کرتا۔

امامؑ نے ان سے فرمایا: تم ابوبکر اور عمر کو دوست رکھتے ہو یا ان سے بیزاری اختیار کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: میں ان سے دوستی رکھتا ہوں۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: اگر تم ان سے بیزاری ظاہر کرتے ہو تو تمہارے لیے ان سے اختلاف کرنا جائز ہے اور اگر تم ان دونوں سے دوستی رکھتے ہو تو تم نے اب ان کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ جب عمر بن خطاب نے ان کی بیعت کی تو انہوں نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ اس کے بعد ابوبکر نے وہ خلافت انہی کو واپس دے دی اور انہوں نے بھی کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ اس کے بعد عمر بن خطاب نے اس کو چھ افراد کے درمیان محدود کر دیا۔ ان میں سے انصار اور دیگر قریش کو خارج کر دیا۔ پھر انہوں نے لوگوں کو ایسی ہدایات دیں کہ جن کو میرے خیال میں تم اور تمہارے ساتھی پسند نہ کریں گے۔ عمرو نے کہا: انہوں نے کیا کیا؟ آپ نے فرمایا: انہوں نے صہیب رومی کو حکم دیا کہ وہ تین دن تک لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں۔ پھر کہا کہ یہ چھ آدمی آپس میں مشورہ کریں جبکہ ان کے ساتھ ابن عمر کے علاوہ کوئی غیر نہ ہو۔ لیکن ابن عمر کو منصب حکومت سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ نیز انہوں نے اپنے پاس موجود مہاجرین و انصار کو ہدایت کی کہ اگر تین دن گزر جانے پر بھی وہ لوگ فیصلہ نہ کریں اور کسی کی بیعت نہ کریں تو چھ کے چھ آدمیوں کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ اگر تین دن گزر جانے سے پہلے چار آدمی متفق ہو جائیں اور دو مخالفت کر رہے ہوں تو ان دو کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ کیا تم جو مسلمانوں میں شوریٰ قائم کر رہے ہو ایسا کرنے پر راضی ہو؟ ان سب نے کہا: نہیں!

احتجاج طبرسی میں روایت ہے کہ پھر امامؑ نے ان لوگوں سے کچھ ایسی باتیں پوچھیں کہ مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے لیکن وہ ان باتوں کا جواب نہ دے سکے۔ تب امامؑ نے اپنی گفتگو یہ کہہ کر ختم فرما دی کہ میرے والد بزرگوار کہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ کے سب سے بڑے عالم اور اس زمین پر بسنے والوں میں سب سے افضل تھے۔

انہوں نے مجھے خبر دی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اگر کوئی شخص لوگوں کو قتل و غارت سے خوفزدہ کرے اور پھران کو اپنی بیعت کرنے کے لیے کہے جبکہ امت میں اس سے زیادہ علم رکھنے والا موجود ہو تو وہ ایک ناحق دخل اندازی کرنے والا ہوگا۔

سلیمان مہران کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ سے اللہ کے قول " وَالْاَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ. " (سورۂ زمر۔آیت ۶۷) کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام کی تمام زمین خدا ہی کی ملکیت ہے اور کوئی دوسرا اس کا ساجھی نہیں ہے۔ البتہ ایک دوسرے مقام پر اللہ کی نسبت سے قبض کے معنی منع کرنے یا محروم رکھنے اور بسط کے معنی عطا کرنے اور وسعت دینے کے ہیں۔ یہ معنی اس آیت میں ہیں: " وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. " (سورۂ بقرہ۔آیت ۲۴۵) یعنی اللہ ہی محروم بھی رکھتا ہے اور عطا بھی کرتا ہے اور تم لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اسی طرح " اخذ " کے معنی قبول کرنے کے ہیں۔ چنانچہ اس معنی میں اللہ کا یہ قول ہے: " يَاْخُذُ الصَّدَقَاتِ. " (سورۂ توبہ۔آیت ۱۰۴) یعنی وہ صدقات کو قبول فرماتا ہے۔

سلیمان بن مہران کہتے ہیں کہ پھر میں نے اللہ کا یہ قول پیش کیا کہ: " وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ " (سورۂ زمر۔آیت ۶۷) آسمان گویا اس نے داہنے ہاتھ میں لپیٹ لیے ہیں۔ تب آپ نے فرمایا: یمین ہاتھ ہے اور ہاتھ سے مراد قدرت اور قوت ہے۔ گویا اس کے معنی ہیں " مَطْوِيّٰتٌۢ بِقُوَّتِهٖ " یعنی اس کی قدرت سے لپیٹ دیے جائیں گے۔

جب ہشام بن حکم نے آپ سے اللہ کی وحدانیت پر دلیل دریافت کی تو آپ نے فرمایا: " مسلسل انتظامِ عالم اور خلقت کی تکمیل "۔

آپ سے ابوشاکر دیصانی نے عرض کیا: اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ کا کوئی خالق ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ میری ذات دو صورتوں سے خالی نہیں ہے۔ یعنی یا تو اسے میں نے خود بنایا ہو یا میرے علاوہ کسی اور نے۔ اگر میں نے خود بنایا ہو تو یہ دو معنی سے خالی نہ ہوگی۔ وہ یوں کہ اگر اس کو میں نے بنایا ہے تو پھر یہ

پہلے ہی موجود تھی، اس لیے مجھ کو اس کے بنانے کی ضرورت نہ تھی لیکن اگر یہ معدوم تھی تو تم جانتے ہی ہو کہ معدوم کسی چیز کے خلق کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس طرح ایک تیسرا قول از خود ثابت ہو جاتا ہے کہ میرا کوئی بنانے والا ضرور ہے اور وہی سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ دیصانی خاموش ہو گیا اور اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

کسی شخص نے سوال کیا کہ اللہ کے اس قول: "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۵) یعنی وہ رحمٰن ہے جو عرش پر سدا مستعد ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: اس کا مطلب ہے: "اِسْتَوٰى عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ" یعنی اللہ کا ہر چیز سے برابر تعلق ہے۔ پس کوئی شے دوسری شے کے مقابلہ میں زیادہ قریب نہیں ہے۔ گویا کوئی دور کی چیز اس سے دُور نہیں اور کوئی قریب کی چیز اس کے قریب نہیں ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کسی چیز میں سے ہے یا کسی چیز کے اندر ہے یا کسی چیز کے اوپر ہے تو وہ کافر ہے۔

اس پر کسی نے کہا: اے فرزند رسولؐ! ذرا اس کی تشریح فرما دیجیے۔ تب آپ نے فرمایا: اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کسی چیز میں سے ہے تو اس نے اس کو حادث قرار دیا۔ جس کسی نے یہ سمجھا کہ وہ کسی چیز کے اوپر ہے تو اس نے اس کو کسی دوسری چیز کے سہارے پر قائم قرار دیا۔

آپ سے خدائے تعالیٰ کی تجسیم اور تشبیہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ: جسم محدود ہوتا ہے اور وہ اپنے آخری سروں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح صورت بھی محدود اور اپنے آخری سروں پر ختم ہو جانے والی ہے۔ جب حد قائم ہو گی تو پھر کمی و بیشی کا امکان بھی ہو گا اور جس میں کمی و بیشی کا امکان ہو گا وہ مخلوق ہو گا نہ کہ خالق!

سلیمان بن مہران اعمش نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا ہمارے لیے یہ کہنا جائز ہے کہ اللہ ایک مقام پر ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ اس سے زیادہ بلند و برتر ہے۔ اگر اللہ کسی مقام پر ہو تو وہ حادث ہو گا کیونکہ کسی مقام پر ساکن ہونے والا اس مقام کا محتاج ہو گا اور محتاج ہونا حادث ہونے کی علامت ہے نہ کہ قدیم کی۔

جعد بن درہم نے ایک شیشی میں مٹی اور پانی ڈال کر رکھا۔ یہاں تک کہ اس کی

حالت بدل گئی اور اس میں کیڑے پڑ گئے۔ اس پر جعد نے کہا: یہ کیڑے میں نے خلق کیے ہیں، کیونکہ ان کے پیدا ہونے کا انتظام میں نے کیا ہے۔ جب اس کا یہ قول امام جعفر صادقؑ تک پہنچا تو آپ نے فرمایا: اگر ان کیڑوں کا خالق وہی شخص ہے تو اب وہ یہ بھی بتادے کہ یہ کتنے ہیں، ان میں سے کتنے نر اور کتنے مادہ ہیں۔ نیز ان میں سے ہر ایک کا وزن کیا ہے؟ پھر اگر ان کو اسی نے خلق کیا ہے تو اس سے کہا جائے کہ اس کے لیے جو طریقہ اس نے پہلے اختیار کیا ہے، اس کی بجائے اب وہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر کے دکھائے۔

آپ کے مناظروں اور مختلف سوالوں پر آپ کے جوابات کا تعلق مختلف علوم سے ہے اور ان کا سلسلہ بڑا طویل ہے لیکن میں ان میں سے صرف یہی چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، کیونکہ میں نے اپنے قارئین کے سامنے آپ کی سیرت کے اس پہلو کی کچھ جھلکیاں پیش کر دی ہیں اور اسی کے ذریعے میں اللہ سے توفیق کا طالب ہوں تاکہ میں امام جعفر صادقؑ کی سیرت کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کر سکوں۔

اپنے اصحاب کو امام جعفر صادقؑ کی ہدایات

تم لوگ جان لو کہ اللہ کے بندوں میں سے کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اللہ کے ہر اس فعل سے خوش نہ ہو جو وہ اس کے لیے ظاہر کرے خواہ وہ اس شخص کو پسند ہو یا ناپسند ہو۔

تم کو غریبوں سے محبت کرنا چاہیے جو کوئی ان کو حقیر سمجھے گا اور ان پر بڑائی جتائے گا، وہ اللہ کے دین کی راہ سے بھٹک جائے گا، کیونکہ ہمارے دادا رسول اللہؐ فرما گئے ہیں کہ: مجھ کو اللہ نے غریبوں سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے۔ نیز جان لو کہ جو کوئی کسی کو بھی حقیر سمجھے گا اللہ اس پر نفرت نازل کر دے گا۔ یہاں تک کہ سب لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں گے۔ آگاہ رہو کہ اللہ کی نفرت بڑی سخت ہوتی ہے۔ پس تم اپنے غریب بھائیوں کے لیے اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ ہاں تم پر ان کا یہ حق ہے کہ تم ان سے محبت کیا کرو کیونکہ اللہ نے اپنے نبیؐ کو ان سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے۔ پھر جس نے اس سے محبت نہ کی، جس کی محبت کا حکم اللہ نے دیا ہے تو اس نے اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی اور جس کو ایسی حالت میں موت آ گئی تو وہ پچھلے لوگوں کی طرح گمراہی پر مرا۔

تم لوگ بڑائی اور غرور سے بچے رہنا کیونکہ بڑائی اللہ کی چادر ہے۔ جو شخص اللہ کی اس چادر پر ہاتھ ڈالے گا، وہ دنیا میں اس کو برباد کردے گا اور قیامت کے روز بھی اس کو رسوا کرے گا۔ تم لوگ ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچے رہنا کیونکہ جو کوئی ظلم کرتا ہے اللہ اس کے ظلم کو اسی پر پلٹا دیتا ہے۔ تم لوگ ایک دوسرے سے حسد کرنے سے بچے رہنا کیونکہ کفر کی جڑ حسد ہی ہے۔

تم ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہنا کیونکہ ہمارے باپ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ: ایک مسلمان کی اعانت کرنے کا ثواب ماہ رمضان کے روزے رکھنے اور اس مہینہ میں خانۂ کعبہ میں اعتکاف کرنے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

دیکھو تم میں سے کوئی اپنے پریشان حال مسلمان بھائی کو تنگی میں نہ ڈالے، کیونکہ ہمارے باپ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ: ایک مسلمان کو کسی پریشان حال مسلمان پر سختی نہ کرنا چاہیے۔ جو بھی اپنے کسی پریشان حال مسلمان بھائی کو پناہ دے گا، اللہ اس کو روز قیامت اپنے سایہ میں رکھے گا جبکہ اس روز اللہ کے سایہ کے علاوہ کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔ جان لو کہ مخلوق میں سے خواہ وہ مقرب فرشتہ ہو یا نبی مرسل ہو یا ان سے کم مرتبہ ہو اللہ کے اور اس کے درمیان اطاعت الٰہی کے علاوہ کوئی اور تعلق نہیں ہے۔

عنوان بصری، مالک بن انس کے اصحاب میں سے تھے لیکن آخر میں امام جعفر صادقؑ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کو امامؑ نے جو نصیحت فرمائی وہ یہ ہے کہ: اگر تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے آپ میں بندگی کی حقیقت پیدا کرو۔ اس پر عنوان بصری نے آپ سے عرض کیا: اے ابو عبداللہ! بندگی کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس میں تین چیزیں شامل ہیں: بندہ اس چیز کو جو اللہ نے اسے عطا کی ہو اپنی ملک نہ سمجھے کیونکہ اس کے اصل بندے وہی ہیں جن کی اپنی ملک نہیں ہوتی، وہ مال کو اللہ کا مال سمجھتے ہیں اور اس کو اللہ کے احکام کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ جب بندہ اللہ کی عطا کی ہوئی چیز کو اپنی ملک نہ سمجھے گا تو اس کو اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرنا اسے آسان معلوم ہوگا۔ وہ اپنے لیے خود کوئی اہتمام نہ کرے۔ جب وہ اس کو اصل اہتمام کرنے والے پر چھوڑے رکھے گا تو اس کو دنیا کی مشکلیں ہلکی معلوم ہوں گی۔ صرف وہ عمل

کرے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اس سے باز رہے جس سے اللہ نے روکا ہے۔ جب وہ صرف وہی عمل کرے گا جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اس کام سے باز رہے گا جس سے اللہ نے روکا ہے تو وہ دکھاوا کرنے اور لوگوں پر بڑائی جتانے سے بے نیاز رہے گا۔

پس جب اللہ اپنے کسی بندے کو یہ تین صفات عطا کر دے گا تو پھر یہ دنیا اس کو بے قیمت معلوم ہونے لگے گی۔ وہ باہمی تفاخر اور دولت آفرینی میں مقابلہ کے لیے اسکو طلب نہ کرے گا اور نہ لوگوں کی نظر میں اپنی عزت اور بلندی کی خواہش رکھے گا۔

ایک بار اسی عنوان بصری نے آپ سے عرض کیا: اے فرزند رسول ؐ! مجھ کو کچھ نصیحت کیجیے۔ آپ نے فرمایا: میں تم کو نو باتوں کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ میری ہدایت اس شخص کے لیے ہوتی ہے جو اللہ کی طرف راستہ پانے کا خواہش مند ہو۔ پس اللہ سے دعا کرتے رہو کہ وہ تم کو ان باتوں کے اختیار کرنیکی توفیق عطا کرے۔ ان میں سے تین تقویت جسم میں، تین حلم میں اور تین علم میں ہیں۔ پس تم ان کو کمتر نہ سمجھو اور ہمیشہ یاد رکھو۔

تقویت جسم کے متعلق تین باتیں یہ ہیں:

۱۔ وہ چیز مت کھاؤ جو تم کو پسند نہ ہو۔ ایسا کرنے سے حماقت اور بے عقلی پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ جب تک بھوک نہ لگے، کھانا مت کھاؤ۔

۳۔ جب کچھ کھاؤ تو اللہ کا نام لو اور حلال چیز کھاؤ۔ نیز نبی اکرم ؐ کی یہ حدیث بھی پیش نظر رکھا کرو: انسان جس چیز میں سب سے زیادہ خرابیاں بھرا کرتا ہے، وہ اس کا اپنا پیٹ ہے۔ اگر اس کا بھرنا ضروری ہو تو پھر ایک تہائی میں کھانا ہو، ایک تہائی میں پانی ہو اور ایک تہائی سانس کی آمد و شد کے لیے خالی ہونا چاہیے۔

حلم کے متعلق تین باتیں یہ ہیں:

۱۔ اگر کوئی تم سے کہے کہ ایک کہو گے تو دس سنو گے تو تم اس سے کہہ دو کہ تم دس کہو گے تو بھی مجھ سے ایک نہ سنو گے۔

۲۔ کوئی تم کو برا کہے تو اس سے کہہ دو کہ تم نے جو کچھ کہا ہے اگر تم اس میں سچے ہو تو میں اللہ سے بخشش کا طلب گار ہوں اور اگر تم نے غلط باتیں کہی ہیں تو میں اللہ

سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہارا یہ گناہ بخش دے۔

۳۔ جو تم سے بے وفائی کرے، تم اس کے ساتھ خیر خواہی اور وفاداری کا سلوک کرو۔

عِلم کے متعلق تین باتیں یہ ہیں:

۱۔ جو بات تم کو معلوم نہ ہو وہ علماء سے پوچھو لیکن ان کی آزمائش یا ان کو پریشان کرنے کے لیے کچھ نہ پوچھو۔

۲۔ علم کے ذریعے سے جب تم عدل اور میانہ روی کو سمجھ لو تو پھر اسی کے مطابق راہ اختیار کرو اور اس میں احتیاط سے کام لو۔

۳۔ فتویٰ دینے سے اس طرح بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو۔ تم اپنی گردن پر دوسرے لوگوں کی ذمہ داری مت لو۔

عمرو بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ سے عرض کیا: میں کئی کئی سال کے بعد آپ سے ملاقات کرتا ہوں۔ پس مجھ کو ایسی نصیحت فرمائیے کہ جس کو دائماً اختیار کرسکوں۔ آپ نے فرمایا: تمہارے لیے میری نصیحت یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت، زبان کی سچائی، پرہیزگاری اور اجتہاد کا راستا اختیار کرو۔ اس بات کو یاد رکھو کہ اجتہاد سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ خوف الٰہی شامل نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس پر نظر نہ رکھو جو مال و متاع میں تم سے بڑھا ہوا ہو، کیونکہ اللہ کا فرمان ہے کہ:

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۵۵)

یعنی اے رسولؐ! ان لوگوں کے مال اور اولاد یں تم کو حیرت میں نہ ڈالیں۔

نیز اللہ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱۳۱)

یعنی اے رسولؐ! تم اپنی آنکھیں اس طرف نہ کرو جو ہم نے اس دنیاوی زندگی کی چمک میں سے ان بعض گروہوں کو عطا کیا ہے۔

امامؑ نے عمرو بن سعید سے مزید فرمایا: اگر تم کو یہ خوف لاحق ہو کہ تم ان باتوں میں بعض پر عمل نہ کرسکو گے تو رسول اللہؐ کی زندگی کو یاد کر لیا کرو، کیونکہ آنحضرتؐ کی خوراک

میں جو، مٹھائی میں کھجور اور ایندھن میں کھجور کی لکڑیاں ہوتی تھیں، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ جب مل جائیں۔

جب تم کسی مصیبت سے دوچار ہو جاؤ تو اپنی مصیبت کا رسول اللہؐ کے مصائب سے موازنہ کر لیا کرو کیونکہ مخلوق خدا میں سے کسی پر آنحضرتؐ کی مانند مصیبت کبھی نہیں پڑی۔

حمران بن اعین کو آپ نے یہ نصیحت فرمائی: اے حمران! اپنی معاش کے معاملہ میں اس طرف نہ دیکھو جو تم سے برتر ہے، بلکہ اس کی طرف دیکھو جو تم سے کمتر ہے۔ اس طرح تم اسی پر قناعت کر سکو گے جو اللہ نے تم کو دیا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس طریقے سے تم اپنے رب سے زیادہ پانے کے مستحق ہو جاؤ۔ دیکھو! ایسا چھوٹا سا عمل بھی جو یقین کے ساتھ متواتر کیا جائے وہ اللہ کے نزدیک اس عمل سے افضل ہے جو یقین کے ساتھ نہ کیا گیا ہو۔

نیز جان لو کہ تمہاری عبادت گزاری اس سے زیادہ فائدہ بخش نہیں ہے کہ تم حرام افعال سے بچو، مومنین کو ضرر پہنچانے سے پرہیز کرو اور ان کی غیبت کرنے سے رکے رہو۔ زندگی میں اچھے اخلاق سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کم مال سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں کہ جس پر قناعت کرنا باعث جزا ہو۔ غرور سے زیادہ نقصان رساں کوئی جہالت نہیں ہے۔

آپ اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے: تم صبح کی نماز پڑھ کر سویرے سویرے روزی کی تلاش میں نکل جاؤ اور رزق حلال کے لیے محنت کرو۔ پس اللہ اس میں تمہاری مدد کرے گا اور تم کو رزق بہم پہنچائے گا۔

زید بن شحام نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: تم اپنے میں سے جس کسی کو دیکھو کہ وہ میری اطاعت کرتا ہے اس کو میرا سلام پہنچا دو۔ میں تم کو اللہ کی اطاعت، اپنے دین میں خوفِ خدا، احکام میں اجتہاد، زبان کی سچائی، امانت کے ادا کرنے، سجدوں کو طول دینے اور پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ رسول اللہؐ یہی احکام لے کر آئے تھے۔ جس نے بھروسہ کر کے امانت رکھوائی ہو اس کی امانت واپس کیا کرو، خواہ وہ نیکوکار ہو یا بدکار ہو۔ رسول اللہؐ سوئی اور تاگہ

تک کے واپس کرنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ اپنے اقربا سے اپنی قرابت کا پاس کرتے رہو، یعنی ان کے مریضوں کی عیادت کرو، ان کے جنازوں میں شرکت کرو اور ان سب کے حقوق ادا کرتے رہو، کیونکہ اگر تم میں کوئی شخص دین کے بارے میں خوفِ الٰہی رکھتا ہو، اپنے قول میں سچا ہو، امانتیں ادا کرتا ہو، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہو اور پھر کہا جائے کہ یہ جعفری ہے تو یہ بات مجھ کو بھلی لگتی ہے اور اس سے مجھ کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ہاں اگر ایسا نہ ہو تو اس سے مجھ کو دلی تکلیف ہوتی ہے اور شرم بھی آتی ہے۔

آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا: جو عمدہ کھانے اور لذیذ مٹھائیاں تم اپنے پیٹ میں ڈالتے ہو، یہ نہ سمجھو کہ وہ اللہ کے غضب کی آگ کو ٹھنڈا کرنے والی ہیں۔ تم خوب جان لو کہ میں نے اپنے پدر عالی قدر سے، انہوں نے اپنے آبائے کرامؑ سے، انہوں نے امیر المومنینؑ سے اور انہوں نے رسول اللہؐ کو ایک روز یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: وہ شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا جو شکم سیر ہو کر سوئے جبکہ اس کا پڑوسی بھوکا رہ گیا ہو۔ اس پر ہم لوگوں نے کہا: یا رسول اللہؐ! پھر ہم تو ہلاک ہو گئے! آنحضرتؐ نے فرمایا: خواہ وہ تمہاری بچی ہوئی چند کھجوریں، روٹی کے ٹکڑے یا پرانے کپڑے ہی کیوں نہ ہوں، ان سے تم اللہ کے غضب کی آگ کو ٹھنڈا کر سکو گے۔

اے بندۂ خدا! تم کسی مومن کو خوف زدہ نہ کرنا، کیونکہ میرے والد امام محمد باقرؑ اپنے والد ماجد سے اور انہوں نے اپنے دادا امام علی بن ابی طالبؑ سے روایت کی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: جو کوئی کسی مومن پر تیکھی نگاہ ڈالے گا، اللہ اس کو قیامت کے دن خوف زدہ کرے گا جبکہ اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور اس کو بگڑی ہوئی صورت میں محشور کرے گا۔

آپ نے حفص بن غیاث سے فرمایا: اگر تم یہ کر سکو کہ پہچانے ہی نہ جاؤ تو پھر ایسا ہی کرو۔ اگر تم خدا کے نزدیک قابل ستائش ہو گئے تو خواہ لوگ تمہاری تعریفیں نہ کرتے ہوں اور تم ان کی نگاہ میں برے ٹھہرائے جاؤ، پھر بھی تمہیں ضرر نہ پہنچے گا۔ اگر یہ بات تمہارے بس میں ہو کہ تم اپنے گھر سے باہر نہ نکلو تو ضرور ایسا ہی کرو، کیونکہ گھر سے

باہر نکلنے کی صورت میں تم پر واجب ہے کہ غیبت نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، حسد نہ کرو، دکھاوا نہ کرو، بناوٹی باتیں نہ کرو اور فریب سے کام نہ لو۔

امام جعفر صادقؑ سے سفیان ثوری نے کہا: اے فرزند رسول! مجھ کو نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: اے سفیان! اگر تم کو پسندیدہ شے حاصل ہو جائے تو بکثرت اللہ کی حمد کرو اور اگر تم کو ناپسندیدہ چیز درپیش ہو تو لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ بکثرت پڑھو۔ اگر تم کو روزی ملنے میں دیر ہو جائے تو کثرت سے استغفار کرو۔ سنو اے سفیان! جھوٹے میں مروت نہیں ہوتی، پریشان کرنے والے کا کوئی بھائی نہیں ہوتا۔ حسد کرنے والے کو چین نصیب نہیں ہوتا اور بداخلاق آدمی کو سرداری حاصل نہیں ہوتی۔

سفیان نے کہا: اے فرزند رسولؐ! کچھ اور بھی۔ آپ نے فرمایا: اے سفیان! اللہ پہ بھروسہ رکھو، مومن ہو جاؤ گے۔ جو کچھ اللہ نے تم کو دیا ہے اس پہ مطمئن رہو، غنی ہو جاؤ گے۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرو، مسلم بن جاؤ گے۔ بدکار کی صحبت اختیار نہ کرو ورنہ وہ تم کو بھی بدکاری سکھا دے گا اور اپنے معاملات میں ان لوگوں سے مشورہ کرو جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔

سفیان نے کہا: اے فرزند رسولؐ! کچھ اور بھی ارشاد ہو۔ اب آپ نے فرمایا: اے سفیان! جو کوئی قبیلہ کی مدد کے بغیر عزت، دولت کے بغیر مالداری اور اقتدار کے بغیر دبدبہ چاہتا ہو، اس کو چاہیے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کی ذلت سے نکل کر اس کی فرمانبرداری کی عزت کی طرف چلا جائے۔ جب اللہ تم کو کوئی نعمت عطا کرے اور تم چاہو کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے تو اس پر کثرت سے حمد و شکر کرتے رہو۔ کیونکہ اللہ فرماتا ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ۔ (سورۂ ابراہیم۔ آیت ۷) یعنی اگر تم شکر کرتے رہو گے تو میں زیادہ سے زیادہ دیتا رہوں گا۔ جب تمہاری روزی کے دستیاب ہونے میں دیر ہو جائے تو کثرت سے مغفرت کیا کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا۔ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا۔ (سورۂ نوح۔ آیت ۹ تا ۱۲)

اپنے رب سے طلب مغفرت کرو۔ بیشک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ آسمان کی طرف سے تم پر زور کی بارش بھیجے گا اور تمہارے مال اور اولاد کو بڑھائے گا۔ نیز تمہارے لیے باغ بنائے گا اور نہریں جاری کر دے گا۔

آپ نے عبداللہ بن جندب کو یوں نصیحت فرمائی: اے ابن جندب! اپنے نیک عمل پر بھروسہ کرنے والا آخرت میں برباد ہو جائے گا۔ اسی طرح وہ شخص بھی نجات نہیں پائے گا جو رحمتِ خدا کی امید میں گناہوں پر قائم رہتا ہے۔ عبداللہ بن جندب نے پوچھا: اے فرزندِ رسولؐ! تو پھر نجات کون پائے گا؟ آپ نے فرمایا: وہ لوگ نجات پائیں گے جو خوف اور امید کے درمیان رہتے ہوں، گویا کہ ان کے دل پرندے کے پنجہ میں ہیں اور ان میں کبھی ثواب کی تمنّا اور کبھی عذاب کا خوف ابھرتا ہے۔ ہاں! نماز سے غفلت کرنے والوں، فراشِ راحت پر سوتے رہنے والوں اور وقت گنوا کر اللہ کا مذاق اڑاتے والوں پر افسوس ہے۔ ان کے لیے آخرت میں کوئی راحت نہ ہو گی۔ روزِ قیامت اللہ ان سے کلام نہ کرے گا اور ان کے لیے تکلیف دہ عذاب تیار ہے۔

اے ابن جندب! اللہ کے لیے محبت کرو۔ نہ ایسے سخت مزاج بنو کہ لوگ تمہاری قربت سے نفرت کریں اور نہ ایسے بے وقار بنو کہ ہر جان پہچان والا تم کو حقیر سمجھے۔ جو تم سے کم مرتبہ ہو اس کا مذاق نہ اڑاؤ۔ حقدار سے اس کے حق پر جھگڑا نہ کرو، نادانوں کی بات پر عمل نہ کرو، کوئی تمہاری قرابتداری کا پاس نہ بھی کرے، تم اس کے ساتھ مروت کرتے رہو، جو تم کو محروم رکھے تم اس کو دیتے رہو، جو تمہارے ساتھ برائی کرے، تم اس سے اچھا سلوک کرو، جو تم کو برا کہے اس کو بھی تم سلام کا تحفہ پیش کرو۔ جو تمہارے ساتھ جھگڑا کرے تم اس کے ساتھ بھی انصاف سے کام لو۔ جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو، جیسے تم چاہتے ہو کہ تم کو معاف کر دیا جائے۔

اے ابن جندب! لوگوں کے سامنے اس لیے صدقات و خیرات مت دیا کرو کہ وہ تم کو نیکوکار کہیں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اپنا اجر کھو بیٹھو گے۔ ہونا یہ چاہیے کہ تم داہنے ہاتھ سے دو تو تمہارے بائیں ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ پس جس خدا کے لیے تم پوشیدہ طور پر صدقات ادا کرو گے وہ تم کو علانیہ طور پر اس کی جزا دے گا۔

امام جعفر صادقؑ نے اپنے اصحاب کو ایسی ہی اور بھی ہدایتیں اور نصیحتیں کی ہیں جو اہل بیتؑ کی امتیازی خصوصیات میں سے ہیں۔ امامؑ اپنے اصحاب اور دوسرے محبّوں کو یہ نصیحتیں کرکے اس امر کی کوشش فرماتے تھے کہ وہ لوگ اسلام کی بات کرنے سے پہلے اسلامی احکام اور اس کے آداب و اخلاق کا عملی نمونہ بن کر سامنے آئیں تاکہ وہ صحیح اسلام کے ایسے مبلغ ثابت ہوں کہ جو زبان سے نہیں، اپنے عمل سے تبلیغ کرتے ہیں۔

حلیتہ الاولیاء میں ایک راوی کا بیان ہے کہ: میں امام جعفر بن محمد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ کے فرزند موسیٰ کاظمؑ بھی آپ کے پاس موجود تھے جو آپ کے جانشین بننے والے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اس وقت آپ نے فرمایا: اے میرے بیٹے! میری یہ وصیت قبول کرو اور اس کو یاد رکھو۔ اگر تم اس پر عمل پیرا ہوگے تو کامیاب زندگی گزاروگے اور تمہارا انجام بھی قابل تعریف ہوگا۔ اے بیٹے! جو اللہ کے دیے ہوئے پر خوش رہے گا وہ تونگری حاصل کرے گا۔ جو اللہ کے دیے ہوئے پر مطمئن نہیں ہوتا وہ گویا اللہ کے فیصلہ کو غلط کہتا ہے۔ جس کو اپنی غلطی چھوٹی لگتی ہے، اس کو دوسرے کی خطا بہت بڑی معلوم ہوتی ہے لیکن جس کو دوسرے کی خطا چھوٹی نظر آئے اس کو اپنی خطا بڑی دکھائی دے گی۔

اے بیٹے! جو دوسرے کا پردہ چاک کرے گا خود اس کے گھر کی پوشیدہ باتیں بھی آشکار ہو جائیں گی۔ جو ظلم کی تلوار کھینچے گا، اس کا گلا بھی اسی سے کٹ جائے گا۔ جو اپنے بھائی کے لیے گڑھا کھودے گا، وہ خود بھی اسی میں گرے گا۔ جو بری جگہوں پر جائے گا، وہ مورد اتہام قرار پائے گا۔ اے بیٹے! لوگوں پر الزام لگانے سے باز رہنا، پھر تم بھی الزام لگنے سے بچے رہوگے۔ ہاں تو تم ہمیشہ حق بات کہنا، خواہ وہ تمہارے حق میں ہو یا تمہارے خلاف جاتی ہو۔ نیز کتابِ خدا کی تلاوت کرتے رہنا۔ سلام علانیہ کیا کرنا، نیکی کا حکم دیتے رہنا، جو قطع رحمی کرے اس کے قریب ہونا اور جو سوال کرے اس کو ضرور دینا۔

دیکھو! لوگوں کے عیوب ظاہر نہ کرنا کیونکہ ایسا کرنے والا خود ان عیوب کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اگر تم بخشش چاہتے ہو تو اس کے منبع کی طرف رجوع کرنا کیونکہ بخشش کا ایک منبع ہے اور وہ دین ہے۔ دین سے اس کے اصول، اصول سے فروع اور فروع سے اجر و ثواب کا پھل حاصل ہوتا ہے۔

میرے بیٹے! جب تم کسی سے ملنے جاؤ تو نیک لوگوں سے ملا کرو اور برے لوگوں کو منہ نہ لگاؤ کیونکہ وہ ایسے پتھر ہوتے ہیں جن سے پانی نہیں پھوٹتا' ایسے درخت ہوتے ہیں جن کے پتے ہرے نہیں ہوتے اور وہ ایسی زمین کی طرح ہوتے ہیں کہ جس میں سبزہ نہیں اُگتا۔

امام علیؑ بن موسیٰؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: میرے والدبزرگوار امام موسیٰ کاظمؑ نے تا زندگی اس وصیت پر عمل کو ترک نہیں کیا تھا۔

اصول کافی میں ایک روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: فراوانی کے زمانہ میں غلہ کو روکے رکھنے کی مدت چالیس دن اور تنگی کے زمانہ میں صرف تین دن ہے۔ پس فراوانی کے زمانہ میں غلہ کو چالیس دن سے زیادہ روکے رکھنے والا ملعون ہے اور تنگی کے زمانہ میں تین دن سے زیادہ روکنے والا ملعون ہے۔ چنانچہ آپ لوگوں کی تنگی کے دنوں میں اپنے خادم سے فرمایا کرتے کہ: بازار سے جَو خرید لاؤ اور ان کو ہمارے کھانے میں شامل کر دیا کرو کیونکہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ ہم اچھی غذا کھائیں' جبکہ عوام الناس معمولی غذا کھا رہے ہوں۔

ابوجعفر فزاری سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک خدمتگار مصادف کو ایک ہزار دینار دیے اور اس سے کہا کہ ہم ایک بڑا کنبہ بن گئے ہیں' اس لیے ضروری ہے کہ اب تم مصر جاؤ اور اس رقم سے کاروبار کرو۔ چنانچہ وہ سامان تجارت لے کر سوداگروں کے قافلے کے ساتھ مصر کو چل دیا۔ جب یہ قافلے والے مصر کے نزدیک پہنچے تو انکو سوداگروں کا ایک قافلہ مل گیا' جو وہاں سے واپس جا رہے تھے۔ مصادف کے قافلے والوں نے ان سوداگروں سے پوچھا کہ ہم جو مال لے کر آئے ہیں' مصر کی منڈی میں ان کی کیا کیفیت ہے؟ ان لوگوں نے بتایا کہ اس وقت مصر کی منڈی میں یہ چیزیں بالکل نہیں ہیں۔ جو چیزیں وہ اپنے ہمراہ لائے تھے' وہ سب عوام کے روزمرہ کی ضروریات تھیں۔ پس ان لوگوں نے قسم کھا کر عہد و پیمان کر لیا کہ وہ اپنے مال کو ہر دینار پر ایک دینار کے نفع سے کم پر نہ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا مال اسی دُگنی منافع کی شرح پر فروخت کیا اور مدینہ واپس ہو گئے۔ جب مصادف امامؑ کی خدمت میں آیا تو اس کے پاس دو تھیلیاں تھیں اور ہر ایک میں ایک ایک ہزار دینار تھے۔ اس نے آپ سے

عرض کیا : میں آپ پر قربان ہو جاؤں، یہ آپ کی اصل رقم ہے اور یہ وہ منافع ہے جو اس پر حاصل ہوا ہے۔ اس پر امام ؑ نے فرمایا: یہ تو بہت زیادہ نفع ہے۔ تم نے اپنے مال پر کس طریقہ سے اس قدر نفع کما لیا؟ تب اس نے بیان کیا کہ: چونکہ وہاں ان چیزوں کی شدید ضرورت تھی، اس لیے ہمارے لوگوں نے قسم کھا کر طے کیا کہ وہ اپنا مال ایک دینار پر ایک دینار سے کم نفع پر نہ بیچیں گے۔ امام ؑ نے فرمایا: ارے تم نے ایک مسلمان قوم کے بارے میں یہ قسم کھائی کہ تم ان کے ساتھ دگنے سے کم نفع پر تجارت نہ کرو گے؟ پھر آپ نے اپنی اصل رقم لے لی اور وہ سارا منافع اس کو دیدیا اور فرمایا: بس یہ ہے ہماری اصل رقم۔ اے مصادف! تلواروں کی جنگ کرنا رزق حلال حاصل کرنے سے آسان کام ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق ؑ کے حکیمانہ اقوال

اگر کوئی مؤلف یہ چاہے کہ وہ امام جعفر صادق ؑ کی تاریخ وسیرت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے تو اس کو ان کی سیرت کے ہر ایک پہلو کے لیے ایک جداگانہ اور مستقل کتاب لکھنا ہوگی۔ اس کام کے لیے جتنا مطالعہ اور جتنی محنت درکار ہے وہ میں فراہم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے عملاً یہ مؤثر طریقہ اختیار کرتے ہوئے کہ نہ سب چیزیں لوں اور نہ سب چیزیں چھوڑوں، آپ کی سیرت میں سے صرف چند جھلکیوں پر اکتفا کی ہے۔ چنانچہ میں اس باب میں مختلف موضوعات پر آپ کے اقوال اور حکیمانہ باتیں پیش کروں گا۔

آپ نے فرمایا کہ: بہترین فرمانروا وہ ہے جس کو تین خصلتیں دی گئی ہوں:

۱۔ نرم دلی ۲۔ سخاوت اور ۳۔ عدل

مزید یہ کہ وہ ان تین معاملوں میں کوتاہی نہ کرتا ہو، یعنی سرحدوں کی حفاظت، ظلم کا استیصال اور اپنے احکام کے نفاذ کے لیے نیکوکار لوگوں کا انتخاب۔

آپ نے فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں جو کسی آدمی سے دُور نہ ہونی چاہئیں:

۱۔ نصیحت کرنے والے سے مشورہ کرنا۔

۲۔ حسد کرنے والے کی دلجوئی کرنا اور

۳۔ عوام الناس سے محبت کا برتاؤ کرنا۔

آپ نے فرمایا: تین آدمیوں سے خبردار رہو اور وہ یہ ہیں:

۱۔ خیانت کار ۲۔ ظالم اور ۳۔ چغل خور

جو تمہارے واسطے خیانت کرے گا وہ تم سے بھی خیانت کرے گا۔ جو تمہارے لیے کسی پر ظلم کرے گا وہ تم پر بھی ظلم کرے گا اور جو تم سے کسی کی چغلی کرے گا، پھر کسی سے تمہاری چغلی بھی کرے گا۔

تین باتیں ہیں کہ جو ان کو اختیار کرے گا وہ اپنا مقصود حاصل کرے گا:

۱۔ وہ جو اللہ سے لو لگائے رکھے۔

۲۔ اللہ کے ہر فیصلہ سے مطمئن رہے۔

۳۔ اللہ کے بارے میں اچھا خیال قائم رکھے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا: لوگوں میں سب سے بڑا عبادت گزار وہ ہے جو فرائض پورے کرتا رہے اور ان میں سب سے بڑا زاہد وہ ہے جو فعل حرام سے بچا رہے۔

روزی کمانے میں ہر محنت کش کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں:

۱۔ اپنے کام میں ماہر ہو

۲۔ امانتدار ہو اور

۳۔ مالک کے مفاد کا خیال رکھے۔

اگر قرابتداروں کے ساتھ تین چیزیں نہ ہوں گی تو لوگوں کے تعلقات میں کمزوری آجائے گی اور دشمنوں کو ان پر ہنسنے کا موقع ملے گا، وہ یہ ہیں:

۱۔ آپس میں حسد سے پرہیز کرنا تاکہ گروہوں میں بٹ جانے سے ان کے معاملات چوپٹ نہ ہو جائیں۔

۲۔ آپس میں مل جل کر رہیں تاکہ ان میں لگاؤ قائم رہے۔

۳۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں تاکہ ان سب کی عزت برقرار رہے۔

کسی شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ: میں تو ہر وقت دنیا ہی میں لگا رہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: تم کیا کرتے رہتے ہو؟ اس نے عرض کیا: میرے بیوی بچے ہیں، جو کچھ کماتا ہوں ان پر خرچ کرتا ہوں اور اس میں سے اپنے بھائیوں کو دیتا رہتا ہوں۔ اس پر امامؑ نے

فرمایا کہ: یہ کام دنیا کے نہیں، آخرت کے ہیں تین طرح کے آدمیوں کو صرف بھلائی ہی ملتی ہے۔ خاموش رہنے والے، برائی سے پرہیز کرنے والے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنیوالے۔
آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: انکساری سب سے بڑی عقلمندی ہے۔ اس پر کسی نے پوچھا: انکساری کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اپنے مرتبہ سے کم تر مقام پر بیٹھنا، جو بھی سامنے آئے اس کو سلام کرنا اور دکھاوے سے پرہیز کرنا، چاہے وہ جائز ہی کیوں نہ ہو۔
آپ نے مفضل بن عمر سے فرمایا: میں تم کو ایسی چھ خصلتوں کی خبر دیتا ہوں جو ہمارے شیعوں کو اختیار کرنی چاہئیں۔ جو امانت کوئی تمہارے سپرد کرے اس کو واپس کرو۔ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ یاد رکھو کہ ہر کام کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، پس تم اس کو نظر میں رکھو۔ کچھ امور کے نتائج یکایک ظہور میں آتے ہیں، ان سے اور بھی خبردار رہو۔ پہاڑ کی چڑھائی میں ہوشیار رہو جبکہ وہ ڈھلوان اور ناہموار بھی ہو۔ اپنے بھائی سے ایسا وعدہ نہ کرو جس کو تم پورا نہیں کر سکتے ہو۔
ایک شخص امامؑ کی خدمت میں اکثر آتا اور آپ کی صحبت میں رہا کرتا تھا۔ پھر اس نے آپ کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ جب آپ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو ایک شخص نے کہا کہ ہم اس کی برائی کرنا نہیں چاہتے۔ تب امامؑ نے فرمایا: ہر شخص کی اصلیت اس کی عقل سے، اس کی خوبی کردار اس کے دین سے اور اس کی عزت اس کے تقویٰ سے ہے۔ ورنہ انسان ہونے کے لحاظ سے تو سب لوگ برابر ہیں۔
ایک روایت میں ہے کہ عبدالعزیز قزاز اہل بیتؑ میں الٰہی صفات کا قائل تھا۔ ایک مرتبہ وہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے فرمایا: اے عبدالعزیز! میرے لیے پانی لے آؤ تاکہ میں اس سے وضو کروں۔ عبدالعزیز کہتا ہے کہ میں امامؑ کا حکم بجا لایا۔ پھر جب آپ تشریف لائے تو میں نے اپنے تئیں کہا کہ: وہ یہی ہیں کہ جن کے متعلق میں کیا سے کیا کہا کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اے عبدالعزیز! کسی پر اتنا وزن نہ ڈالو کہ جسے وہ سہار نہ سکے۔ میں تو خدا کے خلق کیے ہوئے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں۔ آپ نے مزید فرمایا: ظلم سے دور رہو کیونکہ مظلوم کی آہ آسمان پر جاتی ہے۔ جو شخص مسلمانوں کے بارے میں فکر نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں

ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ فرمایا کرتے تھے کہ جو مسلمانوں کے معاملات کی فکر نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہے اور جو کسی مسلمان کو" اے مسلمانوں" کہتا ہوا پائے اور پھر اس کو جواب نہ دے وہ بھی مسلمان نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا: مومن وہ ہے جو پاکیزہ روزی کمائے، اس کے اخلاق اچھے ہوں، ضمیر صاف ہو، اپنا زائد مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو، فضول باتوں سے پرہیز کرتا ہو، لوگ اس کی برائی سے محفوظ ہوں اور جو لوگوں کے ساتھ اپنی ذات کے مقابلہ پر بھی انصاف کرتا ہو۔

تم کو جھگڑا کرنے سے بچے رہنا چاہیے، کیونکہ جھگڑا دلوں کو الجھائے رکھتا ہے اور اس سے دو رُخا پن پیدا ہوتا ہے۔ جو کوئی دشمنی کا بیج بوئے گا، پھر خود ہی اس کا بدلہ دیکھے گا۔ جو اپنے غصہ پر قابو نہ پائے گا وہ اپنی عقل کو کھو بیٹھے گا۔

جو کسی بے عقل کے ساتھ بے عقلی سے پیش آیا، گویا وہ اس پر راضی ہے کہ جو اس کے ساتھ کیا گیا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے عمل میں اسی کی نقل اتاری ہے۔ جو کسی ظالم کے عذر کو قبول کرتا ہے اللہ اس پر بھی ایک ایسے شخص کو مسلّط کر دے گا جو اس پر ظلم کرے۔ پھر جب وہ دعا کرے گا تو اللہ قبول نہ کرے گا اور اس کے مظلوم ہونے پر اس کو کوئی اجر نہ ملے گا۔ جو کوئی لوگوں پر زیادتی کرنے سے اپنا ہاتھ روکے گا تو لوگ اس سے بہت سارے ہاتھ روکے رہیں گے۔

آپ نے ارشاد فرمایا: علم فقہ کے جاننے والے انبیاءؑ کے امین ہوتے ہیں۔ اگر تم فقیہوں کو سلاطین کے ہاں جاتے ہوئے دیکھو تو اپنے دین کے معاملہ میں ان پر ملامت کرو۔

آپ نے فرمایا: تین چیزیں زندگی کو اجیرن کر دیتی ہیں: ظالم فرمانروا، بدخو ہمسایہ اور لڑاکا عورت۔ تین چیزیں وہ ہیں جن کے بغیر دنیا میں سکون نہیں ہوتا: امن، عدل اور رزق۔ تین چیزوں سے انسان کو ہمیشہ دُور رہنا چاہیے: شریروں کی قربت، عورتوں سے میل جول اور بدعتیوں کی صحبت۔

جس کو یہ تین چیزیں حاصل ہو جائیں، وہ سیر چشم ہو جائے گا: جو مل جائے اس پر قناعت، جو دوسروں کے پاس ہو اس سے بے اعتنائی اور فضول کاموں سے پرہیز۔

آپ نے اپنے کسی صحابی سے فرمایا: احمق سے مشورہ نہ کرو۔ جھوٹے سے مدد نہ مانگو اور حاکم کی محبت پر اعتبار نہ کرو۔ کیونکہ احمق اپنی کوشش کرے گا، پھر بھی تمہارا مدعا پورا نہ ہوگا۔ جھوٹا تم کو قریب والے سے دور اور دور والے سے قریب کر دیگا اور حاکم پر کتنا ہی اعتماد کرو وہ تم کو چھوڑ دیگا اور تم جتنے بھی قریب رہو وہ تم سے کٹ جائے گا۔

کسی علاقہ کے لوگ تین شخصیتوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے: ایسا فقیہہ جو عالم بھی ہو اور خدا ترس بھی۔ بھلائی کرنے والا حاکم کہ جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور ایسا طبیب جو عقلمند اور صاحب اعتماد ہو۔ اگر کہیں لوگوں کے درمیان ایسے شخص نہ ہوں تو پھر وہ لوگ بگٹٹ گھوڑوں کی طرح ہوں گے۔

آپ نے فرمایا: ظلم کا زمانہ ہو اور لوگ دغاباز ہوں تو اطمینان ناممکن ہوگا۔ اگر تم چاہو کہ اپنے بھائی کے خلوص کا امتحان کرو تو اس کو غصہ دلاؤ۔ اگر وہ تمہاری محبت پر جما رہے تو وہ تمہارا بھائی ہے ورنہ نہیں۔

آپ نے فرمایا: اللہ سے اس طرح ڈرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں بھی دیکھ رہے، وہ تو تم کو دیکھ ہی رہا ہے۔ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ تم کو نہیں دیکھ رہا تو پھر تم کافر ہو اور اگر تم یہ جانتے ہوئے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے، اس کی نافرمانی کرتے رہے تو گویا تم نے اس کو اپنی طرف دیکھنے والوں میں سب سے حقیر سمجھا ہے۔

تین اشخاص قیامت کے روز سب سے زیادہ اللہ کے قریب ہوں گے۔ وہ جو قدرت رکھتے ہوئے بھی غصہ کی حالت میں اپنے سے کمزور پر زیادتی نہ کرے۔ وہ جو دو آدمیوں کے درمیان چلتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کی طرف دوسرے سے زیادہ مائل نہ ہو اور وہ شخص جو سچ بولے خواہ وہ اس کے حق میں ہو یا اس کے خلاف جاتا ہو۔

تین اشخاص قابل رحم ہوتے ہیں: وہ غنی جو نادار ہو جائے، قوم کا وہ معزز آدمی جس کو ذلیل کیا جائے اور وہ عالم کہ جاہل لوگ جس کا مذاق اڑائیں۔

جب اللہ کسی قوم کے لیے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے ایک رحمدل فرمانروا اور اس کے ساتھ عادل وزیر کو بھیج دیتا ہے۔

آپ فرمایا کرتے: بخدا! بھیڑوں کا وہ غلہ کہ جس کے محافظ موجود نہ ہوں، اس پر

دو خونخوار بھیڑیوں کے حملے سے اتنی زیادہ تباہی نہیں ہوتی، جتنی تباہی منصب اور دولت کی خواہش سے ایک مسلمان کے دین پر آتی ہے۔ آپ یہ بھی فرماتے تھے: ایک ایسے بددیانت پر بھروسہ مت کرو جس کو تم آزما چکے ہو۔ جس پر تم نے بھروسہ کیا ہو، پھر اس پر الزام مت لگاؤ۔ تنگ مزاج آدمی کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ حاسد کو کبھی دلجمعی حاصل نہیں ہوتی۔ میرا محبوب بھائی وہ ہے جو میرے عیوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایمان کا سب سے مضبوط پہلو یہ ہے کہ تم اللہ کے لیے محبت کرو، اللہ کے لیے دشمنی کرو۔ اللہ کے لیے دو اور اللہ ہی کے لیے محروم رکھو۔ اپنے بھائی کی کسی بات کا بُرا مت مانو جبکہ اس میں بھلائی بھی نظر آتی ہو۔

آپ نے ایک شیعہ سے فرمایا: کیا بات ہے کہ تمہارا بھائی تمہاری شکایت کرتا ہے؟ اس نے کہا: وہ میری شکایت اس لیے کرتا ہے کہ میں نے اس پر اپنا حق ثابت کیا ہے۔ اس پر آپ بحالت غصہ اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے: گویا کہ تم نے اس پر اپنا حق جتا کر اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی؟ تم نے دیکھا نہیں کہ خدا نے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو "سوء حساب" سے ڈرتے تھے تو کیا وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ اللہ ان پر ظلم کرے گا؟ نہیں! بلکہ وہ صرف اس چھان بین سے ڈرتے تھے جس کو اللہ نے سخت محاسبہ کہا ہے۔ لہٰذا جو اپنے بھائی کے معاملات کی چھان بین کرتا ہے وہ اس کے ساتھ ایک طرح کی بدسلوکی کرتا ہے۔ اسی طرح آپ کی اور بھی نصیحتیں اور حکیمانہ اقوال ہیں، جو آپ نے اپنے اصحاب اور دوسرے لوگوں کے لیے بیان فرمائے تاکہ ان کے ذہنوں سے برائی کا بیج ختم کر کے ان کو حق اور خیر کی حمایت میں ظلم اور ظالموں کے خلاف اقدام کرنے کے لیے تیار کریں۔

امام جعفر صادقؑ کی اولاد اور آپ کی وفات

امام جعفر صادقؑ کی دس اولادیں تھیں یعنی سات بیٹے اور تین بیٹیاں۔ ایک اور قول کے مطابق آپ کے گیارہ فرزند تھے یعنی سات بیٹے اور چار بیٹیاں۔ ان کی پیدائش کی ترتیب یہ تھی: امام موسیٰؑ بن جعفرؑ۔

محمد اور اسحاق یہ دونوں ایک ماں سے تھے اور محمد کو ان کے حسنِ صورت کے باعث محمد دیباج کہا جاتا تھا۔

علیؑ جنہوں نے خلیفہ مامون کے زمانہ میں مکہ میں عباسیوں کے خلاف خروج کیا اور جب مامون ان پر فتح یاب ہو گیا تو ان کو اپنے ساتھ خراسان لے گیا۔ پھر وہ اسی کے پاس مقیم رہے۔ یہاں تک کہ سنہ ۲۰۳ھ میں وفات پا گئے۔ جب مامون نے ان کے جنازے کو کندھا دیا تو اس سے کہا گیا: آپ اتنی زحمت اٹھا رہے ہیں، اگر آپ ان کا جنازہ پڑھ کر واپس چلے جاتے تو بھی کافی ہوتا۔ وہ کہنے لگا: ارے ان کی قرابتداری کے حقوق کو گزشتہ دو سو سال سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، جن کو ہم آج ادا کر رہے ہیں۔

واقدی سے روایت ہے کہ اہل حجاز و تہامہ نے ان علی بن جعفرؑ کی بیعت کر لی تھی۔ اس طرح وہ ایک اہم قوت بن گئے تھے لیکن ایک جنگ میں معتصم نے ان کو گرفتار کر کے مامون کے پاس بھیج دیا۔ تاہم اس نے ان کے ساتھ نیک سلوک کیا۔ یہ بڑے عبادت گزار اور روزہ دار تھے۔ چنانچہ ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ جو کپڑے پہن کر باہر گئے ہوں، انہی کپڑوں میں واپس بھی آئے ہوں کیونکہ وہ اپنے کپڑے فقیروں کو دے آتے تھے۔

اسماعیل اعرج، ان کو اعرج اس لیے کہا گیا کہ ان کے پاؤں میں نقص تھا۔ فرقہ اسماعیلیہ اور اس کی تمام شاخیں انہی سے منسوب ہیں۔ بیشتر روایات کے مطابق وہ اپنے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔

ان کے علاوہ عبداللہ، عباس، ام فروہ، اسماء، فاطمہ صغریٰ اور فاطمہ کبریٰ ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ام فروہ ہی کا نام اسماء تھا اور ام فروہ ان کی کنیت تھی۔

شیخ مفید کا بیان ہے کہ اسماعیل، عبداللہ اور ام فروہ کی والدہ فاطمہ بنت حسین بن علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ ابن ابیطالبؑ تھیں جبکہ امام موسیٰ کاظمؑ، محمد دیباج اور اسحاق تینوں ایک ماں سے تھے جن کا نام حمیدہ بربریہ تھا۔

امام جعفر صادقؑ کی دیگر اولادیں مختلف ماؤں سے ہوئیں۔ آپ کی اولاد میں سب سے بڑے عبداللہ[1] تھے اور انہی کے نام سے آپ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ ان کا سر کچھ

---

[1] قول مشہور کے مطابق عبداللہ نہیں، اسماعیل سب سے بڑے تھے۔

چپٹا سا تھا، اس لیے ان کو عبداللہ افطح کہا جاتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ کے بعض اصحاب جو آپ کے بعد عبداللہ کی امامت کے قائل ہوئے وہ انھی کی نسبت سے افطحیہ کہلاتے تھے۔

آپ نے اپنی وفات سے قبل اپنے فرزند موسیٰؑ بن جعفرؑ کی امامت کا اعلان فرمایا اور اپنے اصحاب کو آگاہ فرما دیا۔ جیساکہ صحیح روایات اس امر پر دلالت کرتی ہیں۔ آپ کی وفات ماہ شوال اور بقولے ماہ رجب ۱۴۸ھ میں اڑسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ اس بارے میں کچھ اور روایات بھی بیان کی گئی ہیں۔

شیخ کلینی نے ابوایوب جوزی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے بیان کیا: ابوجعفر منصور نے مجھ کو آدھی رات کے وقت بلوایا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک شمع تھی اور ہاتھ میں ایک خط تھا۔ میں نے جاتے ہی سلام کیا تو اس نے وہ خط میری طرف بڑھایا اور روتے ہوئے کہنے لگا: یہ مدینہ کے گورنر محمد بن سلیمان کا خط ہے جس میں اس نے مجھ کو اطلاع دی ہے کہ جعفرؑ بن محمدؑ نے وفات پائی۔ پس کہو کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. جعفرؑ کا سا شخص اب کہاں ہوگا؟ پھر بولا کہ لکھو! جب میں نے خط کا ابتدائی حصہ لکھ لیا تو اس نے کہا: اب یہ لکھ دو کہ اگر انھوں نے کسی شخص کے حق میں وصیت کی ہو تو اس کو بلا کر اس کی گردن اڑا دو۔ بعد میں مدینہ کے گورنر کی طرف سے اس خط کا یہ جواب آیا کہ: امام جعفر صادقؑ نے پانچ افراد کے لیے وصیت فرمائی ہے۔ ابوجعفر منصور، محمد بن سلیمان، عبداللہ بن جعفر، موسیٰ بن جعفر اور بی بی حمیدہ بربریہ۔ اس پر منصور بولا: ان سب کو قتل کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

مروج الذہب مسعودی میں ہے کہ اس وقت منصور کی خلافت کے دس سال گزر چکے تھے جبکہ آپ نے ۱۴۸ھ میں وفات پائی اور بقیع میں اپنے والد، اپنے دادا، اپنی جدۂ ماجدہ فاطمہ زہراؑ اور اپنے بزرگ امام حسنؑ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مزید برآں مسعودی نے مروج الذہب میں اور ابن جوزی نے تذکرۃ الخواص میں بیان کیا ہے کہ ان سب قبروں پر ایک پتھر نصب ہے، جس پر لکھا ہے کہ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ حمد ہے اللہ کے لیے جو قوموں کو نابود کرنے والا اور بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈالنے والا ہے۔ یہ قبر ہے فاطمہؑ بنت رسول اللہؐ

سیدۃ نساء العالمین کی اور یہ قبریں ہیں حسنؑ بن علیؑ، علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ، محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ اور جعفرؑ بن محمدؑ کی۔

جب لوگ آپ کا جنازہ لے کر چلے تو ابو ہریرہ عجلی نے یہ اشعار کہے:

جب اٹھانے والے اور کاندھا دینے والے ان کو اپنی گردنوں پر اٹھانے لگے تو میں نے کہا کہ ارے تم جانتے بھی ہو کہ کس کو بلند ترین عظمت سے خاک کی گہری قبر کی طرف لے جا رہے ہو۔ کل ان کے نشان قبر پہ لوگ مٹی ڈالیں گے لیکن بہتر یہ ہوتا کہ یہ مٹی وہ اپنے سروں پر ڈال لیتے۔

امام موسیٰ کاظمؑ

امام ابوالحسن موسیٰؑ بن جعفر، امام جعفر صادقؑ کی اولاد میں سب سے بڑے بیٹے نہیں تھے۔ غالباً وہ آپ کے تیسرے یا چوتھے بیٹے تھے۔ ان کی اولاد میں سب سے بڑے عبداللہ افطح تھے اور آپ کی کنیت انہی سے تھی۔ بیشتر روایات یہ بتلاتی ہیں کہ امام موسیٰ بن جعفرؑ ۷ صفر ۱۲۸ھ کو ابواء میں پیدا ہوئے، جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے۔ رسول اللہؐ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب کی قبر یہیں ہے۔ جیسا کہ المحاسن میں برقی نے روایت کی ہے کہ آپ کی ولادت کے بعد امام جعفر صادقؑ نے دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا تھا اور وہ تین روز تک جاری رہی۔ آپ کی والدہ ایک اندلسی خاتون تھیں اور ایک دوسرا قول یہ ہے کہ بربر کی تھیں۔ ان کا نام بی بی حمیدہ تھا اور وہ نیک خوئی اور تقویٰ میں بڑے بلند درجہ پر فائز تھیں۔

آپ تقریباً بیس سال تک اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ رہے۔ اس مدت میں آپ نے بنی امیہ کا عہد حکومت دیکھا جو اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ آپ نے اپنے لڑکپن کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی دیکھا کہ مدینہ اطراف وجانب سے آئے ہوئے علماء اور طالبان علم سے بھرا ہوتا تھا۔ وہ سب بوڑھے اور جوان آپ کے والد ماجد کے حضور جمع ہوا کرتے تھے۔ ان میں کچھ تو وہ لوگ ہوتے تھے جو آپ سے حدیث اور دیگر اسلامی علوم حاصل کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے افراد بھی ہوتے تھے جو آپ سے توحید، تشبیہ، قدر،

امامت اور دیگر موضوعات پر مناظرہ کرنے آتے تھے جن پر اس زمانے میں بحثیں ہو رہی تھیں اور ان کے بارے میں لوگوں کی رائیں آپس میں بٹی ہوئی تھیں۔ انھی حالات میں بیس سال گزر گئے جن میں آپ اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں رہے، جو آپ کو علم و حکمت کے دقیق اور عجیب نکات سے آگاہ فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ابتداءِ شباب ہی میں علماء کی توجہ کا مرکز بن گئے اور آپ نے ان کے لیے مختلف علمی مشکلات کے حل میں قابل ترجیح حکم کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔

راویوں نے وہ گفتگو نقل کی ہے جو ایک موقع پر آپ کے اور حنفی مذہب کے امام ابو حنیفہ کے درمیان ہوئی تھی۔ نیز انھوں نے ابو حنیفہ کا وہ اعتراف بھی تحریر کیا ہے جو اس گفتگو کے اختتام پر ان کی زبان سے نکلا تھا۔ حالانکہ آپ اس وقت ابھی لڑکپن سے آگے بڑھنے نہ پائے تھے۔ اس گفتگو سے آپ کی مذکورہ بالا علمیت کا ثبوت ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابو حنیفہ اس وقت امام جعفر صادقؑ سے ملاقات کی اجازت ملنے کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ ادھر آنکلے جو ابھی اپنے لڑکپن ہی میں تھے۔ امام ابو حنیفہ نے چاہا کہ کچھ ہنسیں بولیں اور آپ سے تبادلۂ خیال کریں۔ چنانچہ انھوں نے ایک سوال کر کے آپ سے بات چیت کا آغاز کیا لیکن آپ کے جواب کی گہرائی اور گیرائی کو دیکھ کر آپ کے متعلق ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آگئی۔ تب انھوں نے دوسرا سوال پیش کر دیا جو مشکل ترین مسائل میں سے تھا اور اس زمانہ میں فقہاء و متکلمین وغیرہ کے درمیان اس کے متعلق شدید بحثیں چل رہی تھیں۔ راویوں نے اس گفتگو کو درج ذیل صورت میں بیان کیا ہے:

حسن بن علی بن شعبہ کی تحف العقول اور بعض دوسری کتابوں میں آیا ہے کہ ابو حنیفہ نے بیان کیا: میں نے امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ کے زمانہ میں حج ادا کیا۔ جب میں مدینہ آیا تو میں آپ کے گھر گیا اور دہلیز پر بیٹھ کر آپ سے ملاقات کی اجازت کا انتظار کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک نوخیز لڑکا باہر نکل آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر ایک مسافر کو ضرورت لاحق ہو جائے تو وہ کہاں پیخانہ سے فراغت حاصل کرے؟ اس نے مجھ پر ایک نظر ڈال کر کہا: اس کو چاہیے کہ دیوار کی اوٹ لے لے اور لوگوں کی آنکھوں، دریا کے کناروں، پھلوں کے گرنے کی جگہوں، گھروں کے دروازوں، لوگوں کے راستوں اور مسجدوں سے ہٹا رہے۔

وہ نہ تو قبلہ کی جانب منہ کرے اور نہ ادھر کو پیٹھ پھیرے، پھر وہ اپنے کپڑوں کو سنبھال کر اپنی مرضی سے رفع حاجت کرے۔ ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ اس لڑکے کا یہ جواب سن کر میری آنکھوں میں اس کی شرافت اور میرے دل میں اس کی عظمت نے گھر کر لیا۔ چنانچہ میں نے کہا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں، یہ تو بتایئے کہ معصیت کس کی ہوتی ہے؟ انھوں نے مجھے بغور دیکھا اور کہا کہ ذرا سہولت سے بیٹھ جاؤ تو بتاؤں گا۔ چنانچہ میں ان کی طرف ہمہ تن ہو کر بیٹھ گیا۔ اب انہوں نے کہا: ضروری ہے کہ معصیت بندے کے بارے میں ہو یا اللہ کے بارے میں ہو یا دونوں ہی کے بارے میں ہو۔ اگر معصیت اللہ کے بارے میں ہے تو وہ ایسا عادل اور انصاف کرنے والا ہے کہ بندے پر ظلم نہ کرے گا اور جو عمل اس نے نہیں کیا، اس پر اس کا مواخذہ نہ کرے گا۔ اگر وہ اللہ اور بندے کے بارے میں ہے تو پھر بھی وہ خود ان دو میں سے قوی تر ہے اور وہ اپنے کمزور بندے کے ساتھ انصاف کرنے اور اس کو معاف کر دینے کا زیادہ سزاوار ہے۔ اگر معصیت تنہا کسی بندے کے بارے میں کی گئی ہے تو اس کے کرنے نہ کرنے کا بار اس شخص پر ہے جس نے وہ کی ہے۔ اگر اللہ اس کو معاف کر دے تو یہ اس کا کرم ہوگا اور سزا دے تو یہ اس کے گناہ اور جرم کی بنا پر ہوگی۔

راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ابو حنیفہ نے کہا: میں نے جو کچھ ان امام زادے سے سنا، اس سے میں اتنا سیر ہو گیا کہ پھر امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ کی خدمت میں کوئی سوال پیش کیے بغیر اس آیت کی تلاوت کرتا ہوا رخصت ہو گیا:

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ. وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۳۴)

یعنی ان میں بعض ذریت ہیں بعض کی، اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

بہر حال قبل اسکے کہ امام موسیٰ بن جعفرؑ لڑکپن کی حد سے نکلتے، کئی سال تک امویوں اور ان کے مخالفوں میں خونریز لڑائیاں ہوتی رہیں۔ امویوں سے لڑنے والے عباسی تھے، جو اہل بیت پر ان کے مظالم کو لوگوں کے سامنے دہراتے رہتے تھے۔ ان لڑائیوں کے باعث تمام مسلم علاقوں میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا ـــ جس کو لوگوں نے اس خیال سے پسند کیا کہ اس کے سایہ میں ان کو آزادی، وقار اور ان کے وہ حقوق مل جائیں گے جو دسیوں سال سے امویوں نے غصب کر رکھے تھے لیکن اس حکومت کے چند ہی سال گزرے

تھے اور نئے فرمانروا ابھی اپنے حریف بنی امیہ کو شکست دینے کے بعد امن و امان قائم کرنے میں ہی لگے ہوئے تھے کہ انھوں نے علویوں اور خاص کر شیعوں کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کرنا شروع کردیا جو اموی خلفاء کیا کرتے تھے۔ چنانچہ منصور نے بارہا کوشش کی کہ وہ امام جعفر صادقؑ کو کسی بہانے سے قتل کردے لیکن اللہ نے آپ کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ جیسا کہ ہم پچھلے صفحات میں آپ کی سیرت کے بیان میں ذکر کرچکے ہیں۔ امام موسیٰ بن جعفرؑ نے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ بیس سال گزارے جن میں سے تقریباً پانچ سال بنی امیہ کے عہد میں، ساڑھے چار سال عبداللہ بن محمد بن علی السفاح کے عہد میں اور نو سال اور کچھ مہینے منصور دوانیقی کے عہد میں گزرے۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار امام جعفر صادقؑ کے بعد اپنی امامت کے پینتیس سال گزارے جن میں دس سال منصور کی حکومت میں اور چودہ سال اس کے بھائی ہارون رشید کی حکومت میں گزارے اور پھر اسی کے عہد میں ماہ رجب ۱۸۳ھ میں زہر خورانی سے آپ کی شہادت واقع ہوئی جو آپ کو قید خانہ کے داروغہ سندی بن شاہک کے ذریعے دلوایا گیا، جیسا کہ راویوں میں مشہور ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ کی تصریحات

وہ تصریحات جو نبی اکرمؐ کی جانب سے آنحضرتؐ کے بارہ میں جانشینوں کے متعلق وارد ہوئیں، راویوں میں مشہور ہیں۔ جن میں سے بعض میں ———— ان کے اسماء گرامی اور بعض میں ان کی ایسی صفات مذکور ہیں جو ان کے علاوہ دوسرے اشخاص پر منطبق نہیں ہوتیں۔ ان میں سے بعض تصریحات کا ذکر ہم اسی کتاب کی پہلی فصل میں کر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ بارہ اماموں میں سے ہر امام اپنے خاص اصحاب کے درمیان اپنے جانشین کی صراحت کرتے ہوئے ان کو اس سے باخبر فرماتے رہے ہیں۔

کتاب الارشاد، شیخ مفید میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ سے آپ کے فرزند موسیٰؑ کی امامت کے صریحی اعلان کی روایت آپ کے جن بزرگ اصحاب، خاص احباب، مقرب افراد اور معتمد اور نیکوکار فقہاء نے کی ہے۔ ان میں مفضل بن عمر، معاذ بن کثیر، عبدالرحمان بن حجاج، فیض بن مختار، یعقوب السراج، سلیمان بن خالد، صفوان جمال اور دوسرے اصحاب

شامل ہیں۔ بلکہ یہ روایت خود امام جعفرؑ کے بیٹوں اسحاق اور علی سے بھی وارد ہوئی ہے جن کے بارے میں شیخ مفید کا بیان ہے کہ یہ دونوں فضیلت اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے برابر تھے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ موسیٰ صیقل نے مفضل بن عمر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں امام ابوعبداللہ جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ وہاں ابوابراہیم امام موسیٰ کاظمؑ بھی آئے جبکہ وہ نوعمر ہی تھے۔ اس وقت امام ابوعبداللہؑ نے مجھ سے فرمایا: تم اپنے ساتھیوں میں سے جن کو قابل اعتماد سمجھتے ہو، ان کو میرے اس فرزند کی معرفت کراؤ اور اس کی امامت سے باخبر کردو۔

شبیب نے معاذ بن کثیر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے امام ابوعبداللہؑ سے عرض کیا کہ اللہ نے جس طرح آپ کے والد بزرگوار پر یہ احسان فرمایا کہ ان کے بعد آپ اس منزلت پر فائز ہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کی وفات سے پہلے وہ آپ کو بھی ایک ایسا ہی صاحب منزلت جانشین عطا فرمائے۔ آپ نے فرمایا: اللہ نے مجھ پر یہ کرم کر دیا ہے۔ میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، وہ کون ہے؟ عبد صالح موسیٰ کاظمؑ کہ جو سو رہے تھے، آپ نے ان کی جانب اشارہ کیا اور فرمایا: "یہ سونے والا" ہی میرا جانشین ہوگا۔ حالانکہ اس وقت وہ بہت ہی کم عمر تھے۔

عبدالرحمان بن حجاج کا بیان ہے کہ میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ دعا فرما رہے تھے جبکہ آپ کے فرزند موسیٰ کاظمؑ آپ کے پہلو میں بیٹھے اس پر آمین کہتے جا رہے تھے۔ تب میں نے امامؑ سے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، مجھے آپ سے جو دلی وابستگی اور نیازمندی حاصل ہے، آپ اس سے واقف ہیں پس یہ فرمائیے کہ آپ کا جانشین کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا: اے عبدالرحمٰن! موسیٰ کاظمؑ نے یہ زرہ پہن لی ہے اور وہ ان کے جسم پر ٹھیک بیٹھتی ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا: اس کے بعد مجھ کو کسی اور شے کی حاجت نہیں ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ابن خازم نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ: فرزند رسولؐ! آپ پر جب وہ امر واقع ہو جائے کہ جس سے کوئی مفر نہیں ہے تو پھر یہ امر امامت

کس کے لیے ہوگا ؟ اس پر امام ابوعبداللہ نے فرمایا : جب وہ امر واقع ہو جائے تو تمہارا امام یہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنا ہاتھ ابوالحسن موسیٰ کاظمؑ کے داہنے شانہ پر لگایا۔

محمد بن ولید نے علی بن جعفرؑ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار امام جعفر بن محمد صادقؑ کو اپنے اصحاب اور خاص دوستوں کے ایک گروہ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ : تم لوگ میرے بیٹے موسیٰ کاظمؑ سے اچھی نصیحتیں حاصل کیا کرو۔ کیونکہ یہ میرے بیٹوں میں سب سے زیادہ صاحبِ فضیلت ہے۔ یہی میرے بعد میرا جانشین، میری جگہ قائم ہونے والا اور میرے بعد ساری کائنات پر اللہ کی حجت ہے۔

ایسی ہی اور بھی بہت سی روایات ہیں کہ جن میں امام جعفر صادقؑ نے امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت کی صراحت فرمائی ہے جن میں سے بیشتر اسی طرز عمل کی حامل ہیں جو اس بارے میں آپ سے ظاہر ہوتا رہا تھا۔ البتہ بعض اوقات آپ نام کی صراحت کرنے سے کتراتے تھے۔ کیونکہ آپ کو برسر اقتدار حکومت کی طرف سے فکر و اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ وہ یوں کہ آپ کے آخری زمانۂ عمر میں حکومت آپ کے شب و روز پر سخت نگاہ رکھا کرتی تھی، جیسا کہ آپ کے ساتھ منصور کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے۔ پھر جب اس کو آپ کی وفات کی اطلاع ملی تو وہ آپ کے جانشین کا پتا لگانے کے لیے متفکر ہو گیا۔ چنانچہ اس نے مدینہ میں اپنے گورنر محمد بن سلیمان کو لکھا کہ : اگر امام جعفر صادقؑ نے کسی کو براہ راست اپنا جانشین مقرر کر دیا ہو تو اس کو ماخوذ کر کے اس کی گردن اڑا دی جائے۔ اس پر گورنر کا یہ جواب آیا کہ آپ نے پانچ افراد کے حق میں وصیت فرمائی ہے جو یہ ہیں : خلیفہ ابوجعفر منصور، گورنر محمد بن سلیمان، آپ کے دو بیٹے عبداللہ اور موسیٰ کاظمؑ اور آپ کی زوجہ بی بی حمیدہ بربریہ۔

جیسا کہ کلینی نے ابوایوب جوزی سے روایت کی ہے، یہ نام پڑھ کر منصور نے کہا تھا کہ اگر ایسا ہے تو پھر ان افراد کو قتل کرنے کی کوئی سبیل موجود نہیں ہے۔ ان پانچ افراد کے حق میں امام جعفر صادقؑ کی اس وصیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے جانشین کے بارے میں جابر حکومت کی طرف سے خوف تھا، اس لیے آپ نے اپنی وصیت کو اس طریقہ پر مرتب کر دیا۔ البتہ اپنے حقیقی جانشین کی اطلاع اپنے معتمد اصحاب کو دے دی تھی۔

آپ نے ان کو یہ ہدایت بھی کی کہ مناسب فضا قائم ہونے تک اس کے نام و نشان کو عام شیعوں سے بھی پوشیدہ رکھا جائے۔

امام موسیٰ کاظم نے منصب امامت ان حالات میں سنبھالا جبکہ چاروں طرف خطرات پھیلے ہوئے تھے۔ آپ نے اور آپ کے پرخلوص شیعوں نے آپ کی امامت کا زمانہ اس گھٹی گھٹی فضا میں گزارا کیونکہ منصور کے خاص آدمی آپ پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے جس سے آپ کو سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ادھر عام شیعہ حیران تھے اور جانتے نہ تھے کہ اب وہ کس سے رجوع کریں۔ ان میں سے جو افراد آستانۂ امامت سے رجوع کرتے وہ بھی عبداللہ افطح تک اور اسماعیل (مرحوم) کے حامیوں تک ہی پہنچ پاتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ امام جعفر صادقؑ نے خلیفہ منصور اور اس کے عمال کے خوف سے اپنے شرعی جانشین کے نام کو اپنے خاص اصحاب کے علاوہ دوسرے عام شیعوں سے پوشیدہ رکھا تھا۔

جیسا کہ ہشام بن سالم کی روایت میں آیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہم امام ابوعبداللہؑ کی وفات کے بعد مدینہ آئے تو میں، محمد بن نعمان صاحب طاق اور کچھ دوسرے افراد اس خیال سے عبداللہ بن جعفرؑ کے پاس گئے کہ شاید اپنے والد بزرگوار کے بعد وہی صاحب امامت ہوں گے۔ چنانچہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ دیگر افراد بھی ان کی صحبت میں موجود تھے۔ پس ہم نے ان سے دریافت کیا: کتنے مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ انہوں نے کہا: دوسو درہم پر پانچ درہم۔ ہم نے ان سے کہا: سو درہم پر کتنی؟ انہوں نے کہا: ڈھائی درہم۔ ہم نے کہا: بخدا مرجئہ یہ نہیں کہتے ہیں۔ اس پر وہ بولے: بخدا! مجھ کو یہ معلوم نہیں کہ مرجئہ کیا کہتے ہیں۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ پھر ہم ان کے ہاں سے گم گشتہ کی حیثیت سے نکل آئے اور کچھ نہیں سمجھ رہے تھے کہ کہاں اور کس کے پاس جائیں۔ درعین حال ایک بزرگ شخص نے مجھ کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا تو میں ڈرا کہ مبادا یہ منصور کا کوئی جاسوس نہ ہو کیونکہ مدینہ میں اسکے جاسوس اس ٹوہ میں لگے رہتے تھے اور ہر اس شخص پر نگاہ رکھتے تھے جسکے پاس لوگ جمع ہوتے ہوں اور جسکے بارے میں انہیں گمان ہوتا کہ یہ امام جعفر صادقؑ کا جانشین ہے تاکہ اسکو پکڑیں اور اسکی گردن

ماردیں۔ چنانچہ اسی ڈر سے میں نے احول سے کہا کہ تم ایک طرف ہو جاؤ کیونکہ میں اپنے اور تمہارے لیے آنے والے خطرے سے ڈر رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس شخص کو میرے علاوہ کوئی اور مطلوب نہیں ہے۔ اس پر احول مجھ سے ہٹ کر دور چلا گیا اور میں اس بزرگ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ اب میں اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا ہوں۔ پھر میں گویا اس کا قیدی بنا رہا بلکہ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ایک قیدی ہوں اور موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ اس نے مجھ کو امام ابوالحسن موسیٰؑ بن جعفرؑ کے کے دروازے تک پہنچا دیا اور وہ مجھ کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ اتنے میں دربان نے آکر مجھ سے کہا کہ اللہ تم پر رحم فرمائے" اندر آجاؤ۔ پس میں اس مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں ابوالحسنؑ موجود تھے۔ آپ نے خود ہی گفتگو کی ابتدا کی اور مجھ سے کہا: تم مرجئہ" قدریہ" معتزلہ اور زیدیہ کی طرف نہ جاؤ بلکہ میری طرف آؤ۔ میں نے کہا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں" کیا آپ کے والد بزرگوار گزر گئے؟ فرمایا: ہاں! میں نے کہا: کیا ان پر موت وارد ہوئی ہے؟ فرمایا: ہاں۔ میں نے کہا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں" ان کے بعد اب ہمارا امام کون ہے؟ فرمایا: تم جو کچھ چاہتے ہو" اللہ تم کو اس کی طرف ہدایت کرے! میں نے کہا: آپ کے بھائی عبداللہ کا خیال ہے کہ اپنے والد بزرگوار کے بعد وہی امام ہیں۔ فرمایا: میرے بھائی عبداللہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی عبادت نہ کی جائے۔ میں نے کہا: پھر آپ کے والد بزرگوار کے بعد کون ہے؟ فرمایا: اگر اللہ تمہاری ہدایت کرنا چاہے گا تو ہدایت کر دے گا۔ میں نے کہا: میں آپ پر فدا ہو جاں کیا وہ آپ ہی ہیں؟ فرمایا: میں یہ نہیں کہتا۔

تب میں نے دل ہی دل میں کہا کہ میں نے سوال کرنے کا صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا۔ پھر میں نے ان سے کہا: کیا آپ کا کوئی امام ہے؟ فرمایا نہیں۔ اب تو مجھ پر ان کی ایسی عظمت و ہیبت طاری ہوئی کہ بس اللہ ہی جانتا ہے۔ میں نے ان سے کہا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں" کیا میں آپ سے اسی طرح مسائل دریافت کروں" جیسے آپکے والد بزرگوار سے دریافت کیا کرتا تھا؟ فرمایا: جیسی تمہاری مرضی ہو لیکن اس ملاقات کو کسی پر ظاہر نہ کرنا ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔ پھر جب میں نے ان سے بعض مسائل معلوم کیے تو ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ علم و حکمت کا ایک سمندر ہے جو خشک ہونیوالا نہیں۔ اس کے بعد میں نے ان سے عرض کیا: آپ کے والد بزرگوار کے شیعہ جو ادھر سے ادھر بھٹک رہے ہیں، کیا میں یہ بات ان کو بتلا دوں اور ان کو آپ کی طرف آنے کی دعوت دوں؟ جبکہ آپ مجھ سے اس کو پوشیدہ رکھنے کا پیمان لے چکے ہیں۔ فرمایا: ان میں سے جن کو تم عقلمند سمجھو ان کو بتلا دو، تاہم ان سے بھی اس امر کے پوشیدہ رکھنے کا وعدہ لے لینا کیونکہ اگر کوئی اس کو ظاہر کرے گا تو یہ کاٹ ڈالا جائے گا۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنے گلوئے مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔

جب میں امامؑ کے ہاں سے نکلا تو ابو جعفر احول مجھ سے آ ملے۔ انہوں نے پوچھا: تم پر کیا گزری؟ میں نے کہا میں نے ہدایت پالی۔ پھر میں نے ان کو اپنی ساری سرگزشت سنائی۔ بعد میں ہم نے زرارہ اور ابو بصیر سے ملاقات کی اور ان دونوں نے بھی آپ کی خدمت میں حاضری دی۔ آپ سے مسائل پوچھے، آپ کا کلام سنا اور آپ کی امامت کے بارے میں مطمئن ہو گئے۔ اسی طرح جو کوئی بھی آپ کی خدمت میں آتا رہا ـــــ وہ آپ کی امامت کا قائل ہوتا گیا، سوائے عمار ساباطی، عبد اللہ افطح اور ان تھوڑے سے افراد کے جو ان دونوں کے ساتھ ہو گئے۔ پھر امام کے بارے میں خبریں پھیلتی ہی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ بیشتر شیعہ صحیح راہ پر آ گئے اور اپنے دینی امور اور اپنی دوسری مشکلوں میں آپ سے رجوع کرنے لگے۔ حالانکہ منصور امامؑ کی اور شیعہ لوگوں کی نگرانی کراتا تھا اور وہ اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ شیعوں میں پھوٹ پڑی رہے اور وہ آپ کے بھائی عبد اللہ افطح اور اسماعیل کے حامیوں کی طرف رجوع کرتے رہیں۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اسماعیل تو امام جعفر صادقؑ کی زندگی ہی میں وفات پا چکے تھے اور آپ مدینہ کے گورنر محمد بن سلیمان کی ہمراہی میں ان کے جنازہ کے ساتھ چلتے رہے تھے۔ بعض روایات یہ بھی بتلاتی ہیں کہ جنازہ لے جانیوالے جب چند قدم چل لیتے تو امام جعفر صادقؑ کفن کا پلّو ہٹا کر لوگوں کو اسماعیل کا چہرہ دکھاتے جاتے تھے۔ اس کے باوجود بھی کچھ نافہم شیعہ ان کی امامت کے قائل ہو گئے اور پھر منصور نے اس نظریہ کی تائید کی اور یہ خبر مشہور کر دی کہ بصرہ کے گورنر نے اطلاع دی ہے کہ اسمٰعیل وہاں موجود ہیں۔ چنانچہ وہاں جب وہ ایک پرانے مریض کے پاس سے گزرے تو اس

کے لیے دعا کی اور وہ مریض صحت یاب ہو گیا۔

امام موسیٰ کاظمؑ کا حلم، سخاوت اور دیگر صفات

راویوں کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے عابد، زاہد، فقیہہ، سخی اور سب سے زیادہ شریف تھے۔ آپ آدھی رات کے بعد نافلہ تہجد شروع کرتے اور صبح صادق تک اس میں مشغول رہتے تھے۔ پھر آپ نماز فجر ادا کرتے اور بعد میں خدا کے حضور نالہ و بکا کے ساتھ دعا و مناجات میں منہمک رہتے، یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی اور آپ کو خوف خدا سے غشں آجاتا تھا۔ جب آپ قرآن کی تلاوت فرماتے تو آپ کی آواز کے سوز و گداز کے اثر سے لوگ جمع ہو جاتے اور کبھی کبھی تو وہ آپ کی رقت کو دیکھ کر رونے لگتے تھے۔ اسی بنا پر لوگوں نے آپ کو عبد صالح کہنا شروع کر دیا تھا اور آپ کے نام اور کنیت سے یہی عرف آپ کی پہچان بن گیا تھا۔

کتاب مطالب السؤل میں ہے کہ آپ کے القاب صالح، صابر، امین اور کاظم تھے اور آپ کا عرف عبد صالح تھا۔ آپ کو کاظمؑ اس لیے کہا گیا کہ آپ غصے کو پی جاتے تھے اور جو بھی مصیبت در پیش ہو اس پر صبر فرماتے تھے۔ تذکرۃ الخواص ابن جوزی میں یہ روایت آئی ہے کہ آپ کا لقب اس لیے کاظمؑ ہوا کہ جب کسی سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچتی تو آپ اس کو اتنا مال عطا فرماتے کہ وہ سیر ہو جاتا تھا۔

ابن جوزی نے آپ کے بارے میں شفیق بلخی کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں ۱۴۹ھ میں حج کے لیے روانہ ہوا۔ جب میں قادسیہ میں تھا تو وہاں ایک وجیہہ، تشکیل اور خوش رنگ نوجوان آیا جو ایک اونی کمبل اوڑھے اور پیروں میں سادہ سے جوتے پہنے تھا۔ وہ وہاں آکر لوگوں سے الگ تھلگ بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو کوئی صوفی معلوم ہوتا ہے جو لوگوں سے الگ رہنا چاہتا ہے۔ بخدا کہ میں ضرور اس کے پاس جا کر اس کو تنگ کروں گا۔ پھر میں اس کے قریب گیا لیکن جونہی اس نے مجھ کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا: اے شفیق! زیادہ گمان کرنے سے باز رہا کرو کیونکہ کئی گمان محض گناہ ہوتے ہیں۔ تب میں نے اپنے دل میں کہا کہ بخدا کا

کوئی نیک بندہ ہے جس نے میرے دل کی بات بیان کردی ہے۔ اب میں ضرور اس سے ملوں گا اور اس سے گزارش کروں گا کہ وہ میرے پاس بیٹھے لیکن اس اثناء میں وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر جب ہم واقصہ پر اترے، میں نے اس کو نماز پڑھتے پایا جبکہ اس کے اعضاء کانپ رہے تھے اور آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ سوچا کہ اب اس کے پاس چل کر اس سے معذرت کروں، لیکن اس نے اپنی نماز مختصر کر کے خود ہی مجھ سے کہا: اے شقیق! میں اس شخص سے درگزر کرتا ہوں جو توبہ کرے، ایمان لے آئے اور نیک عمل کر کے ہدایت پا جائے۔ اس پر میں نے خیال کیا کہ یہ صاحب کرامات ہے کہ جس نے دو مرتبہ میرے دل کا راز میرے سامنے بیان کر دیا ہے۔ بعد میں جب ہم منزل زبالہ پر اترے تو وہاں وہ کنوئیں پر کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک مشکیزہ تھا، جس کو وہ پانی سے بھرنا چاہتا تھا لیکن وہ مشکیزہ کنوئیں میں گر پڑا۔ تب اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا:

جب میں پیاسا ہوتا ہوں، تو ہی مجھ کو پانی بہم پہنچاتا ہے اور جب مجھ کو کھانے کی خواہش ہوتی ہے، تو ہی مجھے کھانا مہیا کرتا ہے۔

خدا کی قسم! میں نے دیکھا کہ کنوئیں کا پانی اتنا چڑھ آیا کہ اس نے اپنا مشکیزہ اس میں سے نکال کر بھر لیا اور پھر وضو کر کے چار رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد وہ ریت کے ایک ڈھیر کی طرف چلا گیا، جہاں وہ ریت اٹھا اٹھا کر مشکیزہ میں ڈالتا اور پیتا جاتا تھا۔ اب میں نے اس سے عرض کیا: اللہ نے جو رزق آپ کو عطا کیا ہے اور جو نعمت آپ کو دی ہے اس میں سے مجھ کو بھی کھلایئے۔ اس پر اس نے کہا: اے شقیق! ہم پر اللہ کی نعمتیں ظاہر اور باطن میں آتی رہتی ہیں۔ پس تم اللہ کے بارے میں حسن ظن رکھو۔ اس کے بعد اس نے مشکیزہ مجھ کو دیدیا۔ جب میں نے اس میں سے پیا تو وہ ستو اور شکر تھی۔ بخدا کہ میں نے اس سے زیادہ لذیذ اور خوشبودار کوئی چیز نہ پی تھی۔ اس سے میری بھوک بھی دور ہو گئی۔ نیز پیاس بھی بجھ گئی۔ وہاں میں نے کئی روز قیام کیا لیکن پھر مجھ کو کھانے پینے کی خواہش نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اس کو کہیں نہیں دیکھا، یہاں تک کہ میں مکہ پہنچ گیا۔ وہاں ایک رات میں نے اس کو دیکھا کہ وہ قبۂ شریف کے نزدیک نصف شب کے وقت نماز میں آہ وزاری کر رہا تھا۔ وہ اسی حال میں رہا، یہاں تک کہ صبح صادق طلوع ہو گئی،

تب وہ اپنے مصلّے پر بیٹھا تسبیح پڑھتا رہا۔ پھر نماز فجر ادا کی۔ اس کے بعد بیت اللہ کا طواف کیا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ تب میں اس کے پیچھے ہو لیا تاکہ دیکھوں وہ کہاں جاتا ہے۔ جب میں کچھ آگے گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ اس کے ساتھ بہت سا مال، خدمتگار اور کثیر لوگ ہیں۔ میں حیران تھا کہ وہ اس سے بہت مختلف ہے، جیسا کہ میں نے اس کو راستے میں دیکھا تھا۔ یعنی بہت سے لوگ اس کے پاس آجا رہے ہیں جو اس کو سلام کرتے اور مبارکباد دیتے ہیں۔ میں نے بڑھ کر ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اس نے بتایا کہ یہ موسیٰؑ بن جعفرؑ بن محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ بن ابیطالبؑ ہیں۔

مذکورہ حدیث میں امام موسیٰ کاظمؑ کی عبادت اور ان کی اللہ سے وابستگی کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے، وہ اس کے عین مطابق ہے جو راویوں اور محدثوں نے آپکے بارے میں بالاتفاق بیان کیا ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی سند کی کمزوری یا اس کے راوی شقیق بلخی کے مائل بہ تصوف ہونے یا اس میں آپ کی کرامت کے بیان سے کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا کیونکہ شیعہ اور سنی روایات میں آپ کے اور دیگر ائمہ اہلبیتؑ کے لیے اس سے بھی عظیم تر امور بیان کیے گئے ہیں اور یہ ایسے افراد کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے جو اللہ کی پکار پر لبیک کہتے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں کہ اللہ بھی ان کی دعا کو قبول کرے، ان کی خواہش پوری کرے اور ان کی مدد کرتا رہے۔ پھر بھی ایسی کرامات کی تصدیق کرنا یا ان پر ایمان لانا اہلبیتؑ سے وابستگی رکھنے کا ضروری حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح راویوں اور محدثوں کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے۔ نیز یہ کہ آپ ایسے بڑے سخی تھے کہ قریب اور بعید ہر ایک کو دیتے رہتے تھے۔ جو تھیلیاں آپ اہل حاجت کو دیتے تھے، ان میں کوئی تھیلی تین سو دینار سے کم نہ ہوتی تھی۔ اس لیے لوگ کہا کرتے تھے کہ اس شخص پر تعجب ہے کہ امام موسیٰ بن جعفرؑ کی طرف سے تھیلی ملے اور وہ پھر بھی ناداری کی شکایت کرے۔

خطیب کی تاریخ بغداد میں ہے کہ آپ ایسے کشادہ دل سخی تھے کہ ہر وقت تین سو اور چار سو دینار کی تھیلیاں تیار رکھتے تھے۔ آپ رات کے وقت ان کو ناداروں کے گھروں میں ڈال آتے تھے۔ اس زمانے میں آپ کی یہ تھیلیاں ضرب المثل بن گئی تھیں۔

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں محمد بن عبداللہ بکری سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں کچھ رقم قرض لینے کی خاطر مدینے گیا لیکن وہاں لوگوں نے مجھ کو مایوس کر دیا۔ تب میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں امام ابوالحسن موسیٰؑ بن جعفرؑ کے پاس چلوں اور ان سے اس بات کی شکایت کروں۔ پس میں آپ کی مزروعہ زمینوں پر گیا اور وہاں آپ کی خدمت میں حاضری دی۔ تب آپ نے خود ہی میری حاجت دریافت فرمائی اور میں نے آپ سے سارا قصہ بیان کیا۔ اسی وقت آپ حجرے میں تشریف لے گئے اور جلد ہی باہر آ گئے۔ باہر آ کر آپ نے اپنے خدمت گار کو حکم دیا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔ جب وہ چلا گیا تو آپ نے ہاتھ بڑھا کر مجھ کو تین سو دینار کی ایک تھیلی عطا فرما دی اور میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں عیسیٰ بن محمد ابن مغیث القرظی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے جوانیہ کے قریب ام عظام نامی کنوئیں پر کدو، کھیرے اور خربوزے بوئے۔ جب کھیتی پکنے پر آئی تو اس پر ٹڈی دل ٹوٹ پڑا اور جو کچھ بھی تھا چٹ کر گیا۔ ادھر میں نے اس کھیتی اور دو اونٹوں کی قیمت کے عوض ایک سو بیس دینار قرض لے رکھا تھا۔ کھیتی اجڑنے کے بعد ایک روز میں بیٹھا ہوا تھا کہ امام موسیٰؑ بن جعفر وہاں تشریف لے آئے اور سلام کر کے کہنے لگے: تمہارا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا: میں تو بے ہاتھ پاؤں کا ہو گیا ہوں، کیونکہ ٹڈی دل میری پوری کھیتی چٹ کر گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تم نے اس کے لیے کتنا قرض لیا تھا؟ میں نے عرض کیا: دو اونٹوں کی قیمت سمیت ایک سو بیس دینار۔ آپ نے فرمایا: اے عرفہ! جاؤ اور ابوالمغیث کے لیے ایک سو پچاس دینار لے آؤ۔ پھر فرمایا کہ اس طرح تم کو تیس دینار اور دو اونٹ نفع میں بچ رہیں گے۔ میں نے کہا: اے صاحبِ برکت شخصیت! آپ اندر جا کر میرے لیے دعا فرمائیے۔ چنانچہ آپ نے اندر جا کر دعا کی اور مجھ کو رسول اللہؐ کی یہ حدیث سنائی کہ: ہر آزمائش میں استقامت سے کام لو۔ چنانچہ میں نے انہی اونٹوں سے اس زمین کو جوتنے کا کام شروع کر دیا اور اس کی خوب آبپاشی کی، حتیٰ کہ اللہ نے مجھ کو اسی میں برکت عطا فرما دی۔

اس کے بعد خطیب بغدادی نے ایک اور روایت درج کی ہے کہ جو ادریس بن ابی رافع نے محمد بن موسیٰ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں اپنے والد امام موسیٰ کاظمؑ

کے ساتھ موضع سایت میں اپنی جاگیر پر گیا جہاں ہم کو ایک سرد ترین صبح سے سابقہ پڑا۔ ہم وہاں سے چل کر سایت کے ایک چشمہ پر پہنچے۔ تب کھیتوں میں سے ہوتا ہوا ایک حبشی غلام ہمارے پاس آیا۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا اور اس کے سر پر ایک دیگچہ تھا جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ ہمارے غلاموں کے پاس آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: تمہارے سردار کہاں ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ یہ ہیں۔ اس نے پوچھا اُن کی کنیت کیا ہے؟ انھوں نے بتایا: ابوالحسنؑ! اب وہ امام کے پاس آیا اور بولا: اے میرے آقا، اے ابوالحسنؑ! یہ حلوہ میں آپ کے لیے ہدیہ لایا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اسے ان غلاموں کے حوالے کر دو۔ جب ان لوگوں نے وہ حلوہ کھا لیا تو وہ شخص چلا گیا۔ پھر وہ اپنے سر پر لکڑیوں کا ایک گٹھا لے کر واپس آیا اور بولا: اے میرے آقا! یہ لکڑیاں میں آپ کو ہدیتہً پیش کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ان کو تو غلاموں کے پاس رکھو اور اب ہمارے لیے آگ لے آؤ۔ چنانچہ وہ گیا اور آگ لے آیا۔

راوی نے مزید کہا ہے کہ امام ابوالحسنؑ نے اس کا اور اس کے آقا کا نام لکھ کر مجھ کو دیا اور فرمایا: اے بیٹے! اس کو اس وقت تک اپنے پاس حفاظت سے رکھو جب تک کہ میں اسے تم سے طلب نہ کروں۔ پھر ہم وہاں سے اپنی جاگیر پر آگئے۔ وہاں پر آپ نے حسب دل خواہ قیام کیا اور اس کے بعد فرمایا: اب تم لوگ ہمارے ساتھ خانۂ کعبہ کی زیارت کو چلو۔ چنانچہ ہم لوگ وہاں سے چل دیے اور مکہ پہنچ گئے۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد امام ابوالحسنؑ نے سواری منگوائی اور مجھ سے کہا: اب چلو اور سایت میں اس آدمی کو تلاش کریں۔ جب تم کو اس کے مکان کا پتا چل جائے تو مجھ کو بتا دینا تاکہ میں اس کے پاس چلوں، کیونکہ مجھ کو یہ برا لگتا ہے کہ میں اسے یہاں بلاؤں جبکہ یہ ضرورت بھی میری ہی ہے۔ پھر فرمایا کہ سوار ہو جاؤ، تب میں چلا اور اس آدمی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھ کو دیکھ کر پہچان لیا اور میں بھی اس کو پہچان گیا۔ میں وہاں سے واپس آنے لگا تو اس نے مجھ کو سلام کیا اور کہا: کیا ابوالحسنؑ آئے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ وہ کہنے لگا: تم کس لیے یہاں آئے ہو؟ میں نے کہا: میں اپنی ضروریات کے لیے آیا ہوں۔ اس کو سایت میں امامؑ کے مکان کا علم تھا۔ چنانچہ وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں اس سے ذرا پیچھے رہتا تھا، لیکن وہ خود میرے قریب آجاتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے علٰحدہ نہیں ہوگا، تو

میں اپنے آقا کی طرف چل دیا اور وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا، تا اینکہ ہم ان کے پاس پہنچ گئے۔ اب امامؑ نے مجھ سے کہا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اس کو میری بابت نہ بتانا؟ میں نے کہا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، یہ غلام، یہ اراضی اور اپنی تمام چیزیں میں آپ کے حضور پیش کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ اراضی تم سے لے لوں اور تم کو اس سے محروم کر دوں، کیونکہ فرمایا مجھ سے میرے والد بزرگوار نے اور ان سے ان کے جدامجد نے کہ اراضی کا بیچنے والا مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے اور خریدنے والا خوشحال ہو جاتا ہے لیکن وہ شخص یہ سب کچھ آپ کی خدمت میں پیش کرنے پر برابر اصرار کرتا رہا، بالآخر آپ نے وہ غلام اور وہ اراضی اس سے ایک ہزار دینار میں خرید لی، اس غلام کو آزاد کر دیا اور وہ اراضی اسی کو ہبہ کر دی۔

مقاتل الطالبیین میں یحییٰ بن حسن سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: امام موسیٰؑ کو جب کسی شخص کے حالات کا علم ہوتا تو آپ اس کو ایک تھیلی بھجوا دیتے جس میں دو سو یا تین سو دینار موجود ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ تھیلیاں زبان زدعام ہو گئی تھیں۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ مدینہ میں عمر بن خطاب کی اولاد میں سے ایک شخص آپ کو ایذا پہنچاتا اور امام علیؑ کو برا کہا کرتا تھا۔ آپ کے کچھ دوستوں نے کہا کہ آپ اجازت دیجیے کہ ہم اس کو قتل کر دیں۔ آپ نے ان کو سختی سے منع کر دیا اور اس پر خوب ڈانٹا۔ پھر آپ نے کسی سے اس بدزبان کے متعلق دریافت فرمایا تو اس نے بتایا کہ وہ مدینہ کے اطراف میں کھیتی کرتا ہے۔ چنانچہ آپ سوار ہوئے اور اس کے کھیت پر جا پہنچے، جہاں وہ آپ کو مل گیا۔ آپ اپنے گدھے پر سوار اس کے کھیت میں داخل ہو گئے۔ اس پر وہ عمری چیخا: کھیت میں مت چلو لیکن آپ برابر چلتے رہے تا اینکہ اس کے پاس جا پہنچے، اتر کر بیٹھ گئے اور اس سے ہنسی کی باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد آپ نے اس سے فرمایا: تم نے اس کھیت پر کتنا قرض لے کر لگایا ہے؟ اس نے کہا سو دینار، آپ نے پوچھا اس سے کتنا نفع ملنے کی توقع رکھتے ہو؟ وہ بولا: مجھ کو غیب کا علم نہیں ہے۔ اس پر امام نے اس سے کہا: میں نے تم سے یہ پوچھا ہے کہ تم اس کھیت سے کتنے نفع کی خواہش کرتے ہو کہ جو اس سے تم کو حاصل ہو؟ اس نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس سے دو سو دینار مل جائیں۔

چنانچہ آپ نے اس کو تین سو دینار دیے اور فرمایا: یہ کھیت اب بھی پہلے کی طرح تمہارا ہی رہے گا۔ عمری نے کھڑے ہوکر آپ کے سر کو بوسہ دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ امام موسیٰؑ بھی اٹھے اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ تب آپ نے اس عمری کو وہاں بیٹھا پایا۔ جب اس کی نظر آپ پر پڑی تو وہ بول اٹھا: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (سورۃ انعام۔ آیت ۱۲۴) یعنی اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا کار رسالت کس کے سپرد کرے۔ یہ دیکھ کر آپ کے اصحاب اس کی طرف لپکے اور کہنے لگے: کیا ماجرا ہے؟ پہلے تو تم امامؑ کے خلاف بولا کرتے تھے۔ اس پر اس نے ان سے بڑی لے دے کی۔ تاہم اس کے بعد وہ جب بھی مسجد میں آتا جاتا تو امام ابو الحسنؑ کے لیے دعا کیا کرتا تھا۔ آپ کے وہ دوست دار جو اس کو قتل کرنا چاہتے تھے، آپ نے ان سے فرمایا: بتاؤ کون سا طریقہ بہتر ہے، آیا وہ جس کا تم ارادہ رکھتے تھے یا وہ جو میں نے اس شخص کی اصلاح کے لیے اختیار کیا ہے؟

اسی طرح کی اور بھی بہت سی روایات ہیں جو آپ کے اعلیٰ اخلاق، سخاوت، مشکلوں کے موقع پر صبر اور دنیا کی دلفریبیوں سے کنارہ کشی کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔

ائمہ اہلبیتؑ کی زندگیاں دین، علم اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف تھیں۔ اس راہ میں وہ ہر دوسری چیز کو کچھ بھی اہمیت نہ دیتے تھے۔ البتہ وہ سخت حالات جو ان پر گزرے کہ جن کی تلخی کے گھونٹ وہ ہر دور اور ہر مرحلے میں حلق سے اتارتے رہے، اکثر اوقات وہ ان مقاصد کے حصول میں حائل ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ چند محدود سے وقفوں کو چھوڑ کر ان کو کبھی راحت نصیب نہیں ہوئی کہ جن میں وہ اسلام کی تعلیمات اور احکام کی اشاعت اور اس کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے جیسا کہ ان کی طویل تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے۔

ہم پچھلی فصلوں میں بیان کر آئے ہیں کہ علویوں پر ایک عہد حکومت گزر گیا اور دوسرا آگیا۔ ان نئے اور پرانے حکمرانوں کے درمیان ایسی سخت جنگیں ہوتی رہیں کہ جن کی بدولت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کو کچھ سہولت کا زمانہ مل گیا۔ تب آپ دونوں کے عہد امامت میں لوگ ادھر ادھر سے ان کی خدمت میں علم حاصل کرنے آتے رہے۔ اس طرح ایک جامعہ کی تشکیل ہو گئی کہ جس میں علماء اور طالبان علم کی تعداد

چار ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ مگر نئے فرمانروا اِن حضرات کی ان علمی کوششوں کے حق میں نہ تھے۔ یہاں تک کہ دوسرے عباسی خلیفہ، منصور دوانیقی نے جامعۂ اہلبیتؑ کے معاملے میں نہایت سخت مخالفانہ طرزِ عمل اختیار کیا اور کئی بار کوشش کی کہ اس کے سربراہ امام جعفر صادقؑ کو دھوکے سے قتل کر دے لیکن ہر بار اللہ کا ارادہ اس کے اس مقصد کے حصول میں حائل ہوتا رہا۔

چنانچہ امام جعفر صادقؑ اور جامعۂ اہلبیتؑ پر منصور کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ تاہم وہ خود اور ان کے اصحاب ان تمام تر سختیوں کے باوجود اپنی زندگی کے آخری سانس تک اپنے دینی مشاغل میں منہمک رہے۔ پھر جب اس کو آپ کی وفات کی خبر ملی تو اس نے مدینہ میں اپنے گورنر کو حکم بھیجا کہ اگر آپ نے کسی کو صراحتہً اپنا جانشین مقرر کیا ہو تو وہ اس کی گردن اڑا دے لیکن گورنر کی طرف سے یہ اطلاع آنے پر کہ آپ نے پانچ افراد کے حق میں وصیت فرمائی ہے، جن میں خود خلیفہ منصور بھی شامل تھا تو وہ آپ کے شرعی جانشین کی تلاش میں لگ گیا اور ہر ممکن طریقے سے شیعوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے کام کرنے لگا۔ جیساکہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ عام لوگوں حتیٰ کہ اپنے اصحاب اور شیعوں سے بھی پوشیدہ رہتے تھے۔ چنانچہ شیعوں کے لیے بھی ان خاص حالات میں رات کی تاریکی میں آپ سے چھپ چھپا کر ملنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

پریشانیوں سے بھری ہوئی اس فضا میں امام موسیٰؑ بن جعفرؑ اپنے آبائے کرامؑ کی شروع کی ہوئی اسلامی خدمات یعنی علم کی اشاعت، حدیث کی روایت، اخلاق کی حمایت اور اسلام کی حفاظت میں مصروف رہے، جیساکہ آپ کے اصحاب نے آپ سے ایسے ہی مختلف موضوعات پر ہزارہا حدیثیں روایت کی ہیں۔

اگرچہ آپ کے والد بزرگوار کے بعد آپ کی زندگی کڑی نگرانی اور پھر قید و بند میں گزری، پھر بھی محدثین نے آپ سے فقہ اور دوسرے اسلامی موضوعات پر اس سے کہیں زیادہ حدیثیں روایت کی ہیں جتنی آپ کے بعد کسی اور امام سے کی ہوں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے والد بزرگوار کی زندگی میں اتنا سا وقت مل گیا کہ جس میں آپ نے اپنے اصحاب اور جامعہ اہل بیتؑ کے طالب علموں کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ چنانچہ

آپ کے والد بزرگوار کی وفات کے بعد سخت حالات میں لوگوں کو جب بھی موقع ملتا خواہ رات کی تاریکی میں سہی وہ آپ سے رجوع کیا کرتے تھے۔

آپ کے اصحاب میں سے چھ افراد صدق اور امانت میں مشہور ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ائمہ علیہم السلام سے جو روایات نقل کیں، راویوں نے ان کے صحیح ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ محدثین میں تین اماموں یعنی امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ بن جعفرؑ کے اصحاب میں سے اٹھارہ افراد بہت مشہور ہیں اور وہ اصحاب اجماع کہلاتے ہیں۔ ان میں سے چھ امام ابو جعفر محمد باقرؑ کے، چھ امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ کے اور چھ امام ابو الحسن موسیٰ بن جعفرؑ کے اصحاب ہیں۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ کے وہ چھ اصحاب یہ ہیں:

یونس بن عبدالرحمٰن - صفوان بن یحییٰ بیاع السابری - محمد بن عمیر - عبداللہ بن مغیرہ - حسن بن محبوب السروا اور احمد بن ابی نصر بزنطی۔

۱- یونس بن عبدالرحمٰن: آپ موسیٰ بن جعفرؑ کے مخلص اصحاب میں سے تھے اور انہوں نے آپ سے احادیث اخذ کی ہیں۔ پھر انہوں نے امام علی رضاؑ کی امامت کا بھی کچھ زمانہ پایا۔ جیساکہ آپ نے ان کے بارے میں فرمایا: یونس بن عبدالرحمٰن کا اپنے زمانہ میں وہی مقام ہے جو سلمان فارسی کا اپنے زمانہ میں تھا۔

شیخ طوسی نے الفہرست میں کہا ہے کہ مختلف موضوعات پر یونس بن عبدالرحمٰن کی لکھی ہوئی بتیس کتابیں تھیں۔ ان کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ روزانہ چالیس مومن بھائیوں سے ملاقات کرتے اور پھر اپنے گھر واپس آتے تھے۔ نیز نماز، طعام اور حوائج ضروری کے علاوہ کسی بھی وقت لکھنا پڑھنا ترک نہ کرتے تھے۔ ان کی اکثر تالیفات علم الکلام میں ہیں اور ان کے بارے میں بعض ممتاز اہل علم وفن کی آراء، ان کی وسعت علم اور قوت فکر پر دلالت کرتی ہیں۔ جیساکہ کشی نے کتاب الرجال، مرزا محمد نے اتقان المقال میں اور محدث قمی نے الکنیٰ والالقاب میں صراحت کی ہے۔

۲- محمد بن ابی عمیر: آپ موسیٰ بن جعفرؑ اور ان کے فرزند امام علی رضاؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے ان دونوں اماموں سے حدیث اور فقہ میں اخذ علم کیا اور

پھر انہی معلومات کی روشنی میں فقہ اور دیگر موضوعات پر کتابیں تالیف کیں۔

احمد بن محمد بن عیسیٰ قمی بیان کرتے ہیں کہ محمد بن ابی عمیر نے امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے ایک سو افراد کی روایات جمع کی ہیں۔ جاحظ کہتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ عبادت گزار، تمام خوبیوں میں اپنے زمانہ کے فرد وحید اور خاص و عام کے نزدیک معتمد ترین شخص تھے۔

فضل بن شاذان نے بیان کیا ہے کہ جب میں عراق گیا تو وہاں میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو اپنے ساتھی کو ڈانٹتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ: ارے تمہارے اوپر قرض ہے اور تم صاحبِ عیال بھی ہو، اس لیے تم کو چاہیے کہ ان کے لیے روزی کماؤ۔ تمہاری اس حالت میں تو مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ سجدوں کو طول دینے کی وجہ سے کہیں تمہاری آنکھیں ہی نہ جاتی رہیں۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ: وائے ہو تمہارے حال پر کہ تم مجھ پر بہت زیادتی کر رہے ہو۔ ارے اگر سجدوں کو طول دینے سے کسی کی آنکھیں جایا کرتیں تو پھر سب سے پہلے ابن ابی عمیر کی آنکھیں جاتیں کہ جو بہت ہی طولانی سجدے کیا کرتے تھے۔

خلیفہ ہارون نے ان کو اس لیے قید میں ڈال دیا کہ وہ امام موسیٰ کاظمؑ اور امام علی رضاؑ سے خصوصی میل جول رکھتے تھے۔ اس نے یہ پابندی بھی لگا دی کہ ان کو امامؑ کے اصحاب اور خاص دوستداروں کے حالات کی کوئی خبر نہ دی جایا کرے۔ تاہم ان کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ سب کو پہلے ہی سے جانتے پہچانتے تھے۔ وہ ایک مدت تک قید میں رہے اور جب اس سے بہت تنگ آ گئے تو انہوں نے قید خانے کے دار وغہ سندی بن شاہک کو ایک لاکھ بیس ہزار درہم دیے، تب اس نے ان کو رہا کر دیا۔

ان کے حالات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کو یہ خوف تھا کہ کہیں ہارون کے ملازمین ان کی وہ تالیفات ہتھیا نہ لیں، جو ائمۂ کرامؑ کی احادیث پر مشتمل تھیں۔ اس لیے انہوں نے وہ کتابیں اپنے گھر کے ایک گوشے میں دفن کر دی تھیں لیکن افسوس کہ جب وہ قید سے چھوٹ کر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ سب گل چکی تھیں۔ اس کے بعد وہ جو روایت بھی کرتے، محض اپنے حافظے پر اعتماد کرتے ہوئے بغیر سند کے نقل کیا کرتے تھے۔ تاہم فقہاء نے ان کی ایسی بلا سند احادیث کو بھی معتبر مانا ہے کیونکہ وہ ان کے

معتمد ہونے اور ان کی روایتوں کے بلا سند ہونے کے مذکورہ بالا سبب سے واقف تھے چنانچہ محدثین میں یہ امر مشہور ہو گیا تھا کہ ابن عمیر کی یہ بلا سند روایات دوسرے قابل اعتماد راویوں کی ان روایات کے مانند ہیں جن کو سند کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ **صفوان بن یحییٰ بیاع سابری:** وہ امام موسیٰ بن جعفرؑ کے شاگردوں میں سے تھے اور آپ کی وفات کے بعد امام رضاؑ اور امام جوادؑ کی صحبت میں رہے۔ انکے حالات میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے امام جعفر صادقؑ کے چالیس شاگردوں میں سے روایات لیں اور احادیث ائمہؑ پر مشتمل تیس سے اوپر کتابیں لکھی ہیں۔ جیسا کہ کشی، طوسی، ابن ندیم اور کتب رجال کے دوسرے مؤلفین نے صراحت کی ہے۔

۴۔ **عبداللہ بن مغیرہ بجلی:** کتب رجال کے مؤلفین نے یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ وہ روایت میں انتہائی با اعتماد ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ امام ابوالحسن موسیٰ بن جعفرؑ کے ان اصحاب میں سے ہیں کہ جن کی آپ سے لی ہوئی روایات کی صحت پر محدثین کی پوری جماعت نے یقین کیا ہے۔ ان عبداللہ بن مغیرہ بجلی نے مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

۵۔۶۔ **حسن بن محبوب السراد، احمد بن محمد بن عمرو بزنطی:** یہ دونوں ہی امام موسیٰ بن جعفرؑ اور امام رضاؑ کے معتمد اصحاب میں سے ہیں۔ انہوں نے امام جوادؑ کا زمانہ بھی پایا اور آپ سے فقہ وغیرہ میں روایات لی ہیں۔ کتب رجال کے مؤلفین نے صراحت کی ہے کہ ان دونوں کی بیان کی ہوئی روایات کے قبول کرنے پر محدثین کا اتفاق ہے۔ چونکہ امام موسیٰ کاظمؑ کے ان چھ اصحاب، امام جعفر صادقؑ کے چھ اصحاب اور امام محمد باقرؑ کے چھ اصحاب کے صدق و دیانت اور ان کی روایات کو قبول کرنے پر سبھی محدثین کا اتفاق ہے، اس لیے ان اٹھارہ بزرگوں کو اصحاب اجماع کہا جاتا ہے۔

اگرچہ امام موسیٰ کاظمؑ کے شاگردوں میں سے ان چھ افراد کے علاوہ اور لوگ بھی مشہور ہوئے لیکن جیسا کہ علم رجال کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے وہ ان چھ اصحاب کے مرتبہ کو نہیں پہنچے۔ اس دوسرے زمرے میں سے چند ایک یہ ہیں:

صفوان بن مہران جمال: وہ امام جعفر صادقؑ کے واسطے سے حدیث کی روایت

کرتے تھے۔ ان کے بعد وہ امام موسیٰ بن جعفرؑ کی صحبت میں رہے۔ آپ سے حدیث اور فقہ میں علم حاصل کیا اور پھر ان دونوں موضوعات پر کتابیں تالیف کیں۔ جیساکہ کشی، طوسی اور ابن ندیم نے اپنی کتابوں میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔

ایک بار امام موسیٰ کاظمؑ نے ان سے فرمایا: اے صفوان! ایک چیز کے علاوہ تمہاری ہر شئے حسین وجمیل ہے۔ انہوں نے کہا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہارا ہارون کو کرایہ پر اونٹ دینا۔ انہوں نے کہا: واللہ کہ میں نے اپنے اونٹ کسی برائی یعنی شکار، تماشا یا مقابلہ کے لیے اس کو کرایہ پر نہیں دیئے، بلکہ میں نے تو مکہ جانیوالوں کے لیے دیے ہیں اور میں خود نہیں جاتا بلکہ میرے غلام جاتے ہیں۔ امامؑ نے کہا: اے صفوان! جب تک تمہارا کرایہ وصول نہ ہو جائے کیا تم ان لوگوں کے زندہ رہنے کے خواہشمند نہیں ہوتے؟ اس نے کہا: ضرور، اے فرزند رسولؐ! آپ نے فرمایا: پس جو ان کی زندگی کا خواہاں ہو وہ انہی میں سے ہے اور جو ان میں سے ہے وہ دوزخ میں جائے گا۔

معمر بن خلاد کہتے ہیں کہ امام ابوالحسن موسیٰ بن جعفر نے یہ بھی فرمایا: بخدا ایسی بھیڑیں کہ جن کا کوئی رکھوالا نہ ہو، ان کو دو خونخوار بھیڑیے اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا نقصان مسلمان کے دین میں سرداری کی خواہش سے ہوتا ہے لیکن صفوان وہ شخص ہے جس کو سرداری کی خواہش نہیں ہے۔

عبدالرحمٰن بجلی کوفی: انہوں نے دو اماموں یعنی امام جعفر صادقؑ اور آپ کے فرزند امام ابوالحسن موسیٰ کاظمؑ سے روایت کی ہے۔ امام موسیٰ بن جعفرؑ نے ان کو جنت کی بشارت دی، جیساکہ رجال کشی میں مذکور ہے۔ وہ وسیع النظر، استدلال میں مضبوط اور اپنے زمانہ کے علوم پر حاوی تھے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ نے ان سے فرمایا: تم اہل مدینہ سے بحث وکلام کیا کرو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ تم ایسے شیعہ افراد کو دیکھیں۔

اسحاق بن عمار کوفی صیرفی: وہ امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کے ان نامور شاگردوں میں سے تھے جنہوں نے ان دونوں اماموں کی حدیثوں کو الگ الگ موضوع کے تحت جمع ومرتب کیا۔ علامہ حلیؒ نے خلاصۃ الرجال میں اور ایسے ہی دوسرے مؤلفوں نے ان کو قابل اعتماد قرار دیا اور کہا ہے کہ انہوں نے اصول اربعمائۃ (حدیث

کی ابتدائی چار سو کتابوں) کی تالیف و تدوین میں بھی حصہ لیا ہے۔ نیز یہ کہ امام جعفر صادقؑ نے ان سے فرمایا: اے اسحٰق! اللہ سے اس طرح ڈرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو لیکن اگر تم کو اس میں بھی شک ہے کہ وہ تم کو نہیں دیکھ رہا تو بس تم کافر ہو گئے۔

اسماعیل بن موسیٰ: انہوں نے امام موسیٰ کاظمؑ سے نیز آپ کے والد بزرگوار امام جعفر صادقؑ اور آپ کے دادا محمد باقرؑ کے اصحاب سے بھی روایتیں لی ہیں۔ وہ ہجرت کر کے مصر چلے گئے اور وہیں مقیم رہے۔ جیسا کہ الفہرست طوسی اور رجال نجاشی میں صراحت کی گئی ہے۔ انہوں نے فقہ میں بہت سی کتابیں لکھیں اور وہ ان روایات پر مشتمل تھیں جو انہوں نے امام موسیٰ کاظمؑ اور ان کے آباءِ طاہرینؑ سے حاصل کی تھیں۔

اسحاق موتمن بن امام صادقؑ: ائمۂ کرامؑ کی اولاد اور ان کے راویانِ حدیث میں سے جو لوگ مصر چلے گئے، ان میں اسحاق موتمن بھی تھے۔ وہ امام موسیٰ بن جعفرؑ کے مادری پدری بھائی تھے کیونکہ اسحاق موتمن، امام کاظمؑ، محمد اور فاطمہ کبریٰ بی بی حمیدہ بربریہ سے تھے۔ علمائے رجال کا بیان ہے کہ وہ صاحب علم و فضل اور حامل زہد و تقویٰ تھے۔ وہ اپنے والد امام جعفر صادقؑ اور اپنے بھائی امام موسیٰ کاظمؑ سے احادیث روایت کرتے تھے اور بہت سے لوگ ان سے روایات لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی امام موسیٰ بن جعفرؑ کی امامت کے حق میں بھی روایت کی اور انہوں نے آپ کی امامت میں شک نہیں کیا۔ ابن کاسب یعقوب بن حمید مدنی ان اسحاق مؤتمن سے کوئی حدیث روایت کرتے تو کہا کرتے تھے کہ: "امام رضاؑ کے معتمد اسحاق بن جعفرؑ نے مجھ سے بیان کیا ہے"۔

شافعی کے استاد سفیان بن عیینہ نے بھی ان کے بارے میں ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے امام حسنؑ کے بیٹے زید کی پوتی سیدہ نفیسہ سے تزویج کی جو حسن الانور کی صاحبزادی تھیں۔ وہ مصر میں ایک خاص مقام رکھتی تھیں اور مصر میں آج تک ان کی کرامات مشہور ہیں۔ مزید برآں وہ حضرت رسولؐ اور ائمہ کرامؑ کی احادیث کی راویہ بھی تھیں۔ جیسا کہ ابن خلکان نے روایت کی ہے کہ جب شافعی مصر آئے اور انہوں نے ان خاتون کا حال سنا تو وہ بھی ان سے احادیث اخذ کرنے لگے۔

علمائے رجال نے امام موسیٰ کاظمؑ کے معتمد اصحاب میں حسن بن علی بن خصال،

داؤد الرقی، علی بن جعفر صادقؑ، عبدالسلام بن صالح حصروی، اسماعیل بن مہران، موسیٰ بن بکیر واسطی وغیرہ کے نام بھی لیے ہیں کہ ان سب کا شمار ہم سے ممکن نہیں ہے۔

احمد بن حنبل کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ امام موسیٰ کاظمؑ سے روایت کرتے تو کہتے کہ: مجھ کو بتایا موسیٰ بن جعفرؑ نے، ان کو ان کے والد جعفرؑ نے، ان کو ان کے والد محمد باقرؑ نے، ان کو ان کے والد علی زین العابدینؑ نے، ان کو ان کے والد حسینؑ نے، ان کو ان کے والد علی بن ابی طالبؑ نے اور ان کو خبر دی رسول اللہؐ نے اس کے بعد کہا کرتے تھے کہ: یہ وہ سلسلہ سند ہے کہ اگر اسکو کسی دیوانے کے سامنے بھی دہرایا جائے تو وہ اس کی برکت سے شفا پا جائے گا۔

امام موسیٰ کاظمؑ کے مناظرے اور نصیحتیں

یعقوب بن جعفر الجعفری سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ آسمانِ اوّل پر اتر آتا ہے۔ اس کے جواب میں امام موسیٰ بن جعفرؑ نے فرمایا: اللہ نہ اترتا ہے نہ اس کو اترنے کی ضرورت ہے، کیونکہ کوئی دُور کی چیز اس سے دور نہیں اور کوئی قریب کی چیز اس کے قریب نہیں ہے۔ وہ صاحب قوت ہے اور کوئی اس کے سوا معبود نہیں ہے۔ وہی عزت والا اور صاحب حکمت ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ آسمان اوّل پر اتر آتا ہے تو وہ ان کے قول سے کہیں بلند اور مرتبے والا ہے۔ اس کے بارے میں یہ بات وہی کہتا ہے جو اس کو کمی اور بیشی سے منسوب کرتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر حرکت کرنے والا اس کا محتاج ہے کہ کس طرف حرکت کرے اور کس چیز کے ذریعے سے حرکت کرے۔ جو کوئی اللہ کے متعلق ایسے خیالات قائم کرے گا، وہ برباد ہو جائیگا۔ پس تم لوگ اس کی صفات کے بارے میں خبردار رہو کہ کہیں اس کے محدود ہونے، اس میں کمی بیشی آنے یا حرکت کرنے اور حرکت پانے، کم ہونے اور کم کیے جانے یا اٹھنے اور بیٹھنے سے متصف نہ کر دینا، کیونکہ اللہ تعالیٰ بیان کرنے والوں کے بیان کی حدود سے تعریف کرنے والوں کی تعریف اور سوچنے والوں کی سوچ سے بلند و بالا ہے۔

انہی یعقوب بن جعفر الجعفری سے ایک اور روایت ہے کہ عبدالغفار نامی ایک شخص نے امام موسیٰ کاظمؑ کے سامنے اللہ کا یہ قول پیش کیا:

ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی. فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی. (سورۂ نجم-آیت ۹)

یعنی پھر قریب ہوا اور آگے بڑھا حتٰی کہ وہ دو کمانوں کے یا اس سے کم فاصلے پر تھا۔

عبد الغفار نے کہا کہ میرے نزدیک تو یہ پردوں سے نکلنا اور زمین کے قریب آنا ہے، نیز یہ کہ محمدؐ نے خدا اپنے دل کے راستے دیکھا اور اس کو آنکھ سے منسوب کر دیا۔ اب آپ بتائیے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا: دَنٰی فَتَدَلّٰی کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک مقام سے ہٹا اور نہ یہ کہ وہ جسم کے ساتھ قریب ہوا۔ عبد الغفار بولا: میں اس کو اسی طرح بیان کر رہا ہوں جیسے اس نے خود اپنے تئیں بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ دَنٰی فَتَدَلّٰی اگر وہ اپنے مقام سے ہٹا نہیں تو آگے کیسے بڑھا اور اگر وہ ایسا نہیں ہے تو اس نے اپنے تئیں ایسا کیوں کہا ہے؟ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا: یہ قریش کی زبان ہے، جیسا کہ ان میں سے کوئی شخص جب یہ کہنا چاہتا ہے "میں نے سن لیا" تو وہ کہتا ہے: تَدَلَّیْتُ گویا کہ یہ اس کا سمجھ کی طرف جانا ہوتا ہے۔

داوٗد بن قبیصہ نے امام رضاؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: میرے والد بزرگوار سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ کیا اللہ نے اس چیز سے روکا ہے جس کا حکم دیا ہو، اس سے منع کیا ہے جس کا ارادہ کیا ہو اور اس پر مدد کی ہے جس کا ارادہ نہ کیا ہو؟ آپ نے فرمایا: تمہارا یہ کہنا کہ کیا اس نے اس چیز سے روکا ہے جس کا حکم دیا ہو، پس اللہ کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو وہ ابلیس کو آدمؑ کے آگے سجدہ کرنے سے روک دیتا اور اگر وہ اس کو روکتا تو پھر اس کا عذر قبول کر لیتا اور اس پر لعنت نہ کرتا۔ اسی طرح تمہارا یہ کہنا کہ کیا اس نے ایسی چیز سے منع کیا ہے جس کا ارادہ کیا ہو؟ یہ بھی صحیح نہیں اور اگر یہ صحیح ہوتا تو جب اس نے آدمؑ کو ایک درخت کا پھل کھانے سے منع کیا تھا تو اس کا ارادہ یہ ہوتا کہ وہ اس کو کھا لیں۔ پھر اگر اس کا یہ ارادہ ہوتا کہ وہ اسکو کھائیں۔ تو آج چھوٹے بڑے یہ نہ کہتے کہ آدم نے اللہ کے حکم کے خلاف عمل کیا اور راہ سے بھٹک گئے۔ پس اللہ کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ ایک چیز کا حکم دے جبکہ اسکا ارادہ اس چیز کے خلاف ہو۔

پھر تمہارا یہ کہنا کہ کیا اس نے کسی کی ایسے کام میں مدد کی ہے کہ جس کا خود ارادہ نہ کیا ہو۔ یہ بات بھی اس کے بارے میں صحیح نہیں ہے کیونکہ اللہ اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ انبیاءؑ کے جھٹلائے جانے، ان کو قتل کرنے نیز حسینؑ ابن علیؑ اور ان کے صاحب فضیلت بیٹوں کے قتل میں کسی کی مدد کرے۔ وہ اس کام میں کیسے مدد کر سکتا ہے جس کا وہ ارادہ نہ رکھتا ہو، کیونکہ اس نے اپنے نافرمانوں کے لیے جہنم تیار کی ہے اور اس نافرمانی کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ وہ اس کام میں کسی کی مدد کرے، جس کا وہ خود ارادہ نہیں رکھتا تو گویا اس نے فرعون کے کفر اور اس کے دعوائے خدائی میں اس کی مدد کی تھی۔ کیا تمہارا خیال یہی ہے کہ اللہ ہی نے یہ چاہا ہو گا کہ فرعون رب ہونے کا دعوٰی کرے؟ امامؑ نے مزید فرمایا کہ ایسی بات کہنے والے کو چاہیے کہ وہ توبہ کرے۔ اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اس کا معاملہ اللہ پر رہے گا اور اگر وہ توبہ نہیں کرتا تو پھر اس کی گردن مار دی جائے گی۔

امام حسن عسکری سے روایت ہے کہ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ نے فرمایا: جب اللہ نے مخلوقات کو خلق کیا تو وہ جانتا تھا کہ وہ کیسے عمل کریں گے۔ پس اس نے ان کو کرنے نہ کرنے کے بارے میں احکام بتائے۔ چنانچہ جس عمل کے کرنے کا حکم دیا اسکے لیے انکو اسباب مہیا کر دیے اور جس عمل سے منع کیا، انکو ترک کرنے کا راستہ بتا دیا۔ البتہ وہ کوئی کام صرف اس کی اجازت ہی سے کرتے ہیں یا اس سے باز رہتے ہیں۔ اللہ نے اپنی مخلوق میں کسی کو نافرمانی کرنے پر مجبور نہیں کیا، بلکہ وہ مصائب کے ذریعے ان کی آزمائش کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے:

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (سورۂ ملک۔ آیت ۲)

تاکہ وہ آزمائے کہ تم میں سے کون نیک عمل بجا لاتا ہے۔

تحف العقول میں ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ نے اپنے کسی بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: اے بیٹے! خبردار رہنا کہ اللہ تم کو ایسی نافرمانی کرتے ہوئے نہ دیکھے، جس سے اس نے منع کیا ہے۔ خبردار رہنا کہ تم اس کی اس اطاعت سے غافل نہ ہونا، جس کا اس نے حکم دیا ہے۔ دیکھو اللہ کی عبادت اور فرمانبرداری میں کمی کرتے ہوئے ایک سانس بھی نہ لینا، کیونکہ اللہ کی اتنی عبادت تو کسی سے ہو ہی نہیں سکتی جتنی کہ ہونا چاہیے۔ دیکھو ہنسی ٹھٹھا کرنے سے بچے رہنا کیونکہ اس سے ایمان کا نور ضائع ہو جاتا ہے اور شرم و لحاظ میں کمی

آجاتی ہے۔ دیکھو تنگدلی اور کاہلی سے بچے رہنا کیونکہ یہ دونوں تم کو دنیا و آخرت کے آرام سے محروم کردیں گی۔

آپ نے ہشام بن حکم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: اے ہشام! اگر تمہارے ہاتھ میں اخروٹ ہو اور کوئی یہ کہے کہ یہ موتی ہے تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا اور اگر تمہارے ہاتھ میں موتی ہو اور کوئی کہے کہ یہ اخروٹ ہے تو بھی تم کو اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔کیونکہ تم جانتے ہو کہ یہ موتی ہے۔

اے ہشام! ہر بندے پر ایک فرشتہ مامور ہے۔ جو بندہ انکساری کرتا ہے اللہ اس کا مرتبہ بلند کردیتا ہے اور جو بڑا بنتا ہے اللہ اس کو ذلیل کردیتا ہے۔ اگر تمہاری سیری اس سے نہیں ہوتی جو تمہارے لیے کافی ہے تو پھر دنیا کی کوئی چیز تمہیں سیر نہیں کرسکتی۔ ایک عاقل ایسے شخص سے بات نہیں کرتا جس سے جھٹلائے جانے کا اندیشہ ہو، نہ ایسے شخص سے سوال کرتا ہے جس سے انکار کا خوف ہو۔ نہ ایسا وعدہ کرتا ہے جس کو وفا کرنے کی قدرت اس کو نہ ہو۔ اس چیز کی توقع نہیں کرتا جو باعثِ شرم ہو اور ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا جس کو وہ کر نہ سکتا ہو۔ فساد کی جڑ غصہ ہے اور مومنین میں سب سے زیادہ کامل الایمان وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔ لوگوں سے ملنے جلنے میں اگر تم ایسا کرسکتے ہو تو یہی کرو کہ صرف ایسے شخص سے ملو جس کی حاجت برآری تم کرسکتے ہو۔

اے ہشام! تم کو نرم دلی اختیار کرنی چاہیے کیونکہ نرم دلی میں خوش بختی ہے اور سنگدلی میں بدبختی ہے۔ نرم دلی نیکی اور حسن اخلاق سے شہروں کی رونق بڑھتی ہے اور رزق میں وسعت ہوتی ہے۔ اللہ کا یہ قول کہ:

هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ۔ (سورۂ رحمٰن۔ آیت ۶۰)

یعنی نیک سلوک کا بدلہ صرف نیک سلوک ہی ہوتا ہے۔

یہ وہ اصول ہے جو مومن، کافر، نیک اور بد سب پر منطبق ہوتا ہے۔ جو کوئی بھی تمہارے ساتھ بھلائی کرے تم کو چاہیے کہ اس کو اچھا بدلہ دو، لیکن اس کا بدلہ یہ نہیں ہے کہ جیسا اس نے کیا، ویسا ہی تم بھی کرو بلکہ تم کو اس پر کچھ اضافہ بھی کرنا چاہیے۔ اگر تم اس سے برابر نیکی کروگے تو یہ بھی دیکھو کہ اس نے پہل کرکے گویا کچھ زیادہ ہی احسان کیا تھا۔

اے ہشام! وہ شخص حق پر نہیں ہے جو ہر روز اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرتا۔ وہ اسطرح

کہ اگر نیک عمل کیا ہے تو اس میں اور بھی آگے بڑھے اور اگر بُرا فعل کیا ہے تو پھر توبہ کرے اور اللہ سے مغفرت کا طالب ہو۔ دیکھو عوام سے میل جول اور تعلق پیدا نہ کرو، ہاں اگر ان میں کوئی دانشمند اور برائیوں سے دُور رہنے والا شخص مل جائے تو اس سے ضرور ہی رابطہ بڑھاؤ۔ دوسرے سب لوگوں سے اس طرح بھاگو جیسے کسی خونخوار درندے سے بھاگتے ہو۔ جو کچھ دوسروں کے پاس ہو اسے دیکھ کر تم مایوس نہ ہونا۔ لوگوں کی طرف لالچ سے نہ دیکھنا کیونکہ لالچ ہی ذلت کا سبب، عقل کا دشمن، مروت کا قاتل اور وقار کے زائل ہونے کا باعث بنتا ہے۔ اپنے نفس کو بے جا خواہش سے دُور رکھنے کی کوشش کرتے رہا کرو کیونکہ یہ عمل تم پر اسی طرح واجب ہے جیسے دشمن سے جہاد کرنا۔ جس کو اللہ یہ تین چیزیں عطا کرے گویا کہ وہ اس پر بہت مہربان ہے: وہ عقل جو اس کی خواہش کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہو، وہ علم جو اس کو جہالت سے بچانے کے لیے کافی ہو اور وہ قناعت جو اس کو ناداری کے خوف سے بے پروا کر دے۔

امام موسٰی کاظمؑ کے مختصر کلمات

۱۔ کہیں ایسا نہ ہو جتنا مال تم اللہ کی اطاعت میں خرچ کرنے سے باز رہو، اتنا ہی اس کی نافرمانی میں خرچ کر ڈالو۔

۲۔ مومن ترازو کے دو پلڑوں کی مانند ہوتا ہے یعنی جوں جوں اس کا ایمان بڑھتا ہے اس کی آزمائش بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

۳۔ اچھی ہمسائیگی صرف ضرر رسانی سے رکے رہنا ہی نہیں بلکہ ضرر پہنچنے پر صبر کرنا بھی اچھی ہمسائیگی ہے۔

۴۔ اپنے دل میں ناداری کا خوف اور طولِ عمر کی خواہش نہ رکھو کیونکہ جس کو ناداری کا خوف ہو وہ کنجوسی کرنے لگتا ہے اور جو طول عمر کی خواہش کرتا ہے وہ لالچ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

۵۔ دنیا کی نعمتوں میں سے اپنے لیے اتنا حصہ لے لو جو جائز ضروریات کے لیے ہو، جس سے مروت پر دھبہ نہ آئے اور اس میں فضول خرچی بھی نہ ہو۔ پھر اس سے اپنے دینی معاملات کے انجام دینے میں سہارا حاصل کرو کیونکہ وہ شخص ہم سے نہیں ہے جو دین کی خاطر دنیا کو چھوڑ دے یا دنیا کے پیچھے دین کو ترک کر دے۔

۶۔ فقیہہ کا مرتبہ ایک عابد سے اسی طرح بلند ہے جس طرح ستاروں سے آفتاب کا مرتبہ بلند ہے۔

آپ نے علی بن یقطین سے فرمایا: فرمانروا کے مفاد میں کام کرنے کا کفارہ یہ ہے کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرتے رہو۔ اگر لوگ ایسے گناہ کریں کہ جو انہوں نے پہلے کبھی نہ کیے ہوں تو اللہ تعالیٰ بھی ان پر ایسی مصیبتیں نازل کرے گا جو ان پر کبھی نہ آئی ہوں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: قیامت کے روز ایک منادی یہ آواز دے گا کہ ہر وہ شخص کھڑا ہو جائے جس پر اللہ کا کوئی اجر نکلتا ہو۔ اس پر صرف وہ لوگ کھڑے ہوں گے جنہوں نے کسی کا قصور معاف کر کے اس سے صلح کی ہو گی، کیونکہ ایسے ہی لوگوں کا اجر اللہ پر ہوتا ہے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ: وہ سخی شخص کہ جو خوش خلق بھی ہو، وہ اللہ کے قرب میں رہتا ہے۔ پھر اللہ اس کو ہرگز دور نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ چنانچہ میرے والد بزرگوار اپنی زندگی کے آخری لمحات تک مجھ کو سخاوت اور حسن اخلاق کی برابر تلقین فرماتے رہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ اور حکام وقت

امام موسیٰؑ بن جعفرؑ بیس سال تک اپنے والد کے سائے میں رہے اور اس عہد کے آخری ایام میں آپ نے ان عباسی حکام کا طرز عمل بھی دیکھا جو کل تک اپنے چچازاد بھائیوں یعنی اولاد علیؑ پر گزرے ہوئے مظالم یعنی ایذا رسانی، قتل اور ان کی جلا وطنی پر آنسو بہایا کرتے تھے۔ تب آپ نے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ان کا ظالمانہ سلوک دیکھا، حالانکہ وہ خلافت اور سیاست سے کنارہ کش رہ کر اسلام کی حفاظت اور اس کی تعلیمات کی اشاعت میں منہمک تھے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے علویوں کے ساتھ ان حکمرانوں کے بے رحمانہ طرز عمل کا بھی مشاہدہ کیا جو یہ سختیاں سہتے سہتے اور ان سرکشوں کے ہاتھوں تشدد کے تلخ گھونٹ پیتے پیتے صبر کی طاقت کھو بیٹھے تھے۔ اس لیے اب وہ اپنی جانیں بچانے کے لیے گھر چھوڑ کر نکل جاتے اور پھر ان ستم کیشوں سے اپنا اور دوسرے زیردست لوگوں کا بچاؤ کرنے کے لیے ان کی حکومت کے خلاف میدان میں آجاتے تھے۔ آپ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ آپ کے والد بزرگوار کو منصور کی عداوتوں اور دھمکیوں کا سامنا رہتا تھا۔ وہ

کبھی ان کو قتل اور کبھی ان کو قید کرنے کے متعلق ہوتی تھیں۔ نیز اس نے ہر ہر جگہ پر آپ کے والد بزرگوار کی نگرانی کے لیے اپنے کارکن مقرر کر رکھے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اتنے مجبور ہو گئے کہ آپ کی امامت کے بارے میں اپنے حکم کو عام شیعوں سے بھی پوشیدہ رکھیں۔ چنانچہ اس امر سے انہوں نے اپنے چند مخلص اصحاب کے علاوہ کسی کو مطلع نہیں کیا۔ پھر ان کو بھی یہ ہدایت کر دی کہ وہ اس بات کو پوشیدہ رکھیں اور جا بجا پھیلے ہوئے منصور کے خاص آدمیوں اور اس کے اہلکاروں سے خبردار رہیں۔

مختصر یہ کہ آپ کی امامت کے آغاز سے لے کر آئندہ پینتیس سال آپ اسی فضا میں رہے۔ جو حکومت وقت کی اہلبیتؑ سے دشمنی اور نفرت سے بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ حکومت کی طرف سے برابر خبردار رہے اور آپ نے عام نظروں سے پوشیدہ رہنے کا طریقہ بھی قائم رکھا سوائے ان خاص لوگوں کے جو آپ کی امامت کے موقف پر قائم رہنے کی قدرت رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ لوگوں کو آپ کی طرف کس طرح دعوت دی جائے جیسا کہ ہشام بن سالم کی روایت اشارہ کرتی ہے جس کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں۔

وہ روایات جو امام موسیٰ کاظمؑ کی تاریخ حیات کو پیش کرتی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنی تمام عمر میں عباسیوں کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ کے شاگردوں اور آپ کے پیروکاروں کے لیے بھی آپ سے اس طرح کا رابطہ قائم رکھنا ممکن نہ تھا جیسا کہ وہ آپ کے والد بزرگوار کے زمانہ میں ان سے رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ راویاں جو آپ سے احادیث کی روایت کرتے تھے وہ ظاہر بظاہر آپ کا نام لیکر آپ سے کسی حدیث کی روایت نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ صرف آپ کی کنیت ہی سے آپ کا ذکر کرتے تھے۔ چنانچہ کوئی راوی کہتا تھا کہ میں نے ابو ابراہیمؑ سے یا ابو الحسنؑ سے سنا ہے یا آپ کے دوسرے القاب مثلاً عبد صالح، عالم اور سید کے ذریعے سے آپ کی ذات کو مراد لیتا تھا بلکہ بعض اوقات وہ کسی بھی ایسے لفظ کو کام میں لانا جو آپ کی طرف اشارہ کر سکے۔ جیسے "مجھ سے ایک شخص نے بیان کیا" یا "میں نے ایک شخص سے سنا" یا "میں نے ان کو لکھا" وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکام وقت آپ کی سخت نگرانی کیا کرتے تھے اور وہ آپ پر اور آپ کے اصحاب پر سانس لینا بھی دوبھر کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ اپنے

اصحاب اور خاص لوگوں کو تاکید فرماتے تھے کہ وہ اپنے دینی معاملات اور عبادات میں بھی تقیہ پر عمل کیا کریں تاکہ وہ حکومت کی سختی اور انتظام سے دوچار نہ ہوں۔ ان حالات کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل روایت سے بڑی مدد ملتی ہے۔

عبداللہ بن ادریس نے ابن سنان سے روایت کی ہے کہ خلیفہ ہارون نے علی بن یقطین کو ایک خلعت فاخرہ بھیجی۔ وہ امام موسیٰ بن جعفرؑ کے ممتاز اصحاب میں سے تھے اور انہی کے حکم سے ایک بڑے سرکاری عہدہ پر فائز تھے لیکن اہل حکومت ان کے عقائد سے ناواقف تھے۔ ہارون جب بھی ان کو خلعت اور انعام بھیجتا تو وہ یہ چیزیں امام کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ خلیفہ نے اب جو خلعت بھیجی تھی اس میں ایک سیاہ ریشمی شاہی چغہ بھی تھا جس پر سونے کا کام بنا ہوا تھا۔ علی بن یقطین نے ان میں سے اچھے اچھے لباس اور یہ چغہ بھی امامؑ کی خدمت میں بھیج دیا اور ساتھ ہی کچھ رقم بھی بھیجی۔ جب یہ چیزیں امام موسیٰ کاظم کے پاس پہنچیں تو آپ نے رقم قبول کر لی اور وہ چغہ اسی قاصد کے ہاتھ علی بن یقطین کو واپس کر دیا اور ان کو لکھ دیا کہ تم اس چغے کو اپنے پاس محفوظ رکھو، کیونکہ عنقریب ایسی صورت پیدا ہوگی کہ تم کو اس کی ضرورت آپڑے گی۔ تاہم وہ اس کے واپس کیے جانے پر کچھ کچھ شک ہی میں رہے اور اس کا سبب نہ جان سکے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد وہ کسی وجہ سے اپنے ایک غلام پر خفا ہوئے جو امام موسیٰ بن جعفرؑ سے ان کے لگاؤ سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ امامؑ کو طرح طرح کے ہدیے بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ اس غلام نے خلیفہ ہارون کو جا بتایا کہ موسیٰ بن جعفرؑ یہ کہتے ہیں کہ وہ امامؑ ہیں اور لوگ ان کو خمس کا مال بھیجتے ہیں۔ نیز یہ کہ علی بن یقطین ان کے ماننے والوں میں ہیں اور آپ نے جو سیاہ ریشمی چغہ ان کو دیا تھا وہ بھی انہوں نے امامؑ کو بھیج دیا تھا۔ یہ سنتے ہی ہارون لال پیلا ہو گیا اور بولا: میں اس معاملہ کی ضرور تفتیش کروں گا اور اگر یہ صحیح نکلا تو میں علی بن یقطین کا کام تمام کردوں گا۔

چنانچہ اس نے ان کو اسی وقت اپنے پاس بلوایا اور کہا: تم نے ریشمی چغہ کہاں چھوڑا جو میں نے تم کو دیا تھا؟ انہوں نے کہا: اے امیرالمومنین! وہ میرے پاس موجود ہے اور میں نے اس کو عطر میں بسا کر ایک مہر بند صندوقچے میں حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔ میں ہر صبح کو

وہ صندوقچہ کھول کر خیر و برکت کے لیے اس چغے کو بوسہ دیتا ہوں اور پھر اسکو اسی صندوقچے میں رکھ دیتا ہوں۔ ہارون نے کہا: تم وہ چغہ فوراً لاکر پیش کرو۔ تب انہوں نے اپنے ایک غلام سے کہا: تم میرے گھر جاؤ، خزانچی سے فلاں کمرے کی چابی لو اور اس کو کھولو۔ پھر اس میں رکھے ہوئے بڑے صندوق کو کھول کر اس میں سے وہ صندوقچہ کہ جس پر میری مہر لگی ہوئی ہے، نکال کر یہاں لے آؤ۔ وہ غلام جلد ہی مہر بند صندوقچہ لے کر آگیا اور اس نے وہ ہارون کے سامنے رکھ دیا۔ جب اس نے اس کو کھولا تو وہ چغہ اسی میں پڑا ہوا پایا جو خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ تب خلیفہ کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ کہنے لگا: اس کو وہیں رکھو جہاں سے یہ لایا گیا تھا اور اب تم بے فکر رہو۔ اس کے بعد میں تمہارے خلاف کسی چغلخور کی بات پر کان نہیں دھروں گا۔ پھر اس لُترے کو ایک ہزار کوڑے مارے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ انہی کوڑوں کا مارا ہوا مر گیا۔

ایک دوسری روایت محمد بن فضل سے ہے کہ انہوں نے کہا: ہمارے لوگوں میں پیروں کے مسح کرنے کے بارے میں اختلاف رائے ہو گیا کہ آیا انگلیوں سے ٹخنوں کی طرف یا ٹخنوں سے انگلیوں کی طرف ہونا چاہیے۔ علی بن یقطین نے امام موسیٰ کاظمؑ کو خط لکھا کہ اس مسئلہ کا حل بتائیں۔ آپ نے اپنے جواب میں پیروں کے مسح کی بجائے وضو میں دونوں پیروں کے دھونے کا حکم فرمایا۔ ان کو اس پر تعجب ہوا کیونکہ یہ جواب مذہب اہلبیتؑ کے خلاف ہے لیکن اس کے بعد وہ وضو میں اسی پر عمل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد ان کے کسی دشمن نے خلیفہ ہارون سے ان کی چغلی کھائی اور کہا کہ: علی بن یقطین رافضی ہیں۔ وہ مذہب میں آپ کے مخالف اور موسیٰؑ بن جعفرؑ کی امامت کے قائل ہیں۔ اس پر خلیفہ نے اپنے ایک خاص آدمی سے کہا کہ علی بن یقطین کے شیعہ ہونے کے متعلق بہت خبریں مل رہی ہیں۔ تاہم اس کی خدمت گزاری میں کوئی کمی نہیں پاتا ہوں۔ میں نے کئی بار اس کی آزمائش بھی کی ہے لیکن مجھے اس کے شیعہ ہونے کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ تب حاضرین نے ہارون سے کہا کہ شیعہ وضو میں اہل جماعت کے خلاف چلتے اور اس میں کمی کرتے ہیں کیونکہ وہ پیر نہیں دھوتے۔ پس آپ اس کا اس طرح امتحان کیجیے کہ وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ آپ اس کے طریقۂ وضو کے متعلق معلومات حاصل

کر رہے ہیں۔ ہارون کو یہ رائے پسند آئی لیکن اس نے کچھ مدت تک اس بات کو ملتوی کیے رکھا۔ پھر ایک دن ان کو اپنے محل میں بلایا اور اپنے ساتھ کام کرنے کو کہا۔ جب کبھی وہ خلیفہ کے محل میں کام کرتے تو وضو اور نماز کے لیے تنہا ایک حجرہ میں چلے جاتے تھے۔ چنانچہ اس روز جب نماز کا وقت آیا اور وہ اس حجرے میں گئے تو ہارون نے چھپ کر ان کو دیکھنا شروع کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ انھوں نے تین مرتبہ کلّی کی، تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالا اور اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں خلال کیا۔ پھر کہنیوں تک ہاتھ دھوئے اور اپنے سر اور کانوں کا مسح کیا اور پھر اپنے دونوں پیر تین تین بار دھوئے، جیسا کہ اپنے خط میں امامؑ نے ان کو حکم دیا تھا۔ جب ہارون نے ان کو یہ سب کچھ کرتے دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا، اس نے ان کے سامنے آکر کہا: اے علی بن یقطین! جو بھی یہ کہتا ہے کہ تم شیعہ ہو وہ جھوٹا ہے۔ اس کے بعد امامؑ نے ان کو خط لکھا اور حکم دیا کہ اب وہ وضو میں وہی عمل کریں جو پہلے کیا کرتے تھے۔ یعنی سر کے اگلے حصہ کا اور پیروں کے اوپری حصہ کا ٹخنوں تک مسح کیا کریں، جیسا کہ مذہب اہلبیتؑ میں مروج ہے۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی روایات ہیں جو بہ ظاہر کرتی ہیں کہ اپنے والد بزرگوار کے بعد امام موسیٰ بن جعفرؑ پر اور آپ کے اصحاب پر بھی حکام وقت کی سخت نگرانی تھی چنانچہ آپ پوری پوری احتیاط کے ساتھ دین کی حفاظت فرماتے تھے تاکہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو قید، جلاوطنی اور قتل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کے باوجود بھی آپکے دسیوں اصحاب اور دیگر شیعوں کو جلاوطنی اور قتل کی سزائیں دی گئیں۔ حتٰی کہ خود آپ کی زندگی کا خاتمہ بھی حکومت کے جلّادوں ہی کے ہاتھوں ہوا۔ اس سے پہلے آپ گیارہ سال سے زیادہ عرصے تک ان کے قید خانوں میں رہے۔ جیسا کہ عنقریب ہم اس فصل کے آخر میں آپ کی حیات طیبہ کے بیان میں اس کا ذکر کریں گے۔

ان حالات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دس سالوں میں جو آپ نے اپنے والد بزرگوار امام جعفر صادقؑ کی وفات کے بعد منصور دوانیقی کے عہد میں گزارے آپ کا اس سے کبھی سامنا نہیں ہوا اور نہ اس نے آپ کو بغداد آنے کے لیے کہا، جیسا کہ وہ آپ کے والد بزرگوار کو وہاں بلوا کر قتل کی دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ آپ کو اس کے دور میں

قید بھی نہیں کیا گیا تھا، جبکہ اس کے بیٹے مہدی اور اس کے پوتے ہارون کے زمانہ میں آپ کو قید میں رکھا گیا، حالانکہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے وہ دونوں سے زیادہ بدباطن تھا، جیسا کہ امام جعفر صادقؑ اور دیگر علویوں کے ساتھ اس کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس کو امام جعفر صادقؑ کی وفات کی اطلاع ملی تھی تو اس نے مدینہ میں اپنے گورنر محمد بن سلیمان کو حکم دیا تھا کہ انہوں نے جس کسی کو بھی اپنا جانشین مقرر کیا ہو وہ اسے قتل کر دے لیکن آخر کار اس کو اپنی اس بات سے مایوس ہونا پڑا تھا، کیونکہ اس کے گورنر نے اس کو لکھا کہ امامؑ نے پانچ افراد کو اپنا وصی بنایا ہے جن میں سے ایک خود منصور بھی تھا۔ اس پر اس نے کہا تھا کہ میرے لیے ان سب کے قتل کا کوئی موقع نہیں ہے، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

ایسی بہت سی باتیں ہیں جو منصور کی بُری سرشت، علوی گھرانے سے اور ہر اس شخص سے اسکے بغض کو ظاہر کرتی ہیں جو اس گھرانے سے محبت کا دم بھرتا ہو۔ اس کے اس بغض اور عداوت کی سب سے بڑی دلیل وہ روایت خزانہ ہے جس کے مطابق اس نے اپنے خزانہ کی کنجیاں مہدی کی بیوی اور اپنی بہو ریطہ کے سپرد کر کے اس کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اس خزانے کو اسکی وفات کے بعد صرف اس کے جانشین کی موجودگی ہی میں کھولے، جبکہ اس خونی خزانے میں ایک سو سے زیادہ علوی مقتولین کے لاشے پڑے تھے اور ہر ایک کے پہلو میں اس کے نام و نسب کا پرچہ موجود تھا۔ تاہم ریطہ، اس کے شوہر مہدی یا کسی اور کو اس بات کا کوئی علم نہ تھا، کیونکہ جب منصور اپنی وصیت میں اس کو پوشیدہ رکھنے اور صرف اس کی وفات کے بعد کھولنے کی تاکید کر رہا تھا تو وہ گمان کر رہی تھی کہ لازماً اس میں بہت سا سونا، ہیرے اور دوسری قیمتی چیزیں ہوں گی کہ جن کی مالیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوگا۔

منصور کے ان پاک جسموں کو بحفاظت اپنے خزانے میں رکھنے اور اپنے جانشین کے اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی ان کو اس کے حوالہ کر دینے کے متعلق میرے ذہن میں سوائے اسکے کوئی اور توجیہ نہیں ہے کہ وہ اپنے جانشین کو علویوں اور ہر اس فرد کے خلاف کہ جس سے ان کے تختِ حکومت یا ان کے وجود کو کچھ خطرہ ہو، ایسے ہی سخت اقدامات کرنیکی ہمت دلانا چاہتا تھا۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ کے بارے میں منصور کے بظاہر اس بے ضرر طرزِ عمل کا سبب سے

اہم سبب یہ تھا کہ آپ ان سخت حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے جن میں آپ گھرے ہوئے تھے۔ آپ حتی الوسع اپنے گھر ہی میں رہا کرتے اور اپنے اصحاب اور عام شیعوں سے بھی زیادہ میل جول نہ رکھتے تھے۔ آپ خاص خاص افراد کے علاوہ کسی سے ملاقات نہیں فرماتے تھے اور وہ بھی ایک معین طریقے پر ہوتی تھی۔ جیساکہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ جب یہ معتمد لوگ کسی شخص کے بارے میں مطمئن ہو جاتے تو پھر اس کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ تب آپ بھی اس کو اس ملاقات کو پوشیدہ رکھنے کی ہدایت کرتے اور اس کے اظہار کی صورت میں پیش آنے والے سخت نتائج سے خبردار کر دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصور اس زمانے میں آپ کو اپنے خاص طریقوں سے تلاش کر رہا تھا اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ باوجود کوشش کے اس کا ہاتھ آپ تک پہنچ نہیں پاتا تھا۔ تاہم اگر وہ یہ سمجھ بھی جاتا اور یقین کر لیتا کہ آپ ہی اپنے والد بزرگوار کے شرعی جانشین ہیں تو بھی جب تک آپ لوگوں سے اس طرح دُور رہتے، اسکو آپ کی ذات سے کسی نقصان کا خدشہ نہ تھا اور وہ آپ کو اپنے تخت حکومت کے لیے خطرہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ ایسے بہت سے افراد جو آپ کے والد بزرگوار کے اصحاب میں تھے، ان میں سے کچھ آپ کے بھائی عبداللہ افطح کی جانب اور کچھ آپ کے مرحوم بھائی اسمٰعیل کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ اس لیے شیعوں میں ایک ایسی ابتری پھیل رہی تھی جس سے ان کی وحدت میں رخنہ پڑ گیا تھا۔ چنانچہ منصور نے ان دونوں گمراہ جماعتوں کے لیے اپنے دل کے دروازے کھول دیے تھے۔ اسی زمانے میں منصور کی سیاست میں ایک نیا موڑ آیا اور اس نے امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانہ کے غیر شیعہ علماء کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ وہ ان پر دولت کی بارش کرنے اور ان کے مرتبے بڑھانے اور ان کی تعظیم کرنے لگا۔ وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ ان علماء کو عوام میں نمایاں کر دے۔ تاکہ لوگوں کی نظر میں ائمۂ اہلبیتؑ ان کی فقہ اور ان کے علوم سے ہٹ جائیں۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنے ہم نشینوں میں کہنے لگا: مجھ کو دنیا کی نعمتیں تو بڑی حد تک حاصل ہو گئی ہیں۔ اب میری صرف یہ تمنا باقی ہے کہ میں اور علمائے دین ایک ہی مجلس میں بیٹھا کریں۔

پھر اس نے ان علماء کو اپنا مقرب بنا لیا اور ان پر ہدیوں اور عطیوں کی بارش کرنے لگا۔ تاکہ وہ یہ کہتے رہیں کہ منصور اور اس کے بیٹے پوتے ہی حضرت رسولؐ کے قرابتدار اور انکے وارث

ہیں۔ نیز وہ اپنی حرص و طمع کے تحت لوگوں میں یہ بات بھی پھیلاتے رہیں کہ منصور کی خلافت شرعی ہے اور وہ ایک صاحب فضیلت اور عادل خلیفہ ہے۔ چنانچہ اس کو ان علماء میں ایسے افراد مل گئے جو اس کی ہمنوائی کریں اور اس کے گھرانے کی مدح و ثنائی میں لگ جائیں۔ جیسے مالک بن انس اور ایسے ہی دوسرے افراد کہ جو منصور کے حسب منشا کھاتے اور گاتے رہے۔ اس کے بدلے میں اس نے مالک بن انس کو بزور شمشیر عوام کی گردنوں پر سوار کرا دینے کی کوشش کی اور ان کو حجاز میں گورنروں اور حکومت کے تمام وظیفہ داروں پر اقتدار سونپ دیا۔ چنانچہ ان کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم رہنے لگا اور پھر گورنر اور دوسرے حکام ان سے خائف رہنے لگے۔ ایک موقع پر شافعی جب ان سے ملنے گئے تو ان کو اپنے لیے اس میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے گورنر کی سفارش حاصل کرنا پڑی۔ تب گورنر نے کہا کہ مالک کے دروازہ تک جانے کی نسبت میرے لیے یہ امر زیادہ آسان ہے کہ میں مدینہ سے مکہ تک ننگے پیر پیدل چلا جاؤں کیونکہ میں ذلت برداشت کیے بغیر ان کے دروازے تک نہیں جا سکتا۔ جیسا کہ معجم الادبا کے حوالے سے الامام الصادق والمذاہب الاربعہ کی تیسری جلد میں نقل کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ منصور کا یہ طرز عمل علم کی قدردانی اور دین کی سربلندی کے لیے نہ تھا بلکہ یہ امام جعفر صادقؑ کے شرعی جانشین اور امام وقت کے خلاف اس کا ایک احتیاطی اقدام تھا کیونکہ اس کو اس میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ اگر وہ ظاہر بظاہر میدان میں آ گئے تو فوراً ہی ہر جگہ کے لوگوں کی گفتگو کا مرکز بن جائیں گے اور ہر علاقے کے علماء اور طالبان علم اور ان کے والد بزرگوار کے اصحاب ان کی خدمت میں آنے لگیں گے۔ جبکہ منصور اولاد علیؑ میں کسی بھی شخص کے لیے ایسی مقبولیت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے کہ وہ اس میں اپنے گھرانے اور اپنی حکومت کے لیے خطرہ محسوس کرتا تھا، جبکہ سیاستدانوں اور اقتدار پسندوں کے پیمانے سے یہ ایک غیر معقول بات ہے کہ وہ جس شخص کو اپنے تخت حکومت کے لیے خطرہ تصور کریں اس کی طرف سے چشم پوشی کریں اور اس کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں کھڑی نہ کریں۔ المختصر امام موسیٰ بن جعفرؑ اپنے اصحاب اور عام شیعوں سے ایک حد تک دُور دُور رہے اور منصور ان پر سختی کرنے یا ان کو قید میں رکھنے کے بجائے انہی طریقوں سے ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ البتہ خلیفہ مہدی عباسی کے زمانہ میں جبکہ آپ کی امامت اور مرکزی حیثیت کا شہرہ ہو گیا اور

ایسے بیشتر افراد جو پہلے آپ سے کٹ گئے تھے وہ بھی آپ کی طرف واپس آگئے اور علماء اور راویان حدیث آپ سے رجوع کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ہر دوست اور دشمن کی زبان پر آپ کا تذکرہ جاری تھا۔ ان حالات میں مہدی نے آپ پر سختی کرنے کا ارادہ کیا اور آپ کو کئی بار بغداد بلوایا، لیکن اللہ کی تدبیر اس کے منصوبے میں حائل ہوتی رہی۔

تذکرۃ الخواص ابن جوزی میں ہے کہ: سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ امام موسٰی بن جعفرؑ کا قیام مدینہ میں تھا لیکن خلیفہ مہدی عباسی نے آپکو بغداد بلاکر قید میں ڈال دیا۔ بعد میں جب اس نے ایک خواب دیکھا تو آپ کو رہا کرکے مدینہ واپس بھیج دیا۔

وہ مزید کہتے ہیں: تاریخ بغداد میں خطیب بغدادی نے فضل بن ربیع سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ جن دنوں مہدی نے امام موسٰی بن جعفرؑ کو قید کر رکھا تھا اس نے ایک رات خواب میں امام علی بن ابی طالبؑ کو دیکھا کہ وہ اس سے کہہ رہے ہیں:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ۔ (سورۂ محمدؐ۔ آیت ۲۲)

یعنی کیا ایسا ہے کہ جب تم کو اقتدار حاصل ہو جائے گا تو تم زمین پر فساد برپا کروگے اور قرابتداری کا بھی لحاظ نہ کروگے۔

ربیع کہتے ہیں کہ جب مہدی نے مجھ کو ایک رات بلوایا تو میں بہت ہی خوفزدہ ہو گیا۔ وہ تھا بھی خوش الحان اور اس وقت یہی آیت پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا: امام موسٰیؑ بن جعفرؑ کو میرے پاس لے آؤ۔ جب میں ان کو لے کر آیا تو وہ آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ آپ سے گلے ملا اور آپ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ پھر کہنے لگا: اے ابوالحسنؑ! میں نے ابھی ابھی خواب میں امیرالمومنین امام علیؑ کو دیکھا کہ وہ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے۔ تو کیا اب آپ قسم کھا کر مجھ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ یا آپ کا کوئی بیٹا میرے خلاف جنگی اقدام نہ کرے گا۔ اس پر آپ نے فرمایا: نہ میں نے کبھی ایسا کیا ہے اور نہ یہ میری خصلت ہے۔ وہ بولا: آپ سچ فرماتے ہیں۔ پھر مجھ سے کہا: اے ربیع! امام موسٰی بن جعفر کو تین ہزار دینار دے کر انہیں ان کے اہل و عیال کے پاس واپس بھجوادو۔ ربیع کہتے ہیں کہ کسی اور رکاوٹ کے خوف سے میں نے رات ہی میں اس حکم کی پوری طرح تعمیل کردی اور صبح ہوئی تو امامؑ مدینہ کے راستے پر بہت دور نکل چکے تھے۔

مہدی عباسی نے امام موسیٰ بن جعفرؑ کو کئی بار بغداد بلایا تھا جیسا کہ اصول کافی میں احمد بن محمد اور علی بن ابراہیم نے ابو خالد ربانی سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا: امام موسیٰ بن جعفرؑ جب پہلی بار مہدی کے پاس جانے کے لیے روانہ ہوئے تو زبالہ میں آکر ٹھہرے۔ تب میں آپ سے محو گفتگو تھا اور آپ نے مجھ کو مغموم پایا تو مجھ سے پوچھا: اے ابو خالد! میں تم کو مغموم کیوں پاتا ہوں؟ میں نے کہا: میں کیوں نہ غم محسوس کروں؟ جبکہ آپ اس ظالم کے پاس جا رہے ہیں اور نہیں معلوم کہ وہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس پر آپ نے فرمایا: مجھ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم فلاں مہینہ اور فلاں دن کو مجھ سے اپنے گاؤں کے باہر ملنا۔ اب مجھے تو سوائے مہینہ اور دن شمار کرنے کے اور کوئی فکر ہی نہ رہی۔ یہاں تک کہ وہ دن آگیا اور میں گاؤں کے باہر اس جگہ پر جا پہنچا۔ میں وہیں کھڑا رہا حتیٰ کہ سورج غروب ہونے کا وقت قریب آگیا۔ تب میرے دل میں شیطان نے یہ وہم ڈالا اور میں ڈرنے لگا ـــــ مجھے آپ کے قول میں شک ہونے لگا۔ اتنے میں مجھے عراق کی جانب سے قافلے کے آثار نظر آئے اور میں ان کو لینے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ امام ابو الحسن موسیٰؑ بن جعفرؑ سب کے آگے آگے ایک خچر پر سوار چلے آرہے تھے۔ آپ نے مجھ کو آواز دی: اے ابو خالد! میں نے عرض کیا: میں حاضر ہوں اے فرزند رسولؐ! پھر فرمایا: شیطان کی شکایت نہ کرنا، کیونکہ تم نے خود شک کیا ہے۔ میں نے عرض کیا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو ظالم حاکم سے نجات دلا دی۔ اس پر آپ نے فرمایا: لیکن مجھے تو اس کے پاس دوبارہ جانا پڑے گا اور پھر میں زندہ واپس نہیں آؤں گا۔

بعض روایات میں ہے کہ مہدی عباسی نے امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کو پیش کش کی کہ وہ آپ کو فدک کا علاقہ واپس کر دے گا لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ جب مہدی نے اس پر اصرار کیا تو آپ نے فرمایا: میں اس کی پوری حدود کے ساتھ ہی اسے واپس لے سکتا ہوں۔ اس نے کہا: اس کی حدود کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: پہلی حد عدن ہے۔ اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے فرمایا: دوسری حد سمرقند ہے۔ اس کا چہرہ کالا پڑ گیا۔ آپ نے فرمایا: تیسری حد افریقہ ہے۔ اس پر مہدی نے کہا اور چوتھی حد؟ آپ نے فرمایا: سمندر کا وہ ساحل جو خزر اور آرمینیا سے متصل ہے۔ اس پر وہ بولا: پھر تو ہمارے لیے کچھ بھی نہ رہے گا

اور آپ میری جگہ خلیفہ بن جائیں گے۔ امامؑ نے جواب دیا: میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اگر تم فدک واپس نہیں کرنا چاہتے ہو تو اس کو اتنا محدود کیوں کرتے ہو؟

زمخشری نے ربیع الابرار میں جو روایت درج کی ہے اس کے مطابق یہ گفتگو ہارون اور امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کے درمیان ہوئی تھی۔ تاہم ان دونوں روایتوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے کیونکہ یہ امکان بھی ہے کہ یہ گفتگو دو مرتبہ ہی ہوئی ہو۔

بہرحال خلیفہ مہدی اور اس کے بیٹے ہادی کے عہد حکومت میں امام موسیٰ کاظمؑ سخت نگرانی کے تحت رہے۔ جبکہ مہدی نے آپ کو ایک سے زیادہ مرتبہ بغداد بلوایا کیونکہ وہ آپ سے سخت بغض رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کو قید کیا اور پھر ایک خواب دیکھنے پر آپ کو رہا کیا، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں۔ البتہ اس وقت میرے سامنے جو روایات موجود ہیں، ان میں مجھ کو کوئی اشارہ نہیں ملا کہ مہدی کے بعد خلیفہ ہادی نے بھی امام کے ساتھ کوئی برا سلوک کیا ہو یا آپ کو بغداد بلایا ہو، حالانکہ وہ بھی اپنے ظلم اور سنگدلی میں مشہور تھا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اپنے اس مختصر عہد حکومت میں اس کو اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے باپ اور دادا کے اس طریقہ پر عمل کرتا۔ ہاں اگر اس کا دور حکومت کچھ طول پکڑتا تو یقیناً وہ بھی ان دونوں کے طور طریقوں پر چلتا اور امام موسیٰؑ بن جعفرؑ پر جبر و تعدی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امامؑ کی زندگی کے وہ چند سال جو خلیفہ ہارون کے عہد حکومت میں گزرے، ان میں آپ کو از حد مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس نے اپنے آدمیوں کو آپ کی نگرانی پر معین کر رکھا تھا۔ آپ کو بار بار بغداد بلواتا رہا۔ چونکہ وہ آپ سے سخت بغض رکھتا تھا اس لیے آپ کو قید کر دیتا اور پھر ایک مدت کے بعد رہا کرنے کا حکم دے دیتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کبھی کبھی مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے ظاہری طور پر آپ کی تعظیم و تکریم بھی کرتا تھا۔ اس ضمن میں مروج الذہب جلد دوم میں مسعودی نے عبداللہ بن مالک خزاعی سے ایک روایت نقل کی ہے جو خلیفہ ہارون کے شاہی محل پر متعین پولیس کا سربراہ تھا۔ اس نے بیان کیا کہ ایک بار میرے پاس ہارون کا قاصد ایسے وقت میں آیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے مجھ کو لباس بھی تبدیل نہ کرنے دیا اور اپنے ساتھ لے چلا، جس سے مجھ پر خوف کا غلبہ ہو گیا۔ جب میں محل پر پہنچا تو غلام نے ہارون کو میرے آنے کی اطلاع دی۔ جب مجھے

باریابی کی اجازت ملی تو میں اندر گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے جاتے ہی خلیفہ کو سلام کیا لیکن وہ پھر بھی خاموش ہی رہا۔ اس سے میرے ہوش اڑ گئے اور میری پریشانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد خلیفہ نے مجھ سے کہا: اے عبداللہ! کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں اس وقت کیوں بلایا ہے؟ میں نے کہا: اے امیر المومنین! بخدا کہ میں نہیں جانتا۔ وہ بولا: میں نے ابھی ابھی خواب میں ایک حبشی کو دیکھا ہے کہ وہ ایک خنجر لیے ہوئے میرے پاس آیا اور کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کو ابھی ابھی رہا نہ کیا تو میں تم کو اسی خنجر سے ذبح کر ڈالوں گا۔ پس اب تم جاؤ اور ان کو رہا کرو۔ میں نے کہا: اے امیر المومنین! کیا میں موسیٰؑ بن جعفر کو رہا کر دوں۔ میں نے اپنی یہ بات تین بار دہرائی۔ خلیفہ نے پھر کہا: ہاں! فوراً جاؤ اور رہا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو تیس ہزار درہم بھی دیدو۔ نیز ان سے کہو کہ اگر آپ میرے پاس ٹھہرنا چاہیں تو آپ کو وہ سب کچھ ملے گا جو آپ چاہیں گے۔ تاہم اگر آپ مدینہ تشریف لے جانا چاہیں تو اس کا فیصلہ بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

عبداللہ بن مالک کہتا ہے کہ پھر میں قید خانہ میں گیا تاکہ آپ کو وہاں سے باہر لے آؤں، لیکن مجھ کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک جھپاکے سے میری طرف آئے۔ وہ یہ خیال کر رہے تھے کہ اب مجھ کو بھی ان پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہو گا۔ اس لیے میں نے کہا: پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ امیر المومنین نے مجھے آپ کو رہا کر دینے کا حکم دیا ہے اور ساتھ ہی آپ کو تیس ہزار درہم دینے کی ہدایت کی ہے۔ نیز انہوں نے کہا ہے کہ اب اگر آپ یہاں ہمارے پاس ٹھہرنا چاہیں تو بھی آپ کو اختیار ہے۔ چنانچہ میں نے ان کو تیس ہزار درہم دیدیے اور ان کو قید سے آزاد کر دیا۔ پھر میں نے ان سے کہا: میں آپ کی رہائی کے معاملہ پر تعجب کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: یہ میں تم کو بتاتا ہوں۔ ہوا یہ کہ ابھی جبکہ میں سو رہا تھا، خواب میں نبی اکرمؐ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: اے موسیٰؑ! تم کو ناحق قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ اگر تم اپنی زبان سے یہ کلمات ادا کرو تو تم آج رات سے اس قید خانہ میں نہ رہو۔ میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، میں کونسے کلمات کہوں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کہو:

يَا سَامِعَ كُلِّ صَوْتٍ وَّيَا سَابِقَ الْفَوْتِ وَكَاسِيَ الْعِظَامِ لَحْمًا وَّنَاشِرَهَا بَعْدَ الْمَوْتِ اَسْئَلُكَ بِاَسْمَائِكَ الْحُسْنٰى وَبِاسْمِكَ الْعَظِيْمِ الْاَكْبَرِ الْمَخْزُوْنِ الْمَكْنُوْنِ الَّذِيْ لَمْ يَطَّلِعْ عَلَيْهِ اَحَدٌ مِّنَ الْمَخْلُوْقِيْنَ يَا حَلِيْمًا ذَا الْاِنَاةِ لَا يَقْوٰى عَلٰى اِنَاتِهٖ اَحَدٌ يَا ذَا الْمَعْرُوْفِ الَّذِيْ لَا يَنْقَطِعُ اَبَدًا وَّلَا يُحْصٰى عَدَدًا فَرِّجْ عَنِّيْ.

اے ہر آواز کے سننے والے، اے ہر گزرے ہوئے سے پہلے، اے ہڈیوں پر گوشت چڑھانے والے اور ان کو مرنے کے بعد اٹھانے والے۔ میں سوال کرتا ہوں تیرے اسماء حسنیٰ کے واسطہ سے اور تیرے عظیم اور اکبر نام کے واسطہ سے جو محفوظ کیا ہوا ہے اور پوشیدہ ہے اور اس سے مخلوقات میں سے کوئی واقف نہیں ہے اور ایسے بردبار اور تحمل کرنے والے کہ جس کے تحمل پر کوئی قادر نہیں ہے۔ اے ایسی بھلائی کرنے والے جو کبھی ٹوٹتی نہیں ہے اور گنتی میں شمار نہیں ہو سکتی تو میری مشکل کو حل کر دے!

پس ان کلمات کو جاری کرنے سے جو اثر ظاہر ہوا ہے، اب اسے تم میرے قید سے رہا ہو جانے کی صورت میں دیکھ ہی رہے ہو۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہارون نے آپ کو ایک سے زیادہ مرتبہ قید میں رکھا۔ پھر وہ آپ کو رہا کر دیتا اور آپ سے معذرت کرتے ہوئے عزت و اکرام کے ساتھ آپ کو مدینہ واپس بھیج دیتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ آپ کو بغداد بلاتا یا کسی وقت وہ مکّہ جاتے ہوئے جب مدینہ میں رکتا اور امام موسیٰ کاظمؑ اس سے ملنے کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ آپ کی تعظیم کرتا اور آپ کو سب لوگوں پر فضیلت دیتا تھا۔

چنانچہ شیخ صدوق نے آپ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں ہارون سے ملا تو وہ مجھ سے کہنے لگا۔ آپ لوگوں نے عوام اور خواص کو یہ اجازت کیسے دی ہے کہ وہ آپ کو اولاد رسولؐ کہیں، جبکہ آپ لوگ امام علیؑ کی اولاد ہیں اور ہر آدمی اپنے باپ ہی سے منسوب ہوتا ہے۔ نبیٔ اکرمؐ تو بس ماں ہی کی طرف سے آپ کے جدامجد ہوتے ہیں۔ میں نے جواب میں کہا: اے امیرالمومنین! اگر آج نبی اکرمؐ زندہ ہوتے اور وہ آپ سے آپ کی لڑکی کا رشتہ طلب

کرتے تو کیا آپ اسے قبول کرتے ؟ ہارون نے کہا: سبحان اللہ! میں اسے کیوں نہ قبول کرتا! تب میں نے کہا لیکن آنحضرتؐ نہ تو مجھ سے رشتہ طلب کرتے اور نہ میں ان سے ایسی بات کرسکتا۔ ہارون نے کہا: اے ابوالحسنؑ! آخر ایسا کیوں ہوتا؟ میں نے کہا: اس لیے کہ میں ان کی اولاد سے ہوں اور تم ان کی اولاد میں سے نہیں ہو۔ ہارون نے کہا: اے موسیٰؑ! آپ نے بہت خوب کہا۔ پھر بولا: آپ خود کو کیسے نبیؐ کی ذرّیت کہتے ہیں جبکہ نبی اکرمؐ اپنے بعد کسی کو نہیں چھوڑ گئے جو ان کی نسل سے ہو۔ کیونکہ نسل عورت سے نہیں مرد سے ہوتی ہے اور آپ لوگ ان کی بیٹی کے بیٹوں میں سے ہیں۔ تب میں نے اس سے اپنی قرابت، کا روضۂ رسولؐ کا اور خود حضرت رسولؐ کا واسطہ دے کر کہا کہ اب مجھ کو اس بات کا جواب دینے سے معاف رکھا جائے لیکن اس نے کہا: اے موسیٰؑ اور اے علیؑ کے فرزند! آپ بالضرور مجھ کو اپنی دلیل سے آگاہ کریں کیونکہ میری اطلاع کے مطابق آپ اولادِ علیؑ کے سردار اور امامِ زمانہ ہیں۔ میں آپ کو ہرگز نہ چھوڑونگا جب تک آپ اپنے دعوے کے حق میں مجھ کو کتابِ خدا سے دلیل نہ دیں گے۔ چنانچہ امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ۔

(سورۃ انعام۔ آیت ۸۴-۸۵)

اور انہی ابراہیمؑ کی ذریت سے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ ہیں اور اس طرح ہم نیک عمل کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں۔ نیز زکریاؑ، یحییٰؑ اور عیسیٰؑ بھی۔

یہاں پر امامؑ نے اس سے دریافت کیا: اے امیرالمومنین! عیسیٰؑ کا باپ کون تھا؟ اس نے کہا: عیسیٰؑ کا کوئی باپ نہیں تھا۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: ان کو ہم نے انبیاءؑ کی ذرّیت میں ان کی ماں مریم ہی کی طرف سے شامل کیا ہے۔ پس ہم بھی اپنی مادرِ گرامی فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کی طرف سے ہی خود کو نبی اکرمؐ کی اولاد میں شمار کرتے ہیں۔ امام نے مزید فرمایا: اے امیرالمومنین! اگر آپ چاہیں تو میں کچھ اور بھی بتاؤں۔ اس نے کہا: ہاں ضرور بتائیے۔ تب آپ نے آیتِ مباہلہ تلاوت فرمائی:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ.

(سورۂ آل عمران - آیت ۶۱)

پس جو کوئی تم سے بحث کرے جبکہ تمہارے پاس علم آچکا ہے تو کہہ دو کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو، تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے نفسوں کو اور تم اپنے نفسوں کو۔ پھر ہم اللہ سے رجوع کریں اور اللہ کی لعنت کریں جھوٹوں پر۔

آپ نے فرمایا کہ یہ دعویٰ کسی نے نہیں کیا کہ نصاریٰ سے مباہلہ کے وقت نبی اکرمؐ نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے علاوہ کسی اور کو بھی ہمراہ لیا۔ اس سے اللہ کے قول کا یہ مطلب حاصل ہوتا ہے کہ اَبْنَآءَنَا میں حسنؑ اور حسینؑ، نِسَآءَنَا میں فاطمہؑ اور اَنْفُسَنَا میں صرف علیؑ ابن ابی طالب ہیں۔ تب ہارون کہنے لگا: اے ابوالحسنؑ! آپ نے جو کچھ کہا صحیح کہا اور عمدگی سے کہا ہے۔

راویوں کا بیان ہے کہ: مامون نے اپنے کچھ ہمنشینوں سے کہا: کیا تم لوگ جانتے ہو کہ مجھ کو شیعیت کی تعلیم کس نے دی؟ سب نے کہا: نہیں! بخدا کہ ہم نہیں جانتے۔ وہ کہنے لگا: مجھ کو ہارون نے شیعیت کی تعلیم دی ہے۔ اس سے کہا گیا: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ ہارون تو اس گھرانے کے افراد کو قتل کرتے رہتے تھے۔ وہ بولا: وہ ان کو حکومت کی خاطر قتل کیا کرتے تھے اور حکومت بے رحم ہوتی ہے ــــــ ہوا یہ کہ ایک سال میں نے ان کے ساتھ حج کیا، جب وہ مدینہ گئے تو اپنے خیمے کے پردے کے قریب کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ مکہ اور مدینہ کے مہاجرین و انصار کی اولاد اور قریش و بنی ہاشم میں سے کوئی بھی اپنا نسب ظاہر کیے بغیر اندر داخل نہ ہو۔ چنانچہ جب بھی کوئی شخص اندر جانا چاہتا تو وہ کہتا تھا کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں اور پھر بنی ہاشم یا قریش وغیرہ میں سے اپنے دادا کا نام لیتا تھا۔ تب میرے والد ہارون اس کے مرتبہ اور اس کے باپ دادا کے شرف یا ہجرت میں اولیت کے مطابق اس کو پانچ ہزار یا کم سے کم دوسو دینار دیتے تھے۔ اسی دوران میں ایک روز جبکہ

میں اپنے والد کے پاس کھڑا تھا، فضل بن ربیع نے اندر آکر کہا: اے امیرالمومنین! دروازہ پر ایک صاحب کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ موسیٰؑ بن جعفرؑ محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ بن ابیطالبؑ ہیں۔ تب میرے والد ہارون ہماری طرف آئے جبکہ ہم سب یعنی میں، امین، موتمن اور تمام اراکین دولت ان کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے ہم سب سے کہا: ہاں تم سب لوگ باادب اور ہوشیار کھڑے ہو جاؤ۔ اس کے بعد دربان سے کہا کہ ان کو بلا لاؤ لیکن دیکھو وہ میری مسند پر آکے اپنی سواری سے اتریں گے۔ پھر میں نے ایک بزرگ کو تشریف لاتے دیکھا کہ جن کو عبادت نے ایسا گھلا دیا تھا جیسے کوئی بوسیدہ کھال ہو اور ان کے ماتھے اور ناک کو سجدوں نے زخمی کر دیا تھا۔ جب انہوں نے میرے والد ہارون کو دیکھا تو اپنے گدھے پر سے اترنے لگے، مگر انہوں نے زور دے کر کہا: نہیں، نہیں! بخدا کہ آپ میری مسند تک سواری پر ہی آئیں اور چوبداروں نے ان کو پیدل نہ ہونے دیا۔ چنانچہ وہ گدھے پر سوار چلتے رہے، حتیٰ کہ خلیفہ کی مسند تک پہنچ گئے۔ جبکہ حاجب اور تمام اراکین دولت ان کے جلو میں تھے۔ اب وہ اپنی سواری سے اترے اور میرے والد ہارون ان کے لیے کھڑے ہو گئے اور ان کو مسند پہ اتارا۔ پھر ان کے سر و صورت کو بوسہ دیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنے ساتھ مسند پر بٹھایا اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ وہ سب کو چھوڑ کر انہی کی طرف متوجہ رہے اور انکا حال احوال دریافت کرتے رہے۔ جب امام موسیٰ کاظمؑ واپسی کے لیے اٹھے تو میرے والد ہارون بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور ان کو رخصت کیا۔ پھر وہ امین، موتمن اور میرے پاس آئے اور بولے: اے عبداللہ، اے محمد اور اے ابراہیم! جاؤ اپنے چچا اور اپنے سیّد و سردار کی رکاب تھاما ہو اور ان کے لباس کے پلوؤں کو صحیح کرو۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ مامون کو اپنے باپ کے اس طرز عمل پر تعجب ہوا اور جب وہ اپنے باپ سے تنہائی میں ملا تو اس سے امام موسیٰ کاظمؑ کی اس طرح قدر کرنے کا سبب دریافت کیا۔ اس پر ہارون نے کہا: اے بیٹے! وہی تو اس خلافت و ریاست کے اصل حقدار ہیں۔ یہ سن کر مامون نے کہا: جب آپ کو یہ معلوم ہے تو پھر ان کا یہ حق ان کو لوٹا دیجیے۔ تب ہارون نے کہا: ارے یہ حکومت ہے حکومت! اس میں اگر تم بھی مجھ سے تنازعہ کرتے تو میں تمہارا سر بھی بے دریغ کاٹ ڈالتا۔

ایسی ہی کچھ اور روایات بھی ہیں جو امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ اس کے طرز عمل کو ظاہر کرتی ہیں۔ جن میں سے کچھ روایتیں اس کو آپ کے حق میں نہایت سنگدل اور سخت گیر بتاتی ہیں اور بعض میں وہ امامؑ کے لیے انتہائی مہربان، رحمدل اور نرم مزاج نظر آتا ہے۔ تاہم یہ طریقۂ کار ہارون کی اس روش کے لحاظ سے کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے، جو اس نے لوگوں کے ساتھ اختیار کیے رکھی کیونکہ وہ حالات کی مناسبت سے اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کر لیا کرتا تھا۔ مثلاً ایک وقت میں وہ عالموں اور واعظوں کو بلالیتا تاکہ وہ اللہ کا ذکر کریں۔ تب وہ اتنا روتا کہ جو بھی اس کو اس حالت میں دیکھتا، وہ خیال کرتا کہ عنقریب ہی خوف خدا کے مارے اس کی جان نکل جائے گی۔ اسی طرح کبھی وہ ایک دن میں سو سو رکعت نماز پڑھا کرتا تھا۔ جیساکہ عصر المامون کی جلد اول میں آیا ہے لیکن جب اپنے ہم نشینوں کے ساتھ شراب کے جاموں اور کنیزوں سے لطف اندوز ہونے کا وقت آتا تو پھر وہ ایک دوسرا ہی انسان ہوتا جو بدترین انسانوں کے روپ میں سامنے آتا تھا۔ اسی طرح اگر اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص اس کے ظلم پہ خاموش رہنے والا نہیں یا اس کو یہ گمان ہو جاتا کہ وہ اس کے تخت حکومت کے لیے خطرہ بن سکتا ہے تو وہ ایک ایسا خون آشام بن جاتا جو ایذارسانی اور خوں ریزی میں ایسی لذّت محسوس کرتا ہو، جیسی لذّت خونخوار درندے اپنے شکار کو پھاڑ کھانے میں محسوس کرتے ہیں۔

بہرحال ان تمام پابندیوں کے باوجود جو ہارون نے امام موسیٰؑ بن جعفرؑ پر عائد کی تھیں۔ آپ کی شہرت عراق، حجاز اور تمام مسلم علاقوں میں پھیل گئی اور ہر طرف کے علماء و طالبان علم آپ کے پاس آنے لگے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو ماضی میں آپ سے علٰحدہ ہوگئے تھے وہ بھی آپ کی امامت کے قائل ہوگئے اور تمام شیعہ مسلمان اپنے مال کا خمس اور زکوٰۃ آپ کو ادا کرنے لگے۔ اگرچہ یہ سب باتیں خود ہارون سے بھی پوشیدہ نہیں تھیں، تو بھی آپ کے مخالفین اور سرکاری مخبر اس کے ملک اور تخت کو امامؑ سے لاحق خطرے کا خوف دلاتے رہتے تھے ادھر امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کے اپنے ہی بھتیجے یعنی محمد بن اسماعیل ایسے افراد ہارون کے پاس جا کر کہتے: آجکل مسلم مملکت میں دو خلیفہ برسر عمل ہیں، جن میں سے ایک میرے چچا موسیٰؑ بن جعفرؑ حجاز میں اور دوسرے ہارون بغداد میں ہیں۔

اس طرح خلیفہ ہارون کے ذہن میں زوال حکومت کا خوف پیدا کرنے والی باتیں جمع ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ وہ اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ ایک روز ہارون روضۂ رسولؐ پر آیا اور اس کے اردگرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ تب اس نے حضرت رسولؐ پر یوں سلام کیا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَابْنَ عَمِّ! سلام ہو آپ پر اے ہمارے چچا زاد بھائی! اس موقع پر امام موسیٰؑ بن جعفرؑ بھی وہاں موجود تھے۔ آپ نے فوراً ہی فرمایا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَآ اَبَتَاہُ! سلام ہو آپ پر اے بابا جان! آپ نے یہ اس لیے فرمایا کہ ہارون کا مقصد پورا نہ ہونے پائے، جو یہ چاہتا تھا کہ رسول اللہؐ سے اپنی قرابت ظاہر کر کے عوام کے سامنے بڑا بنے اور لوگ یہ سمجھیں کہ یہ خلافت اور حکومت اس کو اپنے دادا عباس سے وراثت میں ملی ہے جو رسول اللہؐ کے چچا تھے۔ اس پر ہارون کو غصہ آگیا اور بقول راوی اس نے تہیہ کر لیا کہ بہر طور اب امامؑ سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

اصول کافی میں موسیٰ بن قاسم بجلی نے علی بن جعفرؑ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم نے ماہ رجب میں عمرہ ادا کیا اور ابھی مکہ ہی میں تھے کہ محمد بن اسماعیل میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ چچا جان! میرا ارادہ بغداد جانے کا ہے اور چاہتا ہوں کہ اپنے چچا موسیٰ کاظمؑ سے رخصت ہو لوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ میرے ساتھ ان کے پاس چلیں۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ اپنے بھائی امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کے پاس گیا۔ وہ اس زمانہ میں اپنے مکان میں تھے جو خویہ کے مقام پر تھا۔ ہم نماز مغرب کے بعد وہاں پہنچے اور میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تب امامؑ نے پوچھا: کون ہے؟ میں نے کہا: علی بن جعفرؑ۔ وہ بولے: ابھی آتا ہوں، وہ وضو کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے کہا: جلدی کیجیے! چنانچہ وہ باہر نکل آئے اور دروازے کے ساتھ بنی ہوئی سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ اب میں نے ان سے کہا: ہم آپ کے پاس ایک کام سے آئے ہیں۔ اگر آپ کے خیال میں وہ صحیح ہے تو اللہ اس میں ہماری مدد کرے، ورنہ ہم تو کتنے ہی معاملوں میں غلطی کیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے عرض کیا: آپ کا یہ بھتیجا بغداد جا رہا ہے اور آپ سے وداع ہونے آیا ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا: اسے بلاؤ۔ چنانچہ میں نے اس کو وہاں بلا لیا۔ وہ آپ کی جانب بڑھا، آپ کے سر پر بوسہ دیا اور کہا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، مجھ کو کوئی نصیحت کیجیے۔ آپ نے فرمایا: میں تم کو نصیحت

کرتا ہوں کہ میرے خون کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اس نے جواب میں کہا: جو کوئی آپ کا بُرا چاہے، اللہ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کرے، اس کے ساتھ ہی وہ آپ کا برا چاہنے والے کے لیے بددعائیں کرنے لگا۔ پھر آپ کے سر پہ بار دیگر بوسہ دے کر کہا: چچا جان! مجھکو نصیحت کیجیے۔ آپ نے فرمایا: میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ میرے خون کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اس نے کہا: جو کوئی آپ کے لیے برا چاہے اللہ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کرے۔ پھر آپ کے سر پر بوسہ دیا اور کہا: مجھے نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: میں نصیحت کرتا ہوں کہ میرے خون کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اب وہ امامؑ کے ہاں سے چل دیا اور میں بھی اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔ امامؑ نے مجھ سے کہا: اے بھائی! آپ ٹھیر جائیے۔ چنانچہ میں اپنی جگہ ٹھیرا رہا۔ وہ اپنے مکان میں چلے گئے۔ اس کے بعد آپ نے مجھ کو بلایا تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے سو دینار کی ایک تھیلی مجھے دی اور فرمایا: یہ اپنے بھتیجے کو دے دیجئے گا" وہ اس کو اپنے سفر میں کام میں لائے گا۔

علی بن جعفرؑ مزید کہتے ہیں کہ میں نے وہ تھیلی لے لی۔ اس کے بعد آپ نے مجھ کو سو دینار کی ایک تھیلی دی اور فرمایا یہ بھی اسی کو دیدیجیے۔ پھر ایسی ہی ایک تیسری تھیلی مجھکو دی اور کہا: یہ بھی اسی کو دیدیجیے۔ میں نے امامؑ سے کہا: میں آپ پہ فدا ہو جاؤں، جب آپ کو اس سے ایسا اندیشہ ہے کہ جس کا آپ نے ذکر کیا ہے تو پھر آپ خود اپنے ہی خلاف اسکی مدد کیوں کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر میں اس کے ساتھ قرابتداری کا لحاظ رکھوں گا اور وہ اس کا لحاظ نہ کرے گا تو اللہ اس کی مدت حیات کو ختم کر دے گا۔ اس کے بعد آپ نے چمڑے کی ایک اور تھیلی مجھے دی کہ جس میں تین ہزار درہم تھے، پھر فرمایا: یہ بھی اسکو دیدیجیے۔

علی بن جعفرؑ کہتے ہیں: میں وہاں سے محمد بن اسماعیل کے پاس آیا اور اس کو سو درہم کی پہلی تھیلی دی، جس سے وہ خوش ہو گیا اور اپنے چچا کو دعائیں دینے لگا۔ پھر میں نے اس کو دوسری اور تیسری تھیلی بھی دیدی اور وہ اتنا خوش ہوا کہ میں سمجھا "اب یہ اپنا ارادہ بدل دیگا اور بغداد نہیں جائے گا۔ اس کے بعد میں نے اس کو تین ہزار درہم بھی دیدیے لیکن وہ اپنی بات سے ٹلا نہیں۔ یہاں تک کہ بغداد جا کر ہارون سے ملا اور اس کو خلیفہ کہہ کر سلام کیا اور کہا: جب تک میں نے اپنے چچا موسیٰؑ بن جعفرؑ کو نہیں دیکھا کہ جن کو خلیفہ کہہ کر سلام کیا جاتا

ہے، مجھ کو معلوم نہ تھا کہ مسلم مملکت میں دو خلیفہ ہیں۔ اس پہ ہارون نے اس کو ایک لاکھ درہم بھجوائے لیکن اللہ نے اس کو خناق کے مرض میں ختم کر دیا اور اس نے اس رقم میں سے ایک درہم بھی نہ دیکھا اور نہ چھوا۔ کشی نے بھی اس سے ملتی جلتی ایک روایت نقل کی ہے جس میں محمد بن اسماعیل کے اپنے چچا کی چغلی کھانے کا ذکر آیا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ چغل خور شخص علی بن اسماعیل تھا کہ جس نے یحییٰ بن خالد برمکی تک رسائی حاصل کی اور پھر ان دونوں نے امامؑ کی چغلی کھانے پہ اتفاق کر لیا۔ چنانچہ یحییٰ نے علی بن اسماعیل کو ہارون تک پہنچا دیا۔ اس نے ان کی بڑی عزت کی اور اور اس کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ تب اس سے امام موسیٰ بن جعفرؑ کے بارے میں سوالات کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے کہا: اب یہاں ایک ہی زمانہ میں دو خلیفے ہیں۔ میرے چچا موسیٰ بن جعفرؑ حجاز میں اور اے امیرالمومنین! آپ عراق میں ہیں۔ میں خود دیکھ کر آیا ہوں کہ لوگ ان کو خلیفہ کہہ کر سلام کرتے ہیں۔ یحییٰ بن خالد برمکی نے اس پہ ایک اور پیوند لگایا کہ ان کے پاس مشرق و مغرب سے دولت کھنچی چلی آتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے تیس ہزار دینار میں ایک زرعی زمین خریدی ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ پہلے اس کو تھوڑی سی رقم ادا کی لیکن زمین کے مالک نے کہا کہ میں یہ رقم نہ لوں گا بلکہ وہی لوں گا جو میں نے آپ سے چکا لی ہے۔ پھر انھوں نے اس کو وہی تیس ہزار دینار دیدیے جو اس نے زمین کے بدل میں طلب کیے تھے۔ اس پہ ہارون نے علی بن اسماعیل کو اپنے چچا کے خلاف یہ جھوٹ موٹ کی اطلاع پہنچانے پر دو لاکھ دینار دیے، لیکن وہ اس رقم کے پانے سے پہلے ہی مر گیا۔ یہ بات امامؑ نے اپنے بھائی علی بن جعفرؑ کو اسی وقت بتا دی تھی جب انھوں نے آپ کو اس بھتیجے کے ساتھ نیکی کرنے سے باز رہنے کو کہا تھا۔ آپ نے ان سے کہا تھا کہ: اگر میں اس کے ساتھ قرابتداری کا لحاظ کروں گا اور وہ ایسا نہ کرے گا تو اللہ اس کی مدت حیات کو ختم کر دیگا، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات

امام موسیٰ کاظمؑ کی شہرت پھیلتی چلی گئی اور آپ کا نام قریب و بعید کے لوگوں کی زبانوں پر تھا۔ آپ کے پاس اس قدر خمس و زکات کا مال آنے لگا کہ اس سے پہلے اسکی مثال

نہ تھی۔ البتہ چغلخوروں نے کہ جن میں محمد بن اسماعیل یا علی بن اسماعیل اور یحییٰ بن خالد برمکی بھی شامل تھے، آپ کے خلاف ہارون کے کانوں کو خوب بھر دیا تو اس نے آپ کو گرفتار کرنے اور آپ سے چھٹکارا حاصل کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

چنانچہ ابن جوزی نے تذکرۃ الخواص میں لکھا ہے کہ: اپنی خلافت کے چھ یا سات سال بعد اس نے آپ کو گرفتار کر لیا اور پھر ایک سے دوسرے قید خانے میں منتقل کرتا رہا۔ چنانچہ ۱۷۹ھ میں مکہ جاتے ہوئے جب وہ مدینہ آیا تو وہاں کے لوگوں نے اس کا استقبال کیا اور اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ بعض روایات بتاتی ہیں کہ ان استقبال کرنے والوں میں خود امام موسیٰ بن جعفرؑ بھی تھے۔ اس کے بعد آپ حسب عادت مسجد تشریف لے گئے اور جیسا کہ شیخ مفید نے نقل کیا ہے، اسی رات ہارون بھی روضۂ رسولؐ کی زیارت کے لیے گیا تھا۔ وہاں جا کر اس نے کہا: یا رسول اللہؐ! میں آپ سے ایک کام پر معذرت خواہ ہوں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میں آپ کے فرزند موسیٰ بن جعفرؑ کو قید میں ڈال رہا ہوں، کیونکہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف دعوت دے رہے ہیں اور اس طرح امت میں تفرقہ پردازی اور خونریزی کے درپے ہیں۔ چنانچہ روضۂ رسولؐ سے واپس آ کر اس نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا تو انھوں نے امامؑ کو مسجد ہی سے حراست میں لے لیا اور ہارون کے سامنے پیش کر دیا۔ تب اس نے دو عماریاں منگوائیں اور ان میں سے ایک میں آپ کو بٹھا کر اس کو خچر پر رکھوا دیا اور دوسری عماری کو دوسرے خچر پر رکھوا دیا۔ اس طرح دونوں خچر پردوں میں لپٹی ہوئی عماریاں لیے ہوئے اس کے مکان سے باہر نکلے اور ہر ایک کے ساتھ فوجی سوار چل رہے تھے۔ جس خچر پر امامؑ کی عماری تھی، اس کو اس نے بصرہ کی جانب بھیج دیا اور دوسرا خچر کوفہ بھیج دیا گیا۔ وہ فوجی سوار جو امام موسیٰ بن جعفرؑ کے ساتھ جا رہے تھے ان کو حکم دیا کہ وہ آپ کو عیسیٰ بن جعفر بن منصور کے سپرد کر دیں جو اس وقت بصرہ کا حاکم تھا۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو اس کے حوالے کر دیا اور اس نے آپ کو قید خانے میں بند کر دیا اور آپ اس کے پاس ایک سال تک رہے۔ پھر ہارون نے اس کو لکھ بھیجا کہ وہ امامؑ کو قتل کر دے لیکن جب عیسیٰ بن جعفر نے خلیفہ کے اس حکم پر اپنے معتمد رفقائے کار سے مشورہ کیا تو ان لوگوں نے اس کو یہ رائے دی کہ اس معاملے میں توقف سے کام لیا جائے اور خلیفہ

کو اس کام سے باز رہنے کو کہا جائے۔ چنانچہ عیسیٰ بن جعفرؑ نے ہارون کو خط لکھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ کو میری قید میں رہتے ہوئے طویل مدت ہو گئی ہے۔ میں نے ان کے حالات کی تفتیش کی اور اس عرصے میں ان پر خاص آدمیوں کو مقرر کیے رکھا، لیکن میں نے ان کو کبھی عبادت کے علاوہ کسی طرف متوجہ نہیں پایا۔ میں نے ان پر ایسے لوگ متعین کیے جو کان لگا کر سنیں کہ وہ اپنی دعاؤں میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ امامؑ نے آپ کے یا میرے لیے کبھی بد دعا نہیں کی اور نہ ہماری کوئی برائی بیان کی ہے بلکہ وہ صرف اپنے لیے طلب رحمت و مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ پس آپ کسی شخص کو بھیج دیجیے تاکہ میں ان کو اس کے حوالے کر دوں ورنہ میں خود ہی ان کو رہا کر دوں گا کیونکہ میں ان کو اپنی قید میں رکھے رکھے تنگ آ چکا ہوں۔

بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ گورنر عیسیٰ بن جعفر کے مقرر کردہ آدمیوں نے امامؑ کو اپنی دعا میں یہ کہتے سنا کہ: اے اللہ! میں تجھ سے درخواست کیا کرتا تھا کہ تو مجھ کو اپنی عبادت کا موقع عنایت کر دے، جو تو نے مجھے اس قید خانے میں لا کر عطا کر دیا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ جب یہ خط خلیفہ ہارون کو پہنچا تو اس نے اپنا ایک آدمی بصرہ بھیج دیا تاکہ وہ امامؑ کو عیسیٰ بن جعفر کے ہاں سے بغداد لے آئے۔ اس کے بعد اس نے آپ کو فضل بن ربیع کے حوالے کر دیا اور آپ ایک طویل عرصے تک اس کی قید میں رہے۔

شیخ مفیدؒ نے الارشاد میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ہارون نے فضل بن ربیع سے بھی یہ خواہش کی کہ وہ آپ کے قتل کے بارے میں اس کا حکم بجا لائے لیکن اس نے بھی ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تب خلیفہ نے اس کو یہ حکم لکھ بھیجا کہ اب امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کو فضل بن یحییٰ کے حوالہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے آپ کو ابن ربیع کے ہاں سے لا کر اپنے مکان کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا اور آپ پر پہریدار متعین کر دیے۔ یہاں بھی آپ پوری رات جاگتے اور عبادت، تلاوت اور مناجات میں مصروف رہتے۔ دن میں اکثر روزے سے ہوتے اور محراب کی سمت سے اپنا چہرہ نہ ہٹاتے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر فضل بن یحییٰ بھی آپ پر مہربان ہو گیا اور دل کی گہرائی سے آپ کی عزت کرنے لگا۔ ہارون کو اس صورتحال کی اطلاع اس وقت پہنچی جب وہ رقّہ میں تھا۔ چنانچہ اس نے فضل بن یحییٰ کو امامؑ کے

ساتھ اس کی مروت اور نرمی پر ناراضی کا خط لکھا اور اس کو آپ کے قتل کا حکم دیا، لیکن اس نے اس حکم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر ہارون بپھر گیا اور اس نے اپنے غلام مسرور کو بلا کر کہا: تم ابھی اور اسی وقت بغداد جاؤ اور سیدھے موسیٰؑ بن جعفرؑ کے پاس پہنچو۔ اگر وہ آرام و آسائش میں ہوں تو تم یہ خط عباس بن محمد کو دیتے ہوئے اس سے کہو کہ وہ اس پر عمل کرے۔ اس کے ساتھ ہی مسرور کو ایک دوسرا خط سندی بن شاہک کے لیے دیا، جس میں اس کو حکم دیا کہ وہ عباس بن محمد کے کہنے پر عمل کرتا رہے۔ چنانچہ مسرور بغداد گیا اور وہاں فضل بن یحییٰ کے ہاں جا مقیم ہوا۔ تاہم کوئی بھی یہ نہ جانتا تھا کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ پھر وہ امام موسیٰؑ بن جعفر سے ملا اور ان کو ایسی ہی آسائش میں پایا جیسی ہارون کو اس بارے میں ملی تھی۔ پس اس نے فوراً عباس بن محمد اور سندی بن شاہک سے ملکر ان دونوں کو وہ خط دیدیے جو خلیفہ نے اس کے ہاتھ روانہ کیے تھے۔ اس کے بعد کچھ دیر نہ گزری تھی کہ فضل بن یحییٰ کو بلوانے کے لیے ایک قاصد روانہ کیا اور وہ اس کے ساتھ ہی چلا آیا۔ یہاں تک کہ عباس بن محمد کے پاس آپہنچا تب عباس نے ٹکٹکی اور کوڑا منگوایا اور فضل بن یحییٰ کی پشت برہنہ کرکے اس کو ٹکٹکی پر جکڑنے اور کوڑے لگائے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ سندی بن شاہک نے عباس کے سامنے فضل کو سو کوڑے مارے، اس کے چہرے کا رنگ زرد ہوگیا اور وہ دائیں بائیں کے لوگوں کی منتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد مسرور نے اس ساری کارروائی کی تفصیل ہارون کو لکھ بھیجی۔ چنانچہ اس نے امام موسیٰ بن جعفرؑ کو سندی بن شاہک کی تحویل میں دیے جانے کا حکم بھیج دیا۔

علاوہ ازیں ہارون نے ایک بڑا جلسہ منعقد کیا اور کہا کہ: اے لوگو! فضل بن یحییٰ نے میری نافرمانی کی اور میرے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ پس میں نے مناسب سمجھا کہ اس پر لعنت کروں اور تم لوگ بھی اس پر لعنت کرو۔ چنانچہ وہاں موجود لوگوں نے فضل بن یحییٰ پر لعنت کی بوچھاڑ کی، یہاں تک کہ اس سے پوری فضا گونج گئی۔

جب یہ خبر اس کے باپ یحییٰ بن خالد کو پہنچی تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ہارون سے ملنے گیا۔ اور عام دروازے کی بجائے عقبی دروازے سے اس کے پاس گیا۔ وہ پیچھے کی طرف سے ہارون کے پاس اس طرح پہنچا کہ اس کو بھی اس کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ تب اس نے ہارون سے کہا:

اے امیرالمومنین! ذرا میری طرف توجہ فرمائیے اور پھر خود اس کی طرف التجا کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا کہ میرے بیٹے فضل نے یقیناً اطاعت کی رسی کو توڑا ہے۔ تاہم آپ جس طرح چاہیں گے میں اس کی تلافی کروں گا۔ اس پر ہارون خوش ہو گیا اور پھر لوگوں کے اجتماع میں جا کر کہا کہ: فضل بن یحییٰ نے ایک ایسے معاملے میں جس کا میں نے اسے حکم دیا تھا میری نا فرمانی کی تھی اس لیے میں نے اس پر لعنت کی تھی لیکن اب اس نے توبہ کر لی ہے اور میری فرمانبرداری کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ پس اب تم لوگ بھی اس سے دوستی کر لو۔ اس پر لوگوں نے کہا: ہم اس کے دوست ہیں جس سے آپ دوستی رکھتے ہیں اور اس کے دشمن ہیں جس سے آپ دشمنی رکھتے ہیں۔ پس ہم نے بھی فضل کو اپنا دوست تصور کر لیا ہے۔

اس کے بعد یحییٰ بن خالد برمکی بغداد گیا تو لوگوں میں ایک ہلچل پڑ گئی اور وہ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سرکاری ملازمین کے کام کا جائزہ لینے اور ان کے معاملات کو درست کرنے آیا ہے۔ چنانچہ وہ چند دنوں تک انہی کاموں میں لگا رہا۔ اس کے بعد اس نے سندی بن شاہک کو بلایا اور اس کو ایک کام کرنے کا حکم دیا جس کی اس نے تعمیل کر دی سندی بن شاہک نے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ اس نے کھانے میں چپکے سے زہر ملایا اور کھانا امام موسیٰ بن جعفرؑ کو پیش کیا، جسے آپ نے کھا لیا۔ پس زہر کا اثر آپ کے تمام بدن میں پھیل گیا اور پھر اس نے آپ کو تین دن سے زیادہ کی مہلت نہ دی۔ جب آپ کی شہادت واقع ہو گئی تو وہ بغداد کے فقیہوں اور دیگر ممتاز افراد کے ایک گروہ کو وہاں لے آیا اور ان سے بولا: امامؑ کی لاش کو دیکھیے! کیا آپ اس پر تلوار یا نیزہ سے مارے جانے کا کوئی نشان دیکھتے ہیں؟ وہ لوگ بولے: ہم کو تو ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ تب وہ ان سے کہنے لگا کہ: تو پھر آپ اس بات کی شہادت دے دیں کہ امامؑ نے طبعی موت پائی ہے۔ چنانچہ ان سب نے ایسا ہی کیا۔

اس کے بعد آپ کا جسدِ مبارک بغداد کے پل پر رکھوا کر یہ اعلان کرا دیا کہ یہ امام موسیٰ بن جعفرؑ ہیں جو وفات پا گئے ہیں۔ چنانچہ وہاں سے گزرنے والے سبھی لوگ آپ کو دیکھتے تو بظاہر کوئی ایسی علامت نہ پاتے تھے جو آپ کے قتل کیے جانے پر دلالت کرتی ہو۔

ایک اور روایت ہے کہ یحییٰ بن خالد کے حکم سے یہ اعلان کیا گیا کہ: یہ ہیں امام موسیٰ بن جعفرؑ کہ جن کے متعلق شیعہ یہ کہتے ہیں کہ وہ مریں گے نہیں، تو اب تم ان کو دیکھ لو کہ یہ وفات

پا گئے ہیں۔ بعد میں لوگوں نے آپ کی میت کو وہاں سے لے جا کر باب البتین کے قریب دفن کر دیا جو بنی ہاشمؑ، قریش اور دیگر اشراف کا قبرستان تھا۔

تاریخ بغداد میں ہے کہ امام موسیٰ بن جعفرؑ نے خلیفہ ہارون کو قید خانہ سے ایک پیغام بھیجا جس میں آپ نے فرمایا کہ: جو دن میرے اوپر آزمائش کا ہوتا ہے وہ تمہارے لیے آسائش کا دن ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ وہ دن آجائے گا جو کبھی ختم ہونے والا نہیں اور اس دن صرف باطل کوش ہی گھاٹے میں رہیں گے۔

تاریخ یعقوبی میں بیان کیا گیا ہے کہ جب امام موسیٰ بن جعفرؑ کو خلیفہ ہارون کے تاریک قید خانوں میں بہت عرصہ گزر گیا تو کچھ لوگوں نے آپ سے کہا کہ فلاں شخص کو لکھیے تاکہ وہ آپ کے بارے میں ہارون سے کچھ کہے سنے۔ اس پر آپ نے فرمایا: میرے والد بزرگوار نے مجھ کو اپنے آبا، کرامؑ کی یہ حدیث سنائی ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت داؤدؑ کو یہ خبر دی تھی کہ اگر میرے بندوں میں سے کوئی بندہ میری بجائے میری مخلوق میں سے کسی سے امید لگائے گا تو میں اس سے اپنی آسمانی امداد کے ذرائع الگ کر لوں گا اور اس کے لیے زمین کو سخت کر دوں گا۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ کی وفات ۱۸۳ھ اور بقولے ۱۸۶ھ میں پچپن سال کی عمر میں ہوئی۔ تاہم آپ کی وفات کے بارے میں کئی اور اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں۔ آپ سات یا دس سال تک خلیفہ ہارون کی قید میں رہے۔ آپ نے اپنے پیچھے ۳۷ بیٹے اور بیٹیاں چھوڑیں۔ جن میں سے علی بن موسیٰؑ فضیلت اور قدر و منزلت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے جو آپ کے بعد ائمۂ اہل بیتؑ میں آٹھویں امام کی حیثیت سے عرب و عجم میں مشہور و معروف ہوئے۔

امام علی رضاؑ

ائمۂ اہل بیتؑ میں سے آٹھویں امام ابوالحسن علی الرضاؑ بن موسیٰؑ بن جعفر صادقؑ بن محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ مدینہ میں پیدا ہوئے اور آپ نے ایران کے شہر طوس (مشہد) میں وفات پائی۔ محدثین کے درمیان نہ صرف آپ کی ولادت کے سال اور مہینے میں اختلاف ہے بلکہ آپ کے سن وفات میں بھی اختلاف ہے۔ اس بارے میں محدثین کی بیان کی ہوئی روایات اور اقوال میں ایسا اختلاف ہے جو کسی اور امام کے زمانہ ولادت و شہادت میں نہیں ہے۔ ہم ان میں سے بعض اقوال بغیر اس کوشش کے پیش کیے دیتے ہیں کہ ان میں سے کسی قول کو ترجیح دی جائے۔ کیونکہ آج اس بحث میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ ان اقوال میں سے کونسا صحیح یا صحیح تر ہے۔ بہرحال یہ کہا گیا ہے کہ آپ کی ولادت ۱۱ ذیقعد یا ذی الحجہ ۱۴۸ھ یا ۱۵۳ھ میں جمعرات یا جمعہ کو ہوئی۔ البتہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس بارے میں اور بھی کئی اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

آپ کی شہادت ۱۷ یا ۱۹ صفر، ۱۸ جمادی الاول، ۲۱ رمضان یا ۲۳ ذیقعد ۲۰۲ھ ۲۰۳ھ یا ۲۰۶ھ میں پیر یا جمعہ کے دن ہوئی۔ تاہم شیخ صدوق نے عیون اخبار الرضاؑ میں یہ قول اختیار کیا ہے کہ آپ کی شہادت ۲۱ رمضان ۲۰۳ھ میں واقع ہوئی۔ پھر بھی آپ کی تاریخہائے ولادت و شہادت میں اختلاف کے پیش نظر آپ کی عمر ۴۷-۴۸-۵۰-۵۱ یا ۵۷

سال قرار پائی ہے۔

آپ کی والدہ محترمہ کا نام 'خیزران' تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نوبہ کی رہنے والی ایک کنیز تھیں جن کا نام 'اروی' اور لقب 'شقراء' تھا۔ ایک اور قول کے مطابق ان کا نام 'نجمہ' کنیت 'ام البنین' تھی۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا نام پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اس قول کے پیش کرنے والے نے کسی شاعر کے کلام سے استدلال کیا ہے کہ جس نے آپ کی مدح میں یہ شعر کہے تھے:

> علیؑ بن موسیٰؑ خود اپنی ذات، اپنے باپ، دادا اور گھرانے کے لحاظ سے یقیناً بہترین فرد ہیں۔ یہ آٹھویں امام حجت خدا اور صاحب علم و علم ہیں اور وہ اس ماں سے پیدا ہوئے جس کا نام مخفی اور پوشیدہ رہا ہے۔

جس طرح امام علیؑ بن موسیٰؑ کی تاریخ ولادت و شہادت اور آپ کے سن مبارک کے بارے میں محدثین نے اختلاف کیا ہے، اسی طرح آپ کی اولاد کی بابت بھی ان میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ آپ نے اپنے پیچھے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔ پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے چار بیٹے چھوڑے۔ شیخ مفید نے اس کو ترجیح دی ہے کہ امام محمد جوادؑ کے علاوہ آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، جبکہ ایک اور قول کے مطابق آپ کے دو بیٹے ہوئے یعنی محمد جوادؑ اور موسیٰؑ۔ اس قول کے حامی بزنطی کی اس روایت پر بھروسہ کرتے ہیں کہ انھوں نے امام علیؑ بن موسیٰؑ سے عرض کیا: میں دو سال سے لگاتار آپ کے جانشین کے متعلق دریافت کر رہا ہوں اور آپ ہر بار فرماتے ہیں کہ "میرا بیٹا"۔ لیکن اب تو آپ کا ایک ہی بیٹا نہیں بلکہ اللہ نے آپ کو دوسرا بیٹا بھی عطا کیا ہے، پس ان دونوں میں سے کون آپ کا جانشین ہوگا؟ اس پر آپ نے اپنے بیٹے محمد جوادؑ کی طرف اشارہ فرمایا۔

امام علیؑ بن موسیٰؑ الرضاؑ کی کنیت ابوالحسنؑ تھی اور بعض راوی ابوالحسن ثانی بھی بتاتے ہیں۔ آپ تیس سال سے کچھ اوپر مدت تک اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ زندگی گزارتے رہے۔ چنانچہ اس دوران میں آپ نے وہ تمام مصیبتیں و آزمائشیں دیکھی ہیں جو آپ کے والد بزرگوار امام موسیٰ بن جعفرؑ کو پیش آئیں۔ اگرچہ حکومت کے لیے ان کا موقف امن پسندانہ تھا پھر بھی ان کا وجود خلفاء کے لیے پریشانی اور بے چینی کا باعث بنا رہتا تھا اس لیے منصور آپ سے

بدظن رہتا اور آپ کی نقل و حرکت اور آپ کے افعال پر کڑی نگاہ رکھا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ اپنے پرخلوص اصحاب، فرمانبردار شیعوں سے بھی پوشیدہ اور الگ تھلگ رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔
اس کے بعد بنی عباس کے تیسرے خلیفہ مہدی نے آپ کو بغداد میں ایک زمانہ تک اپنی قید میں رکھا اور پھر اس وقت رہا کیا جب اس نے خواب میں امیر المومنین امام علیؑ کو دیکھا کہ وہ اس کو تنبیہ کر رہے ہیں اور اس آیت کی تلاوت فرما رہے ہیں:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ.
(سورۂ محمدؐ۔ آیت ۲۲)

یعنی کیا ایسا ہے کہ جب تم کو اقتدار حاصل ہو جائے گا تو تم زمین پر فساد برپا کرو گے اور قرابتداری کا بھی لحاظ نہ کرو گے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے آپ سے یہ عہد و پیمان بھی لے لیا تھا کہ آپ نہ تو اس کے خلاف کوئی جنگی پیش قدمی کریں گے اور نہ ارکان حکومت کے خلاف کسی تحریک میں شریک ہوں گے۔
مہدی اور ہادی کے نسبتاً مختصر دور حکومت کے بعد ہارون سریر آرائے تخت خلافت ہوا اور اس کے ساتھ ہی علوی گھرانے پر سختیاں اور کٹھنائیاں آنا شروع ہو گئیں، جس کے سربراہ موسیٰؑ بن جعفرؑ تھے اور ان آزمائشوں کا بڑا حصہ آپ ہی کو بھگتنا پڑا۔

چنانچہ ہارون نے آپ کو گرفتار کیا اور گیارہ سال کی طویل مدت تک اپنے قید خانوں کی خوفناک تاریکیوں میں ڈالے رکھا۔ اس عرصے میں وہ آپ کو ایک سے دوسرے قید خانہ میں منتقل کرتا رہا کیونکہ جو لوگ بھی ان قید خانوں کے نگران ہوتے تھے وہ آپ کے قتل کا ارتکاب کرنے سے ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے معاملہ میں تدبیریں کرتے کرتے تھک گیا اور پھر اس کی اس خواہش کو پورا کرنے والا سندی بن شاہک کے علاوہ کوئی اور نہ مل سکا کہ جس کے ساتھ ہارون کا وزیر یحییٰ بن خالد برمکی بھی شریک تھا۔ اس نے سندی بن شاہک کو حکم دیا کہ وہ امام موسیٰ بن جعفرؑ کے کھانے میں مخفی طور پر زہر ملا دے تاکہ خلیفہ ہارون کو ان سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اس طرح خلیفہ کی خواہش پوری ہو گئی۔

مزید یہ کہ امام رضاؑ ان دلدوز واقعات کی ایذا اور تلخی میں حصہ دار تھے جو آپ کے گھرانے اور آپ کے چچاؤں کی اولاد میں سے بیشتر افراد پر گزر رہے تھے۔ نیز آپ اپنے والد بزرگوار

کی مسلسل اور بے شمار پریشانیوں میں بھی اول سے آخر تک شریک رہے لیکن آپ انکی مشکلوں میں کمی کرنے پر قادر نہ تھے۔ اُدھر وہ ستم شعار اس انتظار میں تھے کہ آپ ان کے خلاف کوئی عمل کریں تاکہ ان کو بہانہ مل جائے لیکن اگر آپ کوئی اقدام نہ بھی کریں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ان دونوں گھرانوں یعنی علویوں اور عباسیوں کا اختلاف صرف افراد تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ یہ اختلاف اصولوں پر مبنی تھا۔

یہ ان دو گروہوں کا اختلاف تھا جن میں سے ایک اپنے عزائم و مقاصد کے اعتبار سے اسلام کا مجسمہ تھا اور دوسرا محض خاندانی برتری، قوت کی نمائش اور قبائلی نزاع کا حامل تھا جو اس کے اموی پیشرووں کے زمانہ میں اپنی تمام شکلوں میں نمودار ہو چکی تھی۔ اس گروہ کا نقطہ نظر اس سے مختلف نہ تھا جس کیلئے قبل ازیں ابوسفیان، ابوجہل، امیہ بن صفوان اور دوسرے ستم شعار قریشی افراد جنگیں لڑتے رہے تھے۔ البتہ اب اس کا رنگ دوسرا تھا اور اس زمانہ میں اسلام کے نام پر اس کا ایک نیا اسلوب ظاہر ہو گیا تھا۔ اس صورت حال میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ امام رضاؑ بھی اپنے زمانہ کے عباسی فرمانرواؤں سے اسی سلوک کی توقع کرتے جو آپ کے والد بزرگوار کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ حالانکہ وہ عوام سے، سیاست سے اور سیاست کے تمام جھگڑوں سے دُور رہتے تھے اور انہوں نے ایک دن کے لیے بھی حکومت کی نافرمانی اختیار نہیں کی تھی اور نہ کبھی اقتدار حاصل کرنے کا خیال کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بیس برس جو امام رضاؑ نے اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد گزارے تھے ان میں آپکو مختلف قسم کی تکلیفوں کا سامنا رہا اور آپ انکی تلخی برداشت کرتے رہے۔ اسکے ساتھ ہی آپکو خلیفہ کے اس سلوک سے بھی سابقہ پڑا جو اس سے قبل آپکے والد بزرگوار سے کیا جاتا تھا یہ بات ان واقعات اور حالات سے ثابت ہوتی ہے جو آپ کی شہادت سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو عنقریب ہم آپ کی شہادت کے اسباب کے ذیل میں بیان کریں گے۔

غالباً آپ کے اور اہل بیت نبوت میں سے دیگر ائمہ کے ساتھ تسلط یافتہ خلفاء کا جارحانہ موقف اس بنیادی اختلاف کے علاوہ جو طرفین میں موجود تھا اور جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اس لیے تھا کہ بڑے بڑے مسلمان ان کی امامت پر اور ان کے خلافت کے سب سے زیادہ حقدار ہونے پر ایمان رکھتے اور اس امر پر اصرار کرتے تھے کہ وہ لوگ جو زبردستی خلافت کا لبادہ

اوڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس خلافت کو اسکے شرعی حقداروں سے غصب کر لیا تھا۔ نیز ایسا کرنے میں وہ ان تمام حدود سے بہت زیادہ تجاوز کر گئے تھے جو اللہ نے ان پر اپنے بندوں کے حقوق کی خاطر عائد کی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ان خلیفاؤں کے گرد ایسے اہل فکر و نظر بھی جمع ہوتے رہتے تھے جو مختلف میدانوں میں ائمۂ اہلبیتؑ کی علمی برتری کے سامنے کم تر ثابت ہوتے تھے۔ اس علمی برتری کی وجہ سے عوام ائمۂ اہلبیتؑ پر فریفتہ تھے، ان سے تقرب چاہتے تھے اور یہ مانتے تھے کہ وہی سب سے بڑھ کر حکومت کا بوجھ اٹھانے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے اہل ہیں۔ دوسری جانب بہت سے مفاد پرستوں کی چغلیاں بھی تھیں جو اُن سے بغض اور عداوت رکھتے تھے اور ان میں بعض خود انہی کے چچاؤں کے بیٹے بھی ہوتے تھے۔ جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حکومت کی طرف سے ان کے خلاف اقدامات کیے جائیں۔

چنانچہ اہل حکومت ان اعدائے اہلبیتؑ کی غلط بیانیوں کو خوشی خوشی قبول کر لیتے تھے کیونکہ اس سے ان کے اس بغض کو تقویت پہنچتی تھی جو ان کے سینوں میں جوش کھا رہا ہوتا تھا۔ نیز وہ سختیاں اور تعدیاں جو وہ اہلبیتؑ پر کیا کرتے تھے، وہ ان کے خیال میں حق بجانب ثابت ہو جاتی تھیں۔ ان تمام وجوہ کے اعتبار سے اہل حکومت ان کو اپنے لیے اور اپنی فرمانروائی کے لیے ایک ایسا خطرہ تصور کرتے تھے جو ان کے لیے خوف کا باعث بنا رہتا تھا اور ان کی تباہی اور زوال کا پیشگی اعلان تھا اس لیے وہ لوگ ان کے ساتھ بدترین موقف اختیار کیے رہے کہ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ہے۔

امام علی رضاؑ کی خصوصیات و صفات

منصب امامت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے کہ ان معاملات میں جو انکی زندگی سے متعلق ہوں امامؑ، ان کے بارے میں اپنے دور کے افراد میں سب سے زیادہ علم و معرفت رکھتے ہوں۔ اس کے علاوہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار، دنیا سے بے رغبتی برتنے والے نیز اخلاق، عادات اور تمام صفات میں کامل ہوں اور ائمۂ اثنا عشرؑ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص لازماً اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ جیسا کہ ہم نے اب تک سات اماموںؑ کی صفات اور ان کے کمالات کے کچھ پہلو پیش کیے ہیں اور بقیہ ائمہؑ کے حالات زندگی پر بھی اسی طرح نظر ڈالیں گے۔

تاریخ نے امام علی الرضاؑ کے بہت سے علمی حقائق اور کئی مباحثے اور مناظرے ہم تک پہنچائے ہیں جن میں آپ ہمیشہ اپنے مدمقابل پر غالب آیا کرتے تھے۔ اسی طرح تاریخ میں بہت سے ایسے علوم کا ذکر ہے، جن کے بارے میں آپ نے فکری رہنمائی کی اور معلومات میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ اپنے بیٹوں سے فرمایا کرتے تھے:

تمہارے بھائی علیؑ بن موسیٰؑ، عالمِ آلِ محمدؐ ہیں۔ تم اپنے مسائل ان سے پوچھو اور جو کچھ بتائیں اس کو یاد رکھا کرو۔ کیونکہ میرے والد بزرگوار امام جعفرؑ بن محمدؑ نے کئی بار مجھ سے کہا کہ: وہ عالمِ آلِ محمدؐ تمہارے ہی صلب میں ہے کہ جس کا نام امیر المومنین علیؑ بن ابیطالبؑ کے نام پر رکھا جائے گا، اے کاش کہ میں اسے دیکھ لیتا۔

ابراہیم بن عباس صولی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے دیکھا کہ جب بھی امام رضاؑ سے کچھ پوچھا گیا تو آپ نے وہ ضرور بتا دیا اور آپ کے جوابات قرآن کے مطابق ہوتے تھے۔ میں نے آپ کے وقت اور زمانہ میں آپ سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی اور نہ پایا تھا۔

رجاء بن ابی ضحاک بیان کرتے ہیں کہ: خلیفہ مامون نے مجھ کو امام علی رضاؑ کی نگرانی کے لیے مقرر کیا تھا۔ بخدا میں نے ان سے زیادہ نیکوکاری کرنے والا، ہر وقت اللہ کو یاد کرنے والا اور اللہ سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ جب کبھی وہ کسی بستی میں جاتے تو لوگ ان سے دین کے مسائل دریافت کرنے آجاتے۔ آپ ان کے مسائل کے جواب دیتے اور اس دوران میں اپنے والد بزرگوار نیز اپنے آباء کرام یعنی امام علیؑ بن ابی طالبؑ اور حضرت رسول کریمؐ سے مروی حدیثیں بکثرت بیان کرتے تھے۔ جب میں مامون کے پاس واپس آگیا تو اس نے آپ کے سفر کا حال دریافت کیا۔ تب میں نے آپ کے بارے میں وہ سب کچھ بیان کر دیا، جو میں نے راہ و منزل اور شب و روز میں آپ کے ساتھ رہ کر دیکھا تھا۔ اس پر وہ کہنے لگا: اے ابن ضحاک تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ واقعی وہ دنیا بھر کے لوگوں میں سب سے زیادہ عالم اور عبادت گزار ہیں۔

ابن جوزی تذکرۃ الخواص میں اور حاکم تاریخ نیشاپور میں لکھتے ہیں: امام علی الرضاؑ نے علم و حکمت اور حدیث و خبر اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی تھی۔ آپ مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر لوگوں

کے لیے فتوی جاری کیا کرتے تھے جبکہ وہ ابھی بیس سال کے نوجوان ہی تھے۔

بحار الانوار میں حافظ حاکم نیشاپوری سے روایت ہے کہ جن عباسیوں پر امام علی الرضاؑ کو ولی عہد مقرر کیا جانا گراں گزرا، خلیفہ مامون نے ان سے کہا: تم اعتراض کرتے ہو کہ میں نے امام ابوالحسن الرضاؑ کے لیے ولی عہدی کی بیعت کیوں لی ہے، اب سنو کہ میں نے اس معاملہ پر بڑے غور وخوض کے بعد اور یہ جانتے ہوئے ان کے لیے بیعت لی ہے کہ آج صفحۂ ارض پر بزرگی میں ان سے زیادہ ممتاز، پاکدامنی میں ان سے زیادہ آشکارا، زہد و تقویٰ میں ان سے زیادہ نمایاں، نفس کے مقابل ان سے زیادہ قوی اور خواص وعوام میں ان سے زیادہ ہردلعزیز اور اللہ کے مقابلہ میں ان سے زیادہ سخت گیر کوئی اور نہیں ہے۔

ابوالصلت ہروی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام الرضاؑ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں دیکھا اور جو بھی عالم ان کو دیکھتا وہ میری ہی طرح اس بات کی شہادت دیتا تھا۔ راوی کا کہنا ہے کہ مامون نے اپنے دربار میں علمائے مذہب، فقہائے شریعت اور صاحبانِ علم کلام کی ایک بڑی تعداد جمع کرلی تھی لیکن آپ ان میں سے ہر ایک پر غالب آگئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ جس نے آپ کی افضلیت اور اپنی کمتری کا اقرار نہ کرلیا ہو۔

انہی ابوالصلت نے ایک اور روایت میں کہا ہے کہ امام علی الرضاؑ نے فرمایا: میں اکثر روضۂ رسولؐ میں بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اگرچہ مدینہ میں علماء کی کثرت تھی لیکن جب کوئی مسئلہ ان میں سے کسی کو عاجز کر دیتا تو وہ اپنے مسائل کی گرہ کشائی کے لیے میری طرف رجوع کرتے اور پھر میں ان سب مسائل کا حل بتا دیتا تھا۔

مناقب آل ابیطالب جلد چہارم میں ہے کہ محمد بن عیسیٰ یقطینی نے کہا: امام ابوالحسن الرضاؑ کی امامت کے معاملہ میں جب لوگوں میں اختلاف ظاہر ہوا تو میں نے ایسے اٹھارہ ہزار مسئلے جمع کیے جو آپ سے پوچھے گئے اور آپ نے ان کے جوابات دیے تھے۔ وہ مزید کہتے ہیں: مصنفین کی ایک جماعت کہ جن میں خطیب بغدادی، ثعلبی، سمعانی، ابن معتز اور بہت سے دیگر اہل قلم شامل ہیں جنہوں نے امام علی الرضاؑ سے مختلف موضوعات پر دسیوں احادیث روایت کی ہیں۔
عیون اخبار الرضا میں امام علی رضاؑ اور خلیفہ مامون کی گفتگو کے بیان کے بعد لکھا ہے کہ علی بن جہم

بیان کرتے ہیں کہ پھر مامون نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور محمد بن جعفرؑ جو کہ اس گفتگو میں موجود رہے تھے، وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: کہو اپنے بھتیجے کو کیسا پایا؟ انھوں نے کہا۔ یہ بھی ایک عالم ہیں اور دوسرے عالموں سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔ مامون نے کہا: نہیں! بات یوں نہیں ہے بلکہ تمہارا یہ بھتیجا اہل بیت نبیؐ کے ان افراد میں سے ہے جن کے بارے میں آنحضرتؐ نے فرمایا: خیال رکھنا کہ میری اولاد میں سے نیک افراد اور میری نسل میں سے پاک ہستیاں کم سنی میں سب سے زیادہ بردبار اور بڑے ہو کر سب سے زیادہ عالم ہوتے ہیں۔ تم ان کو پہچانتے نہیں ہو کیونکہ وہ تم سے زیادہ علم والے ہیں۔ وہ تم کو ہدایت کے دروازے سے ہٹنے نہ دیں گے اور گمراہی کے دروازے پر ٹکنے نہ دیں گے۔

امام علی الرضاؑ پاکیزہ اخلاق کے حامل تھے کہ جس کو روح رسالت کی مدد حاصل تھی اور آپ اس کے وارث، امین اور محافظ تھے۔ اس وجہ سے آپ کو عوام اور خواص کی محبت حاصل ہو گئی تھی

چنانچہ عیون اخبار رضاؑ میں ابراہیم بن عباس صولی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ امام ابوالحسن رضاؑ نے کسی سے سخت کلامی کی ہو۔ نہ میں نے یہ دیکھا کہ آپ نے کسی کی بات کاٹی ہو، تاوقتیکہ اس نے اپنی بات کو پورا نہ کر لیا ہو۔ نہ انہوں نے کسی کی اس حاجت کو رد کیا کہ جس کو پورا کرنے پر وہ قادر رہوں۔ نہ کبھی انہوں نے کسی بیٹھے ہوئے شخص کے سامنے اپنے پیر پھیلائے اور نہ اس کے سامنے ٹیک لگا کر بیٹھے۔ نہ انہوں نے کبھی اپنے غلاموں اور کنیزوں کو زبان سے بُرا کہا۔ نہ کبھی میں نے ان کو سرعام تھوکتے دیکھا اور نہ قہقہہ لگا کر ہنستے دیکھا، بلکہ ان کا ہنسنا بھی صرف مسکراہٹ تک ہی ہوتا تھا۔ جب وہ تنہائی میں ہوتے اور دستر خوان لگایا جاتا تو وہ غلاموں اور یہاں تک کہ اپنے دربان اور سائیس کو بھی اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔ پس اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس نے امام علی الرضاؑ کی طرح کا کوئی اور فرد بشر بھی دیکھا ہے تو اس کے کہنے کو سچ نہ ماننا۔

آپ کے یہاں ایک مہمان آیا اور آپ ایک رات اس کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ چراغ میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی۔ تب اس مہمان نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور چاہا کہ اس کو درست کر دے لیکن امام علی الرضاؑ نے اس کو روک دیا اور پھر چراغ اپنے ہاتھ میں لے کر اسکو

درست کر دیا اور فرمایا: ہم وہ لوگ ہیں کہ اپنے مہمان سے خدمت نہیں لیتے۔

ایک شخص نے آپ سے عرض کیا: بخدا کہ صفحۂ ارض پر آپ کے آباءِ کرامؑ سے بڑھ کر کوئی صاحبِ شرف نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ شرف ان کو تقویٰ ہی سے حاصل ہوا۔ ایک شخص نے آپ سے کہا: آپ سب لوگوں سے بہتر ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے شخص: خدا کی قسم نہ کھا، مجھ سے بہتر وہ شخص ہے جو اللہ کا زیادہ اطاعت گزار اور تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے۔ بخدا کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے:

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ۔ (سورۂ حجر۔ آیت ۱۳)

ہم نے تم کو گروہوں اور قبیلوں میں اس لیے قرار دیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ البتہ تم میں سب سے زیادہ صاحبِ شرف وہی ہے جو تقویٰ میں بڑھا ہوا ہو۔

ابوالصلت کا بیان ہے کہ میں نے امام علی الرضاؑ سے عرض کیا: اے فرزندِ رسولؐ! لوگ آپ کے بارے میں کیا کیا کچھ کہتے رہتے ہیں؟ آپ نے پوچھا وہ کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا: وہ کہتے ہیں کہ آپ کا ادّعا ہے کہ سب لوگ آپ کے غلام ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: اے اللہ! اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے اور اے غیب و شہود کے جاننے والے تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کبھی نہیں کہا اور نہ اپنے آباء میں کسی کو یہ کہتے سنا، تو یہ بھی جانتا ہے کہ امت نے ہم پر کیا کیا ظلم کیے ہیں اور لوگوں کا یہ کہنا بھی انہی مظالم میں سے ہے۔ پھر میری طرف مڑے اور فرمایا: اے عبدالسلام! جیسا کہ وہ کہتے ہیں اگر سبھی لوگ ہمارے غلام ہوں گے تو پھر ہم ان کو بیچیں گے کس کے ہاتھ؟

اس کے بعد فرمایا: اے عبدالسلام! اللہ نے جو ہم آلِ محمدؐ کی ولایت کو واجب کیا ہے کیا تم بھی اس کا اسی طرح انکار کرتے ہو جس طرح اور لوگ کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: معاذ اللہ! بلکہ میں تو آپ کی ولایت کا اقرار کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ آپ نے سائل کے اس اتہام کا برا مانا، جس کے ذریعے آپ کے دشمنوں نے طعن کرنا چاہا تھا لیکن آپ نے اس کو بھی ان مظالم میں شمار کیا جو اُمت نے آلِ محمدؐ کے حقوق کے بارے میں کیے تھے کیونکہ آپ سے ایسی

بات کی نسبت دینے کے یہ معنی ہوئے کہ آپ اسلام کے ان قوانین اور قرآنی احکام کی مخالفت کر رہے ہیں، جن کے مطابق ایک شخص کو دوسرے پر صرف تقویٰ ہی کی بنا پر فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ.

اے لوگو! ہم نے تم سب کو مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو جماعتوں اور قبیلوں میں اس لیے قرار دیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ البتہ تم میں سب سے زیادہ صاحب شرف وہی ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہے۔

چنانچہ امام علیہ السلام نے اس بات پر زور دیا کہ اللہ نے لوگوں پر ہمارا بس یہ حق رکھا ہے کہ وہ ہماری ولایت کو قبول کریں اور ہماری اطاعت کریں لیکن یہ بھی خود لوگوں ہی کے مفاد کے لیے ہے تاکہ وہ اس صحیح راہ پر چل سکیں جو ان کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ امام کی نظر میں یہ ولایت اور اطاعت سے مراد قول و فعل دونوں لحاظ سے اسلام کی مطابقت کرنا ہے اور وہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ نیز آپ نے واضح فرمایا کہ سب لوگ اللہ کے غلام ہیں کیونکہ سب کا باپ ایک، ماں ایک اور اللہ ایک ہے۔

وہ شخص جو خراسان کے راستے میں امام علی رضاؑ کے ساتھ رہا تھا۔ عبداللہ بن صلت نے اس سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا: میں امام علی رضاؑ کے سفر خراسان میں آپ کے ساتھ تھا۔ ایک روز جب آپ نے دسترخوان لگوایا تو اس پر آپ کے افریقی غلام بھی تھے اور آپ ان سب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تب میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ ان غلاموں کے لیے ایک اور دسترخوان لگوا دیتے۔ آپ نے فرمایا: لیکن کیوں؟ ہم سب کا اللہ ایک ہے، باپ ایک ہے، ماں ایک ہے اور جزا اپنے اپنے اعمال کے مطابق ملے گی۔

عیون الاخبار میں ابراہیم بن عباس صولی کا بیان ہے کہ میں نے امام علی رضاؑ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: میں نے ایک غلام آزاد کرنے کی قسم کھائی اور میں قسم اسی وقت کھاتا ہوں جبکہ غلام کو آزاد کر چکتا ہوں۔ پھر میں اپنے سب غلاموں کو آزاد کر دیتا ہوں۔ اس

کے بعد آپ نے ایک غلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ سمجھا جائے کہ میں بغیر نیک عمل کیے صرف رسول اللہؐ سے اپنی قرابت کے باعث اس سیاہ فام غلام سے بہتر ہوں تو ایسا نہیں ہے بلکہ میں اپنے نیک عمل ہی کے ذریعہ افضل ہو سکتا ہوں، کسی اور طریقہ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ سے آپ کے آباء کرامؑ اور آپ کی اولاد امجاد سے اس معنی و مطلب میں اور حدیثیں بھی متواتر روایت کی گئی ہیں۔

کثیر روایات سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ امام موسیٰ بن جعفرؑ نے اپنے فرزند امام علی رضاؑ کے حق میں وصیت فرمائی اور ان کو اپنے بعد امت کا امام اور ولی قرار دیا، لیکن اپنے دوسرے فرزندوں کے لیے ایسا کوئی فرمان نہیں دیا۔ انہوں نے آپ کی امامت کے متعلق ایک تحریر لکھی، اس پر اپنے تمام افراد خانہ کی گواہی درج کرانے کے بعد اپنی مہر ثبت کر دی اور اس پر انکار کرنے والے پر لعنت فرمائی۔ البتہ آپ کے بھائیوں نے آپ کے حق میں کی ہوئی وصیت پر جھگڑا کیا تھا کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ والد بزرگوار نے اس کے ذریعہ سے آپ کو مال دیا ہے اور دوسروں کو نہیں دیا۔

اصول کافی میں یزید ابن سلیط سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میرے والد ابو عمران طلحی مدینہ کے قاضی تھے۔ امام موسیٰ بن جعفرؑ کی شہادت کے بعد جب امام علی رضاؑ کے بھائیوں نے اس وصیت نامہ کو قاضی (یعنی میرے والد) کے سامنے پیش کیا تو عباس بن موسیٰؑ نے ان سے کہا: خدا آپ کا بھلا کرے اور آپ کو مالدار بنائے، اس تحریر میں خزانہ اور جواہرات بھی مذکور ہیں۔ (امام) علی رضاؑ کا ارادہ ہے کہ وہ ہم کو ان میں سے کچھ نہ دیں اور سب کچھ خود ہی رکھ لیں، جبکہ ہمارے والد بزرگوار کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ انہی کو دے دیا ہے اور ہم کو بے سہارا چھوڑ گئے ہیں۔ اگر میں اپنے آپ کو اس معاملہ سے علیٰحدہ نہ کیے ہوئے ہوتا تو میں یہ سارا ماجرا آپ کو سب کے سامنے بتلا دیتا۔

ابراہیم بن محمد کہ جو اس وصیت کے گواہوں میں سے تھے، عباس پر برس پڑے اور بولے: بخدا کہ تم ایسی بات کہہ رہے ہو جس کو ہم نہ مان سکتے ہیں اور نہ تصدیق کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تم ہم لوگوں میں ہمیشہ قابل ملامت اور دھتکارے ہوئے سمجھے گئے ہو۔ ہم تمہارے بچپنے سے بڑے ہونے تک تمہارے جھوٹ سے واقف رہے ہیں۔ اگر واقعی تم میں کوئی خوبی ہوتی تو تمہارے والد بزرگوار بھی

تم کو اچھا ہی سمجھتے لیکن وہ تو تم پر دو کھجوروں کے لیے بھی اعتماد نہ کرتے تھے۔ ابراہیم بن محمد کی یہ باتیں سن کر اسحاق بن جعفر نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا اور بولے تم تو بس ایک کم عقل اور احمق بوڑھے ہو۔

جب بات یہاں تک پہنچی تو قاضی ابو عمران نے امام علی رضاؑ سے کہا: اے ابوالحسنؑ! اٹھیے کیونکہ میرے لیے تو یہی بہت بڑی بات ہے کہ آپ کے والد بزرگوار نے آج کے دن مجھ پر لعنت نہیں کی اور انہوں نے بلند نظری سے کام لیا ہے۔ بخدا باپ سے زیادہ اپنے بچوں کی اہلبیت کو دوسرا کوئی نہیں سمجھ سکتا اور آپ کے والد بزرگوار نہ عقل میں کم تھے اور نہ رائے میں کمزور تھے۔

عباس بن موسیٰؑ بن جعفرؑ نے قاضی سے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ اس وصیت نامے کی مہر توڑیے اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس کو پڑھیے۔ اس پر ابو عمران نے کہا: میں اس مہر کو ہرگز نہ توڑوں گا میرے لیے تو یہی بہت بڑی بات ہے کہ آج کے دن آپ کے والد بزرگوار نے مجھ پر لعنت نہیں کی ہے۔ تب عباس نے آگے بڑھ کر وہ مہر خود ہی توڑ ڈالی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس میں خزانے اور جواہرات کا ذکر ہو گا لیکن اس میں تو صرف امام علی رضاؑ کی امامت اور ولایت ہی کا ذکر تھا اور یہ کہ آپ کے سب بیٹے خواہ خوشی سے خواہ ناخوشی سے اسے قبول کریں۔ نیز آپ نے ان سب کو اپنے صدقات سے بیدخل رکھا تھا۔

وہ برا سلوک جو امام رضاؑ کے بھائی عباس نے اس وقت آپ کے ساتھ کیا تھا، اس کے باوجود آپ نے اس سے فرمایا: میرے بھائی! میں جانتا ہوں کہ وہ قرضے اور دیگر واجبات جو تمہارے سر پر ہیں، انہوں نے ہی تم کو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے غلام سے فرمایا: اے سعید! پہلے یہ معلوم کر لو کہ ان لوگوں پر کتنا قرض واجب الادا ہے اور پھر ان کی طرف سے ادا کردو اور قرض خواہوں سے ان کی برائت کی رسیدیں لے لو۔ نیز ان کے واجبات میں سے زکات وصول کر لو۔ اس کے بعد آپ نے ان سب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: بخدا کہ جب تک میں اس دنیا میں موجود ہوں تم لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور حسن سلوک کو ترک نہ کروں گا۔ پھر بھی تم جو چاہو کہتے رہنا۔

آپ کے اس کریمانہ سلوک اور نرم دلی کے باوجود آپ کے بھائی عباس کے طرزِ عمل میں

کوئی تبدیلی نہ آئی، بلکہ اس نے آپ کے جواب میں کہا: آپ نے ہم کو ہمارے ہی مال میں سے کچھ دیدیا ہے اور جو آپ نے دیا ہے، آپ کے پاس ہمارا اس سے زیادہ مال اب بھی موجود ہے۔

لیکن امام علیہ السلام نے اب بھی اپنی گفتگو کا وہی اسلوب قائم رکھا جو آپ کی امامت کے شایان شان تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: تم جو چاہو کہتے رہو اور تمہارا کیا تمہارے ہی لیے ہے۔ اگر تم نیک عمل بجالاؤ گے تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ بخدا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا کوئی بیٹا اور میرا کوئی وارث نہیں ہے تو اگر میں کوئی چیز اپنے پاس رکھے رہوں گا جیسا کہ تمہارا خیال ہے تو وہ بھی تمہارے ہی لیے ہوگی اور تمہارے پاس پلٹ آئے گی۔ بخدا کہ جب سے تمہارے والد رخصت ہوئے ہیں، میری ملکیت میں جو چیز بھی آئی ہے میں اس کو اسی طرح صرف کیا ہے جیسا تم دیکھ رہے ہو۔

لیکن عباس نے پھر ایسی باتیں کیں جن میں اپنے بھائی سے اس کے حسد اور بغض نیز اپنے والد بزرگوار امام موسیٰؑ بن جعفرؑ پر تعریض پائی جاتی تھی مگر امام علی رضاؑ اس حلیمانہ اور ناصحانہ طرز عمل پر قائم رہے جو محبت اور درگزر ایسی شریفانہ صفات کا مظہر تھا۔ یہی وہ صفات ہیں کہ جن کے لیے آپ، آپ کے آباء کرام اور اولاد امجاد مشہور ہیں اور وہ دوسروں کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں کے موقعوں پر وہ ان شریفانہ صفات کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے عباس کی ان ناروا باتوں پر فرمایا:

اے اللہ! اگر تیرے علم کے مطابق میں ان کی بھلائی کا خواہاں ہوں، ان کے ساتھ نیکی کرتا ہوں اور رات دن ان کے معاملات پر نگاہ رکھتا ہوں، تو مجھ کو اس کا بدلہ دے اور اگر ایسا نہیں ہے تو مجھ کو وہی سزا دے جس کا میں اہل ہوں اور اگر بُرا ہوں تو بری سزا اور اگر اچھا ہوں تو اچھی جزا دے۔ اے اللہ! ان کی اصلاح کر دے اور ان کے ذریعہ سے بھلائی عام کر دے۔ مجھ سے اور ان سے شیطان کے شر کو دُور رکھ۔ اپنی اطاعت پر ان کی اعانت فرما اور اپنی راہ پر چلنے کے لیے ان کو آمادہ کر۔ اے سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنیوالے!

اسی طرح آپ نرمی، عفو، رحمدلی اور مصیبت زدوں کے ساتھ حسن سلوک میں نمایاں تھے اور آپ کی ذات خیر و برکت کا سرچشمہ ثابت ہو رہی تھی۔ آپ اپنے اس فعل الخیرات پر دلی خوشی محسوس فرماتے تھے کیونکہ کسی کو خدا کی راہ میں کچھ عطا کرنا محض ایسی نیکی ہی نہیں کہ

جو ایک انسان سوالیوں اور ناداروں کے ساتھ کرتا ہے، بلکہ یہ اس نعمت کا شکر و سپاس بھی ہے جو اللہ نے اس کو عنایت کی ہے۔ مزید یہ کہ آپ کی نظر میں ایک صاحب نعمت اُس وقت تک بڑے خطرہ میں رہتا ہے جب تک وہ ان حقوق سے عہدہ برآ نہ ہو جائے جو اللہ کی طرف سے اس کو ملی ہوئی نعمتوں پر عائد ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا: ہر صاحب نعمت اُس وقت تک خطرہ میں ہوتا ہے جب تک اس کے مال و متاع پر اللہ کے حقوق بقایا ہوتے ہیں کیونکہ اس کی ملی ہوئی نعمتوں میں اللہ کے حقوق ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب تک میں وہ حقوق ادا نہ کرلوں جو مجھ پر عائد ہوتے ہیں، میں اس معاملے میں اللہ سے ڈرتا رہتا ہوں۔

اس صحابی نے آپ سے کہا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، کیا آپ اپنے اس اعلیٰ رتبے کے باوجود بھی اس قدر خوف کھاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اس کے ساتھ ہی میں ان نعمتوں پر اللہ کا شکر کرتا ہوں جو اس نے مجھ کو دی ہیں۔

الیسع بن حمزہ کہتے ہیں: میں امام علی رضا ؑ کی خدمت میں تھا اور ان سے باتیں کر رہا تھا۔ جبکہ آپ کے پاس بہت سے لوگ حلال و حرام کے مسائل دریافت کرنے آئے ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں ایک لانبا سا آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یوں گویا ہوا: سلام ہو آپ پر اے فرزند رسول ؐ! میں آپ کے اور آپ کے آباؑ و اجدادؑ سے محبت کرنے والوں میں سے ہوں۔ میں حج کر کے آ رہا ہوں اور میری پونجی ختم ہو گئی ہے۔ اب میرے پاس اتنا بھی نہیں ہے کہ میں اگلی منزل تک بھی جا سکوں۔ پس آپ مجھے میرے شہر تک پہنچا دیجیے، چونکہ میں خود ایک صاحبِ ثروت انسان ہوں، جتنی رقم آپ مجھ کو دیں گے، میں اپنے شہر پہنچ کر اتنی رقم آپ کی طرف سے صدقہ کر دوں گا، کیونکہ آپ کے لیے صدقہ روا نہیں ہے۔ امام علی رضا ؑ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔ پھر آپ لوگوں سے محوِ گفتگو رہے۔ یہاں تک کہ وہ سب چلے گئے اور صرف سلیمان جعفری، خیثمہ اور میں وہاں رہ گئے۔ اب امام ؑ نے فرمایا: اگر تم لوگ مجھے اجازت دو تو میں گھر کے اندر جاؤں۔ سلیمان جعفری نے عرض کیا: خدا آپ کے معاملے کو آگے بڑھائے! چنانچہ آپ اٹھ کر اپنے گھر کے ایک حجرہ میں گئے اور ایک ساعت کے بعد واپس تشریف لائے اور دروازے کے اوپر سے ہاتھ

بڑھا کر فرمایا: وہ خراسانی کہاں ہے؟ وہ بولا: میں ادھر ہوں اے فرزند رسولؐ! آپ نے اس سے فرمایا: لو یہ دو ہزار دینار ہیں۔ ان میں سے اپنی ضرورت پوری کرو اور برکت حاصل کرو۔ تم میری طرف سے اس کو صدقہ نہ کرنا اور اب یہاں سے چلے جاؤ تاکہ میں تم کو نہ دیکھوں اور تم مجھ کو نہ دیکھو، اس وقت آپ نے اس خراسانی سے اپنا چہرہ مبارک بھی چھپا لیا تھا۔

تب سلیمان جعفری نے کہا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ نے اس پر مہربانی کی اور سخاوت فرمائی ہے۔ پھر آپ نے اس سے اپنا چہرہ کس لیے چھپایا؟ آپ نے فرمایا: اس ڈر سے کہ میں اس کے چہرہ پر سوال کرنے کی ندامت نہ دیکھوں، جبکہ میں اس کی حاجت پوری کر رہا تھا۔ کیا تم نے رسول اللہؐ کی یہ حدیث نہیں سنی ہے کہ: نیکی کر کے اس کو چھپانے والے کا اجر ستر حج کے برابر ہے۔ بدی کا آشکارا کرنے والا تنہا کر دیا جاتا ہے اور اسکا چھپانے والا بخش دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد امامؑ نے اپنی تائید میں کسی کا یہ شعر بھی پڑھا:

میں ایک روز ان کے پاس طلب حاجت کے لیے گیا اور اپنے اہل و عیال میں اسی آبرو کے ساتھ واپس آ گیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام علی رضاؑ نے خراسان میں عرفہ کے روز اپنا سارا مال دے ڈالا۔ اس پر فضل بن سہل نے عرض کیا: یہ تو آپ پر بڑا بوجھ پڑ گیا۔ امامؑ نے فرمایا: نہیں! تم اس کو بوجھ مت کہو، بلکہ یہ تو سرمایہ لگانے کا عمل ہے جس سے تم کو اس سے بھی زیادہ اجر مل جاتا ہے۔

یعقوب بن اسحاق نوبختی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک شخص جب امام ابوالحسن علیؑ بن موسیٰؑ کے پاس سے گزرا تو اس نے آپ سے عرض کیا: مجھ کو اپنی شرافت کے لحاظ سے عطا فرما دیجیے! اس پر امامؑ نے فرمایا: یہ مجھ سے ممکن نہیں ہے۔ تب اس نے کہا: تو پھر میری شرافت کے لحاظ سے دیجیے! آپ نے فرمایا: ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ پھر اپنے غلام کو حکم دیا کہ اس کو دو سو دینار دیدو۔ چنانچہ اس نے اس کو یہ رقم دیدی اور وہ چل دیا۔

معمر بن خلاد نے فقیروں اور ناداروں کے ساتھ آپ کی نرم دلی اور مہربانی کے متعلق بیان کیا ہے کہ: امام ابوالحسن الرضاؑ کھانے کا ارادہ فرماتے تو دستر خوان لگانے کا حکم دیتے۔ پھر اچھے اچھے کھانے الگ کر کے ناداروں کو کھلاتے اور اس آیت کی تلاوت فرماتے:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِىْ يَوْمٍ ذِىْ مَسْغَبَةٍ.

پھر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہیں گزرا اور تم کو کیا معلوم کہ گھاٹی کیا ہے ؟ کسی گردن کا (غلامی یا قرض سے) چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا۔ (سورۂ بلد آیات ۱۱-۱۴)

پھر فرماتے : اللہ جانتا ہے کہ ہر شخص غلام کو آزاد کرانے پر قادر نہیں ہے۔ پس اس نے (غریبوں کو) کھانا کھلانے کے ذریعہ سے سب لوگوں کے لیے جنت کا راستا کھول دیا ہے۔

عیون اخبار الرضاؑ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا : میں نے امام علی رضاؑ کا ایک خط دیکھا جو ان کے فرزند ابو جعفر الجوادؑ کے نام تھا' اس میں لکھا تھا : اے ابو جعفرؑ ! مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ جب تم سوار ہوتے ہو تو غلام اپنی کنجوسی کی وجہ سے تم کو چھوٹے دروازے سے باہر لاتے ہیں تاکہ کوئی تم سے صدقہ وخیرات حاصل نہ کر سکے۔ اپنے اس حق کے واسطے سے مجھ کو جو تم پر حاصل ہے میں تم سے کہتا ہوں کہ تمہارا گھر میں آنا جانا صرف صدر دروازے ہی سے ہونا چاہیے۔ ہاں تو جب تم کہیں جانے کے لیے سوار ہوا کرو تو سونے چاندی کے سکے لیکر نکلا کرو' تاکہ جو کوئی بھی تم سے سوال کرے تم اس کو کچھ نہ کچھ دیتے دلاتے چلو۔ اگر تمہارے چچاؤں میں سے کوئی تم سے اعانت کا خواہاں ہو تو اس کو پچاس دینار سے کم نہ دینا' ہاں اس سے زیادہ کا تمہیں اختیار ہے۔ اسی طرح اگر تمہاری پھوپھیوں میں سے کوئی تم سے کچھ طلب کرے تو اس کو بھی پچیس دینار سے کم نہ دینا' البتہ تم اس سے زیادہ جو چاہو دے سکتے ہو۔ میری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو بلند مرتبہ عطا کرے۔ پس اس کے نام پر خرچ کیا کرو۔ اس صاحب عرش عظیم کے زیر سایہ ہوتے ہوئے اپنے دل میں نادار ہو جانے کا خوف مت رکھو۔

امام علی رضاؑ کی امامت کے متعلق تصریح

بارہ اماموں کے بارے میں حضرت رسول اللہؐ کے اور امیر المومنین امام علیؑ کے عمومی اعلان کے علاوہ ہر امام اپنے خاص اصحاب کے سامنے اس کی صراحت فرما دیتے تھے تاکہ ان کے بعد کوئی اور شخص اس منصب الٰہی کا ادّعا نہ کر سکے۔

امام موسیٰ بن جعفر نے اپنے بیس بیٹوں میں سے اپنے فرزند ابو الحسن علی الرضاؑ کے لیے امامت کی صراحت فرما دی تھی۔ جیسا کہ اصول کافی میں حسین بن نعیم صحاف سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا : ہشام بن حکیم، علی بن یقطین اور میں بغداد میں اکٹھے تھے۔ تب علی بن یقطین نے ہم سے کہا :

میں امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ان کے فرزند علی رضاؑ آگئے۔ اس پر آپ نے فرمایا: علی بن یقطین! یہ علی الرضاؑ میرے بیٹوں کا سردار ہے اور میں نے اپنی کنیت بھی اس کو دیدی ہے۔ اس وقت ہشام بن حکم نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا: وائے ہو تم پر، تم کیسے یہ بات کہہ رہے ہو؟ ابن یقطین نے کہا: بخدا کہ میں نے ان کو یہی کہتے سنا ہے جو میں نے تمہارے سامنے بیان کیا ہے۔ ہشام بن حکم نے کہا: اگر یہ بات ہے تو پھر امام نے تم کو یہ بتایا ہے کہ ان کے بعد امامت انہی کو ملے گی۔

معاویہ بن حکیم سے روایت ہے کہ امام موسیٰ بن جعفرؑ نے فرمایا: میرا فرزند علیؑ (رضاؑ) میرے بیٹوں میں سب سے بڑا، میرے نزدیک ان سب میں نیک اور مجھے ان سب سے محبوب ہے۔ وہ میرے ساتھ الجفر بھی دیکھتا ہے جبکہ اس کو نبی یا وصیٔ نبی کے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھتا۔

اصول کافی میں داؤد رقّی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابوابراہیمؑ سے عرض کیا، میں آپ پر فدا ہو جاؤں، میرا سن بہت ہو گیا ہے اور اب آپ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جہنم سے نکال دیجیے۔ اس پر آپ نے اپنے فرزند ابوالحسن علی رضاؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے بعد یہ تمہارے امام ہوں گے۔

اسی طرح محمد بن عمیر نے بھی اسحاق بن عمار سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابوالحسن اول موسیٰ کاظمؑ سے عرض کیا کہ کیا آپ ہم کو یہ نہیں بتائیں گے کہ ہم آپ کے بعد اپنے دینی معاملات میں کس سے رجوع کیا کریں گے؟ تب آپ نے فرمایا: اس کے لیے میرا یہ فرزند علیؑ موجود ہے۔ پھر فرمایا: میرے والد بزرگوار میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ کو روضۂ رسولؐ میں لے گئے اور فرمایا: اے میرے فرزند! اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔

یعنی میں زمین پر اپنا نمائندہ خلق کرنے والا ہوں۔

اور اللہ جو کہتا ہے اس کو پورا کرتا ہے۔

اصول کافی میں داؤد رقّی سے ایک اور روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ابوالحسن موسیٰ کاظمؑ سے عرض کیا کہ اب میرا سن زیادہ ہو گیا ہے اور میری ہڈیاں بھی پتلی

پڑ گئی ہیں۔ جب میں نے آپ کے والد بزرگوار سے ان کے جانشین کی بابت دریافت کیا تھا تو انہوں نے مجھ کو آپ کے متعلق بتلا دیا تھا۔ پس اب آپ بھی بعد کے لیے مجھ کو بتلا دیجیے۔ آپ نے فرمایا: "یہ ہیں ابوالحسن رضاؑ!"

نصر بن قابوس سے بھی اسی طرح کی روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابو ابراہیمؑ سے کہا: جب میں نے آپ کے والد بزرگوار سے دریافت کیا کہ آپ کے بعد امام کون ہوگا تو انہوں نے مجھ کو آپ کے متعلق بتلایا تھا۔ چنانچہ جب امام ابوعبداللہ جعفرؑ بن محمدؑ نے انتقال کیا تو لوگ ادھر اُدھر بھٹکنے لگے۔ تب میں نے اور میرے ساتھیوں نے سب لوگوں کو آپ کی امامت سے آگاہ کر دیا۔ اب آپ مجھ کو بتلائیے کہ آپ کے بعد آپ کے بیٹوں میں سے کون امام ہوگا؟ اس پر انہوں نے فرمایا: میرا فلاں بیٹا۔

داؤد بن سلیمان سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابو ابراہیمؑ سے عرض کیا، مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کو کچھ ہو نہ جائے اور میں آپ سے نہ مل سکوں، پس آپ مجھ کو اپنے بعد ہونے والے امام کے بارے میں بتلا دیجیے۔ اس پر آپ نے فرمایا: میرا یہ بیٹا! اور آپ نے ابوالحسن علی الرضاؑ کی طرف اشارہ فرمایا۔

محمد بن سنان سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں ابوالحسن موسیٰؑ کاظمؑ کے عراق تشریف لے جانے سے پہلے ان سے ملا جبکہ علیؑ (رضا) ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ تب آپ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا: اے محمد! اس سال میں کچھ ہونے والا ہے لیکن اس کی وجہ سے تم کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ اس پر میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، کیا ہونے والا ہے؟ مجھے تو آپ کے اس ارشاد پر تشویش لاحق ہو گئی ہے۔ آپ نے فرمایا: میں اس ظالم حکمران کے پاس لے جایا جاؤں گا۔ البتہ مجھ کو اس سے یا اس کے بعد آنے والے سے کوئی گزند نہ پہنچے گی۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، پھر کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: اللہ ظالموں کو گمراہی میں بڑھنے دیتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ پھر اپنے بیٹے علیؑ (رضا) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: جو کوئی میرے اس بیٹے علیؑ (رضا) کا حق ظلم سے لے گا، وہ ایسا ہی ہے گویا اس نے امام علی ابن ابیطالبؑ کا حق چھینا اور حضرت رسولؐ کے

بعد ان کی امامت کے بارے میں جھگڑا کیا۔ اس پر میں نے کہا: بخدا کہ اگر اللہ میری عمر میں طول عطا کرے تو میں حق ان کے سپرد کرکے ان کی امامت کا اقرار کرادوں گا۔ آپ نے فرمایا: اے محمد! تم ٹھیک کہتے ہو، اللہ تمہاری عمر دراز کرے گا۔ تب تم ان کا حق ان کے سپرد کرنا۔ پھر تم لوگوں سے ان کی امامت کا اور اسی طرح ان کے بعد آنے والے کی امامت کا اقرار کرالینا۔ میں نے عرض کیا: وہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ان کے بیٹے محمدؑ (تقی)۔ اس موضوع پر ایسی اور بھی بہت سی روایات ہیں جو امام موسٰی کاظمؑ کے اصحاب اور دیگر قابل اعتماد افراد نے بیان کی ہیں۔

امام علی رضاؑ اور فرقۂ واقفہ

امام علی رضاؑ نے اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد ان سے بھی زیادہ سخت تکلیفیں اٹھائیں جو وہ تازندگی اٹھاتے رہے اور جن کی تلخی وہ حلق سے اتارتے رہے تھے۔ وہ یوں کہ ایک طرف تو آپ حکمرانوں اور گماشتوں کی زیادتیوں سے دوچار تھے اور دوسری طرف آپ کی امامت کی ابتدا ہی میں آپ کے والد بزرگوار کے اصحاب میں ایسا تفرقہ پڑ گیا، جس سے اہل حکومت کے مقاصد اور انکی خواہشات پوری ہوگئیں جن کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہا کرتے تھے کیونکہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شیعوں کا اپنے شرعی امام کے گرد یکجا ہوجانا ان کے ان تخت ہائے حکومت کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے جو خدا کی نافرمانی، رعیت پر تشدد اور خاص کر صالح اور پاکباز افراد کے کٹے ہوئے سروں پر قائم تھے۔

بہت سی کتابیں اس امر پر گواہی دیتی ہیں کہ وہ لوگ جو امام علی رضاؑ سے وابستہ نہیں ہوئے وہ امام موسٰیؑ بن جعفرؑ کے ممتاز افراد ہی میں سے تھے۔ ان لوگوں نے آپ کی شہادت کے واقع ہونے ہی کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ یہ دعویٰ کیا کہ وہ قائم آل محمدؐ ہیں اور ہماری نظروں سے اسی طرح اوجھل ہوگئے ہیں جس طرح حضرت موسٰیؑ بن عمران اپنی امت کی نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ پھر آپ کی غیبت اور رجعت کے متعلق بھی راویوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ نوبختی نے اپنی کتاب 'فرق شیعہ' میں ان سب گروہوں کو شیعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے امام موسٰیؑ بن جعفرؑ کی شہادت کو نہیں مانا اور کہنے لگے کہ وقت آخر ان کو اللہ تعالٰی نے اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور ان کے دوبارہ قیام کے وقت ان کو واپس

بھیج دے گا، جبکہ بعض نے کہا کہ وہ بدستور زندہ ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ زندہ ہیں یا شہادت پا گئے کیونکہ اس بارے میں ہم تک بہت سی روایات پہنچی ہیں کہ وہی قائمؑ اور مہدیؑ ہیں۔ اگرچہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے والد بزرگوار اور جدِ امجد اور ان کے گزرے ہوئے آباء کرامؑ کی وفات کے متعلق ہم تک ایسی روایات پہنچی ہیں کہ جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ نوبختی کہتے ہیں کہ انہی فرقوں میں ایک وہ فرقہ بھی ہے جس کو بشیریہ کہتے ہیں۔ اس کا ادّعا یہ ہے کہ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ نہ شہید ہوتے ہیں اور نہ ان کو قید کیا گیا بلکہ وہ زندہ اور غائب ہیں اور وہی مہدی منتظرؑ ہیں۔ انہوں نے اپنی غیبت کے زمانہ میں محمد بن بشیر کو اپنا وصی اور جانشین مقرر کیا اور ان کو اپنی مہر عطا کر دی۔ نیز ان کو وہ تمام امور تعلیم کر دیے تھے جن کی ان کے پیروؤں کو ضرورت ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ علیؑ بن موسیٰؑ اور وہ تمام افراد جنہوں نے امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کے بعد امامت کا دعویٰ کیا، وہ ولادت کے اعتبار سے پاک نہیں ہیں، چنانچہ یہ لوگ ان سب کو آپ کے نسب سے خارج قرار دیتے ہیں اور ان امامت کا دعویٰ کرنے والوں اور ان کی امامت کا اقرار کرنے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ نیز نوبختی کے بقول وہ ان کے خون اور مال کو حلال قرار دیتے ہیں۔ واقفہ کے اس فرقہ کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بعض ضروریات اسلام سے انکاری اور تناسخ کے حامی ہیں۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ امام ایک ہی ہو سکتا ہے اور ایک سے زیادہ امام اس طرح ہوتے ہیں کہ وہ امام ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔

نوبختی کا کہنا ہے کہ ان لوگوں کو بارش کے بھیگے کتے کہا جانے لگا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کی شہادت کے بعد یونس بن عبدالرحمٰن اور علی بن اسماعیل میثمی نے ان سے امام کے بارے میں مناظرہ کیا۔ جب ان لوگوں میں یہ بحث گرما گرمی پر آ پہنچی تو علی بن اسماعیل نے کہا: تم لوگ تو بس بارش کے بھیگے کتے ہو۔

ہر وہ اہل قلم کہ جس نے نوبختی کے بعد شیعہ فرقوں کے بارے میں کچھ لکھا ہے، غالباً وہ انہی کی کتاب پر اعتماد کرتا رہا ہے کیونکہ وہی پہلے شخص ہیں کہ جنہوں نے جیسا بھی وہ جانتے تھے ان فرقوں کے متعلق لکھا ہے۔ البتہ انہوں نے شیعہ فرقوں کے متعلق جو کچھ بھی لکھا نہ تو

اس کی تحقیق کی طرف توجہ کی اور نہ اس کے لیے حقائق کی چھان بین کی۔ جیسا کہ انکی کتاب "فرق الشیعہ" سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ نوبختی افراد اہل بیتؑ سے اپنی وابستگی کا دعویٰ کرتے رہے لیکن عملاً وہ ان ایرانی عناصر سے تعلق رکھتے ہیں جو اہل حکومت کے حلقہ بگوش بنے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ خود یہ نوبختی بھی جو کتاب فرق الشیعہ کے مؤلف ہیں ان حکام وقت کے مقربین میں سے تھے۔ ادھر یہ حکام بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے اور لوگوں کے ضمیر خریدتے تھے، تاکہ وہ ضمیر فروش لوگ اپنے تمام وسائل سے کام لے کر شیعوں میں گڑ بڑ پھیلائیں اور ان کے دینی خصوصیات کو مسخ کر دیں۔

تاہم میری اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں فرقۂ واقفہ کے وجود کا انکار کر دوں اور نہ یہ کہ اس کے وجود کے بارے میں شک وشبہ کی فضا قائم کر دوں۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ ایک ایسا گروہ ضرور تھا جو امام موسیٰؑ بن جعفرؑ ہی پر رک گیا اور اس نے آپ کے شرعی جانشین امام علی رضاؑ کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہی ہے جو راویان حدیث کے حالات لکھنے والوں نے بیان کی اور وہ یہ ہے کہ خمس کی ان رقموں کو ہضم کرنے کا لالچ تھا جو اس وقت ان کے قبضہ میں تھیں اور وہ ان کو امام موسیٰ کاظمؑ کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ البتہ میں ان کے فرقوں کی اس تعداد میں شک کرتا ہوں جو نوبختی نے بیان کی یا ان کے بعد کے فرقوں کے بارے میں لکھنے والوں نے بیان کی ہے۔

بہرحال نظریۂ وقف (یعنی منصب امامت کو امام کاظمؑ پر ٹھہرا دینے) کی کوئی بھی وجہ رہی ہو، یہ نظریہ اس وقت کے حکمرانوں کی مرضی کے عین مطابق تھا کیونکہ وہ لوگ عوام الناس کے کسی ایک امام کے متفق ہونے اور ان کے گرد یکجا ہونے سے ڈرتے تھے۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں کہ منصور نے یہ کوشش کی تھی کہ وہ شیعوں کا رخ اسماعیل بن جعفرؑ اور عبداللہ افطح کی طرف موڑ دے۔ چنانچہ ان میں سے ایک جماعت اسماعیل کی طرف اور دوسری جماعت عبداللہ افطح کی طرف ہو گئی تھی۔ ہم نے خلیفہ منصور عباسی کے اس خط کا ذکر بھی کیا ہے جس میں اس نے مدینہ میں اپنے گورنر کو حکم بھیجا تھا کہ وہ امام جعفر صادقؑ کی وصیت کے ذریعہ مقرر کیے ہوئے ان کے جانشین کو قتل کر دے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اس معاملہ میں امامؑ نے کس احتیاط سے کام لیا تھا۔ چنانچہ آپ نے چار افراد کے حق میں

وصیت فرمائی جن میں سے ایک خود منصور دوانیقی بھی تھا۔ اسی طرح ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ بھی ممکنہ خطرے کا احساس کرتے ہوئے کیسی احتیاط سے کام کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی امامت کا علم فوری طور پر منصور کو بھی نہ ہو سکا تھا۔ نیز امامت کے ابتدائی زمانہ میں آپ کے اصحاب بھی شش و پنج میں پڑ گئے تھے اور ان میں سے کچھ افطح وغیرہ کی طرف ڈھلک گئے تھے۔ پھر حقیقتِ حال واضح ہو جانے پر وہ سب شرعی امام کی طرف پلٹ آئے تھے۔

فرقۂ واقفہ کے نمایاں افراد کے اقدامات

راویوں کا بیان ہے کہ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کے بارے میں نظریہ "وقف" (یعنی یہ کہ امامت آپ پہ آکر رک گئی ہے) سب سے پہلے آپ کے ممتاز اصحاب کے ایک گروہ نے پیش کیا جو آپ کے بہت قریب تھے اور آپ نے ان کو شیعوں سے خمس جمع کرنے کا فریضہ سونپ رکھا تھا۔ چنانچہ آپ کی حیات کے آخری ایام میں جبکہ آپ قید خانوں میں بند تھے ان لوگوں کے پاس خمس کی ایک بڑی مقدار جمع ہو گئی تھی۔ پس جب امام موسیٰ کاظمؑ قید ہی میں شہید کر دیے گئے اور امام علی رضاؑ نے وہ مال ان لوگوں سے طلب کیا جو ان کے پاس جمع تھا تو وہ دنیا کے فریب میں آگئے اور سرے سے امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت ہی سے انکار کرنے لگے۔ تب ان میں سے بعض نے یہ کہا کہ وہ اس پردۂ غیبت سے اسی طرح واپس آجائیں گے جس طرح حضرت موسیٰؑ بن عمران آگئے تھے، اور بھی ایسی ہی بہت سی باتیں تھیں جن کو وہ دہراتے رہے۔ ان میں سب سے پیش پیش علی بن ابی حمزہ بطائنی تھا جس کے پاس امامؑ کے تیس ہزار دینار تھے۔ اسی طرح زیاد بن مروان قندی کے پاس ستّر ہزار دینار، عثمان بن عیسیٰ رواسی کے پاس تیس ہزار دینار اور چھ کنیزیں اور احمد بن ابی بشر سراج کے پاس دس ہزار دینار تھے۔

احمد بن حماد سے روایت ہے کہ عثمان بن عیسیٰ رواسی مصر میں تھا اور اس کے پاس امامؑ کے تیس ہزار دینار اور چھ کنیزیں تھیں۔ امام علی رضاؑ نے اس کو اس مال اور کنیزوں کے لانے کا حکم بھیجا۔ تب اس نے جواباً آپ کو یہ لکھ بھیجا: آپ کے والد بزرگوار کی شہادت ہی واقع نہیں ہوئی۔ امامؑ نے اس کو ایک اور خط لکھا اور بتایا: ہمارے

پاس ان کی شہادت کی اطلاع آگئی ہے اور اس کی تصدیق ہو جانے کے بعد ہم نے ان کی میراث بھی تقسیم کر لی ہے۔ عثمان رواسی نے جواب میں آپ کو لکھا: اگر آپ کے والد بزرگوار نے وفات نہیں پائی تو پھر آپ کا اس مال میں کچھ بھی نہیں ہے اور اگر وہ شہید ہو گئے ہیں جیسا کہ آپ دعوے کر رہے ہیں، تو انہوں نے کوئی چیز آپ کو دینے کے لیے مجھ سے نہیں کہا ہے۔ البتہ کنیزوں کو میں نے آزاد کر دیا تھا اور انہوں نے تزویج کر لی ہے۔

علی بن حمزہ بطائنی اور زیاد بن مروان قندی نے اپنے پاس امام کا کوئی مال ہونے ہی سے انکار کر دیا لیکن یونس بن عبدالرحمٰن کے ساتھ ان کی گفتگو اور پھر اس کو کثیر رقم دے کر اپنے موقف کے لیے اس کی حمایت حاصل کرنے کی پرفریب کوشش یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ بڑی بڑی رقمیں جو ان دونوں کی تحویل میں تھیں وہ انہوں نے غصب کر لی تھیں۔

محمد بن عبدالعزیز کشی نے "رجال" میں احمد بن فضل کی سند سے روایت کی ہے کہ یونس بن عبدالرحمٰن نے کہا: جب امام ابوالحسن موسیٰؑ بن جعفرؑ نے شہادت پائی تو ان کے وکیلوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے پاس بہت بڑی مقدار میں ان کا مال نہ ہو۔ بس یہی سبب تھا کہ وہ آپ کی شہادت کا انکار کرنے اور سلسلۂ امامت کے آپ کے وقوف پر ہٹ دھرمی کرنے لگ گئے تھے۔ چنانچہ زیاد قندی کے پاس ستر ہزار دینار اور علی بن ابی حمزہ بطائنی کے پاس تیس ہزار دینار تھے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ حال دیکھا اور اس کے ساتھ ہی مجھ کو امام ابوالحسن علی رضاؑ کی امامت کے بارے میں معلوم ہوا تو اس کو سمجھ لیا اور حقیقت مجھ پر آشکارا ہو گئی۔ تب میں نے اس سلسلے میں لوگوں سے گفتگو شروع کی اور میں ان کو آپ کی طرف بلانے لگا۔ اس وقت ان دونوں یعنی بطائنی اور قندی نے مجھے کہلا بھیجا کہ تم اس معاملے میں لوگوں کو مت بلاؤ۔ اگر تم کو مال کی خواہش ہے تو ہم تم کو سیر کر دیں گے پھر دونوں نے مجھ کو دس ہزار دینار پیش کیے تاکہ میں لوگوں کو امام رضاؑ کی طرف دعوت دینے کے عمل سے دستبردار ہو جاؤں اور اس سے الگ ہو رہوں۔ اس پر میں نے ان سے کہا: بے شک ہمیں صادقینؑ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب بدعتیں سر اٹھانے لگیں تو عالم پر فرض ہے کہ وہ اپنا یقینی علم ظاہر کر دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریگا تو اللہ تعالیٰ اسکے نورِ ایمان کو سلب کر لیگا۔ بسکہ میں یہ جہاد چھوڑنے والا نہیں

ہوں اور اللہ کا حکم ہر حال میں برتر ہے۔ اس پر وہ دونوں میرے خلاف ہو گئے اور پھر میرے ساتھ عداوت اور دشمنی سے پیش آنے لگے۔

احمد بن ابی بشر سراج کہ جو فرقۂ واقفہ کے نمایاں افراد میں تھا۔ اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ چیز جس نے مجھ کو امام ابوالحسن علی رضاؑ کی طرف رجوع کرنے سے روکا وہ امام کاظمؑ کا وہ مال تھا جو میرے پاس تھا۔ چنانچہ شیخ طوسی کی کتاب الغیبت کے باب واقفہ میں ہے کہ حسین بن احمد بن حسن فضال نے بیان کیا کہ میں اپنے چچا علی بن حسن فضال کے پاس اہل بغداد کے ایک بزرگ شخص کو دیکھتا تھا جو میرے چچا کے ساتھ ہنسی مذاق کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک روز ان سے کہا: اے شیعو! دنیا میں تم سے زیادہ برا کوئی نہیں ہے۔ میرے چچا نے کہا: اللہ تم پر لعنت کرے، کہو بات کیا ہے؟ اس نے کہا: میں احمد بن ابی بشر سراج کی بیٹی سے تزویج کی تھی۔ احمد بن بشر نے اپنی موت کے قریب مجھ سے کہا: امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کے دس ہزار دینار میرے پاس امانت میں تھے لیکن ان کی وفات کے بعد میں نے وہ امانت ان کے فرزند کو نہیں دی، بلکہ یہ کہہ دیا کہ وہ فوت ہی نہیں ہوتے ہیں۔ خدا کے واسطے اب تم مجھ کو جہنم سے بچالو اور وہ امانت امام ابوالحسن علی رضاؑ کے حوالے کر دینا، لیکن قسم بخدا کہ ہم نے اس میں سے ایک درہم بھی نہیں نکالا اور اس کو نار جہنم ہی میں جلنے دیا ہے۔

اسی ابن سراج، ابن مکاری حسین بن ابی سعید اور علی بن حمزہ بطائنی کیسا تھ امام علی رضاؑ کی ایک گفتگو ہوئی ہے۔ جیسا کہ "رجال کشی" میں محمد بن مسعود نے منصور بن عباس بغدادی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: اسماعیل بن سہل کا بیان کہ ہمارے ایک ساتھی نے یہ وعدہ لیکر کہ ہم اس کا نام پوشیدہ رکھیں ہم سے بیان کیا کہ میں امام علی رضاؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ علی بن ابی حمزہ، ابن سراج اور ابن مکاری وہاں آئے۔ ابن ابی حمزہ نے آپ سے کہا: آپ کے والد کا کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا: وہ شہادت پا گئے۔ اس نے کہا: وہ اپنے بعد کس کو اپنا جانشین کر گئے؟ آپ نے فرمایا: مجھ کو اپنا جانشین بنا گئے۔ اس نے کہا: تو کیا آپ وہ امامؑ ہیں کہ اللہ کی طرف سے جن کی اطاعت فرض ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! ابن سراج اور ابن مکاری کہنے لگے: بخدا کہ انھوں نے آپ کو اپنی طرف سے یہ عہد دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: وائے ہو تم پر، ان کے بارے میں یہ کہتے ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں بغداد جا کر ہارون سے

کہوں کہ میں ہوں وہ امامؑ کہ جس کی اطاعت فرض ہے، بخدا کہ یہ امر میرے اوپر لازم نہیں ہے۔ البتہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ آپس میں اختلاف کر رہے ہو اور تم میں تفرقہ پڑتا جا رہا ہے تو میں نے تم کو بتلا دیا ہے تاکہ تمہارا راز تمہارے دشمن کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ تب ابن ابی حمزہ نے کہا: آپ نے ایسی بات کی ہے جو آپ کے آباء کرامؑ میں سے کسی نے نہ کی تھی اور نہ کبھی اس طرح کلام کیا تھا۔ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں؟ میرے آباء کرامؑ میں سب سے افضل یعنی رسول اللہ صؑ نے اسی طرح کا کلام فرمایا تھا۔ جب اللہ نے آنحضرتؐ کو حکم دیا کہ اپنے قرابت داروں میں پیغام رسالت پہنچائیں تو آپ نے اپنے خاندان میں سے چالیس افراد کو جمع کیا اور ان سے فرمایا: میں تمہاری طرف اللہ کا رسولؐ ہوں۔ جبکہ آپ کو جھٹلانے والوں میں سب سے زیادہ سخت آپ کا چچا ابو لہب تھا۔ پس رسول اللہؐ نے فرمایا: اگر میں تمہارے ڈرانے سے ڈر گیا تو پھر میں نبی نہیں ہوں۔ یہ میں تم کو ابتدائے نبوت کی بات بتا رہا ہوں۔ اب میں بھی یہی کہتا ہوں: اگر میں ہارون کے ڈرانے سے ڈر جاؤں تو پھر میں امام نہیں ہوں۔ پس میں تمہارے لیے اپنی امامت کی ابتدا اسی طرح کر رہا ہوں۔

علی بن ابی حمزہ پھر بولا: ہم کو آپ کے آباء کرامؑ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک امام کے بعد فوراً انہی جیسا امام عہدۂ امامت پر فائز ہوتا ہے۔ اس پر امام ابوالحسن علی رضاؑ نے فرمایا: تم مجھ کو حسینؑ بن علیؑ کے بارے میں بتاؤ کہ وہ امام تھے یا نہیں؟ اس نے کہا: وہ ضرور امام تھے۔ آپ نے فرمایا: پھر امامت میں ان کے جانشین کون ہوئے؟ اس نے نے کہا: ان کے فرزند علیؑ بن حسینؑ اور مزید کہا کہ علی بن حسینؑ کوفہ میں عبیداللہ بن زیاد کی قید میں تھے۔ وہ وہاں سے نکل کر کربلا گئے، اپنے والد بزرگوار کے جانشین مقرر ہوئے اور واپس آ گئے لیکن ان لوگوں کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ اس پر امام ابوالحسنؑ علی رضاؑ نے کہا: جس نے علیؑ بن حسین کے لیے یہ ممکن بنا دیا کہ وہ کربلا جا کر اپنے بزرگوار کی جانشینی حاصل کر لیں، وہی اس امام کے لیے یہ ممکن بنا سکتا ہے کہ بغداد جائے اور اپنے والد بزرگوار سے جانشینی حاصل کرے جبکہ وہ خود نہ قید خانہ میں ہے نہ گرفتار ہے۔

امام علی رضاؑ نے ان لوگوں سے بارہا مناظرہ کیا کیونکہ فرقۂ واقفہ کا نظریہ شیعوں میں بہت پھیل گیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس غلط نظریہ سے پلٹ گئی

البتہ ایک گروہ جیسے بطائنی، قندی اور ابن سراج وغیرہ اسی پر قائم رہے۔ چنانچہ امامؑ نے ان لوگوں پر لعنت کی اور ان کو ملحد اور زندیق قرار دیا ہے۔

آپ سے سلیمان جعفری نے روایت کی ہے کہ جب کسی شخص نے امام علی رضاؑ سے ان لوگوں کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: وہ لوگ ملعون ہیں، وہ جہاں کہیں جائیں گے پکڑے اور قتل کیے جائیں گے۔ جو لوگ گزر چکے ہیں ان کے ساتھ بھی اللہ کا یہی طریقہ رہا ہے اور تم اللہ کے طریقہ میں کبھی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ آپ نے یوسف بن یعقوب سے فرمایا: ان واقفہ کو زکات نہ دینا کیونکہ وہ کافر و مشرک ہیں۔ وہ پریشان حالی میں زندگی گزاریں گے اور بے دین ہو کر مریں گے۔

علاوہ ازیں واقفہ کے بارے کسی سوال کرنے والے کو آپ نے یہ جواب لکھا: نظریۂ وقوف کا قائل حق کا دشمن اور بدی پر قائم ہے۔ اگر وہ اسی نظریے پر مر گیا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا: واقفی اور ناصبی لوگ ایک ہی مقام میں ہیں۔ نہ وہ مسلمانوں میں شامل ہیں نہ مومنوں میں جیسا کہ یحییٰ بن مبارک کی روایت میں ہے اور ایسی ہی بہت سی روایات ہیں جو ابو عمر کشی اور علم رجال کی دیگر کتابوں کے مؤلفین نے بیان کی ہیں۔

رجال کشی میں ہے کہ امام ابوالحسن موسیٰؑ بن جعفرؑ کے بعد شیعوں کی ایک جماعت ان کے بیٹے احمد بن موسیٰ سے وابستہ ہو گئی اور ایک مدت تک اسی کی طرف رہی، حالانکہ ان کو آپ کی شہادت کا یقین بھی تھا۔ ابو سمال یا ابو سماک کے دونوں بیٹے ابراہیم اور اسماعیل انہی لوگوں میں تھے۔ جب ابن طبا طبا نے عباسی حکومت کے خلاف خروج کیا اور خلیفہ ہارون نے ابن سرایا کی سرکردگی میں ان سے لڑنے کے لیے ایک لشکر روانہ کیا تو وہی احمد بن امام موسیٰ کاظمؑ اس لشکر کے ساتھ ابن طبا طبا سے لڑنے کے لیے نکلا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے ان دونوں بھائیوں سے کہا کہ یہ شخص تو ابن سرایا کے ساتھ ہو کر جنگ کے لیے نکلا ہے۔ اب تم دونوں کیا کہتے ہو؟ چنانچہ ان دونوں نے احمد بن موسیٰ کاظمؑ کے اس

فعل کو ناپسند کیا اور اس سے کنارہ کش ہو کر یہ کہنے لگے: امام ابوالحسن موسیٰ کاظمؑ ابھی زندہ ہیں اور وہ پھر آپ ہی کی امامت کے قائل ہو گئے۔

اس طرح کی اور بھی روایتیں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ امام علی رضاؑ سے کنارہ کش رہنے والے لوگ وہی تھے جو دنیا کے فریب میں آگئے اور لالچ نے ان پر تسلّط حاصل کر لیا تھا کیونکہ وہ مال و دولت جو ان کے قبضے میں تھا وہ ابوالحسن موسیٰؑ بن جعفرؑ کی امانت تھی۔ اس کو ہڑپ کرنے کی خاطر انہوں نے آپ کے والد بزرگوار کی شہادت ہی سے انکار کر دیا تھا۔ ان لوگوں میں ابن سراج، بطائنی، قندی، ابن عیسیٰ رواسی وغیرہ ہیں جو امام موسیٰ کاظمؑ کے وکیل اور آپ کے مال و متاع کے نگہدار تھے۔

ان میں وہ لوگ بھی تھے جو حکومت کے ایما پر یا بعض دوسری وجوہ کی بنا پر ائمہؑ کے اصحاب میں شامل ہو گئے تھے۔ جیسے محمد بن بشیر اور دوسرے مکار اور تخریب کار لوگ تھے۔ امام علی رضاؑ سے کنارہ کش ہونے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی سوچنے اور سمجھنے کی قوت بہت کم تھی۔ چنانچہ وہ ایسی حدیثوں پر اعتماد کیے ہوئے تھے جو ظاہری طور پر بھی شک و شبہ سے بالاتر نہیں تھیں۔ ان لوگوں میں حسن بن قیاما صیرفی، زرعہ بن محمد حضرمی اور انہی طرح کے اور لوگ کہ جو جھٹلائی ہوئی حدیثوں یا ان حدیثوں سے استدلال کیا کرتے تھے جن کا مطلب صاف اور واضح نہیں ہوتا تھا۔ البتہ یہ پہلے دو طرح کے لوگوں سے کم خطرناک تھے کیونکہ بعض اوقات ان کے اور امامؑ کے مابین یا ان کے اور امامؑ کے اصحاب کے درمیان جو گفتگوئیں ہوتی رہتی تھیں ان کے نتیجے میں ان لوگوں کا امام حق کی طرف پلٹ آنا ممکن تھا۔

واقفہ کے اس گروہ کی بابت صاحب رجال کشی نے فضل بن شاذان سے حسن بن قیاما صیرفی کی ایک روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب میں ۱۹۳ھ میں حج کے لیے مکہ گیا تو وہاں میں نے امام ابوالحسن علی رضاؑ سے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ کے والد بزرگوار کا کیا معاملہ ہے؟ آپ نے فرمایا جس طرح ان کے آباء کرامؑ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اسی طرح وہ بھی رخصت ہو گئے تھے۔ میں نے عرض کیا: پھر میں اس حدیث کا کیا مطلب لوں جو میں نے یعقوب بن شعیب سے سنی کہ ابوبصیر کا

کہتا ہے کہ امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ نے فرمایا: اگر کوئی آکر تم سے کہے کہ میرا بیٹا مر گیا' اس کو کفن دے کر دفنا دیا گیا اور لوگوں نے اس کی قبر پر مٹی ڈال کر اپنے ہاتھ جھاڑ لیے ہیں تو بھی تم اس کو سچ نہ ماننا۔ اس پر امام علی رضاؑ نے فرمایا: ابوبصیر نے غلط کہا۔ امام ابو عبداللہؑ نے اس طرح نہیں کہا تھا۔ بلکہ آپ نے یہ کہا تھا کہ اگر کوئی آکر تم کو یہ بتلائے کہ صاحب امرؑ مر گیا ہے' اس کو کفن دے کر دفن کر دیا گیا اور لوگوں نے اس کی قبر پر مٹی ڈال کر اپنے ہاتھ جھاڑ لیے ہیں تو بھی تم اس کو سچ نہ ماننا۔ یہاں آپ نے صاحب امر سے بارھویں امامؑ کو مراد لیا ہے۔

اسی طرح صاحب رجال کشّی نے ایک اور روایت بھی لکھی ہے کہ محمد بن یونس بن حسن الواسطی کا بیان ہے کہ حسن بن قیاما صیرفی نے کہا: جب میں نے امام ابوالحسن رضاؑ سے آپ کے والد بزرگوار کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: جس طرح ان کے آبائے کرامؑ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اسی طرح وہ بھی رخصت ہو گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا: پھر میں اس حدیث کا کیا مطلب لوں جو میں نے زرعہ بن حضرمی سے اور انہوں نے سماعہ بن مہران سے سنی ہے کہ امام ابو عبداللہ جعفر صادقؑ نے اپنے فرزند موسیٰ کاظمؑ کی جانب اشارہ کیا اور فرمایا: میرا بیٹا پانچ نبیوں سے مشابہ ہے یعنی اس سے حضرت یوسفؑ کی طرح حسد کیا جائیگا۔ وہ حضرت یونسؑ کی طرح غائب ہو جائے گا اور اسی طرح آپ نے تین اور نبیوں کو بھی گنایا۔ اس پر آپ نے فرمایا: زرعہ بن محمد نے غلط کہا ہے۔ کیونکہ سماعہ بن مہران نے اس طرح روایت نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے کہا تھا کہ "صاحب ھذا الامر" یعنی "القائم فیہ" کہ جو پانچ انبیاءؑ سے مشابہ ہوں گے اور "میرا یہ بیٹا" نہیں کہا تھا۔

تاہم جو بھی صورت رہی ہو ہم کو فرقۂ واقفہ' ان کے خیالات اور ان اسباب کے متعلق کہ جن کے باعث وہ اس طرف ڈھلک گئے' ان کی مزید جستجو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' بلکہ ہم نے ان کے بارے میں یہ چند اشارے بھی صرف اس لیے کر دیے ہیں کہ امام موسیٰ کاظمؑ کی حیات طیبہ سے ان کا قریبی تعلق رہا جو اپنے آخری دور تک برابر حادثات سے دوچار ہوتی رہی تھی اور پھر آپ کی حیات بغداد میں خلیفہ ہارون کی قید ہی میں

اختتام کو پہنچی۔

امام علی رضاؑ اور حکومتِ وقت

امام علی رضاؑ اپنے والد بزرگوار کے بعد بیس سال سے زیادہ عرصے تک زندہ رہے جن میں سے دس سال آپ نے ہارون رشید کے عہد خلافت میں گزارے۔ جیسا کہ یعقوبی اور دوسرے مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ آپ کے والد بزرگوار کی شہادت ۱۸۳ھ میں ہوئی اور ہارون نے ۱۹۳ھ میں موت کا مزہ چکھا۔ اس دور میں آپ ان حادثات کی تلخی کے گھونٹ حلق سے اتارتے رہے جو آپکی امامت کے آغاز ہی سے پیش آنے لگے تھے کیونکہ ان حکمرانوں کے حاشیہ بردار انکے سامنے یہ ظاہر کرتے تھے کہ امام علی رضاؑ ان کے تسلّط اور خلافت کے لیے خطرہ ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اس طرح ان کو اہل حکومت کی مہربانی حاصل ہو جائے گی اور ان کے عہدے اور مشاہرے بڑھا دیے جائیں گے۔

چنانچہ موسیٰ بن مہران نے جعفر بن یحییٰ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب خلیفہ ہارون الرشید رقّہ سے مکہ جارہا تھا، اس وقت میں نے عیسیٰ بن جعفر برمکی کو خلیفہ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ: ذرا اپنی وہ قسم یاد کیجیے جو آپ نے آلِ ابی طالبؑ کے بارے میں کھائی تھی، جبکہ آپ نے حلفیہ کہا تھا کہ اگر امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کے بعد کسی نے امامت کا دعویٰ کیا تو میں اس کو پکڑ کر اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اب یہ دیکھیے کہ ان کے فرزند علی رضاؑ وہی دعویٰ کر رہے ہیں اور لوگ ان کو اسی طرح کا امام مانتے ہیں جیسا انکے والد کو مانتے تھے۔ اس پر ہارون نے اس پر غصہ کی نگاہ ڈالی اور کہا: تم آخر چاہتے کیا ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان سب کو اکٹھے ہی مار ڈالوں؟ موسیٰ بن مہران کا بیان ہے کہ جب میں نے جعفر بن یحییٰ سے یہ ماجرا سنا تو میں امام علی رضاؑ کی خدمت میں گیا اور آپ کو ہارون کے اس قول کی اطلاع کر دی۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: میرا اور ان لوگوں کا کیا واسطہ ہے۔ بخدا کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

گویا کہ امام علی رضاؑ کے خلاف حکمرانوں کو بھڑکانے میں برمکی گھرانے کے لوگ پیش پیش تھے جنہوں نے آپ کے والد بزرگوار کے بھتیجے محمد یا علی بن اسماعیل کے بغض اور حسد سے فائدہ اٹھا کر ان کے خلاف اپنی ناپاک سازشوں کے جال بنے تھے۔ چنانچہ

یحییٰ بن خالد برمکی جو ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ ہارون آپ کو بھی آپ کے والد بزرگوار کی طرح ختم کردے، اس نے خلیفہ سے کہا: دیکھیے کہ یہ علیؑ بن موسیٰؑ اپنے باپ کا جانشین بنکر امامت کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ اس پر ہارون نے کہا: جو کچھ ظلم و تعدی ہم ان کے والد کے ساتھ کر چکے ہیں کیا وہ ہمارے لیے کافی نہیں ہے۔کیا تم چاہتے ہو کہ ہم ان سب کو اکٹھے ہی مار ڈالیں؟

ہارون کے کہے ہوئے جملے اگر کچھ ثابت کرتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ اس کو امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ کیے ہوئے اپنے مجرمانہ برتاؤ کا احساس تھا اور اکثر وہ اپنے نفس میں پچھتاوے کی کیفیت دیکھتا رہتا تھا۔ پس وہ اس پر آمادہ نہ تھا کہ اب ان کے فرزند کے قتل سے ایک اور گناہ کا ارتکاب کرے۔ تاہم وہ بہت سی کوششیں جو اس کے حالی موالی کرتے رہتے تھے بالآخر اس کو آپ کے خلاف آمادہ کر لینے میں کامیاب ہو گئیں۔ البتہ اللہ کی مشیت بار بار اس کے اور اس کے برے ارادے کے درمیان حائل ہوتی رہی۔ چنانچہ ابوالصلت ہروی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک روز جبکہ امام ابوالحسن علی رضاؑ اپنے مکان میں جلوہ افروز تھے، خلیفہ ہارون کا قاصد آیا اور بولا: آپ امیرالمومنین کے پاس تشریف لے چلیے۔ پس آپ نے مجھ سے فرمایا: دیکھو اے ابوصلت! ہارون نے اس وقت مجھ کو ضرور کسی فریب کے تحت بلایا ہے لیکن قسم بخدا کہ مجھ کو میرے جدامجد رسول اللہؐ نے کچھ ایسے کلمات تعلیم کر دیے ہیں کہ وہ میرے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کر پائے گا۔ پھر آپ چل پڑے اور میں بھی آپ کے ساتھ ہو لیا۔ یہاں تک کہ آپ ہارون کے پاس پہنچ گئے۔ جب امام علی رضاؑ کی نظر اس پر پڑی تو آپ نے وہ کلمات پڑھے اور جب آپ اس کے سامنے ہوئے اور اس کی نظر آپ پر پڑی تو بولا: اے ابوالحسنؑ! ہم نے آپ کے لیے ایک لاکھ دینار دینے کا حکم دے دیا ہے آپ ہم کو اپنے اہل و عیال کی ضروریات لکھ دیجیے اور جب بھی آپ کی منشا ہو اپنے اہل خانہ کے پاس تشریف لے جائیے گا۔ جب آپ وہاں سے چلنے کے لیے اٹھے تو ہارون نے کہا: میں نے ایک ارادہ کیا تھا لیکن اللہ نے اس کے خلاف ارادہ کیا۔ پس اللہ نے جو ارادہ کیا ہے اس میں خیر ہی خیر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام علی رضاؑ کے وہ اصحاب جو خلیفہ ہارون کی ان جفاؤں کا غم اور

تلخی جھیلے ہوتے تھے جو اس نے آپ کے والد بزرگوار امام موسیٰ کاظمؑ پر کی تھیں، وہ اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ کہیں آپ کے ساتھ بھی وہ سلوک نہ ہو اور کوشش کرتے رہتے تھے کہ آپ کو خطرے کے موقعوں سے دُور رکھیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے بارہا آپ سے درخواست کی کہ اپنی امامت کی دعوت کو پوشیدہ رکھیں اور ان ظالم حاکموں سے خود اپنے لیے اور اپنے شیعوں کے لیے احتیاط فرماتے رہیں کیونکہ یہ لوگ اپنے افعال میں اللہ سے کسی قسم کا خوف نہیں رکھتے تھے لیکن امامؑ ان پر یہ بات ظاہر فرماتے رہتے تھے کہ آپ کو اپنے آباءِ کرامؑ سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کے ساتھ کیا ہو گا اور یہ کہ خلیفہ ہارون اپنی اس گمراہی اور ظلم کے باوجود آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ چنانچہ آپ نے اپنے ان اصحاب کی ایسی کوششوں کے باوجود بھی دعوت الی اللہ کے معاملہ میں اپنا رویہ اور طرزِ عمل تبدیل نہیں فرمایا۔

ابو عمر کشی نے کتاب رجال میں اور یعقوب کلینی نے اصول کافی میں صفوان بن یحییٰ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: جب امام ابو الحسن موسیٰ کاظمؑ شہید ہو گئے اور آپ کے بعد امام علی رضاؑ نے مسندِ امامت پر جلوہ افروز ہو کر اپنی امامت کا اعلان فرمایا تو ہم کو اس میں خطرہ نظر آیا اور ہم نے آپ سے عرض کیا: آپ نے ایک بڑے معاملہ کو ظاہر فرما دیا ہے اور ہمکو آپ کے بارے میں اس ظالم خلیفہ سے خوف آنے لگا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: وہ اپنی سی کوشش کرتا رہے گا لیکن پھر بھی میرے خلاف کچھ نہ کر پائے گا۔

روضۃ الکافی میں محمد بن سنان سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے خلیفہ ہارون کے زمانہ میں امام ابو الحسن علی رضاؑ سے عرض کیا: آپ نے اپنے دعوائے امامت کو ظاہر کر دیا ہے اور آپ اپنے والد بزرگوار کے مقام پر متمکن ہو گئے ہیں حالانکہ ابھی ہارون کی تلوار سے ان کا خون ٹپک رہا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: رسول اللہؐ کے ایک قول نے مجھ کو ایسا کرنے کی جرأت دلائی ہے، جیسا کہ آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا تھا: اگر ابو جہل میرے سر کا ایک بال بھی بیکا کر سکے تو سمجھ لو کہ میں نبی نہیں ہوں۔ پس اب میں بھی تم لوگوں سے کہتا ہوں کہ اگر خلیفہ ہارون میرا ایک بال بھی بیکا کر دے تو میں امام نہیں ہوں۔ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں واقفہ کا ایک گروہ آیا اور آپ سے ان کی گفتگو ہونے لگی۔ تب علی بن حمزہ نے آپ سے کہا: آپ اپنی جان کے بارے میں حاکموں سے ڈرتے

نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: اگر میں اپنی جان کے بارے میں ڈرتا تو خود اسی کو نقصان پہنچاتا، کیونکہ جب ابولہب نے آکر رسول اللہؐ کو خوف دلایا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا: اگر میں تمہارے ڈرانے سے ڈر جاؤں تو میں جھوٹا ہوں۔ یہ تھی وہ پہلی حجت کہ جس سے رسول اللہؐ نے کفر کا مقابلہ فرمایا اور یہی وہ پہلی حجت ہے کہ جس سے میں تمہارے سامنے مقابلہ آزما ہوں، یعنی اگر میں ہارون کے دبدبوں سے ڈر جاؤں تو میں جھوٹا ہوں۔

اس پر فرقہ واقفہ کے ایک اور فرد حسین بن مہران نے آپ سے کہا: ہم تو آپ سے یہ درخواست کرنے آئے ہیں کہ اس بات کو علانیہ ظاہر فرمائیے۔ امامؑ نے فرمایا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ہارون کے پاس جاکر کہوں کہ میں امامؑ ہوں اور تم کچھ نہیں ہو۔ حالانکہ رسول اللہؐ نے ابتداءِ کار رسالت میں ایسا نہیں کیا تھا بلکہ آپ نے یہ امر اپنے خاندان والوں، دوستوں اور ان لوگوں پر ظاہر کیا تھا جن پر آپ کو اعتماد تھا۔ دوسری طرف ہارون کے ساتھی اور خاص کر برمکی لوگ جو علویوں سے بغض رکھتے تھے، وہ امام علی رضاؑ کے خلاف ہارون کے کان بھرتے رہتے تھے اور کبھی کبھی تو وہ ان کی بات مان کر آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے اپنے پاس بلوا بھی لیتا تھا لیکن اللہ اس کی اور اس کی اعانت کرنے والوں کی گھات میں تھا۔ چنانچہ اس نے نہ صرف آپ کو اس کے شر سے محفوظ رکھا بلکہ برامکہ سے آپ کا اور آپ کے والد بزرگوار کا بدلہ بھی ہارون ہی کے ہاتھ سے لیا۔ حالانکہ یہ لوگ اس کے نظامِ سلطنت میں عقلِ کُل بنے ہوئے تھے اور اس کے مقرب ترین ساتھیوں میں سے تھے۔

جب محمد بن جعفر نے مدینہ میں اس ظالم عباسی حکومت کے خلاف اپنے خروج کا اعلان کر دیا تو ہارون نے اپنے ایک خاص فوجی سردار جلودی کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا اور اس کو حکم دیا کہ اگر وہ اس پر فتحمند ہو جائے تو اس کا سر کاٹ لے لیکن اس پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اس کو یہ ہدایت بھی کی محمد بن جعفر سے نمٹ کر وہ آل ابی طالبؑ کے گھروں پر حملہ کر دے اور ان کی عورتوں کے تمام کپڑے اور زیور چھین لے حتیٰ کہ ان میں سے کسی کے پاس جسم ڈھانپنے کے لیے ایک چیتھڑا بھی نہ چھوڑے۔ چنانچہ جب جلودی نے محمد بن جعفر اور ان کے ساتھی غازیوں پر فتحمند ہو گیا تو اس نے آل ابی طالبؑ کے گھروں پر حملہ کر دیا اور خلیفہ ہارون کے ان احکام کی پوری پوری تعمیل کی۔ پھر وہ اپنے سواروں اور پیادوں کو لیکر امام علی رضاؑ کے

گھر پہنچا تو امامؑ نے سب عورتوں کو اپنے مکان کے ایک حجرے میں جمع کر دیا اور خود دروازہ پر کھڑے ہو گئے اور فوجیوں کو اندر آنے سے روکنے کی کوشش فرماتے رہے۔ تب جلودی نے آپ سے کہا: میں تو ضرور گھر کے اندر جا کر ہارون کے حکم کے مطابق عورتوں کو لوٹنے کے کام کی خود نگرانی کروں گا۔ اس پر امام علی رضاؑ نے فرمایا: میں ہی تمہاری طرف سے ان کو اس طرح لوٹے لیتا ہوں کہ ان کے پاس کچھ نہ چھوڑوں گا اور سب کچھ تم کو لا دوں گا۔ چنانچہ آپ اس کو اندر جانے سے روکتے اور قسمیں کھا کر باور کراتے رہے کہ آپ گھر کی عورتوں کے تمام کپڑے اور زیور اتار لائیں گے، بالآخر وہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے امامؑ کی بات مان لی۔

چنانچہ امام علی رضاؑ گھر کے اندر گئے اور پھر عورتوں کے کپڑے اور زیور نیز ان کے ساتھ گھر کی سب چھوٹی بڑی چیزیں بھی جلودی کے حوالے کر دیں۔

اس کے علاوہ تاریخ نے امام علی رضاؑ کے ساتھ ہارون کا کوئی اور تکلیف دہ واقعہ بیان نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد ہارون کے سال وفات یعنی ۱۹۳ھ میں خلیفہ امین اس کا جانشین ہوا کیونکہ وہ ہارون کے حکم سے ولی عہد بن چکا تھا۔ وہ اس طرح کہ ہارون نے اپنے تینوں بیٹوں کے لیے باری باری سے حکومت مقرر کر دی تھی۔ چنانچہ اپنے بعد محمد امین، اسکے بعد عبداللہ مامون اور ان دونوں کے بعد قاسم کو اپنا ولی عہد قرار دیا تھا۔ اسی طرح تاریخ ابن اثیر کے بیان کے مطابق اس نے ان کے لیے علاقے بھی معین کر دیے تھے۔ چنانچہ امین کے لیے عراق، شام اور مغرب کے آخر تک کا علاقہ۔ مامون کے لیے ہمدان سے مشرق میں خراسان اور اس کے نواح تک اور قاسم کہ جس کو اس کے بھائی مامون کے بعد ولی عہد قرار دیا تھا، اس کے لیے جزیرہ، سرحدی علاقے اور قلعے مخصوص کیے تھے۔ البتہ مامون کو یہ اختیار دیدیا تھا کہ وہ چاہے تو اس کی ولی عہدی کو باقی رکھے یا اس کو اس سے محروم کر دے۔

خلیفہ امین اپنے باپ ہارون کے بعد پانچ سال اور کچھ مہینے زندہ رہا۔ کیونکہ محرم ۱۹۸ھ میں وہ ان جھڑپوں میں قتل ہو گیا جو اس کے اور اس کے بھائی مامون میں ہوئی تھیں۔ امین کے قتل کے بعد مامون نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور ملک کے تمام علاقوں میں مسلمانوں نے اس پر اتفاق کر لیا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ فضل بن ربیع مامون سے دشمنی رکھتا تھا اور ڈرتا تھا کہ اگر اس کو خلافت مل گئی تو وہ اس کو اس کے عہدہ سے ہٹا دے گا۔ چنانچہ اس کے مشورے پر

امین نے اس کی جگہ اپنے بیٹے موسیٰ کو ولی عہد بنادیا تھا۔

بہرحال جب تک امین کی حکومت رہی ہم کو تاریخ کی کتابوں میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جو یہ ظاہر کرے کہ اس نے امام علی رضاؑ کو قتل کرنے کی کوئی سازش یا آپ کو ضرر پہنچانے کی کوشش کی ہو۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ شہوت پرستی اور لذت گیری میں پڑ گیا تھا اور اس کے علاوہ خود شاہی گھرانہ میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے جن کی بنا پر اس نے اپنے بھائی مامون کو ولی عہدی سے ہٹا دیا تھا۔ اس سے ان کے اختلافات میں شدّت پیدا ہو گئی اور پھر ان کے باہمی تصادم کے نتیجے میں مملکت کے تمام علاقوں میں بے چینی کا دور دورہ ہو گیا۔

چونکہ مامون کو عوام کی محبت اور اعتماد حاصل تھا اور وہ خود بھی ایک قومی شخصیت رکھتا تھا اس لیے اس کو امین اور اس کے حامیوں پر برتری حاصل تھی اور وہ اس پر نگاہ رکھنے اور اپنے خلاف اٹھنے والی اس شورش کا سدباب کرنے میں ان کے تمام وسائل ناکافی رہے۔ اس طرح مامون نے ان لوگوں کا راستا کاٹ دیا جو عباسی حکومت سے مطمئن نہ تھے اور وہ داخلی خطرہ اس گھرانے کے حکمرانوں کے دل و دماغ پر سوار تھا۔ اب ہلکا معلوم ہونے لگا۔ پس عین ممکن ہے کہ ان تمام وجوہ کے پیش نظر امین اور اس کے ارکان دولت امام علی رضاؑ اور آپ کے لواحقین پر سختی کرنے سے باز رہے، جیسے اس کے اسلاف دیگر ائمہؑ پر کر رہے تھے۔ چنانچہ آپ کو قدرے اطمینان کا زمانہ مل گیا جس میں مسلمانوں میں عقائد کے اختلاف اور مذہبی جھگڑوں کی فضا میں تبلیغ ہدایت اور اصول اسلام کی اشاعت میں مصروف رہے۔ اس امر کو ہم اپنے آئندہ بیانات میں پیش کریں گے۔

امام علی رضاؑ اور خلیفہ مامون

امام علی رضاؑ کی حیات طیبہ مامون کے زمانہ میں اختتام کو پہنچی۔ اس کی خلافت میں پانچ یا زیادہ سے زیادہ آٹھ سال تک زندہ رہے۔ آپ کی زندگی کا وہ زمانہ جو آپ نے مامون کو خلافت منتقل ہونے سے پہلے امین کے عہد میں گزارا، اپنے والد بزرگوار کے بعد غالباً وہ سب سے زیادہ پرسکون زمانہ تھا جس میں آپ نے مختلف موضوعات پر سب سے زیادہ احادیث بیان فرمائی ہیں۔

باوجودیکہ مامون اپنی شیعیت اور علویوں پر اپنی مہربانی کا اظہار کرتا تھا۔ ان سخت رویوں سے نفرت کا اظہار کرتا تھا جو اس کے پیشرو اختیار کرتے رہے تھے اور ایسا طرز عمل اختیار کیا کرتا تھا کہ جس سے اس کے علویوں سے لگاؤ اور عام اعتدال کا پتا چلتا تھا۔ نیز اس نے امام علی رضاؑ کو اپنے پاس بلایا اور ان پر اپنی اور آل علیؑ سے محبت ظاہر کر کے آپ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ پھر بھی آپ اپنی زندگی کے اس زمانہ کو جو آپ نے خلیفہ مامون کے عہد میں بسر کیا تھا، اپنے والد بزرگوار کے بعد سے گزرنے والے ادوار میں سب سے بُرا دور تصور کرتے تھے۔ گویا آپ نے دیکھ لیا تھا کہ مامون کے آپ کو خراسان بلا لینے اور آپ سے اظہار الفت کرنے میں آپ کی زندگی کے لیے کیا خطرے مضمر ہیں۔ اس بات کا اشارہ شیخ صدوق کی کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں سجستانی کی روایت میں ملتا ہے کہ انھوں نے کہا: جب امام علی رضاؑ کو خراسان لے جانے والا قاصد مدینہ پہنچا تو میں بھی وہیں موجود تھا۔ پس آپ رسول اللہ سے رخصت ہونے کے لیے مسجد نبویؐ میں سے ہو کر روضہ پاک پر تشریف لے گئے۔ آپ وہاں کھڑے تھے اور آہ و فغاں میں مشغول تھے۔ اس دوران میں کبھی آپ باہر آجاتے اور کبھی اندر چلے جاتے اور آپ نے کئی بار ایسا کیا جبکہ آپ کے گریہ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ تب میں نے آگے بڑھ کر آپ کو سلام کیا اور آپ کے خراسان جانے پر تہنیت پیش کی۔ آپ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: مجھے میرے حال پر ہی رہنے دو اس لیے کہ اب اپنے نانا کے روضہ سے نکالا جا رہا ہوں اور پھر پردیس میں مروں گا۔

خراسان میں قیام کے دوران آپ اکثر اوقات غم سے نڈھال رہتے اور اپنی موت کی تمنا فرمایا کرتے تھے تاکہ ایسی رنج بھری زندگی سے نجات پا جائیں کہ جس میں اہل حکومت اپنی مصلحتوں اور مفادات کے لیے آپ کی ذات سے فائدہ اٹھاتے تھے چنانچہ عیون اخبار الرضاؑ میں یاسر (ایک غلام) سے روایت ہے کہ: جب آپ جمعہ کے روز مسجد جامع سے واپس تشریف لاتے تو فرمایا کرتے: اے اللہ! اگر موجودہ صورت حال سے میری نجات کا ذریعہ موت ہی ہے تو پھر میری موت میں تعجیل فرما دے۔ چنانچہ اس تمام عرصے میں آپ برابر غم زدہ اور بے چین رہے۔ یہاں تک کہ آپ درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

امام علی رضاؑ کی زندگی کے اس پہلو پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان

اسباب کی طرف بھی اشارہ کرتا چلوں، جنھوں نے مامون کو اس امر پر قائل کیا کہ وہ امامؑ کو اپنے پاس بلائے اور ان کو اپنا ولی عہد بن جانے پر مجبور کرے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ ہارون نے اپنے بعد اپنے بیٹے امین کو اس کے بعد مامون کو اور اس کے بعد اپنے بیٹے قاسم کو اپنا ولی عہد بنایا اور ان میں علاقوں کی تقسیم بھی خود ہی کردی تھی۔ چنانچہ امین کو عراق، شام اور مغرب مامون کو ہمدان سے ایران اور خراسان تک اور قاسم کو مملکت کے باقیماندہ علاقے دیدیے تھے لیکن اپنے باپ کے مرنے سے پہلے ہی امین اور مامون دونوں بھائیوں میں اختلافات رونما ہونے لگے تھے۔ بعض مؤرخین اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ خلیفہ ہارون نے مامون کو خراسان اور اسکے اطراف میں وسیع اور زرخیز علاقے دیے اور اس کے لیے اس علاقہ کے اراکین دولت اور فوجی جرنیلوں سے بیعت لی اور اس کے علاوہ اس کو اور بھی مال و دولت بخش دیا تھا۔ چنانچہ اپنے باپ ہارون کے اس عمل کو امین نے اس کی طرف سے اس لیے اپنی ہتک خیال کیا کہ وہ ولی عہد اوّل تھا اور اس لحاظ سے ضروری تھا کہ حکومت کی اس قسم کی مراعات اس کے لیے ہوں۔

بعد میں دونوں بھائیوں میں اختلاف کی یہ خلیج ان افراد نے اور بھی بڑھادی جو امین کو گھیرے رہتے تھے۔ چنانچہ اس کے کان بھر بھر کر بالآخر اس کو اپنے باپ ہارون کی طرف سے کیے ہوئے ولی عہدی کے فیصلے کو منسوخ کردینے پر آمادہ کرلیا۔ تب امین نے اپنے بھائی مامون کو ولی عہدی سے معزول کرکے اس کی جگہ اپنے بیٹے موسیٰ کے ولی عہد مقرر کیے جانے کا اعلان کردیا اور اس کے بارے میں پوری مملکت میں احکام بھیج دیے۔

امین کے اس فریب کارانہ عمل سے مامون کے دل پر بہت برے اثرات پڑے اور اس نے دارالحکومت بغداد پر قبضہ کرنے کے لیے ایک مضبوط لشکر تیار کیا۔ ادھر امین نے بھی اپنے بھائی مامون کے زیر تسلط علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایک بڑا لشکر تیار کرلیا۔ چنانچہ یہ دونوں لشکر متعدد بار آپس میں ٹکرائے اور ان میں سخت معرکے ہوئے، جن کے نتیجہ میں مامون کو اپنے بھائی پر فتح حاصل ہوئی اور حکومت کے تمام علاقے اس کے قبضے میں آگئے۔ اب اس نے بغداد کے بجائے مرو کو اپنی مملکت کا دارالحکومت قرار دیدیا جس کو اس کے جرنیلوں اور دوسرے حامیوں نے اس لیے پسند کیا کہ اس شہر کے لوگوں نے سخت ترین حالات میں مامون سے وفاداری قائم رکھی، اس کی مدد کی اور اسکو کامیاب بنایا تھا۔

اپنے بھائی امین کے قتل ہو جانے اور حکومت پر اچھی طرح جم جانے کے بعد مامون کو بھی اسی طریقہ پر عمل کرنا تھا جس پر اس کے سبھی پیش رو عمل کرتے آئے تھے۔ وہ یہ کہ وہ بھی اپنے بعد کے لیے کسی کو اپنا ولی عہد مقرر کر دے اور کسی ایسے فرد کا انتخاب کرے جس کو وہ مناسب خیال کرتا ہو۔ چنانچہ اس نے اپنی ان مصلحتوں کے تحت کہ وہ حالات و واقعات بھی ان کی تائید کرتے تھے جن میں وہ اس وقت گھرا ہوا تھا۔ اس نے ولی عہدی کے لیے امام علی رضاؑ کو منتخب کیا۔

شیخ صدوق نے راویوں کی ایک جماعت سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا:
جب مخالفت بالکل ختم ہو گئی اور مامون کی حکومت کے حالات درست ہو گئے تو اس نے اپنے ایک خط میں امام علی رضاؑ سے درخواست کی کہ آپ خراسان آجائیں۔ امامؑ نے متعدد وجوہ کی بنا پر اس بارے میں معذرت کی لیکن مامون آپ کو بار بار خط لکھتا اور وہی مطالبہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ یہ سمجھ گئے کہ ــــــ اب معاملہ سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ آپ مدینہ سے خراسان کو چل پڑے جبکہ آپ کے فرزند محمد جوادؑ کی عمر ابھی نو سال کی تھی۔

تاریخ طبری میں ۲۰۰ھ کے واقعات کے بیان میں آیا ہے کہ اس سال مامون نے فضل بن سہل کے بچا رجاء بن ابی ضحاک اور رفرناس (غلام) کو مدینہ بھیجا تاکہ وہ امام علیؑ بن موسیٰؑ اور محمد بن جعفرؑ کو چلنے پر آمادہ کریں۔ قبل ازیں محمد بن جعفرؑ نے مکہ میں مامون کے خلاف خروج کیا اور امیرالمومنین کا لقب اختیار کر لیا تھا لیکن مامون کا فوجی افسر جلودی ان پر غالب آگیا اور ان کو بغداد لے جا کر حسن بن ربیع کے حوالے کر دیا تھا۔ پھر حسن بن ربیع نے ان کو رجاء بن ابی ضحاک کے پاس بھیج دیا اور اس نے امام علی رضاؑ کے ساتھ ان محمدؑ بن جعفرؑ کو بھی مامون کے پاس پہنچا دیا تھا۔

شیخ صدوق نے عیون اخبار الرضاؑ میں لکھا ہے کہ رجاء بن ابی ضحاک کہا کرتا تھا:
خلیفہ مامون نے مجھ کو مدینہ بھیجا تاکہ میں امام علی رضاؑ کو خراسان چلنے پر آمادہ کروں۔ تب اس نے مجھ کو حکم دیا کہ میں آپ کو قم کے راستا سے نہیں، بصرہ، اہواز اور فارس کے راستا سے لاؤں۔ کلینی کی روایت بھی یہی بتلاتی ہے کہ اس نے ان لوگوں کو حکم دیا تھا کہ وہ آپ کو جبل اور قم کے راستا سے نہ لائیں بلکہ بصرہ، اہواز اور فارس کا راستا اختیار کریں۔

مامون نے امام علی رضاؑ کو خراسان بلایا اور پھر اصرار کر کے ان کو ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور کیا تو اس کا سبب کیا تھا؟ اس بارے میں کہا گیا ہے کہ ہارون نے اپنے بیٹے امینؑ اس کے بعد مامون اور اس کے بعد اپنے بیٹے قاسم کے حق میں بیعت لی تھی اور اس کے متعلق ایک دستاویز خانہ کعبہ میں رکھ دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ملک کے مختلف صوبے اور ان کی آمدنی بھی ان میں تقسیم کر دی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لیکن جب امین نے اپنے باپ کے پیمان کو توڑ دیا اور اپنے بھائی مامون کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے بیٹے موسیٰ کو ولی عہد بنا دیا تو دونوں کے مابین جنگ کی نوبت آ گئی۔ تب مامون نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ اس کو امین کے مقابلے پر کامیاب کر دے گا تو وہ خلافت کو آلِ ابوطالب کے کسی بہترین فرد کے سپرد کر دے گا۔ چنانچہ جب وہ پایۂ تخت بغداد اور اور مملکت کے تمام علاقوں پر قابض ہو گیا تو اس نے اپنی وہ نذر پوری کرنے کے لیے امام علی رضاؑ کو خراسان بلایا۔

شیخ صدوق نے عیون اخبار الرضاؑ میں اسی روایت کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے ریان بن صلت سے روایت کی ہے کہ امام علی رضاؑ کی بیعت کیے جانے کا بہت چرچا ہوا اور لوگوں نے اس کو فضل بن سہل کی کارگزاری سے منسوب کر دیا۔ ریان بن صلت مزید کہتے ہیں کہ پھر مامون نے مجھ کو بلایا اور کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام علی رضاؑ کی بیعت فضل بن سہل کی تدبیر سے ہوئی ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں! لوگوں میں تو یہی بات مشہور ہو رہی ہے۔ مامون نے کہا: وائے ہو تجھ پر اے ریان! وہ خلیفہ کہ جس کو ساری رعایا مانتی ہو اور ملک کے تمام علاقے اس کے زیر نگیں ہوں، کیا کسی کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ کہ وہ اس سے یہ کہے کہ آپ خلافت سے علیحدہ ہو جائیے اور یہ ایک دوسرے شخص کو دیدیجیے۔ میں نے کہا: بخدا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ تب مامون نے کہا: اب سنو! میں تم کو اس کا سبب بتاتا ہوں کہ جب میرے بھائی امین نے مجھے اپنے پاس حاضر ہونیکا حکم دیا اور میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے علی بن موسیٰ بن ہامان کو یہ حکم دیا کہ وہ مجھ کو ہتھکڑیاں لگا کر اور میری گردن میں طوق ڈال کر قید میں ڈال دے۔ اس پر میں نے ہرثمہ بن اعین کو سجستان اور کرمان روانہ کیا لیکن اسکو شکست ہوئی۔ ادھر مالک تخت امین نے حملہ کر کے خراسان کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور یہ سب کچھ ایک ہی ہفتہ میں ہو گیا۔ اب میرے پاس نہ

سپاہ کی کثرت تھی اور نہ دولت کہ جسکا سہارا لے لیتا اسکے ساتھ ساتھ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ میرے جرنیلوں اور سپاہیوں میں شکست اور کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے ارادہ کیا کہ اونٹ کی طرح بادشاہ کے ہاتھ میں اپنی مہار دیدوں کیونکہ میرا خیال تھا کہ اب امین کسی کافر شخص کو دولت کا لالچ دے گا اور پھر وہ مجھ کو اس کے حوالہ کر دیگا۔ پس میرے لیے اس کے سوا کوئی اور صورت نہ تھی کہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں پر توبہ کرتے ہوئے ان حالات میں اسی سے مدد اور پناہ طلب کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے ایک مکان خالی کرایا۔ نہا دھو کر سفید اور پاکیزہ کپڑے پہنے اور چار رکعت نماز پڑھی، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور سچی نیت سے اس بات کا عہد کیا کہ اگر خدا امین کے مقابلہ میں کامیاب کرے اور اس حکومت کا میرے حق میں فیصلہ کر دے تو میں یہ خلافت اسی کے سپرد کر دوں گا جس کے لیے اللہ نے یہ مقرر کی ہے۔ اس عہد و پیمان کے بعد سے میرے بازو مضبوط اور حالات سازگار ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ میرے بھائی کا وہ حال ہوا جو ہوا۔ اب میں نے چاہا کہ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کروں، تو میں نے اس معاملہ میں کسی کو امام علی الرضاؑ سے زیادہ حقدار نہ پایا۔ چنانچہ میں نے خلافت ان کے سپرد کی ہے، لیکن انہوں نے اس کو صرف اسی حد تک قبول کیا ہے کہ جو تم کو معلوم ہے۔

مرآۃ الجنان یافعی میں ہے کہ مامون نے آپ کے حق میں اس لیے بیعت لی تھی کہ اس کو ہاشمیوں میں آپ سے بلند مرتبہ کوئی اور نظر نہ آیا۔ یافعی مزید بیان کرتے ہیں کہ جب مامون خراسان کے شہر مرو میں تھا تو اس نے عباس بن عبدالمطلب کی نسل کے مردوں اور عورتوں کو شمار کرایا تو وہ چھوٹے بڑے ملا کر سب ۳۳ ہزار افراد نکلے۔ پھر اس نے امام ابوالحسن علی بن موسیٰؑ کو بلایا اور آپ کو نہایت ہی عزت و احترام کے ساتھ بٹھایا۔ اس کے بعد اپنے خاص خاص آدمیوں کو بلوایا اور ان سے کہا: میں نے عباس بن عبدالمطلب اور علی بن ابی طالبؑ کی اولاد میں بہت تلاش اور جستجو کی ہے اور کسی کو امام علی الرضاؑ سے افضل اور خلافت کا زیادہ حقدار نہ پایا۔ اس گفتگو کے ساتھ ہی اس نے لوگوں سے آپ کی ولی عہدی پر بیعت لے لی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کا سبب یہ تھا کہ فضل بن سہل خلیفہ مامون پر حاوی ہو گیا تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ خلافت ایک گھرانہ سے دوسرے گھرانہ میں

گردش کرتی رہے۔ جیساکہ ابومسلم خراسانی نے اسکو بنی امیہ سے بنی ہاشم کی طرف منتقل کردیا تھا۔ حسین بن احمد سلامی کی یہ روایت شیخ صدوق نے اپنی دونوں کتابوں یعنی عیون اخبار الرضاؑ اور اخبار خراسان میں نقل کی ہے۔

اخبار خراسان ہی میں ہے کہ خلیفہ مامون کے وزیر اور مدارالمہام فضل بن سہل کا لقب ذوالریاستین تھا اور وہ اپنی اصل کے اعتبار سے مجوسی تھا۔ وہ یحییٰ بن خالد برمکی کے ہاتھ پر اسلام لایا اور اسی کی صحبت میں رہا۔ ایک دوسرے قول کے مطابق اس کا باپ سہل، مہدی عباسی کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا اور یحییٰ بن خالد برمکی نے فضل بن سہل کو مامون کی ملازمت میں لیکر اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ بعد میں وہ مامون پر حاوی ہو گیا۔ پھر تمام امور کو اپنی مرضی سے انجام دینے لگا۔ اس کا لقب ذوالریاستین اس لیے ہو گیا تھا کہ وہ بیک وقت وزارت اور لشکر کی سپہ سالاری کے دونوں عہدے سنبھالے ہوئے تھا۔

راوی مزید کہتا ہے کہ جب مامون نے خلافت حاصل کرلی اور اسکے معاملات درست ہوگئے تو ایک روز فضل بن سہل نے اپنے ایک ہم نشین سے کہا جو کچھ میں نے کیا ہے وہ اسکے مقابلہ میں کیسا ہے جو ابومسلم خراسانی کیا کرتا تھا؟ اس شخص نے کہا: ابومسلم نے خلافت کو ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے کیطرف پھیر دیا تھا جبکہ تم نے اس کو صرف دو بھائیوں ہی کے مابین ادل بدل کیا ہے اور ان دونوں کا فرق بھی تمہیں معلوم ہے۔ اس پر فضل بولا: میں بھی اس کو ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ کی طرف پلٹا دوں گا۔ پس اس کے بعد اس نے مامون کو مشورہ دیا کہ وہ امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کو اپنا ولی عہد بنا دے۔ چنانچہ اس کو یہ مشورہ بڑا پسند آیا اور اس نے اپنے بھائی مؤتمن کی ولی عہدی منسوخ کردی اور آپ کے لیے ولی عہدی کی حیثیت سے بیعت لے لی۔

بغداد میں جب عباسیوں کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے اس کا بُرا مانا اور انہوں نے خلافت کے لیے ابراہیم بن مہدی کی بیعت کرلی۔ پھر جب مامون کو ابراہیم کی بیعت خلافت کے متعلق معلوم ہوا تو اس کو فضل بن سہل کی غلط روی کا اندازہ ہو گیا۔ تب وہ مرو سے عراق روانہ ہوا۔ راستے ہی میں فضل بن سہل کو فریب کاری سے قتل کروا دیا اور امام علیؑ بن موسیٰؑ کو زہر دیدیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مامون نے جو امام علی رضاؑ کو خراسان بلا کر اپنا ولی عہد قرار دیا،

اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اہل بیت کرام ؑ سے وابستگی رکھتا تھا جو اکثر موقعوں پر ظاہر ہوتی رہی۔ مثلاً یہ کہ وہ امیر المومنین امام علی ؑ کو تمام صحابہ سے افضل سمجھتا تھا۔ خلافت کے لیے آپکے سب سے زیادہ حقدار ہونے کا قائل تھا اور اصول اسلام میں وہ بیشتر مسائل میں اہل بیت ؑ کی رائے کو مانتا تھا۔ جیسے اس نے خلق قرآن کے مسئلہ پر محدثین اور فقہاء کے مقابل سخت موقف اختیار کیا تھا۔ نیز وہ نکاح متعہ کو جائز قرار دیتا اور خلیفہ دوم عمر بن خطاب پر سخت نکتہ چینی کرتا تھا جنھوں نے متعہ کو حرام قرار دیا تھا۔ مزید برآں معاویہ کو بُرا کہنے اور اس کو ایک مستقل رسم قرار دینا اور اس کو بھلائی سے یاد کرنے والے کو سزا کی دھمکی دینا، علویوں کے ساتھ نرم دلانہ سلوک اور ان میں سے حکومت کے خلاف خروج کرنے والوں کو معاف کر دینا، فدک ان کو واپس دیدینا اور پھر اس کا یہ اعتراف کہ اس کے پیشروؤں نے علویوں کے ساتھ جو کچھ بھی کیا وہ غلط تھا۔ جیسا کہ اس نے بنی ہاشم سے کہا کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بنی امیہ نے تو علویوں میں سے صرف اس شخص کو قتل کیا کہ جس نے تلوار اٹھائی تھی لیکن ہم بنی عباس نے ان کو کچھ دیکھے سنے بغیر ہی قتل کیا ہے۔ چنانچہ ان بڑے بڑے ہاشمیوں سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے بدلے میں مارے گئے۔ اسی طرح ان مقتولوں سے بھی پوچھا جائے گا جن کو دجلہ و فرات میں ڈبو دیا گیا اور ان کو بھی جن کو بغداد اور کوفہ میں زندہ دفن کر دیا گیا۔

ہم امام ابوالحسن موسیٰ ؑ بن جعفر ؑ کی سیرت کے ذیل میں سفیان بن نزار کی وہ روایت بیان کر چکے ہیں جس میں یہ ذکر تھا کہ مامون کہا کرتا تھا: مجھ کو شیعیت سے میرے باپ ہارون نے روشناس کرایا تھا۔ پھر اس کا یہ بیان کہ جب امام موسیٰ کاظم ؑ میرے والد ہارون کے پاس تشریف لائے تو انھوں نے آپ کے ساتھ انتہائی عزت کا سلوک کیا اور آپ کی ایسی تکریم کی جیسی اس سے پہلے کبھی کسی کی نہ کی تھی۔ چنانچہ جب امام وہاں سے تشریف لے گئے اور میرے والد تنہائی میں تھے تو میں نے ان سے دریافت کیا: اے امیر المومنین! یہ کون شخص تھے جن کی آپ نے اس قدر عزت و توقیر کی ہے کہ آپ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کا استقبال کیا، ان کو صدر مجلس میں بٹھایا، خود ان کے سامنے بیٹھے اور ہم کو ان کی رکاب تھامنے کا حکم دیا۔ تب ہارون نے کہا: یہ اللہ کی مخلوق پر اس کی حجت، اس کے بندوں میں اس کے خلیفہ اور لوگوں کے امام ؑ ہیں۔ میں نے کہا: اے امیر المومنین! کیا یہ تمام صفات آپ میں

نہیں ہیں ؟ انھوں نے کہا: میں اپنے قہر و غلبہ کی وجہ سے لوگوں کا ظاہری امام ہوں اور موسیٰ بن جعفرؑ امام برحق ہیں۔ اے بیٹے! بخدا کہ وہ رسول اللہؐ کی نیابت کے مجھ سے اور ساری مخلوق سے زیادہ حقدار ہیں۔ تب میں نے کہا: جب آپ یہ سب کچھ جانتے ہیں تو پھر حکومت چھوڑیے اور اسے اس کے حقداروں کے سپرد کر دیجیے۔ انھوں نے کہا: اے بیٹے! حکومت میں کوئی رشتہ و تعلق راہ نہیں پاتا، اس کے لیے اگر تم بھی مجھ سے جھگڑا کرو گے تو میں تمہاری آنکھیں نکلوا دوں گا۔ ایسی ہی اور بھی روایتیں ہیں جن سے مامون کی علیؑ اور ان کی اولاد سے محبت اور اسکی شیعیت ظاہر ہوتی ہے۔ مامون کی شیعیت کے بارے میں جو روایات ہیں اگر وہ صحیح ہوں تو یہ امر بعید بھی نہیں ہے کیونکہ اسکے نظریہ کے مطابق اسکی شیعیت تغیر حالات کی ایسی کوششوں کا سبب نہیں بن سکتی تھی جن کا مقصد خود اس کو خلافت سے معزول کرنا یا امام علی رضاؑ کو ولیعہد بنانا ہو۔ پھر اس مفروضہ شیعیت میں وہ مثالی زندگی یا ترک لذّت کے کسی بڑے درجہ پر نہیں تھا کہ اپنی وسیع و عریض سلطنت سے اس کے حقداروں کی خاطر دست بردار ہو جائے اور اس کو ایک گھرانہ سے دوسرے گھرانہ میں منتقل کر دے جبکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس عمل سے ایسے ایسے خطرے سر اٹھائیں گے کہ جن کا مقابلہ کرنا اس کے یا کسی اور کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ ابھی ماضی قریب ہی میں وہ اس سلطنت کی خاطر اپنے بھائی کو اور اسکے ہزارہا ساتھیوں کو مار کاٹ چکا تھا۔ نیز بقول اس کے اس نے اپنے باپ کو یہ کہتے سنا تھا کہ "حکومت میں کوئی رشتہ و تعلق راہ نہیں پاتا۔ اس کے لیے اگر تم بھی مجھ سے جھگڑا کرو گے تو میں تمہاری آنکھیں نکلوا دوں گا۔" اسی اصول کی بنا پر وہ حکومت کی خاطر اپنے بھائی کے قتل کا مرتکب ہوا تھا۔

مختصر یہ کہ مامون کی یہ مفروضہ شیعیت اگر واقعاً صحیح بھی ہوتی تو بھی وہ اس امر کا سبب نہیں بن سکتی تھی کہ وہ قبول خلافت یا ولی عہدی کی صورت میں امام علی رضاؑ کو حکومت میں شریک رکھنے پر اصرار کرے۔

اسی طرح شیخ صدوق کا یہ قول کہ مامون کی طرف سے امامؑ کو ولی عہد بنانے کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی اس نذر کو پورا کرنا چاہتا تھا جو اس نے اپنے بھائی امین سے جنگ کے دوران مانی تھی کہ اگر اللہ نے اس کو فتحمند کر دیا تو وہ یہ خلافت آل ابوطالبؑ میں سے افضل ترین فرد کے سپرد کر دے گا۔ یہ بیان ریان بن صلت کی اس روایت سے غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ ولی عہدی

کے ضمن میں جو کچھ ہوا وہ فضل بن سہل کی تدبیر کا نتیجہ تھا۔ مزید یہ کہ ایک نذر کا پورا کرنا کسی شخص کو خود اپنے ہی خلاف عمل کرنے پر آمادہ نہیں کرتا، پس یہ قول بعید از قیاس اور انتہائی تعجب خیز بھی ہے کیونکہ مامون اپنے دین کے معاملہ میں ایسا پختہ نہیں تھا کہ اپنے مخالفوں کے حق میں صرف اس لیے دستبردار ہو جاتا کہ اس نے اپنے بھائی سے ہونے والی جنگ میں کامیاب ہو جانے کی صورت میں اس کو اپنے اوپر لازم قرار دے لیا تھا۔ کیا ایک ایسا شخص اپنی نذر کو اتنی اہمیت دے سکتا ہے؟ جس نے دسیوں ہزار صالح افراد کو محض ملک اور حکومت کی خاطر موت کے گھاٹ اتارا ہو اور پھر زندگی بھر اپنے باپ کا یہ قول دہراتا رہا ہو کہ "حکومت میں کوئی رشتہ و تعلق راہ نہیں پاتا"، اس کے لیے اگر تم بھی مجھ سے جھگڑا کروگے تو میں تمہاری آنکھیں نکلوا دونگا۔" اسی طرح ریان بن صلت وغیرہ کے ساتھ اس کی گفتگو اگر صحیح بھی ہو تو وہ عوام اور شیعوں کو اپنے اس ارادہ سے بے خبر رکھنے کے لیے تھی کہ اس نے امام علی رضاؑ کو ولی عہدی قبول کرنے پر کس لیے مجبور کیا تھا۔

اسی طرح علل الشرائع کا یہ بیان بھی حیرت خیز ہے کہ مامون نے امام رضاؑ کو ولی عہد قرار دینے کا ارادہ اس لیے کیا تھا تاکہ وہ عوام پر یہ ظاہر کردے کہ یہ ائمۂ اہلبیت صرف ظاہر میں زہد اور ترک دنیا کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ حکمرانوں پر یہ الزام بھی رکھتے ہیں کہ وہ ان کو حکومت کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ چنانچہ اس نے علی رضاؑ کو حکومت میں اس لیے شریک کرنا چاہا کہ وہ ان لوگوں پر ان کی اصلیت کو آشکارا کردے جو ان کی پاک نفسی اور عظمت کے قائل تھے۔

اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ دوسروں سے زیادہ خود مامون ہی ائمہؑ کی حقیقت کو جانتا تھا اس لیے کہ وہ ان کو قریب سے زیادہ دیکھے ہوئے تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ ان کی وہ حیثیت جو لوگوں کے دلوں میں قائم تھی اس پر ایسے کسی اقدام سے کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ حکومت کا سربراہ ہونا زہد و تقویٰ اختیار کرنے کے منافی نہیں ہے جبکہ وہ حق کے قائم کرنے مظلوموں کو انصاف دلانے اور ایک صحت مند معاشرہ قائم کرنے کے لیے حاصل کی جائے۔ نیز اس کی قوت کو، اس کی بنیادی حیثیت کو اور اس کے نظام کو اسلام کے قوانین، تعلیمات اور آداب سے سہارا ملتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین امام علیؑ نے حکومت کی اور اپنے زمانہ خلافت

میں زہد کے اس درجہ سے بھی بڑھے ہوئے تھے جو حکومت لینے سے پہلے تھا کیونکہ ملک کے تمام صوبوں کی آمدنی پر تصرف ہونے کے باوجود آپ نے جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر کبھی نہ کھائی۔ جیسا کہ آپ فرمایا کرتے : کیا میں اس پر مطمئن ہو جاؤں کہ مجھ کو امیر المومنین کہا جاتا ہے اور میں روکھی سوکھی روٹی اور زندگی کی دشواریوں میں عوام کے شریک نہ رہوں ؟

علاوہ بریں ولی عہدی کے سلسلے میں جو کچھ بھی ہوا ' امام علی رضاؑ اس کو ناپسند فرماتے تھے اور آپ کو اسے قبول کرنے پر اس قدر مجبور کیا گیا کہ بالآخر قتل کی دھمکی بھی دیگئی۔ نیز وہ بیشتر روایات کہ جو ان مراحل کو بیان کرتی ہیں جن سے آپ کو گزرنا پڑا تھا۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام الناس بھی اس صورت حال سے واقف تھے۔

آپ ولی عہدی سے اس لیے متنفر تھے کہ آپ جانتے تھے ' مامون علویوں کے ساتھ اپنی جو محبت ' دوستی اور مہربانی ظاہر کرتا تھا وہ اس میں نیک نیت نہیں تھا۔ بلکہ وہ اپنے خونی چہرے پر یہ نقاب اس لیے ڈالتا تھا تاکہ اس سے وہ نتائج حاصل کرسکے جو اس کے اور اس کے گھرانہ کے حق میں مفید ہوں اور اس کی مملکت میں امن اور سکون کی فضا قائم ہو جائے۔ جیسا کہ ان حالات کے مطالعہ سے عیاں ہو جاتا ہے جو تاریخ کے اس دور میں اس کی حکومت کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔

یہ بات عقل کے لیے بھی ناقابل قبول ہے کہ وہ خلافت یا ولی عہدی قبول کرنے کے لیے امام علی رضاؑ سے اصرار کرنے پر پُرخلوص ہو۔ دوسری طرف خود امامؑ کسی سے خلافت یا ولی عہدی طلب کرنے کو ناپسند فرماتے اور اس معاملہ سے احتراز کرتے تھے کیونکہ خلافت ایک ایسا حق تھا جو اللہ نے آپ کے اور دوسرے ائمہ اہل بیتؑ کے لیے مخصوص کر دیا تھا تاکہ وہ حق کو قائم کریں ' عدل کو پھیلائیں اور ان بدعتوں کا مقابلہ کریں جو اس زمانہ میں یا اس سے پہلے اسلام کی تعلیمات ' معاشرت اور اخلاق کے خلاف سر اٹھا رہی تھیں۔ اس بنا پر ائمہ اہلبیت کی نظر میں وہ تمام افراد کہ جنہوں نے اس وقت یا اس سے پہلے خلافت پر قبضہ جمایا تھا ' وہ غاصب اور اللہ کے نازل کیے ہوئے پیغام ہدایت کے مخالف تھے۔

امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کے سیاسی اسباب

بنی عباس میں ہونے والے فرمانرواؤں میں مامون کی

شخصیت علمی اور انتظامی لحاظ سے بہت قوی تھی۔ اس کا بھائی امین جو حکومت کے معاملہ میں اس کا پہلا حریف تھا وہ کچھ بھی صلاحیت نہ رکھتا تھا لیکن ہارون جو ان دونوں میں اس فرق سے واقف تھا، پھر بھی اس نے امین کو مامون پر صرف اس لیے مقدم کیا کہ وہ محل کی صاحبِ فضیلت خاتون زبیدہ کا بیٹا تھا جو جعفر بن منصور دوانیقی کی دختر تھی۔ مگر ہارون ابھی زندہ ہی تھا کہ ان دونوں بھائیوں میں اختلاف کے اسباب پیدا ہو گئے۔ دونوں کے مابین کدورت نے جنم لے لیا اور معاملات پیچیدہ ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ عناد کھل کر سامنے آگیا اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ان دونوں میں وہ خونیں معرکہ ہوا کہ جس میں خود امین قتل ہو گیا اور ہزاروں فوجی موت کے گھاٹ اتر گئے اور حکومت مامون کو حاصل ہو گئی۔

اس کے بعد جب مامون نے یہ محسوس کیا کہ بغداد میں ان بیشتر عباسیوں میں انتقام کا جوش پھیلا ہوا ہے جنہوں نے اس کے خلاف امین کا ساتھ دیا تھا ادھر آئے دن علوی جنگ آزما حکومت کے خلاف سر اٹھاتے رہتے اور کوفہ کے شیعہ بھی ہر خروج کرنے والے کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ اسی طرح دوسرے علاقوں کے شیعہ بھی عباسیوں سے ان کے سلوک کی وجہ سے نالاں تھے جو انہوں نے علویوں کے ساتھ کیا تھا۔ اس لیے وہ ان کی مخالفت میں اٹھنے والی تمام تحریکوں کی حمایت کرتے تھے۔ خاص کر خراسان کے شیعہ کہ جنہوں نے مامون کو اس کے بھائی کے مقابلے میں فتح دلانے اور اس کی حکومت قائم کرانے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ چنانچہ جب مامون نے اقتدار سنبھالا تو اس کی حکومت کو ہر طرف سے خطروں نے دبا رکھا تھا۔ چنانچہ کوفہ اور اس کے اطراف میں سری بن منصور شیبانی معروف بہ ابو السرّایا نے محمد بن ابراہیم بن اسمٰعیل بن حسن مثنٰی بن حسنؑ بن علی ابن ابی طالبؑ کے حق میں خروج کیا اور عوام نے ان کی بیعت کر لی۔ بصرہ اور اس کے اطراف میں علی بن محمد بن جعفرؑ بن علیؑ بن حسینؑ اور زید النار بن موسٰیؑ بن جعفرؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں ان دونوں کا بہت زور قائم ہو گیا۔ اسی طرح یمن میں ابراہیم بن موسٰیؑ اور مدینہ میں حسن افطس بن حسین بن علیؑ بن حسینؑ نے ——————

جب ابن طباطبا کے حق میں دعوت دینا شروع کی اور جب ابن طباطبا قتل ہو گئے تو وہ خود اپنے حق میں دعوت دینے لگے۔ پھر حج کے دنوں میں وہ یمن سے مکہ جا پہنچے۔ تب داؤد بن عیسٰی ہاشمی ان حسن افطس سے ڈر کر مکہ سے بھاگ نکلا۔ چنانچہ انھوں نے تمام آدمیوں کو نماز پڑھائی اور

سب نے ان کے ساتھ حج ادا کیا۔ تاہم ان کے بارے میں بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ انہوں نے خانہ کعبہ کی پوشش کھینچ اتاری تھی۔ غرضیکہ مملکت کے بیشتر علاقوں میں شورشیں برپا ہوتی رہیں اور ہزاروں افراد عباسیوں کے خلاف اٹھنے والے ہر شخص کا ساتھ دینے کے لیے میدان میں آجاتے تھے جنہوں نے اپنے تخت ہائے حکومت نیکوکار اور پارسا افراد کی لاشوں پر قائم کیے تھے اور سارے ملک کی دولت پر قبضہ جما رکھا تھا۔

مقاتل الطالبیین میں ہے کہ ابوالسّرایا اور دوسرے علوی داعیوں کی ان لڑائیوں کے بعد جب لوگوں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ان میں دو لاکھ سے اوپر افراد قتل ہو گئے تھے۔ یہ تعداد صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس وقت مامون کی حکومت چاروں طرف سے خطروں میں گھری ہوئی تھی اور یہ تمام فوجی مہمیں علویوں کی قیادت میں چل رہی تھیں۔

مامون نے اس موقع کی نزاکت اور خطرے کو جلد ہی محسوس کر لیا اور عام شیعی اور علوی لوگوں کے دکھاوے کے لیے اس کو اس سے زیادہ کارآمد کوئی طریقہ نظر نہیں آیا کہ وہ امام رضاؑ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونے کی خواہش ظاہر کرے، حالانکہ وہ خوب جانتا تھا کہ امامؑ بڑی سختی کے ساتھ اس سے دُور رہنا چاہیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ بالآخر اس نے آپکو مجبور کر لیا کہ آپ اس کے ولی عہد بن جائیں اور اس کے ساتھ اسی شہر میں قیام فرمائیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی چابکدستی سے آپ سے اور آپ کے آباء کرامؑ سے محبت کا دعویٰ کیا اور اپنے تمام گورنروں کو یہ حکم بھیجدیا کہ منبروں پر خطبوں میں اور دوسرے تمام مناسب موقعوں پر امام علی رضاؑ کے حق میں دعوت دی جائے۔ نیز اپنے اس فریب کو ہر طرف پھیلانے کے لیے تمام ضروری کارروائیوں کا حکم بھی دیدیا تاکہ ان علویوں کے ساتھ ہونیوالے تصادم سے چھٹکارا حاصل ہو سکے۔ جو یہاں وہاں ہر مقام پر اپنی فوج کشیوں سے عباسی حکومت کو للکارتے رہتے تھے۔ مزید یہ کہ وہ اپنی خلافت کے معاملہ میں شیعوں کی طرف سے مطمئن ہو جائے کیونکہ تاریخ کے اس دور میں اس کو ان لوگوں کی حمایت کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے بعد اس کو میدان میں ان عباسیوں کے علاوہ کوئی بھی نظر نہ آتا تھا جو اس کے خلاف اس کے بھائی امین کے حامی اور مددگار رہے تھے لیکن جب تک مملکت کا ایک بڑا حصہ اس کے قبضہ میں تھا اس کے لیے کسی خطرے کا موجب نہیں بن سکتے تھے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مامون اپنی اس تدبیر میں کامیاب ہو گیا تھا کیونکہ تاریخ نہیں بتاتی کہ امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کے ان دو سالوں کے دوران جب تک کہ آپ زندہ رہے، آپ کے پاس و لحاظ کے باعث کسی ایک علوی نے بھی مامون کے خلاف اقدام کیا ہو یا اس کے خلاف کوئی تحریک چلائی ہو اور اسی طرح عام شیعہ بھی امام کو حکومت میں شریک سمجھتے تھے۔ چنانچہ مامون نے ان کو وہ اطمینان دلا دیا جو ابومسلم خراسانی کی وہ تحریک بھی نہ دلا سکی تھی، جو اس نے علویوں کے نام پر چلائی تھی اور نہ کوئی اور تحریک ایسا کر سکی تھی۔

دوسری طرف مامون اپنے دل میں امامؑ کے لیے بُرا ارادہ چھپائے ہوئے تھا اور وہ اس کے لیے کوشاں رہتا تھا کہ امامؑ کے سامنے ایک ایسا دکھاوا قائم رکھے، جس کے پیچھے اس کے اصل مقاصد اور مصلحتیں پوشیدہ رہیں۔ اس امر کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ آپ پر ایسی سخت نگرانی رکھتا تھا کہ گویا آپ کے سانس تک شمار کیے جا رہے ہوں چنانچہ ریان بن صلت کا بیان ہے کہ: جب امام خراسان پہنچ گئے تو ہشام بن ابراہیم راشدی کہ جو آپ کا خاص آدمی تھا، وہ فضل بن سہل ذوالریاستین سے جا ملا جس نے اس کو اپنے قریب رکھ لیا تاکہ وہ اس کو اور خلیفہ مامون کو امام رضاؑ کے متعلق خبریں پہنچاتا رہے۔ چنانچہ اس کو ان دونوں کا تقرب حاصل تھا اور وہ ان سے امام علی رضاؑ کی کوئی بات مخفی نہ رہنے دیتا تھا۔ بعد میں مامون نے اسی کو امامؑ کا دربان مقرر کر دیا، اس طرح اس نے آپ پر سخت پہرہ لگا دیا اور سب لوگوں کو بلکہ آپ کے خاص آدمیوں اور خدمتگاروں کو بھی آپ کے پاس جانے سے روک دیا اور امام اپنے گھر میں جو بھی بات کرتے وہ مامون اور وزیر ذوالریاستین تک پہنچ جاتی تھی۔

اسی طرح یہ امر کہ مامون، امام علی رضاؑ کے ساتھ ولی عہدی کے بارے میں کیے ہوئے اپنے اس پیمان میں سچا نہیں تھا۔ یہ اس کے اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو اس نے عباسیوں کو دیا اور جیسا کہ بحارالانوار میں روایت آئی ہے کہ اس نے کہا تھا: علیؑ بن موسیٰؑ کے حق میں بیعت لینے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہاری خونریزی کو روک دوں اور اپنے اور ان کے درمیان محبت کے قیام سے تمہاری حفاظت کا انتظام کر دوں، خواہ تم یہی سمجھتے رہو کہ اس کا نتیجہ ان کے حق میں اور ان کے مفاد میں ہے جبکہ میں دراصل تمہی لوگوں کے بچاؤ کے لیے تدبیریں کرتا رہتا ہوں میں تمہارے بیٹوں اور تمہارے بعد آنے والوں کی سلامتی پر نظر

دکھتا ہوں حالانکہ تم خود اس سے بے خبر پڑے ہو اور بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ تمہارے لیے کیا کچھ کیا جا رہا ہے، تم بس اندھیرے میں بھٹکتے رہتے ہو۔

مامون کے یہ بات کہنے کا لازماً یہی مطلب ہے کہ وہ خلافت کو ایک گھرانہ سے دوسرے گھرانہ میں منتقل کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا جس طرح وہ لوگ خیال کر رہے تھے بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ حالات جو اس کے اور اس کی خلافت کے لیے چند در چند مشکلات کا سبب بنے ہوئے تھے اور اس کو بدترین شاخسانوں سے دوچار کیے ہوئے تھے۔ اس کو ان میں پیش آنے والی صورتوں کا مقابلہ کرنے کی قوت اور طاقت حاصل ہو جائے۔

بہرحال ولی عہد کے اس معاملہ کے اسباب کچھ بھی رہے ہوں، امام علی رضاؑ کے لیے مامون کا یہ مطالبہ قبول کر لینے کے علاوہ کوئی اور راستا نہیں تھا۔ جیسا کہ علل الشرائع اور مقاتل الطالبیین میں روایت آئی ہے کہ اس بارے میں اس نے آپ کو قتل کی دھمکی دی تھی۔ چنانچہ اس نے آپ سے کہا تھا: آپ ہمیشہ میرے ساتھ وہی کرتے ہیں جو مجھ کو ناپسند ہوتا ہے لیکن میں اپنی طاقتور حیثیت کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ پس میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یا تو آپ ولی عہد ہونا مان لیجیے ورنہ میں آپ کو اس پر مجبور کروں گا اور پھر اگر آپ مان گئے تو خیر ورنہ میں آپ کی گردن اڑا دوں گا۔

عیون اخبار الرضاؑ میں شیخ صدوق کا بیان ہے کہ: مدینہ سے خراسان جاتے ہوئے امام علی رضاؑ نیشاپور سے گزرے تو آپ اس محلہ میں قیام فرما ہوئے جس کا نام قزوینی یا قزینی تھا۔ وہاں ایک حمام تھا جس کو بعد میں "حمام رضاؑ" کہا جانے لگا۔ اس میں ایک چشمہ تھا جس کا پانی کم ہو گیا تھا۔ آپ نے ایک آدمی کو اس کا پانی نکالنے پر لگا دیا، اس طرح اس میں پانی چڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ بھر گیا۔ پھر آپ نے پھاٹک کے باہر ایک حوض بنوا دیا جس میں سیڑھیاں بنی تھیں اور چشمے کا پانی اس میں آتا تھا۔ جیسا کہ سید امین نے اعیان الشیعہ جلد چہارم میں تحریر کیا ہے۔

سید امین مزید لکھتے ہیں کہ امام علی رضاؑ نے اس حوض میں غسل فرمایا اور اس کے کنارے پر نماز ادا فرمائی۔ چنانچہ اب بھی لوگ حصول برکت کے لیے اس حوض پر آتے ہیں اس میں غسل کرتے ہیں، اس کا پانی پیتے ہیں اور اس کے کنارے پر نمازیں پڑھتے اور

اللہ سے اپنی حاجات طلب کرتے ہیں۔ اس چشمہ کو "عین کہلان" کہا جاتا ہے۔

حدیث سِلسِلَۃُ الذَّہَب

اعیان الشیعہ میں ابن صباغ مالکی کی فصول المہمہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ: عماد الدین محمد بن ابی سعید بن عبدالکریم الوزان اور سعید امام الدنیا "تاریخ نیشاپور" کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ امام علی رضاؑ مدینہ سے خراسان کے اپنے اس سفر کے دوران کہ جس کے نتیجے میں کچھ عرصے کے بعد آپ شہادت پر فائز ہوئے، جب نیشاپور میں داخل ہوئے تو آپ ایک خچر پر کسی ہوئی عماری میں سوار تھے۔ جب آپ شہر کے وسط میں پہنچے تو ابوزرعہ رازی اور محمد بن اسلم طوسی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ دونوں حدیث نبویؐ کے حافظ و امام اور سنت رسولؐ پر سختی سے عامل تھے۔ ان کے ساتھ علمِ حدیث اور رجال کے طالبان کا وہ کثیر مجمع تھا جو شمار سے باہر تھا۔ تب ان دونوں نے امامؑ سے عرض کیا: اے صاحب جلالت سردار اور اے ائمۂ کرامؑ کے فرزند! ہم آپ کے آباء طاہرینؑ اور اسلاف کرامؑ کا واسطہ دیتے ہیں کیا آپ ہم کو اپنے چہرۂ اقدس کی زیارت کا موقع نہ دیں گے اور کیا آپ ہم سے اپنے آبار کرامؑ کی کوئی حدیث بیان نہیں فرمائیں گے جو انہوں نے اپنے جدامجد حضرت رسول خداؐ سے روایت کی ہو تاکہ ہم اس کے ساتھ آپ کو یاد رکھیں۔ پس آپ نے اس خچر کو رکوایا اور اپنے خدمتگاروں کو حکم دیا کہ وہ عماری پر سے پردہ ہٹادیں۔ تب آپ کی عنبریں زلفیں آپ کے کاندھوں پر جلوہ بار تھیں اور لوگوں کی نگاہیں آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں ہر طبقہ کے لوگ آپ پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ ان میں سے بعض آنسو بہارہے تھے اور بعض چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ گرد میں اٹے گئے تھے کیونکہ وہ امامؑ کے خچر کے پیروں پر بوسہ دے رہے تھے۔ اتنے میں علماءؒ فقہاؒ اور عوام نے باآواز بلند کہنا شروع کیا: سنو اے لوگو سنو! اب وہ چیز سننے کے لیے توجہ کرو اور کان لگاؤ کہ جو تم کو فائدہ دے گی۔ ہاں ہاں تم چیخ چیخ کر اور رو رو کر ہم کو امامؑ کی بات سننے سے محروم نہ کرو۔ تب امام رضاؑ نے فرمایا: مجھ سے میرے والد موسیٰ کاظمؑ نے ان سے ان کے والد جعفر صادقؑ نے، ان سے ان کے والد محمد باقرؑ نے، ان سے ان کے والد زین العابدینؑ نے، ان سے ان کے والد حسین شہید کربلاؑ نے ان سے ان کے

والد علی بن ابی طالبؑ نے فرمایا کہ مجھ سے میرے حبیب اور میری آنکھ کی ٹھنڈک رسول اللہؐ نے اور ان سے جبرئیلؑ نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ قول سنا ہے:

كَلِمَةُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حِصْنِيْ وَمَنْ قَالَهَا دَخَلَ حِصْنِيْ وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِيْ اَمِنَ عَذَابِيْ.

یعنی کلمۂ لا الٰہ الا اللہ میرا قلعہ ہے۔ جس نے یہ پڑھا وہ میرے قلعہ میں داخل ہو گیا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہو گیا وہ عذاب سے بچ گیا۔

اس کے بعد عماری پر پردہ ڈال دیا گیا اور آپ روانہ ہو گئے۔ وہ لوگ جو اس وقت حدیث لکھ رہے تھے، جب ان کا شمار کیا گیا تو وہ بیس ہزار سے زیادہ تھے۔

روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدثین کے درمیان یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اس کو انہی اسناد کے ساتھ ہر اس شخص نے نقل کیا ہے جس نے امامؑ کے خراسان کی طرف اس سفر کا حال بیان کیا ہے۔ حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں اس حدیث کو درج کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ ایک ثابت اور مشہور حدیث ہے کیونکہ اس کی روایت امامؑ کے آباء طاہرینؑ کی اسناد سے کی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے ایک پیشرو محدث جب اس سلسلۂ اسناد کو بیان کیا کرتے تو کہتے: اگر ان اسناد کو کسی دیوانہ کے سامنے بیان کیا جائے تو وہ بھی افاقہ پا جائے گا۔

نیشاپور سے امام شہر مرو کے سفر پہ روانہ ہو گئے جہاں مامون آپ کے اکرام اور استقبال کی تیاریاں کر رہا تھا۔ چنانچہ جب آپ وہاں پہنچے تو اس نے آپ کا پوری عزت و احترام سے استقبال کیا۔ اس کے بعد خلافت سے اپنے دستبردار ہونے یا آپ کو اپنا ولی عہد بنانے کے لیے آپ سے گفتگو کی اور جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، جب اس نے آپ کو قتل کرنے کی بات بھی کی تو بالآخر آپ نے وہ ولی عہدی ایسی شرائط کے ساتھ قبول فرمائی جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حکومت اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے عمال کے تمام افعال سے بے تعلق رہنا چاہتے تھے۔

چنانچہ علل الشرائع جلد اول میں ہے کہ جب آپ نے خود کو ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور پایا تو مامون سے فرمایا: میں اس کو اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ میں نہ تو کسی کو کسی عہدہ

پر مقرر کروں گا، نہ کسی کو معزول کروں گا، نہ کسی طریقۂ کار کو بدلونگا اور نہ کسی معاملہ میں مشورہ دونگا۔
چنانچہ وہ آپ کی ان تمام شرائط کو قبول کر لینے پر راضی ہو گیا۔

عیون اخبار الرضاؑ میں ایک اور روایت میں معمر بن خلاد نے کہا ہے کہ: مامون نے امام ابوالحسن علی رضاؑ سے کہا کہ اے ابوالحسن! آپ جس جس کو بھی قابل اعتماد تصور کرتے ہوں اس کو ان شہروں میں حاکم بنا دیں۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: تم مجھ سے ایفائے عہد کرو اور میں بھی تم سے ایفائے عہد کروں گا۔ میں نے جو کچھ قبول کیا ہے وہ اسی شرط پر ہے کہ میں نہ تو کوئی کام کرنے کو کہوں گا، نہ روکوں گا۔ نہ کسی کا تقرر کروں گا اور نہ کسی کو معزول کرونگا تا اینکہ اللہ مجھ کو آپ سے پہلے اپنے پاس بلائے گا۔ قسم بخدا! خلافت وہ چیز ہے جس کا میں نے کبھی خیال بھی نہیں کیا۔ وہ کیا ہی اچھا وقت تھا کہ میں مدینہ میں تھا اور اپنی سواری پر وہاں کے کوچہ و بازار میں پھرتا رہتا تھا۔ لوگ اپنی حاجتیں مجھ سے طلب کرتے تھے اور میں ان کو پورا کرتا تھا۔ وہ سب میرے چچیرے بھائیوں کی طرح میرے ساتھ رہتے تھے۔ نیز میرا جاری کردہ ہر اسلامی حکم تمام علاقوں میں نافذ ہو جاتا تھا اور میرے رب کی طرف سے میرے لیے ایک بڑی نعمت تھی۔

ولی عہد کی حیثیت سے امامؑ کی بیعت وزیروں، فوجی افسروں، حکومت کے ممتاز افراد اور عوام کے عظیم مجمع کے سامنے ہوئی تھی۔ خلیفہ مامون نے اس وقت لوگوں میں تحفے اور انعام تقسیم کیے اور شاعروں نے آپ کی منقبت میں دسیوں قصیدے کہے۔ چنانچہ ابو نواس نے بھی آپ کی مدح کی اور اس میں کہا:

۱۔ مجھ سے کہا گیا کہ تم بڑے شاعر ہو اور طرح طرح کے شاندار کلام میں پیش پیش ہو۔
۲۔ تمہارے کلام میں نئے نئے موتی پائے جاتے ہیں اور تمہارا ہاتھ یہ موتی چنتا رہتا ہے۔
۳۔ لیکن تم نے علیؑ بن موسیٰؑ کی مدح اب تک کیوں نہیں کی اور ان اعلیٰ صفات کو بیان نہیں کیا جو ان میں مجتمع ہیں۔
۴۔ میں نے کہا کہ میں ایسے امامؑ کی مدح کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہوں جس کے باپ کے باپ کا خادم جبرئیلؑ رہا ہو۔

خلیفہ مامون نے اوروں کی طرح اس کو بھی اس قصیدے پر انعام دیا لیکن اس کو

دوسروں سے بہت بڑھ کر دیا۔ پھر ایک روز اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر سے باہر آتے ہوئے یہ اشعار پڑھ رہا ہے :

۱۔ اگر آنکھ آپ کو دور سے دیکھے اور اس کو اس کے متعلق شک ہو تو اس وقت خود قلب آپ کے بارے میں گواہی دیدیتا ہے

۲۔ اگر لوگ آپ سے ملاقات کرنا چاہیں تو آپ کی خوشبو خود ان کی سواری کی رہنمائی کرتی ہے۔

عیون اخبار الرضاؑ میں ہے کہ ابو نواس نے آپ کے بارے میں یہ بھی کہا ہے :

۱۔ یہ پاک افراد ہیں اور ان کے لباس بھی پاکیزہ ہیں۔ جب کبھی ان کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان پر صلوٰۃ پڑھی جاتی ہے۔

۲۔ اگر کوئی نسب کے اعتبار سے علوی نہیں ہے تو اس کو کبھی بھی کسی قسم کا کوئی افتخار حاصل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ جب اللہ نے خلقت کی ابتدا کی اور اس کو تکمیل کو پہنچایا تو ان کو تمام عالم بشریت میں سے منتخب کر لیا۔

۴۔ پس آپ لوگ ایک بلند مرتبہ گروہ ہیں اور آپ ہی کے پاس قرآن اور اس کی تمام سورتوں کا علم ہے۔

بعض لوگ ان اشعار کو ابو نواس سے منسوب کیے جانے پر شک کرتے ہیں کیونکہ وہ بے راہ روی اور بدکرداری میں مشہور تھا۔ نیز یہ کہ وہ مامون کی طرف سے امام علی رضاؑ کے ولی عہد مقرر ہونے سے کچھ اوپر پانچ سال پہلے ۱۹۵ھ میں انتقال کر چکا تھا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے یہ اشعار اس واقعہ سے پہلے ہی کہے ہوں۔

اس کے بعد اور بھی بہت سے شعراء نے آپ کی مدح میں اشعار کہے۔ ان میں سے بعض نے از روئے محبت یا اس موقع پر اپنی مسرت کے باعث آپ کی مدح کی اور بعض نے مامون کی خوشامد اور اس سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں اس واقعہ کے متعلق اشعار کہے۔ راویوں کا بیان ہے کہ دعبل خزاعی جو اہل بیتؑ کے شاعر تھے۔ انہوں نے بھی امام علی رضاؑ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس میں تقریباً اسّی اشعار تھے۔ جیسا کہ

اربلی نے کشف الغمہ میں کہا ہے۔

ابوصلت ہروی سے روایت ہے انہوں نے کہا: دعبل خزاعی مرو میں امام رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! میں نے آپ کی شان میں قصیدہ کہہ کر یہ قسم کھائی ہے کہ اس کو آپ سے پہلے کسی کے سامنے نہ پڑھونگا۔ امامؑ نے فرمایا: اے دعبل! سناؤ۔ چنانچہ انہوں نے وہ قصیدہ سنایا۔ اس میں انھوں نے وہ تمام واقعات پیش کیے جو نبیٔ اکرمؐ کے وصال کے وقت سے اہل بیت کرامؑ پر گزرتے رہے تھے۔ یعنی سقیفہ کا واقعہ، خلافت کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ۔ نیز وہ واقعات جو اہل بیت کرامؑ پر بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ میں گزرے۔ جب دعبل نے یہ شعر پڑھا:

میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کا مال دوسروں نے بانٹ کھایا ہے اور خود
ان کے ہاتھ خالی ہیں۔

اس شعر کا امامؑ پر بہت اثر ہوا۔ آپ اس شعر کو بار بار دہراتے اور روتے رہے۔ آپ یہ بھی کہتے جاتے تھے: اے دعبل! تم نے سچ کہا۔

پھر انہوں نے یہ شعر پڑھا:

جب ان پر ظلم کیا جاتا ہے اور وہ اس کا انتقام لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں
تو ان کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔

تب امامؑ اپنے ہاتھ مَل مَل کر فرمارہے تھے: بہت خوب! بخدا کہ ہمارے ہاتھ رُکے ہی رہتے ہیں۔

جب شاعر ان اشعار پر پہنچا:

کچھ قبریں کوفہ و نجف میں ہیں، کچھ طیبہ (کربلا) میں اور ایک قبر فخ میں
بھی ہے۔ پھر بغداد میں نفس ذکیہ کی قبر ہے جن کو اللہ نے جنت میں داخل
کرلیا ہے۔ میری طرف سے ان سب پر صلوٰۃ پہنچے۔

راوی کہتا ہے کہ اس وقت امامؑ نے فرمایا: کیا ہی اچھا ہو کہ تم اس مقام پر دو شعر اور بڑھالو تاکہ تمہارا قصیدہ پورا ہو جائے۔ انہوں نے کہا: ضرور اے فرزند رسول!

تب امامؑ نے فرمایا: پھر ایک قبر طوس میں ہے جس کی مصیبت پر ہماری آنتیں آہوں کی وجہ سے کٹ کٹ جائیں گی اور حشر تک یہی حال رہیگا یہاں تک کہ اللہ کے حکم سے ہمارا امام قائمؑ ظہور کرے اور ہمارے رنج و الم کا خاتمہ ہو۔

راوی کا بیان ہے کہ: یہ سن کر دعبل خزاعی نے کہا: وہ قبر جو طوس میں ہے میں اس سے واقف نہیں ہوں کہ وہ کس کی قبر ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ میری قبر ہو گی اور دن یا سال نہ گزریں گے کہ وہ ہمارے شیعوں کی زیارت گاہ بن جائے گی۔ جو کوئی اس پردیس میں میری زیارت کو آئے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔

جب دعبل یہ قصیدہ پڑھ چکے تو امام علی رضاؑ نے ان کو ایک تھیلی عطا کی، جس میں سو دینار یا بقولے دس ہزار درہم تھے جن پر بطور ولی عہد حکومت امامؑ کا اسم مبارک نقش تھا۔ تب انہوں نے آپ سے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! میں نے آپ کی مدح میں یہ اشعار اس کے لیے نہیں کہے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے امامؑ سے آپ کے لباس کا ایک ٹکڑا مانگا تاکہ وہ ان کے لیے باعثِ برکت ہو۔ چنانچہ آپ نے اس تھیلی کے علاوہ ان کو ایک ریشمی جبہ بھی عطا فرمایا جو آپ خود زیب تن فرمایا کرتے تھے۔
امام علی رضاؑ کی طرف سے اس طرح نوازے جانے کے بعد دعبل وہاں سے رخصت ہو گئے۔ جب وہ اپنے قافلہ کے ساتھ ایک چشمہ پر سے گزرے تو وہاں ڈاکوؤں نے گھیر لیا جنہوں نے ان لوگوں کا سب مال و متاع لوٹ لیا۔ پھر وہ اس قافلہ سے لوٹا ہوا مال آپس میں تقسیم کرنے کے لیے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس وقت ان ڈاکوؤں میں سے ایک نے ان قافلہ والوں کی مثال دعبل کے اس شعر سے دی کہ:

میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کا مال دوسروں نے بانٹ کھایا ہے اور خود ان کے ہاتھ خالی ہیں۔

دعبل خزاعی نے سنا تو بولے: یہ کس کا شعر ہے جو تم مثال کے طور پر پڑھ رہے ہو؟ ڈاکو نے کہا: یہ بنی خزاعہ کے ایک شخص کا شعر ہے جس کا نام دعبل بن علی ہے۔ تب انہوں نے کہا: میں ہی وہ دعبل ہوں جس نے وہ قصیدہ کہا کہ جس میں یہ شعر ہے۔ اس پر ان ڈاکوؤں نے وہ سب مال جو اس قافلہ سے لوٹا تھا ان کو واپس کر دیا اور

ان سے معذرت کی۔ راوی مزید کہتا ہے کہ پھر دعبل قافلہ کے ساتھ قم تک گئے۔ وہاں کے لوگوں کو انہوں نے وہ قصیدہ سنایا اور بتایا کہ امام علی رضاؑ نے ان کو کیا انعام عطا فرمایا ہے۔ لوگوں نے ان سے کہا: آپ امامؑ کا وہ جبہ ایک ہزار دینار میں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے تاہم جب وہ قم سے چلے تو وہاں کے کچھ جوانوں نے راستے میں آکر وہ جبہ ان سے زبردستی لے لیا۔ تب وہ واپس گئے اور ان سے اپنا جبہ مانگا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بالآخر ان جوانوں نے دعبل کو ایک ہزار دینار اور جبہ کا ایک ٹکڑا دے دیا تاکہ وہ اس کو اپنی قبر میں رکھ لیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے۔

کتاب آغانی میں ہے کہ دعبل خزاعی نے جس قصیدہ میں یہ کہا تھا کہ:

یہ وہ مکانات ہیں جہاں آیات کی تلاوت ہوتی رہتی ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں کہ جو وحی کے نازل ہونے کی جگہیں ہیں۔

دعبل نے اپنا یہ قصیدہ ایک کپڑے پر لکھ کر اس کو احرام حج کے طور پر استعمال کیا اور وصیت کر دی کہ اس کو ان کے کفن میں شامل کر دیا جائے۔ وہ ایک عظیم اور جری شاعر تھے اسلیے اہل حکومت انکی ہجو سے ڈرتے اور ان کی زبان سے خوف کھاتے تھے۔ جیسا کہ ابن مدبّر نے ان سے کہا تھا: اے ابو اسحٰق! تم سب سے زیادہ جرأتمند ہو کیونکہ تم نے مامون کے بارے میں یہ بھی کہہ دیا کہ:

میں اس قوم سے ہوں کہ جس کے دلاوروں نے اپنی تلواروں سے تمہارے بھائی امین کو قتل کیا اور آپ کو تخت حکومت پر بیٹھنے کا شرف بخشا ہے۔ انہوں نے طویل گمنامی کے بعد آپ کو رفعت مہیا کی اور آپ کو تنہائی کے گڑھے سے باہر نکال لائے۔

تب دعبل نے کہا: میں چالیس سال سے اپنی سولی کے لیے لکڑی اٹھائے پھر رہا ہوں لیکن کوئی بھی ایسا نہیں ملا جو مجھ کو پھانسی دیدیتا۔

امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کی اس تقریب کے موقع پر خلیفہ مامون نے درہم کے سکے ڈھلوائے اور ان پر امامؑ کا نام لکھوایا۔ اس کے ایک طرف بیچ میں لکھوایا: "

اَللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَلْمَامُوْنُ خَلِيْفَةُ اللّٰهِ مِمَّا اَمَرَ بِهِ الْاَمِيْرُ الرِّضَا

وَلِیُّ عَھْدِ مُسْلِمِیْنَ عَلِیُّ بْنُ مُوْسٰی بْنُ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْطَالِبٍ اور اس کی دوسری جانب بیچ میں لکھا گیا:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ۔

درہم کی ایک جانب دائرہ کی شکل میں لکھا گیا:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اَرْسَلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْکَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ اور دوسری جانب دو دائرے ایک اندر اور ایک باہر بنائے گئے۔ اندر کے دائرے میں لکھا: بِسْمِ اللّٰہِ ضُرِبَ ھٰذَا الدِّرْھَمُ بِمَدِیْنَۃِ اَصْبَھَانَ سَنَۃَ اَرْبَعَ وَمِائَتَیْنِ۔

اور باہر کے دائرے میں: فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ۔

اس کے ساتھ ہی تمام شہروں میں امام علی رضاؑ کا نام خطبوں میں ولی عہد کی حیثیت سے دہرایا جانے لگا اور مامون نے اپنے گورنروں کو حکم دیا کہ وہ خلیفہ کے ساتھ آپ کے لیے بھی دعا کیا کریں۔ چنانچہ مسلمان مملکت کی مسجدوں کے خطیبوں نے مامون اور امام علی رضاؑ کے لیے دعا سے اپنے خطبوں کی ابتدا کرنا شروع کر دی۔ اس کے علاوہ مامون نے امام علی رضاؑ کے بھائی اسحٰق بن موسیٰؑ بن جعفرؑ کی تزویج اپنے چچا اسحاق بن جعفر بن محمد کی بیٹی سے کر دی۔ پھر ولی عہدی کے چند ماہ بعد مامون نے آپ کی تزویج اپنی بیٹی ام حبیب سے کر دی۔ یہ واقعہ ۲۰۲ھ کے آغاز کا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے آپ کی تزویج اپنی بہن سے کی جس کی کنیت امّ ابیہا یا بقولے امّ حبیبہ تھی۔

علاوہ ازیں مامون نے اہلبیتؑ سے ہم رنگی کے لیے سیاہ لباس کی بجائے سبز لباس نافذ کر دیا، کیونکہ عباسیوں کا سیاہ اور علویوں کا لباس سبز ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ حکم ملک کے تمام علاقوں میں اپنے عمال کو بھی بھیج دیا تھا۔ عباسیوں کو مامون کا یہ حکم بہت برا لگا اور انہوں نے امام علی رضاؑ کی ولی عہدی کے ساتھ ساتھ اس کو بھی عباسیوں کو ان کی خصوصیات اور طریقوں سے محروم کرنے کی ایک کھلی کوشش قرار دیا۔ چنانچہ وہ سب مامون کی مخالفت پر متحد ہو گئے اور انہوں نے مشہور عباسی گویّے ابراہیم بن مہدی کو اپنے معاملات کا ذمہ دار بنا کر خلافت کے لیے اس کی بیعت کر لی اور اس کے گرد جمع ہو گئے۔ یہی وجہ ہوئی کہ مامون کو اپنے اس منصوبہ پر عمل کرنے میں جلدی کرنا پڑی جو اس نے امام علی رضاؑ کے لیے تیار کیا تھا۔

چنانچہ وہ مجبور ہوگیا کہ مرو کو چھوڑ کر بغداد واپس آجائے تاکہ وہ عباسیوں کی ان مخالفتوں کا قلع قمع کر سکے جو رونما ہو رہی تھیں۔ تاہم اس کو بغداد میں داخل ہونے پر کوئی مشکل درپیش نہیں آئی اور نہ اس کو روکنے کے لیے کوئی کوشش ہوئی، بلکہ درحقیقت علوی گھرانہ کو اقتدار منتقل کرنے کے بارے میں عباسیوں کے خطرے اس کو امام علی رضاؑ کی شہادت کے بعد پیش آئے۔ جب ان سب نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور وہ دستبردار خلیفہ نہیں رہا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے زینب بنت سلیمان بن عبداللہ بن عباس کو جو ان میں عقلمند اور معزز مانی جاتی تھی اس کو اپنا واسطہ قرار دیا تاکہ وہ سبز لباس کو پھر سے سیاہ لباس میں تبدیل کرا دے۔

تذکرۃ الخواص ابن جوزی اور دیگر کتابوں میں ہے کہ تب بنی عباس مل کر زینب بنت سلیمان کے پاس گئے اور اس سے درخواست کی کہ مامون سے ملاقات کرے اور اس سے کہے کہ وہ علویوں کا سبز لباس چھوڑ کر اب پھر سیاہ لباس اختیار کر لے کیونکہ وہ سب ڈر رہے تھے کہ امام علی رضاؑ کے بعد اب وہ ان کے فرزند محمد جوادؑ کو اپنا ولی عہد قرار دیدے گا۔ چنانچہ زینب بنت سلیمان مامون سے ملنے گئی تو اس نے اس کا خوشدلی سے استقبال کیا اور بڑی عزت سے پیش آیا۔ تب وہ بولی: اے امیرالمومنین! آپ کو اپنے اہل خاندان کے ساتھ اولاد ابوطالب کے مقابلے میں کچھ زیادہ نیکی کا سلوک کرنا چاہیے۔ کیونکہ آپ صاحب اقتدار ہیں اور آپ کو ان کے ساتھ نیکی کرنے کی زیادہ قدرت حاصل ہے بہ نسبت اس کے کہ اقتدار کسی اور کے یا خود انہی کے ہاتھ میں ہو۔ پس آپ سبز رنگ کا لباس ترک کر کے پھر سے اپنے گھرانہ والوں کا سیاہ لباس اختیار کر لیجیے۔ مامون نے اس سے کہا: اے پھوپھی! بخدا کہ کسی نے مجھ سے ایسی دل لگتی بات نہیں کہی، تاہم میرا مقصود وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں اور رہیں ان کا معاملہ اب آپ ہی کی عقل پر چھوڑتا ہوں۔ وہ بولی: وہ کیا ہے؟ مامون نے کہا: کیا آپ نہیں جانتی ہیں کہ ابوبکر نے رسول اللہؐ کے بعد خلافت سنبھالی تو بنی ہاشم میں سے کسی کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ پھر عمر بن خطاب نے اور عثمان بن عفان نے خلافت سنبھالی تو انھوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ البتہ جب علی بن ابیطالبؑ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بنی ہاشم کی طرف توجہ کی اور عبداللہ بن عباس

کو بصرہ پر، عبیداللہ کو یمن پر، معبد کو مکہ پر اور قثم بن عباس کو بحرین پر حاکم مقرر کیا اور عباس کی اولاد میں سے کسی کو حاکم بنائے بغیر نہیں چھوڑا۔ پس ان کا یہ احسان ہماری گردنوں پر تھا اور میں نے جو کچھ کیا وہ اسی کے بدلے میں ہے۔ تب وہ بولی: اے بیٹے! اللہ آپ کا بھلا کرے، میں نے جو کچھ آپ سے کہا وہ اولاد ابی طالب میں آپ کے عمزاد بھائیوں کے مفاد میں ہے۔ اس پر مامون نے کہا: اچھا تو میں وہی کروں گا جو آپ لوگ چاہتے ہیں۔

راوی مزید کہتا ہے کہ اس کے بعد مامون نے اس معاملہ پر اور محمدؑ بن علی الرضاؑ کو ان کے والد بزرگوار کے بعد ولی عہد مقرر کرنے پر غور کیا اور محسوس کیا کہ یہ معاملہ بنی عباس اور بنی علیؑ کے درمیان آٹھہرا ہے۔ چنانچہ اس نے بنی عباس کو جمع کیا اور ان کے سامنے سیاہ لباس منگوا کر پہنا اور سبز لباس اتار دیا۔ پھر وہ سیاہ لباس ہی پہنتا رہا۔ راوی کا خیال ہے کہ اس وقت بغداد میں آٹھ روز سے زیادہ سبز لباس نہیں پہنا گیا تھا۔

جہشیاری کی کتاب میں اور کتاب الصلہ بین التصوف والتشیع عن الوزراء کے صفحہ ۲۱۹ پر ہے کہ وہ سبز لباس جو مامون نے اپنی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں اختیار کیا تھا وہ علویوں کا نہیں بلکہ فارس کے بادشاہوں اور وہاں کے مجوسیوں کا لباس تھا جبکہ علویوں کا لباس سفید اور عباسیوں کا سیاہ ہوتا تھا۔ راوی مزید کہتا ہے کہ مامون نے اپنے وزیروں اور خاص درباریوں سے مشورہ کیا تو نعیم بن حازم جو اس کے با اعتماد مشیروں میں سے تھا، اس نے کہا: غالباً آپ یہ چاہتے ہیں کہ حکومت بنی عباس سے علی بن ابی طالبؑ کی اولاد میں منتقل ہو جائے۔ پھر انکو دھوکہ دیں اور حکومت دوبارہ کسروی ہو جائے۔ اگر آپکا یہ ارادہ نہ ہوتا تو آپ اولاد علیؑ کے سفید لباس کو چھوڑ کر سبز لباس اختیار نہ کرتے جو کسریٰ اور مجوس کا لباس ہے۔ اس نے مزید کہا مصر میں عبیدیوں نے سفید لباس اختیار کر لیا تھا اور یہ بہتر ہوتا اگر خروج کرنیوالے علوی سبز رنگ اختیار کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البتہ یہ ہوا ہے کہ امین اور مامون کے مابین جنگ کے دوران جب ابن طباطبا نے خروج کیا تو انھوں نے اپنے لیے سفید لباس کو اختیار کیا۔ اسی طرح جب علی بن محمد بن جعفرؑ بن محمدؑ نے بصرہ میں خروج کیا اور اس پر قبضہ کر لیا تھا تو انھوں نے بھی سفید لباس ہی پہنا اور ان کے علاوہ خروج کرنے والے دوسرے علویوں نے بھی سفید لباس ہی کو

اپنا شعار بنایا۔ اس معاملہ کے بارے میں اور بھی بہت سی روایات ہیں لیکن ہم اس کی کچھ زیادہ تحقیق کرنا نہیں چاہتے۔

امام علی رضاؑ کی نماز عید کو روانگی

جیسا کہ شیخ صدوق نے بیہقی سے روایت کی ہے، ولی عہد کی حیثیت سے امام علی رضاؑ کی بیعت ۵ رمضان ۲۰۱ھ میں واقع ہوئی تھی۔ اگرچہ امامؑ نے خلیفہ مامون سے یہ شرط کر لی تھی کہ آپ حکومت میں یا اس کے کسی صیغہ اور معاملہ میں اس کے ساتھ شریک نہ رہیں گے۔ اس کے باوجود ماہ رمضان کے اختتام پر مامون نے آپ سے کہا: لوگوں کو نماز عید آپ ہی پڑھائیں گے۔ چنانچہ علی بن ابراہیم نے امامؑ کے خادم یاسر اور ریان بن صلت سے روایت کی ہے کہ ان دونوں نے کہا: جب اس سال کی عید آئی جس میں آپ کو ولی عہد مقرر کیا گیا تھا تو مامون نے آپ سے کہلا بھیجا کہ آپ لوگوں کو نماز عید پڑھا دیں۔ اس پر امام علی رضاؑ نے اس سے کہلوایا: آپ کو معلوم ہے کہ ایسے کسی بھی معاملہ میں دخل دینے کے بارے میں میرے اور آپ کے درمیان کیا شرائط طے ہوئی ہیں۔ پس لوگوں کو نماز پڑھانے سے آپ مجھے معاف رکھیے، لیکن مامون نے اصرار کیا اور آپ سے کہا: میں چاہتا ہوں کہ اس عمل کے ذریعہ لوگوں کے دل آپ سے مطمئن ہوں اور وہ آپ کے مرتبہ سے واقف ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اس بات پر اصرار کرتا رہا اور قاصد پہ قاصد بھیجتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ نے اس شرط پر مان لیا کہ آپ نماز کے لیے اسی طرح برآمد ہوں گے جس طرح محمد رسول اللہؐ اور ان کے بعد امام علی بن ابی طالبؑ برآمد ہوا کرتے تھے۔ تب مامون نے کہا: آپ جس طرح بھی چاہیں وہاں تشریف لے جائیے گا۔ پھر اس نے فوجی افسروں، درباریوں اور عوام کو حکم دیا کہ وہ کل صبح سویرے امام علی رضاؑ کے درِ اقدس پہ پہنچ جائیں۔

راوی کا بیان ہے کہ لوگ چھتوں پر اور راستوں میں امام ابوالحسن علی رضاؑ کے انتظار میں بیٹھ گئے اور عورتیں اور بچے بھی آپ کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر لشکری اور فوجی افسر آپ کے در اقدس پر جا کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ آفتاب نمودار ہو گیا۔ اب امام ابوالحسن علی رضاؑ نے غسل کیا، لباس زیب تن فرمایا اور سر پہ ایک سوتی عمامہ باندھا کہ جس کا ایک سرا اپنے سینۂ اقدس اور دوسرا سرا اپنے کندھوں پہ ڈال رکھا تھا۔ پھر آپ

نے خوشبو لگائی، عصا مبارک ہاتھ میں لیا اور اپنے خدمتگاروں سے فرمایا: جو کچھ میں کروں تم بھی وہی کرتے جانا۔ چنانچہ وہ سب آپ کے آگے آگے روانہ ہوتے اور آپ برہنہ پا چل پڑے۔ آپ نے اپنے پائینچے آدھی پنڈلیوں تک اوپر اٹھا لیے اور کپڑے جسم پر کس لیے تھے۔ آپ قدرے چلے اور پھر اپنا سر مبارک آسمان کی طرف بلند فرمایا اور تکبیر کہی اور آپ کے ساتھ آپ کے خدمتگاروں نے بھی تکبیر کہی۔ پھر آپ چلتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ اپنے دروازہ پر آکر ٹھیر گئے۔ چنانچہ دروازے پر کھڑے فوجی افسروں اور لشکریوں نے جب آپ کو اس حال میں دیکھا تو وہ بھی اپنی اپنی سواریوں سے اتر پڑے۔ ان میں سب سے اچھے وہ رہے کہ جن کے پاس چاقو موجود تھے جن سے انہوں نے اپنے جوتوں کے تسمے کاٹ ڈالے تاکہ وہ ان کو اتار کر برہنہ پا چل سکیں۔ باب اکبر پر پہنچ کر امام علی رضاؑ نے پھر تکبیر کہی اور آپ کے ساتھ تمام لوگوں نے بھی تکبیر کہی۔ یہاں تک کہ مَرو کا پورا شہر تکبیر کی آوازوں اور رونے والوں کی دھاڑوں سے کانپ کانپ جاتا تھا۔ امامؑ اسی طرح کسی نہ کسی جگہ رکتے اور تکبیر کہتے رہے اور دوسرے لوگ بھی آپ کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ یہاں تک کہ سارا شہر تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر جمع ہو گئے اور وہ روایات جو آپ کے نماز عید کے لیے جانے کا حال بیان کرتی ہیں، ان کی تصریح کے مطابق اس شہر میں ایسا منظر کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

وہ اشعار جو بحتری نے متوکل کے لیے کہے تھے، اگر اس نے وہ اشعار اس موقع کی مناسبت سے امام علی رضاؑ کی شان میں کہے ہوتے تو وہ یقیناً سب سے بڑھ کر سچ کہنے والا شاعر ہوتا اور اہل حکومت کی خوشامد اور جھوٹ کے الزام سے بھی بچا رہتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی اصل مراد آپ ہی ہوں اور اس نے کسی مصلحت سے ان اشعار کو ظاہراً متوکل کے نام سے منسوب کر دیا ہو، جیسا کہ اکثر شعراء کیا کرتے ہیں۔ بہرحال یہ اشعار کسی اور کے لیے ہوں یا آپ کے بارے میں کہے گئے ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ دراصل یہ امام علی رضاؑ کے اور ان لوگوں کے بہترین اوصاف کے آئینہ دار ہیں جو اس موقع پر آپ کے گرد جمع ہو گئے تھے:

"آپ کا چہرۂ مبارک دیکھ کر لوگوں کو نبئ اکرمؐ یاد آ گئے۔ جونہی آپ صفوں کے

درمیان نظر آتے لوگوں نے کلمہ طیبہ اور تکبیر کی آوازیں بلند کرنا شروع کردیں۔ یہاں تک کہ آپ نماز کے مقام پر جا پہنچے جبکہ نور ہدایت آپ کا لباس تھا جو آپ سے اچھی طرح عیاں ہو رہا تھا۔ آپ اللہ کے خوف سے انکسار کرتے ہوئے چلتے رہے نہ آپ نے بڑائی کا اظہار کیا نہ فخر کیا۔ خود منبر آپ کے لیے اس قدر مشتاق تھا کہ اگر اس سے ممکن ہوتا تو وہ دوڑ کر آپ کی طرف آجاتا۔"

مامون نے یہ سوچا تھا کہ آپ لوگوں کو نماز عید پڑھائیں گے تو اسی طرح تشریف لے جائیں گے جس طرح وہ خود یا وہ افراد جایا کرتے تھے جن کو وہ اس کے لیے مقرر کرتا تھا کیونکہ وہ لوگ دینی تہواروں کو بھی اپنی قوت کے اظہار اور لوگوں کے دلوں پر اپنی ہیبت اور دبدبہ قائم کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امام علی رضاؑ اس بات سے بری الذمہ رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ آپ کی رائے میں یہ ضروری تھا کہ دینی تہواروں کا روحانی تقدس قائم رکھا جائے اور ان کو اہل حکومت کی مصلحتوں کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ البتہ جب مامون نے آپ کو نماز عید پڑھانے کے لیے تشریف لے جانے پر مجبور کیا تو آپ ان شرائط پر برآمد ہوئے جو آپ چاہتے تھے۔ جب عمائدین حکومت نے دیکھا کہ عوام امام کے اس طرز عمل کے آگے سرنگوں ہو گئے ہیں جو ان طریقوں سے بالکل مخالف تھا جو ان فرمانرواؤں نے قائم کر رکھے تھے۔ تب وہ دوڑ کر مامون کے پاس گئے اور اس کو موقع کی نزاکت اور اس خطرہ سے آگاہ کیا، جو ان کے وجود اور ان کے اقتدار کو لاحق ہو جاتا، جبکہ امامؑ اسی طرح تشریف لے جاتے اور نماز ادا فرماتے۔ چنانچہ مامون نے آپ کو پیام بھجوادیا کہ اے فرزند رسولؐ! ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی اور بے جا زحمت سے دوچار کیا ہے، حالانکہ ہم آپ کو آرام ہی بہم پہنچانا چاہتے ہیں۔ پس آپ راستے میں اس وقت جہاں بھی ہیں، وہیں سے واپس تشریف لے جائیے۔ آج بھی لوگوں کو نماز عید وہی شخص پڑھا دے گا جو عام طور پر پڑھاتا ہے۔ امامؑ تو چاہتے ہی یہ تھے، اس لیے آپ نے اس وقت واپسی اختیار فرمائی جیسا کہ اس نے کہا تھا۔

امام علی رضاؑ اور علویوں کی فوجی مہمیں

مامون کو اپنی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں ہی تاریخ کے اس دور کی سب سے خطرناک فوجی یلغار کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ محمد بن ابراہیم حسینی عرف ابن طباطبا کی یلغار

تھی، جس کی تیاری اور قیادت سرّی بن منصور عرف ابوالسّرایا نے کی تھی۔ یہ فوجی مہم حجاز سے اٹھ کر کوفہ تک پہنچی اور وہاں سے عراق کے بیشتر علاقوں میں پھیل گئی۔ اسی سے وہ معرکے بھی پھوٹ پڑے جو علویوں کی قیادت میں بصرہ، یمن، بحرین، حجاز اور دوسرے علاقوں میں نمودار ہوئے۔ چنانچہ یمن میں ابراہیم بن موسیٰؑ بن جعفرؑ نے حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ مکہ میں حسین بن حسن افطس نے اور بصرہ میں زید بن جعفر نے کہ جس کو بعض مؤرخین نے زید النار کا لقب دیا ہے کیونکہ اس نے عباسیوں، ان کے حامیوں اور ان کے غلاموں کو بکثرت قتل کیا۔ ان کے گھروں کو تباہ کیا اور جلایا تھا۔ اسی قسم کے مقابلے دوسرے مقامات پر بھی ہوتے رہے جن کو ہم ان اسباب کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں جن کے تحت مامون اس امر پر آمادہ ہوا کہ وہ امام علی رضاؑ کو ولی عہدی سونپے۔ چنانچہ وہ خاص بات کہ جس نے مامون کو اس اقدام پر تیار کیا وہ انہی فوجی مہموں کو دبانا اور ان شیعوں کو قابو میں لانا تھا جو اسکی اعانت کررہے تھے۔ خاص کر خراسان کے ان شیعوں کو جنہوں نے خلیفہ مامون کو ان خونریز لڑائیوں میں قوت بہم پہنچائی تھی جو اس کے اور اس کے بھائی امین کے مابین ہوئی تھیں۔ چنانچہ وہ اس تدبیر میں اس حد تک کامیاب ہوگیا کہ امام علی رضاؑ کی نمایاں حیثیت کے لحاظ میں علویوں نے سکوت اختیار کرلیا تھا۔ چنانچہ اس مدت کے دوران کہ جس میں امام علی رضاؑ ولی عہد ہونے کے بعد زندہ رہے، مامون کے خلاف کوئی علوی تحریک صفحۂ تاریخ میں رونما نہیں ہوئی۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ عباسی حکومت کے خلاف علویوں کی تحریکوں اور ایسی ہر تحریک کے بارے میں امام علی رضاؑ کا رویہ اصولی لحاظ سے منفی نہیں تھا جبکہ وہ ظلم جور اور تعدّی کے خلاف اٹھائی گئی ہو۔ بلکہ آپ بھی ائمہ اہلبیتؑ کی مانند ظلم اور باطل کے خلاف اٹھنے والے ہر شخص کی اخلاقی حمایت فرماتے تھے بشرطیکہ اس کی تحریک شرعی حدود کے اندر اور امت کے مفاد کے لیے ہو، خواہ اسے فوجی کامرانی حاصل ہو یا نہ ہو کیونکہ اکثر اوقات ایک خاص شرعی تحریک قوم کے سامنے حکمرانوں کے عیبوں اور ان کی حقیقی برائیوں کو آشکارا کردیتی ہے اور اس کے نتیجے میں ایسی جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو ظلم اور زیادتیوں کو محسوس کرتی اور حاکموں کا مواخذہ کرتی رہتی ہے۔ جس سے کبھی کبھی ایک حاکم وقت کسی حد تک اپنے طرز عمل اور حکومت کے طریقۂ کار کی اصلاح کرلیتا ہے۔

البتہ اس مقام پر قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم یہ مانتے ہیں کہ ائمۂ کرامؑ ان تحریکوں میں سے بعض کی اخلاقی حمایت کرتے تھے تو پھر وہ ان کی قیادت کیوں نہیں سنبھال لیتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ اگر قاری ان تحریکوں سے ان امور کا مقابلہ کرے جن کی طرف ائمہؑ ملتفت رہے تو اس کو اس سوال پر زیادہ دیر رکنا نہیں پڑے گا کیونکہ ائمہ کرامؑ جانتے تھے کہ ان مسلح تحریکوں کا فوری نتیجہ شکست ہی ہوگا اس لیے کہ وہ غور و فکر کے ساتھ ایسی صحیح بنیادوں پر نہیں اٹھائی گئی تھیں کہ جن سے ان کی کامیابی یقینی ہو جاتی۔ ایک کامیاب مہم کے لیے ضروری ہے کہ وہ پائیدار قومی بنیاد پر قائم ہو اور ہر پہلو کو اچھی طرح دیکھ بھال کر پورے خلوص کے ساتھ اس کی تیاری کی گئی ہو۔ نیز ہر اس معاملہ میں کہ جس پر اسکی کامیابی کا دار و مدار ہو اس کی کارکردگی اپنے رہنما کی منصوبہ بندی کے مطابق ہو لیکن اس زمانے کی وہ فوجی تحریکیں جو ادھر ادھر رو نما ہوتی رہتی تھیں۔ یہی چیز ان میں پورے طور پر موجود نہ تھی۔ چنانچہ اس خاص زمانہ میں بھی جبکہ ہر طرف حکومت کے خلاف آوازیں بلند کی جا رہی تھیں، ائمۂ کرامؑ ثقافتی انقلاب کی رہبری میں منہمک تھے جو اس وقت میں مصلحت اسلام کے لیے عین ضروری تھا اور ان کو مختلف میدانوں میں کامیابی حاصل ہوتی رہتی تھی۔ جیسا کہ انکی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے پر یہ امر بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔

ہمارا یہ کہنا کہ ائمۂ کرامؑ ظلم اور باطل کے خلاف اٹھنے والے ہر شخص کی اخلاقی حمایت کرتے تھے، وہ اس لیے نہیں کہ وہ یہ توقع بھی رکھتے تھے کہ یہ مہم اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ بلکہ وہ حمایت اس لیے تھی کہ ظلم کے خلاف کسی تحریک کا انجام خواہ ناکامی ہی ہو وہ صاحب حکومت کی اصل حقیقت اور اس کی چھپی ہوئی باتوں کو آشکارا کر دیتی ہے اور اپنے پیچھے ایسے افراد چھوڑ جاتی ہے جو ظلم اور سرکشی کا احساس کرتے اور اس کا محاسبہ کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان فوجی مہموں کے ذریعے کم و بیش یہ مقاصد ضرور حاصل ہوتے ہیں لیکن ائمۂ کرامؑ ان دوسری تحریکوں میں شریک ہو جاتے یا ان کی قیادت سنبھال لیتے تو خود ان کی اپنی تحریکوں کے ان بڑے مقاصد میں کچھ بھی حاصل نہ ہوتا جو اسلام کے مفاد میں تھے۔

بہر صورت امام علی رضاؑ اور دیگر ائمہ نے فوجی تحریکیں چلانے والے بعض علویوں کی جو چیز ناپسند فرمائی وہ یہ تھی کہ ان میں سے بعض ظاہری باتوں کے فریب میں آجاتے اور بعض ان لوگوں

کی آوازوں سے دھوکا کھا جاتے تھے جو دکھاوے کو ان کا نام لیتے، غلط مقاصد کے لیے دعوت دیتے تھے اور کسی منصوبہ بندی کے بغیر ہی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ یکے بعد دیگرے قتل ہوا کیے اور پراگندگی کا شکار ہوتے رہے۔ اسی طرح ائمہؑ نے بعض خروج کرنے والوں کی طرف سے قتل عام، لوٹ مار، گھروں کو جلانے اور ایسی دوسری زیادتیوں کو ناپسند فرمایا کیونکہ اس میں حکمرانوں اور ان کے ساتھیوں کی نسبت نیکوکار لوگ زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام علی رضاؑ نے اپنے بھائی زید بن امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کے ساتھ سخت رویہ اختیار فرمایا اور ان کو ان سخت گیریوں اور زیادتیوں پر ڈانٹا جن کی دنیا بھر کے مذہبوں اور شریعتوں میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

چنانچہ یہی زید بن موسیٰ کاظمؑ مورخین اور بعض محدثین میں یزید النّار کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس نے عباسیوں اور ان کے حمایتیوں کو کثرت سے قتل کیا، مال و متاع لوٹا اور ان کے مکانات جلائے۔ تاریخ ابن اثیر میں ہے کہ جب کوئی کالے لباس والا آدمی اسکے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اس کو آگ میں ڈال دیتا تھا۔ نیز اس نے عباسیوں اور ان کے طرفداروں کے مال و متاع کے علاوہ تاجروں کا بھی بہت سا مال چھین لیا تھا۔ اس نے عباسی حکومت کے خلاف بصرہ میں اس وقت خروج کیا جب ابو السّرایا نے کوفہ اور اس کے اطراف پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت خلافت تو مامون کو مل چکی تھی لیکن امام علی رضاؑ ابھی مدینہ ہی میں تھے۔ چنانچہ مامون نے علی بن سعید کی سرکردگی میں ایک بڑا لشکر مقابلہ پر بھیجا اور طرفین میں خونین معرکے ہوتے رہے حتیٰ کہ زید بن موسیٰؑ نے امان طلب کی تو عباسی جرنیل نے اس کو قیدی بنا لیا اور حسن بن سہل کے پاس بھیجدیا جس نے زید کے قتل کا حکم دیدیا۔ اس وقت وہاں حجاج بن خیثمہ بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا: اے امیر! اگر آپ میری بات مانیں تو کام میں جلدی نہ کیجیے کیونکہ میں آپ کو ایک رائے دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ جلّاد جو تلوار لیے زید کی گردن اڑانے کو تیار کھڑا تھا، حسن بن سہل نے اس سے کہا: ذرا رک جاؤ! پھر حجاج سے کہنے لگا: تم کیا رائے دینا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا: اے امیر! آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں آپ کے پاس امیر المومنین کا کوئی حکم آیا ہے؟ وہ بولا نہیں!

تب انہوں نے کہا: پھر آپ امیر المومنین کے چچا کے بیٹے کو ان کی رائے اور انکے

حکم کے بغیر کیوں قتل کیے ڈال رہے ہیں؟ پھر انہوں نے ابی عبد اللہ افطس کا ماجرا بیان کیا اور کہا: ابی عبد اللہ افطس کو خلیفہ ہارون نے جعفرؑ بن یحییٰ کے پاس قید میں رکھا تھا لیکن اس نے اسے قتل کر دیا اور اس کا سر ایک طشت میں رکھ کر نوروز کے موقع پر ہارون کو ہدیہ کے طور پر بھیج دیا، جس سے ہارون کو جعفر بن یحییٰ سے دشمنی ہو گئی۔ چنانچہ جب برامکہ پر شاہی عتاب آیا اور ہارون نے مسرور کو حکم دیا کہ وہ جا کر جعفر بن یحییٰ کو قتل کر دے تو اس سے کہا: اگر جعفر اس قتل کے لیے اپنی خطا دریافت کرے تو اس کو بتا دینا کہ خلیفہ اپنے چچا کے بیٹے ابن افطس کے قتل پر تم کو یہ سزا دے رہے ہیں جن کو تم نے ان کے حکم کے بغیر ہی قتل کر دیا تھا۔

اس کے بعد حجاج بن خیثمہ نے حسن بن سہل سے کہا: اگر آپ اس شخص کو قتل کر دیں اور امیر المومنین آپ کو اس کے بدلے میں قتل کرا دیں، کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے اور امیر المومنین کے مابین ایسا ہی معاملہ پیش آنے سے محفوظ رہیں گے؟ اور کیا وہ آپکے خلاف بھی وہی استدلال نہیں کریں گے جو انہوں نے جعفر بن یحییٰ برمکی کے خلاف کیا تھا؟ اس پر حسن نے حجاج سے کہا: اللہ تم کو جزائے خیر دے! اس کے ساتھ ہی زید کو قید خانہ میں واپس لے جانے کا حکم بھی دے دیا۔ چنانچہ وہ بغداد میں قید رہے۔ تا اینکہ امام علی رضاؑ ولی عہد مقرر ہو گئے۔ اس وقت حسن بن سہل نے زید کو مامون کے پاس خراسان بھیج دیا اور جب اس کو مامون کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا: اے زید! تم نے بصرہ میں خروج کیا اور ہمارے دشمنوں یعنی بنی امیہ، بنی ثقیف، عدی اور ان کے گھرانہ والوں اور آل زیاد کے گھروں کی بجائے تم نے اپنے عزادوں کو نشانہ بنایا اور جلا ڈالا۔ راوی کے بیان کے مطابق زید نے کہا: اے امیر المومنین! مجھ سے غلطی ہو گئی اور اگر مجھ کو پھر موقع مل گیا تو میں اپنے دشمنوں ہی سے شروع کروں گا۔ اس پر مامون کو ہنسی آ گئی اور اس کو امام علی رضاؑ کے پاس بھیج دیا اور آپ سے کہلا بھیجا: آپ کو زید کے جرم کا علم ہو چکا ہے۔ اب آپ اس کے لیے اپنی رائے کے مطابق حکم جاری فرمائیے۔

یاسر خادم سے روایت ہے کہ: جب زید امام علی رضاؑ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا: اے زید! وائے ہو تم پر، تم کو کس چیز نے ایسا فریب دیا کہ تم خونریزی اور نسل کشی کرتے پھرے؟ کیا تم رسول اللہؐ کی اس حدیث سے دھوکا کھا گئے کہ فاطمہؑ نے اپنے کو پاکدامن رکھا اس لیے اللہ نے ان کی ذریت پر آگ کو حرام قرار دیدیا ہے۔

ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: کیا تم کوفہ کے ذلیل لوگوں کے کہنے سے اس دھوکہ میں آ گئے کہ فاطمہؑ نے اپنے کو پاکدامن رکھا اس لیے اللہ نے ان کی ذریت کو آگ کے لیے حرام قرار دیدیا ہے۔ وائے ہو تم پر! اے زید! یہ حدیث تمہارے اور میرے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے رسول اللہؐ کی مراد حسنؑ اور حسینؑ تھے۔

بخدا کہ ان دونوں کو بھی یہ شرف صرف اللہ کی اطاعت سے حاصل ہوا تھا۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے بھی جنت میں داخل ہو جاؤ گے تو گویا تم اللہ کے نزدیک ان دونوں سے اور اپنے والد موسیٰ بن جعفرؑ سے زیادہ معزز بن رہے ہو۔ اے زید! بخدا! کہ کوئی شخص اللہ سے اس کی اطاعت کے بغیر کچھ نہیں حاصل کر سکتا۔ اس پر زید نے آپ سے کہا: میں آپ کا بھائی ہوں اور آپ کے باپ کا بیٹا ہوں۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا: تم میرے بھائی اسی وقت تک ہو جب تک اللہ کی اطاعت کرتے رہو گے۔ ذرا یاد کرو کہ نوحؑ نے کہا تھا: اے اللہ! میرا بیٹا میرے اہل خاندان میں شامل ہے۔ تیرا وعدہ سچا ہوتا ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے لیکن اللہ نے کہا: اے نوحؑ! وہ ہرگز تمہارے اہل خاندان میں سے نہیں ہے کیونکہ اس کا عمل نیک نہیں ہے۔ اس طرح اللہ نے اس کو نافرمانی کرنے پر نوحؑ کے خاندان سے خارج کر دیا۔

عیون میں محمد بن یزید نحوی نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: مامون نے زید بن موسیٰؑ کو ان کے بھائی امام علی رضاؑ کے سپرد کر دیا اور آپ سے کہا: اے ابوالحسنؑ! آپ کے بھائی نے خروج کر کے جو کچھ کیا سو کیا۔ اس سے پہلے زید بن علیؑ نے خروج کیا تھا اور وہ قتل ہو گئے تھے۔ اگر مجھے آپ کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کو قتل کر دیتا کیونکہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔ اس پر امام رضاؑ نے فرمایا: اے امیرالمومنین! آپ میرے بھائی زید کو زید بن علیؑ بن حسینؑ کی طرح خیال نہ کیجیے، وہ تو آل محمدؐ کے علماء میں سے تھے۔ ان کو اللہ کی راہ میں غصہ آیا اور انھوں نے اللہ کے دشمنوں سے جہاد کیا۔ یہاں تک کہ اس کی راہ میں قتل ہوئے۔ مجھ سے میرے والد بزرگوار موسیٰ بن جعفرؑ نے بیان فرمایا کہ: میں اپنے والد بزرگوار جعفرؑ بن محمدؑ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ میرے چچا زید پر رحمت نازل فرمائے کیونکہ انھوں نے رضائے آل محمدؐ کی طرف دعوت دی اور اگر وہ فتح مند ہو جاتے تو

اپنے وعدے کو وفا کرتے۔ انہوں نے مجھ سے اپنے خروج کے بارے میں مشورہ طلب کیا تو میں نے کہا تھا: اگر آپ کناسہ کے مقام پر قتل ہونا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ پھر جب وہ مغلوب ہوگئے تو (امام) جعفرؑ بن محمدؑ نے کہا: وائے ہو ہر اس شخص پر کہ جس نے ان کی پکار سنی ہو اور جواب نہ دیا ہو۔ اس پر مامون نے کہا: اے ابوالحسن! کیا امامت کا غلط دعویٰ کرنے والے کے لیے وہی حکم نہیں ہے کہ جو ہے۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا: زید بن علیؑ نے کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا جس کا ان کو حق نہ تھا اور وہ ایسے معاملے میں اللہ کا بہت زیادہ خوف کرتے تھے کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ: "میں تم لوگوں کو رضائے آلِ محمدؐ کی جانب دعوت دیتا ہوں" اور بخدا زید ان لوگوں میں سے تھے جن کو اس آیت میں خطاب کیا گیا ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ.

تم لوگ اللہ کے لیے ایسا جہاد کرو جو اس کا حق ہے، اس نے تم کو منتخب کر لیا ہے۔ (سورہ حج - آیت ۷۸)

امام علی رضاؑ کے جوابات اور مناظرے

نثر الدرر میں ہے کہ خلیفہ مامون نے امام علی رضاؑ سے کہا: اے ابوالحسن! مجھ کو بتائیے کہ آپ کے دادا علی بن ابی طالبؑ کیونکر لوگوں میں جنت اور جہنم تقسیم کرنیوالے ہیں؟ آپ نے فرمایا: امیر المومنین! کیا آپ نے اپنے والد سے انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے اور انہوں نے عبداللہ بن عباس سے یہ روایت نہیں سنی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے سنا ہے کہ: حُبُّ عَلِيٍّ اِيْمَانٌ وَّ بُغْضُهٗ كُفْرٌ۔ یعنی علیؑ سے محبت کرنا ایمان ہے اور ان سے دشمنی رکھنا کفر ہے۔ مامون نے کہا: ہاں سنی ہے۔ تب آپ نے فرمایا: بس اسی لحاظ سے آپ جنت اور جہنم کے تقسیم کرنے والے ہیں۔ مامون بولا: اے ابوالحسنؑ! اللہ مجھ کو آپ کے بعد زندہ نہ رکھے۔ بے شک آپ رسول اللہ کے علم کے وارث ہیں۔

عیون اخبار الرضاؑ میں علی بن محمد بن جہم سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں خلیفہ مامون کی صحبت میں موجود تھا جبکہ امام علیؑ بن موسیٰؑ بن جعفرؑ بھی وہاں موجود تھے۔ مامون نے آپ سے کہا: اے فرزند رسولؐ! کیا یہ آپ کا قول نہیں ہے کہ انبیاءؑ معصوم ہوتے

ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں ایسا ہی ہے۔ تب اس نے کہا: پھر اللہ کے اس قول کے کیا معنی ہوئے کہ وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی۔ (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱۲۱) یعنی آدمؑ نے اپنے رب کا کہا نہ مانا اور بھٹک گئے۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا: اللہ نے آدمؑ سے کہا تھا: اُسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ وَکُلَا مِنْھَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۳۵)۔ یعنی تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس میں سے جو چاہو خوب کھاؤ، مگر اس پودے کے قریب مت جانا" اس کے ساتھ ہی گیہوں کے پودے کی طرف اشارہ بھی کیا: فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ ورنہ تم دونوں اپنا نقصان کرو گے۔ تو بھی اللہ نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ اس پودے میں سے کھانا مت اور نہ یہ کہ اس کی جنس میں سے بھی نہ کھانا۔ ان دونوں نے یہ حکم مانا، اطاعت کی اور پودے کے قریب نہیں گئے۔ البتہ ابلیس نے ان کو ورغلایا، بہکایا اور ان دونوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسی جنس کے ایک دوسرے پودے میں سے کھالیں اور قسم کھا کر کہا: اللہ نے تمہیں اس جنس کے پودے میں سے کھانے کو منع نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ان دونوں نے اس بات پر اعتبار کر لیا کیونکہ اس سے قبل وہ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ کی جھوٹی قسم بھی کھائی جاتی ہے اور یہ فعل آدمؑ سے نبوت سے پہلے سرزد ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آدمؑ نے جو کچھ کیا وہ گناہ کبیرہ نہیں بلکہ صغیرا اور قابل عفو تھا۔ جو راوی کے خیال کے مطابق نزول وحی کے آغاز سے قبل انبیاءؑ کے لیے جائز ہے۔ تاہم جب اللہ نے ان کو منتخب کر لیا اور اپنا نبی قرار دیدیا تو وہ ایسے معصوم ثابت ہوئے کہ پھر ان سے کوئی بھی کبیرہ یا صغیرہ گناہ سرزد نہیں ہوا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیْہِ وَھَدٰی۔

آدمؑ نے اپنے رب کا کہنا نہ مانا اور بھٹک گئے" پھر اللہ نے ان کو منتخب کیا اور ان کی توبہ قبول کر لی۔ پس وہ ہدایت پا گئے۔ (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱۲۱-۱۲۲)

اس کے بعد مامون نے آپ سے کہا: اب مجھ کو ابراہیم کے بارے میں اللہ کے اس قول کے متعلق بتلائیے کہ فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْہِ الَّیْلُ رَاٰ کَوْکَبًا قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ فَلَمَّا..... جب ان پر رات کی تاریکی چھا گئی تو ایک ستارے کو دیکھا اور کہا یہ میرا خدا ہے۔ جب وہ غروب ہو گیا تو بولے کہ میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جب چاند

کو جگمگاتا ہوا دیکھا تو بولے یہ میرا رب ہے اور جب وہ غروب ہو گیا تو بولے کہ اگر میرا رب میری ہدایت نہ کرتا تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاتا۔ پھر انھوں نے آفتاب کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا، یہ میرا رب ہے اور یہ تو بڑا بھی ہے۔ جب وہ غروب ہو گیا تو بولے کہ اے لوگو! جو شرک تم کرتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔ میں نے جھک کر اپنا منہ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں شامل نہیں ہوں۔

(سورۂ انعام۔ آیات ۷۶ تا ۷۹)

امام علی رضاؑ نے مامون کے جواب میں فرمایا: ابراہیمؑ کو اللہ کے بارے میں کبھی آنکھ جھپکنے جتنا بھی شک نہیں ہوا۔ البتہ وہ ایسے ماحول میں رہتے تھے جہاں لوگ زہرہ، چاند اور اور سورج کی پوجا میں گم ہو گئے تھے۔ اسلیے ابراہیم کو یہ فکر لاحق ہوئی تھی کہ وہ لوگ جو ستاروں کی پرستش کرتے تھے کسی نہ کسی طرح ان پر ان کے غلط مذہب کو آشکارا کر دیں۔ چونکہ چمکنا، غروب ہونا اور ایسی ہی دوسری تبدیلیاں کسی بھی چیز کے حادث ہونے کی علامات ہیں جو اپنے وجود کے لیے کسی سبب کی محتاج ہوتی ہے۔ اس لیے انھوں نے ان لوگوں سے اس طریقہ سے گفتگو کی تاکہ ان کو محسوسات کے ذریعہ سے اس امر پر قائل کریں کہ ان ستاروں کے ماوراء کوئی اور ذات ہے جو ان کو رواں دواں رکھتی ہے اور وہ وہی ہے جو آسمانوں زمین اور جو کچھ ان دونوں کے مابین موجود ہے اس کا پیدا کرنے والا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۸۳) یعنی یہ ہے وہ استدلال جو ہم نے ابراہیمؑ کو انکی قوم کے مقابلہ کے لیے دیا تھا۔

مامون نے کہا: اے ابوالحسنؑ! اللہ آپ کو برکت عطا کرے۔ اب آپ مجھ کو اللہ کے اس قول کے بارے میں بتائیے

فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۔

موسیٰؑ نے اس کو مکا مارا تو وہ مر گیا اور انہوں نے کہا کہ یہ شیطان کا کام ہے۔

اس پر امام رضاؑ نے فرمایا: موسیٰؑ فرعون کے شہروں میں سے ایک شہر میں ایسے وقت میں داخل ہوئے جب وہاں کے لوگ باہر کے حال سے بے خبر تھے کیونکہ مغرب اور عشاء

کے درمیان کا وقت تھا۔ ان کو وہاں دو آدمی ملے جو باہم دگر لڑ رہے تھے۔ جن میں سے ایک ان کے دوستوں میں سے اور دوسرا ان کے دشمنوں میں سے تھا۔ وہ شخص جو آپ کے دوستوں میں سے تھا اس نے آپ سے اس شخص کے خلاف مدد مانگی جو آپ کے دشمنوں میں سے تھا۔

پس موسیٰؑ نے اللہ کے حکم سے دشمن پر حملہ کر دیا اور اس کو ایک مکا مارا جس سے وہ مر گیا۔ تب انہوں نے کہا: یہ شیطان کا فعل ہے۔ اس سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ ان دونوں کی لڑائی شیطان کا فعل ہے نہ وہ کہ جو خود حضرت موسیٰؑ نے کیا تھا۔ اس پر مامون نے آپ سے کہا: اچھا تو اللہ کے اس قول کا مفہوم سمجھا دیجیے: رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ۔ (سورۂ قصص۔ آیت ۱۶) اے اللہ میں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے۔ پس تو مجھ کو بخش دے۔

امامؑ نے فرمایا: اس سے موسیٰؑ کا مدعا یہ تھا کہ اس شہر میں داخل ہو کر میں اپنے آپ کو ایک غیر موزوں مقام پر لے آیا۔ پس اے اللہ! تو مجھ کو معاف کر دے یعنی مجھ کو دشمنوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ، مبادا کہ وہ مجھ پر حاوی ہو جائیں اور مجھ کو قتل کر ڈالیں۔

اس پر مامون نے کہا: فرعون سے موسیٰؑ کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ: فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ۔ ہاں میں نے یہ کیا ہے اور اس وقت میں راستا سے بھٹک گیا تھا۔

امام علی رضاؑ نے فرمایا: فرعون نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ:

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكَافِرِیْنَ۔ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ۔ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۔

(سورۂ شعرا۔ آیت ۱۹ تا ۲۱)

تم نے وہ کام کیا جو تم نے کیا تھا اور تم ناشکروں میں سے ہو۔ موسیٰؑ نے کہا کہ جب میں نے وہ کیا اس وقت میں راستا سے بھٹک گیا تھا، یہاں تک کہ میں تمہارے شہروں میں سے ایک شہر پہنچ گیا اور میں تم لوگوں سے خوف کھا کر بھاگ نکلا۔ پھر اللہ نے مجھ کو اپنا پیامبر بنایا اور مجھ کو احکام دیے۔

اسی طرح اللہ نے اپنے حبیب محمد رسول اللہ سے بھی کہا ہے: اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی۔ کیا اس نے تم کو یتیم پا کر پناہ نہیں دی؟ گویا وہ کہہ رہا ہے کہ تم اکیلے تھے پھر بھی

لوگ تمہارے پاس پناہ لینے آتے تھے۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اور تم کو بھٹکا ہوا پایا پس اس نے ہدایت کی۔ یعنی تم کو تمہاری قوم کی نظر سے گم پایا، پس اس نے ان کو تمہاری معرفت کی ہدایت کی۔ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى۔ (سورہ ضحیٰ۔ آیت ۶ تا ۸) اور تم کو نادار پایا، پس غنی بنا دیا تاکہ تمہاری دعا قبول قرار پائے۔

مامون نے آپ سے اللہ کے اس قول کے معنی دریافت کیے حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا (سورۃ یوسف۔ آیت ۱۱۰) یہاں تک کہ جب انبیاءؑ مایوس ہو گئے اور سمجھے کہ ان کو جھوٹا سمجھا جائے گا تو ان کو ہماری مدد پہنچ گئی۔

اس آیت میں مامون کا شبہ اللہ کی مدد کے بارے میں پیغمبروںؑ سے مایوسی کی نسبت دینے پر تھا۔ حالانکہ اللہ نے ان سے مدد کا وعدہ کیا تھا اور اللہ سے مایوسی ان گناہوں میں ہے جن کو اس نے کفر کے برابر قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے: وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (سورۃ یوسف۔ آیت ۸۷) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کیونکہ اللہ کی رحمت سے کافر لوگوں کے علاوہ کوئی بھی مایوس نہیں ہوتا۔

اس لحاظ سے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک نبی کے دل میں مایوسی پیدا ہو جائے حالانکہ اللہ نے اس کو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب کیا ہے اور اس آیت کے مطابق مایوسی صرف کافروں ہی کو ہو سکتی ہے۔ امام علی رضاؑ نے اس کا یہ جواب دیا: اس آیت میں مایوسی کا تعلق اس مدد سے نہیں ہے جس کا وعدہ اللہ نے اپنے رسولؐ سے کیا تھا، بلکہ یہ اپنی قوم کے ان پر ایمان لانے اور ان کی رسالت کی تصدیق کے بارے میں ہے۔ گویا کہ وہ نبی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور ان کی قوم کو یہ خیال ہوا کہ ان کے نبیوں نے ان سے جھوٹ کہہ دیا تھا کہ ان کو اللہ کی مدد پہنچے گی۔

تب مامون نے آپ سے اللہ کے اس قول کے بارے میں دریافت کیا کہ: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (سورۃ یوسف۔ آیت ۲۴) اس عورت نے ان کے ساتھ برا ارادہ کیا اور اگر وہ اپنے رب کی حجت نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی اس کے ساتھ برا ارادہ کرتے۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا: اس عورت نے تو برا ارادہ کر لیا تھا اور اگر وہ پہلے سے اپنے رب کی حجت نہ دیکھے ہوتے وہ بھی ویسا ہی ارادہ کر لیتے، جیسا کہ اس عورت نے کیا تھا

لیکن وہ معصوم تھے اور معصوم گناہ کا خیال تو کر سکتا ہے لیکن اس کا مرتکب نہیں ہوتا۔ امامؑ نے مزید فرمایا: مجھ سے میرے والد بزرگوار اور ان سے ان کے والد بزرگوار امام جعفر صادقؑ نے بیان کیا کہ اس عورت نے ارادہ کیا کہ وہ فعل کرے اور یوسفؑ نے ارادہ کیا کہ وہ فعل نہ کریں۔ اس پر مامون نے کہا: اے ابوالحسن! اللہ آپ کا بھلا کرے آپ مجھے اللہ کے اس قول کے بارے میں بتایئے کہ: وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمَاتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (سورۂ انبیاء آیت ۸۷) اور جب ذوالنون غصہ میں آکر چلے اور ان کو خیال ہوا کہ ہم ان کو رزق پہنچانے میں تنگی نہ کریں گے تو انھوں نے تاریکی میں آواز دی کہ الٰہی تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں، تو ہی پاک و پاکیزہ ہے اور میں بے شک غلطی پر ہوں۔ امام علی رضاؑ نے فرمایا: یہ یونس بن متّی تھے جو اپنی قوم کی نافرمانی کی وجہ سے غصہ کر کے چلے گئے تھے۔ پس ان کو گمان ہوا یا یقین ہو گیا کہ اللہ ان کی روزی تنگ نہ کرے گا۔ امامؑ نے مزید فرمایا کہ ایسا ہی اللہ کا یہ قول ہے: وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ۔ (سورۂ فجر آیت ۱۶) اور جب اسکی آزمائش کرتا ہے تو اس کے رزق میں تنگی کر دیتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کے رزق میں کمی کر دیتا ہے فَنَادٰى فِي الظُّلُمَاتِ۔ یعنی انہوں نے رات کی تاریکی اور مچھلی کے پیٹ کے گھپ اندھیرے میں خدا کو پکارا تھا۔ چنانچہ اللہ نے دعا قبول کر لی۔

اور اللہ کہتا ہے: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ (سورۂ صافّات۔ آیت ۱۴۳، ۱۴۴) اگر وہ خدا کی تسبیح نہ کرتے رہے ہوتے تو روز قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہتے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ مامون نے آپ سے بعض ایسی آیات کے بارے میں مزید سوالات کیے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ایسے ہی اعضاء سے مرکب ہے اور وہ ان کو اسی طرح استعمال کرتا ہے جیسے انسان اپنی ضروریات کے لیے اپنے اعضاء کو استعمال کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس نے ابلیس سے کہا: مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔ (سورۂ صٓ۔ آیت ۷۵) کس چیز نے تجھ کو اسے سجدہ کرنے سے روکا کہ جسے میں نے اپنے ہاتھ سے خلق کیا ہے یا اس کا یہ قول: يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ

اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے'' اور وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ. (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۳۹)
تاکہ تم میری آنکھ کے سامنے پلو بڑھو۔

چنانچہ امام علیہ السلام مامون کے ان سوالوں کے ایسے ہی جواب دیتے رہے جو اللہ کی پاکیزگی و بزرگی کے لحاظ سے مناسب ہوں اور وہ بندوں سے کسی امر میں مشابہ نہ ہو۔ وہ حدود کے اندر گھرا ہوا نہ ہو اور نہ ایسی کیفیات سے دوچار ہو جو وقت یا مقام کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔
ہاں تو یہ امر ائمۂ اہلبیتؑ کے لیے نہ تو تعجب خیز ہے اور نہ کوئی نئی بات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی نشانی قرار دیا ہے اور امت کو اپنی مشکلات کے حل کے لیے ان سے رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے: فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (سورۂ نحل۔ آیت ۴۳) تم لوگ اہل ذکر سے پوچھ لیا کرو اگر تم خود نا واقف ہو۔

رہی یہ بات کہ امام علی رضاؑ کے ساتھ مامون کی علمی نشستوں کے متعلق بعض روایات اپنی اسناد کے لحاظ سے قابل وثوق نہیں ہیں تو بھی یہ امر ان کے مضامین پر اعتماد کرنے میں مانع نہیں ہے کیونکہ وہ اصول مذہب اور ان صحیح روایات کے مطابق ہیں جو اللہ کو ہر اس صفت سے بلند اور پاکیزہ قرار دیتی ہیں کہ جس سے وہ مخلوق کے مشابہ ہو جائے۔

احتجاج طبرسی میں اللہ کے اس قول کی تفسیر میں کہ: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ. اس روز کچھ چہرے بشاش ہوں گے جو اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ اس بارے میں امام علی رضاؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: اس آیت میں خدا نے یہ کہا ہے کہ ان کی آنکھیں اپنے رب سے ثواب ملنے کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ مزید کہا ہے کہ نبی اکرمؐ فرمایا کرتے تھے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس کسی نے میرے کلام کی تفسیر اپنی رائے سے کی گویا وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔ جس کسی نے مجھ کو میری مخلوقات سے تشبیہ دی اس کو میری معرفت نہیں ہوئی اور جس کسی نے میرے دین میں قیاس سے کام لیا وہ میرے دین میں نہیں ہے۔ پس جس کسی نے قرآن کی متشابہ آیت کو محکم آیت کی مدد سے سمجھا وہ صراط مستقیم کی ہدایت پا گیا۔ امام علیؑ رضاؑ نے یہ بھی کہا کہ جس کسی نے اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوقات سے تشبیہ دی وہ مشرک ہے اور جس کسی نے اس سے وہ شے منسوب کی جس سے اس نے منع کیا ہو تو وہ کافر ہے۔

راویوں کا بیان ہے کہ پیر اور جمعرات کے دو دنوں میں مامون کچہری میں بیٹھا کرتا تھا اور امام علی رضاؑ ان کی داہنی طرف جلوہ افروز ہوتے تھے۔ ایک دن اس کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا کہ کوفہ کے ایک صوفی نے چوری کی ہے۔ تب اس نے اس کو حاضر کیے جانے کا حکم دیا۔ اس کو صوفی کے چہرہ پر نیکی کے آثار نظر آئے تو اس نے کہا: اس قدر ظاہری رکھ رکھاؤ اور اس پر یہ قبیح فعل! صوفی نے کہا: میں نے مجبوراً یہ فعل کیا ہے اور اللہ کا ارشاد ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ یعنی اگر کوئی شخص مجبوراً گناہ کر بیٹھے اور اس کی نیت نافرمانی کی نہ ہو تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنیوالا ہے۔ اور اس پر کوئی گناہ نہیں۔ جبکہ حال یہ ہے کہ میں خمس اور غنیمت سے محروم کر دیا گیا ہوں۔ مامون نے کہا: تمہارا اس میں کتنا حق ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اللہ کا فرمان ہے: وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ۔ (سورۂ انفال۔ آیت ۴۱) یعنی جان لو کہ جو مال تم کو بطور غنیمت حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسولؐ اور ان کے ذوالقربیٰ کے لیے، نیز یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ آپ نے مجھ کو میرے حق سے محروم کر دیا ہے حالانکہ میں مسکین ہوں، مسافر ہوں اور حامل قرآن ہوں لیکن اس کے باوجود ہر سال دو سو دینار پانے سے محروم رہ جاتا ہوں۔ مامون نے کہا: تمہاری ان عجیب باتوں کے اثر سے میں چور کے لیے اس حد اور سزا کو معطل نہ کروں گا جو اللہ کے حکم میں مقرر کی گئی ہے۔ اس پر وہ شخص بولا: اچھا تو پہلے اپنے آپ سے شروع کیجیے اور خود کو طاہر کیجیے پھر کسی اور کو سزا دیجیے گا۔ مامون نے امام ابوالحسن علی رضاؑ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: اے ابوالحسنؑ! یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کہہ رہا ہے کہ جب میرا حق چرایا گیا ہے تو میں نے بھی چوری کر لی۔ اس پر مامون کو غصہ آ گیا اور بولا: بخدا کہ میں تمہارا ہاتھ کاٹوں گا۔ اس شخص نے کہا: کیا آپ میرے ہاتھ کاٹیں گے؟ حالانکہ آپ میرے غلام ہیں۔ مامون نے کہا: وائے ہو تم پر یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے کہا: کیا آپ کی ماں فیٔ کی رقم سے نہیں خریدی گئی؟ پس اس وجہ سے آپ مشرق سے مغرب تک سارے مسلمانوں کے غلام ہیں تا وقتیکہ وہ آپ کو آزاد نہ کر دیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوں اور میں نے آپ کو آزاد نہیں کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک نجس دوسرے نجس کو پاک نہیں

کرنا اور جس پر خود حد جاری ہونا ضروری ہے وہ دوسرے پر حد جاری نہیں کرسکتا تاوقتیکہ اپنے آپ سے ابتدا نہ کرے۔ کیا آپ نے اللہ کا یہ قول نہیں سنا کہ: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۴) کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم اور خود اپنے آپ کو فراموش کیے ہوئے ہو— حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو اور کیا تم کچھ سمجھتے نہیں ہو۔

تب مامون امامؑ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا: اے فرزند رسولؐ! اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے اپنے نبیؐ سے کہا: فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ. (سورۂ انعام۔ آیت ۱۴۹) اللہ ہی کی دلیل دور رس ہوتی ہے۔ وہ ایسی حجت ہے جو ہر ایک تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک جاہل بھی اپنے جہل کے باوجود اس کو جانتا ہے جس طرح کوئی عالم اسکو اپنے علم کی بنا پر جانتا ہے اور دنیا اور آخرت دونوں حجت ہی پر قائم ہیں۔ چنانچہ اس شخص نے حجت بھی اپنی پیش کردی ہے۔ راوی مزید بیان کرتا ہے کہ مامون نے اس صوفی کو چھوڑ دینے کا حکم تو اس کو امام علی رضاؑ پر غصہ آگیا تھا، گو اس نے اپنے اندر کی بات ظاہر نہیں کی۔

حسین ابن خالد سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام علی رضاؑ سے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت کے مثل خلق کیا۔ امامؑ نے فرمایا: اللہ ان لوگوں کو برباد کرے کہ انھوں نے حدیث کا پہلا حصہ حذف کردیا، جو یہ ہے کہ رسول اللہؐ دو آدمیوں کے پاس سے گزرے جو ایک دوسرے کو بُرا کہہ رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے یہ کہتے سنا: اللہ تیرے چہرہ کو اور ہر اس شخص کے چہرہ کو بگاڑ دے جو تیرا ہم شکل ہو۔ آنحضرتؐ نے اس سے کہا: اے بھائی! ایسا نہ کہو، اس لیے کہ اللہ نے آدمؑ کو بھی اسی شخص کی شکل کے مثل بنایا تھا۔

ابراہیم بن محمود سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام علی رضاؑ سے کہا: آپ اس حدیث کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو اکثر لوگ رسول اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: اللہ ہر روز دنیا کے آسمان پر اتر آتا ہے۔ امامؑ نے جواب دیا: لفظوں کو ان کے مقام سے ہٹانے والوں پر اللہ لعنت کرے۔ بخدا کہ آنحضرتؐ نے اس طرح نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا تھا: اللہ جمعہ کی اول شب میں اور دوسری ہر رات کے

آخری تہائی حصہ میں آسمان دنیا پر ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ یہ ندا دیتا ہے: کوئی ہے جو سوال کرے اور میں اس کو دوں، کوئی ہے توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں اور کوئی ہے گناہوں کی بخشش طلب کرنے والا کہ میں اس کو بخشش دوں۔ پھر وہ یہ آواز لگاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح نمودار ہو جاتی ہے۔ پس جب صبح ہو جاتی ہے تو وہ فرشتہ آسمانوں میں اپنے مقام پر واپس چلا جاتا ہے۔

احتجاج طبرسی میں یزید بن عمیر شامی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں مَرو میں امام علیؑ بن موسیٰؑ (رضاؑ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! ہم کو امام جعفرؑ بن محمدؑ (صادقؑ) سے روایت ملی ہے کہ آپ نے فرمایا: نہ جبر ہے نہ اختیار بلکہ دونوں کے درمیان کی صورت ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: جو یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے افعال کو خود اللہ ہی انجام دیتا ہے اور پھر ہم کو ان پر سزا بھی دیتا ہے تو وہ جبر کا قائل ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے خلق کرنے اور رزق پہنچانے کا کام بھی بندوں کے اختیار میں دیدیا ہے، وہ تفویض کا قائل ہے۔ پس جبر کا قائل کافر ہے اور تفویض کا قائل مشرک ہے۔ تب میں نے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! پھر ان دونوں کے درمیان کی صورت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ یہ ہے کہ جس فعل کے بجا لانے کا حکم دیا جائے اس کے بجا لانے کا اور جس سے منع کیا گیا ہو اس کے ترک کرنے کا ذریعہ موجود ہو۔ میں نے عرض کیا: اس میں اللہ کی مشیئت اور ارادہ کو بھی کچھ دخل ہے؟ آپ نے فرمایا: اطاعت کے معاملہ میں اللہ کا ارادہ اور مشیئت اس کے کرنے کا حکم دینا اور اس میں مدد دینا ہے اور گناہوں کے معاملہ میں اس کا ارادہ ان سے روکنا، ان پر ناخوش ہونا اور ان میں مدد نہ کرنا ہے۔ میں نے عرض کیا: کیا اس میں قضاء یعنی آخری فیصلہ کا اختیار اللہ کو ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! بندوں میں سے کوئی شخص جو بھی اچھا یا برا فعل کرتا ہے، اس کا آخری فیصلہ یعنی قضا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے عرض کیا: یہاں قضا کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ فیصلہ کرنا کہ وہ افعال دنیا اور آخرت میں کس قدر ثواب یا عذاب کے مستحق ہیں۔

جبر و تفویض کے سلسلہ میں آپ سے ایک اور روایت کی گئی ہے کہ: نہ جبر کے ذریعے اللہ کی اطاعت اصل اطاعت ہے نہ جبر کے تحت اس کی نافرمانی اصل نافرمانی ہوگی۔

اس نے بندوں کو اختیار دیکر کھلا نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ جو کچھ اس نے ان کو دیا ہے اس پر خود اس کو بھی اختیار ہے اور جو قوت ان کو دی ہے وہ اس پر ان سے زیادہ قادر ہے۔ اگر بندے اس کی اطاعت میں ہوں تو اللہ ان کو اس سے روکے یا ہٹائے گا نہیں اور جب وہ اس کی نافرمانی پر اتر آئیں تو اگر وہ چاہے تو ان کے اور ان کے فعل کے درمیان حائل ہو جائے۔ اگر وہ حائل نہ ہوا تو وہ اس کے مرتکب ہو جائیں گے۔ پس اس میں ان کو وہ خود مشغول نہیں کرتا۔ اس کے بعد امام ؑ نے فرمایا: جو کوئی اس گفتگو کو ذہن نشین کرلے گا وہ اپنے مخالف کا مقابلہ کر سکے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ حسین بن خالد نے آپ سے عرض کیا: اے فرزند رسول ؐ! ان حدیثوں کی بنا پر جو آپ کے آبار کرام ؑ سے آئی ہیں لوگ ہم کو تشبیہ اور جبر سے منسوب کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے ابن خالد! ذرا یہ بتاؤ کہ وہ حدیثیں زیادہ ہیں جو جبر و تشبیہ کے متعلق میرے آبار کرام ؑ سے روایت ہوئی ہیں یا وہ جو اس بارے میں نبیٔ اکرم ؐ سے وارد ہوئی ہیں زیادہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: گویا لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ تشبیہ اور جبر کے قائل تھے۔ میں نے عرض کیا: لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ؐ ایسی کسی بات کے قائل نہ تھے بلکہ خود ان لوگوں ہی نے ان کے نام سے روایتیں بیان کی ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پھر میرے آبار کرام ؑ نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ آپ نے مزید فرمایا: جو کوئی تشبیہ و جبر کا قائل ہو وہ کافر اور مشرک ہے اور ہم اس سے دنیا و آخرت میں بری الذمہ ہیں۔ اے ابن خالد! جبر و تشبیہ کے متعلق وہ حدیثیں ہمارے نام سے ان غالیوں نے بیان کی ہیں جو اللہ کی عظمت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ پس جو کوئی ان سے تعلق رکھتا ہے وہ ہم سے دوری کرتا ہے اور جو ان سے نفرت کرتا ہے وہ ہمارے قریب ہے۔ جو ان سے دوستی رکھتا ہے وہ ہم سے دشمنی رکھتا ہے اور جو ان سے دشمنی رکھتا ہے وہ ہم سے دوستی رکھتا ہے۔ جو ان سے میل ملاپ رکھتا ہے وہ ہم سے قطع تعلق کرتا ہے۔ جو ان پر سختی کرتا ہے وہ ہمارے ساتھ نیکی کرتا ہے اور جو ان کو ذلیل سمجھتا ہے وہ ہماری عزت قائم کرتا ہے۔ پھر اسی طرح امام ان سے اور ان کے طریقوں سے متنبہ کرتے رہے اور آخر میں فرمایا: جو ہمارے شیعہ اور فرمانبردار ہیں وہ ان غالیوں کو نہ اپنا دوست بناتے ہیں اور نہ ان سے کوئی مدد

حاصل کرتے ہیں۔

راویوں کا بیان ہے کہ آپ نے یہودیوں، عیسائیوں، صابئیوں وغیرہ سے بھی مناظرے کیے اور اسی طرح اصول اسلام کے بارے میں مختلف عقائد رکھنے والے مسلم فرقوں سے ان موضوعات پر مناظرے کیے جن میں بحثیں ہوتی رہتی تھیں اور جن کے ذریعے ایک لحاظ سے معتزلہ اور دوسرے محدثین و فقہاء کے مابین فرق واضح ہو جاتا تھا۔ تاہم ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم وہ سب کچھ بیان کریں جو امام علی رضاؑ کے ان مناظروں کے بارے میں روایت کیا گیا ہے۔ البتہ ہم نے آپ کے چند ایک جوابات اور مناظرے پیش کر دیے ہیں تاکہ وہ ہادیانہ اسلوب اور علوی روش قاری کے سامنے آجائے جو ائمہ کرامؑ دوسروں کے ساتھ اپنی گفتگوؤں اور مناظروں میں اختیار فرمایا کرتے تھے۔

امام علی رضا کے زمانہ میں شریعت کی کیفیت

دوسرے ائمہ کرام کی مانند امام علی رضاؑ بھی اپنے زمانہ کے حکمرانوں کی سخت نگرانی میں رہے۔ حالانکہ یہ حضرات حکومت کے خلاف اقدام کرنے اور اقتدار حاصل کرنے کے متعلق سوچتے بھی نہ تھے، جس کے لیے دوسرے لوگ آپس میں مقابلہ آزما رہتے تھے۔ ان کو تو صرف یہ فکر تھی کہ اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور ان کے متعلق صحت مند بحث و استدلال کے ذریعے اس کی حفاظت کے لیے مناسب فضا قائم کر دیں۔ چنانچہ دوسرے ائمہ کرامؑ کی طرح امام علی رضاؑ بھی اس مقصد کے لیے مختلف موقعوں سے استفادہ فرماتے رہے۔ خلیفہ ہارون کی قید میں آپ کے والد بزرگوار کی شہادت واقع ہونے کے بعد آپ کے لیے کار ہدایت کا انجام دینا قدرے آسان ہو گیا تھا۔ اگرچہ حکومت کے تمام ادارے آپ کے قول و فعل کی کڑی نگرانی کرتے اور ہارون کو آپ کے خلاف بھڑکانے کی بارہا کوشش کرتے تھے تاکہ آپ کو پریشان کرنے میں وہ بھی ان ظالموں کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ وہ یہ کوششیں اس لیے کرتے تھے کہ اکثر لوگ اس عظیم علمی سرمایہ سے استفادہ کرنے کے لیے آپ کے گرد جمع رہتے تھے جو آپ کو اپنے آباء کرامؑ اور جد امجد محمد رسول اللہؐ سے حاصل ہوا تھا، جنہوں نے ان ائمہ کرام کو اپنے بعد اس کار رسالت کا امین قرار دیا تھا لیکن اللہ کو یہ منظور تھا کہ آپ اس دشوار منزل سے گزر کر اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد تقریباً بیس سال

تک زندہ رہیں اور آئندہ نسلوں کے لیے علم و حکمت کے ہر میدان میں اپنے افادات کا ایسا عظیم سرمایہ چھوڑ جائیں جو ان کو راہ حیات میں ٹھوکر کھانے سے محفوظ رکھے بشرطیکہ وہ اس علمی خزانے سے استفادہ کریں جو آپ نے اور آپ کے آباءِ کرامؑ نے آداب شریعت، ہدایت اور دین کے مختلف موضوعات پر اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔

یہ امر میرے امکان میں نہیں ہے کہ جو کچھ امام ابوالحسن علی رضاؑ نے ان علمی موضوعات پر اور خاص کر شریعت اور حدیث میں جو سرمایہ چھوڑا ہے اس کو یہاں پیش کرسکوں کیونکہ شیعی فقہ اور حدیث کی ضخیم کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں۔ چنانچہ کسی قاری کو فقہ کی ایسی فصلیں اور باب کم ہی ملیں گے جن میں امام علی رضاؑ کے اقوال یا احادیث موجود نہ ہوں۔ بلکہ بعض فقہی ابواب میں تو ایک ہی مقام پر آپ کی دسیوں حدیثیں ملیں گی۔ علماء کے ایک گروہ نے آپ سے فقہ کی ایک کتاب بھی منسوب کی ہے جس کا نام وہ "فقہ رضوی" بتاتے ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ان کتابوں میں سے ہے جو خود آپ کی دستی تحریر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ قم کے کچھ لوگ اس کا ایک نسخہ مکہ مکرمہ لے گئے جہاں اس کو قاضی امیر سید حسن اصفہانی نے دیکھا تو یہ نتیجہ نکالا کہ اس کا مؤلف غالباً امام علی رضاؑ کا ہمنام رہا ہوگا لیکن مؤلف کا یہ کہنا کہ "میں نے عالم سے سنا" جبکہ حدیثوں کی کتابوں میں "عالم" امام موسیٰ کاظمؑ کا لقب ہے۔ پھر مؤلف کا یہ کہنا کہ مجھ سے میرے والد نے فرمایا، میں نے اپنے والد سے سنا اور اسی قسم کے دوسرے قرینوں سے قاضی امیر سید حسن اصفہانی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کتاب امام علی رضاؑ کی تالیفات میں سے ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان لوگوں سے اس کی ایک نقل حاصل کرلی اور اس کو اپنے ساتھ اصفہان لے گئے۔ وہاں جاکر انھوں نے اس سارے معاملہ سے علامہ مجلسی کے والد کو مطلع کیا۔ چنانچہ ان دونوں نے اس پر غور کیا اور پھر امام علی رضاؑ سے اس کتاب کی نسبت کو صحیح قرار دیا۔ بعد میں علامہ مجلسی نے اپنی کتاب بحار الانوار کے لیے دیگر کتابوں کے ساتھ اس کو بھی ایک بنیادی کتاب کے طور پر استعمال کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اس کتاب کو امام علی رضاؑ سے منسوب نہیں کیا گیا تھا۔ بعض ممتاز علماء نے اس کتاب کو شیخ صدوق کے والد علی بن موسیٰ کی تالیف بتایا ہے، جس کو صدوق ابوجعفر بن بابویہ نے اپنی کتاب من لایحضرۃ الفقیہ میں جمع کرلیا ہے۔

علی بن موسیٰ نے اس میں وہ احادیث جمع کی ہیں جن کی اسناد امام علی رضاؑ تک پہنچتی ہیں۔ البتہ انہوں نے وہ اسناد درج نہیں کی ہیں کیونکہ وہ محض روایت کے مضمون کی بنیاد پر فتوے جاری کیا کرتے تھے۔ غالباً دو ناموں کے مشابہ ہونے سے اصفہانی وغیرہ کو اس کتاب کے امام علی رضاؑ سے منسوب کرنے میں تسامح ہوا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ کتاب ابن ابی عزاقہ معروف بہ شلمغانی کی ہے۔ اسی طرح شیخ آغا بزرگ طہرانی نے اپنی کتاب اجازہ میں اس کو سید حسن صدر سے منسوب کیا ہے اور اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ تاہم صورتِ حال جو بھی رہی ہو اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کتاب امام علی رضاؑ کی تالیفات میں سے ہے یا کسی اور کی ہے کیونکہ اس کی بیشتر روایات آپ ہی سے وارد ہوئی ہیں اور یہ آپ ہی کی احادیث پر مشتمل ہے۔ البتہ ان حدیثوں کو جمع کرنے والے نے ان کی سندوں کو نظر انداز کر دیا ہے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ امام علی رضاؑ کی تالیف ہے۔

وہ کتابیں جو محدثوں نے امام علی رضاؑ سے منسوب کی ہیں ان میں ایک رسالہ طب بھی ہے۔ جس کے متعلق ان کا کہنا کہ وہ خلیفہ مامون کی خواہش پر لکھا گیا تھا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق محمد بن جمہور کے واسطہ سے اور ایک دوسری روایت کے مطابق حسن بن محمد نوفلی کے واسطہ سے اس کی سند امام علی رضاؑ تک پہنچتی ہے۔

تفسیر نجاشی میں ہے کہ محمد بن جمہور ایک قابل وثوق اور جلیل القدر شخص تھے۔ انہوں نے امام علی رضاؑ کی ایک کتاب کے بارے میں روایت کی ہے لیکن اس کے موضوع کا ذکر نہیں کیا، جس سے بعض افراد کو گمان ہوا کہ یہ کتاب وہی رسالۂ ذہبیہ ہے جو طب سے متعلق ہے۔ نیز یہ کہ نوفلی بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے امام علی رضاؑ کی اس کتاب کے متعلق روایت کی ہے۔ غالباً امام علی رضاؑ سے اس رسالہ کی نسبت کا معاملہ کتاب فقہ کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور بہتر طریقہ پر ثابت ہے۔

صحیفۃ الرضاؑ اور محض الاسلام و شرائع الدین بھی ان کتابوں میں ہیں جو امام علی رضاؑ سے منسوب ہوئی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی سند بھی محدثین کی جماعت کے ذریعہ آپ تک پہنچتی ہے لیکن بعض افراد اس نسبت کے صحیح ہونے میں شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی

طرح بعض لوگ اجوبۂ مسائل، ابن سنان اور علل ابن شاذان وغیرہ کو آپکی تالیف مانتے ہیں۔

جیساکہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ وہ تالیفات جو امام علی رضاؑ سے منسوب کی جاتی ہیں ان کی آپ سے یہ نسبت صحیح ہو نہ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس میں شک نہیں ہے کہ ان تالیفات کا بیشتر مواد آپ ہی کے جوابوں، مناظروں اور حدیثوں پر مشتمل ہے۔

احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی

امام علی رضاؑ کے اور آپ کے والد بزرگوار کے شاگردوں کی ایک جماعت نے مختلف موضوعات پر روایات حاصل کی ہیں۔ انہی میں احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی ہیں جو آپ کے قابل اعتماد صحابیوں میں سے تھے۔ جیساکہ شیخ محمد طہٰ کی کتاب اتقان المقال میں آیا ہے کہ انہوں نے آپ سے ایک کتاب کی روایت کی ہے۔ ابو عمر کشی اخبار الرجال میں لکھتے ہیں کہ اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ بزنطی جس چیز کو صحیح قرار دیں وہ صحیح ہے۔ نیز وہ فقہ کے بارے میں ان پر پوری طرح بھروسہ کرتے ہیں۔ علم رجال میں لکھنے والے ہر مؤلف نے اس بات کی تائید کی ہے کہ وہ امام علی رضاؑ اور ان کے فرزند امام محمد جوادؑ سے روایت کرتے تھے اور وہ ان دونوں اماموںؑ کے نزدیک بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔

ابراہیم بن محمد اشعری

آپ امام ابوالحسن موسیٰؑ بن جعفرؑ اور امام علی رضاؑ کے اصحاب میں سے ہیں۔ انہوں نے دونوں اماموںؑ سے روایتیں کی ہیں اور اپنے بھائی فضل بن محمد اشعری کی شراکت میں ان روایات سے ایک کتاب تالیف کی، جیساکہ اتقان المقال اور رجال کی دوسری کتابوں میں کہا گیا ہے۔

حسین بن بشار

آپ امام علی رضاؑ اور آپ کے والد بزرگوار سے روایت کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کے بعد امام علی رضاؑ کی امامت میں شک تھا۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ جب امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کی شہادت ہوگئی تو میں علی بن موسیٰؑ کے پاس گیا۔ جبکہ مجھ کو ان کے والد بزرگوار کے شہادت پاجانے کا یقین نہیں تھا اور نہ میں ان کی امامت کا اقرار کرتا تھا۔ میں اجازت لے کر آپ کی خدمت میں گیا تو آپ نے مجھ کو اپنے قریب بٹھالیا۔ میں آپ سے آپ کے والد بزرگوار کے متعلق کچھ پوچھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ خود آپ نے پہل کی اور فرمایا: اے حسین! اگر تم چاہتے ہو

کہ اللہ تمہاری طرف اور تم اللہ کی طرف بغیر کسی حجاب کے نظر کرو تو آل محمدؐ سے اور ان میں جو بھی ولی امر ہو اس سے محبت رکھو۔ میں نے عرض کیا: ہاں! میں اللہ کی طرف اکثر دیکھتا ہوں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اس پر میں نے آپ کے والد بزرگوار کی وفات اور آپ کی امامت کا یقین کر لیا ہے۔

احمد بن محمد بن عیسیٰ اشعری

انتقان المقال میں شیخ محمد طہٰ کے بیان کے مطابق احمد بن محمد بن عیسیٰ اشعری قم کے شیخ، فقیہہ اور نمایاں فرد تھے۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ وہ ایسے صاحب وجاہت تھے کہ بادشاہ سے ان کی ملاقات رہا کرتی تھی۔ وہ امام علی رضاؑ سے حدیث سننے اور ان کی طرف سے روایت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک کتاب تالیف کی تھی جس کو ان کے ہمعصروں کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے۔ ان کو امام تقیؑ اور امام علی نقیؑ کا زمانہ بھی ملا اور انہوں نے ان دونوں اماموں سے بھی روایت کی ہے۔ امام ابو جعفر تقیؑ کی شہادت کے بعد انہوں نے امام علی نقیؑ کی امامت کی تائید کی تھی۔

حسن بن محبوب سراد

حسن بن محبوب سراد نے امام ابوالحسن علی رضاؑ سے علم حاصل کیا اور روایت کی ہے۔ علمائے رجال نے ان کا شمار 'اصحاب اجماع' میں کیا ہے جن پر لوگوں کو علم و فقہ کے بارے میں پورا پورا بھروسہ تھا' جیسا کہ اس جملے ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔

عبداللہ بن طاؤس

عبداللہ بن طاؤس نے امام علی رضاؑ سے اخذ علم کیا تھا۔ پھر آپ سے اور آپ کے فرزند امام تقیؑ کی طرف سے روایت کرتے رہے۔ حسن ابن احمد مالکی نے ان سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابوالحسن علی رضاؑ سے پوچھا: میرے بھائی کا ایک بیٹا ہے جس سے میں نے اپنی بیٹی کی تزویج کر دی ہے لیکن وہ شراب پیتا ہے اور اکثر میری بیٹی کو طلاق دینے کی بات کرتا رہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر وہ تمہارے بھائیوں میں سے (یعنی شیعہ) ہے تو پھر اس کے ذمہ کچھ نہیں ہے لیکن اگر وہ ان (سنی) لوگوں میں سے ہے تو لڑکی کو اس سے علٰحدہ کر لو کیونکہ اس کے اس قول کا مطلب طلاق ہے۔ میں نے عرض کیا: میں نے آپ کے آباء کرامؑ سے یہ حدیث سنی ہے کہ ایک ہی نشست میں تین مرتبہ طلاق دی ہوئی عورتوں سے نکاح نہ کرنا کیونکہ وہ

اپنے انہی شوہروں کی بیویاں ہوتی ہیں۔ تب آپ نے فرمایا: یہ حکم تمہارے شیعہ بھائیوں کے لیے ہے نہ کہ دوسروں کے لیے ہے۔ جو شخص جس قوم کے مسلک پر ہوگا اس پر اسی کے قوانین نافذ ہوں گے۔

راوی مزید کہتا ہے کہ میں نے آپ سے کہا: یحییٰ بن خالد برمکی نے آپکے والد بزرگوار موسیٰ بن جعفر کو زہر دیا تھا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اس نے ان کو تین کھجوروں میں زہر ملا کر دیا تھا۔ میں نے عرض کیا: کیا ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ زہر آلود ہیں؟ آپ نے فرمایا: ان کا محدث غیر حاضر ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا: محدث کون ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ ایک فرشتہ ہے جو جبرئیل اور میکائیل سے زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ وہ پہلے رسول اللہؐ کے ساتھ رہتا تھا اور اب ائمہؑ کے ساتھ رہتا ہے۔ نیز یہ کہ ہر شے جو طلب کی جائے وہ ملتی نہیں ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: اے بندۂ خدا! تمہاری عمر بہت ہو گی۔ چنانچہ وہ بزرگ یعنی عبداللہ بن طاؤس سو برس تک زندہ رہے۔

احمد بن عمر حلبی

احمد بن عمر حلبی امام علی رضاؑ کے معتمد اصحاب اور راویان حدیث میں سے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے کہا: میں نے مقام منیٰ پر امام ابوالحسن علی رضاؑ سے ملاقات کی اور ان سے عرض کیا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں، ہم اپنے گھر میں دولت، نعمت اور خوشی کی زندگی گزار رہے تھے لیکن اللہ نے ہم سے یہ سب کچھ لے لیا یہاں تک کہ ہم ان لوگوں کے محتاج ہو گئے جو کبھی ہمارے محتاج ہوا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: اے احمد! تم کتنے اچھے حال میں ہو۔ کیا تم اس سے خوش ہوتے کہ تمہارے لیے یہ دنیا سونے سے پُر ہو جاتی اور تم کو تھوڑا سا وہ آرام مل جاتا جو آج ان ظالموں کو حاصل ہے۔ میں نے عرض کیا: نہیں، بخدا نہیں، اے فرزند رسولؐ! اس پر آپ نے ہنس کر فرمایا: کیا یہ تمہارے لیے بشارت نہیں ہے کہ تم یہاں سے جاؤ گے تو کسی کا حال تم سے بہتر نہ ہوگا کیونکہ تمہارے ہاتھ میں ایسی چیز ہو گی جس کو تم دنیا بھر کا سونا لیکر بھی بیچنا پسند نہ کرو گے؟ میں نے عرض کیا: بے شک اللہ نے مجھ کو آپ کے اور آپ کے ابار کرامؑ کے ذریعہ فرحت عطا کی ہے۔ تب آپ نے فرمایا: اللہ کا قول ہے کہ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا۔ (سورۂ کہف۔ آیت ۸۲) اس کے نیچے ان دو لڑکوں کا خزانہ دبا تھا۔ اس کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ نے فرمایا: یہ ایک سونے کی تختی تھی جس پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لکھا تھا اور اس کے بعد

برکہ میں تعجب کرتا ہوں اس شخص پر جو موت پر یقین رکھتا ہے پھر خوش کیسے ہو سکتا ہے؟ جو دنیا والوں سے اس دنیا کے پھر جانے کو دیکھتا ہے، پھر وہ اس پر بھروسہ کس طرح کر لیتا ہے؟ جو شخص اللہ سے غافل رہے اس کو چاہیے کہ اللہ سے اپنے رزق میں کمی کی شکایت نہ کرے اور اس کے فیصلہ پر اس کی شکایت نہ کرے۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا: کہو اے احمد خوش ہو؟ میں نے عرض کیا: ضرور! میں اللہ سے اور آپ اہلبیتؑ سے خوش ہوں۔

علی بن عبید اللہ

آپ کے خاص اصحاب اور راویان حدیث میں علی بن عبید اللہ بن حسینؑ بن علیؑ بن حسینؑ بھی ہیں۔ اتقان المقال میں ہے کہ وہ آل ابی طالبؑ میں اپنے زمانہ کے بڑے زاہد اور عابد تھے۔ وہ دو اماموں یعنی امام موسیٰؑ بن جعفرؑ اور امام علیؑ بن موسیٰؑ کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ محمد بن ابراہیم طبا طبا نے چاہا کہ وہ ان کے بعد ولی عہدی کے لیے ابوالسرایا کی بیعت کر لیں لیکن انہوں نے اس سے انکار کر دیا اور یہ ذمہ داری محمد بن محمد بن زید بن علیؑ پر ڈال دی۔ انہوں نے حج کے موضوع پر ایک کتاب تالیف کی تھی جس کو امام ابوالحسن علیؑ بن موسیٰؑ سے لی ہوئی حدیثوں سے مرتب کیا گیا تھا۔

انہی احمد بن محمد بن عیسیٰ نے سلیمان بن جعفر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: مجھ کو امام ابوالحسن علی رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا تھی لیکن ان کے مرتبہ اور ہیبت کی وجہ سے وہاں جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ پھر اتفاق سے ایسا ہوا کہ امام ابوالحسن کچھ علیل ہو گئے اور میں آپ کی عیادت کے لیے گیا تو آپ مجھ سے نہایت عزت و احترام سے پیش آئے۔ جس سے میں بہت ہی خوش ہوا۔ اس کے بعد جب علی بن عبید اللہ بیمار ہوئے تو امام ابوالحسن علی رضاؑ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ راوی کا بیان ہے کہ مجھ کو میری ایک کنیز نے بتایا کہ اس وقت علی کی بیوی ام سلمہ پردے کے پیچھے سے دیکھتی رہی اور جونہی امام ابوالحسنؑ وہاں سے گئے اس نے آکر اس مقام کو جہاں امامؑ بیٹھے تھے چوما اور اس پر ہاتھ پھیرے۔ جب اس نے یہ بات مجھ کو بتلائی تو میں نے اس کا امام ابوالحسنؑ سے ذکر کیا۔ تب آپ نے فرمایا: اے سلیمان! علی بن عبید اللہ اور اس کے بیوی بچے اہل جنت میں سے ہیں۔ خدا جب علیؑ و فاطمہؑ کی اولاد میں سے کسی کو معرفت عطا کر دے تو پھر وہ عام لوگوں کی مانند نہیں رہتا۔

علاوہ ازیں آپ کے شیعوں میں سے کثیر افراد نے آپ سے روایتیں حاصل کی ہیں، جیساکہ علمائے رجال کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ دوسرے محدثوں نے جیسے کہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں، ثعلبی نے اپنی تفسیر میں، نیز سمعانی اور ابن معتز نے اپنے اپنے رسالہ میں آپ سے روایتیں لی ہیں۔ ان کے علاوہ ایوب بن ابی منصور نیشاپوری، ابوالصلت عبدالسلام بن صالح ہروی، علی بن مہدی بن صدقہ، داؤد بن سلیمان بن یوسف قاری قزوینی، آدم بن ابی ایاس، نصر بن علی الجہضمی اور محمد بن رافع القشیری وغیرہ نے آپ سے روایت کی کہ جن کا شمار ہمارے امکان سے باہر ہے۔

امام علی رضاؑ کے اقوال اور نصائح

تحف العقول میں روایت ہے کہ امام رضاؑ نے فرمایا: انسان کی عقل اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک اس میں دس خصلتیں نہ پیدا ہو جائیں۔ دوسرے لوگ اس سے نیکی کی امید کریں، اس کے شر سے لوگ محفوظ ہوں، وہ دوسرے کی تھوڑی سی بھلائی کو زیادہ تصور کرے اور اپنی زیادہ بھلائی کو بھی کم خیال کرے۔ اس کے سامنے حاجتیں پیش کی جائیں تو وہ اکتائے نہیں، عمر بھر علم حاصل کرنے سے تھکے نہیں۔ اللہ کی راہ میں ناداری اس کو دولتمندی سے زیادہ محبوب ہو، اللہ کی راہ میں ذلت اس کے دشمنوں کی دی ہوئی عزت سے زیادہ محبوب ہو، وہ شہرت سے زیادہ گمنامی کی خواہش کرے اور دسویں یہ کہ جب وہ کسی کو دیکھے تو کہے کہ یہ مجھ سے بہتر اور مجھ سے زیادہ متقی ہے۔ پھر اس کے ساتھ اتنی انکساری کرے کہ وہ اسی کے برابر ہو جائے۔ جو کوئی ایسا کرے گا اس کا مرتبہ بڑھے گا، اس کی نیکیاں قبول ہوں گی، اس کا ذکر اچھائی سے کیا جائے گا اور وہ اپنے زمانہ کے لوگوں پر امتیاز حاصل کرلے گا۔

آپ سے پوچھا گیا کہ کون لوگ نیک ہیں؟ آپ نے فرمایا: نیک لوگ وہ ہیں کہ جو نیکی کریں تو خوشی محسوس کرتے ہیں اور برائی کریں تو طلب مغفرت کرتے ہیں۔ جب ان کو کچھ دیا جائے تو وہ شکرادا کرتے ہیں۔ جب مصیبت میں ہوں تو صبر سے کام لیتے ہیں اور جب ان کو غصہ آجائے تو درگزر کرتے ہیں۔

آپ فرمایا کرتے: اگر کسی شخص میں یہ پانچ خصلتیں نہ ہوں تو اس کو دنیا و آخرت میں کسی

چیز کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ جس کو اپنی رائے کے باوثوق ہونے کا علم نہ ہو۔ جس کی طبیعت میں سخاوت اور جس کی عادات میں استقلال نہ ہو، جس کے دل میں شرافت نہ ہو اور جس کو اللہ کا خوف نہ ہو۔

پھر یہ بھی فرمایا: اللہ بیکار باتیں بنانے، مال کو ضائع کرنے اور مانگتے رہنے سے نفرت کرتا ہے۔ حمیت یہ نہیں کہ کسی شے کو ترک کر دیا جائے بلکہ اس کو کم کر دیا جائے۔ ایک سخی شخص دوسروں کے ہاں اس لیے کھاتا ہے تاکہ وہ بھی اس کے یہاں کھائیں۔ کبھی کبھی ایسا زمانہ بھی آتا ہے جس میں دس میں سے نو حصے بہتر یہ ہے کہ لوگوں سے دُور رہا جائے اور ایک حصہ یہ کہ خاموشی میں وقت گزارا جائے۔

علی بن شعیب کا بیان ہے کہ: میں امام ابوالحسن علی رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھ سے فرمایا: اے علی! کون شخص بہترین طریقہ پر زندگی بسر کرتا ہے؟ میں نے عرض کیا: اے آقا! آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ تب آپ نے فرمایا: اے علی! بہترین زندگی وہ گزارتا ہے جس کے ذریعے دوسرے لوگ بھی اچھی زندگی گزاریں۔ اے علی! سب سے بری زندگی اس کی ہے جس کے ذریعے دوسرے لوگ اچھی زندگی نہ گزار سکیں۔ اے علی! پالتو جانوروں کو اچھی طرح رکھو کیونکہ وہ گریز پا ہوتے ہیں، جب اپنے گروہ سے الگ ہو جائیں تو پھر اسی کے پاس پلٹ جاتے ہیں۔ اے علی! بدترین شخص وہ ہے جو دوسروں کی میزبانی نہ کرے، اکیلا کھائے اور اپنے غلاموں کو کوڑے مارے۔ اللہ سے اچھی امید رکھو کیونکہ جو کوئی اللہ سے اچھی امید رکھے گا اس کے لیے اللہ اس کی امید کے مطابق ہی ہو گا۔ جو کوئی تھوڑے سے رزق سے مطمئن ہو جائے اس کا تھوڑا سا عمل بھی قبول کر لیا جائے گا۔ جو تھوڑے سے حلال رزق سے مطمئن رہے گا اس کی مصیبت کم ہو جائے گی۔ اس کے اہل وعیال خوش رہیں گے۔ اللہ اس کو دنیا کے دکھوں کا علاج سمجھا دے گا اور اس کو سلامتی کے ساتھ دنیا سے جنت کی طرف لے جائے گا۔ کنجوس کو راحت نہیں، حاسد کو چین نہیں، شکایت کرنے والے میں وفا نہیں اور جھوٹے میں مروت نہیں ہوتی۔

آپ نے فرمایا: اللہ نے تین چیزوں کا حکم دیا اور تین ان کے شامل رکھیں۔ چنانچہ اس نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا، پس جو کوئی نماز ادا کرے اور زکوٰۃ ادا نہ کرے اس

کی نماز قبول نہ ہوگی۔ اس نے اپنا شکر اور والدین کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: آنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ (سورۂ لقمان۔آیت ۱۴) میرا بھی شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کا بھی۔ پس جس نے اپنے ماں باپ کا شکر ادا نہیں کیا گویا اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔ اسی طرح اسنے اللہ سے ڈرنے اور رشتہ دار کا لحاظ رکھنے کا اکٹھے حکم دیا پس جو رشتہ دار کا لحاظ نہیں رکھتا گویا وہ اللہ سے بھی نہیں ڈرتا۔

امامؑ نے مزید فرمایا: پانچ باتوں کے بغیر دولت جمع نہیں ہوتی۔ یعنی سخت کنجوسی، لمبی آرزوئیں زیادہ لالچ، رشتہ دار سے بے رحمی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا۔ آدمی کو چاہیے کہ کسی روز خوشبو کا استعمال ترک نہ کرے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو ایک دن چھوڑ کر اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو پھر ہر جمعہ کو خوشبو لگائے۔

کتاب ذخیرہ میں ہے کہ آپ نے فرمایا: جو اپنا محاسبہ خود کرتا ہے وہ فائدہ میں رہتا ہے۔ جو اس کام سے غافل رہتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے وہ امن میں رہتا ہے۔ جو غور کرتا ہے وہ اصلیت کو دیکھ لیتا ہے اور جو دیکھ لیتا ہے وہ سمجھ لیتا ہے۔ بہترین دولت وہ ہے جس کے ذریعہ تمہاری عزت محفوظ رہے۔ بہترین عقل وہ ہے کہ جس سے انسان کو اپنی ذات کی معرفت ہو جائے۔ مومن وہ ہے کہ اگر اس کو غصہ آئے تو وہ حق سے باہر نہیں ہوتا۔ اگر خوش ہو تو وہ خوشی اس کو باطل کی طرف نہیں لے جاتی اور اور اگر با اختیار ہو تو اپنے حق سے زیادہ نہیں لیتا۔

آپ نے کسی صحابی سے فرمایا: حاکم کی ہم نشینی میں ڈرتے رہو۔ دوست کے ساتھ انکساری کرو، دشمن کے شر سے بچتے رہو اور عوام سے بشاش چہرہ سے ملا کرو۔ جو کوئی اپنے عیال کے لیے روزی تلاش کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں سے زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے اقوال اور نصائح ہیں جو نور ایمان سے بھرے ہوئے ہیں اور ان بھلائیوں کا خزانہ ہیں جن کی بنیادوں پر زندگی قائم رہتی ہے، جیسے اخلاق، تربیت، آداب اور اس قسم کی وہ تمام خصوصیات کہ جن کا ایک مسلمان کو اختیار کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ قول سے پہلے عمل کے ذریعہ اسلامی طور طریقوں کا نمونہ بنے اور اس طرح وہ اسلام کا ایک خاموش مبلّغ بن جائے۔ جیسا کہ امام جعفر صادقؑ اکثر موقعوں پر اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے۔

امام علی رضاؑ کی شہادت

مشہور ترین روایت کے مطابق امام رضاؑ کی شہادت ۲۰۳ھ میں ایران کی ایک بستی میں ہوئی جس کا نام سناآباد تھا۔ اس بارے میں اس کے علاوہ اور بھی کئی ایک اقوال ہیں۔ آپ نے اس زہر کے اثر سے شہادت پائی جو خلیفہ مامون نے شربت انار میں ملاکر مکر و حیلہ سے آپ کو دیا تھا۔ ایک اور قول کے مطابق اس نے آپ کو انگور بھیجے کہ جن میں اس طریقہ سے زہر داخل کر دیا تھا کہ کوئی سمجھ ہی نہ سکے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی وفات اس بخار کی وجہ سے ہوئی جس میں آپ تین روز تک بیمار رہے اور پھر آپ وفات پا گئے۔ البتہ جیسا کہ یہ امر حقیقت سے بعید نہیں ہے کہ آپ کی شہادت زہر کے سبب سے ہوئی۔ بیشتر شیعہ محدثین کے علاوہ سنی محدثین اور مؤرخین کی ایک بڑی جماعت بھی اسی بات کی قائل ہے۔

چنانچہ خلاصہ تہذیب الکمال فی اسماء الرجال میں سنن ابن ماجہ قزوینی سے منقول ہے کہ امام علی رضاؑ نے طوس میں زہر کے اثر سے شہادت پائی۔ اسی طرح مقاتل الطالبیین میں بھی مرقوم ہے کہ خلیفہ مامون نے آپ کو اپنا ولی عہد قرار دیا اور اس کے بعد اس نے آپ کو دھوکہ سے زہر دیدیا جس سے آپ کی شہادت واقع ہوئی۔

تہذیب التہذیب میں حافظ ابن حجر نے حاکم کی تاریخ نیشاپور سے نقل کیا ہے کہ امام علی بن موسیٰؑ نے سناآباد میں شہادت پائی۔ نیز اسی تہذیب التہذیب میں ابو حاتم بن حبان سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: آپ نے ماہ صفر کے آخری روز انتقال فرمایا۔ آپ کے لیے شربت انار میں زہر ملایا گیا اور وہ آپ کو پلادیا گیا جس سے آپ نے ماہ صفر کے آخری دن شہادت پائی۔ تاہم لوگوں نے آپ کی شہادت کے اور بھی سبب بتاتے ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ مامون پر آپ کو زہر دینے کا الزام آپ کی شہادت کے دن ہی عائد ہو گیا تھا۔ جیسا کہ خود مامون کے بعض مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ صدوق نے عیون الاخبار کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب امام علی رضاؑ موت سے نبرد آزما تھے اس وقت مامون نے آپ سے کہا: بخدا میں نہیں سمجھ سکتا کہ کون سی مصیبت میرے لیے زیادہ عظیم ہے۔ میرا آپ کی ہستی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جانا یا لوگوں کا یہ الزام کہ میں نے آپ کو دھوکہ سے قتل کیا ہے۔

مقاتل الطالبیین میں ابوالفرج سے روایت ہے کہ اس نے کہا: مامون روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ: اے میرے بھائی! میرے لیے یہ امر کتنا کٹھن ہے کہ میں آپ کا یہ دن دیکھنے کے لیے زندہ ہوں۔ حالانکہ میں آپ کی زندگی کی تمنا کرتا تھا۔ پھر میرے لیے اس سے بھی زیادہ تکلیف وہ بات یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں، میں نے آپ کو زہر پلایا حالانکہ خدا کے ہاں میں اس الزام سے بری ہوں۔

دعبل خزاعی اپنے رثائی قصیدہ میں کہتا ہے:

اے وہ قبر کہ جو پردیس میں طوس کے علاقہ میں واقع ہے۔ رات کو بادل آکر تجھ پر آنسو بہا جاتے ہیں۔

اے بادل! میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ آیا پانی کی خاطر تجھ سے برسنے کو کہوں یا اس موت پر آنسو بہانے کے لیے کہوں۔

میں ان دونوں باتوں میں سے جو بات بھی کہوں۔ چاہے تجھ سے پانی برسانے کو کہوں یا اس موت پر آنسو بہانے کو کہوں، لیکن اگر موت کا ذکر کروں تو وہ زیادہ یقینی ہے۔

تعجب ہے ان لوگوں پر کہ جو آپ کو "رضاؑ" کا نام تو دیتے ہیں لیکن وہ آپ کو تکلیفیں اور ایذائیں پہنچاتے رہتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابوفراس حمدانی کو اس امر کا یقین تھا کہ آپ کو فریب سے مارا گیا ہے، جیسا کہ اس کے اس قصیدہ سے ظاہر ہوتا ہے جس میں اس نے اہل بیتؑ اور بنی عباس کا ذکر کیا ہے۔ اس میں آیا ہے:

ان لوگوں نے امام علی رضاؑ کی بیعت کرنے کے بعد آپ کو ہلاک کر ڈالا۔

اس طرح جان بوجھ کر اپنی دشمنی کا اظہار کیا اور گویا اندھے بن گئے۔

یہ وہ گروہ ہے جو نیکی اختیار کرنے کے بعد برائی کی طرف چلا گیا اور سلامتی کی راہ اختیار کرنے کے بعد ہلاکت میں جا پڑا۔

بیعت بھی ان کو خونریزی سے باز نہ رکھ سکی اور نہ عہد و پیمان، نہ قرابت اور نہ آپ سے خونی رشتہ ان کے لیے رکاوٹ بنا۔

غالباً اشجع بن عمر سلمی بھی آپ کے قتل کا الزام مامون پر رکھتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے:

اے قبر میں جانے والے! ابھی تو تجھ کو نہیں جانا چاہیے تھا اور اے وہ مرنے والے کہ جس کے مارے جانے کا کوئی بہانہ ہی نہیں تھا۔ آپ کو آزمائش کا وہ لباس پہنایا گیا جو ہمارے لیے صبر آزما ہے۔ وہ ایسا نیا لباس ہے جو کسی کو نہیں پہنایا جاتا۔

المختصر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، مامون پر آپ کو فریب سے مار ڈالنے کا الزام آپ کی وفات کے روز ہی سے عائد ہے۔ اس لیے مامون خاصا پریشان ہو گیا اور اس الزام کو اپنے اوپر سے دُور کرنے کے لیے اس نے بہت ہی رنج اور غم کا اظہار کیا۔

بہرحال جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ امام علی رضاؑ کی وفات طبعی طور پر واقع ہوئی ان میں سے بیشتر افراد کو مامون کے اس ظاہری طرزِ عمل سے دھوکہ ہوا جبکہ وہ آپکے جنازے کے ساتھ آہیں بھرتا ہوا برہنہ پا چل رہا تھا۔ تب وہ روتا جاتا اور کہتا جاتا تھا کہ اے ابوالحسنؑ میں آپ کے بعد کس کے لیے خوش ہوا کروں؟ علاوہ ازیں وہ تین دن اور تین راتوں تک آپ کی قبر پر بیٹھا رہا اور راوی کے بقول اس درمیان میں وہ صرف نمک اور خشک روٹی ہی کھاتا رہا تھا۔

وہ لوگ جو اس کو آپ کے قتل کا ذمہ دار ٹھیراتے ہیں، وہ اس کے ساتھ آپ کے بیباک طرزِ عمل اور حق کے معاملے میں آپ کی سخت روی کو سببِ قتل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ الارشاد شیخ مفید میں ہے کہ امام علی رضاؑ جب مامون کے ساتھ تنہائی میں ہوتے تو اکثر اسکو نصیحت فرمایا کرتے اور اللہ کا خوف دلایا کرتے تھے۔ مامون ظاہراً تو اس کو قبول کر لیتا تھا لیکن باطن میں اس کو ناپسند کرتا تھا۔ ایک روز آپ نے اس کو وضو کرتے ہوئے دیکھا جبکہ غلام اس کے ہاتھ پر پانی ڈالتا جاتا تھا۔ تب آپ نے فرمایا: اے امیر المومنین! اللہ کی عبادت کے عمل میں کسی کو شریک نہ کیا کیجیے۔ اس پر مامون نے غلام کو ہٹا کر خود ہی وضو بنا لیا۔ تاہم راوی کا خیال ہے کہ اس سے امامؑ پر اس کا غصہ اور بڑھ گیا۔ نیز یہ کہ امام علی رضاؑ خلیفہ مامون کو سہل کے بیٹوں فضل اور حسن کے عیوب بتاتے اور ان پر اس قدر مہربانی کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے، جس کا ان دونوں کو بھی علم ہو گیا تھا۔ تب وہ دونوں بھائی

مامون سے آپ کی برائیاں کرنے لگے اور آپ کے متعلق اس کو ایسی باتیں کہنے لگے جو آپ کے اور اس کے درمیان تفرقہ پیدا کر دیں۔ چنانچہ وہ اس کو یہ کہہ کر ڈرانے لگے کہ امام علی رضاؑ کے پاس بہت لوگ آتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے بارے میں اس کے خیالات کو بدلنے میں کامیاب ہو گئے اور اس نے آپ کو قتل کرا دیا۔

حقیقت میں یہ دونوں ہی نظریے نہایت سادہ اور سطحی ہیں۔ یہ صرف اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ان دونوں نظریوں کے حامی وقت کی رفتار سے بے خبر رہے ہیں اور کسی ایک نے بھی سیاستدانوں، ان کے طریقۂ کار اور ان کے کردار و عمل کو پوری طرح سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ یوں کہ مامون کا امامؑ پر رونا اور ان کا غم کرنا یہ دونوں فعل محبت سے خالی تھے۔ جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو یہ تہمت خراسان کے شیعہ عوام تک پہنچ جائے۔ چنانچہ رنج و غم کے اس مظاہرے سے اس کی غرض یہ تھی کہ اس الزام کے پھیلنے کی رفتار میں کمی آ جائے اور لوگ اس سے بے خبر رہیں۔ اسی طرح حق کے معاملہ میں امامؑ کی سخت روی اور مامون کو ان امور پر نصیحت فرماتے رہنا جن پر عمل کرنا اس کے لیے ضروری بھی نہ تھا اور پھر اس کو آپ پر اعتماد بھی تھا، اندریں صورت یہ ایسے امور نہ تھے کہ ان کی ایسی بڑی سزا دی جاتی جبکہ یہ اس کے لیے کسی خطرہ کے موجب بھی نہ تھے۔ خصوصاً جب مامون یہ جانتا تھا کہ امامؑ نہ صرف یہ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نصیحت کرتے رہتے ہیں اور اس وقت وہ آپ کے سامنے سراپا انکسار بنا رہتا تھا۔

جب یہ بات صحیح ہے کہ امامؑ نے زہر سے شہادت پائی اور یہ امر بعید بھی نہیں ہے تو پھر یہ معاملہ کہ مامون نے آپ کو کیوں زہر دیا اور فضل بن سہل کو کیوں قتل کرایا؟ اس کا سبب یہ ہے کہ امام علی رضاؑ کے ولی عہد بنائے جانے سے بنی عباس کو یقین ہو گیا تھا کہ اب یہ حکومت علویوں کے پاس چلی جائے گی، اس لیے انہوں نے اعلان بغاوت کر دیا، ابراہیم مغنی عرف ابن شکلہ کی بیعت کر لی اور اپنی طرف سے خلیفہ مامون کو معزول کر دیا تھا۔ لیکن فضل بن سہل ان سب واقعات کو مامون سے پوشیدہ رکھے ہوئے تھا اور آخر کار امام علی رضاؑ نے ہی اس کو اس صورت حال سے مطلع کیا۔ نیز کچھ دوسرے لوگوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی کہ عراق میں ابراہیم نے خلیفہ مسلمین کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس پر

امام علی رضاؑ نے خلیفہ مامون کو یہ رائے دی کہ وہ فضل بن سہل کو اس عہدے سے ہٹا دے اور آپ کو دی ہوئی ولی عہدی کو بھی منسوخ کر دے اور بلا تاخیر خود بغداد جا کر حکومت کا نظم ونسق سنبھال لے۔ پس مامون بغداد کے لیے روانہ ہو گیا اور امام علی رضاؑ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ جب مرو پہنچے تو انہوں نے اپنے آدمیوں کی ایک جماعت کو مامور کر دیا کہ وہ فضل کو چپکے سے حمام میں قتل کر دیں۔ اب صرف امام علی رضاؑ باقی رہ گئے اور وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ جب تک آپ زندہ ہیں اس کے حالات سازگار نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ امام بھی فضل کے ساتھ ہی اس حمام میں جائیں لیکن آپ نے اس کے ساتھ حمام میں جانے سے انکار کر دیا اور جب مامون نے اس کے لیے اصرار کیا تو آپ نے اس کو لکھ بھیجا: رات میں نے رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا کہ وہ مجھ سے فرما رہے ہیں، کل حمام میں داخل نہ ہونا۔ پس فضل کا خاتمہ تو اس طرح ہوا کہ کچھ آدمیوں نے مل کر حمام میں اس پر حملہ کیا اور اس کو قتل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی امامؑ کو بھی مامون نے شربت انار یا انگوروں میں زہر ملا کر دیدیا جس سے آپ کی شہادت ہو گئی اور اس کے بعد اس کے لیے حالات سازگار ہو گئے۔
طبری کی روایت کے مطابق جب اس نے فضل بن سہل کے قاتلوں کو سزا دینے کا ارادہ کیا تو عباس بن ہیثم بن برزجمہر نے اس سے کہا: آپ ہی نے تو ہم کو قتل کا حکم دیا تھا، پھر بھی اس نے ان کو سزا دی تاکہ وہ اس کے قتل کی تہمت سے بری ہو جائے۔

مختصر یہ کہ جو شخص تاریخ کے اس دور کے ان حالات کا مطالعہ کرے گا جن میں مامون گھرا ہوا تھا، وہ دیکھے گا کہ امام علی رضاؑ کو ولی عہد مقرر کرنے سے بغداد وغیرہ میں حالات یہ ہو گئے تھے کہ مامون کو خلافت سے معزول کر کے حکومت ایک دوسرے شخص کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اسی طرح جب وہ امام علی رضاؑ کی شہادت کے حالات وواقعات کو دیکھے گا تو مامون کو اس اتہام سے بری نہیں کر سکے گا کہ اسی نے امامؑ کو سازش کر کے قتل کرایا تھا خواہ اس طریقہ سے جو محدثوں نے بیان کیا ہے یا کوئی اور طریقہ اختیار کیا ہو۔

رہی یہ بات کہ یہ کام کس طرح سرانجام دیا گیا، اس کے متعلق بہت سے راویوں نے عبد اللہ بن بشیر سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا: خلیفہ مامون نے مجھ کو حکم دیا کہ میں اپنے ناخن بڑھا لوں اور اس کی خبر کسی کو نہ ہونے دوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر اس نے

مجھ کو املی سے مشابہ ایک چیز دی اور کہا کہ اس کو اپنے ہاتھوں سے مل ڈالو اور میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر وہ مجھ کو وہیں چھوڑ کر امام علیؑ رضاؑ کے پاس گیا اور جا کر پوچھا: آپ کیسے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ مجھے امید ہے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تب اس نے کہا: کیا آج آپ کی خدمت میں شاہی خدمتگار آئے؟ آپ نے فرمایا: نہیں! اس پر مامون کو سخت غصہ آیا اور اس نے اپنے ایک خدمتگار کو ڈپٹ کر کہا: فوراً شربت انار لاؤ، اب یہ اس کو پیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پھر مجھ کو بلا کر کہا: جلدی سے انار لیکر آؤ۔ جب میں انار لے آیا تو مامون نے مجھ کو حکم دیا کہ میں اس کو اپنے ہاتھ سے نچوڑ دوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ تب خلیفہ نے اسکو میرے ہاتھ سے لیا اور امام علی رضاؑ کو پلا دیا۔ اس کے بعد آپ صرف دو دن زندہ رہے اور شہادت پا گئے۔

بعض راویوں نے ابوالصلت ہروی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں امام علی رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو خلیفہ مامون آپ کے ہاں سے نکل کر جا رہا تھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: اے ابوالصلت! یہ لوگ تو اپنا کام کر گئے۔ پھر آپ اللہ کی حمد و ثنا میں مشغول ہو گئے۔

الارشاد اور مقاتل الطالبیین میں محمد بن جہم سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: امام رضاؑ انگور بڑی چاہت سے کھایا کرتے تھے۔ چنانچہ کچھ انگور لا کر چند دن کے لیے ایک اچھی جگہ پر رکھ دیے گئے۔ اس کے بعد وہاں سے نکال کر آپ کو پیش کیے گئے اور آپ اس وقت بیمار تھے۔ چنانچہ آپ نے ان میں سے کچھ کھائے اور انہی کے اثر سے آپ شہادت پا گئے کیونکہ ان میں زہر قاتل ڈال دیا گیا تھا۔ ان دونوں روایتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مامون نے بیک وقت یہ دونوں ہی طریقے اختیار کیے ہوں۔

شیخ صدوق کی کتاب عیون اخبار الرضاؑ کے مطابق آپ کی شہادت طوس کی ایک بستی سناآباد میں ہوئی اور وہاں آپ حمید بن قحطبہ کے اس مکان میں دفن ہوئے جہاں خلیفہ ہارون کی قبر پہلے ہی موجود تھی۔

راویوں کا کہنا ہے کہ مامون نے آپ کی شہادت کی خبر کو فوراً ہی ظاہر نہیں کیا بلکہ اس خبر کو ایک دن رات کے لیے روکے رکھا اور پھر محمد بن جعفرؑ بن محمدؑ اور آل ابوطالب

کے دوسرے افراد کو آپ کی شہادت کی اطلاع دی ۔ اس کے بعد آپ کا جسد اطہر ان لوگوں کو دکھادیا تاکہ وہ یقین کرلیں کہ آپ فطری موت سے ہمکنار ہوئے ہیں ۔ نیز یہ کہ آپ کے جسم پر تلوار یا نیزہ کا کوئی نشان موجود نہیں ہے ۔

آپ پر مرثیہ لکھنے والے شعراء میں ایک دعبل خزاعی ہیں جو اپنی نظم میں کہتے ہیں :

اے بادل ! میں سوچ میں پڑگیا ہوں کہ آیا پانی کے لیے تجھ سے برسنے کو کہوں یا اس موت پر آنسو بہانے کو کہوں ۔

میں ان دونوں باتوں میں سے جو بھی کہوں ۔ چاہے تجھ سے پانی برسانے کو کہوں یا اس موت پر آنسو بہانے کو کہوں ، لیکن اگر موت کا ذکر کروں گا تو وہ زیادہ یقینی ہے ۔

تعجب ہے ان لوگوں پر کہ جو آپ کو "رضاؑ" کا نام تو دیتے ہیں لیکن وہ آپ کو صرف تکلیفیں اور ایذائیں ہی پہنچاتے رہتے ہیں ۔

کیا تم کو تعجب ہے کہ عہد و پیمان کرنے کے بعد لوگوں نے آپ کے ساتھ بد عہدی کی حالانکہ آپ اللہ کے دین کی کھلی ہوئی نشانی تھے ۔

اشجع بن عمرو سلمی آپ کے مرثیے میں کہتا ہے :

ہائے ! طوس کا وہ دن کہ جب اعلان کرنے والوں نے ہم کو یہ پرہیبت خبر سنائی کہ زمانہ نے امام علی رضاؑ کو ہم سے جدا کردیا ہے اور پھر موت تو ہر ذی نفس کو لے کر ہی رہتی ہے ۔

اے قبر میں جانے والے ! ابھی تو تجھ کو نہیں جانا چاہیے تھا اور اے مرنے والے کہ جس کے مارے جانے کا کوئی بہانہ ہی نہیں تھا ۔ آپ کو آزمائش کا لباس پہنایا گیا جو ہمارے لیے صبر آزما ہے ۔ وہ ایسا نیا لباس ہے جو کسی کو نہیں پہنایا جاتا ہے ۔ اللہ آپ پر صلوات بھیجے کہ جس کی آپ گرم ریگستانوں میں عبادت کرتے رہے ۔

دعبل خزاعی ایک اور مرثیہ میں کہتا ہے :

اے قوم ! تم نے ان میں سب سے پہلے اسلام لانے والے کو بھی قتل کرڈالا

تھا۔ گویا کہ تم اسلام سے وابستہ ہونے کے بعد کفر کی طرف چلے گئے۔ اگر
تم دین کے کسی مقصود کی طرف جانا چاہتے ہو تو طوس میں پاکیزہ امامؑ کی
قبر پہ جاؤ۔

طوس میں دو قبریں ہیں جن میں سے ایک تمام انسانوں میں بہترین فرد کی قبر ہے اور دوسری انسانوں میں سے بدترین فرد کی قبر ہے کہ جس کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔ چنانچہ نہ گناہگار کو پاکیزہ فرد کی قربت فائدہ دے سکتی ہے اور نہ پاکیزہ فرد کو گناہگار کی قربت نقصان پہنچا سکتی ہے۔ مشکل تو یہی ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ اس کے دو ہاتھ ہیں، پس جو چاہے لے اور جو چاہے چھوڑ دے۔

علی بن عبداللہ خوفی نے بھی آپ کا مرثیہ کہا ہے، جس میں یہ اشعار ہیں:
اے سرزمین طوس! اللہ تجھ پر اپنی رحمت کے بادل برسائے۔ ہائے! نیکی کا کیسا بلند نمونہ تیرے اندر پوشیدہ ہے۔ دنیا بھر میں تیری زمین پاک ہو گئی ہے اور اس کو اس امامؑ نے پاک کیا ہے جس کا جسم سناآباد میں مدفون ہے۔ وہی شخص کہ جس کی موت اسلام پر گرانقدر مصیبت ہے۔ وہ یقیناً اللہ کی رحمت میں گھرے ہوئے اور ڈوبے ہوئے ہیں۔ اے ان کی قبر! تو وہ قبر ہے جو اپنے سینہ میں علم، حلم، طہارت اور تقدس کو چھپائے ہوئے ہے۔ تجھ کو فخر کرنا چاہیے کہ تو اس کے جسم مبارک کی امانتدار ہے اور پاک ملائکہ تیرے چاروں طرف پہرہ دیتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ابو فراس حمدانی اور دیگر شعراء نے بھی آپ کے مرثیے لکھے۔ ابو فراس نے اپنے مرثیے میں آپ کی ولی عہدی کی بیعت، آپ سے لوگوں کی غداری اور آپ کے قتل کا حال بیان کیا ہے۔

میں آپ کی سیرت طاہرہ کے صرف اتنے ہی پہلوؤں پر اکتفا کرتا ہوں اور اللہ سے امید کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو آپ کے بعد ہونے والے ائمہ علیہم السلام کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امام محمد تقیؑ

شیخ مفید نوبختی اور تذکرۃ الخواص ابن جوزی کی روایت کے مطابق امام محمد تقیؑ بن علی نقیؑ ماہ رمضان ۱۹۵ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور آپ کی شہادت ماہ ذیقعد ۲۲۵ھ یا بقولے ۲۲۶ھ میں واقع ہوئی۔ اکثر کتابیں یہی بتلاتی ہیں کہ ۲۰۰ھ میں جب آپ کے والد امام علی رضاؑ مدینہ سے ہجرت فرما کر خراسان تشریف لے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر چھ سال کی تھی لیکن یہ بھی بعید نہیں سمجھتا ہوں کہ تب آپ کی عمر اس سے زیادہ رہی ہو۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سال آپ کے والد بزرگوار خراسان جاتے وقت کعبہ کا طواف کر کے اس سے رخصت ہو رہے تھے۔ آپ کو اپنے والد کے لیے درپیش خطرہ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اعیان الشیعہ میں الدلائل کے حوالہ سے امیہ بن علی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جس سال امام ابوالحسن علی رضاؑ نے خراسان کے سفر پر جاتے وقت الوداعی حج کیا۔ میں بھی آپ کے ساتھ مکہ میں تھا اور آپ کے فرزند ابو جعفر محمد تقیؑ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ امام رضاؑ کعبہ کو الوداع کہہ کر ایک طرف گئے اور وہاں نماز پڑھنے لگے۔ جبکہ ابو جعفر محمد تقیؑ اس وقت آپ کے ایک خدمتگار کے کاندھے پر بیٹھے طواف کر رہے تھے۔ آپ طواف کر کے اس کے کندھے سے اترے اور حجر ابراہیمؑ پر بیٹھ گئے۔ جب آپ کو وہاں بیٹھے بیٹھے بہت دیر ہو گئی تو موفق خادم نے کہا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں۔ اب یہاں سے اٹھیے! لیکن انہوں نے اٹھنے سے انکار کر دیا اور

اور کہا : جب تک اللہ کی مرضی نہ ہوگی میں اس مقام سے نہ اٹھوں گا اور ان کے چہرہ پرغم کے آثار نمایاں تھے ۔ اس پر موفق خادم نے امام علی رضاؑ کو اس معاملہ کی اطلاع دی اور امامؑ نے خود ان کے پاس جاکر فرمایا : میرے بیٹے ! اب یہاں سے اٹھ جائیے، لیکن وہ اٹھنے پر راضی نہ ہوئے اور کہا میں اس مقام سے نہیں اٹھونگا اور پھر میں اٹھوں بھی کیسے، جبکہ آپ خانہ کعبہ سے اس طرح رخصت ہوتے ہیں کہ اس کے بعد یہاں لوٹ کر نہ آئیں گے ۔ بالآخر آپ وہاں سے اٹھے اور اپنے والد بزرگوار کے ساتھ جہاں جانا تھا وہاں چلے گئے ۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب آپ کے والد بزرگوار خانہ کعبہ کی زیارت کر کے اس سے رخصت ہو رہے تھے اور ان کے دل میں وہ خطرے سما رہے تھے جو ان کو پیش ہونے والے تھے ۔ اس وقت امام محمد تقیؑ نے بھی ان خطروں کا احساس کرلیا تھا ۔ حالانکہ اس عمر میں اس قسم کا احساس نہیں ہوا کرتا ۔ مزید یہ کہ آپ کے والد بزرگوار کی شہادت کے کچھ ہی عرصہ کے بعد خلیفہ مامون نے آپ سے اپنی بیٹی ام الفضل کی تزویج کردی ۔ پھر اس تزویج سے پہلے وہ مباحثہ بھی ہوا جو ایک طرف مامون اور بنی عباس کے درمیان اور دوسری طرف امام محمد تقیؑ اور قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم کے درمیان ہوا تھا ۔ جب ہم ان سب امور پر نظر غائر ڈالتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے وقت امام تقیؑ کی عمر دس سال اور چودہ سال کے درمیان رہی ہوگی ۔ البتہ ہم کو اس بات کی تائید میں کوئی روایت نہیں ملتی ۔

بہرحال بیشتر روایات یہ بتلاتی ہیں کہ امام محمد تقیؑ اپنے والد بزرگوار کے بعد سترہ سال تک زندہ رہے اور آپ نے معتصم عباسی کے عہد میں شہادت پائی ۔ آپ نے اپنی اولاد میں سے علی نقی الہادیؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور موسیٰ، فاطمہ اور امامتہ کو اپنے پیچھے چھوڑا ۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے اپنے بعد دو لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑیں ۔

امام علی رضاؑ نے آپ کی امامت کی تصدیق فرمادی تھی اور جن افراد نے آپ کی امامت کے بارے میں روایت کی ہے ان میں علی بن جعفرؑ بن محمدؑ، صفوان بن یحییٰ، معمر بن خلاد، حسین بن بشار، بزنطی، واسطی، حسن بن جہم اور بہت سے دوسرے افراد شامل ہیں کہ جن کا شمار ہم سے ممکن نہیں ۔

زکریا بن یحییٰ بن نعمان بصری سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے علی بن جعفر کو حسن بن حسین بن علیؑ بن حسینؑ سے ایک حدیث بیان کرتے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے: اللہ نے امام ابوالحسن علی رضاؑ کی اس وقت مدد کی جب خود ان کے بھائیوں اور چچاؤں ہی نے ان کے خلاف سر اٹھایا تھا۔ اس طویل حدیث میں وہ بیان کرتے ہیں کہ پھر میں اٹھا اور ابو جعفر محمد بن علی رضاؑ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے نزدیک میرے امامؑ ہیں۔ اس پر امام علی رضاؑ رو پڑے اور آپ نے فرمایا: چچا جان! کیا آپ نے میرے والد کو یہ کہتے نہیں سنا کہ رسول اللہؐ نے ان سے فرمایا: تمہارے ہاں سب سے بہتر بیٹا ایک نوبیہ کنیز طیبہ یا سبیکہ سے پیدا ہوگا، اس کی اولاد میں ایک بیٹا ہوگا جس کو بہت پریشان کیا جائیگا اور وہ اپنے والد اور دادا کا غمگسار ہوگا۔ پھر اسی کی اولاد میں وہ صاحب غیبت ہوگا کہ جس کے بارے میں لوگ کہیں گے: وہ مر گیا، ہلاک کیا گیا یا کسی وادی میں چلا گیا۔ میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ نے سچ فرمایا۔

شیخ مفید نے الارشاد میں صفوان بن یحییٰ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام علی رضاؑ سے عرض کیا: جب اللہ نے آپ کو ابھی ابو جعفر محمد تقیؑ عطا نہیں کیے تھے، تب ہم آپ سے دریافت کیا کرتے تو آپ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ مجھ کو فرزند عطا کرے گا۔ پھر اللہ نے آپ کو فرزند عطا کر دیا اور ان سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ اللہ ہمیں وہ وقت نہ دکھائے لیکن اگر وہ دن آ گیا تو پھر آپ کے بعد ہم کس کی طرف رجوع کریں گے۔ اس پر آپ نے اپنے ہاتھ سے ابو جعفر محمد تقیؑ کی طرف اشارہ کیا کہ جو سامنے ہی کھڑے تھے۔ میں نے کہا: یہ تو ابھی تین ہی برس کے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اس سے کیا فرق پڑتا ہے، عیسیٰؑ تو اس وقت ہی حجت خدا کے طور پر سامنے آ گئے تھے جب وہ عمر میں تین سال سے بھی کم تھے۔ احمد بن محمد بن عیسیٰ نے معمر بن خلاد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: ایک دفعہ جب امام رضاؑ احادیث بیان کر رہے تھے۔ میں نے اس دوران میں ان کو کہتے سنا: اب تمہاری کوئی حاجت نا تمام نہیں ہے کیونکہ یہ ابو جعفرؑ ہیں کہ جن کو میں نے اپنی جگہ بٹھایا ہے اور اپنے فرض کو ان کے ذمے لگا دیا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا: ہم اہلبیتؑ ہیں اور ہمارے چھوٹے ایک کے بعد اپنے بڑوں کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔ اس موضوع پر اسی طرح کی اور بھی بہت سی روایات

ہیں کہ جن کو قابل اعتماد محدثین نے روایت کیا ہے لیکن یہ ان حدیثوں کے علاوہ ہیں جو رسول اللہؐ اور ائمۂ کرامؑ سے ایک کے بعد ہونے والے دوسرے امامؑ کے نام وارد ہوئی ہیں۔

بیشتر روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام علی رضاؑ جب مامون کی دعوت پر خراسان تشریف لے گئے تو آپ اپنے فرزند ابوجعفرؑ کو مدینہ میں چھوڑ گئے تھے۔ بعد میں مامون نے بغداد کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تو اس نے ۲۰۴ھ میں امام محمد تقیؑ کو بھی بلوا لیا تھا تاکہ آپ سے اپنی بیٹی ام الفضل کی تزویج کر دے۔

شیخ مفید اور دیگر محدثین کی روایت کے مطابق اس وقت آپ اپنی عمر کے دسویں سال میں تھے۔ گو مجھے اس بارے میں کوئی روایت نہیں ملی جو یہ ظاہر کرے کہ امام علی رضاؑ اپنے اہل وعیال کو بھی اپنے ساتھ خراسان لے گئے تھے لیکن پھر بھی مجھ کو یہ امر کچھ بعید ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے عیال کو حجاز میں چھوڑا ہو اور تنہا تشریف لے گئے ہوں کیونکہ آپ اس سفر کو اپنے لیے پُرخطر خیال کر رہے تھے اور مدینہ میں اپنے جدامجدؐ کے روضہ پاک سے اور مکہ میں خانہ کعبہ سے اس طرح رخصت ہوئے تھے کہ وہ ان دونوں جگہوں پر کبھی واپس آنے کی توقع ہی نہ رکھتے تھے۔

ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ کم سن ہونے کے باوجود امام علی رضاؑ کے فرزند امام محمد تقیؑ نے رنج اور خطرے کا اندازہ کر لیا تھا جو آپ کے والد بزرگوار خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اپنے نفس میں محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ طواف کعبہ کرتے ہوئے اور اس سے رخصت ہوتے ہوئے وہ اپنے والد بزرگوار کی حالت سے متاثر ہو کر حجر ابراہیم پہ بیٹھ کر رونے لگے تھے۔ پھر یہ بھی بعید سی بات ہے کہ اس عمر میں مامون کی بیٹی سے ان کی تزویج ہوئی ہو اور متصلاً اس سے پہلے وہ طویل مباحثہ ہوا ہو جو ایک طرف مامون اور بنی عباس کے درمیان تھا اور دوسری طرف امام محمد تقیؑ اس وقت کے قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم کے درمیان ہوا تھا۔ اس لیے میں اس رائے کو ترجیح دیتا ہوں کہ آپ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ خراسان میں موجود تھے اور باپ بیٹوں کو موت کے سوا کسی اور نے جدا نہیں کیا۔ البتہ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد آپ مدینہ واپس آ گئے تھے۔ بعدہٗ جب خلیفہ مامون بغداد آ گیا اور اس کے حالات سازگار ہو گئے تو اس نے آپ کو مدینہ سے

بلا کر آپ سے محبت کا اظہار کیا اور اپنی بیٹی کی تزویج آپ سے کردی تاکہ وہ آپ کے والد بزرگوار کو دھوکے سے مار ڈالنے کی تہمت سے بری ہوجائے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ آپ کا سن اس وقت تزویج کے لیے موزوں رہا ہو۔

مامون کی بیٹی سے امام محمد تقیؑ کی تزویج

الارشاد اور دیگر کتابوں میں ہے کہ جب خلیفہ مامون نے امام ابو جعفر محمد بن علی الرضاؑ سے اپنی بیٹی کی تزویج کرنے کا ارادہ کیا اور عباسیوں کو اس کی خبر ہوئی تو یہ بات ان پر گراں گزری اور انھوں نے اس کا بُرا مانا۔ ان لوگوں کو یہ ڈر ہوا کہ بالآخر اس تعلق کا بھی وہی نتیجہ ہوگا جو ان کے والد بزرگوار کے لیے ہوا تھا۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگوں نے مامون سے ملاقات کی اور کہا: اے امیر المومنین! ہم آپ کو اللہ کی قسم کھا کر یہ بات بتانا چاہتے ہیں کہ آپ نے امام علی رضاؑ کے بیٹے سے اپنی بیٹی کی تزویج کرنے کا جو ارادہ فرمایا ہے اگر آپ اس پر قائم رہیں گے تو ہم کو ڈر ہے کہ وہ حکومت جس کے اب ہم مالک ہیں ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی اور ہم کو اس سے جو عزت حاصل ہوئی ہے وہ زائل ہوجائے گی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے اور آلِ علیؑ کے آپس میں پرانے زمانے سے کیسے تعلقات چلے آرہے ہیں اور آپ سے پہلے کے خلفاء ان لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے رہے ہیں۔ ہم کو امام علی رضاؑ سے آپ کے اس سلوک سے بھی بڑا ڈر تھا لیکن اللہ نے اس مہم کو ہمارے لیے بخیر و خوبی ختم کردیا۔ پس آپ اللہ سے ڈریے کہ کہیں آپ ہم کو پھر اسی رنج میں مبتلا نہ کردیں کہ جس سے ہم خدا خدا کرکے نکلے ہیں۔ پس آپ امام علی رضاؑ کے بیٹے کے بارے میں اپنا ارادہ ترک فرما کر اس رشتے کے لیے اپنے گھرانہ والوں میں سے کسی کو پسند فرما لیجیے جو آپ کی بیٹی کے لیے ان سے زیادہ مناسب ہو۔

تب مامون نے ان سے کہا: تمہارے اور آل ابی طالبؑ کے درمیان جو کشیدہ تعلقات رہے اس کا سبب خود تم لوگ ہی ہو۔ اگر لوگوں نے ان کے ساتھ انصاف سے کام لیا ہوتا تو وہ اس حکومت کے تم سے زیادہ حقدار تھے۔ پھر مجھ سے پہلے جو کچھ ان کے ساتھ کیا جاتا رہا وہ یقیناً قرابتداری کے حقوق کے خلاف تھا اور میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ بخدا کہ میں نے امام علی رضاؑ کو خلافت منتقل کرنے کے لیے جو کچھ بھی

رکیا اس پر نادم نہیں ہوں۔ بلکہ میں نے تو ان سے گزارش کی تھی کہ میں خلافت سے دستبردار ہو جاؤں اور وہ اس کو قبول فرما لیں لیکن انھوں نے انکار فرما دیا اور پھر وہی ہوا جو اللہ کو منظور تھا۔ اب رہے ابو جعفر محمد بن علیؑ تو میں نے ان کو اس لیے منتخب کیا ہے کہ وہ کمسن ہونے کے باوجود بھی بڑے بڑے عالموں کے مقابلہ میں ممتاز مقام رکھتے ہیں کیونکہ ان کی یہ حیثیت بڑی تعجب خیز ہے، اس لیے میں وہ لوگوں کو دکھا دینا چاہتا ہوں تاکہ میں نے ان میں علم کا جو ظہور دیکھا ہے اس کو اور لوگ بھی دیکھ لیں۔

وہ لوگ کہنے لگے: اے امیرالمومنین! آپ کی وہ بیٹی جو آپ کی آنکھ کی ٹھنڈک ہے، کیا آپ اس کی تزویج ایک ایسے بچّے سے کر دیں گے جس کو ابھی دین خدا کے احکام کی واقفیت ہی نہیں اور وہ حلال وحرام اور فرض وسنت سے لاعلم ہے۔ یہ ابھی نوخیز ہیں اور گو اُن کے رکھ رکھاؤ سے آپ حیرت زدہ ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی وہ ابھی بچے ہی ہیں اور ان کو دین اور فقہ کی کوئی معرفت نہیں ہے۔ پس آپ ان کو اتنا وقت دیجیے کہ وہ آداب سیکھ لیں، قرآن پڑھ لیں اور دین کے احکام کی تعلیم حاصل کر لیں، اس کے بعد آپ جو چاہیں کیجیے گا۔

اس پر مامون نے کہا: وائے ہو تم پر، میں اس بچے کو تم سے کہیں زیادہ پہچانتا ہوں۔ وہ یقیناً تم سے زیادہ فقہ سے واقف ہے اور اللہ اور اس کے احکام اور رسولؐ اور ان کی سنت کو جانتا ہے۔ وہ تم سے زیادہ قرآن کو جاننے والا ہے کیونکہ وہ اس کی محکم ومتشابہ ناسخ ومنسوخ ظاہر وباطن اور خاص وعام آیات، نیز اس کی تنزیل وتاویل کا تم سب سے زیادہ علم رکھتا ہے اور اگر تم چاہو تو اس کا امتحان کر سکتے ہو۔ اگر وہ ویسا ثابت ہو جیسا تم بیان کرتے ہو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔ ان لوگوں نے کہا: یہ بات ہمیں منظور ہے کہ ہم آپ کے اور اپنے لیے اس کا امتحان لیں۔ پس آپ ہمارے اور محمد بن علی رضاؑ کے درمیان سے ہٹ جائیے تاکہ ہم کسی ایسے شخص کو تلاش کر لیں جو آپ کی موجودگی میں ان سے فقہ وشریعت کے متعلق کچھ سوال کرے۔ اگر وہ صحیح جواب دیں گے تو پھر ہم کو کچھ اعتراض نہ ہوگا اور اگر وہ جواب نہ دے سکے تو ان کے متعلق ہماری بات صحیح ہو جائیگی۔

اس کے بعد ان لوگوں نے بالاتفاق یحییٰ بن اکثم کہ جو اس وقت کے قاضی القضاۃ تھے ان کو اس کام کے لیے منتخب کیا، تاکہ یہ ان سے کوئی ایسا مسئلہ دریافت کریں جس کا جواب ان کو معلوم نہ ہو۔ اگر ایسا کرنے میں وہ کامیاب ہوجائیں تو ان کو کثیر دولت دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے مامون کے پاس جاکر ان سے اس کام کے لیے دن مقرر کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ مامون کے مقرر کیے ہوئے روز امام محمد تقیؑ تشریف لائے، قاضی القضاۃ اور مامون بھی آگئے اور دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق بیٹھ گئے۔ اب یحییٰ بن اکثم نے سوال کرنے کی اجازت طلب کی اور امامؑ کے اجازت دینے پر اس نے سوال کیا: اے ابو جعفرؑ! اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو حالت احرام میں شکار کرلے؟ آپ نے فرمایا: آیا اس نے حدود حرم میں شکار کیا یا مسجد حرام کے اندر، اس کو مسئلہ کا علم تھا یا نہ تھا، اس نے عمداً شکار کیا یا سہواً، وہ آزاد تھا یا غلام، کم عمر تھا یا بڑی عمر کا، اس نے پہلی بار شکار کیا یا پرانا شکاری تھا، وہ شکار پرندہ تھا یا کچھ اور، اس کا شمار بڑے شکاروں میں ہوتا ہے یا چھوٹے شکاروں میں، وہ اپنے فعل پر اڑا رہا یا نادم ہوا، اس نے رات میں شکار کیا یا دن میں، بے دلی سے شکار کیا یا گرمجوشی سے، اس کا احرام حج کا تھا یا عمرہ کا۔ اس ایک مسئلہ کی اتنی ساری صورتیں سامنے آنے پر یحییٰ بن اکثم تو حیران ہوگئے اور ایسی پریشانی میں پڑ گئے جو سب لوگوں پر آشکارا ہوگئی۔ ان کے چہرہ پر کچھ ایسی بے بسی، پریشانی اور بوکھلاہٹ نمودار ہوئی کہ جس کو وہاں موجود سب لوگ سمجھ گئے۔

راوی مزید کہتا ہے کہ یہ دیکھ کر مامون خوش ہوگیا اور اپنی اس کامیابی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر اس نے امامؑ سے درخواست کی کہ وہ ان تمام مفروضہ صورتوں کے احکام بھی بیان فرمادیں۔ چنانچہ آپ نے سوال کے تمام پہلوؤں کے پورے طور پر جواب دیدیے۔ اس پر عباسیوں کے چہرے مارے پریشانی کے سیاہ پڑ گئے۔ اس کے بعد امام محمد تقیؑ نے خطبۂ نکاح پڑھا اور جناب فاطمہ زہراؑ کے برابر کے مہر پر مامون کی بیٹی سے آپ کا نکاح ہوگیا۔

ریان بن شبیب مزید کہتا ہے: اس کے بعد تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ہمکو ایسی آوازیں سنائی دیں جیسی کشتی بانوں کی کہ جو اپنی تے میں گاتے ہیں۔ پھر ہم کیا دیکھتے ہیں

کہ کچھ خدمتگار چاندی کی بنی ہوئی ایک مصنوعی کشتی کھینچ کر لا رہے ہیں جو ایک گاڑی پہ ریشمی ڈوریوں سے بندھی ہوئی ہے اور اس میں عطر اور خوشبوئیں لدی ہوئی ہیں۔ چنانچہ مامون کے حکم سے ممتاز افراد کی داڑھیوں میں عطر اور خوشبوئیں لگائی گئیں۔ اس کے بعد دسترخوان لگا دیے گئے۔ لوگوں نے کھانا کھایا اور سب کو ان کے مرتبے کے مطابق تحفے دیے گئے۔

اس سلسلے میں راوی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مامون نے امام محمد تقیؑ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ بھی یحیٰی بن اکثم پر سوال کریں، جیسا کہ اس نے آپ پر سوال کیا تھا۔ امامؑ اس کے لیے راضی ہو گئے اور آپ نے یحیٰی سے فرمایا: ایک شخص نے کسی عورت پر دن کے پہلے حصہ میں نظر ڈالی تو وہ نظر حرام تھی لیکن جب ذرا دن چڑھا تو وہ عورت اس پر حلال ہو گئی۔ جب آفتاب ڈھل گیا تو وہ اس پر حرام ہو گئی۔ عصر کے وقت وہ اس پہ حلال ہو گئی۔ آفتاب غروب ہوا تو وہ اس پر حرام ہو گئی۔ جب عشا کا وقت ہوا تو وہ اس پر حلال ہو گئی۔ نصف شب کے وقت وہ پھر اس پر حرام ہو گئی اور صبح ہوتے ہی وہ اس پہ حلال ہو گئی، تو اب آپ بتائیں کہ یہ عورت اس مرد پر کس طرح حلال ہوتی رہی اور کس طرح حرام ہوتی رہی؟ یحیٰی بن اکثم نے کہا: بخدا کہ میں آپ کو اس کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ مجھ کو اس کے وجوہ معلوم نہیں ہیں۔ پس آپ ہی ہم کو مستفید فرمائیے۔

تب امامؑ نے فرمایا: یہ عورت کسی شخص کی کنیز ہے۔ اس پر ایک غیر مرد نے دن کے آغاز میں نظر ڈالی تو یہ نظر حرام تھی۔ دن چڑھا تو اس شخص نے اس کو مالک سے خرید لیا اور وہ اس کے لیے حلال ہو گئی۔ ظہر کے وقت اس مرد نے اسے آزاد کر دیا اور وہ اس پہ حرام ہو گئی۔ عصر کے وقت اس شخص نے اس عورت سے تزویج کی تو وہ اس کیلئے حلال ہو گئی۔ مغرب کے وقت اس مرد نے اس سے ظہار کیا (یعنی اسکو اپنی ماں سے تشبیہہ دی) اور وہ اس پر حرام ہو گئی۔ عشاء کے وقت مرد نے کفارہ ادا کر دیا اور وہ عورت اس پر حلال ہو گئی۔ نصف شب کے وقت مرد نے اسکو ایک مرتبہ طلاق دیدی جس سے وہ عورت اس پر حرام ہو گئی۔ صبح کے وقت مرد نے رجوع کر لیا اور وہ عورت اس پہ پھر حلال ہو گئی۔

خلیفہ مامون کے اہل خاندان میں سے جو لوگ موجود تھے، اب اس نے ان سے کہا: کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو اس سوال کا اس طرح سے جواب دے سکتا یا جو سوال

پہلے کیا گیا تھا اس کا جواب جانتا ہو۔ ان سب نے کہا: نہیں! اے امیرالمومنین، بخدا کہ آپ بہتر جانتے ہیں۔

راوی کہتا ہے کہ اس پر مامون نے ان لوگوں سے کہا: وائے ہو تم پر، دیکھا تم نے کہ یہ گھرانہ ساری مخلوق میں کیا فضیلت رکھتا ہے اور کم سن ہونا ان کے کامل ہونے میں رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ رسول اللہؐ نے تبلیغ احکام کی ابتدا علی بن ابی طالبؑ ہی کو اسلام کی طرف دعوت دیکر کی تھی جبکہ وہ صرف دس سال کے تھے۔ جنہوں نے اسی وقت اسلام قبول فرمایا اور آنحضرتؐ نے ان کو اسلام کے احکام تعلیم کیے۔ حالانکہ آنحضرتؐ نے اس عمر کے کسی اور آدمی کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہیں سمجھتے کہ اللہ نے ان حضرات کو کیا خصوصیات عطا فرمائی ہیں۔ یہ وہ ذرّیت ہے جو سب ایک دوسرے کے برابر ہیں اور جو کچھ ان میں سے آخری کے لیے صحیح ہے وہی ان میں سے اوّل کے لیے صحیح ہے۔ ان لوگوں نے کہا: اے امیرالمومنین! آپ سچ کہتے ہیں۔ راویوں کا کہنا ہے کہ اس گفتگو کے بعد تزویج کی تقریب ختم ہوئی۔

امام محمد تقیؑ کی مدینہ واپسی

راوی بیان کرتے ہیں کہ مامون کی بیٹی سے تزویج کے بعد امام محمد تقیؑ اپنی زوجہ ام الفضل کو ساتھ لے کر جب مدینہ واپس تشریف لے گئے تو لوگ آپ کو رخصت کرنے کے لیے نکلے۔ جب آپ رخصت کرنے والوں کی معیت میں باب کوفہ کی شاہراہ پر پہنچے تو شیخ مفید کی روایت کے مطابق آپ دارالمسیب پر ایک مسجد میں داخل ہوئے، جس کے صحن میں آڑو کا ایک پودا تھا اور اس میں اب تک پھل نہ آیا تھا۔ آپ نے ایک برتن میں پانی منگوایا اور اس سے پودے کی جڑ میں وضو کیا اور مغرب کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک ذکرِ الٰہی میں مصروف رہے۔ پھر نوافل ادا کیے اور نماز مغرب کی تعقیبات پڑھیں۔ بعدہٗ جب آپ اسی آڑو کے پودے کے پاس تشریف لے گئے تو لوگوں نے دیکھا کہ اس میں بہت عمدہ پھل آ گئے ہیں۔ اس پر سب کو تعجب ہوا اور انھوں نے وہ پھل کھا کر دیکھا تو وہ بہت میٹھا تھا اور اس میں گٹھلی بھی نہیں تھی۔ اس مقام پر لوگوں نے آپ کو رخصت کر دیا اور آپ مدینہ روانہ ہو گئے۔ اس وقت سے آپ برابر مدینہ ہی میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ معتصم

نے ۲۱۵ھ کے اوائل میں آپ کو بغداد بلوا لیا۔ چنانچہ اس کے بعد آپ اپنی شہادت تک وہیں رہے جو اسی سال میں واقع ہوئی۔

تاہم راویوں نے نہ تو اس سال کی وضاحت کی ہے جب آپ بغداد سے اپنی زوجہ ام الفضل کو لے کر مدینہ تشریف لے گئے اور نہ اس سال کی تصریح کی ہے جس میں اس سے آپ کی تزویج ہوئی تھی۔ البتہ شیخ مفید کی روایت صرف یہ صراحت کرتی ہے کہ جب آپ کے اور یحییٰ بن اکثم کے درمیان مباحثہ ہوا اس وقت آپ کی عمر نو سال کی تھی۔ اس روایت پر پہلی ہی نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس مباحثہ کے نتیجہ میں جب اس تزویج کے بارے میں عباسیوں کا اعتراض زائل ہو گیا تو مامون نے اپنے ارادے کو پورا کیا اور انہی دنوں اپنی بیٹی کا عقد امام محمد تقیؑ سے کر دیا لیکن اس سے کوئی ایسی ٹھوس بات ظاہر نہیں ہوتی جس سے ذہن کو تسکین ہو سکے۔

ادھر اثبات الوصیۃ میں مسعودی کی تحریر ظاہر کرتی ہے کہ اس وقت تک امامؑ سن کے اعتبار سے تزویج کے اہل ہو چکے تھے۔ کیونکہ اس کا بیان ہے کہ جب امام علی رضاؑ نے شہادت پائی تو مامون نے آپ کے فرزند محمد تقیؑ کو بغداد بلوا کر اپنے مکان کے قریب ٹھہرایا اور اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ آپ کی تزویج اپنی بیٹی ام الفضل سے کر دے۔ ابن جوزی نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ مامون نے آپ کی وہی عزت کی اور آپ کو وہی سہولیات دینا شروع کیں جو وہ اس سے پہلے آپ کے والد بزرگوار کو دیتا تھا۔ اسی طرح اعیان الشیعہ میں سید امین کی تحریر بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ تزویج کے بعد امام محمد تقیؑ زیادہ تر بغداد ہی میں قیام فرماتے تھے۔ ہاں اس سال کہ جس میں طرسوس کے مقام پر مامون کی وفات ہوئی۔ امامؑ اس کے مشورے سے اپنی زوجہ ام الفضل کو ساتھ لے کر حج کے لیے گئے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں امام تقیؑ نے خلیفہ مامون سے حج کو جانے کی اجازت لی اور اپنی زوجہ کو لیکر بغداد سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انہی ایام میں مامون نے طرسوس میں وفات پائی اور اس کے بھائی معتصم کی بیعت کر لی گئی اور اس نے امام محمد تقیؑ کو پھر سے بغداد بلا لیا۔ وہ مزید لکھتے ہیں مسعودی نے اثبات الوصیۃ میں کہا ہے کہ جس سال مامون روم کے شہروں میں سے البدندون کی طرف گیا تھا، تب امام ابوجعفر جوادؑ اپنی زوجہ ام الفضل کو ہمراہ لے کر حج کے لیے تشریف لے گئے

اور آپ نے اپنے فرزند علیؑ کو بھی ساتھ لے لیا جو اس وقت چھوٹے ہی تھے ۔ پھر آپ نے ان کو مدینہ میں چھوڑ دیا اور خود ام الفضل کے ساتھ معتصم کے بلانے پر عراق چلے گئے ۔ البتہ جانے سے پہلے آپ نے اپنے بعد امام ابوالحسن علی نقیؑ کی امامت کی صراحت کر دی اور اس کے متعلق وصیت فرمادی ۔ ادھر البدندون میں جمعرات ۱۳ رجب ۲۱۸ھ کو مامون کا انتقال ہو گیا ۔ جب امام ابوجعفر محمد تقیؑ عراق پہنچ گئے تو خلیفہ معتصم اور مامون کا بیٹا جعفر آپ کو قتل کرنے کے لیے تدبیریں کرنے لگے اور اس کے طریقے سوچنے لگے ۔

شیخ مفید نے الارشاد میں صراحت کی ہے کہ آپ آخر ماہ محرم ۲۲۰ھ میں بغداد پہنچے اور اسی سال ماہ ذیقعد میں وہیں آپ کی شہادت ہوئی ۔ ایک دوسری جگہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ آپ مدینہ ہی میں مقیم رہے تا اینکہ ۲۲۵ھ میں معتصم نے آپ کو بغداد بلوایا اور اسی سال ماہ ذی قعد میں آپ کی شہادت ہوئی ۔

امام محمد تقیؑ اپنے والد بزرگوار کے بعد جب تک زندہ رہے اور جس مقام پر رہے مؤلفین نے اس کا ذکر اسی تضاد کے ساتھ کیا ہے ۔ بہرحال ایک مطالعہ کرنے والے کو ان بیانات سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد خلیفہ مامون نے آپ کو بغداد بلا کر اپنے مکان کے قریب ٹھہرایا اور آپ کے ساتھ عزت و احترام کا سلوک کیا تاکہ آپ کے والد بزرگوار کے قتل کی تہمت کو خود سے دور کر سکے جو ہر طرف سے اس پر عائد کی جا رہی تھی ۔ پھر جب آپ کا سن تزویج کے قابل ہو گیا تو اس نے اپنی بیٹی سے آپ کی تزویج کر دی ۔ چنانچہ آپ اس کے ساتھ بغداد میں اس سال تک رہے جس میں مامون کی وفات ہوئی ۔ اس سال آپ اس کے مشورے سے اپنی زوجہ کے ساتھ حج کے لیے تشریف لے گئے اور پھر مدینہ میں قیام پذیر رہے ۔ تا اینکہ ۲۲۰ھ یا ۲۲۵ھ میں معتصم خلیفہ ہو گیا اور اس نے آپ کو پھر سے بغداد بلا لیا ۔ نیز یہی وہ سال ہے جس میں امامؑ نے شہادت پائی ۔ جیسا کہ شیخ مفید کی دوسری روایت میں اس کا ذکر آیا ہے ۔ یہ ہے وہ تفصیل جو ان مؤلفین کے بیانات سے امامؑ کی تزویج، قیام اور شہادت کے بارے میں حاصل کی جا سکتی ہے ۔ البتہ مدینہ میں اور بغداد میں آپ کے قیام کے وقت، آپ کی تزویج اور شہادت کی تاریخ کے بارے میں ان روایات میں کوئی اطمینان بخش بیان نہیں ملتا کہ جس سے ان امور کا تعین کیا جا سکے ۔

البتہ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کا طویل تر زمانہ خلیفہ مامون کی حکومت میں بسر فرمایا اور خواہ آپ بغداد میں رہے یا مدینہ میں رہے ہوں آپ پہ اس کی طرف سے نہ کوئی سختی کی گئی اور نہ آپ کو زیر نظر رکھا گیا۔ چنانچہ آپ نے اس وقت کو اپنے کار ہدایت کے لیے صرف فرمایا اور شیعہ بالاتفاق آپ کی امامت کے قائل رہے اور آپ سے مختلف موضوعات پر دسیوں حدیثیں روایت کیں۔

شیعی فقہ کی بنیادی کتابوں کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص یہ دیکھے گا کہ کہیں کہیں ایسے راوی بھی ہیں جو امامؑ سے براہ راست ملتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو جعفر ثانی سے دریافت کیا۔ بعض اپنے مسائل امامؑ کو لکھ بھیجتے تھے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے لکھ کر امامؑ سے فلاں امر کی بابت پوچھا۔ البتہ بعض اوقات کوئی راوی صرف یہ کہتا ہے کہ میں نے ابو جعفرؑ سے پوچھا اور چونکہ یہ کنیّت آپ کے اور آپ کے دادا امام محمد باقرؑ کے مابین مشترک ہے، اس لیے جب کبھی روایت اس صورت میں وارد ہوئی ہو تو پھر قرائن کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ یہ طے کیا جائے کہ یہاں ان دونوں میں سے کون سے ابو جعفرؑ مراد ہیں۔

آپ سے روایت کی ہوئی احادیث کی مثال اصول کافی میں وہ حدیث ہے جو علی بن مہزیار نے روایت کی ہے کہ ابوالحسن بن حصین نے میرے ساتھ مل کر ابو جعفر ثانیؑ کو لکھا کہ: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ کے ماننے والوں میں نماز فجر کی بابت اختلاف ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ اس وقت نماز پڑھتے ہیں جب پو پھٹے اور آسمان پر پھیل جائے لیکن بعض اس وقت نماز پڑھتے ہیں جب دور افق پر نیچے کی جانب سفیدی نمودار ہو اور دکھائی دینے لگے۔ چنانچہ ان دو آراء کے پیش نظر میں یہ نہیں سمجھ پاتا ہوں کہ نماز فجر پڑھنے کے لیے کونسا وقت افضل ہے۔ پس براہ کرم میرے لیے ان دونوں میں سے افضل وقت کا تعین کر دیجیے اور اس کا چاند اور صبح صادق سے تعلق واضح کر دیجیے تاکہ میں یہ فرق کر سکوں کہ کب سرخی پھیلتی ہے اور کب صبح ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ میں بادلوں کی حالت میں کیا کروں اور یہ بھی بتائیں کہ سفر میں اور قیام کی حالت میں اس کی کیا صورت ہو گی۔ پس امام محمد تقیؑ نے اپنے خط میں اس کو لکھا:

اللہ تم پر رحم کرے، صبح وہ سپیدی ہے جو پھیلتی ہے نہ وہ جو بلند ہوتی ہے۔ پس سفر میں یا قیام میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک وہ ظاہر نہ ہو جائے کیونکہ اللہ نے

مخلوق کو اس بارے میں شک میں نہیں چھوڑا بلکہ کہہ دیا ہے : وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (سورۃ بقرہ آیت ۱۸۷) یعنی کھاؤ پیو تا اینکہ سیاہی میں سے صبح کا سفید خط نمودار ہو جائے۔ یہ سفید خط وہی ہے جو پھیل جاتا ہے اور اسی وقت روزہ میں کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے اور یہی وہ وقت ہے کہ جب نماز کی ادائیگی واجب ہے۔

اصول کافی میں ابن مہزیار کی سند سے یحییٰ بن ابی عمران ہمدانی سے بھی ایک ایسی ہی روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابوجعفر محمد تقیؑ کو لکھا کہ : میں آپ پر فدا ہو جاؤں، یہ فرمایئے کہ اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے کہ جو اپنی نماز میں سورۂ حمد سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھتا ہے لیکن دوسری صورت کے لیے نہیں پڑھتا، جبکہ عباسی کہتا ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ امامؑ نے اپنے خط میں عباسی کے قول کے خلاف جواب دیا اور لکھا دونوں مرتبہ بسم اللہ پڑھی جائے۔ [1]

اصول کافی میں سہل بن زیاد کی سند سے محمد بن ولید کرمانی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ابوجعفر ثانی امام محمد تقیؑ سے عرض کیا: مشک کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: میرے والد بزرگوار کے حکم سے ان کے لیے سات سو درہم کا مشک تیار کیا گیا تھا۔ اس پر فضل بن سہل نے آپ کو لکھا کہ : لوگ اس بات سے آپ پر عیب لگا رہے ہیں۔ تب آپ نے ان کو لکھا : اے فضل! کیا تم نہیں جانتے ہو کہ یوسفؑ نبی تھے۔ وہ سونے کے تاروں اور ریشم سے بنا ہوا ریشمی لباس پہنتے اور سونے کی کرسیوں پر بیٹھتے تھے لیکن اس سے ان کی دانائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد آپ کے حکم سے آپ کے لیے چار ہزار درہم کے عطریات تیار کیے گئے۔

اصول کافی کی پانچویں جلد میں سیاری اور احمد بن زکریا صیدلانی کی سند سے بست و سجستان کے بنی حنیفہ کے ایک شخص سے روایت ہے کہ اس نے کہا: میں اس سال امام ابوجعفر محمد تقیؑ کے ساتھ تھا۔ جب آپ نے خلیفہ معتصم کی خلافت کے شروع میں حج کیا۔ ایک روز میں آپ کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا اور وہاں خلیفہ کے

---

[1] یہ ہشام بن ابراہیم عباسی جو کافی کے حاشیہ کے مطابق امام علی رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کی مخالفت کرتے رہتے تھے۔

دوستوں کا ایک گروہ بھی موجود تھا۔ میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، ہمارے علاقے کا حاکم ایک شخص ہے جو آپ اہلبیت ؑ سے محبت کرتا ہے اور میرے اوپر اس کے حساب میں خراج کی کچھ رقم واجب الادا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اس کے نام ایک خط لکھ دیجیے کہ وہ مجھ پر مہربانی کرے۔ آپ نے فرمایا: میں اس کو جانتا نہیں ہوں۔ میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، وہ آپ اہلبیت ؑ کا دوستدار ہے اور آپ کی تحریر سے مجھ کو اس سے فائدہ پہنچ جائے گا۔ پس آپ نے کاغذ لیا اور لکھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! اس خط کے حامل نے تمہارے اچھے اعتقادات کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ تم نیک کام کرتے رہتے ہو۔ پس تم اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی نیکی کرو۔ ہاں یاد رکھو کہ اللہ تم سے ایک ذرّہ اور رائی کے دانہ بھر کا بھی حساب لے گا۔

راوی کہتا ہے کہ جب میں سجستان پہنچا تو اس سے پہلے ہی حسین بن عبداللہ نیشاپوری کو اس بات کی خبر مل گئی تھی اور وہی ہمارے علاقے کے حاکم تھے۔ چنانچہ انھوں نے شہر سے چھ میل آگے آ کر میرا استقبال کیا۔ میں نے ان کو خط دیا تو انھوں نے اس کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر مجھ سے کہا: تم کو کیا چاہیے؟ میں نے کہا: میرے اوپر آپ کے محکمہ کا کچھ خراج واجب ہے۔ انہوں نے وہ خراج معاف کر دیے جانے کا حکم صادر کر دیا اور مجھ سے کہا: جب تک میں یہاں ہوں تم سے کسی طرح کی رقوم نہ لی جائیں گی۔ پھر انہوں نے میرے اہل و عیال کے متعلق پوچھا تو میں نے ان کے ضروری مصارف بتلا دیے۔ تب انہوں نے میرے اور ان کے لیے اتنی رقم مقرر کر دی کہ ہمارے اخراجات کے بعد بھی کچھ بچ رہتا تھا۔ چنانچہ ان کی عملداری کے دوران میں نے کوئی واجبات ادا نہیں کیے اور انہوں نے مرتے دم تک ہمارا وظیفہ بھی بند نہیں کیا تھا۔

اصول کافی کی پانچویں جلد میں کتاب معیشت میں ابوعمرو الخلدار کی سند سے اسی شخص سے روایت ہے کہ اس نے کہا: میرے حالات خراب ہو گئے تو میں نے امام ابوجعفر محمد تقی ؑ کو لکھ بھیجا۔ آپ نے مجھ کو لکھا کہ: سورۂ نوح ؑ کی تلاوت استقلال کے ساتھ کیا کرو۔ چنانچہ میں ایک سال تک یہ سورہ پڑھتا رہا لیکن کچھ اثر ظاہر نہ ہوا۔ میں نے پھر سے آپ کو اپنی بدحالی کی بابت لکھ بھیجا اور یہ بھی کہ میں آپ کے حکم کے مطابق اس سورۃ کی تلاوت کرتا

رہا ہوں۔ تب آپ نے مجھ کو لکھا کہ ایک سال پورا ہو گیا ہے۔ اب تم سورۂ قدر کی تلاوت کرنا شروع کر دو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا اور ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ مجھ کو ابن ابی داؤد نے بلا بھیجا۔ اس نے میرا قرض ادا کرنے کے علاوہ میرے اور میرے اہل خانہ کے لیے وظیفہ بھی جاری کر دیا اور مجھ کو باب کلاء کا وکیل بنا کر بصرہ بھیج دیا۔ جہاں میری تنخواہ پانچ سو درہم مقرر کر دی گئی۔ امام محمد تقیؑ کی شہادت کے بعد میں نے بصرہ سے علی بن مہزیار کے ذریعہ سے ابوالحسن ثالث۔ امام علی نقیؑ کو لکھا کہ میں نے آپ کے والد بزرگوار سے اس طرح کی درخواست کی تھی اور انھوں نے مجھ کو یہ جواب دیا تھا۔ چنانچہ جو کچھ میں چاہتا تھا مجھ کو وہی حاصل ہو گیا۔ اب بتائیے کہ میں سورۂ قدر کا پڑھنا کم کر کے اس کو صرف فرض نمازوں ہی میں پڑھتا رہوں یا اس کے ساتھ دوسری سورتیں بھی پڑھوں۔ آپ نے جو جواب دیا وہ یہ تھا: قرآن کو کم اور زیادہ سے شمار نہ کرنا چاہیے۔ تم کو رات اور دن میں سورۂ قدر کا ایک سو مرتبہ پڑھنا فائدہ مند رہے گا۔

اصول کافی میں سہل بن زیاد نے علی ابن اسباط کی سند سے روایت کی ہے کہ انھوں نے امام ابوجعفر محمد تقیؑ کو اپنی لڑکیوں کے بارے میں لکھا کہ مجھ کو ان کے لیے ہم پلہ رشتہ نہیں مل رہا ہے۔ امام ابوجعفرؑ نے ان کو لکھا: تم نے اپنی لڑکیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کو کوئی اپنے جیسا نہیں مل رہا ہے۔ پس اللہ تم پر رحم کرے اس معاملہ میں انتظار مت کیا کرو کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی ایسا شخص مل جائے جس کے اخلاق اور دین سے تم مطمئن ہو تو اس سے تزویج کر دیا کرو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو دنیا میں سخت ترین خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔

علی بن مہزیار نے محمد بن حسن اشعری سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میرے چچا کے ایک بیٹے نے ابوجعفر ثانی امام محمد تقیؑ کو لکھا : اے فرزند رسولؐ! آپ اس لڑکی کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں کہ جس کی تزویج اس کے چچا نے کر دی تھی لیکن وہ بڑی ہوگئی تو اس نے اس تزویج کا انکار کر دیا۔ آپ نے جواب لکھا: اس بات کا برا مت مانو، وہ اپنے معاملہ کی مختار ہے۔

اصول کافی کی ساتویں جلد میں علی بن ابراہیم نے علی بن محمد بن سلیمان نوفلی کی سند

سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابو جعفر ثانیؑ کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ: میرے دادا نے کچھ اراضی فلاں شخص کی اولاد میں سے ناداروں کے لیے وقف کر دی ہے اور وہ بہت لوگ ہیں اور شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ نے جواب دیا: تم نے اس اراضی کا ذکر کیا ہے جو تمہارے دادا نے فلاں بن فلاں کے لیے وقف کی ہے۔ پس یہ اراضی اس کے لیے ہے جو اسی علاقہ میں موجود ہو جہاں وہ وقف کی گئی ہے اور تمہارے اوپر یہ لازم نہیں ہے کہ کسی غیر موجود کے پیچھے پیچھے جاؤ۔

انہی علی بن ابراہیم نے محمد بن سلیمان کی سند سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے امام ابو جعفر ثانیؑ سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے تو اس کی یہ ایک شہادت چار شہادتوں کے برابر ہوتی ہے جبکہ دوسروں کے لیے کیوں ایسا نہیں ہے؟ کیونکہ اگر شوہر کے علاوہ کوئی اور شخص اس پر الزام لگائے خواہ وہ اس کا بیٹا یا بھائی ہی ہو تو اس پر حد جاری ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا: یہی سوال امام ابو جعفر محمد الباقرؑ سے کیا گیا اور آپ نے فرمایا تھا: جب شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو جب اس سے پوچھا جائے گا کہ تم کو کیسے معلوم ہوا، تو وہ کہہ دے گا کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے پس اس کی یہ ایک شہادت اللہ کے نزدیک چار شہادتوں کے برابر ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شوہر کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ خلوت کے ایسے مقامات پر جائے جہاں کوئی اور نہیں جا سکتا۔ جبکہ کسی عورت کا باپ اور بیٹا اس کو دن اور رات میں ہر وقت نہیں دیکھتے۔ اس لیے اگر شوہر یہ کہہ دے کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے تو اس کی شہادت اللہ کے نزدیک چار شہادتوں کے برابر ہو گی۔ البتہ اگر وہ یہ کہے کہ میں نے آنکھ سے نہیں دیکھا تو اس کی حیثیت بھی دوسرے الزام لگانے والوں کی سی ہو جائے گی اور اس کو سزا دی جائے گی، سوائے اس کے کہ اس عورت کے خلاف زنا کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔ پھر اگر شوہر کے علاوہ کوئی اور شخص الزام لگائے اور یہ کہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ تم نے کیسے دیکھ لیا اور کیوں تم خلوت کے اس مقام پر گئے کہ جہاں صرف تم نے ہی دیکھا تم اپنی اس بات میں صرف اتہام لگا رہے ہو۔ چاہے تم سچے ہی ہو لیکن تم تہمت کی سزا کے مستحق ہو اور اس سے نہیں چھوٹ سکتے جو اللہ نے تم ایسے شخص کے لیے مقرر کی ہے۔ آپ نے

مزید فرمایا: اس طرح شوہر کی ایک گواہی ان چار گواہیوں کے برابر ہے جو اللہ کے نام پر دی جائیں۔ یعنی یہ ان چار گواہوں کے برابر ہے جن میں سے ہر ایک نے قسم کھا کر گواہی دی ہو۔ اسی طرح کی اور بہت سی روایات ہیں جو محدثین اور فقہا نے فقہ، حدیث، احکام اور دوسرے موضوعات کے مجموعوں میں شامل کی ہیں۔

آپ سے روایت کرنے والے قابل اعتماد صحابیوں اور دوسرے لوگوں میں سے چند ایک یہ ہیں:

ایوب بن نوح بن دراج کوفی: کشی نے اخبار الرجال میں لکھا ہے کہ یہ نیک عمل افراد میں سے تھے اور امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ کے وکیل تھے۔ اگرچہ ان پر دولتمند ہونے کی تہمت لگائی جاتی تھی لیکن انہوں نے اپنے بعد صرف ایک سو پچاس دینار چھوڑے۔

جعفر بن محمد بن یونس احول: یہ آپ کے اصحاب میں سے تھے اور انھوں نے آپ سے اور آپ کے والد بزرگوار امام علی رضاؑ سے روایت حدیث کی ہے۔ علمائے رجال نے ان کو صاحب علم وفضل بتایا ہے اور ان کو ائمہؑ کے صاحب تالیف اصحاب میں شمار کیا ہے۔

جبران الخادم قراطیسی[1]: ان سے ایک طویل روایت ہے کہ جس میں انہوں نے کہا: میں امام محمد تقیؑ کی خدمت میں گیا تو آپ ایک دکان پر کھڑے تھے جس میں کوئی فرش نہ تھا۔ ایک خدمتگار نے آپ کے لیے ایک جا نماز لاکر بچھا دی اور آپ اس پر بیٹھ گئے۔ تب مجھ پر آپ کی ہیبت طاری ہو گئی اور میں نے دکان کے چبوترے پر اس طرف سے چڑھنا چاہا جہاں زینہ نہیں تھا۔ پس آپ نے مجھ کو اشارہ سے زینہ بتلا دیا اور میں نے اس طرف سے اوپر آکر آپ کو سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو بوسہ دیا اور اپنے چہرہ پر رکھ لیا، پھر آپ نے اشارہ کر کے مجھ کو بٹھلا دیا۔ تاہم مجھ پر آپ کی جو ہیبت طاری تھی، اس کی وجہ سے میں آپ کا ہاتھ پکڑے رہا اور آپ نے بھی اس کو میرے ہاتھ ہی میں رہنے دیا اور

---

[1] ان کو قراطیسی اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ قرطاس یعنی کاغذ بناتے اور اسکی تجارت کرتے تھے۔

جب مجھ کو سکون ہوا تو میں نے آپ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر میں نے آپ سے عرض کیا: ریان بن شبیب آپ سے اپنے لیے اور اپنے بیٹے کے لیے دعا چاہتا ہے لیکن رجال کشی کے مطابق آپ نے اس کے لیے تو دعا فرمائی لیکن اس کے بیٹے کے لیے نہیں فرمائی۔

علی بن مہزیار اہوازی: یہ آپ کے خاص اصحاب اور آپ سے روایت کرنے والوں میں سے ہیں۔ علمائے رجال نے ان کو قابل اعتماد، باعظمت اور روایات کے معاملہ میں وسیع المعرفت قرار دیا ہے۔ نیز یہ کہ وہ امام ابوجعفرؑ کے خاص اصحاب اور آپ کے وکیلوں میں سے تھے۔ راویوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر ۳۳ کتابیں تصنیف کی تھیں۔

علی بن اسباط سالم: ان کی کنیت ابوالحسن مقری تھی، علمائے رجال کا کہنا ہے کہ پہلے وہ افطح کے معتقد تھے مگر بعد میں شرعی امام کی طرف پلٹ آئے اور امام رضاؑ اور ان کے بیٹے امام محمد تقیؑ سے روایت کرتے رہے۔ شیخ محمد طہٰ نے اتقان المقال میں لکھا ہے کہ وہ سب سے زیادہ قابل اعتماد اور صادق القول تھے۔

حسین بن سعید اہوازی: طوسی کی فہرست اسماء المولفین میں ہے کہ حسین بن سعید اہوازی نے امام علی رضاؑ اور امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ سے روایت کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۳۰ کتابیں بھی تالیف کی تھیں۔ تاہم علمائے رجال کا کہنا ہے کہ ان کتابوں کی تالیف و ترتیب میں ان کے بھائی حسن بن سعید بھی شریک کار رہے تھے۔

ان کے علاوہ شاذان بن خلیل نیشاپوری، نوح بن شعیب بغدادی، محمد بن احمد محمودی، ابویحییٰ جرجانی، ہارون بن حسن بن محبوب، اسحاق بن اسماعیل نیشاپوری، احمد بن ابراہیم مراغی، محمد بن حسن بن شمون وغیرہ بھی امام محمد تقیؑ کے رواۃ میں شامل ہیں کہ جن کا شمار ہم سے ممکن نہیں ہے۔

پھر ہم کو ان رواۃ کی زندگی کے خاص اس پہلو سے ہی سروکار ہے کہ جس کا تعلق اسلام کے احکام یا ان علوم سے رہا، جن پر ائمہ کرامؑ نے توجہ فرمائی اور ان کی ترویج و ترقی کا اہتمام فرمایا۔ بس یہ ان کے نیک اصحاب اور رواۃ کا بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ان کو محفوظ کیا اور اپنے بعد آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا۔

امام محمد تقیؑ کے جوابات اور ارشادات

احتجاج طبرسی میں ہے کہ جب خلیفہ مامون نے اپنی بیٹی ام الفضل کی تزویج امام ابوجعفر محمد تقیؑ سے کر دی تو ایک مرتبہ مامون، امام ابوجعفر محمد تقیؑ، یحییٰ بن اکثم اور خاص درباریوں کے علاوہ کچھ بڑے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ تب یحییٰ بن اکثم نے کہا: اے فرزندِ رسولؐ! اس روایت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ جبرئیلؑ نے آکر رسول اللہ صلعم سے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو سلام بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو ابوبکر سے خوش ہوں۔ اب آپ ان سے دریافت کیجیے کہ آیا وہ بھی ہم سے خوش ہیں؟ راوی کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا: میں ابوبکر کے مرتبہ کا منکر نہیں ہوں لیکن یہ روایت بیان کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی اس معتبر حدیث کو بھی دیکھے جو انہوں نے آخری حج کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی کہ میرے نام سے جھوٹ بولنے والے بہت ہیں اور عنقریب میرے بعد وہ اور بھی بڑھ جائیں گے۔ پس جو کوئی میرے نام پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے گا وہ اپنے لیے جہنم میں ٹھکانا بنا لے گا۔ سن لو کہ جب تمہارے سامنے میری کوئی حدیث آئے تو تم اس کو قرآن اور میری سنت پر منطبق کر کے دیکھو۔ جو حدیث قرآن اور میری سنت کے مطابق ہو اس کو قبول کر لو اور جو حدیث قرآن اور میری سنت کے خلاف ہو اس کو قبول نہ کرو۔ آپ کی پیش کی ہوئی یہ حدیث قرآن سے مطابقت نہیں رکھتی اس لیے کہ اللہ کہتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ (سورہ قٓ۔ آیت ۱۶)

ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، ہم خوب جانتے ہیں کہ اسکے ذہن میں کیا کیا خیال ابھرتے رہتے ہیں اور ہم اس سے اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

جبکہ اس حدیث کے مفہوم کے مطابق اللہ پر ابوبکر کی خوشی و ناخوشی پوشیدہ رہی تا اینکہ اس کو اس مخفی راز کے متعلق پوچھ پاچھ کرنا پڑی اور یہ امر خلاف عقل ہے۔

اس کے بعد یحییٰ بن اکثم نے کہا: روایت کی گئی ہے کہ ابوبکر و عمر کی زمین پر وہی حیثیت ہے جو جبرئیل و میکائیل کی آسمان پر ہے۔ امامؑ نے فرمایا: اس میں بھی یہ امر قابل غور

ہے کہ جبرئیل و میکائیل اللہ کے وہ مقرب فرشتے ہیں جنہوں نے کوئی نافرمانی نہیں کی اور کسی معمولی سی بات میں بھی اس کی اطاعت سے کنارہ کش نہیں ہوئے۔ جبکہ یہ دونوں حضرات ایک مدت تک اللہ کے ساتھ بتوں کو شریک قرار دیا کیے اور اپنے اس شرک کے بعد اسلام لائے۔ اس طرح ان کے بیشتر ایامِ حیات شرک کی حالت میں گزرے تھے۔ پس یہ محال ہے کہ ان دونوں حضرات کی تشبیہ ان دونوں پاک فرشتوں سے دی جائے۔

اب یحییٰ بن اکثم کہنے لگا: یہ روایت بھی ہے کہ دونوں یعنی ابوبکر و عمر جنت کے بوڑھوں کے سردار ہیں۔ اے ابوجعفرؑ! اس کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا: اس حدیث میں بھی صحت کا کوئی پہلو نہیں ہے، کیونکہ جنت میں نہ بوڑھے ہوں گے نہ ادھیڑ اور یہ حدیث بنی امیہ نے رسول اللہؐ کی اس حدیث کے مقابلہ پر بنائی ہے کہ: اَلْحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ یعنی حسنؑ اور حسینؑ جنت کے جوانوں کے سردار ہوں گے۔

یحییٰ نے مزید کہا: ایک روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: اگر میں نبی نہ بنایا گیا ہوتا تو پھر عمر بن الخطاب کو نبی بنایا جاتا۔ امام محمد تقیؑ نے فرمایا: کتاب خدا اس حدیث سے زیادہ سچی ہے، اس لیے کہ اللہ اپنی کتاب میں کہتا ہے: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ. (سورۂ احزاب۔ آیت ۷)

اور جب ہم نے سب نبیوں سے عہد لیا اور خاص تم سے اور نوحؑ سے۔

پس جب اللہ اپنے نبیوں سے عہد لے چکا ہے تو اب کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے اس عہد کو بدلے۔ نیز یہ کہ انبیاء میں سے کسی نے ایک پل بھر بھی شرک نہیں کیا۔ تو پھر اللہ ایک ایک ایسے شخص کو کیونکر نبی بنا سکتا ہے جو شرک کرتا رہا ہو اور جس کے بیشتر ایام حیات شرک باللہ میں بسر ہوئے ہوں؟

عبدالعظیم حسنی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام محمد تقیؑ بن علی نقیؑ سے عرض کیا کہ اے آقا! میرا دل چاہتا ہے کہ آپ ہی وہ قائم آل محمدؑ ہوں جو دنیا کو ظلم و جور کے بعد عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ آپ نے فرمایا: ہم میں سے ہر ایک اللہ کے احکام کا قائم کرنے والا اور اس کے دین کی طرف ہدایت کرنے والا ہے لیکن وہ قائمؑ کہ

جس کے ذریعہ اللہ دنیا کو کفر اور بے دینی سے پاک کر کے عدل و انصاف سے بھر دے گا۔
ان کی پیدائش لوگوں سے پوشیدہ رہے گی اور ان کی شخصیت نظروں سے اوجھل رہے گی۔
ان کے لیے زمین کی وسعت کم ہو جائے گی اور ہر مشکل ان کے لیے آسان ہوتی چلی جائیگی۔
ان کے لیے اہل بدر کی تعداد کے برابر یعنی تین سو تیرہ ساتھی دنیا کے اطراف سے جمع ہو جائیں گے۔
اس بارے میں اللہ کا قول ہے:

اَیْنَمَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔ (سورۂ بقرہ۔آیت ۱۴۸)

تم جہاں کہیں ہو گے اللہ تم سب کو اکٹھا کرے گا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

جب مخلص افراد کی یہ تعداد پوری ہو جائے گی تو اللہ ان کو ظاہر ہونے کا حکم دے گا اور جب وعدۂ الٰہی کے مطابق دس ہزار افراد کی تعداد پوری ہو جائے گی تب وہ اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اللہ کے دشمنوں کو قتل کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ راضی ہو جائے۔
کسی شخص نے آپ سے درخواست کی کہ: اے فرزند رسولؐ! مجھ کو کچھ نصیحت فرمائیے۔
آپ نے فرمایا: کیا تم نصیحت قبول کرو گے؟ وہ بولا: ضرور۔ آپ نے فرمایا: صبر کو اپنا سہارا بناؤ اور ناداری کو پکڑے رہو۔ خواہشات سے کنارہ کش رہو اور ہوس رانی کی مخالفت کرو۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تم اللہ کی نگاہ سے باہر نہیں ہو۔ پس اس بات کا دھیان رکھو کہ تم دنیا میں کیسے رہتے ہو۔ آپ نے مزید فرمایا: جس کسی نے بات کرنے والے کی بات پر دھیان دیا، وہ ایسا ہی ہے گویا کہ اس کی عبادت کی ہے۔ پس اگر وہ بولنے والا اللہ کی طرف سے ہے تو اس نے اللہ کی عبادت کی ہے اور اگر وہ بولنے والا ابلیس کی طرف سے ہے تو اس نے ابلیس کی عبادت کی ہے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا: توبہ میں دیر کرنا بے پروائی ہے اور کام میں لیت و لعل کرنا پریشان خیالی ہے۔ اللہ کے سامنے بہانے بنانا ہلاکت ہے اور گناہ پر اصرار کرنا اللہ کی تدبیر سے بے خوف رہنا ہے۔ حالانکہ اللہ کی تدبیر سے صرف گھاٹا اٹھانے والے ہی بے خوف رہتے ہیں۔ پھر فرمایا: مومن کو تین خصلتیں درکار ہوتی ہیں: اللہ کی توفیق، اپنے آپ کو نصیحت کرنا

اور نصیحت کرنے والے کی نصیحت قبول کرنا۔ جس کسی نے تمہاری خوشی کی خاطر اپنی نصیحت کو تم سے روکے رکھا اس نے تم سے دشمنی کی۔ حاجتیں امید کے ساتھ طلب کی جاتی ہیں اور خدا کی مرضی سے پوری ہو جاتی ہیں لیکن اس کی بہترین عطا، عافیت (برائی سے محفوظ رکھنا) ہے۔

آپ نے مزید فرمایا: کسی سے دشمنی نہ کرو تا اینکہ تم کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے اور اللہ کے مابین کیا صورتِ حال ہے۔ اگر وہ نیک عمل ہے تو اللہ اس کو تمہارے قابو میں نہ دیگا اور اگر وہ بدعمل ہے تو تمہارے لیے اتنا جان لینا ہی کافی ہے۔ تم اس سے دشمنی مت رکھو اور اس طرح ظاہراً اللہ کے دوست اور پوشیدہ طور پر اسکے دشمن مت بنو۔

آپ نے فرمایا: حفاظت کا انتظام خوف کی نسبت سے ہونا چاہیے۔ زمانہ چھپے ہوئے رازوں کو تم پر آشکارا کرتا رہتا ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھنے والا ہلاک نہیں ہوتا اور اللہ کو طلب کرنے والا اس سے دُور نہیں رہ سکتا۔ جو بے سمجھے بوجھے عمل کر بیٹھتا ہے وہ نیکی کے مقابلہ میں برائی زیادہ حاصل کرتا ہے۔ تم کو بداعمال لوگوں کی صحبت سے بچے رہنا چاہیے کیونکہ وہ کھنچی ہوئی تلوار کی مانند ہے کہ جس کی شکل خوشنما لیکن کاٹ تباہ کن ہوتی ہے۔ انسان کے لیے یہ بھی ایک خیانت ہے کہ وہ خیانت کرنے والوں کا امانتدار ہو جائے۔ مومن کی عزت اس میں ہے کہ وہ لوگوں سے بے نیاز رہو۔ خواہشات کا پیرو غلطیوں سے نہیں بچ سکتا۔

آپ نے فرمایا: ظلم کرنے والا، اس کی مدد کرنے والا اور اس پر راضی رہنے والا سب ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ ظالم کے لیے عدل کا دن مظلوم پر ظلم کے دن سے زیادہ کٹھن ہوتا ہے۔ علماء بھی اپنے اندر جاہلوں کی کثرت سے اجنبی بنے رہتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: انسان پر اللہ کی نعمتیں اسی وقت زیادہ ہوتی ہیں جب اس پر انسانوں کی طرف سے سختیاں بڑھتی ہیں۔ جو کوئی ان سختیوں کو نہ جھیل سکے گا وہ نعمت کو بھی زوال کے راستہ پر لگا دے گا۔ آپ نے فرمایا: خیرات کرنے والے کو نسبتاً اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ اہل حاجت اس کی طرف آئیں کیونکہ ان کی وجہ سے اس کو اجر ملتا ہے، فخر حاصل ہوتا ہے اور اس کا ذکر عام ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص خیرات کرتا ہے تو یہ خود اسی کے لیے مفید ہے۔ پس اس کو اپنے ہی لیے نیکی کرنے پر کسی دوسرے سے شکریہ کی خواہش نہ کرنی چاہیے۔

آپ سے اس حدیث کے مقصود کے بارے میں سوال کیا گیا کہ: اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ

ذُرِّيَّةَ فَاطِمَةَ عَلَى النَّارِ ۔ یعنی اللہ نے ذریتِ فاطمہؑ کو جہنم کے لیے حرام قرار دیدیا ہے ۔ آپ نے فرمایا: یہ بات امام حسنؑ اور حسینؑ کے لیے مخصوص ہے ۔

ایک بار آپ نے فرمایا : ایک انسان کے لیے مردانگی کا کمال یہ ہے کہ وہ زینت کی چیزوں کو ترک کر دے ۔ حیا کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے سے ایسا سلوک نہ کرے جسے وہ خود ناپسند کرتا ہے ۔ عقل کا کمال یہ ہے کہ معاشرت میں اچھائی کو برقرار رکھے ۔ ادب کا کمال یہ ہے کہ ضروری شئے کو ترک نہ کرے ۔ عرفان کا کمال یہ ہے کہ زمانہ کے حالات سے واقف رہے ۔ خوفِ خدا کا کمال یہ ہے کہ اپنی آنکھ کو نیچا کیے رہے اور اپنے پیٹ کو (حرام غذا سے) بچائے رکھے ۔ حسنِ خلق کا کمال یہ ہے کہ کسی کو اذیت دینے سے باز رہے ۔ سخاوت کا کمال یہ ہے کہ حقدار کا حق ادا کرے اور اپنے مال میں سے اللہ کا حق ادا کرتا رہے اسلام کا کمال یہ ہے کہ غیر متعلق باتوں سے سروکار نہ رکھے اور دین کے معاملہ میں جھگڑے اور دکھاوے سے بچا رہے ۔ حسنِ سلوک کا کمال یہ ہے کہ اپنے آپ پر دوسرے کو ترجیح دے ۔ صبر کا کمال یہ ہے کہ شکایت کم کرے ۔ عقل کا کمال یہ ہے کہ اپنے آپ کے ساتھ انصاف کرے ۔ بردباری کا کمال یہ ہے کہ مخالف پر غصہ نہ کرے ۔ انصاف کا کمال یہ ہے کہ جونہی حق واضح ہو جائے اسکو مان لے ۔ نصیحت کا کمال یہ ہے کہ جو کچھ اپنے آپ کو پسند نہ ہو اس سے باز رہے ۔ اچھی ہمسائیگی کا کمال یہ ہے کہ وہ شخص تمہاری برائی کو جانتے ہوئے بھی تم کو برا نہ کہے ۔ شکر کا کمال یہ ہے کہ جس کسی نے بھلائی کی ہے اس کی بھلائی کو یاد رکھے ۔ دوستی کا کمال یہ ہے کہ وہ شخص تم سے زیادہ تر موافقت اور کم سے کم اختلاف کرے ۔ سلامت روی کا کمال یہ ہے کہ دوسرے کے عیوب کو کم سے کم یاد رکھے اور اس کے عیوب کی اصلاح پر نظر رکھے ۔

آپ نے فرمایا : کوئی شخص ایمان کے حقیقی کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک دین کو اپنی خواہش پر ترجیح نہ دے ۔ کوئی شخص ہلاک نہ ہو گا جب تک وہ اپنی ہوس اور خواہش کو دین پر ترجیح نہ دے ۔ آپ نے فرمایا : انسان کی موت عمر پوری ہونے کے مقابلہ میں گناہوں کی وجہ سے واقع ہوتی ہے اور اس کی عمر کے مقابلہ میں اس کی زندگی نیکی کی بدولت بڑھتی رہتی ہے ۔

آپ کے یہ اقوال ان پہلوؤں پر حاوی ہیں جو انسان کو بہتر اخلاق، بلند آداب،

پاکیزہ کردار اور ہر اس شے کی تعلیم دیتے ہیں جس سے اس کو دنیا اور آخرت دونوں جگہ فلاح اور عزت حاصل ہو سکے۔

عقیدہ اور اصول کے انہی پہلوؤں کی خاطر ائمۂ اہل بیت علیہم السلام نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں اور سرکش حکمرانوں کے ہاتھوں ہر قسم کا ظلم و ستم برداشت کرتے رہے۔ ان کے جسم تو یقیناً انسانوں کی اس دنیا سے چلے گئے لیکن ان کی سیرت، ان کے اصول اور انکی تعلیمات کو بقاء دوام حاصل ہے اور وہ تمام نسلوں کے لیے ہر زمانہ اور ہر مقام پر نیکی، شرافت اور فضیلت کا سرچشمہ بنی ہوئی ہیں۔

امام محمد تقیؑ کی شہادت

مؤلفین کا بیان ہے کہ آپ کی ولادت ماہ رمضان ۱۹۵ھ میں اور شہادت اواخر ماہ ذی الحجہ ۲۲۰ھ میں ہوئی۔ شیخ مفید کی روایت کے مطابق آپ کی شہادت ۲۲۵ھ میں ہوئی۔ اس طرح آپ کی مدت امامت اٹھارہ اور تیئیس سال کے درمیان ہوئی، جس کا بیشتر حصہ مامون عباسی کے عہد میں گزرا۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ آپ کا قیام بغداد اور مدینہ میں رہا۔ آپ مامون کی وفات سے پہلے ہی اپنی زوجہ ام الفضل کے ساتھ مدینہ تشریف لے آئے تھے لیکن مامون کے بعد متوکل کی دعوت پر آپ اپنی زوجہ کے ساتھ عراق واپس چلے گئے اور اپنے فرزند علی نقیؑ کو مدینہ ہی میں چھوڑ گئے۔ البتہ آپ نے اپنے بعد کے لیے ان کی امامت کا اعلان فرما دیا اور جیسا کہ مسعودی کی اثبات الوصیۃ سے معلوم ہوتا ہے، اپنے خاص اصحاب کو اس سے آگاہ بھی فرما دیا تھا۔

جب خلیفہ معتصم کی دعوت پر امام بغداد واپس آئے تو خود معتصم، جعفر بن مامون اور ان کے خاص آدمی آپ کے قتل کی تدبیریں کرنے اور بہانے نکالنے میں لگ گئے۔ بعض روایات بتلاتی ہیں کہ وہ دونوں آپ کی زوجہ ام الفضل کو ورغلانے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اس کو اس کام کے لیے آمادہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے آپ کے انگوروں میں زہر ملا دیا اور اسی سے آپ کی شہادت ہو گئی، لیکن شیخ مفید اپنی ایک روایت میں کہتے ہیں کہ امام تقیؑ محرم ۲۲۰ھ کے آخر تک مدینہ ہی میں رہے۔ تاہم اس کے چند ماہ بعد آپ نے اسی سال کے ماہ ذیقعد میں شہادت پائی لیکن اپنی ہی ایک دوسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ آپ کی شہادت ذی قعد ۲۲۵ھ میں واقع ہوئی۔ عیون المعجزات کے حوالے سے

اعیان الشیعہ میں منقول ہے کہ معتصم نے آپ کی زوجہ ام الفضل کو آپ کے قتل پہ آمادہ کیا جو ابوالحسن علی نقیؑ کی والدہ سے جلتی تھی اور آپ سے رنجیدہ تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ آپ اس کے مقابل اپنی ان بی بی کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ معتصم کے کہنے پر اس نے آپ کے لیے انگوروں میں زہر ملا دیا اور جیسا کہ روضۃ الواعظین اور ابن بابویہ میں ہے کہ بعد میں وہ اپنے اس فعل پہ نادم بھی ہوئی تھی۔ البتہ شیخ مفید نے الارشاد میں اس بات کا ذکر نہیں کیا۔

تاہم معتصم جو آپ سے بغض رکھتا تھا اس سے یہ فعل بعید نہیں ہے کہ اس نے آپ کو مدینہ سے بغداد بلا کر آپ کی زوجہ کو اس پر تیار کر لیا ہو کیونکہ وہ آپ سے رنجیدہ ہو گئی تھی اور آپ سے کینہ رکھنے لگی تھی اس لیے کہ اس کے خیال میں آپ اپنے فرزند علی نقی ہادیؑ کی والدہ کو اس پر ترجیح دیتے تھے اور جیسا کہ کشف الغمہ میں ہے کہ اس نے اپنے باپ مامون کی زندگی میں اس سے آپ کی یہ شکایت بھی کی تھی کہ آپ اس سے رغبت نہیں رکھتے ہیں لیکن مامون نے اس کو سختی سے ڈانٹ دیا تھا اور آپ کی اطاعت کرنیکی تاکید کی تھی۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے عین جوانی کے عالم اور اس حالت میں شہادت پائی جب آپ بغداد میں مجبوراً قیام کیے ہوئے تھے۔ آپ کو قریش کے قبرستان میں اپنے جد بزرگوار امام موسٰی بن جعفرؑ کے پہلو میں دفن کیا گیا جہاں ان دونوں اماموں کے مزار ہزاروں انسانوں کی زیارت گاہ بنے ہوئے ہیں۔ وہاں ظالموں کے ظلم سے خوفزدہ افراد ان کی پناہ لیتے ہیں۔ گناہگاران کی شفاعت کے طلبگار رہتے ہیں۔ صاحبان حاجت ان کے وسیلہ سے خداوند کریم سے اپنی حاجات طلب کرتے ہیں۔ گویا وہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ:

> میں آپ کے پاس پناہ کی تلاش میں آیا ہوں اور قیامت کے روز آپ سے وابستہ رہنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کے وسیلہ سے نجات کا پروانہ حاصل کرلوں۔ قیامت کے روز آپ کی شفاعت مجھ سے پہلے کسی اور کو نہ ملے گی کیونکہ آپکی محبت میں کوئی مجھ سے بڑھا ہوا نہیں ہے۔

امام علی نقیؑ

بیان کیا جاتا ہے کہ امام علی نقی الہادیؑ ماہ ذی الحجہ ۲۱۲ھ یا بقولے ماہ رجب ۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے، تاہم اس بارے میں اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔ آپ کا مقام ولادت مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ایک گاؤں "صریا" تھا جس کو آپکے دادا امام موسیٰ کاظمؑ نے آباد کیا تھا۔ جیسا کہ مناقب ابن آشوب میں ہے کہ آپ کی والدہ ایک بربری خاتون "سمانہ" تھیں۔ جب آپ کے والد بزرگوار کی شہادت ہوئی اس وقت آپ کا سن چھ یا آٹھ سال اور بقولے اس سے زیادہ تھا۔ آپ ان کے بعد تیس سال سے زیادہ مدت تک زندہ رہے، جس میں سے کچھ عرصہ خلیفہ معتصم کے عہد میں اور کچھ واثق ہارون بن محمد بن ہارون کے عہد میں گزارا کہ جس کی خلافت پانچ سال نو مہینہ تک قائم رہی۔ پھر متوکل (جعفر بن ہارون) کا زمانہ آیا، جس کی خلافت چودہ سال تک رہی۔ اس کے بعد بقول مسعودی منتصر (محمد بن جعفر) نے چھ مہینے حکومت کی اور پھر مستعین (احمد بن محمد بن معتصم) نے تین سال اور آٹھ مہینے حکومت کی اور وہ معتز (زبیر بن جعفر) کے حق میں اس سے دستبردار ہو گیا تھا۔ پھر وہ بھی تقریباً چار سال اور چند ماہ حکومت کر کے اس سے دست کش ہو گیا۔ مسعودی نے مروج الذہب میں ۲۵۴ھ کے واقعات کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ امام علی نقیؑ کی شہادت معتز ہی کے عہد میں ہوئی۔ یعقوبی نے بھی اپنی تاریخ میں اس بیان کی تائید

کی ہے لیکن اتنا اضافہ کیا ہے کہ معتز نے اپنے بھائی ابو احمد بن متوکل کو بھیجا اور اس نے شارع ابو احمد پر آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ جب وہاں لوگوں کا بہت زیادہ اجتماع ہو گیا اور ہر طرف رونے پیٹنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو اس نے آپ کا لاشہ آپ کے مکان پر واپس بھیج دیا۔ آپ وہیں دفن ہوئے اور اب بھی وہاں آپ کا مزار موجود ہے۔

آپ کے والد بزرگوار نے اپنی شہادت سے قبل ہی آپ کی امامت کی صراحت فرما دی تھی۔ جیسا کہ ہر امام اپنے جانشین کا اعلان فرماتے رہے جو نبی اکرمؐ کے احکام کے مطابق ہوتا تھا، جو آنحضرتؐ سے بارہ اماموں کے بارے میں ان کے ناموں کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔

چنانچہ اصول کافی میں اسماعیل بن مہران کی سند سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: جب امام ابو جعفر محمد تقیؑ پہلی بار مدینہ سے بغداد روانہ ہوئے تو میں نے آپکی روانگی کے وقت آپ سے ملاقات کی۔ تب میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں مجھ کو آپ کی جان کا ڈر ہے۔ پس فرما دیجیے کہ آپ کے بعد امامت کس کے لیے ہے؟ آپ نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور فرمایا: اس سال میں وہ کچھ نہیں ہونے والا جس کا تم کو ڈر ہے۔ پھر جب آپ دوسری مرتبہ معتصم کے پاس جانے کے لیے مدینہ سے بغداد روانہ ہوئے تو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ تشریف لے جا رہے ہیں لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کے بعد امامت کس کے لیے ہے؟ اس پر آپ اتنا روئے کہ آپ کی ریش مبارک تر ہو گئی، پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ہاں! اس مرتبہ میرے لیے خطرہ ہے۔ پس میرے بعد امامت کا منصب میرے فرزند علی نقی ہادیؑ کے لیے ہے۔

اسی طرح حسین بن محمد نے خیرانی سے اور انھوں نے اپنے والد سے کہ جو امام محمد تقیؑ کے ذاتی خدمتگار تھے روایت کی ہے کہ امام ابو جعفر محمد تقیؑ کی طرف سے آپ کے فرزند علی نقی ہادیؑ کی امامت کے بارے میں حکم صریح وارد ہے۔ اس کو ابو جعفر احمد بن محمد بن عیسیٰ الاشعری اور خیرانی کے والد نے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ خیرانی نے کہا: جب امام محمد تقیؑ کی شہادت ہو گئی اور میرے والد اپنے گھر سے نکلے تو جماعت کے تقریباً چار سو سربرآوردہ افراد ان کو راستے میں ملے جو محمد بن فرج کے پاس اس معاملہ پر گفتگو کرنے کے لیے جمع ہو گئے۔ تب محمد بن فرج نے

میرے والد کو لکھا کہ ان کے پاس بہت لوگ جمع ہوگئے ہیں اور اگر بات کے پھیل جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ خود ان سب کو لیکر ان کے پاس آتے اور امر امامت کے بارے میں ان سے پوچھتے۔ چنانچہ میرے والد سوار ہو کر ان کے پاس گئے اور دیکھا کہ ان کے پاس بہت سے لوگ جمع ہیں۔ ان لوگوں نے میرے والد سے کہا: آپ اس معاملہ میں کیا کہتے ہیں۔ اس پر میرے والد نے کہا: جن لوگوں کے پاس وہ وثیقے ہیں۔ وہ اب ان کو نکالیں کیونکہ امامؑ نے اپنی وصیت دس وثیقوں پر لکھ کر جماعت کے دس افراد کے سپرد کردی تھی۔ تب ان لوگوں نے وہ ثیقے نکالے اور میرے والد نے ان سے کہا: یہ ہے وہ بات جس کا مجھ کو حکم دیا گیا ہے۔ اس وقت حاضرین میں سے کسی نے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں آپ کے ساتھ کوئی اور بھی گواہ ہو۔ انھوں نے کہا: ہاں یقیناً! اللہ نے تمہارے لیے گواہ بھی بھیج دیا ہے۔ یہ ہیں ابو جعفر اشعری کہ جو اس بات کی گواہی دیں گے کہ انھوں نے بھی اس بات کو سنا ہے۔ پھر اشعری سے کہا کہ وہ جو کچھ جانتے ہیں اس کو بطور شہادت پیش کریں۔ لیکن احمد بن محمد اشعری نے اس بات سے انکار کردیا کہ انہوں نے ایسا سنا تھا۔ اس پر میرے والد نے ان سے مباہلہ کیا اور جب معاملہ ثابت ہوگیا تو اشعری نے کہا: ہاں میں نے امام محمد تقیؑ سے یہ بات سنی تھی۔ البتہ میں چاہتا تھا کہ کوئی عرب ہی یہ بات کہتا جبکہ یہ شخص عجمی ہے کیونکہ خیرانی ایران کے باشندہ تھے۔ راوی مزید کہتا ہے کہ لوگ وہیں رہے تا اینکہ حق کے قائل ہوگئے اور سب نے امام ابو الحسن علی نقی ہادیؑ کو اپنا امام تسلیم کرلیا۔

یہ روایت بیان کرنے کے بعد شیخ مفید کہتے ہیں کہ اس ضمن میں کثیر روایات آئی ہیں اور اگر ہم ان سب کو پیش کریں تو کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔ کیونکہ ساری جماعت شیعہ نے امام ابو الحسنؑ کی امامت پر اتفاق کرلیا تھا اور آپ کے علاوہ کسی اور نے اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا کہ جس سے اس امر میں کوئی اشتباہ پیدا ہوتا" اس لیے ہم ان تمام احکام اور احادیث کو تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے ہیں۔

جب آپ منصب امامت پر فائز ہوئے تو ابھی آپ عہد طفلی ہی میں تھے کیونکہ اس وقت آپ اپنی عمر کے نویں سال میں تھے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی جوانی کا آغاز ہو رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب عباسی حکمرانوں نے ائمۂ اہل بیتؑ سے دشمنی

اور علویوں کے ساتھ اپنی سختی از سر نو شروع کر دی تھی جبکہ اس سے قبل ان کو کچھ زمانہ امن و سکون کا مل گیا تھا۔ تب امام علی نقیؑ مدینہ میں امامت کی ذمہ داریاں سرانجام دیتے رہے لیکن حکومت کی طرف سے آپ کی نگرانی کی جاتی تھی تا اینکہ آپ کی عمر بیس سال سے زیادہ ہو گئی۔ چنانچہ آپ دور دراز علاقوں اور مقامات کے لوگوں کے لیے علم کا سرچشمہ بن گئے۔ یہاں تک کہ آپ کی شہرت خوب پھیل گئی اور دُور و نزدیک کے لوگ اپنی دینی مشکلیں حل کرانے کے لیے آپ سے رجوع کرنے لگے۔

ان حالات نے آپ کے خلاف حکمرانوں کا غصہ بھڑکا دیا اور انکی خوابگاہوں میں بے چینی پیدا کر دی۔ چنانچہ انھوں نے آپ کو اپنے دارالحکومت بلا لیا اور بیس سال سے زیادہ عرصے تک جبراً وہاں رکھا تاکہ اسطرح آپ اور آپکے آباء کرامؑ کے شیعوں کے درمیان حائل ہو جائیں کہ جنہوں نے آپ کی امامت کو مان لیا تھا اور جن کی تعداد اس دور میں پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ حکمران عباسی خاندان کے پہلے فرمانرواؤں کے مقابلہ میں خلیفہ متوکل اہلبیتؑ سے کھلی دشمنی رکھنے میں مشہور تھا۔ چنانچہ ابن اثیر اور طبری نے تاریخ کی اپنی کتابوں میں ۲۳۶ھ کے ذیل میں لکھا ہے کہ متوکل کی علیؑ اور آل علیؑ سے عداوت اور بغض کی حد یہاں تک آ گئی تھی کہ اس نے امام حسینؑ بن علیؑ کا روضہ مسمار کرا کے اس کو زمین کے برابر کر دیا اور پھر حکم دیا کہ اس کو جوت کر یہاں کھیتی بو دی جائے تاکہ اس روضہ کا نشان تک مٹ جائے۔ نیز یہ کہ اس نے آپکے روضہ کی زیارت کے لیے آنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان پر بھاری ٹیکس عائد کیے اور انکے لیے طرح طرح کی سزائیں مقرر کر دیں تاکہ وہ اسکی زیارت سے باز رہیں۔ ذیل کے اشعار میں اسکے ان مظالم کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے جو ابن سکیت یا بسامی کے ہیں کیونکہ یہ اشعار دونوں ہی سے منسوب ہیں۔

> اگر بنی امیہ نے نبی اکرمؐ کی بیٹی کے بیٹے کو ظلم سے قتل کر ڈالا تھا، تو خدا کی قسم! انکے چچا کے بیٹوں نے بھی ویسے ہی ظلم کر ڈالے کیونکہ انہوں نے کربلا میں امام مظلوم کے روضہ کو مسمار کر دیا ہے۔ گویا ان کو حسرت یہ تھی کہ وہ ان کے قتل میں کیوں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ اسی لیے انہوں نے انکی قبر اکھاڑی اور انکی لاش کے ساتھ وہی ظلم کر دکھایا۔

اس زمانے میں لوگوں کے دلوں میں امام علی نقیؑ سے کس قدر محبت اور ان کی کیا قدر و منزلت تھی۔ اس کا اظہار تذکرۃ الخواص میں ابن جوزی کے اس بیان سے ہوتا ہے جس میں اس نے لوگوں کے اس خوف اور تردّد کا ذکر کیا ہے جو ان کو اس بات پر ہوا کہ معتصم عباسی نے آپ کو عراق میں اپنے ملک کے دارالحکومت میں بلایا۔

چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ جب اس (یعنی متوکل) کو مدینہ میں امام علی نقیؑ کے بلند علمی مرتبہ اور پھر اس بات کا علم ہوا کہ لوگ آپ سے دل و جان سے وابستگی رکھتے ہیں تو اس کو اپنی حکومت کے لیے آپ سے خدشہ محسوس ہوا۔ تب اس نے یحییٰ بن ہرثمہ کو بلاکر کہا کہ تم مدینہ جاکر ان کے حالات کا مطالعہ کرو اور ان کو ہمارے پاس لے آو۔ یحییٰ کا بیان ہے کہ جب میں مدینہ گیا اور جونہی میں شہر میں داخل ہوا تو لوگوں میں رونے رلانے کا ایک ایسا شور برپا ہوا جیسا وہاں کبھی نہ سنا گیا تھا، کیونکہ ان کو امام علی نقیؑ کے لیے خطرے کا احساس ہوگیا اور ساری خلقت ششدر رہ گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امامؑ ان کے ساتھ ہمیشہ بھلائیاں کرتے رہے تھے۔ وہ اکثر مسجد سے وابستہ رہتے اور طلب دنیا سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ یحییٰ بن ہرثمہ مزید بیان کرتا ہے کہ میں نے ان لوگوں کو اطمینان دلایا اور قسمیں کھائیں کہ مجھ کو ان کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کرنے کا حکم نہیں ملا اور یہ کہ امام کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بالآخر ان لوگوں کی حالت سکون پذیر ہوئی اور ان کا رونا دھونا بند ہوگیا۔

آپ کے حالات کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کو اس روایت کے علاوہ بھی اس امر کے بہت سے شواہد مل جائیں گے کہ امام علی نقی ہادیؑ کو تمام اسلامی علاقوں اور طبقوں میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اسی وجہ سے حکمرانوں نے ان کی نگرانی شروع کردی اور ان کو اپنے پاس دارالحکومت میں قیام کرنے پر مجبور کردیا، جیسا کہ ہم بیان کرآئے ہیں، لیکن حکمرانوں کی اس کوشش کے باوجود آپ کی عزت و شہرت میں اضافہ ہوتا رہا اور اہل حکومت اس میں کامیاب نہیں ہوسکے کہ وہ آپ کے اور عوام کے درمیان حائل ہو جاتے۔ چنانچہ انھوں نے یہ کوشش کی کہ آپ کے بھائی موسیٰ کے ذریعہ سے آپ کو بے راہ روی پر ڈالیں اور آپ کو بہلا پھسلاکر برائی کی محفلوں میں لے آئیں تاکہ یہ چیز آپکے مرتبہ پر اثرانداز ہوسکے۔

چنانچہ شیخ نے الارشاد میں حسین بن حسن حسنی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:
مجھ سے ابو طیب یعقوب بن یاسر نے بیان کیا کہ متوکل اپنے ہم جیسوں اور خاص مصاحبین سے کہا کرتا تھا کہ: وائے ہو تم پر کہ مجھ کو ابن رضاؑ کے معاملہ نے پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ وہ میرے ساتھ شراب پئیں اور میرے ہم صحبت رہیں لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر میں نے چاہا کہ اس مقصد کے لیے کوئی اور موقع ہی مل جائے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

اس پر مصاحبین میں سے کسی نے کہا: اگر آپ کی خواہش ابن رضاؑ کے ذریعہ سے پوری نہیں ہو سکی تو ان کے بھائی موسیٰ کو لے لیجیے، وہ عیاش ہے، موسیقی کا رسیا ہے، اچھا کھانے والا، شراب پینے والا، بدمست رہنے والا اور عاشق مزاج ہے۔ اس کو بلا کر اپنے ساتھ رکھیے اور پھر اس بات کو خوب شہرت دیجیے۔ جب یہ باتیں ابن رضاؑ کے نام سے مشہور ہو جائیں گی تو لوگ اس میں اور ان کے بھائی علی نقی ہادیؑ میں فرق نہ کریں گے، بلکہ جو لوگ ان کو نیک بھی سمجھتے ہوں گے وہ موسیٰ کی برائی کی وجہ سے ان کے بھائی کو بھی ان ہی برائیوں سے منسوب کریں گے۔

اس پر متوکل نے کہا: اچھا تو موسیٰ کو عزت کے ساتھ یہاں آنے کو لکھ دو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ جب وہ آئے گا تو اس سے خود متوکل، تمام بنی ہاشم، فوج کے افسر اور دوسرے لوگ آؤ بھگت کی ملاقات کریں۔ چنانچہ جب موسیٰ اور متوکل آپس میں ملے تو اس کے لیے ایک قطعہ زمین خرید کر اس پر مکان بنوا دیا گیا جس میں بہت سے شرابی اور گانے والیاں پہنچا دی گئیں اور خود موسیٰ کو انعام و اکرام دیا گیا۔ مزید یہ کہ ایک شاہی محل مخصوص کر دیا گیا کہ جس میں خود خلیفہ متوکل اور موسیٰ ایک محفل نشاط برپا کیا کریں گے۔
جب امام علی نقی ہادیؑ کا بھائی موسیٰؑ وہاں آ گیا تو امامؑ نے ایک بڑے محل میں اس سے ملاقات کی اور سلام کے بعد کہا: اس شخص یعنی متوکل نے تم کو ذلت اور رسوائی میں ڈالنے کے لیے بلایا ہے۔ تم اس کے سامنے یہ اقرار نہ کرنا کہ تم نے کبھی شراب پی ہے۔ پس اے میرے بھائی! اللہ سے ڈرو کہ کہیں خطرے میں نہ گھر جاؤ۔ موسیٰ نے کہا: اس نے تو مجھے شراب و شباب ہی کے لیے بلایا ہے۔ پھر اب میں کیا کروں۔ امامؑ نے اپنی پہلی ہی بات دہرائی لیکن موسیٰ نے

آپ کا کہنا نہ مانا۔ جب آپ نے اس کی یہ مخالفت ملاحظہ فرمائی تو کہا: تم اس کے ساتھ ہم نشینی کی جو توقع رکھتے ہو وہ کبھی پوری نہ ہوگی۔

راوی کہتا ہے کہ موسیٰ وہاں تین سال تک رہا اور وہ روزانہ متوکل کے دروازے پر جاتا تھا لیکن کبھی کہہ دیا جاتا کہ خلیفہ آج کام میں مصروف ہیں، کبھی کہہ دیا جاتا کہ وہ نشہ میں ہیں اور کبھی یہ کہ انھوں نے ابھی ابھی دوا پی ہے اس لیے یہ ان سے ملنے کا وقت نہیں ہے۔ موسیٰ کے ساتھ یہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ متوکل کو قتل کردیا گیا اور ان دنوں میں کہ جو اس نے موسیٰ کے ساتھ شراب پینے کے لیے مقرر کیے تھے۔ وہ دونوں کسی ایک دن بھی اکٹھا نہ ہو سکے۔

فقہ میں امام علی نقیؑ کا حصہ

امام علی نقیؑ بھی اپنے آبا ر کرامؑ کی طرح اقتدار کے جھگڑوں سے کنارہ کش رہ کر اسلام کی حفاظت اور فروغ اسلام کی اشاعت کے ذریعہ اس دین حق کے تحفظ کی جانب متوجہ رہے۔ چنانچہ آپ نے دین کی سچائی میں شک کرنے والوں اور خدا کے منکروں کے ساتھ مناظرے کیے اور ان کے سوالوں کے دلائل منطق سے بھرے ہوئے مکمل اور تسلی بخش جواب دیتے رہے۔ دین میں شک کرنے والوں میں سے جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں آتا تو ان کی صداقت کا قائل ہو جاتا اور مطمئن ہو کر یہی کہتا ہوا واپس جاتا تھا کہ: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ. (سورۂ انعام - آیت ۱۲۴) یعنی اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنا کار رسالت کس کے سپرد کرے۔ جہاں تک تدوین فقہ کا تعلق ہے تو علماء اور رواتِ حدیث جن مسائل کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے تھے وہ آپ کو لکھ کر پوچھ لیا کرتے تھے۔ یہ غالباً اسی طریقہ کا نتیجہ تھا کہ شیعہ محدثین جو ائمہٴ کرامؑ کی فقہ اور حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ وہ ملک کے تمام گوشوں میں پھیل گئے۔ تاہم امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے وہ اصحاب اور روات کہ جنھوں نے کتابیں تالیف کیں ان کی زیادہ تعداد شہر قم کے حصہ میں آئی۔ حالانکہ حکومت اور اس کے اہلکار ائمہؑ پر سختی کرتے تھے۔ ان کی ہر حرکت و سکون پر نظر رکھتے تھے اور اکثر وبیشتر ان کو دارالحکومت میں اپنے پاس قیام کرنے کے لیے مجبور کرتے تھے: تاکہ وہ لوگوں کے آپ حضرات کے گرد جمع ہونے بلکہ ان سے ملنے پر بھی پابندی لگا دیں۔ اسی وجہ سے علماء اور

رواۃ ان تین اماموں یعنی امام محمد تقیؑ، امام علی نقیؑ اور امام عسکریؑ سے زیادہ تر تحریری طور پر رجوع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان تینوں ائمہؑ کے حالات کا مطالعہ کرنے والے کو فقہ کے مختلف ابواب اور موضوعات میں اس طریقہ سے حاصل کی ہوئی دسیوں روایتیں ملیں گی۔ ہم آپ کے والد بزرگوار کی سیرت کے ذیل میں ان خطوں کی کچھ مثالیں پیش کر چکے ہیں جو ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ اب ہم ان خطوں کی بھی کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں جو امام علی نقی ہادیؑ کے پاس آیا کرتے تھے۔ نیز آپ کے ان ہمعصروں کی تحریریں کہ جو آپ سے روایات اور حدیثیں لیا کرتے تھے۔

اس ذیل میں یعقوب کلینی نے اصول کافی کی چوتھی جلد میں محمد بن یحییٰ سے ایوب بن نوح کی سند سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابوالحسن ثالث علی نقی ہادیؑ کو لکھا کہ کچھ لوگوں نے مجھ سے فطرہ کے متعلق سوال کیا ہے اور یہ پوچھا ہے کہ کیا وہ لوگ اس کی قیمت آپ کو پہنچا دیں۔ اس آدمی نے پچھلے سال بھی یہ سوال کیا تھا اور مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں یہ آپ سے دریافت کروں لیکن میں بھول گیا تھا۔ اب اس سال میں اپنے عیال کی طرف سے نو رطل فی درہم کے حساب سے ایک درہم فی کس آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میں آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔ اس کے جواب میں امامؑ نے لکھا کہ فطرہ کے بارے میں سوالوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور میں ہر اس شئے سے گریز کرتا ہوں جو ہمارے کام کی عام شہرت کا باعث بنتی ہو۔ پس اب اس کا ذکر بند کرو اور جو کوئی دیدے لے لو، جو نہ دے اس کے بارے میں کچھ نہ کرو۔[۱]

اصول کافی کی اس چوتھی جلد میں انہی محمد بن یحییٰ سے محمد بن رجاء ارجانی کی سند سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام کو لکھا کہ میں نے خانۂ کعبہ میں ایک دینار دیکھا۔ جب اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک اور بھی ملا۔ پھر میں نے کنکر ہٹائے تو تیسرا بھی ملا۔ میں نے وہ تینوں دینار وہاں سے اٹھا لیے اور ان کی بابت معلوم کیا لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

---

[۱] یہ روایت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ امامؑ سوالوں کی کثرت سے گریز کرتے تھے۔ کیونکہ حکومت کی طرف سے خوف تھا جو ہر حال میں نگرانی کرتی تھی۔

آپ کا اس میں کیا حکم ہے؟ آپ نے لکھا کہ تم نے دیناروں کا جو معاملہ لکھا ہے میں نے اس پر غور کیا ہے۔ اگر تم صاحب ضرورت ہو تو ان میں سے ایک صدقہ میں دیدو اور اگر صاحب ضرورت نہیں ہو تو تینوں صدقہ میں دیدو۔

اصول کافی کی اسی چوتھی جلد میں انہی محمد بن یحییٰ سے محمد بن ارومہ کی سند سے ایسے شخص سے روایت ہے کہ جس نے امام ابوالحسن ثالثؑ سے روایت کی ہے کہ آپ امیرالمومنین امام علیؑ کے مقبرہ پر جا کر فرمایا کرتے:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا وَلِيَّ اللّٰهِ اَنْتَ اَوَّلُ مَظْلُوْمٍ وَّ اَوَّلُ مَنْ غُصِبَ حَقُّهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ لَقِيْتَ اللّٰهَ وَاَنْتَ شَهِيْدٌ عَذَّبَ اللّٰهُ قَاتِلَكَ بِاَنْوَاعِ الْعَذَابِ جِئْتُكَ بِحَقِّكَ مُسْتَبْصِرًا بِشَاْنِكَ فَاشْفَعْ لِيْ اِلٰى رَبِّكَ فَاِنَّ لَكَ عِنْدَ اللّٰهِ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا مَّعْلُوْمًا وَّجَاهًا وَّشَفَاعَةً وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى.

سلام ہو آپ پر اے ولی خدا کہ آپ پہلے مظلوم ہیں اور پہلے شخص ہیں جس کا حق غصب کیا گیا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ سے جا ملے جب کہ آپ شہید ہیں۔ اللہ آپ کے قاتل کو قسم قسم کے عذاب دے۔ میں آپ کی خدمت میں آیا ہوں اور آپ کے حق کو جانتا ہوں اور آپ کے مرتبہ کو پہچانتا ہوں۔ پس آپ اللہ سے میری شفاعت کر دیجیے کیونکہ آپ کو اللہ کے نزدیک قابل تعریف اور جانا بوجھا مقام، مرتبہ اور حق شفاعت حاصل ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے کہ (اسکے سامنے) صرف وہی شفاعت کر سکتے ہیں جن سے وہ خوش ہے۔ (سورۂ انبیاء۔ آیت ۲۸)

اسی طرح کربلا میں امام حسینؑ کے مقبرہ کی زیارت بھی آپ سے ایسے ہی الفاظ میں وارد ہوئی ہے جو ان الفاظ سے مختلف نہیں ہیں جو آپ سے امیرالمومنینؑ کی زیارت میں نقل ہوئے ہیں۔

اصول کافی کی پانچویں جلد میں علی بن محمد قاسانی کی سند سے روایت ہے کہ انہوں

نے کہا: ۲۳۱ھ میں جبکہ میں مدینہ میں تھا۔ میں نے امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کو لکھا کہ: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، ایک شخص نے ایک دوسرے شخص سے اپنے لیے کچھ سامان خریدنے کو کہا۔ اس نے وہ خرید لیا لیکن اس میں سے کچھ چوری ہو گیا یا راستہ میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ پس یہ کس کا مال گیا ہے، منگوانے والے کا یا لانے والے کا؟ آپ نے لکھا منگوانے والے کا مال گیا ہے۔

اصول کافی کی چھٹی جلد میں حمدان بن اسحاق کی سند سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میرا ایک بیٹا تھا کہ جس کے پھوڑا نکل آیا۔ لوگوں نے مجھ کو بتایا کہ نشتر کا چیرہ لگانے کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔ چنانچہ میں نے اس کے چیرا لگوایا لیکن اس سے وہ مر گیا۔ تب لوگ یہ کہنے لگے کہ میں ہی اس کی موت کا ذمہ دار ہوں۔ اس پر میں نے امام ابوالحسن علی نقیؑ کو یہ ماجرا لکھ بھیجا تو آپ نے اس کے جواب میں لکھا: اے احمد! جو کچھ تم نے کیا اس کے لیے تم قابل مواخذہ نہیں ہو کیونکہ تم اس کا علاج کرنا چاہتے تھے۔ البتہ اس کی موت اسی چیرے کے نتیجہ میں ہونا تھی جو تم نے لگوایا۔

اصول کافی میں چھٹی جلد کی کتاب تجمل میں ابوہاشم جعفری کی سند سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں امام ابوالحسن علی نقیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کے ایک بچہ نے گلاب کا پھول لا کر آپ کو دیا اور آپ نے اس کو بوسہ دیکر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ پھر وہ پھول مجھ کو دیا اور فرمایا: اے ابوہاشم! اگر کسی کو گلاب کا پھول یا کوئی دوسرا پھول ملے اور وہ اسکو بوسہ دیکر آنکھوں سے لگائے اور پھر محمدؐ اور آل محمدؐ پر صلوات بھیجے تو اللہ اس کے لیے ریت کے ٹیلہ کے ذروں کے برابر نیکیاں لکھ دے گا اور اس کے نامۂ اعمال میں سے اتنے ہی گناہ مٹا ڈالے گا۔

اصول کافی میں ساتویں جلد کی کتاب حدود میں جعفر بن رزق اللہ کی سند سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: خلیفہ متوکل کے سامنے ایک عیسائی پر حد جاری کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے اسلام کا کلمہ پڑھ لیا۔ اس پر یحییٰ بن اکثم نے کہا: اس کے ایمان نے اس کے شرک اور جرم کا خاتمہ کر دیا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس پر تین حدیں جاری کی جائیں اور اسی طرح کی مختلف آراء کا اظہار کیا گیا۔ تب متوکل نے حکم دیا: امام ابوالحسن علی نقیؑ کو خط لکھ کر اس مسئلہ کا حل دریافت کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے وہ خط پڑھ کر جواب میں لکھا: اس عیسائی

کو اتنا مارا جائے کہ وہ ہلاک ہو جائے ۔ یحییٰ بن اکثم اور شہر کے دوسرے فقیہوں نے اس کو نہ مانا اور کہا: اے امیر المومنین! نہ تو قرآن یہ کہتا ہے اور نہ رسول اللہؐ کی ایسی کوئی سنت ہے ۔متوکل نے امام کو پھر لکھا: مسلم فقہاء آپ کے اس فتویٰ کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ میں ایسا کوئی حکم موجود نہیں ہے ۔ پس آپ وضاحت کر دیجیے کہ آپ نے یہ حکم کیسے دیا کہ اس کو اتنا مارا جائے کہ وہ ہلاک ہو جائے ۔ آپ نے جواب میں لکھا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ. فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ. وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ.

(سورہ مومن ۔ آیت ۸۴-۸۵)

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے ۔ پس جب ان لوگوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہہ دیا کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے جو ایک ہے اور ان سے پھر گئے جن کو اس کے ساتھ شریک کیا کرتے تھے ۔ لیکن ہمارا عذاب دیکھنے کے بعد ان کا ایمان لانا ان کو فائدہ نہ دے گا ۔ یہ ہے اللہ کی وہ سنت جو اس کے بندوں کے لیے رائج رہی ہے ۔ ہاں کفر اختیار کرنے والے گھاٹے میں رہیں گے ۔

امامؑ کا یہ جواب آنے پر متوکل کے حکم سے عیسائی کو اتنا مارا گیا کہ وہ ہلاک ہو گیا ۔

اصول کافی میں ساتویں جلد کی کتاب ایمان ونذور میں علی بن ابراہیم سے، انہوں نے اپنے باپ سے ــــ اور انہوں نے رواۃ کی ایک جماعت سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: ایک مرتبہ جب متوکل کو سخت بخار ہو گیا تو اس نے نذر مانی کہ وہ بہت سامال صدقہ کرے گا لیکن اس کی مقدار معین نہیں کی تھی ۔ بعد میں فقہاء میں اس کی مقدار کے بارے میں شدید اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور وہ لوگ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے ۔ تب اس کے کسی درباری نے مشورہ دیا کہ بہتر ہو گا کہ یہ مسئلہ امام ابوالحسن علی نقیؑ سے دریافت کر لیا جائے ۔ اس نے کہا کہ کیا وہ اس کا مناسب جواب دے سکتے ہیں؟ اس شخص نے کہا: اگر وہ آپ کو اس پریشانی

کا حل بتادیں تو پھر آپ کو مجھے اتنا انعام دینا ہوگا ورنہ آپ مجھے سو کوڑے ماریے گا۔ چنانچہ متوکل نے آپ کے پاس جعفر بن محمود کو بھیجا تاکہ وہ آپ سے مال کثیر کی مقدار پوچھ آئے۔ جب اس نے جاکر پوچھا تو آپ نے فرمایا: کثیر سے مراد اسّی ہوتا ہے۔ جعفر بن محمود نے کہا: اے آقا! اگر وہ مجھ سے اس کی وجہ دریافت کرے تو؟ اس پر ابوالحسنؑ نے فرمایا: اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ (سورۂ توبہ۔ آیت ۲۵) اللہ تعالیٰ نے کثیر موقعوں پر تمہاری مدد کی۔ اور جب ہم نے ان موقعوں کا شمار کیا تو وہ اسّی تھے[1]۔

اس کے علاوہ حدیثوں کے مجموعوں میں آپ سے فقہی موضوعات پر اور بھی بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

مکاتبات الرجال: اعیان الشیعہ میں سید امین نے کہا ہے کہ خیبری یا حمیری کی کتاب "مکاتبات الرجال" میں لوگوں کے وہ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے امام علی نقی ہادیؑ اور امام حسن عسکریؑ کو مسائل کا جواب حاصل کرنے کے لیے لکھے تھے۔

علل الصلوٰۃ: اسحاق بن عبداللہ اشعری نے امام علی نقی ہادیؑ کے ارشادات کو کتاب "علل الصلوٰۃ و مسائل الرجال" میں جمع کیا ہے۔ جیساکہ فہرست طوسی میں ہے کہ وہ آپ کے فرزند امام ابو محمد عسکریؑ کے خاص اصحاب میں تھے لیکن وہ امام علی نقی ہادیؑ سے بھی روایت کرتے تھے۔

روایات عن ابی الحسن ثالث: ایوب بن نوح جو آپ کے وکیل تھے ان کی ایک کتاب کا نام "روایات عن ابی الحسن ثالث" ہے۔

کتاب علی بن بلال: شیخ محمد طہٰ کی کتاب "اتقان المقال" میں ہے کہ علی بن بلال البغدادی نے بھی امام علی نقی ہادیؑ کی روایات کو اپنی ایک کتاب میں جمع کیا تھا۔

رسالۂ علی بن ریان: علی بن ریان بن صلت اشعری قمی کا ایک رسالہ تھا جس میں انہوں نے امام ابوالحسن ثالثؑ سے اخذ کی ہوئی روایات جمع کی تھیں۔

---

[1] وقت، مقام اور مناسبت کے لحاظ سے کثیر کے معنی مختلف ہوتے ہیں۔ اس روایت میں اسکے یہی معنی ہونگے۔

منثور الاحادیث: عمران بن موسیٰ کہ جو امام ابوالحسن ثالث علی نقیؑ سے روایت کرتے تھے، ان کی ایک کتاب "منثور الاحادیث" ہے جس میں آپ سے لی ہوئی روایات لکھی تھیں۔ نیز انتقان المقال میں شیخ محمد طٰہٰ کے بیان کے مطابق علی بن ابراہیم بھی آپ سے روایت کرتے تھے۔

علی بن مہزیار اہوازی: علی بن مہزیار اہوازی امام علی نقی ہادیؑ اور آپکے والد بزرگوار امام محمد تقی جوادؑ کے خاص اصحاب میں سے تھے، وہ ان دونوں اماموں کی طرف سے وکیل تھے اور ان سے احادیث روایت کرتے تھے۔ راویان حدیث اور علمائے رجال کی رائے میں وہ قابل اعتماد تھے اور ان پہ کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تھا۔

احمد بن محمد اشعری: احمد بن محمد بن عیسیٰ اشعری نے امام علی رضاؑ، امام محمد تقی جوادؑ اور امام علی نقی ہادیؑ کا زمانہ پایا۔ وہ ان تینوں اماموں سے حدیث کی روایت کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی با اعتماد محدثین اور فاضل علماء تھے جو آپ سے روایت کرتے اور اہلبیتؑ کی حدیثوں کی حفاظت کرتے تھے۔

غالیوں کے بارے میں امام علی نقیؑ کا رویہ

بارہ اماموں میں سے ہر ایک نے اپنے زمانہ میں غلو اور غالیوں کے خلاف واضح رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ ان پاک ہستیوں نے غالیوں سے بیزاری ظاہر کی۔ ان کے کفر اور بے دینی کا اعلان کیا۔ ان کے نظریات کا اس صراحت سے انکار کیا کہ جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ تھی۔ ان ذوات مقدسہ کا ان سے اور ایسے ہی دیگر افراد سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ تھا جو اسلام کے معین خطوط سے بھٹک گئے تھے بلکہ وہ خود اسلام کے ان خطوط کی حفاظت کرتے رہے اور اس میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کرتے رہے چنانچہ ائمہ کرامؑ اور شیعہ علماء کی ان تمام کوششوں اور کاوشوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ہر ہر طریقے سے ان غالیوں کے نظریات کو پاش پاش کر کے نیست و نابود کر دیا جائے۔

اس ذیل میں یہ حضرات اس امر پہ زور دیتے تھے کہ غلو اپنی ہر صورت میں اسلام کے اس طرح برخلاف اور اس کی کھلی ہوئی ضد ہے کہ غالی لوگ اس کو چھیل چھال کر بھی اہل بیتؑ کے دوستدار مسلمانوں میں داخل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ امیرالمومنین امام علیؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: کفر چار ستونوں پہ قائم ہے۔ یعنی گناہ، غلو، شک اور شبہہ۔

امام جعفر صادقؑ سے بھی ایسی ہی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: کسی شخص کے لیے ایمان سے خارج ہو جانے کا معمولی سے معمولی راستا یہ ہے کہ وہ کسی غالی کے پاس بیٹھ کر اس کی باتیں سنے اور ان کو مانتا جائے۔ میں نے اپنے پدر بزرگوار سے، انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے، انھوں نے اپنے جد امجد سے اور انھوں نے رسول اللہؐ سے سنا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: میری امت کے دو گروہوں کو اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے اور وہ ہیں غالی اور قدریہ۔ [1]

رجال کشی میں ہے کہ امام علی نقی ہادیؑ نے ایک صحابی سے فرمایا: غالیوں سے کہہ دو کہ اللہ سے توبہ کریں کیونکہ وہ گناہگار، کافر اور مشرک ہیں۔ آپ نے بشار شعیری سے فرمایا: چلا جا یہاں سے، اللہ تجھ پر لعنت کرے۔ اس کے چلے جانے کے بعد امام نے فرمایا: وائے ہو اس پر کہ یہ بھی وہی کہتا ہے جو یہودی کہتے ہیں۔ یہ وہی کہتا ہے جو عیسائی کہتے ہیں اور یہ وہی کہتا ہے جو مجوسی کہتے ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا: اللہ تعالیٰ کو اس قدر کمتر حیثیت میں کسی نے پیش نہیں کیا، جیسا کہ اس فساد انگیز نے کیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا: یہ شیطان بن شیطان ہے اور شیعوں کو گمراہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم آپ کی سیرت کے ذیل میں غالیوں کے بارے میں آپ کے طرز عمل کو بیان کر آئے ہیں۔

ائمۂ اطہارؑ کی انہی کوششوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ اس چیز کا انکار فرماتے رہتے تھے کہ ان کے اور غالیوں کے ان سرغنوں کے درمیان کسی بھی قسم کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ وہ یہ اعلان کرتے رہتے تھے کہ وہ لوگ آپ حضرات پر جھوٹ باندھتے ہیں کیونکہ غالی کچھ حدیثیں گھڑ لیتے، ان میں ائمۂ کرامؑ کے اقوال کی آمیزش کر لیتے اور ان کو ائمہؑ سے منسوب کر دیتے تھے۔ اس طریقہ سے لوگوں میں ان کو اپنے حامی اور مددگار بنانے اور شریعت اسلام کے بگاڑنے میں مدد ملتی تھی اور غالیوں کی تحریک کے یہی دو نمایاں مقاصد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ائمۂ کرامؑ غلو اور غالیوں کے اس پہلو کو نمایاں کرتے رہتے اور ان کے متعلق اپنے نظریات و خیالات کو محدثین کے حلقوں میں عام کرنے کے خواہشمند رہتے تھے۔

---

[1] مسلمانوں کا وہ فرقہ جو انسان کے فعل کا ذمہ دار اللہ کو قرار دیتا ہے۔ (مترجم)

بہرحال امام علی نقی ہادیؑ کے عہد میں غالی ایک بار پھر ابھرے اور انھوں نے زور پکڑ لیا، حالانکہ اس سے پہلے جب یہ لوگ امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں ظاہر ہوئے تھے تو آپ کے محکم طرزِ عمل کی وجہ سے ان کی آواز دب گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پوتے امام علی نقی ہادیؑ کے زمانہ میں غالیوں کو پھر سے سازگار فضا مل گئی جو ائمۂ کرامؑ کے ان دشمنوں کے ذریعہ سے ملی تھی کہ جو آپ حضرات کی امامت اور ان کے مرتبہ کے صحیح مفہوم کو مسخ کرنے کے درپے تھے جس کو اللہ نے علیؑ و فاطمہؑ کی ذریت میں سے ان پاکیزہ اور منتخب افراد کے لیے خاص کر دیا ہے۔

غالیوں کے اس گروہ میں علی بن حسکہ اور قاسم بن یقطین بہت مشہور ہیں۔ چنانچہ محمد بن مسعود نے احمد بن محمد بن عیسیٰ کی سند سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام علی نقی ہادیؑ کی خدمت میں لکھا: بہت سے غالی عام لوگوں میں آپ سے اور آپ کے آباءِ کرامؑ سے منسوب کرکے ایسی حدیثیں اور باتیں بیان کرتے ہیں کہ جن میں بعض ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کے باعث لوگ اہلبیتؑ کے طریقہ اور ان کی روش سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان باتوں کو ایسے لوگوں کا نام لیکر نقل کرتے ہیں کہ جن کو وہ آپ کا دوستدار بتاتے ہیں۔ ایسا کرنے والوں میں علی بن حسکہ اور قاسم بن یقطین بہت نمایاں ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مراد اس شخص سے ہے جو نیکی کے لیے نصیحت کرتا اور بدی سے روکتا ہے۔ پھر اسی طرح زکات اور بہت سے دوسرے فرض و سنت کے احکام اور گناہ کے کاموں کی بھی تاویلیں کرتے ہیں۔ پس آپ اس معاملے کو واضح فرما دیجیے اور یہ بتا کر اپنے دوستداروں پر کرم کیجیے کہ وہ ان لوگوں، ان کے ایسے اقوال اور ان کے اقوال کو ماننے والوں سے کس طرح نجات حاصل کریں کیونکہ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ آپکے دوستدار ہیں۔ اس کے جواب میں آپ نے لکھا کہ: یہ غالی جو کچھ کہتے ہیں وہ ہمارا دین نہیں ہے اور تم لوگ ان سب سے کنارہ کش رہو۔ ایک روایت میں محمد بن عیسیٰ نے کہا ہے کہ امام علی نقی ہادیؑ نے اپنے خط کے شروع میں یہ لکھا: اللہ تعالیٰ قاسم بن یقطین اور علی بن حسکہ پر لعنت کرے۔ بے شک قاسم پر شیطان آتا ہے اور اس کو جھوٹی اور بے جوڑ باتیں بتا جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں سہل بن زیاد الآدمی سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: ہمارے ایک ساتھی نے امام علی نقی ہادیؑ کو لکھا کہ: اے آقا! میں آپ پر فدا ہو جاؤں، علی بن حسکہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آپ کی ذات اول اور قدیم ہے اور وہ آپ کا دوستدار، آپ کا باب اور آپ کا نبی ہے۔ نیز یہ کہ آپ نے اس کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کو آپ کی طرف دعوت دے۔ اس کا خیال ہے کہ نماز، روزہ حج اور زکات یہ سب آپ کی اور ابن حسکہ ایسے دوسرے افراد کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ہیں جو آپ کی طرف سے اپنی بابیت اور نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پھر اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ اب وہ خود مومن کامل ہو گیا ہے اور اس پر سے نماز وغیرہ کے ذریعہ عبادت کرنا ساقط ہو گیا ہے۔ چنانچہ بہت سے افراد ان کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں میری گزارش ہے کہ آپ اس بارے میں اپنے دوستداروں کو ہدایت سے سرفراز فرمائیے تاکہ وہ اس ہلاکت سے نجات پائیں۔ امام نے لکھا: ابن حسکہ جھوٹ بولتا ہے، اللہ اس پر لعنت کرے، اس کو کیا ہو گیا ہے۔ بخدا کہ اللہ نے محمد رسول اللہؐ اور ان سے قبل دوسرے انبیاءؑ کو نماز، زکات، روزہ، حج اور راستی و رہنمائی کے لیے مبعوث کیا جبکہ محمد رسول اللہؐ نے صرف اس اللہ کی طرف دعوت دی جو ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی طرح ہم ائمہ اہلبیتؑ کہ جو ان کی اولاد میں ان کے اوصیاءؑ ہیں، ہم اللہ کے بندے ہیں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار نہیں دیتے۔ اگر ہم اس کی اطاعت کریں گے تو وہ ہم پر رحم کرے گا اور اگر ہم اس کی نافرمانی کریں گے تو وہ ہم کو سزا دے گا۔ خدا کے سامنے ہماری کوئی حجت باقی نہیں، البتہ اللہ کی حجت ہم پر اور تمام مخلوق پر قائم ہے۔ ابن حسکہ یا جو کوئی بھی ایسی لغو باتیں کہتا ہے، میں اس سے اظہار بیزاری کرتا ہوں اور اللہ کے سامنے اس شخص کے اقوال سے اپنی برائت کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت کرتا ہوں کہ تم لوگ ان غالیوں سے دور رہو۔ اللہ ان پر لعنت کرے اور ان کو تنگ و تاریک راستے پر پھینک دے۔ اگر تم کو ان میں سے کوئی ملے تو پتھر مار کر اس کا سر پھوڑ دو۔

اس کے علاوہ حسن بن محمد (ابن بابا) محمد بن نصیر نمیری اور فارس بن حاتم قزوینی ہیں کہ امام علی نقی ہادیؑ نے ان سب پر لعنت فرمائی ہے اور اپنے اصحاب اور مسلمانوں کو

ان کی دھوکا بازیوں اور فریب کاریوں سے خبردار فرمایا ہے۔ مسلم فرقوں کے بانیوں پر لکھی گئی کتابوں کے مطابق محمد بن نصیر نمیری امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کی امامت کے ابتدائی ایام میں آپ کی اطاعت کرتا تھا۔ بعد میں کہنے لگا کہ میں ان کی طرف سے رسول ہوں۔ مزید یہ کہ وہ مسئلہ تناسخ کا بھی قائل ہو گیا اور غلو کرنے لگا۔ نہ صرف یہ بلکہ نبی مرسل بن کر اس نے مردوں کے ساتھ ایسی عورتوں کا نکاح جائز قرار دیدیا جو اُن کے لیے حرام تھیں اور پھر الٹا یہ بھی کہنے لگا کہ اللہ نے ان چیزوں کو منع نہیں کیا ہے۔ وہ اس قسم کی اور باتیں بھی کرتا تھا جو خدا کے دین اور رسول اللہؐ کی شریعت کے سراسر خلاف تھیں۔ یہ حالات دیکھ کر امام علی نقیؑ نے اپنے اصحاب کو ایک خط لکھا جس میں ان کو اور دوسرے مسلمانوں کو نمیری کی گمراہی سے خبردار کیا اور کہا: اللہ ان غالی لوگوں پر لعنت کرے کہ یہ دوسرے مسلمانوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتے اور ورغلاتے ہیں اور ہمارے لیے سخت تکلیف کا باعث ہیں۔ اللہ ان کو بھی تکلیف میں رکھے، ان کو لعنت میں ڈال دے اور ان کو فساد میں مبتلا کرے کیونکہ شیطان نے ان پر قابو پا کر ان کو گمراہ کر دیا ہے۔ اس طرح امام علی نقی ہادیؑ کوئی ایسا موقع نہ جانے دیتے جس میں آپ اپنے اصحاب اور دوسرے مسلمانوں کو ان غالیوں اور ان کی فریب کاریوں سے خبردار نہ کرتے ہوں۔ آپ ان پر لعنت کرتے اور ان پر لعنت کرنے اور ان سے قتال کرنے کا حکم بھی دیتے تھے۔ جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے ان غالیوں کے ساتھ کیا جنہوں نے آپ کے زمانہ میں بدعت اور غلو کا ارتکاب کیا تھا۔

انہی گم گشتہ راہ لوگوں میں فارس بن حاتم بھی تھا۔ اس کی صحبت لوگوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک تھی، کیونکہ یہ فریب دینے اور گمراہ کرنے میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ ابوعمر کشی نے اپنی کتاب رجال میں لکھا ہے کہ فارس کی گمراہ سازی کی وجہ سے امامؑ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور اپنے اصحاب میں سے کچھ لوگوں کو اس کے لیے مامور بھی کیا تھا۔ چنانچہ اس کتاب میں سعد بن عبداللہ بن ابی خلف قمی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ مجھ سے محمد بن عیسیٰ بن عبید نے بیان کیا کہ امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ نے فارس بن حاتم کے قتل کا حکم دیا تھا اور جو کوئی اس کو قتل کرے اس کے لیے جنت کی ضمانت دی تھی کیونکہ یہ بڑا فتنہ پرور تھا جو لوگوں کو مخالفِ اسلام باتوں کی طرف دعوت دیتا اور

ان کو ورغلاتا رہتا تھا۔ راوی کا کہنا ہے کہ یہ فارس بن حاتم امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کے ہاں سے نکل گیا اور پھر جھوٹ موٹ ان کی طرف سے کام کرنے اور لوگوں کو ورغلا کر مخالفِ اسلام افعال پر آمادہ کرنے لگا۔ چنانچہ امام علی نقی ہادیؑ نے اس کا خون ہر اس شخص کے لیے مباح قرار دیا تھا جو اس کو قتل کر ڈالے۔ امامؑ نے فرما دیا تھا جو کوئی اس کو قتل کرنے سے مجھ کو راحت پہنچائے گا میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔

کشی نے کتاب رجال میں ایک اور روایت بھی درج کی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص کہ جس کا نام جنید تھا، امام علی نقی ہادیؑ نے اس کو بلا کر کچھ درہم دیے تاکہ وہ ان سے اسلحہ خریدے اور پھر اس کو حکم دیا کہ وہ ہتھیار خریدنے کے بعد آپ کو دکھا دے۔ راوی کہتا ہے کہ جنید نے ایک تلوار خریدی، لیکن امامؑ نے اس کو واپس کرنے اور اس کی بجائے خنجر خریدنے کا حکم دیا۔ پھر جب آپ کو وہ خنجر لا کر دکھایا گیا تو اس کو آپ نے پسند فرمایا۔ تب جنید وہ خنجر لے کر چلا اور مغرب و عشاء کے درمیان مسجد کے باہر فارس بن حاتم سے جا ٹکرایا۔ اس نے اس کے سر پر خنجر کی ایک ایسی ضرب لگائی کہ جس سے وہ گر پڑا اور مر گیا۔

کشی نے اپنی کتاب رجال میں ہاشم ابن ابی ہاشم، ابوالسہری، ابن ابی زرقاء، جعفر بن واقد اور ابوالغمر کو بھی غالیوں میں شمار کیا ہے۔ آپ نے ان پر خود بھی لعنت کی اور یہ حکم دیا کہ ان پر لعنت کی جائے اور ان سے بیزاری اختیار کی جائے۔ آپ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ: جو کوئی اس پر لعنت نہ کرے کہ جس پر اللہ نے لعنت کی ہو تو پھر اللہ اس پر بھی لعنت کرتا ہے۔

یہ روایات صحیح ہیں یا نہیں؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس میں شک نہیں ہے کہ ائمۂ کرامؑ اپنا تمام زورِ بیان اور اپنی قوتِ عمل اس بات پر صرف کرتے تھے کہ وہ اپنے اصحاب، اپنے شیعوں اور ان تمام لوگوں کو جو ان سے قربت رکھتے تھے ان سب کو حق اور نیکی کے ایسے مبلغ بنا دیں جو اپنے قول سے پہلے اپنے افعال سے اسلام اور اس کی تعلیمات کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتے ہوں۔ جیسا کہ وہ اسلامی تعلیمات کو فساد، تحریف اور کذب سے بچانے کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔ لیکن وہ خود چونکہ اللہ کے بندے تھے اس لیے اپنی ذات کو دکھ سے اسی وقت بچا سکتے تھے یا اپنے لیے سکھ حاصل کر سکتے تھے، جب

اس میں اللہ کی مشیئت بھی شامل ہو۔ چنانچہ وہ اپنی زندگیوں میں حکمرانوں کے ظلم وستم سے اس حد تک دوچار ہوتے رہے کہ ایسی آزمائش اور مصیبت کا مقابلہ کرنا عام آدمی کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ یہ حضرات عام لوگوں کے ساتھ انہی کی طرح زندگی بسر کرتے رہے۔ وہ ان لوگوں پر لعنت کرتے تھے جو ان کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہوں جو خود انہوں نے اپنے متعلق نہ کہی ہوں۔ مثلاً یہ کہ وہ ان حضرات سے ذاتی علم غیب، خلق کرنے اور رزق دینے یا کسی ایسی صفت کو منسوب کرتے ہوں جو اللہ ہی سے مخصوص ہے۔ اس کے باوجود ان کے بعض دوستوں اور بعض دشمنوں نے ان سے ایسی ہی صفات منسوب کر دیں اور کچھ لوگوں نے بدنیتی سے ان کے بارے میں غلو کا ارتکاب کیا۔ تاہم ائمہ کرامؑ اس ساری صورت حال پر نظر رکھتے تھے اور غلو کرنے والوں پر لعنت کرتے، ان سے بیزاری ظاہر کرتے اور ان کی گمراہی اور کجروی کا اعلان فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے اپنے دوستداروں کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ اعتدال پر قائم رہیں اور دشمنوں کو نصیحت کی کہ اہل بیتؑ کے بارے میں رسول اللہ کے ارشادات اور ہدایات کا خیال رکھیں۔ پھر وہ اپنے اپنے وقت میں جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اس حیثیت سے رخصت ہوئے کہ اللہ کی مخلوق کو ہدایت کرنے میں سب سے آگے، اس کے دین اور شریعت کے سب سے شیدا، اس کی طرف سے آئی ہوئی ہر آزمائش پر سب سے بڑھ کر صبر کرنے والے اور اس کی ناراضی اور عذاب سے سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔

امام علی نقیؑ کے سامرا جانے کے اسباب

اپنے والد بزرگوار امام محمد تقی جوادؑ کی شہادت کے بعد امام علی نقیؑ بیس سال سے زیادہ عرصے تک مدینہ میں مقیم رہے، جہاں لوگ آپ سے محبت کرتے اور آپ کے گرد جمع رہتے تھے۔ علماء اور طالبان علم آپ سے وابستہ رہتے اور آپ کے شیعہ آپ سے رابطہ رکھتے تھے۔ آپ کے زمانہ میں پہلے سے کہیں زیادہ لوگ خط وکتابت کے ذریعہ سے دین کے مسائل دریافت کرتے اور اپنی مشکلوں کے حل کے لیے دربار امامت سے رجوع کیا کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کے تمام تر حالات پر حکومت کی طرف سے کڑی نگرانی بھی جاری رہتی تھی۔ چنانچہ خلیفہ متوکل کے ایک ہمدرد بریحہ عباسی نے اس کو لکھا کہ اگر

آپ مکہ اور مدینہ کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتے ہیں تو وہاں سے امام علی نقی بن محمدؑ کو نکال دیجیے۔ وہ لوگوں کو اپنی امامت کی دعوت دیتے ہیں اور بہت سے لوگ ان کے پیرو بن گئے ہیں۔ پھر اس نے متوکل کو اسی مضمون کے اور بھی کئی ایک خط لکھے۔ جب امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کو معلوم ہوا کہ بریحہ عباسی متوکل سے اس طرح کی خط و کتابت کر رہا ہے کہ جس میں وہ آپ کی ہستی کو اس کے لیے خطرہ بنا کر پیش کرتا ہے تو آپ نے متوکل کو ایک خط میں لکھا کہ: بریحہ عباسی اکثر میری مخالفت کرتا اور بلا وجہ پریشان کرتا رہتا ہے۔ جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ جھوٹ کی پوٹ ہے۔ چنانچہ آپ کے اس خط کے جواب میں اس نے بھی آپ کو ایک خط بھیجا جو مکر، فریب اور دھوکہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ: امیرالمومنین کو معلوم ہو گیا ہے کہ جو کچھ آپ کی بابت کہا گیا ہے۔ آپ اس سے بری الذمہ ہیں اور آپ کی نیت پاک ہے۔ نیز آپ نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ جس پر آپ کو متہم کیا جا سکے۔ پس میں نے عبداللہ بن محمد کے بجائے محمد بن فضل کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا اور اس کو حکم دیا ہے کہ وہ آپ کی عزت اور راحت کا خیال رکھے اور آپ کے معاملہ میں آپ کی رائے کا لحاظ کرے۔ کیونکہ وہ اسی طرح سے اللہ اور امیرالمومنین کا تقرب حاصل کر سکتا ہے۔ البتہ امیرالمومنین آپ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں اور آپ سے تجدید عہد کرنا چاہتے ہیں۔ پس اگر آپ ان سے ملنا اور ان کے پاس قیام کرنا پسند فرمائیں تو جب بھی آپ مناسب تصور کریں، اپنے اہل خانہ اور غلاموں کے علاوہ جو بھی سامان اپنے ساتھ لانا چاہیں وہ لیکر وہاں سے روانہ ہوں۔ اس سفر کے دوران میں آپ جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں پڑاؤ کریں اور جب چاہیں روانگی کریں۔ اگر آپ پسند کریں تو امیرالمومنین کا غلام یحییٰ بن ہرثمہ اپنے لشکر سمیت آپ کے قافلہ کے ہمرکاب رہے اور آپ کے ساتھ چلتا رہے۔ ہم نے اس کو آپ کی خدمت پر مامور کر دیا ہے اور وہ اس دوران میں آپ کے حکم پر کاربند رہے گا۔ پس آپ کو اللہ خیر سے رکھے۔ یہاں تک کہ آپ امیرالمومنین کے پاس پہنچ جائیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اپنے بھائیوں، اولاد، خاندان اور خاص لوگوں میں سے کوئی بھی فرد آپ سے زیادہ بلند مرتبہ نہیں رکھتا اور نہ کسی کا خاندانی شرف آپ سے زیادہ قابل تعریف ہے۔ وہ ان لوگوں میں کسی کا آپ سے زیادہ خیال نہیں رکھتے، نہ کسی پر آپ

سے زیادہ شفیق ہیں اور نہ ان کو آپ سے زیادہ کسی اور سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

متوکل نے امام علی نقی ہادیؑ کو یہ خط ایسے مہذب طریقہ اور نرم لہجہ میں لکھا، گویا کہ وہ ایک ایسا پارسا شخص ہے جو اللہ کے ایک ولی سے تواضع، خدمت اور احترام کا وعدہ کررہا ہے۔ حالانکہ وہ علیؑ، آلِ علیؑ اور ہراس شخص سے دشمنی رکھتا تھا جو قرابت یا کسی اور وجہ سے ان کے ساتھ تعلق رکھتا ہو۔ ادھر امامؑ بھی اس کے اس خبث باطن کو خوب سمجھتے تھے اور آپ یہ بھی جان گئے تھے کہ اب وہ آپ کو مدینہ میں رہنے نہیں دے گا۔ چونکہ آپؑ کے لیے اس کے بلاوے سے مفر کا کوئی راستا نہیں تھا۔ اس لیے آپ نے اس کی یہ دعوت قبول کرلی۔

ادھر متوکل نے یحییٰ بن ہرثمہ اور اس کے لشکر والوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ امامؑ کے مکان کی اچھی طرح تلاشی لے لیں، کیونکہ مدینہ میں اس کے اہلکاروں نے اسکو اطلاع دی تھی کہ آپ اس کے خلاف فوجی کارروائی کے لیے سپاہ اور ہتھیار جمع کررہے ہیں۔ چنانچہ جب وہ مدینہ میں داخل ہوا تو اس سے لوگوں نے کچھ شر کا خطرہ محسوس کیا اور ان کو خوف ہوا کہ وہ امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کر بیٹھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ متوکل کے دل میں اہلبیتؑ کی طرف سے کینہ بھرا ہوا ہے۔

اس ذیل میں مسعودی، ابن جوزی اور دوسرے راوی یحییٰ بن ہرثمہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا: جب میں مدینہ میں داخل ہوا تو وہاں کے لوگوں نے امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کے بارے میں ڈر کر ایسا سخت شور مچایا کہ جس سے گویا زمین کی گردش رک گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ہمیشہ مسجد سے وابستہ رہتے، حرص دنیا سے کوئی سروکار نہ رکھتے اور لوگوں کے ساتھ بھلائیاں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں کو اطمینان دلایا اور قسمیں کھائیں کہ مجھ کو ان کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کرنے کا حکم نہیں ملا۔ نیز یہ کہ امامؑ کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد میں نے آپ کے مکان میں داخل ہو کر اس کی تلاشی لی۔ جیسا کہ متوکل نے مجھ کو حکم دیا تھا لیکن وہاں مجھ کو قرآن شریف، دعاؤں اور دوسری علمی کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ اس پر میرے دل میں امامؑ کی عظمت بیٹھ گئی اور جب وہ چلنے کو تیار ہوگئے

تو ہم لوگ بھی ان کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ پھر میں سارے سفر میں ان کی خدمت کرتا رہا تا اینکہ میں ان کو لیکر بغداد پہنچ گیا۔

مسعودی نے مروج الذہب میں یحییٰ بن ہرثمہ سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا: جب ہم مدینہ سے چلے تو آسمان صاف تھا اور آفتاب چمک رہا تھا۔ اس کے باوجود امامؑ نے بارش سے حفاظت کا سامان فراہم کر لیا اور اپنی سواری کو ایڑ لگانا شروع کر دی۔ تب مجھ کو آپ کے اس فعل پر تعجب ہو رہا تھا لیکن تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ بادلوں نے ایک دم پانی برسانا شروع کر دیا اور ہم کو شدید بارش کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پر آپ نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: مجھ کو معلوم ہے کہ تم مجھ کو دیکھ کر برا مان رہے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید مجھ کو کچھ ایسی چیزیں معلوم ہیں جو تم نہیں جانتے مگر ایسا نہیں ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ میں دیہات میں پلا بڑھا ہوں اور ان ہواؤں کو پہچانتا ہوں جو مینہ لے کر لاتی ہیں۔ آج کی صبح میں نے ہوا میں پانی کی نمی محسوس کی تھی اس لیے میں نے پہلے ہی سے اس کا مناسب انتظام کر لیا تھا، جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو۔

اس مقام پر کچھ شیعہ محدثین امام کے بارے میں ایسی باتیں روایت کرتے ہیں جو ائمۂ کرامؑ کی کرامات میں سے ہیں۔ ان کا ماحصل یہ ہے کہ یحییٰ بن ہرثمہ کے ساتھ متوکل نے اپنے خاص آدمیوں اور لشکریوں سمیت تین سو آدمی بھیجے تھے تاکہ وہ امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کے ساتھ رہیں۔ انہوں نے مدینہ کے راستے میں ایک صحرا سے گزرتے ہوئے ان باتوں کا ذکر چھیڑ دیا جو شیعہ محدثین امام علیؑ بن ابی طالبؑ اور دوسرے ائمہؑ کے متعلق روایت کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں ایک نہ ایک قبر نہ ہو۔ اس پر ان میں سے بعض لوگ اس قول کا مذاق بھی اڑاتے رہے۔ البتہ جب وہ لوگ مدینہ پہنچے تو امام علی نقی ہادیؑ نے ان سے کچھ دیر ٹھیرنے کو کہا تاکہ آپ تیاری فرمالیں۔ اگرچہ وہ ایک تیز گرمی کا مہینہ تھا لیکن جب امام علی نقی ہادیؑ نے گرم کپڑے، لبادے اور ایسی ہی دوسری چیزیں مہیا کیں تو ان لوگوں نے اس کا بھی مذاق اڑایا۔ البتہ راستہ چلتے چلتے ایک دم رت بدل گئی، فضا تاریک ہوگئی تیز ہوا کے ساتھ ایسی بارش شروع ہوگئی جس کی مثال ان لوگوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ طوفان باد و باران آلیتا، امامؑ اور آپ کے ساتھ والوں نے گرم کپڑے

پہن لیے اور جو بچ گئے وہ یحییٰ اور اس کے کچھ ساتھیوں کو دیدیے۔ ادھر تند ہوائیں ان لوگوں کو تھپیڑے مارتی رہیں اور بارش بھی ہوتی رہی ——————— یہاں تک کہ یحییٰ کے کچھ ساتھی جاں بحق ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد بادل چھٹ گئے، ہوا رک گئی اور فضا اپنی پہلی سی حالت پر آ گئی۔ تب امامؑ نے یحییٰ سے فرمایا: جاؤ اور اپنے مر جانے والے آدمیوں کو دفن کرو۔ ہاں اس طرح سے اللہ زمین کو قبروں سے بھرتا رہتا ہے تا اینکہ کوئی حصہ ایسا باقی نہ رہے گا جہاں کوئی قبر نہ ہو۔

راوی کہتا ہے کہ یحییٰ امام علی نقی ہادیؑ سے لپٹ کر آپ کے ہاتھوں اور پیشانی پر بوسے دینے لگا اور یہ کہتا جاتا تھا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ آپ حضرات زمین پر اللہ کے خلیفہ ہیں۔ یہ امر ان ذوات مقدسہ کے لحاظ سے نہ تو محال ہے اور نہ تعجب خیز کہ جن کو اللہ نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا ہو، اپنی مخلوق پر اپنی حجت بنایا ہو اور اپنی اطاعت کے لیے دلیل قرار دیا ہو۔ چنانچہ راویوں نے ان حضرات کے متعلق ایسی دسیوں کرامات بیان کی ہیں جو صرف ایسے ہی افراد سے ممکن ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لیے وقف کر دیا ہو اور جو اسی کے امر اور نہی پر مبنی احکام کی پابندی کرتے ہوں، مگر ان حضرات کے علاوہ کوئی اور ایسا عالم اور کامل نہیں ہو سکتا۔ تاہم میں نے ان حضرات کی سیرت کے اس پہلو کو چنداں نمایاں نہیں کیا لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں ان سب کرامات کو انکے دوستداروں یا غالیوں کی ساخت و پرداخت سمجھتا ہوں، بلکہ اس لیے کہ میں دیکھتا ہوں، یہ حضرات اپنی زندگیوں میں ظلم اور ظالموں کے مقابلہ میں کچھ اس طرح ڈٹے رہے۔ اللہ کی راہ میں ایسی قربانیاں دیتے رہے اور انسانیت کی بھلائی کے لیے وہ حیران کن ایثار کرتے رہے جو ان کی عظمت اور کاملیت کی ان غیبی کرامات سے کہیں زیادہ بڑی دلیلیں ہیں، جن کرامات پر صرف تھوڑے سے لوگ ہی یقین کرتے ہیں۔

محدثوں اور مورخوں نے امام علی نقی ہادیؑ کے مدینہ سے سر من رائے (سامرہ) کے سفر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ یحییٰ بن ہرثمہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا: جب میں آپ کو لیکر مدینۃ السلام (بغداد) پہنچا تو میں سب سے پہلے اسحٰق بن ابراہیم طاہری سے ملا جو اس وقت بغداد شہر کا حاکم تھا۔ اس نے مجھ سے کہا: اے یحییٰ! جن صاحب کو

تم لائے ہو یہ تو رسول اللہ ؐ کے فرزند ہیں اور متوکل کے دل میں جو کچھ ہے وہ تم جانتے ہی ہو۔ اگر تم ان کے قتل میں اس کی اعانت کرو گے تو رسول اللہ ؐ یقیناً تم سے بیزار ہو جائیں گے۔ میں نے کہا: بخدا کہ میں نے ان میں سوائے اچھی صفات کے اور کچھ نہیں پایا ہے۔

مروج الذہب اور دوسری کتابوں کے مطابق یحیٰی بن ہرثمہ نے مزید کہا کہ پھر میں سامرا گیا اور وہاں میں سب سے پہلے وصیف ترکی سے ملا کیونکہ میں اس کے دوستوں میں سے تھا۔ اس نے مجھ سے کہا: بخدا کہ اگر تم نے اس شخص کے سر کا ایک بال بھی بیکا کیا تو مجھ سے بڑھ کر اس کا بدلہ لینے والا اور کوئی نہ ہو گا۔ اس پر مجھ کو ان دونوں یعنی اسحاق بن ابراہیم طاہری اور وصیف ترکی کے خیالات کی ہم آہنگی پر بڑی حیرت ہوئی۔ پھر جب میں متوکل کے پاس پہنچا تو اس نے مجھ سے آپ کے متعلق دریافت کیا، تب میں نے اس کو آپ کی نیک اطواری، دیانتداری، خدا ترسی اور زہد و عبادت گزاری کا حال بتلایا اور یہ بھی کہا کہ میں نے آپ کے مکان کی تلاشی لی لیکن مجھ کو وہاں قرآن مجید اور علمی کتابوں کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ جب میں مدینہ پہنچا تو اہل مدینہ کو ان کی سلامتی کا اندیشہ ہوا اور انہوں نے اس بات پہ احتجاج کیا اور بہت شور مچایا۔ پھر جب تک میں نے ان کے سامنے یہ قسم نہ کھالی کہ امیرالمومنین ان کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے، اس وقت تک وہ خاموش نہیں ہوئے۔ چنانچہ متوکل نے بھی آپ کا خیر مقدم کیا، آپ سے عزت کے ساتھ پیش آیا، آپ کو معقول رقم دی اور آپ کو اس مکان میں ٹھہرا دیا جو آپ کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

البتہ شیخ مفید کی روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام علی نقی ہادیؑ جس روز سامرا پہنچے تھے، اس روز متوکل نے آپ کو ملنے کا موقع نہیں دیا بلکہ آپ کو ایک سرائے میں اتارا اور اس روز آپ وہیں رہے۔ ہاں دوسرے دن اس نے آپ کو ملنے کا موقع دیا اور پھر آپ کے رہنے کے لیے ایک علٰحدہ مکان بھی مخصوص کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب سے امامؑ سامرا تشریف لائے تو پھر آپ وہیں مقیم رہے اور سبھی روایات یہ بتلاتی ہیں کہ خلیفہ متوکل ظاہراً آپ کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ البتہ وہ آپکے جملہ اقوال و افعال پر کڑی نظر رکھتا تھا ——— نیز وہ آپ کو وقتاً فوقتاً اپنی صحبت میں بلا بھیجتا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے

بیان کر آئے ہیں کہ آپ کے شیعہ ان دنوں زیادہ تر آپ سے خط و کتابت کے ذریعہ ہی رابطہ قائم رکھتے تھے۔

مروج الذہب کی دوسری جلد میں مسعودی کا بیان ہے کہ متوکل کے زمانہ میں ایک عورت نے دعویٰ کیا کہ وہ امام علی بن ابی طالبؑ کی بیٹی ہے اور اللہ نے اس کی عمر کو اس وقت تک طول دیدیا ہے۔ جب اس کو متوکل کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے امام علی نقی ہادیؑ کو وہاں بلا لیا۔ چنانچہ آپ وہاں تشریف لائے اور آپ نے اس عورت سے فرمایا کہ چونکہ درندے بنی فاطمہؑ کا گوشت نہیں کھاتے اس لیے تم درندوں کے پنجرے میں داخل ہو جاؤ تاکہ تمہارے سچ اور جھوٹ کا پتا چل جائے مگر وہ ڈر گئی اور ایسا کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ تب امامؑ اپنی جگہ سے اٹھے اور درندوں کے بیچوں بیچ جا کھڑے ہوئے۔ اس وقت وہ درندے آپ کے قریب آ گئے اور انہوں نے آپ کے کپڑے چاٹنا شروع کر دیے۔ جب اس عورت نے یہ منظر دیکھا تو وہ اپنے دعویٰ سے دست کش ہو گئی۔

الارشاد شیخ مفید میں علی بن ابراہیم کی سند سے ابن تغیم بن محمد طاہری سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک بار متوکل بیمار پڑ گیا اور پھر اس کے بدن پر بڑا سا پھوڑا نکل آیا اور کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس پر نشتر سے چیرا لگوا دیتا۔ حتیٰ کہ اس پھوڑے کی تکلیف کے باعث وہ مرنے کے قریب ہو گیا۔ چنانچہ اس کی ماں نے نذر مانی کہ اگر متوکل شفایاب ہو جائے تو وہ امام ابوالحسن علیؑ ابن محمدؑ کی خدمت میں ایک بڑی رقم نذرانہ میں پیش کرے گی۔ ادھر فتح بن خاقان نے بھی متوکل کو مشورہ دیا کہ آپ ابوالحسن سے کہلوائیے، ممکن ہے ان کے پاس کوئی ایسی شے ہو جس سے اللہ آپ کی یہ تکلیف دور کر دے۔ چنانچہ اس کا ایک آدمی آپ کے پاس گیا اور اس نے آ کر کہا: امام علی نقی ہادیؑ نے فرمایا ہے کہ بھیڑ بکری کی چربی کو گلاب کے عرق میں ملا کر پھوڑے پر لگائیں جو اللہ کے حکم سے فائدہ دے گی۔ متوکل کے پاس بیٹھنے والوں نے اس بات کا مذاق اڑایا، لیکن فتح بن خاقان نے ان لوگوں سے کہا کہ تم کو ان کے کہے کو آزمانے میں کیا جھجک ہے۔ بخدا میں امید رکھتا ہوں کہ اسی سے فائدہ ہو گا۔ چنانچہ یہ چربی منگائی گئی اور اس کو عرق گلاب میں حل کر کے پھوڑے پر لگایا گیا جس سے وہ پھوٹ نکلا اور متوکل کو آرام آ گیا۔ تب اس کی ماں نے اپنی منت

پوری کی اور دس ہزار دینار کی تھیلی پر اپنی مہر کر کے امام علی نقی ہادیؑ کی خدمت میں بھجوادی۔

کچھ دنوں کے بعد بطحانی نے متوکل سے امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کی چغلی کی اور کہا کہ انہوں نے اپنے پاس بہت سارا مال اور ہتھیار اکٹھے کر لیے ہیں۔ اس پر متوکل نے سعید حاجب کو حکم دیا کہ وہ رات کو آپ کے مکان پر چھاپہ مارے اور وہاں جو بھی مال اور ہتھیار ملیں وہ سب اٹھا کر لے آئے۔ ابراہیم بن محمد کا کہنا ہے کہ مجھ سے سعید بن حاجب نے بیان کیا کہ: میں سیڑھی لیکر رات کے وقت امام ابوالحسنؑ کے مکان پر جا پہنچا اور چھت سے ہو کر تاریکی میں ایک کھڑکی پر اتر گیا، لیکن میں یہ نہ سمجھ پا رہا تھا کہ دروازہ تک کیسے پہنچوں۔ اتنے میں خود امامؑ نے مجھ کو آواز دی کہ اے سعید! وہیں ٹھہرے رہو، یہاں تک کہ لوگ تمہارے پاس شمع لے آئیں۔ کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ لوگ شمع لیکر میرے پاس آ گئے۔ میں نیچے اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ایک اونی جبہ اور اونی ٹوپی زیب تن کیے چٹائی کے مصلے پر قبلہ رو تشریف فرما ہیں۔ آپ نے فرمایا: مکان کے سب حجرے تمہارے سامنے موجود ہیں۔ چنانچہ میں نے ہر ایک حجرے میں جا کر تلاشی لی، لیکن مجھ کو ان میں کوئی چیز نہ ملی۔ البتہ مجھ کو ایک تھیلی ملی کہ جس پر متوکل کی ماں کی مہر لگی ہوئی تھی اور اسی کے ساتھ ایک مہر بند بٹوا بھی ملا۔ پھر امام ابوالحسنؑ نے کہا کہ یہ جا نماز بھی دیکھ لو۔ میں نے اس کو اٹھایا تو نیام میں رکھی ہوئی ایک تلوار ملی۔ چنانچہ میں یہ چند چیزیں متوکل کے پاس اٹھا لے گیا۔ جب اس نے تھیلی پر اپنی ماں کی مہر دیکھی تو اس کے بارے میں اس سے پچھوایا۔ اس نے بتا دیا کہ میں نے تمہاری بیماری کے دوران نذر کی تھی کہ اگر تم کو شفا ہو گئی تو اپنے مال میں سے امام علی نقی ہادیؑ کو دس ہزار دینار دوں گی جو میں نے ان کو بھجوا دیے تھے۔ تب اس نے کہا: اس بٹوے اور دوسری تھیلی کے دینار باہم ملا دیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھ سے کہا کہ یہ سب کچھ امام ابوالحسنؑ کے پاس لے جاؤ اور ان کی تلوار اور تھیلی مع رقم کے واپس دے آؤ۔ چنانچہ میں یہ سب چیزیں ان کی خدمت میں لے گیا اور بڑی شرمندگی کے ساتھ عرض کیا: اے آقا! مجھ کو بہت گراں معلوم ہو رہا ہے کہ میں آپ کے مکان میں آپ کی اجازت کے بغیر داخل ہوا تھا، لیکن کیا کرتا مجھ کو ایسا ہی حکم دیا گیا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا: وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ. (سورۂ شعرا۔ آیت ۲۲۷)

یعنی جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس جگہ لوٹائے جائیں گے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ چغلی کرنے والے وقتاً فوقتاً اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ متوکل کو امام علی نقی ہادیؑ کے خلاف ورغلاتے رہیں اور آپ کو اس کے تخت حکومت کے لیے خطرہ بنا کر دکھائیں۔ چنانچہ اس کے بہت سے حاشیہ بردار پکے ناصبی اور اہل بیت کرامؑ سے بغض اور دشمنی رکھنے والے تھے، جیسے علی بن جہم، محمد بن داؤد ہاشمی، ابو سمط اور بطحانی وغیرہ کہ جنہوں نے اپنے آپ کو شیطان کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔

مروج الذہب کی دوسری جلد میں ہے کہ متوکل کے حاشیہ برداروں میں سے کچھ لوگوں نے اس سے امام ابو الحسن علی نقی ہادیؑ کی چغلی کی کہ آپ کے مکان میں بہت سامال اور ہتھیار جمع ہیں۔ نیز آپ کے شیعوں کے خط ہیں کہ جن میں انھوں نے آپ کو حکومت کے خلاف فوج کشی پر آمادہ کیا ہے اور اب آپ اس کے لیے ساز و سامان مہیا فرما رہے ہیں۔ پس اس نے ترکوں اور دوسرے لوگوں کی ایک جماعت کو بھیجا، جس نے آپ کے گھر پر رات کے وقت چھاپہ مارا لیکن انہوں نے گھر میں آپ کو تنہا پایا جبکہ آپ بالوں کا لباس پہنے ہوئے تھے اور آپ کے سر پہ اونی ٹوپی تھی۔ آپ کے گھر میں کوئی ساز و سامان اور مال و متاع موجود نہ تھا۔ اس وقت آپ قرآن کی آیات تلاوت فرما رہے تھے جو وعدہ و وعید سے متعلق ہیں۔ وہ لوگ آپ کو اسی حالت میں کہ جس میں آپ کو پایا تھا، متوکل کے پاس لے گئے۔ جب آپ کو اس کے سامنے کھڑا کیا گیا تو اس وقت وہ شراب کی محفل میں تھا اور جام اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے آپ کو دیکھا تو آپ کی تعظیم کی اور اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ چونکہ آپ کے گھر میں ایسی کوئی چیز نہ ملی کہ جس کے متعلق خلیفہ سے کہا گیا تھا اور نہ کوئی اور ایسا سبب تھا، جس کے باعث آپ کے خلاف کچھ کیا جا سکتا۔ اس لیے متوکل نے اور تو کچھ کہا سنا نہیں لیکن اپنے ہاتھ کا جام آپ کو پیش کر دیا۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: اے امیر المومنین! میرے گوشت اور خون میں شراب کبھی داخل نہیں ہوئی۔ پس آپ مجھ کو اس سے معاف رکھیے۔ چنانچہ اس نے امامؑ کی اس بات کو مان لیا۔ اب وہ آپ سے کہنے لگا: کچھ ایسے شعر پڑھیے جو مجھ کو اچھے معلوم ہوں۔ امامؑ نے اس پر بھی عذر فرمایا اور کہا: میں شعر کم ہی کہتا ہوں۔ لیکن اس نے آپ کا عذر قبول نہ کیا اور

آپ سے اصرار کیا، تب آپ نے یہ اشعار پڑھے :

۱۔ لوگ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے لگے تاکہ وہ ان کو محفوظ رکھیں لیکن ان چوٹیوں نے ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچایا اور دوسرے لوگوں نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا۔

۲۔ موت نے ان کو ان کے قلعوں کی بلندیوں سے گرا کر قبروں میں پہنچا دیا، ہاں کیسی بری جگہ ہے جہاں وہ گرا دیے گئے۔

۳۔ جب قبروں میں پہنچ گئے تو پکارنے والے نے ان کو آواز دی کہ اب کہاں ہیں تمہارے وہ اچھے اچھے لباس، کہاں ہیں تمہارے تاج اور کہاں ہیں تمہارے گھرانے کے لوگ جن پر تم کو غرور تھا۔

۴۔ وہ چہرے کیا ہوئے جو ناز و نعم میں سرخ و سفید تھے اور جن پر بڑے بڑے عمامے اور کلغیاں سجی ہوئی تھیں۔

۵۔ تب ان کی قبر نے پکار کر کہا : آؤ دیکھ لو کہ اب ان کے چہروں پر گرد و غبار کی تہیں جم رہی ہیں۔

۶۔ ان لوگوں نے دنیا میں رہ کر خوب خوب کھایا پیا لیکن بالآخر اب خاک قبر نے خود ان کو کھا لیا ہے۔

۷۔ وہ بہت دنوں تک گھروں میں رہے جو ان کو موت سے بچائے رکھیں لیکن انجام کار ان کو وہ گھر چھوڑ کر قبروں میں جانا پڑا۔

۸۔ انہوں نے ہر طریقے سے خوب مال و دولت جمع کیا لیکن وہ سب کا سب اپنے دشمنوں کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔

۹۔ ان کے وہ اونچے اونچے مکانات اب ویران ہیں کیونکہ ان میں بسنے والے قبروں میں جا پڑے ہیں۔

امامؑ اسی طرح کے اشعار پڑھتے رہے کہ جن کی خلیفہ متوکل کو توقع بھی نہ تھی لیکن اب وہ زار زار رونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے رونے سے اور لوگ بھی جو بزم مینا و جام میں موجود تھے وہ بھی رونے لگے۔

چنانچہ اس نے وہاں سے شراب اٹھالیے جانے کا حکم دیدیا اور پھر امامؑ سے دریافت کیا: اے ابوالحسنؑ! کیا آپ پر کوئی قرض ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! مجھ پر چار ہزار دینار قرض ہیں۔ اس نے یہ رقم آپ کو دیے جانے کا حکم دیا اور آپ کو عزت کے ساتھ آپ کے مکان پر واپس پہنچوادیا۔

اس طرح امامؑ کی چغلی کرنے والے اپنی کوششوں میں ناکام رہے اور متوکل کو اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اسی بنا پر اس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ امامؑ کو وہاں موجود اپنے درباریوں اور شراب خور ہم جلیسوں کے سامنے خفیف کرے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آپ کو وہ جام شراب پیش کیا جو اس نے اپنے لیے تیار کیا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ امامؑ کی رائے میں شراب پینے والا بھی بت پوجنے والے جیسا ہے کیونکہ آپ کے آباء کرامؑ یکے بعد دیگرے نبیٔ اکرمؐ سے یہی روایت کرتے آئے ہیں۔ جب وہ اس معاملہ میں آپ سے مایوس ہوگیا تو اس نے ایک دوسرے طریقہ سے آپ کو اپنے ڈھب پر لانا چاہا۔ یعنی اس نے آپ سے شراب اور لونڈیوں کی تعریف میں اشعار پڑھنے کی فرمائش کردی تاکہ وہ انہی سے محظوظ ہوتا رہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ امامؑ اس کو اپنے پند و نصائح کے ایسے تھپیڑ رسید کریں گے جو اس پر بجلی کی طرح آپڑیں گے اور آپ اس کے سامنے حکومت اور ریاست والوں کی وہ تصویر پیش فرمادیں گے، جس سے اس کو پتا چل جائے گا کہ اس کا اور ایسے ہی دوسرے ظالم، سرکش اور ہوس ران حاکموں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ تمام ظالموں کے بارے میں کہ خواہ وہ زندہ ہوں یا مرچکے ہوں اور ان چہروں کے بارے میں جو ناز و نعم میں تر و تازہ ہیں، آپ نے یہ عبرت انگیز بیان فرمایا کہ تھوڑے ہی دنوں میں ان سب پر گرد و غبار پڑنے والا ہے۔ آپ نے متوکل کی طرف دیکھتے ہوتے ہی یہ فرمایا تھا کہ: "اب ان چہروں پر قبروں کا گرد و غبار جما ہوا ہے۔"

متوکل آئے دن آپ کو اسی طرح سے بلاتا رہتا تھا کیونکہ وہ برابر آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے تھا لیکن اللہ تعالیٰ اس کے دست ستم کو آپ سے دور ہی رکھتا تھا۔ چنانچہ سہل بن زیاد سے روایت ہے کہ اس نے کہا: ایک مرتبہ جب ہم سامرہ میں الکاتب ابوالعباس فضل بن احمد بن اسرائیل کے گھر پہ تھے تو وہاں امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کا

کا ذکر چھڑ گیا۔ تب اس نے کہا: میں تم کو ایسی بات سناتا ہوں جو مجھ کو میرے والد نے بتائی تھی۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم منتصر کے ساتھ تھے اور میرا باپ اس کا منشی تھا۔ جب ہم اندر گئے تو خلیفہ متوکل اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔ منتصر سلام کر کے کھڑا ہو گیا اور میں بھی اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ منتصر کے آنے پر اس نے خوشی ظاہر کی اور اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر وہاں قیام میں طول ہوتا گیا۔ خلیفہ متوکل ایک شخص کو اٹھاتا اور دوسرے کو بٹھاتا رہا لیکن وہ مجھ کو بیٹھنے کے لیے نہ کہہ رہا تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ لحہ بہ لمحہ اس کا چہرہ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے فتح بن خاقان سے کہا: یہی وہ شخص ہے جس کے متعلق میں نے بیان کیا ہے؟ اس نے متوکل کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا: جی ہاں اے امیرالمومنین! وہ آپ پر جھوٹ باندھتا ہے۔ اس پر وہ غصہ میں اور بھی بپھر گیا اور کہنے لگا: بخدا کہ میں اس کو ضرور قتل کر ڈالوں گا، کیونکہ یہ "زندیق" کافر اور جھوٹا مدعی ہے، جو میری حکومت پر الزام دھرتا ہے۔ پھر اس نے چار تند خو ساحلی ترکوں کو بلا کر ان کو تلواریں دیں اور کہا: جونہی امام ابوالحسنؑ آئیں تم ان کو قتل کر دینا۔ پھر بولا: بخدا کہ میں ان کے قتل کے بعد ان کو جلا ڈالوں گا۔ تب میں منتصر کے پیچھے پردے کی اوٹ میں کھڑا تھا کہ اتنے میں امام ابوالحسنؑ تشریف لائے جبکہ انکے ہونٹ جنبش کر رہے تھے لیکن نہ تو ان کو کوئی پریشانی تھی نہ کوئی خوف تھا۔ جونہی متوکل نے ان کو دیکھا تو اپنے تخت سے اتر کر ان کے آگے جھکا اور ان کی پیشانی اور ہاتھوں پر بوسے دینے لگا اور یہ کہتا جا رہا تھا: اے میرے آقا! میرے ابن عم! اے ابوالحسنؑ! ادھر وہ یہ کہہ رہا تھا اور ادھر امام ابوالحسنؑ فرما رہے تھے: اے امیرالمومنین! میں اس امر سے آپ کے لیے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ پھر متوکل نے ان سے کہا: اے میرے آقا! اس وقت آپ کیسے تشریف لائے؟ انہوں نے فرمایا: مجھ کو تمہارا آدمی بلا کر لایا ہے۔ اس پر وہ بولا: جھوٹا ہے وہ بری ماں کا بیٹا! آپ اپنے مکان پر تشریف لے جائیے۔ مزید یہ کہ اس نے فتح بن خاقان، عبیداللہ اور منتصر کو حکم دیا کہ وہ امام کے گھر تک ان کے ساتھ جائیں۔ جب آپ چلے گئے تو اس نے جن ترکوں کو ان کے قتل کا حکم دیا تھا، ان سے کہنے لگا: تم نے میرے حکم پر کیوں عمل نہ کیا؟ وہ بولے: جب ہم نے ان کو آتے دیکھا تو ہمارے دلوں پر ان کی ہیبت چھا گئی اور ہم ڈر گئے تھے۔

امام علی نقیؑ کے پند و نصائح

جو شخص اللہ کی اطاعت کرتا ہے وہ مخلوق کی ناراضی کی پروا نہیں کرتا۔ جو کوئی اپنے کو اللہ کی تدبیر سے محفوظ سمجھتا ہے وہ مغرور ہو جاتا ہے لیکن جب اس کی موت آتی ہے تو اللہ کا حکم ہی نافذ ہوتا ہے۔ جو اللہ کی دلیلوں سے سبق لیتا ہے اس کے لیے دنیا کے مصائب ہلکے ہو جاتے ہیں، خواہ وہ کثیر اور شدید ہی ہوں۔ شکر کرنے والے کو اس شکر پر اس نعمت سے بھی بڑی نیکی حاصل ہوتی ہے جس کا شکر ادا کرنا واجب تھا کیونکہ نعمت ایک دنیاوی متاع ہے جبکہ شکر ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے ساتھ اجر بھی ملتا ہے۔ ایک ظالم کہ جو بردبار بھی ہو، وہ اپنے ظلم کو بردباری کے ذریعہ کالعدم کر سکتا ہے لیکن ایک بیوقوف حق کوش اپنی بیوقوفی سے اپنے اندر موجود حق کے نور کو بجھا دیتا ہے۔

جو کوئی اپنی محبت اور رائے تمہارے لیے خاص کر دے، تم اس کے لیے اپنی اطاعت کو وقف کر دو۔ جو اپنے ہی خیال میں منہمک رہتا ہے اس کے شر سے اپنے کو محفوظ نہ سمجھو۔ جو اپنے آپ سے خوش رہتا ہے اس سے ناراض رہنے والوں کی تعداد بہت ہوتی ہے۔ ہم اہلبیتؑ سے دنیا میں مال کے ذریعہ اور آخرت میں اپنے اعمال کے ذریعہ اظہار محبت کرو۔

ایک شخص جو آپکی بہت تعریف کر رہا تھا اس سے آپ نے فرمایا: اپنے اوپر قابو رکھو کیونکہ خوشامد کی زیادتی سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ جب تم اپنے بھائی کی نظر میں قابل اعتماد ہو جاؤ تو پھر خوشامد کی بجائے خلوص اختیار کرو۔

امام علی نقیؑ نے فرمایا: صبر کرنے والے کے لیے ایک اور بے صبرے کے لیے دو مصیبتیں ہوتی ہیں۔ حسد نیکیوں کو مٹا دیتا ہے، غرور کرنے اور چغلی کھانے کی عادت ڈالتا ہے اور حصول علم سے باز رکھتا ہے۔ جہالت اور کنجوسی انسان کے لیے بدترین باتیں ہیں۔ لالچ ایک بُری خصلت ہے۔ مذاق اڑانا بیوقوفوں کا شغل اور جاہلوں کا وطیرہ ہے۔

آپ نے فرمایا: جس پر تم کو قابو حاصل ہو اس پر غصہ دکھانا کمینہ پن ہے۔ عقل کی باتیں بدحواس لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ آپ نے مزید فرمایا: بھلائی سے اچھا خود بھلائی کرنے والا، برائی سے زیادہ برا اس کی طرف لے جانے والا اور خوف زدہ خوف سے بھی زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ حسد سے دُور رہو کیونکہ وہ تمہارے اندر نور ہے گا لیکن تمہارے

دشمن پر اس کا اثر نہ پڑے گا۔ اگر تم ایسے زمانہ میں ہو جبکہ ظلم پر عدل غالب ہو تو یہ حرام ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی بابت بدگمانی کرے تاوقتیکہ اس کے متعلق علم نہ ہو جائے اور اگر تم ایسے زمانہ میں ہو جبکہ عدل پر ظلم غالب ہو تو کسی کو دوسرے کی بابت اچھا گمان نہ کرنا چاہیے تاوقتیکہ اس کا علم نہ ہو جائے۔

متوکل سے ایک گفتگو کے دوران امام علی نقی ہادیؑ نے فرمایا: اس شخص سے خیر خواہی کی توقع نہ کرو کہ جس کی زندگی تم نے اجیرن کر دی ہو اس سے وفا کی امید نہ رکھو کہ جس کو تم نے دھوکہ دیا ہے اور اس سے نصیحت کی توقع نہ کرو کہ جس سے تم خود ہی بدگمان ہو۔ کیونکہ کسی دوسرے کے دل میں تمہارے لیے وہی ہے کہ جو تمہارے دل میں اس کے لیے ہے۔

آپ نے فرمایا: دنیاوی نعمتوں کی اچھی طرح حفاظت کرو اور ان پر شکر ادا کر کے ان میں بڑھوتی حاصل کرو۔ جب ایک شخص نے آپ سے اپنے ہی بیٹے کی برائی کی تو آپ نے فرمایا: بیٹے کی نافرمانی ایسی ہی ہے جیسے بیٹے کا مر جانا۔ ناراضی ظاہر کرنا دل میں برائی رکھنے سے بہتر ہے۔

مروج الذہب کی دوسری جلد میں محمد بن فرج نے ابو دعامہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں امام علیؑ ابن محمدؑ بن علیؑ بن موسیٰؑ کی اس علالت میں آپ کی عیادت کے لیے گیا کہ جس میں آپ نے شہادت پائی تھی۔ جب میں نے آپ کے ہاں سے واپس جانے کا ارادہ کیا تو آپ نے مجھ سے فرمایا: اے ابو دعامہ! تم میری عیادت کو آئے ہو تو اس سے میرے اوپر تمہارا حق قائم ہو گیا ہے۔ کیا اب میں تم کو ایک ایسی حدیث سناؤں کہ جس سے تم خوش ہو جاؤ۔ میں نے کہا: اے فرزند رسولؐ! تو پھر مجھ کو اور کیا چاہیے؟ امام علی نقی ہادیؑ نے فرمایا: میں نے اپنے والد بزرگوار موسیٰؑ بن جعفرؑ سے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار جعفرؑ بن محمدؑ سے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار محمدؑ بن علیؑ سے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار علیؑ بن الحسینؑ سے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار حسینؑ بن علیؑ سے، انہوں نے امیر المومنین علیؑ سے اور انہوں نے رسول اللہؐ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: اے علیؑ لکھو! علیؑ نے کہا: کیا لکھوں؟ آپ نے فرمایا: لکھو شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، رحم والا ہے۔ ایمان وہ ہے جو دل میں جاگزیں ہو اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔ اسلام وہ ہے

کہ زبان سے اقرار کیا جائے اور اس سے دو گھرانوں میں رشتہ نکاح حلال ہو جائے۔ میں نے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! میں یہ نہیں سمجھ پا رہا کہ یہ حدیث بہتر ہے یا اس کا سلسلۂ اسناد بہتر ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: یہ اس صحیفہ میں ہے جو رسول اللہؐ کا فرمودہ اور جو علیؑ بن ابی طالبؑ کے خط میں لکھا ہے۔ یہ ہمارے ہر چھوٹے کو اپنے بڑے سے وراثتہً منتقل ہوتا رہتا ہے۔

امام علی نقیؑ کی شہادت

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ امام علی نقیؑ اپنے والد کے ساتھ اور پھر ان کی شہادت کے بعد بھی بیس سال سے زیادہ مدت تک مدینہ میں قیام پذیر رہے۔ پھر جعفر بن محمد بن ہارون عرف متوکل عباسی کے خلیفہ مقرر ہونے کے دوسرے سال یعنی ۲۳۳ھ میں اس کی خفیہ پولیس نے اس سے یہ چغلی کھائی کہ امام علی نقیؑ مدینہ میں سپاہ اور ہتھیار جمع کر رہے ہیں۔ اس پر متوکل نے آپ کو سامرا بلوا لیا اور آپ کے لیے اس کا یہ بلاوا منظور کر لینے کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ پھر متوکل، منتصر، مستعین اور معتز کی حکومت تک کے طویل زمانے میں سامرا ہی میں قیام پذیر رہے۔ یہاں تک کہ معتز کی حکومت کے دوسرے سال یعنی ۲۵۴ھ میں جمادی الثانی کے آخری دنوں میں آپ نے وہیں شہادت پائی۔ امام علی نقیؑ کی عمر بیالیس سال ہوئی، جن میں سے آپ نے اکیس سال مدینہ میں بسر کیے تھے۔ اس کے بعد چودہ سال متوکل کے عہد حکومت میں اور سات سال منتصر، مستعین اور معتز کی حکومتوں میں سامرا میں گزارے۔

آپ کی تاریخ حیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سات سال جو آپ نے منتصر، مستعین اور معتز کی حکومتوں میں گزارے، ان میں آپ کو ویسی دراندازیوں اور پابندیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جیسی متوکل کے زمانہ میں آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ کیونکہ ان تینوں فرمانرواؤں نے آپ کو جبری طور پر سامرا میں رکھنے پر ہی اکتفا کی۔ اگر آپ پر یہ پابندی نہ رہی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ آپ اپنے نانا محمد رسول اللہؐ کے شہر کے علاوہ کسی اور مقام پر بود و باش اختیار کرتے۔

غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خلافتِ بنی عباس کے اس دور میں خلیفہ کے اختیارات قریب قریب ختم ہو گئے تھے اور اس کے پاس نام کی خلافت کے علاوہ کچھ اور باقی نہ تھا۔

کیونکہ حکومت کی باگ ڈور ترک اور دوسرے فوجی حکام کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ چنانچہ عزل ونصب کے علاوہ دیگر احکام بھی وہی جاری کرتے تھے۔ حتیٰ اینکہ وہ خلیفہ کو معزول کردیتے یا اگر ان کو کچھ زیادہ غصہ آجاتا تو وہ اس کو قتل کردیتے اور حکومت کسی دوسرے کو دے ڈالتے تھے جیسا کہ مستعین کے ساتھ ہوا کہ ابھی اس کو خلیفہ بنے تین سال اور نو مہینے ہی ہوئے تھے کہ انہوں نے اس کو خلافت سے دستبردار ہونے پر مجبور کردیا اور ۲۵۱ھ میں معتز کی بیعت کرلی، حالانکہ اس سے پہلے وہ اور اس کا بھائی مؤید ایسے مصائب میں گرفتار رہ چکے تھے جو اس دور میں خلفاء کی بے اختیاری کو ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس زمانہ کے ایک شاعر نے خلافت کی گری ہوئی حالت کو اپنے ان اشعار میں بیان کیا ہے:

خلیفہ غلاموں اور خواجہ سراؤں کے سامنے اس طرح بے بس ہے، جیسے وہ پرندہ جو پنجرے میں بند ہو۔

وہ طوطے کی طرح وہی رٹ لگاتا ہے جو یہ غلام اس سے کہلواتے ہیں۔

ایک دوسرے شاعر نے اور مروج الذہب کے مطابق بحتری نے کہا ہے کہ:

اللہ ترکی گروہ کا بھلا کرے کہ انہوں نے زمانہ کی مصیبتوں کا مقابلہ تلوار سے کیا اور خلیفہ احمد بن محمد (مستعین) کو قتل کرکے ساری قوم کو خوف کے شکنجہ میں جکڑ دیا۔

ان لوگوں نے سرکشی کرکے اقتدار کو آپس میں بانٹ لیا ہے اور اب ہمارا خلیفہ ایک مہمان سے زیادہ حیثیت کا مالک نہیں رہا

تاریخ مسعودی میں ہے کہ امام علی نقی ہادیؑ کی شہادت پیر کے روز ۲۵ یا ۲۶ ربیع الثانی کو ۲۵۴ھ میں واقع ہوئی۔ تب لوگوں نے ایک کنیز کو یہ کہتے سنا کہ: اے لوگو! اس زمانے میں اور اس سے پہلے کے زمانے میں پیر کے روز ہم پر کیا کیا حادثات گزر گئے ہیں۔

مسعودی کی اثبات الوصیۃ کے حوالے سے اعیان الشیعہ میں منقول ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب آپ کی شہادت واقع ہوئی تو تمام بنی ہاشم آل ابوطالب، بنی عباس اور آپ کے شیعہ آپ کے مکان پر جمع ہوگئے۔ پھر برآمدے کے بیچ کا ایک دروازہ کھلا اور ایک سیاہ فام خدمتگار باہر آیا۔ اس کے بعد امام ابومحمد حسن عسکریؑ اس حال میں برآمد

ہوئے کہ آپ کا گریبان چاک، سر برہنہ اور آپ پر گریہ طاری تھا۔ آپ کے چہرہ کے نقوش آپ کے والد بزرگوار سے اتنے مشابہ تھے کہ ذرا بھی فرق نہ تھا۔ اس وقت متوکل کے بیٹے بھتیجے ہی مکان کے اندر تھے۔ ان کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جو باہر نہ نکل آیا ہو۔ تب ابو احمد موفق آپ کی طرف بڑھا تو امام حسن عسکریؑ نے اس سے معانقہ کیا اور فرمایا: مرحبا اے ابن عمؑ! صحن میں لوگوں کی باتوں کا اتنا شور تھا کہ مکان کوئی بازار معلوم ہو رہا تھا لیکن جیسے ہی آپ باہر آئے سب لوگ خاموش ہو گئے۔ آپ برآمدے کے دونوں دروازوں کے بیچ میں آ بیٹھے، ایک غلام بھی آپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور دوسرے لوگ آپ کے سامنے بیٹھے تھے۔ پھر جنازہ لایا گیا اور آپ اس کے ساتھ پیدل چلتے رہے۔ یہاں تک کہ سڑک پر پہنچ گئے۔ قبل ازیں آپ نے لوگوں کے سامنے آنے سے پہلے امام کی نماز جنازہ پڑھی تھی اور پھر معتمد باہر آیا تو اس نے نماز پڑھائی۔ امام علی نقی ہادیؑ کو آپ ہی کے ایک مکان میں دفن کیا گیا۔ آپ کی وفات کے روز سارا سامرا شہر لوگوں کی آہ و بکا سے لرز رہا تھا۔

اعیان الشیعہ میں ابن بابویہ سے روایت ہے کہ خلیفہ معتمد عباسی نے امام علی نقی ہادیؑ کو زہر دلوایا اور اس سے آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ آپ نے زہر سے شہادت پائی تھی تو پھر یہ ضروری ہے کہ آپ کو یہ زہر معتز باللہ ہی نے دیا ہو کیونکہ آپ کی شہادت اسی کے عہد میں ۲۴۵ھ میں ہوئی، جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں اور جیسا کہ تاریخ یعقوبی وغیرہ میں ہے کہ معتمد کی بیعت رجب ۲۵۶ھ میں مہتدی (محمد بن ہارون الواثق) کے قتل کے بعد ہوئی تھی۔

الارشاد شیخ مفید میں ہے کہ آپ کی اولاد میں چار بیٹے امام ابو محمد حسن عسکریؑ، حسین، محمد اور جعفر اور ایک بیٹی عائشہ تھیں۔

امام حسن عسکریؑ

امام حسن عسکری مدینہ میں ۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۳۴ھ میں جب کہ آپ دو سال کے تھے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ سامرا منتقل ہو گئے کیونکہ متوکل نے ان کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اس وقت سے آپ اپنے والد بزرگوار امام علی نقیؑ کے ساتھ سامرا ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ وہ ۲۵۴ھ میں معتز عباسی کے دلوائے ہوئے زہر سے شہادت پا گئے اور ان کے بعد آپ عہدۂ امامت پر فائز ہوئے۔ تب آپ کی عمر بائیس سال تھی۔ آپ اپنے والد بزرگوار کے بعد تقریباً چھ سال تک زندہ رہے۔ ان میں سے کم و بیش ایک سال معتز کے عہد میں گزرا، یہاں تک کہ ترکوں نے اس پر یورش کر کے پہلے تو معزول کیا اور پھر قتل کر دیا۔ اس کے بعد ایک سال مہتدی کی حکومت میں گزارا اور پھر ترکوں نے اس کو بھی قتل کر دیا۔ یہ دو سال اس طرح بیتے اور آپ کی حیات کے بقیہ چار سال اور کچھ مہینے معتمد کے عہد میں گزرے جس کی بیعت مہتدی کے قتل کے بعد ۲۵۶ھ میں کی گئی تھی۔ اس کی خلافت کے چوتھے سال یعنی ۲۶۰ھ میں امام ابو محمد حسن عسکریؑ کی شہادت ہوئی۔ تاہم معتمد کی خلافت ۲۷۹ھ تک رہی۔ یہاں تک کہ سامرا کے باہر اس کو زہر دے کر قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد خلافت بغداد میں آ گئی۔

آپ کی والدہ گرامی کا نام نامی سوسن اور بقولے حدیثہ تھا۔ اکثر روایات کے

مطابق آپ کی کنیت ابو محمد تھی جن میں سے کچھ ہم عنقریب بیان کریں گے۔ آپ کا لقب عسکری تھا کیونکہ جب وہ سامرا تشریف لائے تو جس محلہ میں مقیم ہوئے اس کو عسکر کہا جاتا تھا۔ آپ کے دوسرے القاب ہادی، زکی، تقی اور خالص ہیں۔ نیز مناقب ابن شہر آشوب میں مذکور ہے کہ امام حسن عسکری اپنے والد بزرگوار امام علی نقیؑ اور آپ کے دادا حضور امام محمد تقیؑ میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے زمانہ میں "ابن رضاؑ" کہا جاتا تھا۔

احمد بن عبید اللہ بن خاقان کہ جو علویوں سے دشمنی رکھتا تھا اور امام حسن عسکریؑ کو بدنام کرنے کے درپے رہتا تھا، کلینی اور صدوق کی روایات کے مطابق وہ آپ کے بارے میں کہتا ہے کہ میں سامرا کے علویوں میں امام حسنؑ بن علیؑ بن محمد بن رضاؑ ایسے کسی شخص کو جانتا اور پہچانتا نہیں ہوں، بلکہ میں نے تو کسی سے سنا بھی نہیں کہ راستی، سیر چشمی، پاکدامنی، شرافت اور سخاوت میں لوگ ان کے اہل بیت، بنی ہاشم یا خلیفہ کے گھرانے کے کسی فرد کو آپکے ہم پلہ مانتے ہوں، بلکہ خود یہ گھرانے ان کو اہلبیتؑ میں سے بزرگ اور نمایاں افراد پر بھی مقدم قرار دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فوجی افسروں، وزیروں، منشیوں اور عوام الناس کا بھی یہی خیال ہے۔ چنانچہ میں نے کبھی ان کے بارے میں بنی ہاشم یا فوجی افسروں، وزیروں، منشیوں، قاضیوں، فقیہوں اور عوام الناس سے دریافت کیا تو یہی دیکھا کہ ان کے دلوں میں امام حسن عسکریؑ کی عظمت و جلالت اور ان کا بلند مقام و مرتبہ جاگزیں ہے۔ وہ ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے ہیں اور ان کو اہلبیتؑ کے دیگر بزرگوں اور تمام دوسرے افراد پر مقدم قرار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دوست ہو یا دشمن ہر ایک ان کو اچھے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور ان کی مدح کرتا ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ میرے باپ عبید اللہ بن خاقان کا کہنا تھا کہ اگر خلافت بنی عباس کے ہاتھ سے نکل جاتی تو پھر امام حسن عسکری کی قابلیت، پاکدامنی، سیر چشمی، تقویٰ، زہد، عبادت، حسن خلق اور ان کی سلامت روی کی وجہ سے بنی ہاشم میں سے ان کے علاوہ کوئی اور اس خلافت کا حقدار نہ ہوتا۔

آپ کی امامت کی تصریحات

اصول کافی میں یحییٰ بن یسار عنبری سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: امام ابو الحسن علی نقیؑ نے اپنی شہادت سے چار مہینے پہلے اپنے فرزند حسن عسکریؑ کے حق میں امامت کی وصیت

فرمادی اور مجھ کو اور میرے کچھ دوستوں کو اس کا گواہ قرار دیا تھا۔

اسی طرح علی بن عمر نوفلی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں امام ابوالحسن علی نقیؑ کے مکان کے صحن میں ان کے سامنے حاضر تھا کہ ہمارے پاس سے آپ کے فرزند محمد گزرے۔ تب میں نے عرض کیا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں، کیا آپ کے بعد یہ ہمارے امام ہوں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں! میرے بعد حسن عسکریؑ تمہارے امام ہوں گے۔ جبکہ شیعوں کا ایک گروہ یہ سمجھتا تھا کہ امام علی نقیؑ کے بعد ان کے فرزند محمد ہی امام ہونگے۔

چنانچہ نوبختی کی کتاب فرق الشیعہ میں ہے کہ جب امام علیؑ بن محمدؑ بن علی الرضاؑ کی شہادت ہوئی تو آپ کے اصحاب میں سے کچھ لوگ آپ کے فرزند محمد کی امامت کے قائل ہو گئے، حالانکہ وہ اپنے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں سامرا میں وفات پا چکے تھے۔ لیکن وہ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ زندہ ہیں۔ نوبختی نے اس کے بعد یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ان کے والد بزرگوار نے اس بات کا اشارہ کر دیا تھا اور ان لوگوں کو بتلا دیا تھا کہ ان کے بعد محمد ہی امام ہوں گے جبکہ امام کے لیے جھوٹ بولنا جائز نہیں اور نہ اس میں ترمیم کی کوئی بات ہوئی ہے۔ البتہ ان کے والد بزرگوار کو ان کی سلامتی کی طرف سے اندیشہ لاحق ہو گیا تھا اس لیے ان کو لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔

اصول کافی میں عبداللہ بن محمد اصفہانی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ امام علی نقیؑ نے فرمایا: میرے بعد تمہارا امام وہ ہوگا جو میری نماز جنازہ پڑھائے گا۔ اگرچہ ہم اس سے پہلے ابو محمد حسن عسکریؑ کو جانتے بھی نہ تھے لیکن جب امام علی نقیؑ نے شہادت پائی تو ابو محمدؑ نے گھر سے باہر آکر ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

علی بن مہزیار سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابوالحسن علی نقیؑ سے کہا کہ اگر خدا نخواستہ کوئی واقعہ ہو گیا تو آپ کے بعد امامت کس کی ہوگی؟ آپ نے فرمایا: میرا یہ عہدہ امامت میرے بڑے بیٹے کو مل جائے گا۔ جبکہ ابو محمد حسن عسکریؑ ہی آپ کے بڑے بیٹے تھے، جیسا کہ وہ تمام روایات بتلاتی ہیں جو آپ کی تاریخ ولادت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

اسی طرح ابوبکر فہفکی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: امام علی نقیؑ نے مجھ کو لکھا کہ میرا فرزند ابو محمد حسن عسکریؑ اپنی اصل وفضل کے اعتبار سے آل محمدؑ میں سب سے بڑھ کر ہدایت کیش اور حجت میں قابل اعتماد ہے۔ وہی میرا سب سے بڑا فرزند اور میرا جانشین ہے۔ امامت اور اس کے احکام کی تبلیغ کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ پس تم کو جو کچھ بھی دریافت کرنا ہو اسی سے دریافت کیا کرنا کیونکہ اس کے پاس ہر وہ علم موجود ہے جس کی بنی نوع انسان کو ضرورت ہو۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں جو کلینی اور دوسرے محدثین نے امامؑ کی امامت کے بارے میں بیان کی ہیں۔ نیز یہ ان صریحی اخبار کے علاوہ ہیں جو نبی اکرمؐ سے آپ کے بعد ہونے والے بارہ اماموں کے ناموں اور ان کے اوصاف کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔

امام حسن عسکریؑ کے ہمعصر فرمانروا

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں امام حسن عسکریؑ کی امامت کا زمانہ بنی عباس کے تین خلفا یعنی معتز، مہتدی اور معتمد کی حکومتوں میں گزرا۔ معتز کی حکومت کو کچھ کم ایک سال ہی ہوا تھا کہ ترکوں نے اس پر حملہ کیا اور اس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد ۲۵۵ھ میں مہتدی تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس نے مذہبی قوانین پر عمل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور چاہا کہ وہ اسلام میں پہلے چار خلفاء اور عمر بن عبدالعزیز کی طرح رعایا میں برتاؤ کیا کرے اور موجودہ ظاہری شان وشوکت میں کمی کر دے۔ جیسا کہ مروج الذہب میں مسعودی کا بیان ہے کہ اس نے ایک قبہ بنوایا، جس میں وہ ہر خاص وعام کی دادرسی کے لیے بیٹھا کرتا تھا لیکن اس کا یہ طریقہ سب لوگوں کو اور خاص کر ترکوں کو بہت برا لگا کیونکہ وہ اپنی من مانی کیا کرتے تھے چنانچہ اس کا ترک سرداروں کے ساتھ اس موضوع پر بحث ومباحثہ ہوا جس میں ان لوگوں نے کہا: آپ لوگوں کو اس عظیم سیرت پر چلانا چاہتے ہیں کہ جس سے وہ واقف ہی نہیں ہیں خلیفہ مہتدی نے کہا: میں لوگوں کو رسول خداؐ ان کے اہلبیتؑ اور خلفاء راشدین کی سیرت پر چلانا چاہتا ہوں۔ ترکوں نے کہا: رسول اللہؐ کے ساتھ کے لوگ تو وہ تھے جن کو دنیا کی طلب سے کوئی سروکار نہ تھا اور ان کی نظر آخرت کی فلاح پر تھی لیکن آپ کے ساتھ ترکی

خزرجی، فرغانی اور مغربی وغیرہ غیر عرب قوموں کے لوگ ہیں جو آخرت کے بارے میں اپنے فرائض سے ناواقف ہیں۔ ان کو صرف اس چیز سے غرض ہے کہ دنیا میں لگے ہاتھوں کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس پر بھی خلیفہ ترکوں کے ساتھ گفتگو میں اپنے نقطۂ نظر پہ اڑا رہا۔ مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا اور انجام کار اس کو ان کے ساتھ جنگ کرنا پڑی جس میں اس کے لشکر کو شکست ہوئی اور وہ اکیلا سامرا پہنچا، وہ اس شہر کی سڑکوں پر کھڑے ہو کر اپنے لوگوں کو مدد کے لیے پکارتا رہا لیکن کسی نے بھی اس کی آواز پر کان نہ دھرا۔

جب ترکوں اور دوسرے غلاموں کے ساتھ خلیفہ مہتدی کا یہ سخت جھگڑا اچل نکلا تو امامؑ نے اس کے نتیجے سے آگاہ فرما دیا تھا۔ چنانچہ محمد الصدر کی کتاب "تاریخ غیبت صغریٰ" میں اعلام الوریٰ طبرسی کے حوالے سے منقول ہے کہ امام حسن عسکریؑ کے ایک صحابی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خلیفہ مہتدی اپنی اس کھینچ تان میں الجھ جانے سے امامؑ کو پریشان کرنے کی طرف متوجہ نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ ان صحابی نے امامؑ کو لکھا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ظالم خلیفہ کو آپ سے دور رکھا ہے کیونکہ مجھ کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپ پر دباؤ ڈالتا رہتا تھا۔ تب امام نے ان کو اپنے دست مبارک سے یہ لکھا: اب اس کی عمر بہت کم رہ گئی ہے۔ تم آج سے پانچ دن گن لو اور چھٹے دن دیکھنا کہ یہ شخص ذلّت و خواری اٹھانے کے بعد قتل ہو جائے گا۔

مناقب ابن شہر آشوب سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ مہتدی اپنی رعایا کے ساتھ عدل کرنا چاہتا تھا اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا تھا جو عمر بن عبد العزیز نے کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ امامؑ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کو قید خانہ میں ڈال دیا تھا اور پھر آپ پر سختی کرنے کا حکم بھی دیدیا تھا۔ البتہ امامؑ نے قید خانہ میں اپنے ایک ساتھی کو بتا دیا تھا کہ آج کی رات اللہ اس کی عمر کو تمام کر دے گا۔ راوی کہتا ہے کہ جب صبح ہوئی تو ترکوں نے مہتدی پر حملہ کر کے اس کو قتل کر ڈالا اور اس کی جگہ پر معتمد نے حکومت سنبھال لی۔

اصول کافی میں علی بن محمد نے عبد الغفار سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب امام ابو محمد حسنؑ بن علیؑ کو سامرا میں قید کیا گیا تو بنی عباس کے کچھ افراد جن میں صالح بن علی اور ایسے ہی دوسرے منحرف افراد شامل تھے، صالح بن وصیف کے پاس آئے اور اس سے

امامؑ پر سختی کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر صالح بن وصیف نے کہا: میں ان کے ساتھ اور کیا سختی کر سکتا ہوں جبکہ میں نے ڈھونڈ کر دو بدترین آدمی ان پر لگائے تھے لیکن ہوا یہ کہ وہ دونوں خود بھی نماز اور عبادت میں منہمک ہو کر رہ گئے۔ پھر میں نے ان دونوں کو بلوایا اور کہا: وائے ہو تم پر، امامؑ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ دونوں کہنے لگے: آپ ایسے آدمی کے بارے میں کیا پوچھتے ہیں کہ جو دن میں روزے سے رہتا ہے ساری رات عبادت میں گزار دیتا ہے اور خدا کی عبادت کے سوا نہ کوئی عمل کرتا ہے نہ بات کرتا ہے۔ جب وہ ہم پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمارے جسم کانپ اٹھتے ہیں اور اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ جب ان عباسیوں نے یہ حال سنا تو وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

اس روایت سے یہ امر واضح نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ مہتدی کے زمانہ کا ہے یا اس کے بعد کسی اور خلیفہ کے زمانہ کا ہے۔ البتہ اس سے پہلی روایت اس بات کو واضح کرتی ہے جیسا کہ اربلی کی کتاب "القبلۃ لاربلی" میں محمد بن اسمٰعیل علوی سے روایت ہے کہ مہتدی نے امام ابو محمد حسن بن علیؑ کو قید خانہ میں علی بن اوتاش کی نگرانی میں رکھا۔ یہ شخص آل محمدؑ سے سخت دشمنی رکھتا تھا اور آل ابیطالبؑ سے بڑی عداوت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کو حکم دیا گیا کہ تم امامؑ پر جتنی سختی کر سکتے ہو کرو اور ان کو جی بھر کے تکلیف پہنچاؤ لیکن اس نے چند دن ہی ایسا کیا تھا کہ وہ بھی آپ کا مطیع ہو گیا اور آپ کی بزرگی اور پاکیزگی کی وجہ سے وہ آپ کے سامنے آنکھ بھی نہ اٹھاتا تھا۔ جب وہ آپ کے پاس سے نکلتا تو آپ کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ سال کی وہ مدت کہ جو آپ نے اپنے والد بزرگوار کے بعد ان تین خلفاء کے عہد میں گزاری تھی اس میں آپ بارہا قید میں ڈالے گئے۔

۱۔ خلیفہ معتز عباسی امام حسن عسکریؑ سے شدید بغض رکھتا تھا اور اس تاک میں رہتا تھا کہ آپ کو کسی خفیہ طریقے سے قتل کرا دے۔ جیسا کہ مناقب ابن شہر آشوب کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ معتمد نے سعید حاجب کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کی نظریں بچا کر امام ابو محمد حسن عسکریؑ کو قتل کر دے۔ پھر یہ بھی کہا کہ وہ امام ابو محمدؑ کو کوفہ لیجا کر اس طرح ان کی گردن اڑا دے کہ کوئی شخص دیکھ نہ پائے۔ راوی مزید کہتا ہے کہ انہی دنوں امام کا ایک نامہ مبارک ہمارے پاس آیا کہ جس میں آپ نے لکھا: جو کچھ تم نے سنا ہے

انشاء اللہ تم اس سے محفوظ رہو گے۔ اس کے بعد تین ہی دن گزرے تھے کہ معتز کو معزول کر کے قتل کر ڈالا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کی حیات شریفہ کے خلاف معتز کی اس سازش کی خبر شیعی حلقوں میں پھیل گئی تھی، اس لیے امام حسن عسکریؑ نے ان کو یہ خط لکھ کر اطمینان دلایا کہ قبل اس کے کہ معتز آپ کے بارے میں اپنے منصوبہ کو پورا کر سکے خود اس کے ساتھ ہی کچھ ہونے والا ہے۔ ایسی کسی بات کا قبل از وقت بتانا نہ صرف امام کے لیے بلکہ ہر اس شخص کے لیے بھی جو عباسیوں کے اس عہد میں رہا ہو، کوئی قابل تعجب امر نہیں تھا کہ وہ ٹھیک ٹھیک بتا دے کہ ان فرمانرواؤں کے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے جن کو حکومت پر کوئی اختیار حاصل نہیں رہا تھا؛ چنانچہ کسی شاعر نے اس حالت کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے جن میں سے ایک شعر یہ ہے:

لوگوں نے سرکشی کی اور اقتدار کو آپس میں بانٹ لیا ہے۔ اس صورت میں اب ہمارا خلیفہ ایک مہمان بنکر رہ گیا ہے۔

مہتدی کی خلافت میں صاحب زنج نے کچھ غلاموں، ناداروں اور غریبوں کو ساتھ لیکر خروج کیا۔ چنانچہ وہ بصرہ اور اس کے مضافات پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ رسول اللہؐ کی آل میں سے ہے اور وہ اپنا شجرۂ نسب امام علی بن ابی طالبؑ سے ملاتا تھا۔ جبکہ بعض مورخین نے کہا ہے کہ وہ علی بن محمد بن احمد بن عیسیٰ بن زید بن علیؑ بن الحسینؑ ہی تھے۔

مروج الذہب مسعودی کی دوسری جلد میں ہے کہ وہ صاحب زنج اصل میں رَے کی کسی بستی کا باشندہ تھا اور اس کے ساتھیوں میں اکثر غلام اور حبش کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ اس نے عباسیوں کو سخت تنگ کیا اور ایسا لگتا تھا کہ عنقریب وہ انکے دار الحکومت بغداد پر قبضہ کرے گا کیونکہ اس کے اور عباسیوں کے درمیان خونریز مقابلے ہو رہے تھے۔ بعض مورخوں کے بیان کے مطابق علویوں سے اپنا نسبی رشتہ جوڑنے کی وجہ سے لوگ حیرت سے یہ سوال کرنے لگے کہ یہ شخص کیونکر علوی کہلاتا ہے؟ حالانکہ خود اس کے اعمال نہایت قابل نفرت تھے اور اس کے ساتھیوں نے بھی بہت ہی بری حرکتیں کی تھیں۔

تاہم اس کا علویوں سے نسبی رشتہ رکھنے کا دعویٰ اس تحریک کو پھیلانے اور اس کے حامیوں کی تعداد بڑھانے میں بہت مؤثر ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ اہل حکومت اور ان کے ہم نواؤں نے امام ابو محمد حسن عسکریؑ کو بلوایا تاکہ آپ صاحب زنج کے اس دعویٰ کی تردید فرمائیں۔ کیونکہ اس وقت کے علویوں میں سب سے بڑھ کر ذمہ دار آپ ہی تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: "صاحب زنج اہلبیتؑ میں سے نہیں ہے۔" نیز جب کبھی اس کی کسی نئی فوج کشی کی خبر نکلتی کہ جس میں وہ بوڑھوں اور بچوں کو قتل کرتا، عورتوں کو قیدی بنا لیتا، گھروں اور بستیوں کو آگ لگاتا اور ایسی ہی دوسری سختیاں کرتا تھا، اس وقت بھی آپ اس ظالم کے علویوں سے نسبت رکھنے کی تردید فرماتے جبکہ اس دور کے لوگ اس بارے میں بہت باتیں کرتے تھے اور بالخصوص خوارج کا کہنا تھا کہ ظالم صاحب زنج علویوں میں سے ہے جیسا کہ مسعودی نے مروج الذہب میں بیان کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے اس دور میں مسلم حکومت کے تمام علاقوں میں صدقات اور محصولات پر ترک اور دوسرے غلاموں کو تصرف حاصل تھا۔ ملک کے طول و عرض میں اسلامی اُمّہ کے ہر طبقے پر ظلم و ستم کیا جا رہا تھا اور خلیفہ کو کسی چیز پہ کوئی اختیار نہ تھا۔ یہ امر کچھ بعید نہیں ہے کہ صاحب زنج کی اس نبرد آزمائی کو بھی ایک ویسی تحریک سمجھا جائے گا جو علویوں اور بعض دوسرے لوگوں کی قیادت میں آئے دن اس لیے رونما ہوتی رہتی تھیں کہ خلق خدا کو ان مصیبتوں اور سختیوں سے نجات مل سکے جو عباسی حکومت میں تمام اسلامی طبقوں کو گھیرے ہوئے تھیں۔ تاہم ایسی تحریکیں چلانے والے ان لوگوں سے جو ظالمانہ کارروائیاں منسوب کی جاتی تھیں وہ اہل حکومت اور ان کے عُمّال کی مَن گھڑت باتیں تھیں اور ان میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

البتہ راویوں کا یہ کہنا کہ امامؑ نے فرمایا: "صاحب زنج اہلبیتؑ میں سے نہیں ہے"۔ اگر آپ نے واقعی یہ فرمایا تھا تو بھی آپ کا یہ جملہ یہ صراحت نہیں کرتا ہے کہ وہ شخص مجہول النسب تھا یا خود کو علویوں سے منسوب کرنے میں جھوٹا تھا کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اپنے اس جملے سے آپ کا مطلب یہ ہو کہ وہ اپنے برے حرکات اور افعال کے باعث ہم میں سے نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے اس جملہ کے ذریعہ سے آپ اہل حکومت کے خلاف ایک تدبیر

فرما رہے ہوں کیونکہ بعض روایات اور جیسا کہ اکمال الدین، شیخ صدوق میں آیا ہے کہ وہ شخص (اپنے علوی ہونے کے دعویٰ میں) جھوٹا نہیں تھا۔

بہرحال امام حسن عسکریؑ کے ساتھ معتمد کا رویہ اپنے پیشرو عباسی حکمرانوں سے مختلف نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے بھی آپ کو ایسی سخت نگرانی میں رکھا کہ ان خاص طریقوں کے علاوہ کہ جو امامؑ نے اپنے مقرب اصحاب کے لیے مقرر کر دیے تھے کوئی بھی شخص آپ سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا، بلکہ جو بات بھی آپ تک پہنچتی یا آپ کی طرف سے صادر ہوتی وہ خط و کتابت ہی کے ذریعہ سے ہوا کرتی تھی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ خلیفہ معتمد اپنی خلافت کے آغاز میں امام حسن عسکریؑ کے مکان پر حاضر ہوا اور آپ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ اس کے لیے طول عمر اور اس کی خلافت کے بیس سال تک قائم رہنے کی دعا فرمائیں۔ چنانچہ امامؑ نے اپنی خاص مصلحت کے مطابق اس کی بات ماننے میں کوئی پس و پیش نہ کی اور فرمایا: اللہ تمہاری عمر دراز کرے!

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ معتمد اس وقت کے حالات کو اپنے لیے ناساز گار پاتا اور ڈرتا تھا جیسا کہ اس کے پیشرو خلفاء ترکوں اور غلاموں کے رحم و کرم پر رہا کرتے تھے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ تین خلیفاؤں یعنی منتصر، معتز اور مہتدی میں سے ہر ایک کی خلافت سال چھ مہینے سے زیادہ نہ رہی تھی۔ پس ان مشکل حالات میں وہ صرف اس صورت میں ایک یا چند سال سے زیادہ عرصے تک زندہ رہنے کی توقع کر سکتا تھا کہ اس کو ایک ایسی دعا کا سہارا مل جائے جو خدا کے ہاں مقبول ہونے والی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کو یہ اطمینان بھی تھا کہ آج امام حسن عسکریؑ کے علاوہ کوئی اور ایسا فرد نہیں ہے کہ جس کی دعا قبول ہو جائے حالانکہ وہ امامؑ کے ساتھ برا سلوک کیا کرتا اور آپ کے گھرانے سے موروثی بُغض رکھتا تھا لیکن دوسرے لوگوں کی طرح اس کو بھی یہ یقین ضرور تھا کہ امامؑ کا موقف صحیح ہے۔ آپکا رویہ عادلانہ ہے اور اس اللہ کے ساتھ آپ کا رابطہ قائم ہے جس کا یہ وعدہ ہے کہ جو کوئی اس کو پکارے گا وہ اس کی دعا کو قبول کرے گا:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي. (سورۂ بقرہ - آیت ۸۶)

اے رسولؐ! میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو کہہ دو
میں ان کے قریب ہی ہوں۔ جب کوئی مجھ کو پکارتا ہے تو میں ان کی
دعا سن لیتا ہوں۔ پس ان کو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں۔

اسی طرح اس کے پیشرو خلفاء بھی اللہ کے ہاں ائمہ اہلبیتؑ کے بلند مرتبے کا یقین رکھتے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ رعایا کے حقوق کے انتظام اور ان کی نگہداری کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتے ہیں لیکن اُن کا اِن حضرات کے ساتھ وہ ظالمانہ رویہ صرف اس لیے تھا کہ وہ لوگ ائمہ اطہارؑ کو اپنے تخت و تاج کے لیے ایک بڑا خطرہ تصور کرتے تھے۔

چنانچہ معتمد عباسی جب خلیفہ بنا تو وہ ڈر اور پریشانی میں گھرا ہوا تھا۔ اسکو ترکوں اور دوسرے غلاموں کے خونی پنجہ سے بچنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور راستا نظر نہ آیا کہ وہ امام حسن عسکریؑ کے وسیلے سے اللہ کی پناہ حاصل کرے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ خدا تک پہنچنے کے لیے آپ ہی ایک مقرب وسیلہ ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور آپ کی دعا کا وسیلہ طلب کیا تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کردے۔ اس کے بعد وہ تقریباً ۲۳ سال تک خلافت پر جما رہا لیکن باوجودیکہ اس کی خلافت کی ابتدا امامؑ ہی کی ایک مقبول دعا سے ہوئی، پھر بھی آپ کے ساتھ اس کا رویہ ویسا ہی رہا جیسا کہ اس کے پیشرو خلیفاؤں کا آپ کے آبا و اجداد کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آپ کو بارہا اپنے قید خانوں میں ڈالا اور وہاں آپ پر سختی کرتا رہا تھا۔

اسی طرح بعض روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ معتمد کے جو اہلکار آپ کی عزت و تکریم کرتے تھے وہ خود اس کے، اس کے عمّال کے اور اس کے ولی عہد موفق بن جعفر المتوکل کے غیظ و غضب کا شکار ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ احمد بن عبید اللہ بن یحییٰ بن خاقان سے روایت ہے کہ جس کے باپ عبید اللہ کو معتمد نے آغاز خلافت ہی میں اپنا وزیر مقرر کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: ایک روز جبکہ میرے والد نے ایک کھلی کچہری لگائی —— اور اس میں ان کے ساتھ میں بھی بیٹھا تھا۔ اتنے میں دربانوں نے آکر کہا: ابو محمد ابن رضاؑ تشریف لائے ہیں۔ میرے والد نے بلند آواز سے کہا: ان کو آنے دو۔ تب میں نے اپنے باپ پر اور ان دربانوں کی اس جسارت پر بھی تعجب کیا کہ جنھوں نے میرے باپ کے حضور میں ایک شخص کو اس کی کنیت سے یاد کیا،

حالانکہ ان کے سامنے خلیفہ، ولی عہد اور امیرالامراء کے حکم کے بغیر کسی کا نام اس کی کنیت سے نہیں لیا جاتا تھا۔ بہرحال ایک صاحب اندر داخل ہوئے کہ جن کا قد لانبا، بھرا بھرا بدن، چڑھتی جوانی اور پیارا سا چہرہ تھا کہ جس پر پاکیزگی کا سماں چھایا ہوا تھا۔ جونہی میرے باپ کی نظر ان پر پڑی وہ اٹھ کر ان کے استقبال کے لیے بڑھے لیکن میں نے ان کو ہاشمیوں، فوجی سرداروں یا ولی عہدوں میں سے کسی کے لیے کبھی ایسا کرتے نہ دیکھا تھا۔ جب وہ صاحب ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے ان کو گلے لگا لیا اور ان کے چہرے، سینے اور شانوں پر بوسے دیے اور ان کا ہاتھ تھام کر ان کو خاص اپنی مسند پر بٹھا دیا اور خود ان کی طرف رخ کر کے ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ پھر جب انھوں نے گفتگو شروع کی تو میرے والد خود کو اور اپنے ماں باپ کو ان کا فدیہ کرتے جاتے تھے۔ ابھی میں ان کے اس رویہ پر تعجب ہی کر رہا تھا کہ دربان آیا اور کہنے لگا: موفق آیا ہے۔ یہ معتمد کا حقیقی بھائی تھا اور جب کبھی وہ میرے باپ کے پاس آتا تو پہلے اس کے چوبدار اور فوجی محافظ داخل ہوا کرتے تھے۔ پس لوگوں نے میرے باپ کی نشست گاہ کے دروازے سے آنے جانے کی جگہ تک دو پردے آویزاں کر دیے۔ جب میرے والد نے موفق کے چوبداروں کو آتے دیکھا تو ان صاحب سے عرض کیا: اللہ مجھ کو آپ کا فدیہ بنا دے، آپ بات کا برا نہ مانیں۔ پھر اپنے دربانوں سے کہا کہ وہ آپ کو ان پردوں کے پیچھے لے جائیں تاکہ وہ آپ کو نہ دیکھے۔ اس میں ان کا اشارہ طلحہ عرف موفق کی طرف تھا کیونکہ ان کو اس سے اپنے لیے اور ان کے لیے بھی ڈر معلوم ہو رہا تھا۔ چنانچہ میرے والد نے اٹھ کر ان کو گلے سے لگایا اور رخصت کیا۔ تب وہ تشریف لے گئے۔ البتہ احمد بن عبداللہ کا کہنا ہے کہ میں اپنے باپ اور ان صاحب کے بارے میں سوچتا رہا جن کی انھوں نے اس قدر عزت کی تھی۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی اور میرے والد نماز کے لیے تنہائی میں چلے گئے۔ جب وہ نماز پڑھ چکے تو میں نے ان سے ان صاحب کے بارے میں دریافت کیا جن کی انہوں نے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عزت اور تعظیم کی اور خود کو اور اپنے ماں باپ کو ان کا فدیہ کرتے رہے تھے۔ تب انھوں نے کہا: اے بیٹے! یہ شیعوں کے امام حسنؑ بن علیؑ ہیں اور لوگ ان کو ابن رضاؑ کہتے ہیں۔ راوی مزید کہتا ہے کہ اب میرے باپ ذرا سی دیر خاموش رہے۔ شاید وہ کسی اہم معاملہ پر

غور کر رہے تھے، پھر بولے : اے بیٹے! اگر خلافت بنی عباس کے ہاتھ سے نکل جائے تو بنی ہاشم میں سے کوئی بھی اپنی عظمت، پاکدامنی، عبادت، زہد اور حسن اخلاق کے لحاظ سے ان سے بڑھ کر اس خلافت کا حقدار نہ ہو گا۔ اگر تم ان کے والد بزرگوار کو دیکھتے تو ایک نہایت ذی احترام، صاحب شرافت اور صاحب فضل کو دیکھ لیتے"۔ ہم یہیں بس کرتے ہیں اور اس روایت کا باقی حصہ امامؑ کی شہادت کے ذیل میں بیان کریں گے۔

راویوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد دوسرے عام اور خاص افراد سے امامؑ کی تعریف، بلند حیثیت اور پاکیزہ نفسی کا حال سن کر احمد بن عبیداللہ نے آپ کے بارے میں اپنی رائے میں تبدیلی کر لی اور دل سے آپ کی قدر و منزلت کرنے لگا حالانکہ اس سے پہلے وہ علویوں، ان کے حامیوں اور ان کے شیعوں میں سے کسی کے لیے بھی کوئی اچھی رائے نہ رکھتا تھا۔

اگرچہ ان روایات کے صحیح ہونے یا نہ ہونے سے امام حسن عسکریؑ کی منزلت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، تاہم ان کے صحیح نہ ہونے کے بارے میں کوئی معقول وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں شیعہ بڑی کثرت میں تھے اور مملکت کے تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ حتٰی اینکہ ان حکمرانوں کے پایۂ تخت میں بھی موجود تھے۔ یہ لوگ امام ابو محمدؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کے ان وکیلوں کے ذریعہ جو مختلف علاقوں میں موجود تھے آپ کے پاس کثیر مال پہنچتا رہتا تھا۔ علاوہ بریں ہر روز آپ کے درِ دولت پر آپ سے ملنے والے گروہ در گروہ آیا کرتے تھے۔

ادھر کئی ایک علوی جانباز مختلف علاقوں میں حکومت کے خلاف خروج کرتے رہتے تھے، جیسے حسن بن زید علوی کہ جنہوں نے طبرستان اور اس کے مضافات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان حالات سے اہل حکومت کی نیند حرام ہو رہی تھی اور ان کے حسابوں امام حسن عسکریؑ کا آزاد رہنا گویا ان کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ وہ لوگ حکومت اور اہل حکومت کے بارے میں آپ کے خیالات سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب کبھی آپ ظلم اور ظالموں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو آپ کی مراد دوسروں کے بجائے خود انہی حکمرانوں اور ان کے عُمّال سے ہوتی ہے۔

جب آپ عدل، نیکی اور ایثار کی تلقین فرماتے اور ظلم اور سرکشی سے منع فرمایا کرتے تو آپ کا عندیہ یہی ہوتا تھا کہ عوام اچھی طرح دیکھ لیں کہ یہ حکمران اسلام، اخلاق اور حقوق عباد کی طرف سے کس قدر بے پروا ہیں اور نافرمانیوں اور ستم رانیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ کے اس طرز عمل کی وجہ سے ان اہل حکومت کو سخت بے چینی لاحق تھی اور اسی لیے انھوں نے یہ امر لازم قرار دیدیا تھا کہ آپ کو جبراً اپنے پاس رکھیں جس طرح انہوں نے آپ کے والد بزرگوار کو جبری طور پر اپنے پاس رکھا تھا اور آپ پر اپنے آدمی مقرر کر دیے تھے۔ چنانچہ ان حکمرانوں نے امام حسن عسکریؑ کے نسبتاً مختصر سے دور امامت میں آپ کو متعدد بار قید میں ڈالا اور آپ کے وہ پیرو کار جو ملک کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے ان پر سخت پابندیاں لگا دیں۔ یہاں تک کہ ان کے اہم ترین شہر قم میں بھی ان گنت علماء و محدثین کو قتل کر دیا گیا۔ جیسا کہ تاریخ کامل ابن اثیر کی پانچویں جلد میں بیان کیا گیا ہے۔ ان حکمرانوں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ آپ کے خلاف یہ بغض برابر قائم رہا اور تیز سے تیز تر ہوتا گیا یہاں تک کہ عین عنفوان شباب میں ہی جبکہ آپ کی عمر پورے تیس سال بھی نہ ہونے پائی تھی کہ آپ کی شہادت واقع ہو گئی۔ کہا گیا ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا تھا اور ان ظالموں سے ایسا فعل کچھ بعید بھی نہیں ہے۔

امام حسن عسکریؑ کا عہد اور شیعیت

شیعیت کہ جو ظہور اسلام کے وقت ہی سے موجود ہے اور کبھی آہستگی سے اور کبھی تیزی سے اپنی راہ پر گامزن رہی۔ یہاں تک کہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے دور میں اس پاکیزہ خون کی بدولت کہ جو اللہ کی راہ میں بہایا گیا اور آپ دونوں باپ بیٹے کی کوششوں کے نتیجہ میں یہ اسلامی فکر کو بہترین شکل میں پیش کرنے لگی اور اب بھی کرتی ہے۔ پھر اس کا اثر ہر شہر اور ہر بستی میں پھیلتا چلا گیا، حالانکہ امویوں اور پھر عباسیوں کی طرف سے اس کو ہر بستی، ہر گھر میں سخت حادثات سے دوچار ہونا پڑا تھا بلکہ اس پر عباسیوں کی لائی ہوئی مصیبتیں زیادہ سخت اور تلخ تھیں۔ جیسا کہ ان کے طویل عہد میں ائمۂ اہلبیتؑ اور ان کے پیرو کاروں کے ساتھ ان کے برتاؤ سے ظاہر ہوتا ہے۔

تاریخ میں ایسی کوئی مذہبی تحریک نہیں ہے کہ جس کو شیعیت کی طرح ایسی بدترین

صورتوں میں تعدیوں، سختیوں اور ایذا رسانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہو اور پھر وہ دشمنوں کے مقابلے پر اسی طرح ڈٹے رہنے میں کامیاب بھی رہی ہو، جیسے شیعیت کامیاب رہی ہے بلکہ وہ حکومت کے تابڑ توڑ حملوں اور دوسرے گوناگوں حادثات سے بچی ہوئی اس وسیع دنیا کے کونے کونے میں پھیلتی ہی چلی گئی۔ حالانکہ اس کے مخالف اپنے شر و فساد کی پوری طاقت سے اس کو برباد کرنے اور مٹانے کے درپے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی کم سے کم خواہش یہ ہوتی تھی کہ وہ اس مورچے پر اپنے پورے وسائل کے ساتھ ائمۂ اطہارؑ کا مقابلہ کرتے رہیں۔

یہ تحریک دوسری اور تیسری صدی ہجری میں ائمۂ اطہارؑ کی تعلیمات، توجہ اور کوششوں کی بدولت برابر پھیلتی رہی، حالانکہ وقت کی حکومتیں اور ان کے عمّال ہر مرحلے میں اس پر سختیاں کرتے رہتے تھے۔ جیساکہ ہم پچھلے صفحات میں بیان کر آئے ہیں۔

چنانچہ امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے دورِ امامت میں ایران، عراق، یمن، حجاز اور مصر کے شہروں، نیز عباسیوں کے دارالحکومت سامراسمیت لاکھوں کی تعداد میں شیعہ آباد تھے اور تمام دینی مسئلوں اور دنیاوی مشکلوں میں امام علی نقیؑ کے بعد ان کے مرجع امام ابو محمد حسن عسکریؑ تھے جن کو خمس کی رقمیں ان کے وکیلوں کے ذریعہ سے آتی تھیں جو تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

شیخ طوسی کی کتاب "الغیبت" میں آیا ہے کہ امام ابو محمد حسن عسکریؑ کے ایک وکیل عثمان بن سعید عمری، جو سمّان کہلاتے تھے کیونکہ وہ آپ کے معاملات کو پوشیدہ رکھنے کی غرض سے سَمن (روغنیات) کی تجارت کرتے تھے۔ چنانچہ جب شیعوں کو امام ابو محمدؑ کی خدمت میں وہ مال خمس بھیجنا ہوتا جو ان پر واجب ہوتا تھا تو وہ لوگ اس کو ان کے سپرد کر دیتے تھے۔ پھر وہ اہل حکومت اور ان کے افسروں کے خوف سے اس مال کو روغن والے برتنوں میں رکھ کر امام ابو محمدؑ تک پہنچا دیتے تھے۔

کتاب الغیبت ہی میں حسین بن احمد خصیبی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:
مجھ سے محمد بن اسماعیل حسنی اور علی بن عبداللہ حسنی نے کہا کہ ہم دونوں سامرا میں امام ابو محمد حسن عسکریؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت ان کی خدمت میں ان کے شیعوں اور دوستداروں میں سے کچھ افراد موجود تھے۔ اس وقت آپ کے خادم بدر نے آکر کہا:

اے آقا! دروازے پر کچھ افراد آئے ہیں کہ جن کے جسم اور لباس گرد سے اَٹے ہوئے ہیں۔
امامؑ نے فرمایا: وہ ہمارے شیعہ ہیں۔ جاؤ اور عثمان بن سعید عمری کو ہمارے پاس لے آؤ۔
ان دونوں راویوں کا بیان ہے کہ اسی وقت عثمان اندر آئے اور امام نے ان سے فرمایا:
اے عثمان! تم اللہ کے مال پر با اعتبار امین ہو، تم جاؤ اور وہ یمنی افراد جو مال لے کر آئے
ہیں ان سے لے لو۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ پھر ہم سب نے مل کر عرض کیا: اے آقا!
بخدا کہ عثمان آپ کے بہترین شیعوں میں سے ہیں۔ یہ آپ کی نظر میں بلند مرتبہ ہونے کے
علاوہ علم میں بھی اونچا مقام رکھتے ہیں اور اللہ کے مال پر آپ کی طرف سے آپ کے معتمد وکیل
ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: ہاں گواہ رہنا کہ یہ عثمان بن سعید میرے وکیل ہیں اور ان کے
بیٹے محمد میرے فرزند اور تمہارے امام محمد مہدیؑ کے وکیل ہیں۔

کشف الغمہ میں آیا ہے کہ امام ابو محمدؑ کے زمانہ میں ایک علوی روزی کی تلاش میں سامرا
سے جبل کی طرف روانہ ہوا، راستے میں حلوان کے مقام پر اس کی ملاقات ایک اور شخص سے
ہوئی تو اس نے علوی سے پوچھا: تم کہاں سے آ رہے ہو؟ اس نے کہا: سامرا سے۔ وہ بولا: کیا
تم فلاں محلہ کے فلاں مقام سے واقف ہو؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس نے پوچھا: کیا تم کو
امام حسن بن علیؑ کے متعلق کچھ معلوم ہے؟ اس علوی نے کہا نہیں — اس نے کہا: تم جبل
کیوں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: روزی کی تلاش میں۔ تب اس نے کہا: تم مجھ سے پچاس
دینار لے لو اور میرے ساتھ سامرا چلے چلو اور وہاں امام حسن بن علیؑ سے ملاقات کرو۔ چنانچہ
اس نے وہ پچاس دینار اس کو دیدیے اور وہ اس کے ساتھ واپس ہو لیا۔ سامرا آ کر ان دونوں
نے امام ابو محمدؑ سے حاضری کی اجازت چاہی تو آپ نے ان کو اجازت دیدی۔ اس وقت
آپ اپنے مکان کے صحن میں تشریف فرما تھے۔ جب آپ کی نظر اس جبلی شخص پر پڑی تو فرمایا:
تم فلاں بن فلاں ہو اور تمہارے باپ نے تم کو جو وصیت کی تھی تم اس کو پورا کرنے کے لیے
چار ہزار دینار لیکر آئے ہو۔ اس نے کہا: ہاں۔ تب اس نے وہ رقم آپ کو دیدی۔ اس کے
بعد آپ نے علوی کی طرف دیکھا اور فرمایا: تم تلاش معاش میں جبل جا رہے تھے۔ راستے میں
اس شخص نے تم کو پچاس دینار دیے ہیں اور تم اس کے ساتھ واپس آ گئے ہو۔ اب ہم
تم کو پچاس دینار اور دیدیتے ہیں۔

کشف الغمہ ہی میں ہے کہ آپ کی خدمت میں کچھ لوگ ایک سو ساٹھ تھیلیوں میں سونا اور چاندی لیکر آئے۔ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ایک بڑی رقم لیے ہوئے جرجان سے حاضر ہوئے۔ نیز محمد بن ابراہیم بن مہزیار بھی بہت سا مال لے کر آئے جو ان کے باپ کے پاس امامؑ کے لیے آیا تھا۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے وہ اپنے بیٹے محمد کو دیا، جس کو لیکر اب وہ آپ کی خدمت میں آئے تھے۔ پس جیسا کہ رجال کشی میں لکھا ہے جب یہ سب لوگ بغداد پہنچے تو عثمان بن سعید عمری بھی آگئے جو امام ابو محمد حسن عسکریؑ کے معتمد ترین اصحاب میں سے تھے۔ چنانچہ ان سب لوگوں نے اپنا اپنا مال انہی عمری کے حوالے کر دیا۔

اسی طرح ایک اور شخص آپ کی خدمت میں اٹھارہ قیراط سونا لیکر آیا، جیسا کہ شیعہ احادیث اور رجال کی کتابیں بتلاتی ہیں کہ امامؑ کے پاس مختلف علاقوں سے کثیر مال آتا تھا، حالانکہ اہل حکومت اور ان کے کارندوں کے خوف سے امام ابو محمد عسکریؑ کی حیات طیبہ کا یہ پہلو مکمل طور پر پوشیدہ رکھا جاتا تھا کیونکہ وہ لوگ آپ کے تمام معاملات کی نگرانی کرتے تھے، تاکہ شیعہ نظریات ملک کے تمام گوشوں میں اس حد تک نہ پھیلنے پائیں کہ پھر حکومت ان کا مقابلہ ہی نہ کر سکے۔

اس زمانہ میں جبکہ اہل حکومت نے ائمہ کرامؑ کے سامرا میں جبری قیام کو لازمی قرار دیدیا تھا، شیعہ علماء اور عوام اپنی فقہ کے معاملے میں ان کتابوں اور روایتوں پر انحصار کرتے تھے جو ان کے پہلے محدثین نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے مدرسہ سے حاصل کیں اور وہ ان کو امام موسیٰ کاظمؑ اور آپ کے فرزند امام علی رضاؑ کے واسطہ سے ملی تھیں۔

علاوہ ازیں کوفہ، بغداد اور حجاز میں درس و تدریس اور بحث و تمحیص کے حلقے قائم تھے۔ نیز تاریخ کے اس دور میں تعلیم و تعلّم کے معاملہ میں ایران کے شہر قم کو خاص شہرت حاصل تھی۔ حسن بن علی وشاء کہ جو امام علی رضاؑ کے ہم عصر تھے، انہوں نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں میں سے ان نو سو بزرگوں سے ملاقات کی تھی جو اس وقت تک زندہ تھے اور مسجد کوفہ میں امام جعفر صادقؑ کی حدیثیں بیان کرتے تھے۔ اسی طرح محمد بن عمیر کے پاس امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں کی لکھی ہوئی سو کتابیں موجود

تھیں اور پھر محمد بن مسعود عیاشی کہ جو امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے ہمعصر تھے، انہوں نے اپنے باپ سے پائی ہوئی ساری دولت اہل بیتؑ کی احادیث نشر کرنے میں خرچ کر ڈالی۔ ان کا مکان گویا ایک مسجد کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ دسیوں کتابیں تھیں کہ جن میں ناسخ، مقابل، قاری اور معلق آیتوں کے بارے میں بحث کی گئی تھی۔ چنانچہ جب کبھی ائمہ کرامؑ کے اصحاب کا ان تک پہنچنا ممکن نہ ہوتا تو وہ یہ کتابیں استفادہ کے لیے ان کے سامنے پیش کر دیا کرتے تھے۔

امام حسن عسکریؑ سے فرقہ فطحیہ، واقفہ اور ائمہؑ سے منحرف ہو جانے والے دوسرے افراد کی کتابوں کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: جو کچھ ان لوگوں نے روایت کیا ہو اس کو قبول کر لو لیکن جو کچھ وہ اپنی رائے سے کہیں اس کو ترک کر دو۔

امام حسن عسکریؑ کے زمانہ میں شہر قم میں سیکڑوں راوی اور عالم جمع ہو گئے تھے، تاکہ احادیث کی تحقیق کریں اور خطابیوں، غالیوں اور ان افراد کی گھڑی ہوئی روایتوں کو الگ کر دیں جو ائمہ کرامؑ سے منحرف ہو گئے تھے اور ان پر جھوٹ باندھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو احکام کے معاملہ میں اگر کوئی مشکل پیش آتی اور ائمہ کرام کے پیشرو اصحاب کی روایتوں اور کتابوں میں اس کا حل موجود نہ ہوتا تو یہ لوگ امام حسن عسکریؑ سے ملاقات کرنے کی بجائے آپ کو عریضہ لکھ بھیجتے اور آپ اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر ان لوگوں کو اس مسئلہ کا حل بتا دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اصول کافی کی مندرجہ ذیل روایات دیکھی جا سکتی ہیں۔

محمد بن یحییٰ کی پہلی روایت: محمد بن حسن نے امام ابو محمد حسن عسکریؑ کو لکھا: کیا ایک شخص پر میت کا قرض ثابت کرنے کے لیے اس کے وصی کے ساتھ ایک عادل کی گواہی کافی ہو گی؟ آپ نے جواباً تحریر فرمایا: اگر ایک عادل گواہی دیتا ہے تو بھی مدعی کو اپنے دعوے پر قسم کھانا ہو گی۔ [1]

---

[1] غالباً یہاں قسم بیان میں مضبوطی پیدا کرنے کے لیے ہوگی، ممکن ہے کہ اس عبارت کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہو اور آپ کا جواب یہ رہا ہو کہ اگر اس کے ساتھ عادل گواہ شہادت نہ دے تو مدعی کو قسم کھانا ہو گی اور فیصلہ ایک گواہ یا مدعی کی قسم پر ہو گا۔

راوی مزید کہتا ہے کہ پھر آپ کو لکھا گیا کہ: کیا وصی کے لیے جائز ہے کہ وہ میت کے بالغ یا نابالغ وارث کا گواہ بنے کہ میت پر یا کسی اور پر اس کا فلاں حق واجب ہے جبکہ وہ نابالغ کی طرف سے قابض بھی ہو البتہ بالغ کی طرف سے قابض نہ ہو۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا: ہاں! وصی کو چاہیے کہ حق کو نہ چھپائے اور اس کے لیے گواہی دے۔ راوی یہ بھی کہتا ہے کہ خط کے ذریعے آپ سے پوچھا گیا کہ کیا میت کے خلاف ایک عادل گواہ کے ساتھ وصی کی شہادت قبول ہو سکتی ہے؟ آپ نے جواب دیا: ہاں! جبکہ قسم بھی کھائی جائے۔

محمد بن یحییٰ کی دوسری روایت: محمد بن حسن نے امام ابو محمد حسن عسکریؑ کو ایک شخص کے بارے میں لکھا، جس نے اپنی زرعی زمین کسی اور کے ہاتھ بیچ ڈالی، جس میں کئی قطعات تھے، وہ ان کی حدیں نہیں جانتا تھا اور اس وقت اس کو کسی نے بتایا بھی نہیں تھا بلکہ کہہ دیا کہ جب تمہارے پاس حدود کا تعین کرانے آئیں تو تم گواہی دے دینا۔ کیا اس کے لیے یہ گواہی دینا جائز ہے یا نہیں؟ آپ نے تحریر فرمایا: ہاں! اس کے لیے گواہی دینا جائز ہے۔ والحمد للہ۔

محمد بن یحییٰ کی تیسری روایت: ایک شخص جو کئی قطعے زمین کا مالک تھا، اس نے امام حسن عسکریؑ کو لکھا کہ کسی کام سے اس کو مکہ جانا پڑ گیا۔ جس گاؤں میں اس کی زمین تھی وہ وہاں سے کئی منزلوں کے فاصلہ پر تھا اور اس کو اپنی زمین کی حدود بھی معلوم نہ تھیں۔ البتہ پورے گاؤں کا حدود اربعہ اس کو معلوم تھا۔ چنانچہ اس نے حاضرین سے کہا: اے لوگو! تم گواہ رہنا کہ میں نے فلاں شخص کے ہاتھ وہ پورا گاؤں بیچ دیا ہے، جس کی شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں یہ یہ حدیں ہیں اور یہ بھی کہا کہ اس گاؤں میں اسکے صرف چند قطعے زمین کے ہیں۔ کیا خریدنے والے کے لیے یہ معاملہ صحیح ہے۔ پھر یہ کہ اس گاؤں کی زمین کا کچھ ہی حصہ اس کا ہے، تو کیا وہ پورے کا پورا گاؤں کسی کے ہاتھ بیچ سکتا ہے: آپ نے جواب میں لکھا: جو چیز کسی شخص کی ملکیت میں نہیں ہے اس کے لیے اس کا بیچنا جائز نہیں ہے اور کسی سے صرف اتنا ہی خریدا جا سکتا ہے کہ جس کا وہ مالک ہو۔ راوی مزید کہتا ہے کہ آپ کو بار دیگر لکھا گیا: جس گواہ نے پورے گاؤں کے سودے میں گواہی دی تھی، کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ گاؤں کے عادل اشخاص سے زمین کے

ان قطعوں کی حدود معلوم کر کے گواہی دیدے؟ آپ نے تحریر فرمایا: ہاں! جانی پہچانی چیز کی گواہی دی جاسکتی ہے۔ [1]

محمد بن یحییٰ کی چوتھی روایت: ایک شخص نے امام حسن عسکریؑ کو لکھا: ایک آدمی نے یوں کہا کہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ فلاں گاؤں میں میرا جو مکان ہے، وہ اپنی پوری حدود کیساتھ اور اس میں موجود سامان سمیت اب فلاں بن فلاں کا ہے۔ پس گھر کے اندر کا تمام سامان خواہ وہ کچھ بھی ہو، کیا خریدار کے لیے اس کا لے لینا جائز ہوگا؟ آپ نے فرمایا: جو کچھ بھی خرید و فروخت میں شامل ہے وہ سب اس کے لیے جائز ہوگا۔ انشا اللہ۔

محمد بن یحییٰ کی پانچویں روایت: سہل بن زیاد نے کہا کہ میں نے امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں لکھا: ایک شخص کے دو بیٹوں میں سے ایک مر گیا اور اس کی اولاد میں بیٹے بیٹیاں موجود ہیں۔ چنانچہ ان کے دادا نے وصیت کی ہے کہ ان کے باپ کا حصہ انکو دیدیا جائے۔ آیا اس مال میں سے بیٹوں اور بیٹیوں کو برابر حصہ ملے گا یا ہر بیٹے کو بیٹی سے دگنا ملے گا؟ آپ نے تحریر فرمایا: دادا کی اس وصیت پر اللہ کے حکم کے مطابق ہی عمل کیا جائے گا۔ راوی مزید لکھتا ہے کہ آپ کی خدمت میں لکھا گیا: ایک شخص جس کی اولاد میں بیٹے بیٹیاں موجود ہیں، اس نے اپنی وصیت میں کہا ہے کہ اس کی زرعی زمین اس کی اولاد کے لیے ہے لیکن اس نے یہ واضح نہیں کیا کہ اس میں ان کے حصے مساوی ہیں یا اللہ کے حکم کے مطابق ہوں گے۔ آپ نے تحریر فرمایا: ان کے باپ نے اپنی وصیت میں جو صراحت کی ہے اس پر عمل کیا جائے۔ اگر اس نے صراحت نہ کی ہو تو پھر کتاب خدا اور سنت رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے۔

محمد بن حسن نے امام حسن عسکریؑ کو لکھا: ایک شخص جو مر گیا، اس نے دو آدمیوں

---

[1] غالباً پوچھنے والا امامؑ سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ جب بیچنے والے کا حق اتنے ہی پر ہے جو اسکی ملکیت تھا اور ہم نے فرض کیا ہے کہ اس نے پورا گاؤں بیچ دیا تھا تو کیا اب یہ معلوم ہونے پر کہ بیچنے والا گاؤں کے کتنے حصے کا مالک تھا، گواہ کے لیے یہ جائز ہوگا کہ وہ اس حصہ کی گواہی دے جس کی قیمت کا حق اس مالک کو حاصل ہے اور معاملے کی اس حیثیت سے یہ سوال قابل پذیرائی ہے۔

کے حق میں وصیت کی تھی۔ کیا یہ جائز ہے کہ ان میں سے ہر ایک میت کا آدھا آدھا ترکہ لے لے؟ آپ نے فرمایا: ان کے لیے میت کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ ان کو وہی کرنا چاہیے کہ جو اس نے کہا ہے۔

اسی طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جو ایک محقق کو فقہ کے مختلف ابواب میں ملیں گی جو سب خطوں کی صورت میں ہیں اور اگر سب نہیں تو ان میں سے زیادہ تر محمد بن حسن ہی کے واسطہ سے وارد ہوئی ہیں۔

احمد بن محمد بن عیسیٰ اشعری

احمد بن محمد بن عیسیٰ اور ان کے ساتھی راوی اور روایت کی شرطوں میں بڑی سختی برتتے تھے۔ غالباً قم کے ان علماء کی خواہش یہ تھی کہ ائمہ کرامؑ کو ان باتوں سے بری الذمہ رکھیں جو غالی اور منحرف افراد ان سے منسوب کر دیتے تھے۔ اسی طرح وہ یہ بھی چاہتے کہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے اصحاب کی کتب حدیث میں خطابیہ اور بزیغیہ فرقوں کے لوگوں کی طرف سے جھوٹی حدیثیں داخل کرنے کے عمل کو روکیں جو شیعیت کا نقاب اوڑھے ہوئے تھے۔

انہی وجوہ کی بنا پر وہ مجبور تھے کہ راویوں اور روایتوں کے معاملہ میں انتہائی درجہ کی احتیاط کو کام میں لائیں۔ چنانچہ اس موضوع کے مسلسل مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد بن محمد بن عیسیٰ اور ان کے عظیم رفقاء کی ان کاوشوں کو اس زمانہ سے آج تک علم رجال پر قلم اٹھانے والوں کے لیے اولین سرچشمہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ نیز علمائے رجال میں سے کوئی بھی انکے معینہ راستے سے ہٹ کر نہیں چلا ہے۔ چنانچہ ان کی تالیفات کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ ان کے بعد کسی نے بھی راویوں کے حالات کی ایسی جانچ پڑتال نہیں کی کہ جس سے ان کے بارے میں اطمینان حاصل ہو جائے۔

محمد بن حسن صفّار

کتب رجال سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن حسن صفّار قم کے ممتاز علماء اور محدثین میں سے بلند مرتبہ اور قابل اعتماد مانے جاتے تھے۔ ان کی اکثر و بیشتر روایات قابل قبول ہوتیں اور ان میں بہت ہی کم ناقابل قبول ہوتیں۔ راویوں کا بیان ہے کہ انہوں نے امام عسکریؑ کی طرف سے بہت سے مسائل کے جواب روایت کیے ہیں۔

سہل بن زیاد

سہل بن زیاد ابوسعید الآدمی بھی امام حسن عسکریؑ سے خط و کتابت کے ذریعہ سوال کر کے ان کے جواب حاصل کیا کرتے تھے جن میں سے کچھ ہم نے بیان کیے ہیں۔ تاہم کتب رجال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مطلوبہ معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ کیونکہ ان پر غلو کا الزام تھا اور احمد بن محمد بن عیسیٰ اشعری نے ان سے روایت لینے کی ممانعت کی ——— اور ان کو قم سے نکال دیا۔ علم حدیث کے مرکز قم سے نکالے جانے کے بعد وہ رَے میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ لوگوں کے ان سے دل برداشتہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ احمد بن محمد بن عیسیٰ اور انکے ساتھی راوی اور روایت کی شرطوں میں بڑی سختی برتتے تھے اور غلو کے حامل ایک فقرہ یا ذرا سے شبہ پر بھی بعض راویوں پر غلو کا اتہام عائد کر دیتے تھے۔

احمد بن محمد بن عیسیٰ نے اوروں کے علاوہ احمد بن خالد برقی کو بھی قم سے نکال دیا تھا جن کے بارے میں علمائے رجال کی رائے یہ ہے کہ وہ مرضیین میں سے تھے۔ البتہ بعد میں ان کو واپس بلا کر ان سے عذر خواہی کر لی تھی۔ نیز جب احمد بن خالد برقی کی وفات ہوئی تو وہ ان کے جنازے میں بھی شریک ہوئے جبکہ ان کے چہرے پر غم کا اثر نمایاں تھا۔

حسین بن سعید اہوازی

امام حسن عسکریؑ کے ہم عصر شیعہ محدثوں اور فقیہوں میں حسین بن سعید اہوازی بھی تھے۔ ان کے اور ان کے بھائی حسن بن سعید کے بارے میں ابن ندیم نے بیان کیا ہے کہ یہ دونوں اپنے زمانہ میں علم فقہ میں سب سے زیادہ وسیع النظر تھے۔ حسین بن سعید نے ائمہ کرام کی حدیثیں مختلف عنوانات کے تحت مرتب کی ہیں۔ وہ تالیفات جو اُن سے منسوب ہیں اُن میں اُن کے بھائی حسن بن سعید بھی ان کے ساتھ شریک رہے ہیں۔

حسن بن خالد برقی

بعض روایات کے مطابق حسن بن خالد برقی اس تفسیر کے مؤلف ہیں جس کو انہوں نے امام حسن عسکریؑ سے اخذ کیا تھا۔ جو تفسیر عسکریؑ کے نام سے مشہور ہے۔ البتہ بعض لوگ اس تفسیر کے امامؑ کی طرف سے تعلیم کیے جانے کا انکار کرتے ہیں اور غالباً اُن کا کہنا درست ہے جیسا کہ اس تفسیر کے مطالعہ سے ہر شخص کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

احمد بن اسحاق بن عبداللہ

علمائے رجال کے بیان کے مطابق احمد بن اسحاق بن عبداللہ بن سعد اشعری امام حسن عسکریؑ کے بلند مرتبہ اصحاب میں سے تھے۔ وہ اہل قم کے سردار اور امامؑ کے ہاں ان کے نمائندہ تھے۔ نیز انتقان المقال میں آیا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے صاحب الامر کو دیکھا تھا۔ ان کے بارے میں اور بھی بہت سی روایات ہیں کہ ان سب کا بیان کرنا ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔

امامؑ کے جوابات اور مختصر کلمات

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ.

اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ انکی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ (سورہ بقرہ۔ آیت ۷)

اس آیت کی تفسیر میں امام حسن عسکریؑ سے روایت ہے کہ: اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں کو ایسے رنگ سے رنگ دیا ہے کہ جس کو دیکھ کر ملائکہ میں سے ہر ایک ان کو پہچان لیتا تھا۔ نیز اس نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے کیونکہ انہوں نے اس بات کو دیکھنے سے کنارہ کشی کی جس کا ان کو حکم دیا گیا تھا اور جس کی ان سے توقع کی گئی تھی، انہوں نے اس کو پورا نہیں کیا، جس امر پر ایمان لانا ان کے لیے ضروری تھا، وہ اس سے لاعلم رہے۔ اس طرح وہ اس شخص کی مانند ہو گئے کہ جس کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوں اور وہ اپنے سامنے کی چیز کو بھی نہیں دیکھتا۔ پس اللہ کی ذات اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ فعل عبث کرے یا فساد کرے یا اپنے بندوں سے اپنے قہر کے ذریعہ وہ بات منوائے، جس سے اس نے ان کو منع کیا ہو۔ وہ ان کو کوئی حکم زبردستی سے نہیں دیتا اور جس چیز سے ان کو روکا ہو اس پر ان کو اپنی قدرت سے نہیں چلاتا۔ اسی لیے کہتا ہے کہ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ یعنی ان کیلئے وہی عذاب ہے جو آخرت میں کافروں کے لیے ہے۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا. (سورۃ بقرہ۔ آیت ۲۲)

جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا۔

اس آیت کی تفسیر میں آپ نے فرمایا: اللہ نے زمین کو تمہاری طبیعتوں کے مطابق اور تمہارے جسموں کے لیے موزوں بنایا ہے۔ نہ اس کو زیادہ گرم بنایا ہے کہ تم کو جلا ڈالے اور نہ زیادہ ٹھنڈا بنایا ہے کہ تم کو جما کر رکھ دے۔ نہ اس کی خوشبوئیں اس قدر تیز ہیں کہ تمہارے سروں میں درد پیدا کر دیں اور نہ بوئیں اتنی تیز ہیں کہ تم کو ہلاک کر دیں۔ نہ وہ پانی کی مانند نرم ہے کہ تم کو ڈبو دے اور نہ اتنی سخت ہے کہ نہ تم کھیتی کر سکو اور نہ مکان بنا سکو۔ بلکہ اس نے اس میں ایسی سختی رکھی ہے جس سے تم فائدہ حاصل کر سکو اور اس کے اوپر اپنے جسموں اور عمارتوں کو قائم رکھ سکو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس میں ایسی نرمی بھی رکھی ہے کہ تم اپنی کھیتی اور دوسرے فائدوں کے لیے اس کو استعمال میں لا سکو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اس کو تمہارے لیے فرش بنایا، آسمان کو تمہارے لیے مکان یعنی چھت کے طور پر رکھا کہ جو ہر طرح سے محفوظ ہے اور اس میں سورج، چاند اور ستارے تمہارے فائدے کے لیے گردش کر رہے ہیں۔ وہ آسمان کی طرف سے بارش نازل کرتا ہے۔ اس کو بلندی سے اس لیے نازل کرتا ہے کہ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں، نیچی پہاڑیوں، ٹیلوں اور میدانوں میں پہنچ سکے۔ اس نے تمہاری زمین، درختوں اور پھلوں کے فائدے کے لیے اس بارش کو پھوار، بوندا باندی، ہلکی اور موسلا دھار جھڑیوں میں تقسیم کیا ہے اور اس قسم کی بارشوں سے تمہاری غذا کے لیے تمام پھل اگائے ہیں۔ پس تم کو چاہیے کہ کسی کو اس کا شریک نہ قرار دو اور اس کی شبیہیں بنا کر ان کی پرستش نہ کیا کرو۔ کیونکہ ان بڑی بڑی نعمتوں پر ان کا کوئی اختیار نہیں جو اللہ نے تم کو دی ہیں۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ ۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۷۸)

اور ان میں ایسے امی ہیں کہ جو کتاب خدا کو صرف اپنی خواہش کے مطابق جانتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں آپ سے روایت ہے کہ: الْأُمِّيّ میں ماں کی طرف سے نسبت دی ہے۔ گویا وہ ایسے ہی ہیں جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی نہ پڑھتے ہیں، نہ لکھتے ہیں، نہ اس کتاب کو جانتے ہیں جو آسمان سے آئی اور نہ اس کتاب کو جو ان کے علماء نے خود بنائی ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان اس وقت تک فرق نہیں کر سکتے جب تک ان کو

پڑھ کر سنایا اور بتایا نہ جائے کہ یہ اللہ کی کتاب اور اس کا کلام ہے لیکن وہ پھر بھی شک ہی میں رہتے ہیں مگر ان کے علمار محمد رسول اللہؐ کی نبوت کو ——— جھٹلانے کے لیے ان کو جو کچھ سناتے ہیں وہ اس کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ ان کی پیروی سے ان کو منع کیا گیا ہے۔ پس وائے ہو ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے[1]۔ یہ لوگ یہودیوں میں سے تھے۔ وہ کچھ خیالی صفات لکھ کر کہہ دیتے تھے کہ یہ محمدؐ کی صفات ہیں۔ حالانکہ وہ آنحضرتؐ کی صفات کے خلاف تھیں۔ پھر وہ اپنے کمزور افراد سے کہتے تھے کہ یہ اس نبی کی صفات ہیں جو آخر زمانہ میں مبعوث ہوں گے۔ وہ لمبے قد، بڑے جسم اور سرخ بالوں والے ہوں گے۔ ہاں دیکھ لو کہ محمدؐ اس سے مختلف ہیں اور وہ آخری نبی آج سے پانچ سو سال بعد آئے گا۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ یہ کمزور افراد اسلام نہ لائیں تاکہ وہ ان پر اپنی سرداری قائم رکھے رہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وائے ہو ان لوگوں پر جو کتاب خدا میں اپنی طرف سے لکھ دیتے ہیں اور وائے ہو ان پر جو ایسا کام کرتے ہیں۔

راوی کہتا ہے کہ اس پر ایک شخص نے کہا: اگر یہ لوگ قوم یہود سے تھے کہ جو کتاب کو صرف اتنا ہی سمجھتے تھے جتنا وہ اپنے علمار سے سنتے تھے اور ان کے پاس اس کا کوئی اور ذریعہ بھی نہ تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے علمار کی بات ماننے پر بُرا کیوں کہا؟ جبکہ یہودی عوام بھی ہمارے ہی عوام کی طرح رہے ہوں گے کہ جو اپنے علمار کے کہنے پر چلتے ہیں۔ تب امامؑ نے فرمایا: ہمارے عوام اور علمار اور یہودی عوام اور علمار میں ایک لحاظ سے تفاوت اور ایک لحاظ سے یکسانیت ہے۔ یکسانیت اس لحاظ سے ہے کہ اللہ نے ہمارے عوام کو بھی اپنے علمار کی تقلید کرنے پر بُرا کہا جس طرح یہودی عوام کو برا کہا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ یہودی عوام جانتے تھے کہ ان کے علمار جھوٹے ہیں، رشوت لیتے ہیں، حرام کھاتے ہیں اور سفارش یا تہدید کے زیر اثر شرعی احکام کو بدلتے رہتے ہیں۔ نیز وہ ان کے اس شدید تعصب سے بھی واقف تھے کہ جس سے وہ دین میں تفرقے پیدا کرتے رہتے تھے اور ایسی ہی اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو وہ ان کے متعلق جانتے تھے۔ پس ان کو اس لیے برا کہا گیا کہ انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے ایسے بُرے لوگوں کی تقلید کی۔

[1] سورہ بقرہ آیت ۷۹۔

جبکہ یہ طرز عمل ان کے لیے مناسب نہیں تھا کہ جو کچھ ان کو ایک جھوٹا عالم بتائے وہ اس کو مان لیں اور اس کی تصدیق کریں، بلکہ ان کے لیے محمد رسول اللہؐ کے معاملہ پر خود غور کرنا اور اپنی عقل سے کام لینا لازم تھا کیونکہ آنحضرتؐ کا پیغام واضح اور آپ کے دلائل روشن اور ظاہر تھے۔ اسی طرح جب ہمارے عوام کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے فقہاء بداعمالیوں اور جنبہ داریوں میں پڑ گئے ہیں اور وہ دنیا کے چند ٹکڑوں پر ریجھے جا رہے ہیں تو ہمارے عوام میں جو لوگ بھی اس طرح کے فقہاء کی تقلید کریں گے ان کی مثال انہی یہودیوں کی سی ہوگی جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بدکار فقہاء کی تقلید کرنے پر برا کہا ہے۔ البتہ ایسے فقیہہ جو اپنے نفس کو گناہوں سے بچانے والے، اپنے دین کی حفاظت کرنے والے، اپنی خواہشات کی مخالفت کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنے والے ہوں تو عوام کو ان کی تقلید کرنا چاہیے۔ تاہم سب شیعہ فقہاء ایسے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے چند ایک ہی اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ پس جو کوئی بدکار فقہاء کی طرح برائیوں اور بداعمالیوں میں پڑ جائے اس سے ہمارے متعلق کوئی چیز بلکہ ہماری کرامت بھی سنو تو قبول نہ کرو کیونکہ جو کچھ ہم اہلبیتؑ سے اخذ کیا جاتا ہے پھر اس میں بہت کچھ آمیزش ہو جاتی ہے اور وہ اس طرح کہ جب ایسے بدکار لوگ ہم سے کچھ حاصل کرتے ہیں تو وہ اپنی جہالت اور معرفت کی کمی کی وجہ سے اس میں تبدیلیاں کر کے اس کو نامناسب جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو جان بوجھ کر ہم پر جھوٹ باندھتے ہیں تاکہ اس طرح مال دنیا حاصل کریں لیکن وہ جھوٹ الٹا ان کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو ہم سے دشمنی رکھنے والے ہیں لیکن وہ ہم کو برا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے، البتہ وہ ہمارے کچھ علوم حاصل کر لیتے ہیں اور پھر ہمارے شیعوں میں جا کر ہمارے اس علم میں جھوٹ ملا ملا کر بیان کرتے ہیں کہ جس سے ہم بالکل بری الذمہ ہوتے ہیں۔ تاہم وہ ان کو ہمارے شیعوں میں سے سمجھتے ہوئے ان سے وہ باتیں صحیح جان کر لے لیتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ پس یہ لوگ ہمارے عام شیعوں کے لیے اس سے زیادہ نقصان رساں ہیں جتنا کہ حسینؑ بن علیؑ اور ان کے اصحاب کے لیے یزید کا لشکر تھا۔

آپ نے مزید فرمایا: رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ ہماری امت میں سے برے علماء ہم کو لوگوں سے دور کرتے ہیں اور ہماری طرف آنے والے راستوں پر لوٹ مار کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مخالفوں کے نام ہم جیسے رکھتے ہیں اور ہمارے مقابل آنے والوں کو ہمارے القاب دیتے ہیں۔ پھر وہ لوگ بظاہر تو ان پر رحمت بھیجتے ہیں مگر اصل میں وہ لعنت کے سزاوار ہوتے ہیں۔ وہ ہم سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ جبکہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عزتیں گھیرے ہوئے ہیں اور ہم پر خدا اور اس کے مقرب ملائکہ کی جو صلوات جاری رہتی ہے اس کے ہوتے ہوئے ہم ان کی صلوات کی ضرورت نہیں رکھتے۔

راوی کا خیال ہے کہ امام حسن عسکری نے یہ بھی فرمایا کہ امیرالمومنین امام علی بن ابی طالبؑ سے پوچھا گیا کہ ائمہ ہدیٰؑ جو اندھیرے کے چراغ ہیں، ان کے بعد خلق خدا میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ نے فرمایا: علماء کہ جب وہ نیک عمل کرتے ہوں۔ پھر پوچھا گیا: ابلیس، فرعون، نمرود اور ان لوگوں کے بعد بدترین خلائق کون ہے؟ جو آپ کے سے نام اور لقب رکھتے ہیں لیکن عوام الناس کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ علماء کہ جو فساد پھیلاتے ہوں یعنی وہ باطل کی پشت پناہی کرتے اور حق کو چھپاتے ہیں۔ وہ یہی ہیں کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا: خدا ان پر لعنت کرتا ہے اور دوسرے لعنت کرنیوالے بھی لعنت کرتے ہیں۔

یوسف بن محمد بن زیاد اور علی بن محمد بن سیار بیان کرتے ہیں کہ ہم دونوں نے امام حسن عسکریؑ سے کہا: ہمارے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاروت و ماروت فرشتے ہیں۔ جب انسانوں میں گناہوں کی کثرت ہوگئی تو ملائکہ نے ان کو منتخب کیا اور خدا نے ان کو ایک تیسرے فرشتہ کے ساتھ دنیا میں بھیجا۔ یہاں وہ زہرہ کے جمال پر مفتون ہوگئے اور پھر شراب پی، اس سے زنا کیا اور ایک شخص کو ناحق قتل بھی کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کو چاہ بابل میں عذاب دے رہا ہے۔ جادوگر وہاں جاکر ان سے سحر سیکھتے ہیں۔ نیز یہ کہ خدا نے اس عورت کو مسخ کردیا اور وہ ستارۂ زہرہ کی شکل میں آسمان پر موجود ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: معاذ اللہ! ملائکہ تو اللہ کے خاص لطف کے سہارے کفر اور دوسری برائیوں سے بالکل بری ہیں۔ جیسا کہ خدا نے ان کے بارے میں فرمایا:

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ .

(سورۂ تحریم۔ آیت ۶)

اللہ ان کو جو حکم دیتا ہے وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے

اس نے یہ بھی فرمایا ہے:

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ .

(سورۂ انبیاء۔ آیت ۱۹)

جو فرشتے آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ اسی کے بندے ہیں۔ ان میں جو اس کی سرکار میں ہیں وہ اس کی عبادت میں شیخی نہیں کرتے۔

ملائکہ ہی کے بارے میں فرمایا:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ .

(سورۂ انبیاء۔ آیت ۲۶-۲۷)

بلکہ وہ خدا کے معزز بندے ہیں۔ جو بات میں اس پر پہل نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر ہی عمل کرتے ہیں۔

آپ نے مزید فرمایا: اللہ تعالیٰ فرشتوں کو زمین پر اس لیے نہیں بھیجتا کہ وہ یہاں آکر امام اور حاکم بن جائیں، بلکہ ان کو خدا کے نبیوں کے پاس اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ وہ ان کو اپنے رب کے پیغامات پہنچایا کریں۔ تب سائل نے کہا: اس کے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ابلیس فرشتہ نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا: نہیں! وہ ایک جنّ تھا۔ کیا تم نے خدا کا یہ قول نہیں سنا کہ:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ . كَانَ مِنَ الْجِنِّ .

(سورۂ کہف۔ آیت ۵۰)

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جو جنّوں میں سے تھا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ امام حسن عسکریؑ نے فرمایا: جو شخص اپنے مسلمان بھائیوں کے حقوق کو سب سے زیادہ پہچانتا ہو اور ان کے ادا کرنے میں سب سے زیادہ

کوشاں ہو، خدا کے نزدیک وہ سب سے بلند مرتبہ پر ہوتا ہے اور جو شخص اس دنیا میں اپنے مسلمان بھائیوں کے سامنے انکساری کرتا ہے وہ خدا کے ہاں صدیقین اور امام علیؑ بن ابی طالبؑ کے سچے پیروکاروں میں سے ہوگا۔ جو شخص محفل میں معمولی جگہ پر بیٹھنے سے مطمئن ہو تو جب تک وہ وہاں سے اٹھ نہ جائے، خدا اور اس کے فرشتے اس کو برابر آفرین کہتے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: انسانوں میں شرک کا موجود ہونا، رات میں ایک سیاہ جگہ پر چیونٹی کے چلنے سے بھی زیادہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ نیکوکاروں کی نیکوکاروں سے محبت ان کے لیے باعثِ ثواب ہے۔ بدکاروں کی نیکوکاروں سے محبت نیکوکاروں کے لیے باعث فضیلت ہے۔ بدکاروں کا نیکوکاروں سے دشمنی رکھنا بدکاروں کے لیے باعثِ ذلّت ہے۔

اپنے پاس سے گزرتے ہوئے شخص پر سلام کرنا اور محفل میں معمولی جگہ بیٹھنا انکساری اور کسی بات پر خوش ہوئے بغیر ہنسنا جہالت ہے۔

آپ نے شیعوں کے ایک گروہ سے فرمایا: میں تم کو ہدایت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اپنے دین میں خدا کے خوف کو مدّنظر رکھو، گفتار میں سچائی اختیار کرو، نماز میں سجدوں کو طول دیا کرو اور ہمسائے کا خیال رکھا کرو۔ یہی وہ احکام ہیں جو رسول اللہؐ لے کر آئے: اپنے قرابتداروں سے نیک سلوک کیا کرو۔ اپنے لوگوں کے جنازوں میں شرکت کیا کرو۔ تم میں جو بیمار ہوں ان کی عیادت کیا کرو اور لوگوں کے حقوق ادا کرتے رہا کرو۔ اگر تم میں کوئی ایسا ہوگا جو اپنے دین میں خدا کا خوف رکھے، اپنی گفتار میں سچّا رہے، لوگوں کی امانتیں ادا کرتا رہے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور جب کہا جائے کہ یہ میرا شیعہ ہے تو اس سے مجھ کو خوشی ہوگی۔ اللہ سے ڈرو اور اس طرح ہمارے لیے باعث زینت بنو نہ کہ باعث رسوائی بنو۔ ساری محبت ہماری طرف مرکوز کرو اور ہم کو ہر برائی سے دور سمجھو۔ کیونکہ ہمارے بارے میں جو بھی خوبی بیان کی جائے ہم اس کے سزاوار ہیں اور ہمارے متعلق جو برائی بیان کی جائے ہم اس سے پاک ہیں۔ ہمارے حق کا ذکر قرآن میں ہے۔ ہماری قرابت رسول اللہؐ سے ہے۔ ہماری پیدائش پاک ہے اور ہمارے علاوہ جو بھی یہ دعوے کرے وہ جھوٹا ہے۔

آپ نے ان لوگوں سے مزید فرمایا: صرف روزہ اور نماز کی کثرت ہی کا نام عبادت

نہیں بلکہ اللہ کے معاملہ میں غور کرتے رہنا بھی عبادت ہے۔ بہت برا ہے وہ شخص کہ جس کے دو چہرے اور دو زبانیں ہوں۔ یعنی اپنے بھائی کے سامنے اس سے خوش ہوتا ہو اور پیٹھ پیچھے اس کو کھا جانے کو تیار ہو۔ اگر اس کے بھائی کے پاس مال آئے تو اس سے حسد کرتا ہو اور اگر وہ کسی مشکل میں پڑ جائے تو اس کو چھوڑ کر چل دے۔ غصہ تمام برائیوں کی کنجی ہے اور انسانوں میں سب سے کم راحت پانے والا وہ ہے جو کینہ پرور ہو۔ لوگوں میں سب سے بڑا زاہد وہ ہے جو حرام سے دور رہتا ہو۔ جو نیکی بوتا ہے وہ نیک نامی حاصل کرتا ہے اور جو برائی بوتا ہے وہ رسوائی پاتا ہے۔ احمق کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے اور دانشمند کا منہ اس کے دل میں ہوتا ہے۔

آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا: رزق مل جانے کی ضمانت کے باعث تم کو محنت سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ جو طہارت کے معاملہ میں حد سے آگے بڑھتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو اس کا خیال ہی نہیں کرتا۔ حق سے روگردانی کرنے والا باعزت بھی ہو تو وہ رسوا ہو جائے گا اور حق کو اختیار کرنے والا اگر ذلیل بھی ہو تو وہ معزز ہو جائے گا۔ دو خصلتوں سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں یعنی اللہ پر ایمان رکھنا اور مسلمان بھائیوں کو فائدہ پہنچانا۔ بچپن میں اپنے باپ پر بیٹے کی جرأت بڑے سن میں سرکشی تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک رنجیدہ شخص کے سامنے اظہار مسرت اچھا فعل نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا: جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو پوشیدہ طور پر نصیحت کرتا ہے وہ اس کی عزت بڑھاتا ہے اور جو اس کو علانیہ نصیحت کرتا ہے وہ اس کو گویا رسوا کرتا ہے۔ مومن کے لیے کوئی ایسی خواہش کرنا بہت برا فعل ہے جو اس کو ذلیل کر دے۔ نعمت کو صرف وہی پہچانتا ہے جو اس کا شکر ادا کرے اور اس کا شکر وہی ادا کرتا ہے جو اس کو پہچانتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے مانگنے سے پرہیز کرو کیونکہ ہر روز کے لیے نیا رزق مقرر ہوتا ہے۔ مانگنے میں اصرار کرنا آبرو کو زائل کر دیتا ہے اور ذلت اور تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ پس صبر سے کام لو۔ یہاں تک کہ اللہ تمہارے لیے کوئی ایسا راستا کھول دے کہ جس سے تم کو آسانی حاصل ہو جائے۔ جو پھل ابھی تم کو نہیں ملا اس کے لیے جلدی مت کرو اور یقین رکھو کہ تمہارا کارساز اس وقت سے خوب واقف ہے۔ جب وہ پھل تمہارے

حال کے لیے مناسب ہے۔ ہاں تو اپنے تمام معاملات میں اس کے علم پر بھروسہ رکھو اس سے تمہاری حالت درست ہو جائے گی۔ اپنی حاجتوں کے معاملہ میں ان کے برآنے سے پہلے جلدی مت کرو، ورنہ تمہارا سینہ تنگ اور تمہارا دل رنجیدہ ہو جائے گا اور تم پر مایوسی چھا جائے گی۔

آپ فرمایا کرتے: جو کوئی باطل کی پیٹھ پر سواری کرے گا، وہ اس کو رسوائی کی طرف لے جائے گی۔ اللہ کی قدرت کے مقرر کیے ہوئے امور کو انسانی طاقت کے ذریعے دور نہیں کیا جا سکتا؛ جو رزق لکھا ہوا ہے نہ اس کو لالچ کے سہارے حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے توجہ ہٹا کر اس کو روکا جا سکتا ہے۔ تمہارے لیے مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس بات سے باز رہو جو تم دوسرے سے ناپسند کرتے ہو۔ تمہارا بہترین بھائی وہ ہے جو تمہاری غلطی کو بھول جائے اور تمہاری نیکیوں کو یاد رکھے۔ اس دشمن کی چال سب سے کمزور ہے جو اپنی دشمنی کو ظاہر کر دے۔ جو کوئی اللہ سے انس رکھتا ہے وہ انسانوں کی محفل سے گھبراتا ہے اور اللہ سے اس کی انس کی پہچان یہی اس کا انسانوں کی محفل سے گھبرانا ہے۔ ساری برائیاں ایک گھر میں بند کر دی گئی ہیں اور جھوٹ اسکی کنجی ہے۔

اس طرح کے اور پند و نصائح بھی ہیں کہ جن سے آپ اپنے اصحاب اور عوام الناس کو آگاہ فرماتے تھے۔ اس راہ میں آپ ہر وہ کوشش کرتے تھے جو آپ کے لیے ممکن ہوتی تھی، تاکہ آپ ایسے اخلاق اور ایسی صفات کو پیش کرتے رہیں جن کا اختیار کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور جو دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں زیادہ مؤثر ہیں۔ دراصل اس زمانے میں آپ کی ذات مقدس اہلبیتؑ کے اخلاق، تعلیمات اور سیرت کے اسی نمایاں پہلو کا نمونہ تھی جس کے سامنے ان افراد کی اصلیت اور ان کا کھوکھلا پن واضح ہو جاتا ہے جو اسلام کے نام سے حکومت کیا کرتے تھے جبکہ تمام دوسری قوموں کے لوگ جو ان کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے رہے، ان کے نزدیک وہی فرمانروا اسلام کا نمونہ مانے جاتے تھے۔ پس اگر میں یہ کہوں تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ ماضی و حال کے زمانوں میں اسلام کا اپنی راہ میں ٹھوکر بن کھاتے رہنا اور غیروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پسماندگی اسلام کی اسی غبار آلود شکل کا نتیجہ ہے، جو ان اسلام کے سرکش حکمرانوں نے

اپنے پیچھے چھوڑی اور جو ہمارے آج کے زمانہ تک آنے والے افراد ایک دوسرے سے حاصل کرتے چلے آرہے ہیں۔ اگرچہ وہ لوگ حکومت تو اسلام ہی کے نام پر کرتے تھے اور اور اپنی زبانوں پر اسلام کا تذکرہ بھی جاری رکھا کرتے تھے لیکن اپنے دلوں کے اندر وہ اس کے بدترین دشمن اور سخت ترین بدخواہ تھے۔

امام حسن عسکریؑ کی شہادت

روایات اس پر متفق ہیں کہ آپ کی شہادت ۲۶۰ھ میں واقع ہوئی جب کہ خلیفہ معتمد عباسی (احمد بن جعفر متوکل) کے چار سال گزر چکے تھے۔ آپ کے فرزند محمدؑ (مہدی المنتظرؑ) کے علاوہ آپ کی اولاد میں کوئی اور بیٹا بیٹی نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے ان کی امامت، طول حیات اور ایک طویل غیبت کے بعد ان کے ظہور کی واضح خبر دیدی تھی۔ نیز یہ کہ وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جو ان کے ظہور سے قبل ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی جیسا کہ ان کے جد امجد رسول اکرمؐ نے اور ان کے بعد امام المنتظرؑ کے تمام آبائے کرام یعنی ائمہ طاہرینؑ یکے بعد دیگرے صراحت کرتے چلے آئے تھے، یہاں تک کہ ان کے والد بزرگوار امام حسن عسکریؑ کا زمانہ آگیا اور آپ نے بھی ان کی امامت، غیبت اور ظہور کے بارے میں اسی طرح وضاحت فرمائی جیسے ہر امامؑ نے اپنے اپنے جانشین کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ امام القائم کی آمد کا اعلان کیا تھا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ امام حسن عسکریؑ کی شہادت ماہ ربیع الاول کے پہلے پندھرواڑے میں واقع ہوئی اور اس سے متصل آٹھ روز تک آپ بیمار رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی بیماری معتمد عباسی کے معاندانہ اقدام کا نتیجہ تھی کیونکہ اس نے ایک آدمی کے ذریعہ سے آپ کے کھانے میں زہر ڈلوادیا تھا۔ یہ ان شیعہ علماء اور محدثین کی رائے ہے جس کا ماخذ وہ روایت ہے جو بعض محدثین نے امام جعفر صادقؑ سے لی ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم میں سے ہر فرد کو یا تو قتل کیا جائے گا یا زہر دیا جائے گا۔ اس بنیاد پر اکثر لوگوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ تمام ائمہ کرامؑ کو دشمنی اور فریب سے شہید کیا گیا اور یہ کہ ان میں سے جو تلوار سے قتل نہیں ہوئے وہ زہر سے مارے گئے۔ میں اس فعل کو ان حکمرانوں سے بعید نہیں سمجھتا ہوں، جو ان ہستیوں سے

اپنے تخت ہائے حکومت کے بارے میں ڈرتے رہتے تھے، جبکہ تاریخ میں بھی اس کے ثبوت بھرے پڑے ہیں۔ چنانچہ جب خلیفہ ہارون اور اس کے بیٹے مامون کے درمیان امام موسیٰ بن جعفرؑ کے بارے میں ایک گفتگو ہوئی تھی تو اس نے مامون سے کہا تھا کہ اگر تم بھی حکومت کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑا کرو گے تو میں تمہاری آنکھیں نکال لونگا۔ پھر اس بات میں کچھ شک نہیں کہ عباسی حکمران ائمہ اہلبیتؑ سے اپنے تخت حکومت کے بارے میں خطرہ محسوس کرتے تھے اور ان سے ڈرتے رہتے تھے اور ان شکایتوں سے جھٹ متاثر ہو جاتے تھے جو ان کو اہلبیتؑ کے دشمنوں اور خود ان کے عمال حکومت کے ذریعہ سے پہنچتی تھیں۔ ان وجوہ کی بنا پر ائمہ کرامؑ کو ان حکمرانوں کے زیر نظر جبری طور پر بغداد اور سامرا میں رکھا جاتا تھا اور ان کو ہر طرح کی دھمکیوں، سختیوں، تکلیفوں اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ وقتاً فوقتاً قید و بند کی مصیبتیں اٹھانا پڑتیں جو محض بہتان اور ابہام کی وجہ سے ان پر ڈال دی جاتی تھیں۔ تاہم صرف یہی واقعات اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ امام حسن عسکریؑ اور بعض دیگر ائمہؑ زہر سے مارے گئے بلکہ وہ روایات جو آپ کی شہادت کے بارے میں ہیں اور جن پر آپ کی سیرت لکھنے والوں نے اعتماد کیا ہے وہ بھی اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتیں۔ ان میں سب سے مشہور روایت وہ ہے جو راویوں نے احمد بن عبیداللہ بن خاقان کی سند سے بیان کی ہے کہ جس کا باپ معتمد کا وزیر تھا۔ اس روایت کا پہلا حصہ ہم امام حسن عسکریؑ کے بارے میں حکمرانوں کے رویہ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ کہ جو آپ کی شہادت سے متعلق ہے اور کلینی، مفید اور صدوق نے بھی اپنے بیان میں اسی پر اعتماد کیا ہے وہ یہ ہے۔

"احمد بن عبیداللہ خاقان کا بیان ہے کہ امام حسن بن علیؑ کی شہادت کے وقت خلیفہ معتمد اور اس کے امرائے حکومت پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اس سے مجھ کو تعجب ہوا اور مجھے خیال بھی نہ تھا کہ ایسا ہوگا چنانچہ جب امام حسن عسکریؑ بیمار ہوئے اور میرے والد کو اطلاع ملی تو وہ فوراً ہی سوار ہوئے اور قصر خلافت پہنچے۔ جب وہ وہاں سے واپس آئے تو ان کے ساتھ خلیفہ کے پانچ غلام تھے جو سب کے سب اس کے خاص آدمی تھے جن کو اس نے امام حسن عسکریؑ کے مکان پر رہنے کا حکم دیا تھا۔ پھر کچھ طبیبوں کو بلوایا اور ان کو حکم دیا کہ وہ یکے بعد دیگرے

ان کے پاس رہیں اور صبح و شام ان کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ اس کے دو یا تین روز بعد میرے والد کو اطلاع ملی کہ امامؑ کا ضعف بڑھ گیا ہے۔ تب وہ سوار ہو کر صبح سویرے ہی انکی خدمت میں پہنچ گئے اور طبیبوں کو حکم دیا کہ ان کے گھر پر ہی رہیں۔ اس کے بعد انھوں نے قاضی القضاۃ کو حکم دیا کہ وہ دس ایسے افراد کہ جن کی دینداری اور پارسائی پر ان کو بھروسہ ہو ان کو امام حسن بن علیؑ کے مکان پر رات دن رہنے کا حکم دیدیں۔ چنانچہ قاضی القضاۃ نے ان آدمیوں کو بھیج دیا اور پھر وہ امامؑ کے گھر پر رہے یہاں تک کہ آپ کی شہادت ہوگئی۔

احمد بن عبید اللہ بن خاقان مزید بیان کرتا ہے کہ جیسے ہی امام حسن عسکری کی شہادت کی خبر پھیلی، سارا سامرا شہر یک زبان ہو کر رونے پیٹنے لگا اور کچھ لوگ آپ کے جنازہ کی تیاری میں لگ گئے۔ شہر کے بازار بند ہوگئے اور بنی ہاشم، فوجی افسران، امرائے دربار، قاضیان عدالت اور تمام دوسرے لوگ آپ کے جنازے کی طرف چل پڑے۔ سامرا شہر میں اس روز قیامت کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ جب لوگ آپ کا جنازہ تیار کر چکے تو خلیفہ معتمد نے ابو عیسیٰ بن متوکل کو ان کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کہلا دیا۔ جب جنازہ لا کر رکھ دیا گیا تو ابو عیسیٰ نے امامؑ کا چہرہ کھول دیا اور علویوں، ہاشمیوں، عباسیوں، فوجی افسروں، درباریوں اور قاضیوں کو دکھا کر کہا کہ یہ امام حسنؑ بن علیؑ بن محمد الرضاؑ ہیں کہ جو اپنے بستر پر قضائے الٰہی سے فوت ہوئے ہیں۔ ان کی تیمارداری امیر المومنین معتمد کے فلاں فلاں غلام اور فلاں فلاں طبیب کرتے رہے ہیں۔ پھر اس نے ان کا چہرہ مبارک ڈھک دیا اور پانچ تکبیروں کے ساتھ ان کی نماز جنازہ پڑھا کر ان کو وہاں سے اٹھائے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ امامؑ کے جسد اطہر کو وہاں سے اٹھایا گیا اور پھر انہی کے مکان میں انکو اسی حجرے میں دفن کر دیا گیا جہاں اس سے پہلے ان کے والد بزرگوار امام علی الہادیؑ دفن ہوئے تھے۔

راوی کہتا ہے کہ محمد بن عبید اللہ نے اس پر اضافہ بھی کیا کہ جب امام حسن عسکریؑ دفن ہوگئے تو ان کے بھائی جعفر نے میرے باپ کے پاس آ کر کہا: مجھ کو میرے والد اور بھائی کا مرتبہ عطا کر دیجیے، اس کے عوض میں آپ کو بیس ہزار دینار سالانہ ادا کیا کروں گا۔ میرے والد نے اس کو جھڑک دیا اور پھر کہا: اے نادان! خدا خلیفہ کی شوکت میں اضافہ

کرے کہ اس نے ان لوگوں پر کوڑے برسائے اور تلواریں چلائیں کہ جو تمہارے باپ اور بھائی کو اپنا امام مانتے تھے۔ اس نے چاہا کہ وہ ان کو اس عقیدے سے باز رکھے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا اور پھر اس نے یہ کوشش بھی کی کہ تمہارے باپ اور بھائی کو امامت کے اس منصب سے ہٹا دے، لیکن وہ یہ بھی نہیں کرسکا۔ پس اگر تم اپنے باپ اور بھائی کے پیروکاروں کے نزدیک امام ہو تو پھر تمکو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ خلیفہ یا کوئی اور تم کو ان دونوں کے بعد امامت عطا کرے اور اگر تم کو ان کے نزدیک یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے تو تم اس کو ہرگز حاصل نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد میرے باپ نے جعفر کو بہت شرمندہ کیا اور حکم دیا کہ اس کو مجھ سے دور ہی رکھا جائے۔ چنانچہ اس کو پھر کبھی ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی، یہاں تک کہ میرے باپ نے وفات پائی۔

پھر جس کسی نے بھی امام ابو محمد حسنؑ بن علیؑ کی شہادت کو بیان کیا، اس نے اس روایت کا ضرور ذکر کیا ہے جس میں امامؑ کے مرض شہادت اور اس میں خلیفہ کے طرز عمل کا ذکر ہے۔ حتیٰ اینکہ وہ لوگ جو اس بات کے قائل ہیں کہ آپ کو زہر دیا گیا تھا انہوں نے بھی آپ کی شہادت کے ذکر کی ابتدا میں اس روایت کو بیان کیا ہے۔ اسکے باوجود بھی یہ لوگ اس ضعیف روایت پر اعتماد کرتے ہیں کہ جس میں راوی کہتا ہے: امام جعفرؑ نے فرمایا ہے کہ ہم میں سے ہر فرد یا قتل کیا جائے گا یا اس کو زہر دیا جائے گا۔" تاہم وہ یہ بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر بھلا دیتے ہیں کہ خود احمد بن عبیداللہ کی یہ روایت ہی اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ معتمد عباسی اپنی تمام حیلہ سازی کے باوصف امام حسن عسکریؑ کے خون سے بری الذمہ نہیں ہے اور اس پر یہ الزام اسی روز عائد کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان ایام میں جبکہ امام صاحب فراش تھے وہ اپنے رویہ سے خود کو اس سے بری کرانے کی کوشش کررہا تھا۔ اگر یہ بات نہ تھی تو کیوں اس نے امامؑ کی بیماری کی خبر ملتے ہی اپنے وزیر کے ذریعے اپنے خاص آدمیوں اور طبیبوں کو آپ کے مکان پر حاضر رہنے کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح اس نے قاضی القضاۃ کو کیوں حکم دیا کہ وہ دس دیندار اور پارسا افراد کو رات دن امامؑ کے مکان پر مامور رکھے۔ پھر کیوں ابو عیسیٰ نے امامؑ کا چہرہ کھول کر علویوں، ہاشمیوں، عباسیوں، فوجی افسروں اور قاضیوں کو دکھایا اور کہا کہ

آپ کی وفات طبعی طور پر ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر خلیفہ اس جرم میں ملوث نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا اور پھر یہ کہ اس کی طرف اسی روز انگلیاں اٹھ رہی تھیں اور اصل حقیقت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اکمال الدین شیخ صدوق میں ابوالادیان سے روایت آئی ہے کہ اس نے کہا: میں امام حسنؑ بن علیؑ کی خدمت کیا کرتا تھا اور آپ کے خطوط دوسرے علاقوں میں لیجاتا تھا۔ چنانچہ جس بیماری کے باعث آپ نے شہادت پائی، اس کے دوران میں جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے کئی خط لکھے اور فرمایا: تم ان کو مدائن لے جاؤ۔ تب میں آپ کے وہ خطوط لے کر گیا اور ان کے جواب لیکر پندرھویں روز سامرا واپس آیا۔ وہاں آکر دیکھتا کیا ہوں کہ امامؑ کے گھر میں شور ماتم ہے۔ دروازہ پر آپ کا بھائی جعفر بن علیؑ بیٹھا ہے۔ بہت سے شیعہ ان کے گرد جمع ہیں جو آپ کی شہادت پر اس کو پرسا دے رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مبارکباد بھی دے رہے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر اب یہ جعفر ہی امام ہے تو پھر امامت کا حال اور سے اور ہو جائے گا۔ اتنے میں عقید نامی غلام نے باہر آکر جعفر سے کہا: اے آقا! آپ کے بھائی کو غسل وکفن دیدیا گیا ہے، اب آپ ان پر نماز پڑھ لیجیے۔ تب وہ شیعوں کے جلو میں گھر کے اندر آگیا۔ جب وہ امام حسن عسکریؑ کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھا لیکن ابھی تکبیر کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ایک صاحبزادے تشریف لائے۔ ان کا چہرہ گندمی رنگ کا، کھڑے چھوٹے بال اور دانت چھدرے تھے۔ انہوں نے جعفر ابن علیؑ کی چادر کا پلّو کھینچ کر کہا: چچا جان! آپ ہٹ جائیے، میں اپنے والد کا جنازہ پڑھانے کا آپ سے زیادہ حقدار ہوں۔ یہ سنکر جعفر ہٹ تو گیا لیکن اس کا چہرہ خاصا مکدّر ہو گیا۔ پس ان صاحبزادے نے آگے بڑھ کر آپ پر نماز پڑھائی اور پھر آپ کو اپنے والد امام علی نقیؑ کے برابر میں دفن کر دیا گیا، جہاں پر آپ دونوں ائمہؑ کے مزار زیارت گاہ خلائق اور شیعیان اہلبیتؑ کے لیے جائے پناہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ ان سے برکت حاصل کرتے ہیں اور ان کی حرمت کا واسطہ دے کر خدا سے اپنے لیے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی رحمت ان کے شامل حال کرے، حق و ہدایت پر قائم رکھے اور ان اہلبیت کرامؑ کے قدم بہ قدم چلنے کی توفیق عطا فرمائے، جن کو اس نے ہر قسم کی برائی سے اس طرح پاک رکھا کہ جو پاک رکھنے کا حق ہے۔

امام محمد مہدیؑ

امام ابوالقاسم محمدؑ بن حسنؑ جو اس امت کے مہدیؑ اور اس کی آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز ہیں اور جو اس دنیا کو اس وقت عدل و انصاف سے بھر دیں گے جبکہ یہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔ آپ ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ میں خلیفہ معتز عباسی کے عہد میں پیدا ہوئے اور آپ کی پیدائش سے ایک ماہ بعد مہتدی کو خلافت مل گئی تھی۔

بیشتر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے والد امام حسن عسکریؑ کی شہادت ہوئی تو آپ کی عمر پانچ سال تھی۔ اللہ نے اس کم سنی میں آپ کو حکمت عطا کی اور آپ کو مسلمانوں کے لیے امام اور عالمین کے لیے نشانی قرار دیا۔ جس طرح حضرت عیسیٰؑ کو اس وقت نبوت عطا کی جب وہ گہوارے ہی میں تھے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک روز امام عسکریؑ کی پھوپھی حکیمہ خاتون آپ سے ملنے آئیں۔ جب وہ جانے لگیں تو امامؑ نے ان سے درخواست کی کہ آج رات یہیں قیام فرمائیں۔ پھر ان کو بتایا کہ ان کی زوجہ بی بی نرجس کے یہاں ولادت ہونے والی ہے حالانکہ ان پر حمل کے آثار چنداں نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ راویوں کا بیان ہے کہ امام حسن عسکریؑ اور ان کی پھوپھی حکیمہ خاتون کے مابین طویل گفتگو ہوئی اور پھر وہ رات بھر کے لیے آپ کی زوجہ کے پاس رک گئیں۔ چنانچہ نیمۂ شعبان کو صبح صادق سے قبل جب بی بی نرجس سونے سے

جاگیں تو ان پر وضع حمل کی کیفیت طاری تھی اور امام حسن عسکری کی پھوپھی حکیمہ خاتون کے ذریعے سے یہ ولادت تکمیل کو پہنچی۔ اس کے بعد امامؑ نے ابو عمر عثمان بن سعید کو حکم دیا کہ وہ چند گوسفند لے کر آپ کی طرف سے اس فرزند کا عقیقہ کر دیں۔ مزید یہ کہ ایک بڑی مقدار میں گوشت اور روٹی لے کر غریبوں کو کھلائیں۔ چنانچہ عثمان بن سعید نے امامؑ کے احکام کی تعمیل اسی طرح سے کی جس طرح کہ آپ چاہتے تھے۔

امام مہدی محمدؑ بن حسنؑ کی والدہ گرامی ایک رومی خاتون تھیں، جن کو سوسن، نرجس، ریحانہ اور صقیلہ کہا جاتا تھا اور غالباً امامؑ کے گھرانہ میں وہ نرجس کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔ نیز خود امامؑ بھی اکثر و بیشتر ان کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ امام علی نقیؑ نے اپنا ایک خاص آدمی بغداد میں اس جگہ بھیجا جہاں غنیمت کا مال آیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے بی بی نرجس کو وہاں سے خریدا اور ان کو امام علی نقیؑ کے پاس لے آیا۔ تب آپ نے ان کی تزویج اپنے بیٹے امام حسن عسکریؑ سے فرمادی۔ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ امام علی نقیؑ کی حقیقی بہن حکیمہ خاتون نے ان کی تزویج اپنے بھتیجے حسن عسکریؑ سے کرادی تھی۔

بی بی نرجس کے متعلق جو روایات وارد ہوئی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ یہ روم کے شاہی خاندان سے تھیں اور ان کی والدہ شمعون الصفا کی اولاد میں سے تھیں۔ ان کے دادا قیصر روم نے یہ ارادہ کیا کہ وہ ان کی تزویج اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دے اور پھر اس مقصد سے اس نے بہت سارے مہمان بھی بلا لیے لیکن تزویج کی رسم شروع ہونے سے پہلے ہی صلیب گر پڑی، ستون ٹوٹ گئے اور پوری تخت گاہ نیچے آرہی۔ اس بات کو ان کے دادا قیصر روم اور ان مذہبی پیشواؤں نے ایک بدشگونی خیال کیا، جو تزویج کی رسوم ادا کرنے کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے، اس گھبراہٹ میں انہوں نے کوئی رسم ادا کیے بغیر ہی وہ اجتماع ختم کر دیا تھا۔

بعض روایتوں میں اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بی بی نرجس نے خواب میں دیکھا کہ ان کے دادا کے یہاں ایک اجتماع ہو رہا ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواری شمعون بھی موجود ہیں۔ نیز پیغمبر عرب محمد رسول اللہؐ بھی اپنے جانشین بیٹوں کے ساتھ وہاں تشریف

فرماہیں کہ جن میں ابو محمد حسن عسکریؑ بھی موجود ہیں۔ اس وقت نبی اکرمؐ نے اپنے فرزند حسن عسکریؑ کے لیے حضرت عیسیٰؑ سے بی بی نرجس کا رشتہ طلب کیا جس کو انھوں نے منظور کرلیا اور ان دونوں کی تزویج ہوگئی۔ پھر یہ طویل حدیث اس بیان پر ختم ہوتی ہے کہ امام ابو محمد حسن عسکریؑ نے ایک رات خواب میں بی بی نرجس کو بتایا کہ ان کا دادا عنقریب مسلمانوں سے جنگ کے لیے ایک لشکر بھیجنے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان سے کہا کہ وہ بھی اس لشکر کے ساتھ آجائیں۔ پس وہ آپ کے حکم کے مطابق اس لشکر کے ساتھ آئیں اور مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی بن کر بغداد آگئیں۔ ادھر امام علی نقیؑ نے ایک آدمی وہاں بھیج دیا، جو بی بی نرجس کو ایک تاجر سے خرید کر کے سامرا لے آیا جہاں امامؑ مقیم تھے۔ تب آپ نے ان کے اس مبارک بچہ کے پیدا ہونے کی بشارت دی، جو مہدی منتظر ہوں گے اور وہ اس دنیا پر قبضہ و اختیار حاصل کر کے اس کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔

ہم نے اس حدیث کو مختصراً لکھ دیا ہے کیونکہ اس کو اسی طرح سے حرف بہ حرف نقل کرنے سے کوئی خاص فائدہ نہ تھا، جس طرح یہ حدیث کی کتابوں میں وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو شیخ صدوق نے اکمال الدین میں، شیخ طوسی نے الغیبۃ میں، علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اور دوسرے محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے، جہاں ان لوگوں نے فربہ و لاغر اور صدف و خزف کو برابر رکھ دیا ہے۔ نیز اس حدیث کے بعض حصے ایسے بھی ہیں جو قصہ گویوں کے گھڑے ہوئے ہیں، کیونکہ اس کے راوی وہ غیر معروف افراد ہیں کہ جن کا علم رجال کی کتابوں میں ذکر تک نہیں ہے۔

بہر حال معتبر راویوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بی بی نرجس کو امام ابو محمد حسن عسکریؑ کے لیے اس جگہ سے خریدا گیا تھا جہاں جنگی قیدی فروخت کیے جاتے تھے۔ وہ نیک اور پارسا خواتین میں سے تھیں اور ان کا وہ حمل کہ جس سے امام المنتظرؑ پیدا ہوئے تھے، بعض ایسی عورتوں سے بھی پوشیدہ رہا جو ان سے اکثر ملتی رہتی تھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت ہی یہ تھی کہ وہ ایک ایسے پاکیزہ اور معزز ہستی کی ماں بنیں کہ جس کی حیات سے قوموں کے ذہن و دماغ حیران رہ جائیں اور پھر ان پر صرف وہی لوگ ایمان

لائیں جو ان کے جد امجد محمد رسول اللہؐ اور ان کے آباء یعنی ائمۂ ہدیٰؑ پر ایمان رکھتے ہوں۔ پس وہ پردۂ غیبت سے اس روز باہر تشریف لائیں گے جب اللہ تعالیٰ ان کو اس کی اجازت دے گا۔ تب وہ دنیا کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔

مذاہب عالم میں مہدیؑ کا تصوّر

محدثوں، ادیبوں اور شاعروں نے مہدی کا لفظ ہر اس فرد کے لیے استعمال کیا ہے جو ہدایت اور اصلاح کا فرض ادا کرتا ہو اور حق، نیکی اور صراط مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہو۔ اسی طرح نبی اکرمؐ نے بھی اس لفظ کو انہی معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے بعض مواقع پر مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اگرچہ تم ایسا نہیں کرو گے تاہم اگر تم علیؑ کو اپنا حاکم قرار دو گے تو تم ان کو ایسا ہادی اور مہدی پاؤ گے جو تم کو صراط مستقیم پر لے جائے گا۔

اسی طرح امام جعفر صادقؑ نے بھی بارہ اماموں کی شان میں یہی لفظ استعمال فرمایا، جیسا کہ ابوبصیر سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم میں بارہ مہدی ہوں گے جن میں سے چھ تو ہو چکے اور چھ ابھی باقی ہیں اور اس چھٹے کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیّت کو پورا کرے گا۔ مزید یہ کہ امام جعفر صادقؑ کے علاوہ دیگر ائمہؑ نے بھی اس امر کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ ایک بار جب امام صادقؑ سے پوچھا گیا کہ: کیا آپ ہی اہلبیتؑ کے مہدی ہیں؟ تب آپ نے فرمایا: ہم سب کے سب مہدی ہیں اور ہم حق اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

بہت سے شعراء نے اموی اور عباسی حکمرانوں کے لیے خوشامد اور چاپلوسی سے مہدی کا لفظ استعمال کیا تاکہ ان سے اچھے عطیے اور انعام حاصل کریں۔ اسی طرح بعض تابعین نے عمر بن عبدالعزیز کو مہدی کہا اور ان کو ائمۂ ہدایت میں شمار کیا ہے کیونکہ وہ اپنی سیرت اور طرز عمل میں راستی اور عدل پر کاربند رہے جبکہ ان سے پہلے کے حکمران ہر قسم کے ظلم و جور کا ارتکاب کرتے اور دین و اخلاق کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ امیر المومنین امام علیؑ نے مہدی کا لفظ صرف ائمۂ اہلبیت کے لیے مخصوص کر دیا اور

فرمایا: ہم اہلبیتؑ کو علم اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوا ہے۔ ہم نے اس میں پوشیدہ نکات بھی اللہ ہی سے حاصل کیے ہیں اور ہم نے وہ سچی باتیں سنی ہیں جو یقین سے بھری ہوتی ہیں۔ پس اگر تم لوگ ہمارے طور طریقے کی پیروی کرو گے تو ہم سے ہدایت حاصل کرو گے اور اور ہم سے سیکھی ہوئی دانش سے راہ راست اختیار کر سکو گے کیونکہ ہم نے حق اور ہدایت کا علم اٹھا رکھا ہے اور جو کوئی بھی اس کے ساتھ چلے گا منزل مقصود تک پہنچ جائے گا اور جو اس سے دور رہے گا وہ ضرور ڈوب جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی اکثر موقعوں پر ائمہ کرام اور ان افراد کے لیے جو حق، نیکی اور صراط مستقیم کی طرف دعوت دینے والے ہوں یہ لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ وہ مفہوم کہ جس میں یہ لفظ امام محمدؑ بن حسنؑ کا ایک ایسا اسم معرفہ قرار پا گیا ہے کہ اسکے استعمال سے خاص کر شیعوں میں امام زمانہ کے سوا کسی اور کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مہدی سے صرف ایک ایسا فرد مراد نہیں ہے جو ہدایت کا فرض ادا کرتا ہو اور اللہ، دینِ حق اور صراط مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہو، بلکہ ان صفات کے علاوہ اس سے یہ مراد بھی ہوتی ہے کہ آپ ظلم و جور کرنے والوں کے خلاف اقدام کریں گے اور دنیائے انسانیت کو ظالموں کی بالادستی، جور اور سختی سے اور اس طرح کی ان تمام مشکلات سے نجات دلائیں گے جن سے نوع بشر ہزارہا سال سے دوچار رہی اور ماضی سے زیادہ مستقبل میں دوچار ہونے والی ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے گا کہ جب اللہ تعالیٰ امام مہدیؑ کو اجازت دے گا اور آپ ظہور فرما کر اس دنیا کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دینگے جس طرح اس سے پہلے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ لفظ "مہدی" جو رسول اکرمؐ اور ائمہ کرامؑ کے ارشادات کی بنا پر شیعوں کے نزدیک ان کے بارھویں امام کا "اسم معرفہ" بن گیا ہے، یہ صرف شیعہ اعتقادات ہی تک محدود نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض عرب مصنفین نیز مستشرقین نے بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس دنیا کو مشکلات سے نجات دلانے والے ایک فرد کے آنے کا اعتقاد قدیم مذاہب میں بلکہ بعض ایسی قوموں میں بھی موجود رہا ہے جن کے مذاہب کو آسمانی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل بھی انسانیت کو آزادی اور نجات دلانے والے ایک ایسے فرد کے ظہور کی

بشارت دیتے رہے، جس کو اللہ تعالیٰ اس لیے بھیجے گا کہ وہ دنیائے بشریت کو پیش آنیوالی مشکلات سے نجات دلا دے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ پر ایمان لانے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ وہ اپنے دعوئے میں جھوٹے ہیں اور وہ سچا مسیح جو لوگوں کو نجات دلانے والا ہے، کسی اور وقت یا آخر زمانہ میں ظہور کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر افراد اس شخص کے ظہور کا انتظار کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بہت سے عیسائی بھی حضرت عیسیٰؑ کی واپسی کا انتظار کرتے ہیں تاکہ وہ دنیا کو بے انصافی اور خونریزی سے نجات دلائیں۔

ڈاکٹر احمد محمود صبحی اپنی کتاب "نظریہ الامامۃ عند الشیعہ الاثنیٰ عشریہ" میں کہتے ہیں کہ حبشہ کے مسیحی لوگ مدّت سے یہ انتظار کر رہے ہیں کہ ان کا ایک بادشاہ "تھیوڈور" آخر زمانہ میں مہدی کی حیثیت سے واپس آئے گا۔ پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عیسائیت کے علاوہ دوسرے مذہبوں میں بھی مہدی کے آنے کا تصور اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، جو مسلمانوں میں مہدیؑ کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مغلوں کا عقیدہ تھا کہ تیمور لنگ یا چنگیز خاں نے اپنی موت سے پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی قوم کو چین کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے ایک بار پھر یہاں واپس آئیں گے۔

ایرانی دیومالا کے مطابق مجوسی بھی زردشت کی اولاد میں سے اشیدر بابی کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی طرح قدیم مصری مذاہب میں، چینیوں کی کتابوں میں اور قدیم ہندوؤں کے عقیدۂ تناسخ میں بھی وہی آثار پائے جاتے ہیں جو پارسیوں کے نظریات میں پائے جاتے ہیں۔ نیز ایسی ہی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جو مختلف مذاہب کے عقائد سے متعلق عرب اور مستشرقین اہل علم کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے شیعوں میں عقیدۂ مہدیؑ کی ابتدا کے ضمن میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شیعوں نے یہ عقیدہ انہی قدیم قوموں سے لیا ہے جو اس خوش فہمی میں رہا کرتی تھیں کہ ایک ایسا شخص ضرور آئے گا جو ان کو جابر اور قاہر حکام کے ظلم و جور سے نجات دلا دیگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں: چونکہ شیعہ بھی اپنی تاریخ کی شروعات سے ایسے ہی حالات سے گزرتے رہے ہیں کہ جنہوں نے ان کو انہی پہلی قوموں کی طرح اس سوچ پر مائل

کر دیا تھا جو کبھی نہ کبھی آنے والے کسی ایسے شخص کا انتظار کیا کرتی تھیں جو ان کو حکمرانوں کے ظلم وجور سے نجات دلائے گا۔ چنانچہ شیعہ بھی اسی قسم کی بہت سی غلط فہمیاں پھیلاتے اور غلط بیانیاں کرتے رہے ہیں۔"

اگر ہم یہ بات مان بھی لیں کہ اسلام سے پہلے کے آسمانی مذہبوں نے ایک ایسے شخص کے آنے کی بشارت دی تھی جو انسانیت کو درپیش مصائب سے نجات دلائے گا جیساکہ بنی اسرائیل اور یہودیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے تو پھر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ انبیاءؑ نے آخری زمانہ کے اسی نجات دہندہ کے آنے کی خبر دی ہو، جس کی آمد کا محمد رسول اللہؐ نے اشارہ فرمایا ہے۔ کیونکہ انبیاء کرامؑ وحیِ آسمانی کی بنا پر آئندہ کے واقعات کی اطلاع دیتے تھے اور ہر نبی اپنے بعد آنے والے نبی کی خبر دیتا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے توریت میں حضرت عیسیٰؑ کے آنے کی خبر دی تھی۔ البتہ یہودیوں نے اس کو بدل ڈالا اور کہنے لگے کہ یہ تو جھوٹے مسیح ہیں اور جو سچے مسیح ہیں وہ آخری زمانہ میں آئیں گے۔ پھر عیسائیوں نے بھی اسی طرح سے محمد رسول اللہؐ کا انکار کیا اور انجیل کے اس فقرے کو بدل دیا جس میں آنحضرتؐ کے آنے کی بشارت دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ آپ کو جھٹلانے، انجیل کے الفاظ کو مسخ کرنے اور اس کے مفہوم میں تحریف کرنے کے تمام امکانی طریقوں سے کام لیکر اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔

المختصر کہ اگر یہ بات صحیح بھی ہو کہ انسانیت کو درپیش مصائب سے نجات دلانے اور مشکلوں سے نکالنے والے ایک شخص کے ظاہر ہونے کا عقیدہ قدیم قوموں میں موجود تھا اور اسلام میں یہ وہیں سے آیا ہے تو بھی یہ چیز ان مہدی منتظرؑ کے متعلق شیعی عقیدہ کے خلاف نہیں ہے، جن کے بارے میں نبی اکرمؐ نے بشارت دی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو اجازت دیگا تو وہ ظہور فرمائیں گے۔

البتہ یہ خیال کہ شیعوں میں مہدی کا عقیدہ اس وجہ سے در آیا ہے کہ ان کے معتقدات اور نظریات پر یہودیوں اور عیسائیوں کے خیالات کا غلبہ ہو گیا تھا، جیساکہ احمد امین نے اپنی کتاب ضحی الاسلام کی تیسری جلد میں لکھا ہے۔ تاہم ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی یہی کہتے ہیں جو تمام شیعہ عقائد کو مسخ کرنا چاہتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ

وہ مہدیؑ کے بارے میں ہوں یا ان کے دوسرے عقائد ہوں لیکن شیعہ عقائد کو یہود عیسائی نظریات سے ماخوذ بتانا ایک ایسا بے بنیاد تصور ہے جو علم اور عقل کے سامنے ٹھیرتا ہی نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد اس بغض کے علاوہ کچھ نہیں ہے جو قدیم ترین زمانوں سے اہلبیتؑ اور ان کے پیروکاروں کے خلاف ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتا چلا آرہا ہے جیسا کہ ہر اس شخص پہ واضح ہو جائے گا جو شیعیت کی تاریخ اور اس کے عہد بہ عہد کے حالات کا بے تعصبی اور خلوص سے مطالعہ کرے۔

بہرصورت جب مسلم معاشرے میں ظہور مہدیؑ کی احادیث ہر طرف پھیل گئیں اور یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ وہ اہلبیتؑ میں سے اور خاص کر فاطمہؑ بنت محمد عربیؐ کی اولاد میں سے ہوں گے تو امویوں نے خالد بن یزید بن معاویہ کے نام سے ایک سفیانی کی آمد کے بارے میں یہ حدیث تیار کروائی کہ آخر زمانہ میں وہ سفیانی ظہور کرے گا جو تمام ملکوں اور انسانوں پر حکمرانی کرے گا۔ انہوں نے اس سے مراد یہ لیا کہ حکومت ان کے ہاتھ سے نکل کر مروان اور اس کے بیٹوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی جیسا کہ 'النجوم الزاہرہ فی اخبار مصر و قاہرہ' میں آیا ہے۔ چنانچہ بنی عباس کو یہ برا معلوم ہوا کہ امویوں میں سفیانی اور علویوں میں مہدیؑ ہو گا جو آخری زمانہ میں ظہور کرے گا جبکہ ان دونوں کا نشانہ بننے کو عباسی ہی رہ جائیں گے۔ چنانچہ جب امویوں کا عروج ختم ہو گیا تو عباسیوں کو یہ خیال ستانے لگا کہ کیوں ان کے یہاں کوئی مہدی نہ ہو۔ پس ان کے خیرخواہوں نے بھی ایسی حدیثیں وضع کر لیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ آنے والا مہدی عباسیوں میں سے ہو گا اور وہ انسانیت کو امویوں کے مظالم سے نجات دلائے گا۔

چنانچہ طبرانی میں ابن عمر سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک دن رسول اللہؐ مہاجرین و انصار کے کچھ افراد کے درمیان جلوہ افروز تھے جبکہ عباس بن عبدالمطلب آپ کے دائیں ہاتھ اور علی بن ابی طالبؑ بائیں ہاتھ کو بیٹھے تھے۔ تب عباس اور انصار کے کچھ لوگ جھگڑنے لگے اور انصار نے عباس کے ساتھ سخت کلامی بھی کی تھی۔ اس پر نبی اکرمؐ نے ایک ہاتھ سے عباس کو پکڑا اور ایک ہاتھ سے علیؑ کو پکڑا اور فرمایا" اسکی نسل میں ایسا آدمی ہونے والا ہے جو دنیا کو ظلم و جور سے بھر دے گا اور اس کی نسل میں وہ آدمی ہونے والا ہے جو اس دنیا کو

عدل وانصاف سے بھر دے گا۔ پس جب تم پر وہ وقت آئے تو تم کو اس تیمی جوان کا ساتھ دینا چاہیے جو مشرق کی طرف سے بڑھے گا اور ہدایت کا علم لیے ہوئے ہو گا۔" بعد میں جب عباسیوں کو امویوں پر فتح حاصل ہو گئی تو وہ کہنے لگے کہ مہدیؑ ہم میں سے ہونے والے ہیں کیونکہ وہ لوگ جو علم لیے ہوئے ابو مسلم خراسانی کی قیادت میں مشرق سے آئے وہ ہمارے ہی ساتھی تھے۔

حاکم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم اہلبیتؑ میں چار افراد یعنی سفاح، منذر، منصور اور مہدی ہوں گے۔ مجاہد نے کہا: چاروں کے متعلق کچھ بیان کیجیے! انہوں نے کہا: سفاح وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کو قتل کرے گا اور دشمنوں سے درگزر کرے گا۔ منذر بہت دولت تقسیم کرے گا، اپنے لیے بہت کم دولت رکھے گا پھر بھی خود کو بڑا محسوس نہیں کرے گا۔ منصور کو اپنے دشمنوں پر ایک مہینہ میں فتح حاصل ہو گی، جس طرح رسول اللہؐ کو حاصل ہوا کرتی تھی۔ رہا مہدی تو وہ وہی ہے جو دنیا کو عدل سے بھر دے گا جبکہ وہ ظلم سے بھر چکی ہو گی۔ اس وقت جنگلی جانور اور درندے امن محسوس کریں گے اور زمین اپنی تہوں کے خزانے اگل دے گی۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا: زمین کی تہوں میں خزانے کیا ہیں؟ انہوں نے فرمایا: "وہ گویا سونے اور چاندی کے ستون ہوں گے۔" چنانچہ اسی وجہ سے منصور عباسی نے اپنے بیٹے محمد کو مہدی کا لقب دیدیا تھا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ وہ مہدی منتظر ہی ہے کہ جس کی بشارت نبی اکرمؐ نے دی تھی۔ پھر جب خلیفہ کے طور پر اس کی بیعت کی گئی تو ذلّہ خوار خطیبوں نے اس کی تعریف میں تقریریں کیں اور ابن الوقت شاعروں نے بھی اس کی خوب خوب مدح سرائی کی۔ مثلاً مطیع ابن ایاس نے اٹھ کر کہا کہ ہم سے فلاں نے، اس سے فلاں نے اور اس سے نبی اکرمؐ نے فرمایا: "مہدی ہم میں سے ہو گا اور وہ محمد ہے جو ابن عبداللہ ہے، البتہ اس کی ماں ہم میں سے نہیں ہو گی۔ وہ دنیا کو عدل سے اسی طرح بھر دے گا جیسے وہ ظلم سے بھر چکی ہو گی۔" پھر وہ بنی عباس میں سے ایک شخص کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا: خدا تمہاری زبان کو یاوری دے، کیا تم نے یہ حدیث سن رکھی ہے؟ تب اس بے چارے نے منصور کے خوف اور ہیبت کی وجہ سے

کہدیا: ہاں! میں نے سنی ہے۔

بلخی نے اپنی کتاب 'البدء والتاریخ' میں رسول اللہؐ کی یہ حدیث ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "یہ دنیا اس وقت تک ختم نہ ہوگی، جب تک میری امت میں میرے اہلبیتؑ میں سے ایک ایسا شخص نہ آجائے کہ جس کا نام میرے نام پر ہوگا"۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے اس کی تاویل کر لی اور کہا: یہ وہی مہدی بن ابی جعفر منصور ہے کہ جس کا نام محمد ہے۔

بشرط صحت یہ روایات اس امر کی صراحت کرتی ہیں کہ وہ مہدی آنحضرتؐ کے اہل بیتؑ میں سے ہونگے جبکہ یہ کسی نے بھی نہیں کہا ہے کہ عباسی خلفاء آنحضرتؐ کے اہل بیتؑ میں سے ہیں۔ سوائے اس صورت کے جو کسی دلیل سے صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ طبرانی کی روایت میں ہے کہ جب آنحضرتؐ نے یہ فرمایا کہ "اس کی نسل میں وہ شخص ہوگا جو زمین کو ظلم سے بھر دے گا" تو بلا شک و شبہ اس میں آپ کا اشارہ عباس کی طرف تھا اور اسی طرح دوسرے جملہ میں آپ کا اشارہ علیؑ کی جانب تھا۔ لیکن راوی نے اس کو ان لوگوں کے سامنے صرف خوف کی وجہ سے یا خوشامد اور صلہ وانعام کے لالچ میں اس طریقہ سے بیان کیا تھا۔

بارھویں امامؑ کے بارے میں اسلامی روایات

ہم ائمۂ اثنا عشریؑ کی سیرت کے بیان کی ابتدا کرتے وقت نبی اکرمؐ کی ان احادیث کا ذکر کر چکے ہیں جو سنی اور شیعہ سلسلوں سے وارد ہوئی ہیں۔ ان روایات کے مطابق ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ یہی بارہ امامؑ آنحضرتؐ کے جانشین ہیں اور انہی کے وجود سے یہ دین قائم ہے۔ ان میں سے بعض احادیث میں یہ صراحت بھی ہے کہ ان کی تعداد بنی اسرائیل کے نقیبوں کے برابر ہوگی۔ نیز یہ کہ ان میں سے آخری امام اس دنیا کو عدل وانصاف سے اسی طرح بھر دیگا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔ ہم اس ضمن میں سنیوں کی اس روش کو بھی بیان کر چکے ہیں کہ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ اب نبی اکرمؐ کی ان احادیث پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے کیونکہ ان حدیثوں کو انہی کے

نبیکو کار راویوں اور معتمد محدثین نے روایت کیا ہے تو وہ ان احادیث کی تاویل کرنے میں لگ گئے۔

چنانچہ خاص مہدی کی ذات اور شخصیت سے متعلق بہت سی احادیث سنی محدثین کی ایک جماعت نے اپنی صحاح میں روایت کی ہیں۔ جیسے ترمذی، ابوداؤد، حاکم اور ابن ماجہ وغیرہ کہ جنہوں نے ان احادیث کی سند علی مرتضیٰؑ، ابن عباس، ابو عمر، طلحہ، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، بی بی ام سلمہ ایسے بلند مرتبہ اصحاب تک پہنچائی اور ان کے علاوہ ان لوگوں تک بھی کہ جنہوں نے مختلف موقعوں پر رسول اللہؐ کو مہدی اہلبیتؑ کی حدیث بار بار بیان کرتے ہوئے سنا تھا۔

جیسا کہ صحیح ترمذی میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: خواہ دنیا کی زندگی کا صرف ایک ہی دن باقی رہ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ اس دن کو طول دیکر میرے اہلبیتؑ میں سے اس شخص کو مامور کرے گا کہ جس کا نام میرے ہی نام پر ہوگا۔ ترمذی کی ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ دنیا اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک عرب میں میرے اہلبیت سے ایک ایسا شخص ظاہر نہ ہوگا جو میرا ہی ہم نام ہوگا۔

سنن ابوداؤد میں آیا ہے کہ خواہ زمانہ کا صرف ایک ہی دن باقی رہ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ میرے اہلبیتؑ میں سے ایک شخص کو مامور کرے گا جو اس کو عدل سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم سے بھر چکا ہوگا۔ بعض احادیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے امام حسینؑ کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ "میرا یہ بیٹا خود بھی سردار ہے اور اس کی نسل میں ہی وہ شخص پیدا ہوگا جس کا نام تمہارے نبی کے نام پر ہوگا جو سیرت میں تو اس کے مثل ہوگا لیکن صورت میں وہ اس کے مثل نہ ہوگا اور وہ اس دنیا کو عدل سے بھر دے گا"۔

مسند احمد بن حنبل میں آنحضرتؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "نہ دن انتہا کو پہنچیں گے اور نہ یہ زمانہ ختم ہوگا حتیٰ کہ عرب میں میرے اہلبیتؑ میں سے وہ شخص حاکم ہوگا جس کا نام میرے نام پر ہوگا"۔

ڈاکٹر احمد صبحی اپنی کتاب 'نظریہ امامت' میں لکھتے ہیں کہ گو انتظار مہدی کا عقیدہ اہلسنت کے اصول مذہب میں اسی طرح شامل نہیں جس طرح وہ شیعوں کے عقائد

میں شامل ہے۔ پھر بھی انتظارِ مہدیؑ کا تصور اہلسنت کے ایک بڑے طبقہ میں ظاہر و باہر نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ان کے بعض علماء، مثلاً حافظ محمد بن یوسف گنجی شافعی نے اپنی کتاب 'البیان فی اخبار صاحب الزمانؑ' میں، علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب 'العرف الوردی فی اخبار المہدیؑ' میں، علامہ حجر عسقلانی نے اپنی کتاب 'العقول المختصر علیٰ علامات المہدی المنتظرؑ' میں اور یوسف بن یحییٰ دمشقی نے 'عقد الدرر فی اخبار الامام المنتظرؑ' میں اس کو بیان کیا ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ علمائے اہلسنت کے دوسرے طبقے بھی مہدیؑ کے متعلق اس اعتقاد میں برابر کے شریک ہیں، حالانکہ وہ اپنے قدیم بزرگوں کی تقلید کرتے ہوئے شیعوں سے دشمنی بھی رکھتے ہیں اور ان کے بیشتر عقائد کی صحت کا انکار کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ابن تیمیہ بھی اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں جو ابن عمر نے نبی اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ "آخری زمانہ میں میری نسل سے وہ شخص ظاہر ہونیوالا ہے جس کا نام میرا نام اور جس کی کنیت میری کنیت ہوگی، وہ زمین کو عدل سے اسی طرح بھر دیگا جس طرح وہ ظلم سے بھر چکی ہوگی اور وہی مہدیؑ ہوگا۔

آنحضرتؐ کی ایک دوسری حدیث ہے کہ مہدیؑ میری عترت اور فاطمہؑ کی اولاد میں سے ہوگا۔ اسی طرح وہ (ابن تیمیہ) مہدیؑ کے متعلق احمد، ترمذی اور ابو داؤد کی روایتوں کو صحیح مانتے ہیں جبکہ حافظ ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن محمد گنجی شافعی نے اپنی کتاب 'البیان فی اخبار صاحب الزمانؑ' میں مہدیؑ کے نسب، ان کی غیبت اور ان کے ظہور کے متعلق صحابہ کرام سے نبی اکرمؐ کی دسیوں حدیثیں روایت کی ہیں۔ جیسا کہ شیخ طوسی کی کتاب 'الغیبت' میں گنجی کی البیان کے مشمولہ عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے۔

جیسا کہ مہدیؑ کے بارے میں سہل بن سلیمان نے ابو ہارون عبدی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں ابو سعید خدری کی خدمت میں گیا اور کہا کہ کیا آپ بدر میں شریک ہوئے تھے؟ انہوں نے کہا: ہاں! میں نے کہا: کیا آپ ہم کو ایک ایسی حدیث سنائیں گے جو رسول اللہؐ نے علیؑ اور ان کے فضائل میں بیان فرمائی ہو۔ انہوں نے کہا: ہاں تو میں تم کو بتاتا ہوں کہ جب رسول اللہؐ کو آخری مرض لاحق تھا تو جناب فاطمہؑ ان

عیادت کے لیے تشریف لائیں جبکہ میں رسول اللہؐ کی داہنی جانب بیٹھا ہوا تھا۔ جب ان بی بی نے آنحضرتؐ کا ضعف ملاحظہ فرمایا تو وہ یوں رونے لگیں کہ جس سے ان کی آواز رکنے لگی اور ان کے چہرے پر آنسو نمودار ہو گئے۔ تب رسول اللہؐ نے ان بی بی سے فرمایا: اے فاطمہؑ! تم کیوں روتی ہو؟ کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا پر پہلی بار نظر ڈالی تو اس میں سے تمہارے باپ کو منتخب کیا اور اس کو اپنا نبی بنا کر بھیجا۔ پھر دوبارہ نظر ڈالی تو تمہارے شوہر علیؑ کو منتخب کیا، پھر مجھ کو حکم دیا اور میں نے اس سے تمہاری تزویج کر دی اور ان کو اپنا وصی قرار دیا۔ کیا تم کو یہ نہیں معلوم ہے کہ یہ تمہارے اوپر اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ تمہارا شوہر سب سے زیادہ صاحب علم، سب سے زیادہ حلیم اور سب سے پہلے اسلام میں داخل ہوا ہے۔ اس بات پر فاطمہؑ مسکرا دیں اور خوش ہو گئیں۔ اب رسول اللہؐ نے چاہا کہ ان کو کچھ اور باتیں بھی بتلائیں جو اللہ تعالیٰ نے محمدؐ اور آل محمدؑ کو عطا کی ہیں۔ پس آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: "اے فاطمہؑ! ہم اہلبیتؑ کو چھ خصلتیں ایسی دی گئی ہیں جو خدا نے نہ گزرے ہوئے لوگوں میں سے کسی کو دیں اور نہ ہم اہلبیتؑ کے بعد آنے والوں میں سے کسی کو ملیں گی۔ ہم میں وہ نبی آیا جو سب نبیوں میں افضل ہے اور وہ تمہارا باپ ہے۔ ہمارا وصی سب اوصیاء میں افضل ہے اور وہ تمہارا شوہر ہے۔ ہمارا شہید سب شہیدوں میں افضل ہے اور وہ تمہارے باپ کے چچا حمزہ ہیں۔ اس امت میں ہمیں میں سے دو نواسے ہوئے ہیں اور وہ تمہارے دونوں بیٹے ہیں اور اس امت کا وہ مہدیؑ ہم میں سے ہے کہ جس کے پیچھے عیسیٰؑ نماز ادا کریں گے۔" پھر آنحضرتؐ نے حسینؑ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "اسی کی نسل میں سے اس امت کا وہ مہدیؑ آئے گا۔"

حذیفہ یمان کی سند سے نبی اکرمؐ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: مہدیؑ میری اولاد میں سے ہوگا۔ اس کا چہرہ سرخ اور چاند کی مانند ہوگا۔ وہ زمین کو عدل سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم سے بھر چکی ہوگی اور اس کی حکومت میں اہل آسمان و زمین سب مطمئن ہوں گے۔ اسی طرح سفیان بن عیینہ نے علی بن ہلال سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں رسول اللہؐ کے اس مرض کے زمانہ میں آپ سے ملنے گیا کہ جس میں آپ نے انتقال فرمایا۔ اس وقت فاطمہؑ آپ کے سرہانے تشریف فرما تھیں۔

وہ اس قدر روئیں کہ ان کی آواز بلند ہو گئی۔ اس کے بعد راوی نے ان بشارتوں کو بیان کیا ہے جو آنحضرتؐ نے ان بی بی کو دیں۔ انہی میں آنحضرتؐ نے ان بی بی سے یہ بھی فرمایا کہ ہم میں سے اس امت کا مہدیؑ ہوگا جبکہ دنیا میں فساد برپا ہوگا اور فتنے ابھرے ہوئے ہوں گے، راستوں میں لوٹ مار ہوتی ہوگی اور لوگ ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہونگے۔ بڑا چھوٹے پر شفقت نہ کرتا ہوگا اور چھوٹا بڑے کی عزت نہ کرتا ہوگا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ہم میں سے ایک شخص کو ظاہر فرمائے گا، جو گمراہی کے قلعوں اور غلاف چڑھے ہوئے دلوں کو کھول دیگا اور آخری زمانے میں دین کو قائم کردے گا، جبکہ اس سے پہلے وہ مشکلوں سے دوچار رہا ہوگا۔ وہ زمین کو عدل سے اسی طرح بھر دیگا جس طرح وہ ظلم سے بھر چکی ہوگی۔

اسی طرح ابو سعید خدری کی سند سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہؐ نے اس مصیبت کا ذکر فرمایا کہ جو امت پر آنے والی ہے جبکہ کسی آدمی کو ظلم سے بچنے کے لیے کوئی جا، پناہ نہ ملتی ہوگی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ میری عترت میں سے اس شخص کو ظاہر کریگا جو زمین کو عدل سے اسی طرح بھر دیگا جس طرح وہ ظلم سے بھر چکی ہوگی۔ یہاں تک کہ آسمان اور زمین کے رہنے والے اس کی حکومت میں مطمئن ہوں گے۔ وہ ایسا وقت ہوگا کہ آسمان کی سمت میں کوئی ایسی جگہ نہ رہے گی کہ جس سے بارش نہ برس جائے اور زمین پر کوئی ایسی جگہ نہ رہی ہوگی کہ جس سے پیداوار نہ ہوتی ہو، یہاں تک کہ مردہ افراد بھی زندگی کی خواہش کرنے لگیں گے۔

حافظ گنجی شافعی کی کتاب البیان میں بھی اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ بعض روایات کے مطابق امام مہدیؑ کے عہد میں دولت کی اس حد تک فراوانی ہوگی کہ نہ تو لوگ اس میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے اور نہ کوئی شخص اس کی خواہش کریگا۔

حذیفہ یمان سے ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: خواہ دنیا کی حیات کا صرف ایک ہی دن باقی رہ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ اس شخص کو ظاہر کرے گا کہ جس کا نام میرا نام اور جس کی سیرت میری ہی سیرت ہوگی۔ لوگ خانہ کعبہ میں رکن و مقام کے درمیان اس کی بیعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے دین کو پھر سے زندہ کرے گا حتیٰ کہ صفحۂ ارض پر ہر شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوگا۔ اس وقت سلمان فارسی اُٹھے

اور آنحضرتؐ سے عرض کیا: یارسول اللہؐ! وہ مہدیؑ آپ کے کس بیٹے کی اولاد سے ہوں گے؟ تب آنحضرتؐ نے امام حسینؑ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: وہ مہدیؑ میرے اس بیٹے کی نسل سے ہوں گے۔

سعید بن جبیر کی سند سے ابن عباس نے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: علی بن ابی طالبؑ میری امت کا امام اور میرے بعد اس میں میرا جانشین ہے۔ وہ امام المنتظرؑ بھی اسی کی اولاد میں سے ہوگا جس کے ذریعہ سے خدا زمین کو عدل وانصاف سے اسی طرح بھر دیگا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔ قسم اس ذات کی کہ جس نے مجھ کو بشیر ونذیر بنا کر حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، جو لوگ اس امام المنتظرؑ کی غیبت کے زمانے میں اس کے ظہور کے عقیدہ پر قائم رہیں گے وہ خالص سونے سے بھی زیادہ قابل وقعت ہوں گے۔ اس پر جابر بن عبداللہ انصاری نے آنحضرتؐ سے عرض کیا: یارسول اللہؐ کیا آپ کی اولاد میں سے آنے والے قائمؑ کے لیے غیبت پر ایمان لانے والوں کے گناہوں کو بخش دیگا اور انکار کرنے والوں کو برباد کر دیگا۔ سنو اے جابر! غیبت اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے کہ جو اس کے بندوں سے پوشیدہ ہے۔ تم اس میں شک کرنے سے بچے رہنا کیونکہ خدا کے کاموں میں شک کرنا کفر ہے۔

اسی طرح کی اور بھی بہت سی روایات ہیں جو البیان کے مؤلف اور دوسرے شیعہ و سنی علماء نے اہلبیتؑ میں سے آنے والے مہدی یعنی بارھویں امامؑ کے بارے میں اپنی کتابوں میں معتمد صحابہ کی اسناد کے ساتھ نبی اکرمؐ سے روایت کیں اور ان کے بعد آنے والے لوگوں نے ان روایات کو اگلی نسلوں تک پہنچایا اور پھر سنی اور شیعہ محدثین نے ان کو احادیث کی اپنی اپنی صحاح اور سنن ومسانید میں شامل کر لیا۔

چنانچہ وہ روایات جو ان قدیم سنی علما میں جانی پہچانی جاتی تھیں، جنہوں نے صحابہ کرام سے روایات لیں اور ابتدائی دور میں حدیثیں جمع کی تھیں ان کی بنا پر سنی علماء اور محدثین کے تمام طبقات اور گروہوں میں اہلبیتؑ میں سے آنے والے ایک ایسے مہدیؑ کا تصور دور دور تک پھیلا ہوا تھا جو دنیائے بشریت کو ظلم وجور سے نجات دلائے گا اور یہ نظریہ ان کے کثیر التعداد علماء اور محدثین میں ایک اسلامی عقیدہ کے طور پر

تسلیم کیا جاتا تھا۔ تاہم شیعوں کے ساتھ اپنی سلف سے خلف تک قائم رہنے والی عداوت اوران سے مذہبی اختلاف کے باعث ان لوگوں نے ان احادیث میں بھی ایسی تبدیلیاں کرلیں جو ان کے اعتقادات اور خواہشات کے مطابق ہوں جس طرح انہوں نے بعض دوسری حدیثوں میں بھی اپنی ضرورت کے تحت تبدیلیاں کی ہوئی ہیں۔

جس طرح نبی اکرمؐ نے امام محمد مہدی المنتظرؑ کے بارے میں دسیوں موقعوں پر صراحت فرمائی تھی اسی طرح ائمہ کرامؑ بھی آپ کی ذات، اوصاف اور ظہور کے متعلق یکے بعد دیگرے مسلسل تصریحات فرماتے رہے۔ چنانچہ آپ کے والد بزرگوار امام حسن عسکریؑ نے اپنی حیات کے آخری مہینوں میں بارہا اپنے معتمد اصحاب اور خاص افراد کی موجودگی میں آپ کی امامت کی صراحت فرمائی اور آپ کو ان لوگوں کے سامنے لاکر ان کو دکھلا بھی دیا۔ حالانکہ وہ اہل حکومت کے خوف سے آپ کو خاص شیعوں تک سے بھی پوشیدہ رکھتے تھے۔ اس لیے عوام میں یہی مشہور تھا کہ امام حسنؑ بن علیؑ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ البتہ آپ کا چچا جعفر بن امام علی نقیؑ ان لوگوں میں سے تھا جن کو امام مہدیؑ کی ولادت اور ان کے وجود کا علم تھا لیکن وہ اس عام افواہ سے خوش تھا اور اس کو پھیلانے میں مدد دیتا رہتا تھا تاکہ اس سے امام حسن عسکریؑ کے بارے میں ان شیعوں میں بددلی پیدا ہو جائے جو ان کی امامت کے قائل تھے اور ان کو اپنے مال ومتاع کا خمس پہنچایا کرتے تھے۔ دراصل اس نے اپنے بھائی امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے دن ہی سے اپنے آپ کو اس کام کے لیے تیار کر لیا تھا، جبکہ امام کو ابھی غسل وکفن ہی دیا جارہا تھا۔ وہ ان کے دروازہ پر بیٹھ کر ان کی شہادت پر عوام سے پرسا لے رہا تھا اور ساتھ کے ساتھ اہل حکومت اور ان کے اہلکاروں سے اپنی امامت کی مبارکباد بھی قبول کرتا جارہا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ اس کو اسی لیے تیار کر رہے تھے کہ وہ اپنی امامت کا نعرہ لگا کر شیعوں میں تفریق پیدا کر دے اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر ڈالے لیکن جب ان لوگوں نے اس کو امام حسن عسکریؑ کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھایا اور امام مہدیؑ نے آگے نکل کر اس کی چادر کا پلو پکڑ کر فرمایا: چچا جان! آپ پیچھے ہٹ جائیے! میں اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھانے کا آپ سے زیادہ حقدار ہوں' وہاں موجود لوگ اس اچانک رونما ہونیوالے واقعہ سے ششدر رہ گئے۔ جعفر مصلے پر سے ہٹ

گیا لیکن اس کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اس پر مایوسی اور ناکامی کی زردی چھا گئی۔ تاہم ایک ایسے وقت میں جبکہ لوگوں کی نظریں آپ کے بدکردار چچا پر لگی ہوئی تھیں جو اپنی شراب خوری اور بدکرداری میں مشہور تھا۔ آپ جو حقیقی اور شرعی امام تھے، آپ کے لیے ایسا دانشمندانہ اقدام کرنا اشد ضروری تھا تاکہ خود جعفر اور اس کے حامی اہل حکومت کی ان تمام تدبیروں کو ناکام بنا دیا جائے جو یہ لوگ شیعوں کے نظام امامت میں پراگندگی پیدا کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ مزید یہ کہ اس بروقت اقدام سے یہ ثابت ہو جائے کہ آپ کے علاوہ اس کے بھائی امام حسن عسکریؑ کا کوئی اور وارث موجود نہیں ہے۔

ائمہ کرام اور امام مہدیؑ کی امامت و غیبت

راویوں نے امام مہدیؑ کی امامت، غیبت اور ان کے ظہور کے بارے میں ائمہ اہلبیتؑ سے دسیوں حدیثیں روایت کی ہیں جن کو محدثین نے اپنی مسانید میں شامل کیا ہے لیکن محض اس خیال سے کہ روایات کا طویل سلسلہ قارئین کو اکتا نہ دے۔ ہم ان گیارہ اماموں میں سے ہر ایک کی ایک ایک حدیث نمونۃً پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

شیخ صدوق نے اکمال الدین میں اور دیگر معتمد شیعہ محدثین کے ایک گروہ نے اصبغ بن نباتہ کی سند سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں امیرالمومنین امام علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ فکرمند بیٹھے تنکے سے زمین کرید رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا: یا امیرالمومنین! آپ کچھ فکرمند نظر آتے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ آپ زمین کرید رہے ہیں۔ کیا یہ زمین آپ کو پسند ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ بخدا کہ مجھ کو اس سے کوئی رغبت نہیں ہے، نہ کسی دن اس دنیا سے رغبت ہوئی ہے بلکہ اس وقت میں اپنی اولاد میں پیدا ہونے والے اس بچے کے متعلق سوچ رہا تھا جو میرے بیٹوں میں سے گیارھواں ہو گا اور وہی مہدیؑ ہو گا جو زمین کو عدل سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔ اس پر ایک ایسی حیرت انگیز غیبت آنے والی ہے کہ جس سے کچھ لوگ گمراہ ہو جائیں گے اور کچھ ہدایت پا جائیں گے۔ میں نے کہا: یا امیرالمومنینؑ! واقعی ایسا ہونے والا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں اے اصبغ! گویا وہ خلق ہو چکا ہے اور میں تم کو اس کی بابت بتا رہا ہوں کہ

وہ اس عترت کے صالح ترین افراد اور اس امت کے بہترین ائمہ میں سے ہے۔ میں نے کہا: مہدیؑ کے بعد کیا ہو گا؟ آپ نے فرمایا جو اللہ کی مرضی ہو گی۔

شیخ صدوق نے حسین بن خالد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام علی رضاؑ سے، انہوں نے اپنے والد امام موسیٰؑ بن جعفرؑ سے، انہوں نے اپنے والد امام جعفرؑ بن محمدؑ سے، انہوں نے اپنے والد امام محمدؑ بن علیؑ سے، انہوں نے اپنے والد امام علیؑ بن حسینؑ سے، انہوں نے اپنے والد امام حسینؑ سے اور انہوں نے اپنے والد امام علی بن ابی طالبؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس نے محمدؐ کو نبی بنا کر مبعوث کیا اور ان کو تمام مخلوق میں سے منتخب قرار دیا، یہ ضرور ہو گا لیکن حیرت انگیز غیبت کے بعد ہو گا۔ مہدیؑ کے زمانہ میں اس کے بتائے ہوئے دین پر ان لوگوں کے علاوہ کوئی ثابت قدم نہ رہے گا، جن کے دل خلوص سے اور ان کی روح یقین سے سرشار ہو گی۔ وہ وہی لوگ ہوں گے جن سے خدا ہماری محبت کا وعدہ لے چکا ہو گا اور ان کے دلوں میں ایمان کو داخل کر کے اپنی روح القدس سے ان کی مدد کی ہو گی۔

امام محمد باقرؑ کی سند سے روایت ہے کہ جابر بن عبد اللہ انصاری نے کہا کہ میں بی بی فاطمہ زہراؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے سامنے ایک تختی پڑی تھی، جس پر رسول اللہؐ کے اوصیاء کرامؑ کے اسماء گرامی لکھے تھے۔ میں نے وہ نام گنے تو بارہ ہوئے اور ان میں آخری نام القائمؑ کا تھا، جبکہ ان میں سے تین محمدؑ اور چار علیؑ تھے کہ ان سب پر اللہ کی طرف سے صلوٰت اور سلام ہو۔

جب امام حسنؑ بن علی المرتضیٰؑ کی خدمت میں شیعوں کا ایک گروہ آیا اور انھوں نے آپ سے اس بات پر شکوہ بھی کیا تھا کہ آپ نے حکومت کیوں معاویہ بن ابی سفیان کے حوالے کر دی ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے ان سے فرمایا: ہم میں سے ہر ایک کو اپنے زمانہ کے سرکش حاکم کا دباؤ برداشت کرنا ہو گا سوائے القائمؑ یعنی محمدؑ بن حسنؑ کے جن کے پیچھے حضرت عیسیٰؑ نماز پڑھیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی ولادت کو پوشیدہ رکھے گا اور ان کی شخصیت کو آنکھوں سے اوجھل کر دے گا تاکہ ان پر کسی سرکش حاکم کا دباؤ نہ پڑے۔ وہ میرے بھائی حسینؑ کی نویں پشت میں ہوں گے اور خدا ان کی غیبت میں ان کی عمر

کو طویل کر دیگا۔ پھر جب اپنی قدرت سے ان کو ظاہر فرمائے گا تو وہ چالیس سال کے کم عمر جوان کی مانند ہوں گے اور یقیناً خدا ہر شے پر قادر ہے۔

امام حسینؑ بن علی المرتضیٰؑ کی سند سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: میری نسل میں نویں پشت میں ہونیوالے بیٹے میں حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کی کچھ خصوصیات ہوں گی اور ہم اہلبیتؑ میں سے القائم ہو گا۔ ہمدان کے ایک شخص کی سند سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ امام حسینؑ نے فرمایا: میری نسل میں نویں پشت میں ہونے والا بیٹا اس امت کا قائم اور صاحبِ غیبت ہے اور وہ زندہ ہی ہو گا کہ اس کی میراث تقسیم ہو جائے گی۔ اگرچہ دنیا کی حیات کا ایک ہی دن باقی رہ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ اس دن کو طویل کر دے گا، یہاں تک کہ وہ شخص ظاہر ہو جائے جو اس زمین کو عدل سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی

سعید ابن جبیر کی سند سے روایت ہے کہ امام علیؑ بن حسینؑ نے فرمایا: القائم ہم میں سے ہونے والا ہے لیکن اس کی ولادت عوام سے اس طرح پوشیدہ رہے گی یہاں تک کہ لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ وہ پیدا نہیں ہوا ہے مگر اس کو جب ظاہر ہونا ہو گا وہ ظاہر ہو جائے گا اور وہ کسی کی بیعت نہیں کرے گا۔ آپ ہی سے ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ہمارے القائمؑ کی دو غیبتیں ہوں گی اور ان میں سے دوسری اتنی طویل ہو گی کہ وہ لوگ جو اس کا اقرار کرتے ہوں گے ان میں سے بیشتر روگرداں ہو جائیں گے۔ اس کی آمد کے عقیدے پر صرف وہی لوگ ثابت قدم رہیں گے جن کا یقین پختہ اور معرفت صحیح ہو گی اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی ہمارے لیے مقرر کیا ہے اس میں ان کو کوئی کلام نہ ہو گا۔

عبید اللہ بن عطار نے امام ابو جعفر محمد باقرؑ سے کہا: عراق میں آپ کے شیعہ کثرت میں ہیں اور آج اہلبیتؑ میں آپ کی مانند کوئی اور صاحبِ فضل و کمال فرد موجود نہیں ہے تو پھر آپ خروج کیوں نہیں فرماتے؟ اس پر امام محمد باقرؑ نے فرمایا: اے عبد اللہ! شائد تمہارے کانوں میں میل بھر گیا ہے۔ بخدا کہ میں تمہارا وہ امام نہیں ہوں۔ اس نے کہا: ہمارا وہ امام کون ہو گا؟ آپ نے فرمایا: انتظار کرتے رہو اور ہم میں سے جسکی ولادت تم سے پوشیدہ رہے گی وہی تمہارا وہ امام ہو گا۔

محمد بن مسلم ثقفی کا بیان ہے کہ میں امام ابوجعفر محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور چاہتا تھا کہ آپ سے قائم آل محمدؑ کے بارے میں کچھ پوچھوں لیکن آپ نے خود ہی ابتدا کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا: اے محمد بن مسلم! قائم آل محمدؑ میں پانچ نبیوں یعنی یونسؑ بن متیٰ، یوسفؑ بن یعقوبؑ، موسیٰؑ بن عمران، عیسیٰؑ بن مریمؑ اور محمد مصطفیٰؐ کی خصوصیات موجود ہونگی۔ پھر فرمایا کہ ان کے ظہور کی یہ چار علامات ہیں: شام سے سفیانی کا خروج، ایک یمانی کا خروج، ماہ رمضان میں آسمان کی طرف سے ایک چنگھاڑ کی آواز کا آنا اور کسی پکارنے والے کا القائمؑ کو ان کا اور ان کے والد کا نام لیکر پکارنا۔

محمد بن مسلم ثقفی نے ایک اور روایت میں کہا ہے کہ میں نے امام ابوجعفر محمد باقرؑ کو یہ کہتے سنا: "ہم میں سے آنے والے القائمؑ کو نصرت الٰہی حاصل ہوگی اور وہ قوت و طاقت سے فتح حاصل کرے گا۔ اس کی تیز رفتاری کے باعث زمین اس کے لیے گویا سکڑ جائے گی۔ اس میں موجود تمام خزانے اس کے لیے ظاہر ہو جائیں گے اور اس کا اقتدار حکومت مشرق و مغرب تک پھیلا ہوا ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرے گا۔ خواہ یہ امر مشرکوں کو برا ہی کیوں نہ لگے اور وہ عیسیٰؑ بن مریمؑ کو نازل کرے گا جو القائمؑ کے پیچھے نماز ادا کریں گے۔"

راوی مزید کہتا ہے کہ تب میں نے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! آپ لوگوں میں سے آنے والے القائمؑ کب ظہور کریں گے؟ آپ نے فرمایا: جب مرد عورتوں کی اور عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کریں گی۔ عورتیں گھوڑوں پر سواری کیا کریں گی۔ مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے جنسی سیری حاصل کریں گی۔ جھوٹی گواہی قبول کی جایا کرے گی اور سچی گواہی رد کی جایا کرے گی۔ لوگ خونریزی کو ایک معمولی بات خیال کریں گے، زنا کا ارتکاب کیا جائے گا، سود خوری عام ہوگی اور برے لوگوں سے ان کی زبان کی کاٹ کے باعث ڈرا جائے گا۔"

صفوان بن مہران سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "جو کوئی تمام ائمہؑ کا اقرار کرے اور امام مہدیؑ کا انکار کرے وہ ایسا ہی ہے جیسے تمام انبیاءؑ کا اقرار کرے اور محمد رسول اللہؐ کا انکار کرے۔" اس پر آپ سے کہا گیا: اے فرزند رسولؐ!

آپ کی اولاد میں سے کون مہدیؑ ہوگا ؟ آپ نے فرمایا: "ہم میں سے ساتویں امام کے بعد پانچواں، جس کی شخصیت تم لوگوں سے پوشیدہ رہے گی اور تمہارے لیے روا نہ ہوگا کہ اس کا نام لیکر اس کا تذکرہ کرو۔" ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "جب یکے بعد دیگرے محمدؑ، علیؑ اور حسنؑ تین امام ہوں تو ان کے بعد چوتھے القائمؑ ہوں گے۔"

سید بن محمد حمیری نے ایک طویل روایت میں کہا ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے کہا کہ اے فرزند رسولؐ! اکثر راویوں نے آپ کے آباء کرامؑ کی طرف سے غیبت کے صحیح ہونے کی روایت ہم سے بیان کی ہے۔ پس آپ مجھ کو بتائیے کہ یہ کس کے لیے واقع ہوگی ؟ آپ نے فرمایا: وہ غیبت میرے بعد چھٹی پشت میں ہونے والے بیٹے کے لیے ہوگی جو رسول اللہؐ کے بعد ان ائمہ ہدیٰؑ میں بارھواں امام ہوگا کہ جن میں پہلے امیرالمومنین امام علیؑ ہیں اور آخری وہ قائم بالحق، بقیۃ اللہ فی الارض اور صاحب الزمانؑ ہیں۔ بخدا کہ اگر وہ غیبت میں اتنی مدت بھی رہ لیں جتنی مدت نوحؑ اپنی قوم میں رہے تھے پھر بھی وہ دنیا سے اٹھائے نہ جائیں گے جب تک کہ ظہور نہ کرلیں اور اس زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے نہ بھردیں جس طرح وہ ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔" نیز محمد بن عمیر نے ابوبصیر کی سند سے روایت کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "حسنؑ بن علیؑ کے بعد نو امام ہیں اور ان میں سے نویں القائمؑ ہوں گے۔"

شیخ صدوق اور دیگر محدثین نے علی بن جعفرؑ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میرے بھائی امام موسیٰؑ بن جعفرؑ نے فرمایا کہ جب میری اولاد میں سے چوتھی پشت میں ہونے والے بیٹے کی شہادت ہوجائے تو پھر تم لوگ اپنے دین کے بارے میں ہوشیار ہوجانا کیونکہ اس وقت کے امام کے لیے غیبت ضروری ہوگی، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی اس سے روگرداں ہوجائیں گے جو پہلے یہ کہتے رہے ہوں گے کہ یہ غیبت ایک ایسا امتحان ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی آزمائش کی ہے۔" نیز یونس بن عبدالرحمٰن نے بھی روایت کی ہے کہ امام موسیٰؑ بن جعفرؑ

نے فرمایا: "القائمؑ وہ ہے جو اس زمین کو خدا کے دشمنوں سے پاک کرکے اسکو عدل وانصاف سے اسی طرح بھردے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔ وہ میری اولاد میں سے آئندہ ہونے والے بیٹوں میں سے پانچواں ہوگا۔ وہ اپنی جان کو لاحق خطرے کے باعث ایک طویل غیبت میں رہے گا کہ جس کے دوران میں کچھ لوگ مرتد ہوجائیں گے اور اکثر ثابت قدم رہیں گے۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا: "شاباش ہے ہمارے ان شیعوں کو جو ہمارے القائمؑ کی غیبت میں ہم سے وابستہ رہیں گے۔ نیز ہماری محبت اور ہمارے دشمنوں سے بیزاری پر ثابت قدم رہیں گے۔ ہاں تو وہ ہم میں سے ہیں اور ہم ان سے ہیں۔ وہ اس بات سے خوش ہیں کہ ہم ان کے امامؑ ہیں اور ہم اس بات پر راضی ہیں کہ وہ ہمارے شیعہ ہیں۔ ان کے لیے شاباش پر شاباش ہے۔ بخدا کہ وہ قیامت کے روز ہمارے ساتھ اور ہمارے قرب میں ہوں گے۔"

حسین بن خالد سے روایت ہے کہ ——— امام علی رضاؑ نے فرمایا: "جو گناہ سے اجتناب نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں اور جو (بوقت ضرورت) تقیہ نہیں کرتا اس کا ایمان نہیں۔ تم میں سب سے قابل عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقیہ پر عمل کرتا ہو۔" آپ سے کہا گیا: اے فرزند رسولؐ! یہ طریقہ کب تک رہے گا؟ آپ نے فرمایا: "وقت معلوم تک اور وہ ہے ہمارے القائمؑ کے ظہور کا دن۔ پس جس نے ہمارے القائمؑ کے ظہور سے پہلے تقیہ ترک کردیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" اس پر آپ سے کہا گیا: "اے فرزند رسولؐ! آپ اہلبیتؑ میں سے القائمؑ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ میری اولاد میں سے چوتھی پشت میں ہونے والا بیٹا ہے جو کنیزان عالم کی سردار کا بیٹا ہوگا۔ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اس زمین کو تمام بے انصافیوں سے پاک اور ظلم سے بری کردے گا۔ وہ وہی ہے کہ جس کی ولادت میں لوگ شک کریں گے اور وہ وہی ہے جو اپنے ظہور سے پہلے غیبت میں رہے گا۔ جب وہ ظہور کرے گا تو زمین اس کے نور سے روشن ہوجائے گی۔ جب وہ لوگوں کے درمیان انصاف کی ترازو قائم کریگا تو پھر کوئی کسی پر ظلم نہ کر پائے گا۔"

عبد العظیم بن عبداللہ بن علی بن حسن بن زید بن حسنؑ بن علی بن ابی طالبؑ سے

روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں اپنے آقا امام محمد تقی الجوادؑ کی خدمت میں اس ارادہ سے حاضر ہوا کہ ان سے القائمؑ کے متعلق دریافت کروں گا کہ آیا مہدیؑ وہی ہیں یا اُن کے علاوہ کوئی اور ہے۔ تاہم انہوں نے خود ہی ابتدا کرتے ہوئے فرمایا کہ "اے ابوالقاسمؒ! ہم میں سے آنے والے مہدیؑ وہی القائمؑ ہی ہیں کہ جن کی غیبت کے زمانہ میں ان کا انتظار کرنا چاہیے اور جب وہ ظہور کریں تو ان کی اطاعت کرنی چاہیے۔ وہ میری اولاد میں سے تیسری پشت میں ہوں گے اور قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد مصطفیٰؐ کو نبوت عطا کی اور ہم کو امامت کے لیے منتخب کیا، اگر دنیا کی حیات کا صرف ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس قدر طویل کر دے گا کہ وہ ظہور کریں اور اور اس زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دیں جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔ خدا ان کے لیے حالات کو ایک ہی رات میں درست کر دے گا جس طرح اس نے موسیٰ کلیم اللہؑ کے لیے حالات درست کر دیے تھے۔ چنانچہ وہ آگ لینے گئے تھے اور جب واپس ہوئے تو اللہ کے رسول اور نبیؑ بنا دیے گئے تھے۔ ہمارے شیعوں کے لیے بہترین عمل یہ ہے کہ ان کی آمد کا انتظار کریں۔"

داؤد بن قاسم جعفری سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابوالحسن علی نقی ہادیؑ کو یہ فرماتے سنا کہ "میرے بعد میرا بیٹا حسنؑ میرا جانشین ہے۔ مگر تم اس کے بعد ہونیوالے جانشین کے بارے میں کیا کرو گے، جبکہ تم اس کی صورت بھی نہ دیکھ پاؤ گے۔ میں نے عرض کیا: پھر ہم ان کا ذکر کس طرح کیا کریں گے؟ آپ نے فرمایا: تم کہا کرنا "حجت آل محمدؑ"۔"

علی بن مہزیار نے علی بن محمد بن زیاد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام ابوالحسن علی نقیؑ کو ایک خط لکھا اور ان سے فَرَج یعنی ظہور کے بارے میں پوچھا تو آپ نے لکھا: "جب تمہارا امام ظلم اور ظالموں کے مقام سے غیبت میں چلا جائے، تو پھر تم فَرَج و ظہور کی توقع کرنا۔" نیز ایک اور روایت میں ہے کہ امام علی نقیؑ نے یہ بھی فرمایا: میرے بعد میرا بیٹا حسن عسکریؑ امام ہو گا اور پھر اس کا وہ بیٹا کہ جو القائمؑ ہے۔ وہ زمین کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دے گا

جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔

احمد بن اسحاق بن سعد اشعری سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں امام ابو محمد حسن عسکریؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ان کے جانشین کے بارے میں دریافت کیا۔ اس پر امامؑ نے فرمایا: اے احمد! جب سے اللہ نے آدمؑ کو خلق کیا ہے اس نے زمین کو کبھی حجت خدا سے خالی نہیں رکھا اور نہ قیامت تک خالی رکھے گا کیونکہ اسی حجت خدا کے وسیلہ سے دنیا کے لوگوں سے بلائیں دور ہوتی ہیں اور اسی کی برکت سے مینہ برستا اور زمین سے غلہ، پھل اور سبزیاں حاصل ہوتی ہیں۔" میں نے عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! آپ کے بعد ہمارا امام اور آپ کا جانشین کون ہے؟ آپ جلدی سے بَیْتُ الشَّرف کے اندر تشریف لے گئے اور ایک بچے کو اپنے دوش پر لیے ہوئے باہر آئے کہ جس کا چہرہ چاند جیسا اور عمر تقریباً تین سال رہی ہو گی، پھر فرمایا: اے احمد بن اسحاق! اگر اللہ تعالیٰ اور اس کی حجتوں کے ہاں تم کو قربت نہ رہی ہوتی تو میں تمہارے سامنے اپنے اس بیٹے کو نہ لاتا۔ اس کا نام اور کنیت رسول اللہؐ نے رکھی تھی اور یہی وہ القائمؑ ہے جو دنیا کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔ اے ابن اسحاق! اس امت میں اس کی مثال حضرت ذوالقرنینؑ کی سی ہے، قسم بخدا کہ یہ ایک ایسی غیبت میں جانے والا ہے جس کے دوران صرف وہی شخص گمراہی سے بچ سکتا ہے جو خدا کی مدد سے اس کی امامت کا قائل رہے اور اس کے جلد ظہور کرنے کے لیے دعا کرتا رہے گا جبکہ اس پر عقیدہ رکھنے والے بیشتر لوگ اس امر سے روگرداں ہو جائیں گے اور صرف وہی باقی رہیں گے کہ جن سے اللہ تعالیٰ نے ہماری محبت کا عہد لیا ہے۔ ان کے دلوں میں ایمان کو جاگزیں کر دیا اور ان کو روح القدس سے مدد پہنچائی ہے۔ آپ نے مزید فرمایا: اے احمد! یہ خدا کا معاملہ ہے۔ اس کے رازوں میں سے ایک راز اور اس کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔ پس تم کو جو کچھ بتایا گیا ہے اس کو مان لو اور خدا کا شکر ادا کرتے رہو۔"[1]

---

[1] اصول کافی جلد اوّل، اکمال الدین شیخ صدوق اور الغیبۃ، شیخ طوسی وغیرہ کی کتب حدیث کو دیکھیں۔

ہم ائمہ کرامؑ سے مروی ان سیکڑوں حدیثوں میں سے صرف انہی چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں جو اس امت کے بارہویں امام اور مہدی موعود امام محمد بن حسنؑ کے اوصاف، آپ کی غیبت اور ظہور کے حالات و واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اگرچہ ان روایات کا ایک خاصہ بڑا حصہ صحیح نہیں ہے، تاہم اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بیشتر روایات دل و دماغ کے لیے باعث اطمینان ہیں، کیونکہ ان کے راوی وہ افراد ہیں جو اپنے صدق، دیانت اور خلوص میں مشہور ہیں۔ ان روایات کے درست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے متن کے لحاظ سے رسول اللہؐ کے ارشادات کے موافق ہیں، کہ جن کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ اپنی خواہش نفس سے بولتے ہی نہ تھے۔ مزید برآں یہ روایتیں ائمہ کرامؑ کے اقوال سے بھی پوری طرح متفق ہیں۔

امام مہدیؑ اور ان کے چچا جعفر

امام علی نقیؑ اپنے بیٹے جعفر کی ولادت پر نہ تو خوش ہوئے اور نہ اس سے کوئی اچھی توقعات قائم کیں۔ چنانچہ ایک خاتون جو آپ کے ان تاثرات کو دیکھتی رہی تھی، جب اس نے آپ سے اس کے بارے میں سوال کیا تو جیسا کہ کشف الغمہ اربلی میں ہے، آپ نے فرمایا: "تم دیکھو گی کہ اس کے ذریعہ سے کثیر افراد گمراہ ہونگے۔"

بہت سی روایات میں آیا ہے کہ یہی جعفر جب جوان ہوا تو اس نے وہ اسلامی اخلاق اور طور طریقے چھوڑ دیے جو ان کے آبار کرامؑ نے مسلمانوں کے سامنے اتمام حجت کے لیے پیش کیے تھے تاکہ وہ ان سختیوں اور مشکلوں سے نجات پا جائیں جو انکو درپیش تھیں۔ چنانچہ اسلامی اصولوں کی پابندی کرنے کی بجائے وہ اہل حکومت اور ان کے عُمّال کی صحبتوں میں رہنے لگا۔ اس طرح وہ شراب خوری اور دوسری برائیوں میں ڈوب گیا، یہاں تک کہ تاریخ سامرا جلد دوم کے مطابق اس کے والد امام علی نقیؑ کو اپنے بعض اصحاب سے کہنا پڑا کہ تم میرے بیٹے جعفر سے دُور دُور ہی رہا کرو۔ کیونکہ وہ میرے لیے حضرت نوحؑ کے اس بیٹے کی مانند ہے کہ جس کی بابت اللہ تعالٰی نے فرمایا:

"اے نوحؑ! وہ تمہارے اہل میں سے نہیں کہ اس کا عمل غیر صالح ہے۔ (سورۂ ہود۔ آیت ۴۶)

خلیفہ معتمد عباسی کے وزیر عبید اللہ بن خاقان کا بیٹا احمد کہ جو امام حسن عسکریؑ کے بارے میں بات کر رہا تھا، جب اس سے امامؑ کے بھائی جعفر کے متعلق پوچھا گیا تو وہ کہنے لگا: یہ جعفر کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ اس کے متعلق کچھ پوچھا جائے یا اس کا خیال کیا جائے۔ عبید اللہ بن خاقان وزیر کا بیٹا احمد مزید بیان کرتا ہے کہ جب جعفر کے بھائی امام حسن عسکریؑ کا کفن دفن ہو گیا تو وہ میرے باپ کے پاس آیا اور ان سے کہنے لگا: اگر آپ مجھ کو میرے باپ اور بھائی کا منصب عطا کر دیں گے تو میں آپ کو بیس ہزار دینار سالانہ پیش کیا کروں گا۔ اس پر میرے باپ نے اس کو ڈانٹ دیا اور کہا: ناسمجھ! کیا تم نہیں جانتے کہ جو لوگ تمہارے باپ اور بھائی کو امام مانتے ہیں، خلیفہ نے ان کے خلاف تلوار اٹھائی تاکہ ان کو اس عقیدے سے باز رکھے لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ پھر اس نے یہ کوشش کی کہ تمہارے باپ اور بھائی کو امت کی امامت کے اس مرتبہ سے ہٹا دے، مگر یہ بھی اس سے ممکن نہ ہوا۔ پس اگر تم اپنے باپ اور بھائی کے پیروکاروں کے نزدیک امام ہو تو تم کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ خلیفہ تم کو امامت کا مرتبہ عطا کرے لہٰذا اگر تم شیعہ جماعت کے نزدیک اس مرتبہ پر فائز نہیں ہو تو پھر تم اس کو کسی طرح بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

امام حسن عسکریؑ کے ایک خادم ابوالادیان کہ جو مختلف مقامات پر رہنے والے شیعوں کے لیے آپ کے خطوط اور تحریریں لے جانے پر مامور تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے انکو مدائن کے ممتاز شیعہ افراد کے نام لکھے ہوئے خطوط دیکر بھیجا۔ جب وہ وہاں سے واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ امامؑ شہادت پا چکے ہیں اور آپ کا بھائی جعفر آپ کے دروازے پر بیٹھا پرسہ دینے والوں کا پرسہ لے رہا ہے اور ان لوگوں کا خیر مقدم بھی کر رہا ہے جو اس کو اپنے بھائی امام حسن عسکریؑ کے بعد امام قرار دیکر مبارکباد دے رہے ہیں جیسا کہ ابوالادیان سے روایت آئی ہے کہ اس وقت انھوں نے کہا: اگر امام حسنؑ بن علیؑ کے بعد یہ جعفر ہی امام ہے تو پھر امامت کے دن گنے جا چکے ہیں، کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ یہ صاحب خدا کے احکام کی تحقیر کرنے اور برائیوں کو فروغ دینے میں لگے رہتے تھے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس معاملہ میں اہل حکومت جعفر کی پشت پناہی کرتے تھے

اور وہ اس کو اسکے بھائی کی جگہ پر امام بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی مقصد سے ان لوگوں نے جعفر کو امام حسن عسکریؑ کو نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھایا تھا لیکن وہ مصلّے پر آکے کھڑا ہوا ہی تھا کہ اچانک لوگوں نے ایک صاحبزادے کو برآمد ہوتے دیکھا کہ جن کی عمر چھ سال سے زیادہ نہ ہوگی، انہوں نے آتے ہی جعفر کی چادر کا پلّو پکڑ کر کہا: چچا جان! آپ ہٹ جائیے، کیونکہ اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھانے کا میں زیادہ حقدار ہوں چنانچہ جعفر ان کے سامنے کوئی پس وپیش کیے بغیر مصلے پر سے ہٹ گیا، حالانکہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس پر ناکامی اور مایوسی کی زردی چھا گئی تھی لیکن باوجودیکہ اس کو اپنے بھائی کے ان شرعی وارث کے آجانے پر شدید صدمہ پہنچا کہ جن کی شخصیت سے عوام ناواقف تھے، نیز وہ اس عظیم مجمع کے سامنے نماز جنازہ نہ پڑھا سکا تھا جو امامؑ کے جسد اطہر کو آخری آرامگاہ تک پہنچانے کے لیے جمع ہوا تھا۔ پھر بھی اس کے دل میں یہ تمنا باقی تھی کہ وہ اہل حکومت اور ان کے عمال کی مدد سے اپنے بھائی کے بعد امامت کا مرتبہ حاصل کرلے کیونکہ وہ لوگ پہلے ہی سے اس کے مفاد میں کام کر رہے تھے اور باہر سے آنے والوں اور خمس کا مال لانے والوں کو جعفر کی طرف موڑ دینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن خود اسکی، اہل حکومت کی اور ان کے عمال کو یہ کوششیں اکارت گئیں اور ناکامی سے دوچار ہوگئیں کیونکہ ائمۂ کرامؑ کے وکلا، خاص احباب اور عام شیعہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ خدا نے جن افراد کو امت کی قیادت اور امامت کے لیے منتخب کیا ہے، اس نے ان کو ایسی صفات عطا کی ہیں جو کسی دوسرے کو میسر نہیں ہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے بھی بعض افراد نے اپنی ذاتی خواہش، شہرت کی لالچ اور اہل حکومت کے بڑھاوے اور ان کی حمایت سے امامت کا دعوٰی کیا تھا لیکن جیسے ہی ان کی اصل حقیقت واضح ہوئی ان کو اس سے پلٹنا ہی پڑا تھا اور جعفر بن علیؑ بھی ان دوسرے دعوٰی کرنے والوں سے زیادہ مختلف نہ تھا بلکہ وہ تو بے علم ہونے کے علاوہ دین سے بے پروائی اور گناہگاری میں مشہور تھا۔ پھر جب امام مہدیؑ کے آباء کرامؑ کے پیروکاروں پر آپ کی امامت کے متعلق ایسی دلیلیں واضح ہوگئیں جیسی آپ کے والد بزرگوار اور دیگر ائمۂ اطہارؑ پیش کرتے رہے تھے تو وہ لوگ آپ کو امام شرعی مان کر آپ سے وابستہ ہوگئے۔

ابوالادیان کہ جو امام حسن عسکریؑ کے خطوط مختلف علاقوں میں لے جایا کرتے تھے

ان سے روایت ہے کہ جب امام حسن عسکریؑ کا کفن دفن ہو گیا تو ان کے فرزند امام القائمؑ نے مجھ سے فرمایا: اے بصری! خطوں کے وہ جواب جو تمہارے پاس ہیں مجھے دیدو! تب میں نے خطوں کے وہ جواب ان کو دیدیے اور پھر اپنے دل میں سوچنے لگا کہ ان کی امامت پر یہ دو کھلی دلیلیں ہیں'، یعنی ایک تو آپ کا اپنے والد کی نماز جنازہ پڑھانا اور دوسرے یہ جان لینا کہ میں مدائن سے خطوں کے جواب لے کر آیا ہوں۔ حالانکہ اس کا کسی اور شخص کو علم ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد میں جعفر بن علیؑ کے پاس گیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اتنے میں قم کے کچھ لوگ امام ابو محمد حسن عسکریؑ سے ملنے کے لیے آئے کیونکہ ان کو سامرا میں داخل ہونے سے پہلے آپ کی شہادت کا علم نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا: ہم کس کو پرسہ دیں؟ لوگوں نے امام کے بھائی جعفر کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ وہ جعفر کے پاس گئے، پہلے تعزیت ادا کی اور پھر اس کو امامت کی مبارکباد دی۔ اس کے بعد کہنے لگے: ہمارے پاس کچھ مال اور چند خطوط ہیں۔ اگر آپ ہم کو یہ بتائیں کہ وہ خطوط کس کس کے ہیں اور مال کی مقدار کیا ہے تو ہم وہ سب کچھ آپ کے حوالہ کر دیں گے۔ تب وہ اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: آیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم غیب جانتے ہیں؟ جعفر کا یہ جواب سنا تو ان لوگوں نے اس کو کچھ بھی نہ دیا۔

وہ لوگ اس معاملہ میں پریشان کھڑے تھے کہ امام کے مکان سے ایک غلام نکلا اور اس نے ان لوگوں سے کہا: تمہارے پاس فلاں فلاں اشخاص کے خطوط ہیں، ایک تھیلی میں ایک ہزار دینار ہیں اور ان میں سے دس دینار سونے کے ہیں۔ اس پر ان لوگوں نے وہ خطوط اور رقم اس کے حوالہ کر دی اور بولے: جس نے تم کو یہ بتایا ہے، وہی ابو محمدؑ کے بعد امامت کا امامؑ ہے۔ یہ دیکھ کر جعفر بن علیؑ کو بڑا غصہ آیا اور اس نے خلیفہ معتمد عباسی کے پاس جاکر اہل قم کا یہ پورا قصہ بیان کر دیا۔ تب معتمد نے اس کے ہمراہ اپنے پیادے بھیج دیے جنھوں نے امام مہدیؑ کی والدہ صیقل (بی بی نرجس) کو گرفتار کر لیا اور ان سے کہا کہ وہ امامؑ کو پیش کریں۔ جب انھوں نے اس سے انکار کیا تو ان کو قاضی ابن ابی شوراب کے سپرد کر دیا گیا لیکن راوی کا کہنا ہے کہ خلیفہ کے وزیر عبیداللہ بن خاقان کی اچانک موت اور بصرہ میں صاحب زنج کی فوج کشی کے باعث بی بی کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی اور انکو ظالموں سے نجات مل گئی۔

شیخ صدوق نے اکمال الدین میں ابو الحسن بن علی بن سنان سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب امام ابو محمد حسن عسکریؑ کی شہادت ہوئی تو قم اور جبال کے کچھ لوگ مال خمس لے کر آئے کہ جن کو امام کی شہادت کا علم نہ تھا۔ البتہ جب وہ سامرا میں داخل ہوئے اور ان کو آپ کی شہادت کا علم ہوا تو انہوں نے آپ کے جانشین کے متعلق دریافت کیا۔ چنانچہ ان کو بتایا گیا کہ وہ جعفر بن علیؑ ہے۔ جبکہ وہ اس وقت گویوں اور بے فکر نوجوانوں کو ساتھ لیکر عیش و عشرت کے لیے دریائے دجلہ پر گیا ہوا تھا۔ جب وہ وہاں سے واپس آیا تو ان لوگوں نے اس سے ملاقات کی اور کہا: اے آقا! ہم لوگ قم اور اس کے نواح سے آئے ہیں اور امام ابو محمد حسن عسکریؑ کے لیے مال خمس لیکر آئے ہیں۔ آپ ہم کو اس مال کی مقدار بتا دیجیے اور یہ بھی بتائیے کہ وہ کہاں کہاں سے جمع کیا گیا ہے۔ اس پر جعفر نے ان سے کہا: تم لوگ میرے بھائی پر جھوٹ باندھتے ہو، کیونکہ وہ ایسا نہیں کیا کرتے تھے بلکہ یہ تو علم غیب ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔ ان کی یہ بات سن کر وہ لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ پھر جعفر نے ان سے کہا: اب تم وہ مال نکالو۔ وہ بولے: ہم تاجر لوگ ہیں اور ہم یہ مال صرف وہ نشانیاں دیکھ کر ہی دے سکتے ہیں جو ہم آپ کے بھائی میں دیکھا کرتے تھے۔ اگر آپ امام ہیں تو پھر اس پر اپنی دلیلیں ہمارے سامنے پیش کیجیے، ورنہ ہم یہ مال واپس لے جا کر اس کے مالکوں کے حوالے کر دیں گے۔ اس پر جعفر وہاں سے اٹھ کر خلیفہ معتمد کے پاس چلا گیا اور اس سے ان قم کے لوگوں کے خلاف مدد طلب کی۔ چنانچہ اس نے ان کو حکم دیا کہ وہ خمس کا یہ مال جعفر کے حوالے کر دیں لیکن انہوں نے کہا کہ ہم تاجر لوگ ہیں اور ہم کو تاکید کی گئی ہے کہ ہم امامت کی دلیل اور علامت دیکھے بغیر یہ مال کسی کے حوالے نہ کریں، جیسا کہ ہم ان کے بھائی کے زمانہ میں کیا کرتے تھے کیونکہ وہ ہم کو ان دیناروں کی تعداد بتانے کے علاوہ ان لوگوں کے نام بتا دیا کرتے تھے جنہوں نے وہ بھیجے ہوتے تھے۔ پس اگر یہ شخص حامل امامت ہے تو ہمارے سامنے اس مال کی تفصیل اسی طرح بیان کرے جس طرح اسکے بھائی امام حسن عسکریؑ بیان کیا کرتے تھے۔ ورنہ ہم یہ مال واپس لے جا کر اس کے مالکوں کو دے دیں گے۔

اس کے بعد وہ لوگ سامرا سے چل دیے اور جب وہ شہر سے باہر پہنچے تو ایک

جوان شخص نے ان سے ملاقات کی اور کہا: اے فلاں اور اے فلاں! تم اپنے آقا کے بلاوے پر ان کے پاس چلو، چنانچہ وہ وہاں سے پلٹ کر امام مہدی القائمؑ کی خدمت میں آ پہنچے۔ آپ نے ان کو مال کی مقدار کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ یہ کس کس نے بھیجا ہے۔ تب ان لوگوں نے وہ مال آپ کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے ان کو ہدایت کی کہ آئندہ سے وہ کوئی بھی چیز سامرا نہ بھیجیں بلکہ اپنے خط اور مال آپ کے نائبوں کے پاس بغداد بھیجا کریں۔

راوی مزید بیان کرتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد جعفر بن علیؑ نے مال کی ایک بھاری مقدار لے جا کر خلیفہ معتمد کو پیش کی اور اس سے درخواست کی کہ: مجھ کو میرے بھائی کی جگہ پر امامت کا منصب عطا کیا جائے۔ اس نے کہا کہ: تمہارے بھائی کا مرتبہ امامت ہمارے بس میں نہیں تھا بلکہ ہم تو اس کے مٹانے کی کوشش کیا کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے مرتبہ کو بڑھاتا ہی رہا کیونکہ وہ حسن عمل اور نشر علم اور عبادت میں منہمک رہتے تھے۔ اگر تم ان کے شیعوں کے نزدیک امامت کی منزلت پر ہو تو تم کو ہمارے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم تم کو کچھ نہیں دے سکتے۔

قطع نظر اس سے کہ یہ روایتیں صحیح ہیں یا نہیں تاہم اس امر میں شک نہیں کہ اہل حکومت اور ان کے عمال نے اپنی انتہائی کوشش کر ڈالی کہ وہ شیعوں کو جعفر بن علیؑ کی طرف مائل کر دیں۔ کیونکہ وہ ان کے حامیوں میں سے تھا اور ان کے ساتھ ان کے دسترخوان پر اور ناچ گانے کی محفلوں میں حاضر رہا کرتا تھا۔ دوسری طرف وہ مشکل تر حالات کہ جو امام مہدیؑ کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں کے لیے مددگار ثابت ہو رہے تھے کیونکہ آپ کا لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہنا بھی ان لوگوں کے لیے یہ دلیل مہیا کرتا تھا کہ جعفر ہی اپنے باپ اور بھائی کا واحد وارث ہے، جبکہ خود جعفر بھی امام القائمؑ کے وجود سے ناواقف نہیں تھا اور اہل حکومت بھی اس امر کو جانتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ بھی ان لوگوں کی فریب کاریوں پر نظر رکھتا تھا اور اس نے ان کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ چنانچہ امام القائمؑ کا انکار کرنے والے ناکامی کے رنج میں دانت پیس کر رہ گئے اور کچھ حاصل نہ کر پائے، جبکہ آپ کے آباء کرامؑ کے شیعہ آپ سے وابستہ ہو گئے اور غیبت صغریٰ کے زمانہ میں آپ کے سفیروں اور وکیلوں کے ذریعہ آپ سے رابطہ قائم کیے رہے جیسا کہ دسیوں روایات سے

ظاہر ہونا ہے۔

امام حسن عسکریؑ کے بھائی جعفر بن علیؑ کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام محسن بن جعفر تھا۔ اس کو دمشق کے نواحی علاقہ میں عربوں کی ایک جماعت نے قتل کر دیا تھا اور دعویٰ کیا کہ اس نے خلیفہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ چنانچہ اس کا سر بغداد لایا گیا اور وہاں پل پر لٹکا دیا گیا، جیسا کہ الکنیٰ والالقاب، قمی میں مذکور ہے۔

جعفر کے دوسرے بیٹے عیسیٰ کے بارے میں قمی کا بیان ہے کہ وہ ایک عالم و فاضل شخص تھے۔ چنانچہ ہارون بن موسیٰ تلعکبری نے ان سے حدیثیں سنی ہیں۔ جب اس نے ان سے اجازۂ روایات طلب کیا تو انہوں نے اس کو اجازہ دیدیا اور اس نے یہ اشعار کہے تھے:

> اے فرزندان نبی اکرمؐ! ہم آج تم کو پکارتے ہیں اور امید ہے کہ تم کل (قیامت میں) ہم کو سہارا دو گے۔ تم نے ہم کو علم کے ہزار باب عطا کیے ہیں اور پھر ہر باب سے ہزار ہزار باب نکلے ہیں۔ حکومت تمہاری ہی ہے اور تمہی کو آخری فیصلے کرنے کا اختیار ہے۔

امام مہدیؑ کی غَیبتِ صغریٰ اور نوابین اربعہ

راویوں نے امام مہدی القائمؑ کی غیبت اور اس کے اسباب کے ذیل میں امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ سے روایت کی ہے کہ پہلے تو اللہ نے آپ کی ولادت کو پوشیدہ رکھا اور پھر آپ کو لوگوں کی نظروں سے غائب رکھا تاکہ آپ کو کسی شخص کی بیعت کا پابند نہ ہونا پڑے۔ اس طرح امام ابو جعفر محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ امام مہدیؑ بنی عباس کی طرف سے خوف و خطر کی وجہ سے غیبت میں رہیں گے۔

عبداللہ بن فضل ہاشمی سے روایت ہے کہ جب ایک شخص نے امام مہدیؑ کی غیبت کے بارے میں امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس غیبت کی مصلحت آپ کے ظہور کے بعد ظاہر ہو گی، جس طرح سے حضرت خضرؑ کے کاموں کی مصلحت ان کے حضرت موسیٰؑ سے علیحدہ ہونے کے بعد ظاہر ہوئی تھی۔ آپ نے مزید

فرمایا کہ یہ معاملہ اللہ کے معاملات میں سے ہے ۔ ________ اس کے رازوں میں سے ایک راز ہے اور اس کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے ۔ جب ہم مانتے ہیں کہ اللہ حکیم ہے تو ہم کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس کے ہر فعل میں مصلحت ہوتی ہے خواہ وہ ہم پر واضح ہو یا نہ ہو۔ میری رائے میں امام القائمؑ کی غیبت کے اسباب کے متعلق امام جعفرؑ صادق سے مروی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اسباب غیبت بھی سرّ الٰہی میں سے ہیں اور یہ معاملہ صرف اللہ ہی کے علم میں ہے ۔ چنانچہ ہم اللہ کی اس مشیئت کو مان لینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ آپ کی طویل زندگی اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کے ظہور کی بابت شک کرنا گویا سبھی انبیاءؑ کی نبوت اور آپ کے آبائے کرامؑ کی امامت پر شک کرنے کے برابر ہے

آپ کے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد تقریباً ستر سال کے عرصہ تک کوئی شخص ان چار نائبین یعنی عثمان بن سعید العمری، محمد بن عثمان العمری، حسین بن روح نوبختی اور علی بن محمد السمری کی وساطت کے بغیر آپ سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا ۔ یہی نائبین مختلف مقامات پر رہنے والے شیعوں کے اور آپ کے مابین رابطہ قائم رکھتے تھے ۔ وہ ان لوگوں کے خطوط آپ کے پاس لاتے اور آپ کی طرف سے ان کا جواب ان کو پہنچایا کرتے تھے ۔ نیز آپ نے ان کو مال خمس وصول کرنے اور اس کو آپ کی بتائی ہوئی مصلحتوں کے مطابق خرچ کرنے کا مجاز بھی قرار دے رکھا تھا ۔ آپ کی امامت کے ابتدائی زمانہ میں نیابت کا یہ عہدہ عثمان بن سعید العمری کے پاس رہا کہ جن کا عرف سمّان تھا کیونکہ روایات کے مطابق وہ سمن (روغنیات) کے تاجر تھے اور اپنی اس تجارت کے ذریعہ سے شیعوں کے گھروں میں اس طرح آتے جاتے تھے کہ اہل حکومت پر ان کا یہ عمل ظاہر نہیں ہونے پاتا تھا ۔ جب کوئی شیعہ ان کو خمس کی رقم دیتا تو وہ اس کو تیل رکھنے کی مشک میں ڈال کر لوگوں سے پوشیدہ کر لیتے تھے ۔ وہ تین اماموں یعنی امام علی نقیؑ، امام حسن عسکریؑ اور امام القائم المنتظرؑ کے نائب کے طور پر خدمت کرتے رہے ۔

احمد بن اسحاق بن سعد قمی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ایک روز میں نے امام ابوالحسن علی نقیؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے آقا! میں آپ کے پاس آتا رہتا ہوں لیکن کبھی کبھی آپ تک رسائی نہیں ہو پاتی ۔ پس یہ فرما دیجیے کہ ایسی صورت میں

ہم لوگ آپ کی بجائے کس کی بات مانا کریں اور کس کو آپ کا نمائندہ تصور کریں؟ آپ نے فرمایا: یہ ابو عمرو ہیں کہ جو صاحب اعتماد اور امین ہیں۔ جو کچھ یہ کہیں یہ میری طرف سے ہے اور جو حکم یہ دیں گے وہ میری طرف سے ہو گا۔

عثمان بن سعید العمری

شیخ طوسی نے کتاب الغیبتہ میں علی بن ہلال، محمد بن معاویہ بن حکیم اور حسن بن ایوب بن نوح وغیرہ چند شیعوں سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا ہم امام ابو محمد حسن عسکریؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ ان سے پوچھیں کہ ان کے بعد امام کون ہو گا۔ اس وقت آپ کے حضور میں تقریباً چالیس افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ عثمان بن سعید نے آپ سے عرض کیا کہ: "اے فرزند رسولؐ! میں آپ سے ایک ایسی بات پوچھنا چاہتا ہوں جو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں"۔ آپ نے فرمایا: اے عثمان! بیٹھ جاؤ۔ اس پر وہ رنجیدہ ہو کر جانے لگے تو امامؑ نے عثمان بن سعید کو پکارا تو وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ تب امامؑ نے فرمایا: اب میں تم کو وہ بات بتلاتا ہوں کہ جس کے لیے تم سب آئے ہو۔ ہم سب نے کہا: ضرور اے فرزند رسولؐ! آپ نے فرمایا: تم مجھ سے یہ پوچھنے آئے ہو کہ میرے بعد امام کون ہو گا؟ سب نے کہا: جی ہاں! اتنے میں ایک صاحبزادے گھر کے اندر سے نکل کر ہمارے سامنے آئے کہ جن کا چہرہ چاند کی مانند روشن تھا اور وہ امام ابو محمدؑ سے بہت مشابہ تھے۔ اب امامؑ نے فرمایا: میرے بعد یہ تمہارا امام اور میرا جانشین ہے۔ اس کی اطاعت کرنا اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرنا ورنہ تم دین کے معاملے میں برباد ہو جاؤ گے البتہ آج کے بعد تم اس کو کبھی نہ دیکھ پاؤ گے۔ پس جو کچھ عثمان بن سعید کہیں تم وہ مانتے رہنا، ان کے قول کو قبول کرنا اور ان کے حکم کو معتبر جاننا کیونکہ یہی تمہارے امام کے نائب ہیں اور سارے کام انہی کے سپرد ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ان کا بیٹا محمد بھی میرے بیٹے اور تمہارے امام مہدیؑ کا نائب ہو گا۔ چنانچہ امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد عثمان بن سعید العمری امام مہدی القائمؑ کے نائب کا عہدہ سنبھالے رہے۔ البتہ راویوں نے اس کی مدت نہیں بتائی۔ گویا کہ وہ اپنی وفات تک نائب امام رہے اور

اپنے بعد انہوں نے یہ عہدہ امام الحجت ؑ کے حکم سے اپنے بیٹے ابو جعفر محمد بن عثمان عمری کے سپرد کر دیا۔

محمد بن عثمان العمری

محمد بن ابراہیم بن مہزیار اہوازی سے روایت ہے کہ ابو عمرو عثمان بن سعید العمری کی وفات کے بعد امام القائم ؑ نے ایک توقیع نامہ میں فرمایا کہ عثمان کا بیٹا بھی ہمارے نزدیک صاحبِ اعتماد ہے' اللہ اس سے راضی رہے اور وہ اللہ کو راضی رکھے۔ اللہ اس کے چہرہ کو روشن رکھے کہ وہ ہمارے ہی کہنے پر چلتا اور ہمارے ہی کہنے پر رکتا ہے۔ وہ ہمارے حکم کے مطابق احکام جاری کرتا ہے اور خود بھی انہی پر عمل کرتا ہے'۔ اس لیے اللہ بھی اس کو دوست رکھتا ہے۔ پس تم اسی کے حکم پر قائم رہو اور یہ بات ہمارے شیعوں کو بھی بتا دو۔

عبید اللہ بن جعفر الحمیری سے روایت ہے کہ: امام حجت القائم ؑ نے محمد بن عثمان العمری کو ان کے باپ کے انتقال پر پرسہ دیا تو اس میں تحریر فرمایا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ تَسْلِیْمًا لِّاَمْرِہٖ وَرِضًا بِقَضَآئِہٖ امابعد۔ تمہارے والد زندگی میں نیک اطوار اور موت کے وقت قابلِ تعریف تھے۔ اللہ ان پر رحمت نازل کرے اور ان کو اپنے دوستداروں اور خدمت گزاروں میں شامل کرے کیونکہ وہ انہی کے مقاصد کے حصول میں کوشاں تھے اور ایسا عمل کرتے تھے جس سے ان کو اللہ تعالیٰ کا اور اس کے مقربین کا تقرب حاصل ہو جائے۔ پس اللہ ان کے چہرے کو روشن رکھے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر کرے' تمہارے اجر و ثواب میں اضافہ کرے اور تمہارے غم کو قبول فرمائے۔ ان کی وفات تمہارے ساتھ ہمارے لیے بھی باعثِ غم ہے۔ ان کی جدائی تمہارے ساتھ ہم پر بھی شاق ہے۔ اللہ ان کو اس نئی زندگی میں خوش رکھے۔ یہ ان کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اللہ نے ان کو تم جیسا فرزند عطا کیا ہے جو ان کے بعد ان کا جانشین ہے' خدا کے حکم سے ان کی جگہ پر متمکن ہوا اور ان کے واسطے رحمت طلب کرتا ہے۔ لوگ تمہاری نیابت پر خوش ہیں اور تمہاری صلاحیتوں اور تمہارے کردار پر مطمئن ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے' تم کو قوت دے' طاقت میں اضافہ کرے اور خیر کی توفیق سے نوازے۔ وہی تمہارا سرپرست' نگہبان' مالک اور سازگار ہے۔

امام مہدی القائمؑ کے وہ خطوط جو آپ شیعوں کے دینی اور معاشرتی اہم معاملات پر ان کو لکھتے تھے، وہ محمد بن عثمان العمری کے ہاتھوں ان لوگوں تک اسی طرح پہنچا کرتے تھے جس طرح ان کے والد عثمان بن سعید کے زمانہ میں آیا کرتے تھے۔ چنانچہ شیعوں کے لیے ان کے علاوہ کوئی اور واسطہ نہ تھا کہ جس سے وہ امامؑ سے اپنا تعلق قائم رکھیں۔ اسلامی فقہ کا مطالعہ کرنے والے شخص کو اس کے ہر باب میں امام مہدی القائمؑ کے ارشادات ملتے ہیں، جو آپ نائبوں کے ذریعہ سے شیعوں کے سوالات کے جواب میں بھیجا کرتے تھے۔ ان میں سے بیشتر جواب غالباً محمد بن عثمان العمری کے ذریعہ سے لوگوں تک پہنچے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاروں نائبوں میں ان کی نیابت کی مدت سب سے طویل تھی جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد کی وفات پر ۲۶۵ھ میں امام القائمؑ کے نائب بنے اور ۳۰۵ھ تک اس منصب پر قائم رہے۔ اس طرح ان کی نیابت کی مدت چالیس سال ہوتی ہے جبکہ ان کے والد کی نیابت کا زمانہ صرف پانچ سال ہی تھا۔

انہوں نے اپنی وفات سے پہلے ہی اپنے لیے ایک قبر کھدوالی اور اس پر قرآن کی کچھ آیتیں اور ائمہ کرامؑ کے اسماء مبارکہ لکھوا دیے تھے۔ وہ خود روزانہ وہاں جاکر قرآن کا ایک پارہ تلاوت کیا کرتے تھے۔ ان کی قبر بغداد میں قبر خلانی کے نام سے مشہور ہے۔

ابوالقاسم حسین بن روح

محمد بن عثمان العمری نے امام مہدی القائمؑ کے معاملات کے لیے ابوالقاسم حسین بن روح نوبختی کے حق میں وصیت کر دی تھی، بلکہ شیعہ عوام ان کی زندگی کے آخری دنوں ہی میں حسین بن روح سے ہدایات حاصل کرنے لگے تھے۔ جیسا کہ جعفر بن محمد مدائنی بیان کرتے ہیں کہ: میں امامؑ کے لیے خمس کی رقمیں لاکر ابوجعفر محمد بن عثمان العمری کے حوالہ کر دیا کرتا تھا اور دوسرے لوگ بھی اموال خمس کے معاملہ میں ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مدائنی مزید کہتے ہیں کہ ان کے آخری ایام میں ایک مرتبہ میں چار سو دینار خمس لے کر ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا: آپ یہ مال حسین بن روح کو دیدیں۔ اس پر ہم دونوں میں طویل گفت و شنید ہوتی رہی۔ پھر بھی انہوں نے وہ رقم خود نہ لی بلکہ مجھ کو سختی سے کہا: اللہ آپ کو معاف کرے، میرے پاس سے چلے جائیں، کیونکہ میں نے حسین بن روح کو اپنی جگہ بٹھا دیا ہے اور اپنی ذمہ داریاں ان کے

سپرد کر دی ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ جب مجھ کو یقین ہو گیا کہ انہوں نے امام ہی کے حکم سے ایسا کیا ہے تو میں نے جا کر وہ رقم ان کو دیدی۔

شیخ طوسی کی روایت میں آیا ہے کہ جب ابو جعفر محمد بن عثمان العمری کی حالت خراب ہوئی تو کچھ ممتاز شیعہ افراد نے ان سے کہا: اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو آپ کی جگہ کون لے گا؟ تب انہوں نے کہا: یہ ابوالقاسم حسین بن روح بن ابی بحر نوبختی ہیں جو میری جگہ پر نائب امام ہوں گے۔ یہ تمہارے اور امامؑ کے درمیان واسطہ ہوں گے اور یہ ان کے صاحبِ اعتماد وکیل اور امین ہیں۔ تم لوگ اپنے دینی معاملات میں ان سے رابطہ رکھنا اور اپنی مشکلات میں انہی پر بھروسہ کرنا۔ جان رکھو کہ مجھ کو یہی حکم دیا گیا ہے جو میں نے تم تک پہنچا دیا ہے۔

راویوں کا بیان ہے کہ وہ امام القائمؑ کی نیابت اور وکالت کے معاملات میں نہایت دانشمند ثابت ہوئے تھے۔ اس لیے عوام و خواص سب حلقوں میں ان کی عزت کی جاتی تھی۔ وہ اپنے حسن عمل اور معاملہ فہمی میں اس حد تک یکتا مانے جاتے تھے کہ اگر کوئی ان کو شیعیت سے منسوب کرتا تھا تو لوگ اس کی بات کا یقین نہ کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمیوں میں بحث چھڑ گئی۔ جن میں سے ایک کا کہنا تھا کہ رسول اللہ صلعم کے بعد سب لوگوں سے افضل ابوبکر ہیں۔ ان کے بعد عمر بن خطاب، عثمان بن عفان اور پھر علی بن ابی طالبؑ آتے ہیں۔ جبکہ دوسرے کا کہنا تھا کہ رسول اللہؐ کے بعد ساری مخلوق میں علیؑ سب سے افضل ہیں۔ چنانچہ ان کے سامنے ہی سامنے ان دو آدمیوں کا جھگڑا بڑھ گیا۔ اس وقت وہاں سنی اور شیعہ دونوں کا انبوہ کثیر موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کو اہل حکومت کی طرف سے خود اپنے لیے اور امامؑ کے لیے خوف لگا رہتا تھا، اس بنا پر ان کو مصلحت سے کام لینے کی عادت ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس جھگڑے کو اپنی دانشمندی سے ختم کر دیا اور کہا: صحابہ نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ ابوبکر مقدم ہیں۔ ان کے بعد فاروق، عثمان اور ان کے بعد علیؑ کہ جو وصی پیمبرؐ ہیں۔ صاحبان حدیث بھی اسی کے قائل اور ہمارے نزدیک وہ صحیح کہتے ہیں۔ ان کے اس بیان کو لوگوں نے بہت پسند کیا، عوام نے ان کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ جو لوگ انکو شیعیت سے منسوب کر رہے تھے ان کو خوب برا بھلا کہا۔ ایک مرتبہ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے دربان نے معاویہ پر لعنت کی اور ان کو برا کہا ہے تو انہوں نے اس کو ملازمت سے برطرف

کرنے اور وہاں سے نکال دیے جانے کا حکم دیا اور پھر اس کے حق میں کسی کی سفارش قبول نہیں کی۔[1]

ابوالقاسم حسین بن روح بن ابو بحر نوبختی تقریباً اکیس سال یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ تک امام القائمؑ اور کروڑوں شیعوں کے مابین نیابت اور وکالت کے عہدہ پر فائز رہے، جو ان سے اپنے معاملات اور مشکلات میں رجوع کیا کرتے اور وہ امامؑ سے ان کے مسائل کے تحریری جوابات لا کر ان کو دیا کرتے تھے۔ وہ ۳۲۶ھ میں بغداد میں فوت ہوئے، ان کی قبر آج تک موجود ہے اور لوگوں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی وفات کے قریب امامؑ کے حکم سے اپنا منصب علی بن محمد السمری کے سپرد کر دیا۔

علی بن محمد السمری

حسین بن روح کی وفات کے بعد علی بن محمد السمری نے نائب امام کی وہ ذمہ داری سنبھالی جو ان کے پیشرو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کی نیابت کا زمانہ تین سال سے زیادہ نہیں رہا۔ کیونکہ غیبت صغریٰ کا وہ زمانہ کہ جس کے دوران یکے بعد دیگرے آپ کے چار نائبوں کے ذریعہ امام القائمؑ سے رابطہ رہا اس کی میعاد ختم ہو گئی تھی۔

راوی کہتے ہیں کہ اپنی وفات سے پہلے علی بن محمد السمری، لوگوں کے پاس امامؑ کا ایک توقیع نامہ لائے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ "اے علی بن محمد! خدا کے ہاں تمہارا اور تمہارے ان بھائیوں کا عظیم ترین اجر ہے کہ جو تم سے پہلے ہماری نیابت کرتے رہے۔ پس آگاہ رہو کہ تم آج سے چھ روز کے اندر اندر مرنے والے ہو۔ تم نہ تو اس پر فکر مند ہونا اور نہ اپنے بعد کے لیے کسی کو جانشین بنانا، کیونکہ اب غیبت کبریٰ شروع ہو گئی ہے۔ اب ہمارا ظہور صرف اسی وقت ہو گا جب اللہ تعالیٰ اسکی اجازت دے گا۔ لیکن یہ موقع ایک طویل مدت کے گزرنے اور لوگوں کے دلوں کے سخت ہو جانے کے بعد آئے گا۔ جبکہ یہ زمین ظلم و ستم سے بھر چکی ہوگی۔ اس دوران جو کوئی میرے شیعوں کے پاس آ کر یہ دعویٰ کرے گا کہ اس نے مجھ کو دیکھا ہے وہ جھوٹا اور فریب کار ہو گا۔"

---

[1] ابو الحسن بن کبریا نوبختی کے بقول حسین بن روح کی یہ گفتگو اور طرز عمل تقیہ پر مبنی تھا۔

راوی نے مزید بیان کیا ہے کہ چھ روز کے بعد جب ہم ان کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ حالت احتضار میں ہیں۔ پس ہم نے ان سے دریافت کیا: اپنے بعد آپ نے کس کے حق میں وصیت فرمائی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ معاملہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے اور وہ اس کا پورا کرنے والا ہے۔ سمری کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی جبکہ امام مہدیؑ کی عمر ۷۴ سال ہو چکی تھی، جس میں سے ساڑھے چار سال آپ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہے اور بقایا ساڑھے انہتر سال آپ غیبت صغریٰ میں رہے تھے۔ مسعودی نے اثبات الوصیۃ میں کہا ہے کہ غیبت صغریٰ کے ختم ہونے کے وقت آپ کی عمر شریف ۷۶ سال اور ۱۱ مہینے تھی۔ جو معتمد، معتضد، مقتدر اور راضی کی خلافت میں گزری۔ اگرچہ مورخین کا کہنا ہے کہ ان خلفاء کی خلافت عباسیوں کے تنزل اور پراگندگی کا دور تھا جبکہ خلیفہ کو مہریں لگانے اور دستخط کرنے کے علاوہ کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ پھر بھی یہ لوگ امامؑ کے ان سفیروں اور وکیلوں پر کڑی نظر رکھتے تھے جو مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ نیز وہ روایات کہ جن میں امام مہدیؑ کے متعلق ان اہل حکومت کے طرزِ عمل کا ذکر ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باربار یہ کوشش کرتے تھے کہ آپ کو گرفتار کر لیں۔

امام مہدیؑ کی سفارت کے جھوٹے مدعی

راویوں کا بیان ہے کہ وہ مال جو امامؑ کے وکیلوں اور سفیروں کے ذریعہ سے آپ کے پاس آتا تھا، اس کے لالچ میں کچھ فریب کاروں نے آپ کی سفارت کا جھوٹا دعویٰ کر کے شیعوں کو دھوکہ دینا شروع کر دیا تھا، بلکہ بعض دیگر وجوہ کی بنا پر اہل حکومت بھی اس دراندازی سے لاتعلق نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امامؑ نے اپنے خطوں میں شیعوں کو ان لوگوں سے خبردار کیا اور یہ حکم بھی دیا کہ وہ ان مکاروں پر لعنت کریں۔ چنانچہ انہوں نے ان جھوٹ موٹ کے سفیروں پر لعنت کی اور ان سے اظہار بیزاری کیا بلکہ ان کے علاوہ ان سب سے بھی برائت چاہی، جنہوں نے اہل بیتؑ سے دشمنی کی، ان کے مرتبے سے انکار کیا، ان کی حدیثوں میں آمیزش کی اور ان کے متعلق ایسی باتیں کہیں جو خود انہوں نے اپنے بارے میں نہیں کہی تھیں۔ نیز ان کے حق میں رسول اللہؐ کی وصیتوں کو فراموش کر دیا۔ ایسے لوگوں پر تا روز قیامت پھٹکار پڑتی رہے گی۔

وہ روایتیں کہ جن میں اس قسم کے جھوٹے دعووں کا بیان آیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کی سفارت کے جھوٹے دعوے کرنے والے لوگ امام القائمؑ کے دوسرے نائب محمد بن عثمان العمری کے زمانہ ہی میں نمودار ہونے لگے تھے جن کی مدت نیابت بیس سال سے زیادہ عرصہ تک رہی تھی۔ ان کے دور میں جن لوگوں نے ایسے دعوے کیے ان میں حسین ابو محمد شریعی، محمد بن نصیر نمیری، احمد بن ہلال کرخی، ابو طاہر محمد بن بلال بلالی، اسحٰق احمر اور عمری کا اپنا بھتیجا محمد بن احمد بن عثمان عرف بغدادی وغیرہ شامل ہیں۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ اس سے پہلے بڑے پختہ عقیدے کے مالک تھے اور وہ امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کا عہد امامت دیکھ چکے تھے، لیکن بعد میں غلط راہ پر چل پڑے اور ایسی باتوں کے قائل ہوگئے جو نظریۂ شیعیت اور اصول اسلام کے موافق نہیں تھیں۔ اسی طرح امام القائمؑ کے تیسرے نائب حسین بن روح کے زمانہ میں محمد بن علی شلمغانی العزاقری کو اس کے نفسانی خواہشوں نے گمراہی کے گڑھے میں دھکیل دیا اور اس نے امامؑ کی سفارت کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ نیز بعض راوی اور مؤرخین کہتے ہیں کہ صوفیاء میں سے ایک مشہور فرد یعنی حسین بن منصور حلاج نے بھی اس طرح کا دعویٰ کیا اور قریب تھا کہ وہ اپنے شعبدوں کی بدولت عوام کی عقلوں پر چھا جاتا لیکن ابو سہل بن اسمٰعیل بن علی نوبختی نے ایک مناظرے میں لوگوں پر اس کی حقیقت واضح کردی جو ان دونوں کے درمیان واقع ہوا جس میں اس کا منہ بند ہوگیا تھا۔ اس کے مزید حالات آگے چل کر بیان کریں گے۔

حسین ابو محمد شریعی

حسین ابو محمد شریعی، امام ابوالحسن علی نقیؑ اور امام ابو محمد حسن عسکریؑ دونوں کا صحابی تھا اور بعد میں گمراہ ہوگیا۔ وہ ان دونوں اماموں کے بارے میں غلو کرتے ہوئے ان سے ایسی باتیں منسوب کرنے لگا جو ایک انسان کا خاصہ نہیں ہیں۔ نیز وہ امام القائمؑ کا سفیر ہونے کے ساتھ ہی اپنی رسالت کا دعویٰ بھی کرنے لگا تھا۔ چنانچہ امام مہدی القائمؑ نے اس کے بارے میں توقیع نامہ جاری فرمایا جس میں اس پر لعنت کرنے اور اس سے اظہار بیزاری کا حکم دیا گیا تھا۔ تب شیعوں نے اس پر لعنت کی اور اس سے اظہار بیزاری کیا۔

محمد بن نصیر نمیری

محمد بن نصیر نمیری کی بابت ہم پہلے ہی امام حسن عسکریؑ کے عہد میں غالیوں اور گمراہوں کے تذکرے میں بتلا چکے ہیں کہ اس کے تمام اقوال و افعال میں کفر اور الحاد کی علامات ظاہر ہو گئی تھیں کیونکہ وہ تناسخ ارواح اور محرم عورتوں کے مباح ہونے کا قائل ہو گیا تھا۔ چنانچہ امام حسن عسکریؑ نے حسن بن محمد بن بابا قمی اور اسی نمیری کی مذمت میں ایک سخت خط بھی لکھا تھا۔ وہ جن بری باتوں کا قائل تھا، وہ کچھ لوگوں میں رائج ہو گئیں اور پھر ان کو نمیریہ کہا جانے لگا تھا۔ امام حسن عسکریؑ کی شہادت کے بعد اس نے یہ دعویٰ داغ دیا کہ وہ امام القائمؑ کا سفیر ہے اور ان کے اور ان کے شیعوں کے درمیان تعلق کا ذریعہ ہے، جبکہ اس سے قبل وہ نبوت کا دعویٰ کیا کرتا اور کہتا تھا کہ امام علی نقیؑ نے اس کو عوام کی طرف بھیجا ہے۔ جب وہ قریب المرگ تھا تو اس سے پوچھا گیا کہ تمہارے بعد یہ منصب کس کو ملے گا؟ تب اس نے کمزور سی آواز میں کہا: "میرے بعد احمد ہے" لیکن وہ لوگ سمجھ نہ پائے کہ احمد سے کون مراد ہے اور اس کے بعد ان میں تفرقہ پڑ گیا اور جیساکہ کتاب الغیبۃ طوسی، الفرق نوبختی اور رجال کشی میں مذکور ہے۔

احمد بن ہلال کرخی

احمد بن ہلال کرخی، امام علی رضاؑ کے زمانہ سے لیکر امام القائمؑ کی غیبت صغریٰ کے پہلے سات سال تک زندہ رہا۔ امام حسن عسکریؑ اور امام مہدی القائمؑ دونوں نے ہی اس پر لعنت فرمائی تھی۔ چنانچہ امام القائمؑ نے عراق کے شیعوں کو اس سے خبردار کرنے کے لیے لکھا کہ: "تم لوگ اس بناوٹی صوفی سے ہوشیار رہو، خدا اس کے گناہوں کو نہ بخشے اور اس کی خطاؤں کو معاف نہ فرمائے۔ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس سے اور ہر اس شخص سے اظہار بیزاری کرتا ہوں جو اس سے اظہار بیزاری نہیں کرتا۔"

بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں کرخی صحیح راستے پر تھا، البتہ امام القائمؑ کے پہلے نائب عثمان بن سعید العمری کی وفات کے بعد اس شخص پر گمراہی سوار ہو گئی۔ چنانچہ اس نے ان کے بیٹے ابو جعفر محمد بن عثمان العمری کی نیابت کو نہیں مانا اور ان کو مال خمس کی رقمیں دینے سے انکار کر دیا جو اس نے امامؑ کے لیے وصول کی تھیں۔ جیساکہ طوسی نے کتاب الغیبۃ میں بیان کیا ہے۔

محمد بن بلال

محمد بن بلال بھی امام حسن عسکریؑ کے اصحاب میں سے تھا لیکن آپکی شہادت کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ میں اب بھی ان کا وکیل ہوں۔ چنانچہ وہ مال جو امامؑ کو پہنچانے کے لیے اس کے پاس آیا تھا وہ اس کو ہڑپ کر کے بیٹھ رہا۔ جب امام القائمؑ کے نائب ابو جعفر العمری نے اس سے اصرار کیا کہ امامؑ کا جو مال تمہارے پاس ہے وہ مجھ کو دیدو، تو اس نے ایک نہ مانی۔ اس کے بعد وہ اس کے گھر گئے تو وہاں اس کے حامیوں کی ایک جماعت بھی موجود تھی۔ ابو جعفر العمری نے اس سے کہا: میں تم کو اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کہ کیا امام القائمؑ نے تم کو یہ حکم نہیں دیا ہے کہ جو مال تمہارے پاس ہے وہ میرے حوالہ کردو۔ اس نے کہا: او خدایا! امامؑ نے مجھ کو یہ حکم تو دیا ہے۔ اس پر ابو جعفر وہاں سے چل کھڑے ہوئے اور ان لوگوں کو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ جب وہ کچھ بحال ہوئے تو محمد بن بلال کے بھائی ابو الطیب نے اس سے کہا: تم نے امام القائمؑ کو کہاں دیکھا؟ اس نے جواب میں کہا: ابو جعفر العمری مجھ کو ان کے ایک مکان میں لے گئے تھے۔ تب امام القائمؑ اپنے گھر سے نکل کر میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ کو یہ حکم دیا کہ جو بھی مال میرے پاس ہے میں وہ ابو جعفر العمری کو دیدوں۔

محمد بن احمد بن عثمان العمری

محمد بن احمد بن عثمان خود ابو جعفر العمری کے بھائی کا بیٹا تھا اور ان کے نزدیک وہ منحرفین میں سے تھا۔ چنانچہ وہ اس پر لعنت کرتے، اس سے اظہار بیزاری کرتے اور اپنے ساتھیوں کو اس سے خبردار کرتے رہتے تھے۔ ایک بار کچھ شیعہ راوی اور ممتاز افراد ابو جعفر العمری کے سامنے ائمہ کرامؑ کی حدیثیں بیان کر رہے تھے کہ اتفاق سے محمد بن احمد بن عثمان بھی ان کے پاس آ پہنچا۔ جب ابو جعفر نے اس کو آتے دیکھا تو حاضرین سے کہنے لگے: اب تم چپ ہو جاؤ کیونکہ یہ آنے والا تمہارے ساتھیوں میں سے نہیں ہے۔ مزید یہ کہ وہ ابو دلف محمد بن منظفر کاتب کے پانچ اقوال کو مانتا تھا جن میں ایک یہ تھا کہ: یہ پانچ افراد یعنی سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد بن اسود، عمار بن یاسر اور عمرو بن امیہ العمری خدا کی طرف سے امور دنیا کو چلانے پر مامور ہیں۔

مسلم فرقوں کے متعلق کتابیں لکھنے والے بعض مؤلفین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے

کہ احمد بن ہلال کرخی کے پیروکر خیبین بھی ان پانچ صحابیوں کے بارے میں اسی نظریہ کے حامل تھے اور ابو دلف محمد بن مظفر نے یہ نظریہ انہی سے لیا تھا۔ چنانچہ مسلم فرقوں پر لکھی گئی کتابوں میں ان کو بھی غالیوں کے مختلف فرقوں میں شمار کیا گیا ہے جو اس دور میں اسلام اور شیعیت سے نکل گئے تھے۔

محمد بن علی بن شلمغانی

جیسا کہ شیخ طوسی کی کتاب الغیبۃ میں ہے کہ محمد بن علی شلمغانی عرف ابو العزاقری بھی اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں صحیح عقیدہ پر رہا اور شیعوں میں اس کا بڑا مقام تھا۔ حتٰی کہ جب خلیفہ معتمد عباسی نے امام القائمؑ کے تیسرے نائب حسین بن روح کا پیچھا کیا اور وہ روپوش ہو گئے تو انہوں نے اسی کو اپنی بعض ذمہ داریوں کا نگہدار بنایا تھا اور شیعہ اپنے مسائل اور مشکلات میں اسی سے رجوع کیا کرتے تھے۔ نیز امام القائمؑ کی تحریریں بھی حسین بن روح کے ذریعہ سے اس کے پاس آیا کرتی تھیں۔ اس زمانہ میں جبکہ وہ صحیح العقیدہ تھا اس نے کچھ کتابیں بھی لکھیں جن میں سے ایک "کتاب التکلیف" تھی۔ جب وہ مکمل ہو گئی تو حسین ابن روح نے خود وہ کتاب بغور دیکھی اور اس کو ائمہ کرامؑ کی احادیث کے مطابق پایا۔ ابن شلمغانی کی ایک اور تالیف بھی تھی جس کا نام "کتاب التادیب" تھا۔ حسین ابن روح نے اس کی یہ کتاب قم کے شیعہ علماء اور راویان حدیث کے پاس بھیجی تاکہ وہ لوگ اس پر نظر ڈالیں۔ چنانچہ راوی کہتا ہے کہ ان علماء نے ابن روح کو لکھا کہ : یہ کتاب صحیح معلومات کی حامل ہے اور اس میں کوئی چیز خلاف مذہب نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اس نے فطرہ کی مقدار ایک صاع غلہ کی بجائے نصف صاع بتائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسین بن روح ——— اس کی کتابوں پر اس لیے نگاہ رکھا کرتے تھے کہ کہیں وہ ان میں مذہب امامیہ کے خلاف کوئی بات داخل نہ کر دے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شلمغانی ایک ایسی منزل سے گزر رہا تھا کہ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالآخر اس کی گمراہی ظاہر ہو کر رہی۔ جیسا کہ تاریخ کامل ابن اثیر کی چھٹی جلد میں مذکور ہے کہ آخر کار اس نے غلو، تناسخ اور حلول کے عقائد اختیار کر لیے تھے۔ اس کے ایک ساتھی ابو علی بن ہمام کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن علی شلمغانی کو یہ کہتے سنا کہ : خدا کی ذات تو ایک ہی ہے لیکن اس کے لباس مختلف ہیں اور وہ ایکدن

سفید میں ظاہر ہوتا ہے تو دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز نیلے رنگ میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

تاریخ کامل ابن اثیر نے اس پہ یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ: رسول اللہؐ کی روح ابوجعفر بن عثمان العمری میں، امیرالمومنین امام علیؑ کی روح ابوالقاسم حسین بن روح میں، اور بی بی فاطمہ زہراؑ کی روح ابوجعفر العمری کی بیٹی ام کلثوم میں منتقل ہو گئی ہے۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے اقوال ہیں جو اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں جن سے اس کا کفر و الحاد عیاں ہو جاتا ہے۔

راویوں کا بیان ہے کہ ۳۱۲ھ میں امام القائمؑ نے ایک توقیع نامہ جاری کیا جس میں فرمایا کہ: محمد بن علی شلمغانی اسلام سے پھر گیا ہے۔ اس نے دین میں الحاد کو داخل کیا ہے اور وہ ایسے دعوے کرتا ہے جو خدا کے حکم کے مقابلے میں کفر پر مبنی ہیں نیز یہ کہ وہ بے اصل اور جھوٹی باتیں گھڑتا ہے، مذہب میں غلط بیانی کرتا ہے اور یوں عظیم گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ پس ہم خدا اور اس کے رسولؐ کے سامنے اس سے اظہار بیزاری کرتے ہیں اور اس پر ظاہر میں اور باطن میں علانیہ اور پوشیدہ ہر وقت اور ہر حال میں خدا کی لعنت بھیجتے ہیں نیز ہر اس شخص پر بھی جو اس کی حمایت کرے یا اس کی پیروی کرے اور اس پر بھی کہ جس کو ہمارا یہ حکم پہنچے اور وہ اس کی دوستی پر قائم رہے۔

رفتہ رفتہ جب شلمغانی کا غلو اور الحاد مشہور عام ہو گیا اور اس کے عقائد اور اقوال پھیل گئے تو ۳۱۲ھ میں اس کو خلیفہ معتمد عباسی کے وزیر عبداللہ بن محمد بن عبیداللہ خاقانی نے اپنے پاس بلوایا، لیکن وہ روپوش ہو کر موصل بھاگ گیا اور وہاں ناصرالدولہ حسین بن عبداللہ بن حمدان کے ہاں پناہ لے لی۔ چار سال کے قریب وہاں قیام کرنے کے بعد وہ پھر بغداد آ گیا اور اہل حکومت سے چھپ چھپا کر اپنے خیالات کی ترویج میں لگ گیا۔ یہاں تک کہ ۳۲۲ھ میں خلیفہ راضی کی حکومت قائم ہو گئی اور اس کے وزیر محمد بن علی بن مقلہ نے اس کو گرفتار کر لیا اور اس کے گھر چھاپہ مار کر وہاں سے ایسے خطوط اور رقعات برآمد کیے جن میں لوگوں نے اس کو اس طرح خطاب کیا تھا کہ جس طرح ایک انسان دوسرے کو ہرگز خطاب نہیں کرتا لیکن اس نے خلیفہ کے سامنے کفر و الحاد کی ان تمام باتوں کا انکار کر دیا جو اس سے منسوب کی جاتی تھیں۔ البتہ اس کے بہت سے ساتھیوں نے گواہی دی کہ یہ شخص

امام القائمؑ کا سفیر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور بالآخر خلیفہ راضی کے وزیر ابن مقلہ نے اس کو علماء اور فقہاء کے سامنے پیش کر دیا اور اس کے اقوال ان کو بتائے۔ اس پر انھوں نے اس کے خون کے مباح ہونے کا فتویٰ دیدیا۔ چنانچہ اس کو اور اس کے ایک پیرو ابن ابی عون کو پھانسی دینے کے بعد ان کی لاشوں کو جلا دیا گیا، جیسا کہ تاریخ کامل ابن اثیر وغیرہ میں مذکور ہے۔

حسین بن منصور حلاّج

حسین بن منصور حلاج صوفیوں کے طبقہ میں سے تھا۔ ایک زمانہ میں اس کا مکر و فریب زوروں پر رہا اور اس میں کفر و الحاد کی علامات نمایاں ہو گئیں، چنانچہ اس کا شمار ان ممتاز صوفیوں میں ہونے لگا جو حلول اور کشف کے قائل تھے۔ بعض محدثین اور مستشرقین نے اس کو شیعہ صوفیوں میں شمار کیا ہے کیونکہ وہ تصوف کو علیؑ اور ان کی اولاد میں ہونیوالے ائمہ کرامؑ کی پیروی کرنے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر کامل مصطفیٰ شیبی کہ جو جامعۂ ازہر قاہرہ میں اسلامی فلسفہ کے استاد ہیں، انھوں نے تصوف اس کے مصادر اور اس کے سلسلوں کے متعلق اَلصِّلَةُ بَیْنَ التَّصَوُّفِ وَالتَّشَیُّعِ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے شیعوں کے ائمہ کرامؑ کو اصول تصوف کے بانی اور صوفیہ کے پیشرو قرار دیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان حضرات سے ایسے اقوال اور احوال منسوب کیے ہیں جو نظریۂ تصوف کی تائید کرتے ہیں اور جن پر انھوں نے اپنی کتاب کی بنیاد قائم کی ہے۔ حالانکہ وہ ایسے معاملات ہیں جن کا ان معصومینؑ کی تاریخ حیات سے قریب یا بعید کسی بھی طرح کا تعلق نہیں ہے اور نہ وہ روایات کسی معتمد راوی کے ذریعہ سے آئی ہیں۔ بلکہ ان میں کچھ شیبی اور شیعوں کے دوسرے دشمنوں کی من گھڑت ہیں اور کچھ منافقوں، غالیوں حتیٰ کہ شیعیت اور اسلام سے منحرف ہو جانے والوں کی گڑھی ہوئی ہیں۔ مزید یہ کہ جن روایتوں میں ائمہ کرامؑ اور ان کے اصحاب کے بارے میں تصوف سے ملتی جلتی باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کئی ایک کے وضع کرنے میں داستان گو اشخاص کا بھی خاصا دخل رہا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب منطق، تحقیق اور صداقت سے دور اور عجیب و غریب باتوں پر

مشتمل ہے۔ شیبی کے وہ بیانات کہ جن میں حقائق کو مسخ کیا گیا ہے اور بعض نظریات اور اطوار میں صوفیوں کو شیعوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر ہم اس کتاب سے ان کی مثالیں دینے لگیں تو گفتگو میں طول ہو جائے گا۔ اس لیے ہم نے اس کتاب کی صرف ایک فصل کو ہی پیش نظر رکھا ہے۔ حالانکہ اس کی ساری فصلیں ایسی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر گہری نظر ڈالی جائے۔

اس کتاب کی وہ فصل کہ جس کو میں نے نمونہ کے لیے سامنے رکھا ہے اس کا عنوان اَلْفُتُوَّۃُ وَ الْمَلَامَتِیَّۃ ہے۔ مؤلف کے پورے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فتوت (بہادری) کا مصدر قرآن ہے اور اس صفت کا ذکر متعدد آیتوں میں آیا ہے۔ نیز نبی اکرمؐ کی زبان مبارک پر بھی یہ کلمہ جاری ہوا تھا:

لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَارِ۔

صوفیوں نے فتوت کا اطلاق اپنے ممتاز افراد نیز ان لوگوں پر کیا ہے جو اپنی حرص و ہوس پر قابو پالیں۔ ان میں ملامتیت کا وہی افادہ ہے جو شیعوں میں تقیہ کا ہے۔ چنانچہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کے گروہ کے افراد اپنے زہد، عبادت اور تقویٰ کو ظاہر نہ کریں۔ اس طرح اپنے مقصد کے لحاظ سے ملامتیت اور تقیہ کی حدیں باہم ملتی ہیں، یعنی راز اور عقیدہ کو ایسا پوشیدہ رکھنا کہ دشمن اس سے آگاہ نہ ہونے پائیں اور کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں۔ ڈاکٹر شیبی کی اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ملامتیت اور تقیہ دونوں صفتیں شیعیت سے لیگئی ہیں، اس لیے بقول ان کے تصوف اور شیعیت میں گہرا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں شیعوں پر اور بھی بہت سے بے بنیاد اور جھوٹے الزامات لگائے گئے ہیں۔

اسی طرح کی غلط فہمیاں کہ جن کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مؤلفین کا ایک بڑا گروہ یہ سمجھتا ہے کہ تصوف ائمہ اہلبیتؑ اور ان کے پیروکاروں سے چلا ہے، حالانکہ شیعیت قول و فعل ہر لحاظ سے تصوف اور صوفیوں سے بہت دور ہے اور ان دونوں سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ البتہ زہد یعنی حرص دنیا کو ترک کرنے کی دعوت کہ جس کا ذکر اہلبیتؑ سے وارد ہونے والی روایات میں ملتا ہے اور جو ان کی صفات میں داخل تھا، اس کے معنی اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہیں کہ انسان محض لذت پرستی ہی کو

اپنائے نہ رکھے جس سے وہ آخرت کے لیے عمل کرنے سے غافل رہنے لگے کیونکہ ائمہ کرامؑ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان ان قرآنی تعلیمات کی پیروی کریں جو دنیا اور آخرت دونوں کی طرف دعوت دیتا ہے کہ:

وَابْتَغِ فِيمَا آتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا. (سورۂ قصص۔ آیت ۷۷)

یعنی جو کچھ اللہ نے تم کو عطا کیا ہے اس کے ذریعے سے آخرت کا توشہ حاصل کرو لیکن دنیا (کی لذتوں) میں سے اپنا حصہ مت چھوڑو۔

اور کہتا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ. قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا.

(سورۂ اعراف۔ آیت ۳۲)

(اے رسولؐ!) کہیے کہ اللہ نے جو اچھی چیزیں اور پاکیزہ کھانے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں وہ کس نے حرام کر دیے ہیں۔ کہیے کہ وہ تو خاص ان کے لیے ہیں کہ جو ایمان لائے ہیں۔

نیز نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

مَلْعُوْنٌ مَنْ تَرَكَ دُنْيَاهُ لِاٰخِرَتِهٖ وَمَنْ تَرَكَ اٰخِرَتَهٗ لِدُنْيَاهُ.

قابلِ لعنت ہے وہ شخص کہ جو اپنی آخرت کی خاطر دنیا کو چھوڑ دے اور وہ جو اپنی دنیا کی خاطر آخرت کو چھوڑ دے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے : لوگوں میں سب سے زیادہ پارسا وہ ہے جو شک کے موقع پر رک جائے، سب سے زیادہ عبادت گزار وہ ہے جو فرائض ادا کرے اور سب سے بڑا زاہد وہ ہے جو حرام سے باز رہے۔

ائمۂ اہلبیتؑ کی احادیث ایسی باتوں سے بھری پڑی ہیں جو طلب رزق کے لیے سعی و عمل پر ابھارتی ہیں، ان کاہل لوگوں کی مذمت کرتی ہیں جو زمانہ اور مقام کے تقاضوں

کے مطابق معاشرہ قائم کرنے میں اپنی ہمت صرف نہیں کرتے اور امکان بھر کوشش نہیں کرتے۔ تاہم تصوف کا جو مطلب تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے دوران سمجھا جاتا تھا وہ اپنے کفر اور الحاد کو چھپائے رکھنے کا ایک پردہ اور اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کا ذریعہ تھا، جیسا کہ اس دور کے صوفیوں کے حالات سے عیاں ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حلاج، نمیری، شلمغانی اور ایسے ہی دوسرے شیعہ ان جھوٹے الزامات کی بدترین مثالیں ہیں جو شیعوں پر ان کی طویل تاریخ کے دوران تھوپے جاتے رہے ہیں لیکن میں اس مقام پر حلاج کی کج روی اور اس کے الحاد کے بارے میں صرف اتنا ہی بیان کروں گا کہ امام مہدی القائمؑ کی سفارت سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ چنانچہ الکنیٰ والالقاب میں خطیب بغدادی سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حسین بن منصور حلاج نے بغداد آ کر امام القائمؑ کی سفارت کا دعویٰ کیا اور بہت سے خاص و عام افراد کو دھوکہ دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح شیعوں کی صفوں میں داخل ہو کر ابوسہل بن اسماعیل بن علی نوبختی کو اپنے قابو میں لائے جو ممتاز علماء میں سے تھے اور پھر ان کے نسبی رشتہ سے شیخ حسین ابن روح نوبختی سے فائدہ اٹھائے۔ پھر اس نے ان کے پاس اپنا آدمی بھیجا تاکہ ان کو اپنے جال میں پھانسے، لیکن ابوسہل نہایت عاقل اور زیرک شخص تھے۔ انہوں نے اس کے آدمی سے کہا کہ جو کرامات وہ دکھاتا ہے وہ تو شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہیں ہے تاہم میں ایک عیش پرست آدمی ہوں لہٰذا مجھ کو عورتوں اور ان کی حکومت سے زیادہ کوئی لذت نہیں بھاتی۔ مزید یہ کہ میں گنجا آدمی ہوں اس لیے اپنے سر پر عمامہ کسے رہتا ہوں اور اپنے بڑھاپے کو چھپانے کے لیے خضاب لگاتا ہوں۔ پس اگر وہ کچھ کر سکتا ہے تو میرے سر پر بال اگا دے اور میری داڑھی کو خضاب کے بغیر سیاہ کر دے۔ پھر چاہے وہ امام القائمؑ کا سفیر ہونے یا نبی ہونے بلکہ خدا ہونے ہی کا دعویٰ کیوں نہ کرے، میں اس کے ہر دعوے کو تسلیم کر لوں گا۔ حلاج نے جب ان کا یہ جواب سنا تو وہ ان کی طرف سے مایوس ہو گیا اور ان سے اپنا منہ موڑ لیا۔

راوی کہتے ہیں کہ حسین بن منصور حلاج قم بھی گیا تھا جو اس زمانہ میں علماء و محدثین کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں جا کر اس نے صدوق کے والد علی بن موسیٰ بن بابویہ کو ایک رقعہ

لکھا اور اس میں یہ دعویٰ کیا کہ "میں امام مہدی القائمؑ کے سفیر اور وکیل کی حیثیت سے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں"۔ جب انہوں نے وہ رقعہ پڑھا تو اس کو پھاڑ ڈالا اور حلاج کے قاصد سے کہا: "تم کو ان بیہودگیوں کی فرصت کیسے مل گئی"۔ وہ لوگ جو وہاں موجود تھے جب ان کو اس خط کے مضمون کا علم ہوا تو انہوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ راوی مزید کہتا ہے کہ اس کے بعد ابن بابویہ وہاں سے اٹھ کر اپنے اصحاب اور خدمتگاروں کے ساتھ اپنی دکان پر چلے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو جو لوگ وہاں موجود تھے وہ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے، البتہ ایک آدمی کھڑا نہ ہوا اور وہ بیٹھا رہا۔ چنانچہ ابن بابویہ جب اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو انہوں نے اس سے کھڑے نہ ہونے کی وجہ پوچھی۔ تب اس نے کہا: آپ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں جبکہ میں اس وقت بھی آپ کے پاس موجود تھا اور دیکھ رہا تھا کہ آپ میرا رقعہ پھاڑے ڈال رہے تھے۔ پھر ابن بابویہ نے اس سے کہا: اچھا — تو تم حلاج ہو! تمھی وہ ملعون ہو کہ معجزے دکھانے کا دعویٰ کیا کرتے ہو۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے خدمتگاروں کو حکم دیا اور اس کو وہاں سے نکلوا دیا۔ انہوں نے اس کو نہ صرف اپنے یہاں سے نکلوا دیا بلکہ پھر اس کو شہر قم ہی سے نکلوا دیا۔ اس کے بعد وہ کبھی وہاں نہیں گیا۔

ہم حلاج اور اس طرح کے دوسرے ملحد اور کج رو افراد کے بارے میں اتنے ہی بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو امام مہدی القائمؑ کے سفیر ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے تاکہ اس طریقہ سے اپنے برے مقاصد حاصل کریں اور لوگوں میں اپنے منافی اسلام اقوال کو پھیلا سکیں لیکن ادھر ائمہ کرامؑ ایسے لوگوں کے کفر و الحاد کو آشکارا کرتے اور اپنے اصحاب کو ہدایت فرماتے تھے کہ وہ ان جھوٹے دعویداروں پر لعنت کریں اور ان سے بیزاری اختیار کیے رہیں۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے پچھلے صفحات میں ان واقعات کا ذکر کر آئے ہیں۔

غیبت صغریٰ کے زمانے میں امامؑ کے وکیل

امام مہدی القائمؑ کے حالات پر مشتمل کتابوں کے مطابق غیبت صغریٰ کے زمانہ میں آپ کی نیابت کے عہدہ پر یکے بعد دیگرے چار افراد فائز رہے جن کو آپ نے اس ذمہ داری کے لیے منتخب کیا اور ان کو پابند کیا تھا کہ وہ آپ کے اور تمام شیعوں کے درمیان واسطہ بنے رہیں گے۔ ان کے علاوہ آپ نے کچھ کاموں میں اپنے ان نائبوں

کی مدد کے لیے متعدد شیعہ افراد کو اپنا وکیل بھی مقرر کیا تاکہ ان کی وہ مشکلیں کچھ کم ہو سکیں جو ان کو اہل حکومت اور ان کے اہلکاروں کی طرف سے پیش آتی رہتی تھیں۔ البتہ وکالت کی ذمہ داری نیابت کی ذمہ داریوں کے مقابلہ میں محدود تھی کیونکہ امامؑ کا نائب آپ سے براہ راست ملاقات کرکے تعلیمات اور احکامات حاصل کرتا تھا اور اکثر ذمہ داریوں کو اسی طریقے سے پورا کرتا تھا، جیسا کہ وہ ان کے لیے آپ سے احکام حاصل کرتا تھا۔ جبکہ وکیل کی ذمہ داری زیادہ تر اپنے دائرہ عمل تک محدود ہوتی تھی، جیسے مال خمس وصول کرکے آپ کو پیش کر دینا، احکام کا پہنچانا اور شیعوں کے لیے امام القائمؑ کے نائب سے ملاقات میں آسانی پیدا کرنا تاکہ وہ اپنے مسائل ان تک لیجا سکیں۔

حاجز بن یزید

سید محمد صادق صدر نے اپنی کتاب 'موسوعۃ الامام المہدیؑ' میں لکھا ہے کہ شیخ صدوق نے اکمال الدین کے قلمی نسخہ میں امام القائمؑ کے بہت سے وکیلوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں حاجز بن یزید بھی ہیں۔

اکمال الدین ہی میں شیخ مفید کے حوالے سے حسن بن عبدالحمید سے روایت ہے کہ:
مجھ کو حاجز بن یزید کے معاملہ میں شک تھا، اس لیے میں نے کچھ چیزیں جمع کیں اور سامرا گیا۔ تب ہمارے پاس امامؑ کا جواب آیا کہ: تم لوگوں کو نہ تو ہمارے بارے میں شک ہونا چاہیے اور نہ اس فرد کے بارے میں کوئی شبہ ہونا چاہیے جو ہمارے حکم سے کام کرتا ہو۔ پس تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم اپنے دل میں حاجز بن یزید کے بارے میں کوئی بدگمانی رکھو۔

محمد بن علی بن بلال

رجال کشی میں روایت ہے کہ امام القائمؑ نے بعض توقیعات میں جو آپ سے منسوب ہیں ان میں ابوطاہر محمد بن علی بن بلال البلالی کو قابل اعتماد، صاحب امانت اور اپنے فرائض کا پابند قرار دیا ہے لیکن شیخ طوسی نے ان کو گمراہ اور وکالت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں میں شمار کیا ہے۔
پھر یہ بات کچھ بعید بھی نہیں ہے کہ ابتدائی دور میں وہ قابل اعتماد افراد میں شامل رہے ہوں اور اس کے بعد منحرف ہو گئے ہوں۔ جیسا کہ کئی دوسرے افراد گمراہ اور منحرف ہو گئے تھے جو ائمہ کرامؑ کے معتمد اصحاب میں شامل رہ چکے تھے۔

محمد بن ابراہیم بن مہزیار

ابن طاؤس نے محمد بن ابراہیم بن مہزیار کو سفیر اور باب قرار دیا ہے اور شیعہ سفیر اور باب میں کوئی فرق تصور نہیں کرتے، جیساکہ جامع الرواۃ میں آیا ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کی سفارت سے مراد وکالت ہی ہو گی کیونکہ شیعوں کے ہاں متفق علیہ طور پر امام القائمؑ کے سفیروں یعنی نائبوں کی تعداد صرف چار تک مانی جاتی ہے۔

کتاب الغیبۃ شیخ طوسی میں ہے کہ محمد بن مہزیار کہا کرتے تھے کہ: امام محمد حسن عسکریؑ کی شہادت کے وقت میں ان کے جانشین کے معاملہ میں شک میں پڑ گیا۔ اس وقت میرے باپ کے پاس بہت سا مال خمس جمع ہو گیا تھا۔ تب انہوں نے وہ سارا مال اپنے ساتھ لیا اور کشتی میں سوار ہو گئے جبکہ میں بھی ان کے ہمراہ جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں ان کو شدید بخار ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ مجھے اپنی موت قریب نظر آ رہی ہے اس لیے تم مجھ کو گھر واپس لے چلو۔ پھر مجھ کو وصیت کی کہ اس مال کے معاملہ میں اللہ کا خوف کرنا اس کے ساتھ ہی وہ وفات پا گئے۔

وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ اپنے والد کے کفن و دفن سے فارغ ہو کر میں وہ مال لے کر عراق جا پہنچا۔ وہاں میں نے دریا کے کنارے پر ایک مکان کرایہ پر لیا اور کچھ دن وہیں رہا۔ یہاں تک کہ ایک قاصد میرے پاس ایک خط لیکر آیا جس میں لکھا تھا کہ: اے محمد! تمہارے پاس اس وقت ہمارا اتنا مال ہے جو تمہارے باپ نے چھوڑا ہے۔ نیز یہ بھی لکھا تھا کہ کیا کیا چیز کتنی کتنی مقدار میں موجود ہے۔

حالانکہ میں خود بھی اس کی تعداد وغیرہ سے واقف نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے وہ سارا مال اس قاصد کے سپرد کر دیا اور پھر وہاں مزید چند روز تک مقیم رہا۔ تب میرے پاس امامؑ کا حکمنامہ آیا جس میں لکھا تھا کہ: ہم نے تم کو تمہارے باپ کی جگہ مقرر کر دیا ہے۔ پس تم اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے رہو۔

احمد بن اسحاق اشعری

احمد بن اسحاق بن سعد بن مالک اشعری امام تقی الجوادؑ، امام نقی الہادیؑ اور امام حسن عسکریؑ کے دور میں ان کے اور اہل قم کے مابین واسطہ بنے رہے تھے پھر انکو امام مہدی القائمؑ

کی غیبت کا بھی کچھ زمانہ ملا۔ یہی وہ بزرگ ہیں کہ امام حسن عسکریؑ سے ان کے جانشین کے بارے میں جن کے سوال پر امامؑ نے اپنے فرزند مہدی القائمؑ کو ان کے سامنے کر دیا تھا۔ نیز ان کے کچھ حالات بیان کیے جو ان کی غیبت صغریٰ اور کبریٰ میں پیش آنیوالے تھے۔

محمد بن صالح ہمدانی

رجال کشی میں ہے کہ اسحاق بن اسماعیل کے نام امام القائمؑ کا ایک حکمنامہ آیا جس میں لکھا تھا کہ: جب تم بغداد جاؤ تو یہ محمد بن صالح بن محمد ہمدانی دھقان کو پڑھ کر سنا دینا، وہ ہمارے وکیل اور معتمد ہیں اور ہمارے پیرو کاروں سے خمس وغیرہ کی وصولی کا کام کرتے ہیں۔ جامع الرواۃ میں کہا گیا ہے کہ اپنے آخری زمانہ میں دہقان غلو کرنے لگے اور امام القائمؑ نے ان پر لعنت فرمائی اور کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے دہقان کے افعال کی وجہ سے ان کے ایمان کو کفر سے بدل دیا ہے اور جلد ہی وہ ان کو عذاب میں گرفتار کرے گا۔ تاہم بعض علمائے رجال کا خیال ہے کہ وہ دہقان جس پر امامؑ نے لعنت کی تھی، وہ عروہ بن یحییٰ دہقان ہے نہ کہ محمد بن صالح ہمدانی دہقان؟ اور یہ بات کچھ بعید بھی نہیں ہے۔

محمد بن جعفر اسدی

نجاشی کا بیان ہے کہ: امام القائمؑ نے محمد بن جعفر اسدی کو صاحب امانت قرار دیا اور مال خمس ان کے سپرد کیے جانے کا حکم دیا تھا۔ ان کے علاوہ آذربائیجان کے قاسم بن بلار، محمد بن شاذان بن نعیم نیشاپوری، ابراہیم بن مہزیار، حسین بن علی بن سفیان بزفوری اور بہت سے دوسرے افراد بھی ہیں کہ امام القائمؑ نے مسلمانوں کے اہم امور ان کے سپرد کیے اور ان کو خمس وصول کرنے اور لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے کام پر مامور فرمایا تھا۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ وکلاء بذریعہ خط و کتابت یا امامؑ کے ان نائبوں کے ذریعہ آپ سے رابطہ قائم کرتے تھے جن پر امامؑ کو اعتماد تھا اور آپ نے ان کو لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے اور ان کی مشکلیں حل کرنے کے لیے مقرر فرمایا تھا۔

ان وکیلوں کے حالات کے بارے میں بیان کی گئی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام القائمؑ کے بعض نائب اور وکیل تجارت کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعے مختلف علاقوں میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ اس طرح حکومت اور اس کے عمال جو خود امام کی

اور آپ کے نائبوں اور وکیلوں کی نگرانی کرنا چاہتے تھے وہ انکی پہچان ہی نہ کرپاتے تھے۔

امام مہدی القائمؑ کی حیات مقدسہ کو بیان کرنے والی روایات بتاتی ہیں کہ آپ اپنی امامت کے ابتدائی زمانہ یعنی غیبتِ صغریٰ میں جس طرح اپنے چار نائبوں اور جابجا پھیلے ہوئے وکیلوں سے ملا کرتے تھے۔ اسی طرح بعض اوقات اپنے خاص شیعوں کو بھی ملاقات کا موقع دیتے اور ان کی مشکلیں حل فرماتے تھے۔ حالانکہ اہل حکومت انتہائی سختی کے ساتھ آپ کا پیچھا کرتے اور آپ کے نائبوں اور وکیلوں پر بھی کڑی نگاہ رکھتے بلکہ کبھی کبھی تو وہ اپنے اہلکاروں کی مخبری پر آپ کے کسی نہ کسی وکیل کو گرفتار بھی کر لیتے تھے۔ مزید یہ کہ آپ کے چچا جعفر بن امام علی نقیؑ کے اکسانے پر امامؑ کو گرفتار کرنے کے لیے خلیفہ معتمد کے حکم سے آپ کے گھر پر بار بار چھاپے بھی مارے گئے لیکن ان کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہوئی، یہاں تک کہ آپ کی عمر انیس سال کی ہوگئی اور معتمد کے بعد معتضد کی خلافت کا زمانہ آگیا۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی آپ کو گرفتار کرنے کی بارہا کوشش کی، روز لشکر پر لشکر بھیجے جو آپ کے گھر کا محاصرہ کر کے بڑی سختی کے ساتھ تلاشی لیتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے بندوں میں سے منتخب کر لیا تھا اور آپ پر اس کا خاص کرم تھا، اس لیے اس کی تدبیر آپ کے اور خلیفہ کے درمیان حائل ہو جاتی تھی۔

اہل حکومت کی ان کوششوں کے باوجود بھی امام القائم اپنے خاص اصحاب اور شیعوں کے ساتھ مل بیٹھتے اور ان کی مصلحت کا خیال رکھتے ہوئے ان کی مشکلات کو حل فرما دیتے تھے۔ جیسا کہ روایات بتاتی ہیں کہ جب وہ لوگ آپ کے حضور حاضر ہوتے تو ان پر ایک طرح کا کیف و سرور چھا جاتا تھا کہ آپ کی ذات ان کے ذہنوں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جب تک آپ ان سے جدا نہ ہو جاتے، ان لوگوں کو یہ خیال ہی نہ آتا تھا کہ آپ ان کے ساتھ موجود ہیں۔ البتہ اگر کبھی مصلحت کا تقاضا ہوتا تو آپ ان لوگوں پر اپنے آپ کو آشکارا بھی فرما دیتے تھے۔

عیسیٰ بن مہدی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا لیکن آپ کی موجودگی سے بے خبر سا ہو گیا تھا۔ تب آپ نے فرمایا کہ: اگر جھٹلانے

والے یہ نہ کہتے کہ امام القائمؑ کہاں ہیں؟ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ ان کو کس نے دیکھا ہے؟ ان کی طرف سے تمہارے پاس کون آیا ہے؟ انہوں نے تم کو کیا خبر دی ہے؟ ان کے معجزے کہاں ظاہر ہوئے ہیں؟ تو تم مجھ کو ہرگز نہ دیکھ پاتے۔ اے عیسیٰ بن مہدی! جاؤ اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ ہمارے دوستوں کو بتا دو' لیکن خبردار یہ باتیں ہمارے دشمنوں کو نہ بتانا۔ راوی مزید کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا: اے میرے آقا! دعا کیجیے کہ میں ثابت قدم رہوں۔ آپ نے فرمایا: اگر اللہ نے تم کو ثابت قدم نہ کیا ہوتا تو تم مجھ کو دیکھ نہ پاتے۔

بحار الانوار میں عیسیٰ بن مہدی سے ایک اور روایت بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام القائمؑ کو دیکھا' آپ کے ساتھ رہا اور آپ کے دسترخوان پر کھانا کھایا۔ اسی طرح حسن بن وجناء نصیبی کا بیان ہے کہ میں مکہ میں آپ کے ساتھ تھا جبکہ آپ خانۂ کعبہ میں سجدہ کی حالت میں انتہائی رقت سے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک کنیز نے آکر ان کو بلایا اور آپ اس کے ساتھ چل دیے۔ یہاں تک کہ ام المومنین خدیجہ کے مکان پر جا پہنچے۔ پھر مجھ کو آواز دی کہ: اے حسن! اوپر آجاؤ۔ چنانچہ میں اوپر جا کر مکان کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا' تب امام القائمؑ نے مجھ سے فرمایا: اے حسن! آیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھ سے پوشیدہ رہے ہو؟ بخدا کہ تمہارے مناسک حج کے دوران کوئی وقت ایسا نہیں کہ جب میں تمہارے ساتھ نہ تھا۔ پھر آپ نے مجھ کو میرے حج کے تمام اوقات بتا دیے' جن کو سن کر میں بیہوش ہو گیا۔ جب تک امامؑ نے اپنا ہاتھ میرے سینہ پر نہ رکھا میرے حواس بجا نہیں ہوئے۔

کتاب الغیبۃ میں شیخ طوسی نے ایک ازدی شخص کا ذکر کیا ہے کہ اس نے کہا: کعبہ کا طواف کرتے ہوئے میں نے وہاں ایک جوان کو دیکھا جو بہت باوقار اور خوشرو تھا اور اس کا بدن خوشبو سے مہک رہا تھا۔ تاہم اپنی اس تمکنت اور ہیبت کے باوجود وہ لوگوں میں گھل مل گیا تھا۔ میں نے اس کے کلام سے اچھا کلام اور اس کی زبان سے میٹھی زبان کبھی نہ سنی تھی۔ جب میں نے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ: یہ فرزند رسولؐ ہیں جو سال میں ایک مرتبہ اپنے خاص اصحاب کے سامنے آتے ہیں اور ان سے

ضروری باتیں کرتے اور سنتے ہیں۔ ازدی مزید کہتا ہے کہ یہ سن کر میں آپ کے قریب گیا اور ان سے خواہش کی کہ آپ مجھ سے بھی بات کریں۔ چنانچہ آپ نے میرے لیے دعا کی اور فرمایا: "میں امام القائمؑ ہوں۔"

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ حج کے زمانہ میں مکہ اور مدینہ میں لوگوں کے پاس آیا کرتے تھے، جہاں آپ اپنے خاص شیعوں کو دینی و دنیوی امور کے بارے میں ہدایات دیتے تھے۔ مزید یہ کہ وہاں آپ شیعوں کا مال خمس اپنے نائبوں اور وکیلوں کے ذریعہ یا بذات خود وصول فرماتے تھے لیکن جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے اور اس میں شک بھی نہیں ہے کہ اپنے نائبوں، وکیلوں اور خاص شیعوں سے ظاہراً ملاقات سے آپ کو کئی ایک مشکلوں کا سامنا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ عمل اہل حکومت اور ان کے اہلکاروں یہاں تک کہ عام شیعوں کی نظروں سے بھی دور ہی انجام پاتا تھا۔

اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ان روایات میں سے بعض یا اکثر آپ سے محبت کرنے والوں کی گھڑی ہوئی ہیں اور یہ بات کچھ بعید بھی نہیں ہے تو بھی اس میں شک نہیں ہے کہ آپ کی حیات کا پہلا دور وہ تھا جو آپ کے چوتھے نائب شیخ سمری کی وفات پر ۳۲۹ھ میں ختم ہوا جبکہ آپ کی عمر ۷۴ سال تھی جس میں ساڑھے چار سال آپ نے اپنے والد بزرگوار کے ساتھ گزارے تھے۔ اس دور میں آپ لوگوں سے بالکل علیحدہ نہیں رہے بلکہ جب کبھی ضرورت کا تقاضا ہوتا تو آپ پوشیدہ طور پر اپنے خاص اصحاب اور اپنے نائب سے ملاقات کرتے تھے، کیونکہ اہل حکومت کی طرف سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اگرچہ وہ آپ کے معاملہ میں اللہ کی مشیئت کے آگے بے بس ہو جاتے تھے۔

داستانِ سرداب

اس بات پر اتفاق ہے کہ امام القائمؑ کی غیبت صغریٰ آپ کے چوتھے نائب شیخ سمری کی وفات پر ختم ہوگئی اور اس وقت سے غیبت کبریٰ شروع ہوئی جس کے متعلق امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ: یہ خدا کا راز اور اس کا ایک پوشیدہ امر ہے کیونکہ غیبتِ کبریٰ متواتر جاری رہیگی تا اینکہ اللہ تعالیٰ اس کے ختم ہونے کا حکم نہ دے۔ رہی یہ بات کہ امام القائمؑ اپنی حیات کے

پہلے دور یعنی غیبت صغریٰ میں کہاں تھے؟ غیبت کبریٰ کس جگہ سے شروع ہوئی؟ نیز اس کے شروع ہوتے سے ختم ہونے تک آپ کہاں رہیں گے۔ اس ضمن میں صحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہے اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کہ غیبت صغریٰ میں آپ کا قیام اپنے والد امام حسن عسکریؑ کے مکان میں رہا۔ البتہ بعض اوقات آپ اہل حکومت، ان کے مددگاروں اور اہل کاروں کی نظروں سے بچنے کے لیے مکان کے ایک حصہ میں سرداب میں روپوش ہو جاتے تھے، جبکہ عراق کے مکانوں میں کل کی طرح آج بھی سرداب کا چلن باقی ہے اور اس کو گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

حکومت جب کبھی آپ کی تلاش میں کچھ زیادہ سرگرمی دکھاتی اور آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا جاتا جیسا کہ کئی مرتبہ ہوا تو آپ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے سایہ میں اپنے گھر سے نکل کر روپوش ہو جاتے تھے۔ البتہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر سال آپ دینی اجتماع کے مواقع پر حاضر ہو جاتے، یہاں تک کہ اپنے اصحاب کی محفلوں میں مجلسوں میں بھی تشریف لاتے تھے تاکہ ان لوگوں کی مشکلات حل کر دیں اور انکی حاجات کو پورا کر دیں لیکن اس طرح کہ بعض اوقات چند خاص الخاص اصحاب کے علاوہ کوئی شخص آپ کو پہچان نہ پاتا تھا۔

پس معلوم ہوا کہ غیبت کبریٰ کی ابتدا آپ کے گھر سے ہوئی اور بلاشک یہیں سے آپ اللہ تعالیٰ کی اس زمین کی وسعتوں میں داخل ہو گئے، جہاں آپ عام لوگوں کے ساتھ اس چیز کا جو انسان کو درپیش ہوتی ہے یعنی بھوک، پریشانی، ایذا، اور ظلم وغیرہ کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ تاہم حج اور دوسرے اہم موقعوں پر لوگوں کے اجتماعات میں تشریف لاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی اس مشیئت اور مصلحت کے تحت کوئی بھی آپ کو پہچانتا نہیں، کیونکہ اس کے راز اور حد کو پیشین گوئی اور قیاس آرائی ہرگز نہیں پا سکتی۔

بہرحال آپ کی زندگی کے اس پہلو پر اور اس کے راز کے متعلق گفتگو کرنا ایک پیچیدہ اور کٹھن مرحلہ ہے اور آپ کے وجود سے انکار کرنے والا شیعیت سے خارج ہے۔ بلکہ اگر اس انکار سے نبی اکرمؐ کو جھٹلانا مقصود ہو تو پھر وہ اسلام ہی سے خارج ہو جائیگا۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے بھی آپ کے متعلق خبر دی ہے۔ رہا یہ سوال کہ آپ کی غیبت کیوں

اور کس لیے ہے تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کے لیے یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہے۔ خدا کا سلام ہو یہ کہنے والے پر کہ امام القائمؑ خدا کا ایک راز اور اس کے پوشیدہ امور میں سے ایک پوشیدہ امر ہیں۔

بعض روایات جو امام القائمؑ کی حیات کے مراحل کو بیان کرتی ہیں ان میں کہیں کہیں سرداب کا ذکر بھی آتا ہے اور وہ بتلاتی ہیں کہ شیعہ امام علی نقیؑ اور امام عسکریؑ کے روضوں کی زیارت کرتے ہیں اور اس مکان میں جو امام حسن عسکریؑ سے منسوب ہے نمازیں پڑھتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ ان روایات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے شیعوں کے مخالفین نے اپنی اس عادت کے مطابق کہ جب اور جہاں موقع ملا جو چاہا فقرہ کس دیا، ان پر یہ جھوٹا الزام عائد کر دیا کہ شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ سرداب میں چلے گئے تھے اور آپ کی ماں آپ کا انتظار کرتی رہیں لیکن آپ ایک طویل مدت تک وہاں سے باہر نہیں آئے چنانچہ ان لوگوں کے ایک شاعر نے بھی اس کے متعلق کہہ ڈالا ہے:

وہ شخص کیسے سرداب سے باہر آئے گا۔ تم تو جہالت کے سبب سمجھ رہے ہو کہ وہ آنے والا ہے۔ تمہاری عقلوں پر تو پتھر پڑ گئے ہیں کیونکہ تم عنقا اور ردبو کے بعد ایک تیسری موہوم ہستی کے قائل ہو گئے۔

کنجی اپنی کتاب البیان میں کہتا ہے کہ یہ لوگ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ آپ اللہ کی قدرت سے اس تمام طویل مدت میں سرداب کے اندر بغیر کھائے پیئے زندہ موجود ہیں۔ اس قسم کی اور جھوٹی باتیں ہیں جن پر اعتماد کرنے کے لیے نہ کوئی معقول بنیاد ہے نہ کوئی قابل قبول صحیح حدیث موجود ہے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ پہلے دور میں آپ کی زندگی آپ کے والد بزرگوار کے گھر میں اور کبھی کبھی باہر گزری اور یہ کہ آپ اہل حکومت کے خوف سے لوگوں سے پوشیدہ رہتے تھے کیونکہ یہ لوگ آپ کے وجود سے گھبرائے رہتے تھے اور کبھی کبھی آپ سے اور آپ کے سفیروں سے مل بھی جاتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ سرداب میں چلے جاتے تھے جو عراق کے ہر گھر میں ہوتا ہے لیکن دوسرے دور میں آپ یقیناً حتمی طور پر وہاں سے نکل کر اللہ کے وسیع علاقہ میں چلے گئے تاکہ دوسرے انسانوں کی مانند زندگی بسر کریں۔

لیکن کیونکر کہاں اور کب آپ اس اہم کام کے انجام دینے کے لیے ظہور فرمائیں گے جس کے لیے اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا ہے، یہ اللہ کو معلوم ہے۔ ہم لوگوں کے لیے مشکل ہے کہ ہم آپ کی غیبت کی حکمت اور اس کے راز کو سمجھ سکیں۔ اس لیے ہم کو چاہیے کہ نبی اکرمؐ کے فرمان کے سامنے سر جھکا دیں کیونکہ آنحضرتؐ اپنی خواہش نفس سے کبھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ طویل عمری عقلاً محال نہیں ہے۔ ہمارے سامنے حضرت نوحؑ کی مثال موجود ہے جو ایک ہزار سال سے زیادہ مدّت تک زندہ رہے اور جس کی گواہی قرآن کریم نے دی ہے جس میں آگے پیچھے کہیں غلط بیانات کا گزر ہی نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے حضرت عیسیٰؑ کے زندہ رہنے کو بتلایا ہے اور یہودیوں کے اس قول کو غلط ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے ان کو قتل کر دیا تھا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ:

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ...... وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا.

ان لوگوں نے نہ انہیں قتل کیا اور نہ ہی سولی دی، مگر ان کے لیے" ایک دوسرا شخص عیسیٰ کے" مشابہ کر دیا گیا اور جو لوگ اس سلسلے میں اختلاف کرتے ہیں وہ انکے بارے میں دھوکے میں ہیں۔ ان کو اس (واقعہ) کی خبر ہی نہیں مگر یہ کہ وہ گمان پر عمل کرتے ہیں اور عیسیٰؑ کو ان لوگوں نے یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا اور خدا تو بڑا زبردست تدبیر والا ہے اور اہل کتاب میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو ان پر انکے مرنے سے قبل ایمان نہ لائے اور وہ روز قیامت ان پر گواہ ہونگے۔ (سورۂ نسار آیت ۱۵۷-۱۵۸)

اس آیت سے ظاہر ہے کہ وہ اب تک زندہ ہیں اور اس سے پہلی آیت ثابت کرتی ہے کہ یہودیوں نے ان کو نہ قتل کیا نہ سولی دی بلکہ اللہ نے ان کو اپنی جانب اٹھا لیا۔ البتہ وہ آیت کہ " اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ .... ـــــ تو اس میں بھی ان کی موت کا اظہار نہیں ہے بلکہ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں تمہارا اجر تم کو دوں گا اور تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس آیت میں وفات سے مراد موت ہی ہے تو بھی ـــــ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ زمانۂ ماضی میں واقع ہو گئی تھی کیونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ واؤ عطف کا اس طرح کا استعمال ترتیب کے معنی نہیں دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم حضرت عیسیٰ بن مریمؑ

کی زندگی کو نظر انداز بھی کر دیں تو حضرت نوحؑ کا اپنی قوم میں طویل عرصے تک زندہ رہنا جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے اس امر کا بہترین ثبوت ہے کہ انسان طویل زمانہ تک زندہ رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حدیث اور تاریخ سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ لقمان بن عاد کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ زندہ رہا اور اس نے اپنی زندگی میں سات حالتیں بدلیں۔ اعشیٰ نے اس کے متعلق اپنے اشعار میں یوں کہا ہے:

تمہاری جان کی قسم تم نے تو سات زندگیاں پالیں۔ ایک زندگی ختم ہوتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ جب اس کے بال بے رنگ ہو گئے تو اس نے اپنے سب سے آخری دور حیات سے کہا کہ اب تو میں بھی مر چلا اور ابن عاد بھی اور تم کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

راویوں کا کہنا ہے کہ قیس بن ساعدہ ایادی سات سو سال یا بقولے اس سے بھی زیادہ عرصہ زندہ رہا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ عمر بن ربیعہ بن کعب عرف مستوغر چار سو سال زندہ رہا اور ظہور اسلام سے پہلے مر گیا۔ مؤرخین کے مطابق اس نے خود یہ اشعار کہے ہیں:

میں اپنی زندگی کے طولانی ہونے سے تنگ آ گیا ہوں کیونکہ اس کا شمار سیکڑوں سال تک ہو گیا ہے۔ دو سو سال پر اور ایک سو سال ہوئے اور پھر مہینوں کے بجائے سال بڑھتے رہے۔ زندگی کا جو دن گزرتا اس سے زیادہ باقی رہتا تھا اور اس طرح دن پر دن اور رات پر رات گزرتی رہی۔

طویل العمر لوگوں میں سے ایک زہیر بن خباب ہے جو دو سو بیس سال زندہ رہا۔ جیسا کہ سید مرتضیٰ نے اپنی "امالی" میں بیان کیا ہے۔ انہی میں ایک اور نام ذو اصبع عدوانی کا ہے۔ اس کے حالات میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ تین سو سال یا بقولے اس سے کم زندہ رہا۔ اسی طرح تاریخ کا کہنا ہے کہ ربیع بن ضبع نے اپنے متعلق خود بتایا ہے کہ وہ دو سو سال حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں اور ایک سو سال سے زیادہ جاہلیت کے زمانہ میں زندہ رہا"

اور عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک زندہ رہا۔ چنانچہ اس کے سامنے اس نے یہ شعر پڑھا:

جب کوئی دو سو سال تک زندہ رہتا ہے تو سارا لطف اور اطمینان ختم ہو جاتا ہے۔

بیشتر مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ جب وہ عبدالملک سے ملنے آیا اور اسے بتانے لگا کہ اس نے اپنی طویل زندگی میں کیا کیا دیکھا اور پچھلے لوگوں کے حالات سنائے تو ان دونوں میں بہت طویل اور مزیدار گفتگو ہوتی رہی۔

زیادہ عمر پانے والوں میں عبدالمسیح بن بقلہ غسانی کا نام بھی آتا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ تین سو پچاس سال سے زیادہ مدت تک زندہ رہا۔ اسی طرح محدثوں اور مؤرخوں نے دسیوں ایسے طویل العمر لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی عمریں اس حد سے آگے نکل گئی تھیں جس سے انسان قدیم زمانے سے لے کر آج تک مانوس رہا ہے۔ نیز سنّی اور شیعہ دونوں کی کتب حدیث میں موجود بکثرت حدیثیں بتاتی ہیں کہ حضرت خضرؑ طویل زمانہ تک زندہ رہے بلکہ ان میں سے بیشتر کا کہنا ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں۔

اگرچہ زیادہ عمر پانے والوں کے متعلق راویوں کا بیان صحیح ہے۔ پھر بھی یہ اس سے مختلف ضرور ہے جس سے انسان مانوس رہا ہے اور شیعہ یہ دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ امام القائمؑ کی طویل زندگی حسب معمول ہے بلکہ وہ اس کے قائل ہیں کہ یہ مشیئت الٰہی کے مطابق ہے۔ جس طرح مشیئت الٰہی یہ تھی کہ نوحؑ ایک ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ زندہ رہیں۔ اسی طرح آپ کا غیبت میں رہنا آپ کے لیے باعث نقص نہیں ہے کیونکہ یہ بھی مصلحت کا تقاضا ہے جیسا کہ بعض انبیاء جان کے خوف سے یا دوسری مصلحتوں سے اپنی قوم سے روپوش ہو جاتے تھے۔ اس کی ذمہ داری امت کے کاندھوں پر ہے جس نے آپ کو مجبور کیا کہ وہ لوگوں سے روپوش ہو جائیں۔ جس طرح آپ سے پہلے کے لوگوں نے آپ کے آباء کرامؑ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ظالموں کے سامنے تقیہ اختیار کریں اور بیشتر اوقات اپنی تبلیغ کو چھپ کر انجام دیں۔ آپ کی سیرت کے ان پہلوؤں کا بیان پیچیدہ اور طویل ہے۔ شیعوں نے ان کے بارے میں زمانۂ قدیم سے لیکر عہد حاضر تک متعدد کتابیں لکھی ہیں اور اپنے عقیدہ کا جواز منطق اور دلیل سے پیش کیا ہے۔

میں نے طے کیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے اختصار سے کام لوں گا اس لیے میں ائمہ کرامؑ کی سیرت کے بیان میں اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں کہ میں ان ذواتِ مقدسہ کو پوری طرح اور ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو جو نیکیوں اور فضیلتوں سے بھرے پڑے ہیں پیش کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ میں ان سے معذرت خواہ ہوں اور ان پر ان کے جدامجد حضرت محمد مصطفےٰؐ پر درود و سلام بھیجتا ہوں جو تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبَّنَا صَلِّ عَلٰی اَحْمَدَ خَیْرِ الْمُرْسَلِیْنَا

وَعَلِیٍّؑ صَاحِبِ الْحَوْضِ اَمِیْرِ الْمُوْمِنِیْنَا

وَعَلٰی فَاطِمَۃَ الزَّھْرَآءِؑ اُمِّ الطَّیِّبِیْنَا

وَعَلَی السِّبْطَیْنِؑ وَالسَّجَّادِؑ زَیْنِ الْعَابِدِیْنَا

وَعَلَی الْبَاقِرِؑ وَالصَّادِقِؑ عِلْمًا وَّیَقِیْنَا

وَعَلَی الْکَاظِمِؑ مُوْسٰی وَالرِّضَاؑ فَضْلًا وَّدِیْنَا

وَالتَّقِیِّؑ الْخَاشِعِ الْبَاسِطِ بِالْجُوْدِ یَمِیْنَا

وَعَلَی الْھَادِیؑ الَّذِیْ اَشْرَقَ کَالشَّمْسِ جَبِیْنَا

وَالزَّکِیِّ الْعَسْکَرِیِّؑ الْحَسَنِ الْخُلْقِ اَمِیْنَا

وَعَلَی الْقَآئِمِؑ بِالْقِسْطِ مُغِیْثًا وَّمُعِیْنَا

اٰلِ یَاسِیْنَ الْھُدَاۃِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَا

رَبَّنَا سَیِّدَنَا صَلِّ عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْنَا